ہندوستان کے محکمہ ہائے تعلیم میں منظور شدہ

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار

رسالہ

ادبی دنیا

نقشۂ عالم کے [illegible] ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے

مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع

جولائی سنہ ۱۹۳۰

ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر

ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی

سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول [illegible]

[illegible]

TO LET

APPLY TO

F. M. SAQI,

Advertising Manager,

ADABI DUNYA

LAHORE.

انسان کے جسم کا نہایت قیمتی حصہ سر ہے
اور سر کی حفاظت اور خوبصورتی کا ذریعہ بال ہیں
اور بالوں کی حفاظت اور خوبصورتی کا دارومدار کاہن آملہ ہیئر آئل پر ہے

تیار کنندگان: میسرز گوبند رام کاہن چند
جنرل عطاران - خاص دکان کیسرا بازار لاہور

Do not fail to mention "ADABI DUNYA" while writing to these advertisements. It will pay you.

دسمبر میں ادبی دنیا کا خاص نمبر نہ نکلنے پر ہم پر بازاری پھبتیاں کسنے والے مقامی معاصر کو شکر کرنا چاہیئے کہ ہم نے بے اصولی برت کر اس کو خطرے میں نہیں ڈالا ورنہ اس کے خاص نمبر کے ساتھ ہمارا خاص نمبر شایع ہو جاتا تو اس کا رہا سہا طلسم بھی ٹوٹ جاتا اور اسے اپنے سالنامے کو دواؤں کی پڑیاں باندھنے میں استعمال کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کونسی اصول پروری ہے کہ ایک طرف معتقد احباب کے ذریعے مولینا تاجور سے اس کی التجا کیجا رہی ہے کہ وہ ادبی دنیا کا انتظام اُنکے سپرد کر دیں اور دوسری طرف انہیں پر اپنے سوفیانہ پن کی مشق کیجا رہی ہے۔

بارہا اعلان کیا جا چکا ہے کہ ہم کسی سے اپنی جیسی الوالعزمی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان نمائشی پرچوں کے جعلی ایڈیٹروں کے مصالح کی خاطر ہم ادبی دنیا کا معیار پست کر دیں۔ مگر اپنے میں ہماری بیجگری کے مقابلے کی طاقت نہ پا کر اپنے حسنِ ادب اور فراوانیٔ تہذیب کا اشتہاری مظاہرہ شروع کر دینا ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سکول کا آرٹ ہے۔

مولینا تاجور کا ابتدا سے یہ رویہ رہا ہے کہ وہ اپنے ان چھچھورے مخالفوں کو قابلِ خطاب نہیں سمجھتے۔ اس وقت وہ دورے پر تشریف لے گئے ہیں اور ہم نے اُنکی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ذمہ داری پر یہ چند سطریں محض اس لئے لکھ دی ہیں کہ لاہور سے باہر کے رہنے والے ناظرین بھی ان ادبی رہنماؤں کی ادب پرستی کے روشن ترین پہلو سے کسی حد تک واقف ہو جائیں۔ ورنہ درحقیقت یہ نہ ہمارے حریفِ خطاب ہیں۔ نہ ہونگے۔ نہ ہو سکتے ہیں۔

ادبی دنیا کا پہلا سال اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہوتا ہے اس لئے اس کا خاص نمبر اصولاً ہمیں مئی سنہ ۳۰ء میں شایع کرنا چاہیئے۔ مگر ادبی دنیا کے محترم نگراں سر عبدالقادر کا خیال ہے کہ پژمردگی کے ان دنوں میں عموماً ذوق ادب بھی پژمردہ ہو جایا کرتا ہے اس لئے مئی میں خاص نمبر نکال کر ذوق ادب کو دعوتِ مطالعہ دینے سے بہتر یہ ہے کہ اسے اکتوبر یا نومبر میں شایع کیا جائے۔ بہرحال ہم ابھی تاریخ نہیں مقرر کر سکتے۔ اس کی ترتیب میں لگے ہوئے ہیں ہمارے معیار اور ہماری پسند کے مطابق مرتب ہو جائیگا تو اشاعت کے وقت کا بھی اعلان کر دینگے۔

جن لوگوں نے فرمائشیں بھیجی ہیں ان کے نام رجسٹر میں درج کر لئے گئے ہیں اور شایع ہونے پر خاص نمبر انہیں بھیج دیا جائیگا۔ اور جنھوں نے اپنا نام اب تک درج نہیں کرایا ہے وہ اگر چاہیں تو ابھی سے درج کرا سکتے ہیں۔

خاص نمبر میں ہم کسی عام نمبر کو وضع کرنا نہیں چاہتے۔ خاص نمبر خواہ کسی وقت شایع ہو سالانہ قیمت میں خریداروں کو سال کے بارہ پرچے دینے کے ہم ذمہ دار ہیں۔ اور خریدار اسی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہونگے۔

ہم اپنے ظاہر و باطن کی اس یکسانی پر مسرور ہیں کہ ٹائیٹل پر "مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع" لکھا ہوا دیکھکر اس کے اندر مشرق و مغرب کے شہ پاروں کی جستجو میں اہل نظر ناکام نہیں رہتے۔

یہ صرف ادبی دنیا کی خصوصیت ہے کہ آٹھ آٹھ نو نو افسانوں کے ساتھ ہر نمبر میں مختلف نوعیت کے چودہ پندرہ ایسے مضامین شایع کئے جاتے ہیں جو علمی دنیا میں اہم ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی دنیا کے افسانے عریانی اور ہیجان انگیز عناصر سے پاک ہوتے ہیں۔ اور یہ امتیاز بھی صرف ادبی دنیا کو حاصل ہے۔ کہ جن کے اوریجنل ہونے کی تشریح کر دیجاتی ہے۔ ان کے سوا تمام افسانے دنیا کے مشہور ترین فسانہ نگاروں کے شاہکاروں کا ترجمہ یا ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ آسکر وائلڈ۔ اناطول فرانس۔ ٹیگور۔ ماویلزوپن جیسے فسانہ نگاروں کا ایک نمبر میں اجتماع یورپ کے کسی پرچے میں بھی مشکل ہی سے نظر آ سکتا ہے۔ مگر ادبی دنیا کے ہر نمبر میں ان جیسی سات سات آٹھ آٹھ شخصیتیں جمع کر دی جاتی ہیں۔

ص ...

ادبی دنیا ہر ماہ میں ہر خریدار کو بصد احتیاط سے رجسٹر سے چیک کر کے روانہ کیا جاتا ہے۔ آپ کا پرچہ اگر دس تاریخ تک نہ پہنچے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ اور اپنے ہاں کے پوسٹماسٹر سے شکایت کریں۔

ہر خط میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ ورنہ آپ کے ارشاد کی تعمیل تقریباً غیر ممکن ہے۔

مینیجر

آئینۂ عالم

سنہ ۱۹۲۹ء پر ایک اجمالی نظر

سنہ ۱۹۲۹ء کو دنیا کی تاریخ میں کئی اعتبارات سے اہمیت حاصل ہے اسی سال مسٹر کیبلوگ نے تھکی ہوئی مغربی دنیا کے لئے ایک خواب آور نسخہ تجویز کیا اور خونریزی اور استعمار کی رُوح کو تھپک تھپک کر سلا دینے کی کوشش کی۔ اس نسخۂ خواب آور۔ اس معاہدۂ امن پر ہر سلطنت کے نمائندے نے دستخط کر دیئے مگر روس جو خون میں نہا کر آزاد ہوا ہے دستخط کرنے سے محترز رہا۔ شاید روس یہ محسوس کر رہا ہے کہ دستخط کر دینے سے ایک قسم کی پابندی عاید ہو جائے گی۔ جو اس کی نئی اور نرالی آزادی کے منافی ہے۔

انگلستان اور امریکہ کی کشمکش کے سلسلے میں انگلستان کے موجودہ وزیر اعظم بنفس نفیس امریکہ تشریف لیگئے جس کا نتیجہ تشفی بخش بیان کیا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہوا مگر واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جبتک مغرب کا جوع الارض کم نہیں ہوتا اور جبتک مغربی حکومتوں کی بری و بحری طاقت کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جارہی ہے اس وقت تک امن کے یہ معاہدے ردّی کاغذ کے پُرزوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اسی سال مشرق کا سب سے اندوہناک واقعہ افغانستان کی تباہی وقوع پذیر ہوا۔ طاقتور قوموں کی باہمی رقابت اور مغربی تدبر و سیاست کی بے پناہ موج شاہ امان اللہ خاں جیسے روشن دماغ اور بیدار مغز بادشاہ کو سیلِ بلا کی طرح بہا لے گئی۔ اور خزف ریزوں کی طرح اٹلی کے ساحل پر پھینک دیا۔

انقلاب افغانستان کے سلسلے میں یہ حقیقت بے حد تکلیف دہ ہے۔ افغانیوں کے مذہبی جذبے سے بیجا فائدہ اٹھایا گیا اور ان سے شریعت کے نام پر وہ کام لیا گیا جس سے شریعت الہٰی تو کیا انسانی قانون بھی شرماتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ افغانستان کی خونریزی اور خانہ جنگی نادر خاں کے جذبۂ عمل کی محرک ثابت ہوئی۔ اور وہ علالت کے باوجود" محض اپنے ملک کی بھلائی کے لئے" سات سمندر پار کر کے افغانستان پہنچ گئے اور بلا شرکت غیرے افغانستان کے بادشاہ بنگئے۔ مگر فضا ابھی تک مکدر ہے اور افغانستان کے لئے منزلِ امن ابھی بہت دُور معلوم ہو رہی ہے۔

بچہ سقہ کی حیرت انگیز کامیابی اور اس کے ہولناک انجام میں ہزاروں عبرتیں پنہاں ہیں جس قوم کے بطن سے بچہ سقہ جیسا کپوت پیدا ہو ممکن ہے کہ اس کی گود میں اور بھی سقہ بچے پل رہے ہوں۔

مشرق کے لئے اس سال کا ایک اہم ترین واقعہ برطانیہ اور مصر کا جدید معاہدہ ہے۔ جس کی رو سے مصر تقریباً آزاد ہو گیا ہے۔ یا آزاد ہو جائیگا۔ بشرطیکہ اس نے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔ اور غفلت میں پڑ کر نہر سویز کے پاسبانوں کو اندرونِ ملک میں پیر پھیلانے کا موقعہ نہ دیا۔

ترکی اور ایران میں افغانستان کی طرح سازشیں اور بغاوتیں رونما ہوئیں مگر وہ پنپنے سے پہلے ہی کچل دی گئیں۔

ترکی میں لاطینی رسم الخط عام طور پر رائج ہوگئی اور جیسا کہ سرکاری اطلاعول سے معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ سے علم و ادب کی رفتار ترقی میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔

معلوم ہوا ہے کہ شاہ ایران بھی رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں ہیں اور اس کے لئے موافق فضا کا انتظار کر رہے ہیں۔

ترکی کی اقتصادی حالت اس سال بہت کمزور رہی مگر ایران کی اقتصادی کیفیت قابل اطمینان بتائی جاتی ہے۔

بیت المقدس میں دیوار گریہ پر یہودیوں کے قبضہ کرنے کی کوشش نے سارے فلسطین میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا۔ سیکڑوں مسلمان عرب اور یہودی مقتول و مجروح ہوئے۔ اور فلسطین کو صدیوں کے بے وطن یہودیوں کا وطن بنانے کی برطانوی پالیسی دنیائے اسلام کے لئے بیحد تکلیف دہ اور افسوسناک ثابت ہوئی۔

نجد و حجاز میں سلطان ابن سعود کا اصلاحی اقدام جاری رہا - مگر سرحدِ عراق کی جنگ اور فیصل الدویش کی بغاوت نے انہیں بار بار پریشان کیا -

حجاز کی اقتصادی حالت بہت اچھی رہی - اور تجارت پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گئی - آمد و رفت کے وسائل میں بھی توسیع ہوئی اور ایامِ حج کے لئے بہم رسانی آب کا قابلِ اطمینان انتظام کیا گیا - مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے کتبخانوں کی تنظیم کر کے انہیں اہلِ علم کے لئے مفید اور کار آمد بنانے کی سعی کی گئی - سرکاری درسگاہوں میں طلبہ کی تعداد گزشتہ سال سے زیادہ رہی - اور علومِ جدیدہ کی تعلیم کا مزید سامان مہیا کیا گیا

چین اور روس کی کشمکش گزشتہ چند سال کی طرح اس سال بھی جاری رہی اور ابتک جاری ہے -

چین قدامت اور مشرقیت سے نکل کر مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب و تمدن اختیار کر رہا ہے - اور اس معاشرتی انقلاب کے ساتھ سیاسی انقلاب ایک لازمی امر ہے - مگر کسی ملک کے سارے باشندے بیک وقت ہم رائے نہیں ہو سکتے - چین میں بھی قدامت پسند موجود ہیں - اور انتہا پسندوں کے ساتھ ان کا تصادم ضروری ہے - روس ان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر وہاں بالشویکیت کا پرچار کر کے اپنا سب سے اہم فرض ادا کرنا چاہتا ہے - اسی کے لئے کئی سال سے جھڑپیں ہو رہی ہیں - اور اس سال بھی ہوتی رہیں -

---

ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان کے لئے یہ سال مبارک تھا یا منحوس کیونکہ جو واقعات یہاں اس سال رونما ہوئے ہیں ان کے نتائج کا صحیح اندازہ کچھ دنوں بعد ہو سکیگا -

نہ معلوم ۳۱ دسمبر کو اس سال کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے اور نہ معلوم جس چیلنج کے ساتھ اس کی ابتدا ہوئی تھی اس کا کیا حشر ہوتا ہے -

سنہ ۲۸ء کی "سائمن گو بیک" کی صدائے بازگشت اس سال بھی سنائی دیتی رہی - ناتجربہ کار نوجوانوں اور کار آزمودہ بوڑھوں کا مسلک اس سال الگ الگ نمایاں ہو گیا - نوجوانوں نے آزادی کی راہ کو صرف ایک چھلانگ میں طے کرنے کی کوشش کی - جوانی کے نہ رُکنے والے جوش اور جدید شاہراہ کی موہوم دلکشی نے انہیں خطرناک اقدام عمل پر ابھارا اور انہوں نے تدبر و تفکر سے کام لئے بغیر انقلاب کی جدوجہد شروع کر کے اپنے ساتھ آزادی وطن کی راہ میں بھی مشکلات حائل کر دیں - اور ایسے وقت جبکہ قدیم بہی خواہانِ وطن ملک کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں نوجوانوں نے اپنی تخریبی جدوجہد سے چنداں دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ جو خون ان کے ہاتھوں بہا وہ مادرِ وطن ہی کے زخموں کا خون ثابت ہوا -

نوجوانوں کے سوا ہندوستان کے اکثر رہنماؤں نے حکومت سے باعزت صلح کی کوشش کی - اور اس لحاظ سے یہ سال ہندوستان کے لئے بیحد مبارک ہے کہ کانگرس - خلافت - اور جمعیۃ العلما کی نمایندہ شخصیتوں نے موجودہ معاملات پر کئی بار وائسرائے سے تبادلۂ خیال کیا - اور برسوں کی بدگمانیوں کی وجہ سے برطانیہ اور ہندوستان میں جو دوری واقع ہو گئی تھی - وہ بڑی حد تک کم ہو گئی ہے - یہ بھی ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ انگلستان کی مزدور حکومت برسرِ اقتدار آ گئی -

ہندوستان لیڈروں اور وائسرائے کا تبادلۂ خیال بیکار نہ گیا - اور لارڈ ارون کو وہ مشہور اعلان شائع کرنے کا موقع ملا - جس میں ہندوستان کو درجہ نوآبادیات عطا کرنے کے متعلق ملک معظم کا زاویۂ نگاہ بیان کیا گیا ہے اور گول میز کانفرنس میں ہندوستانیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے -

◆ ◆ ◆

پنجاب آجکل سیاسی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا ہے - اور زندہ دلانِ پنجاب لاہور کانگرس کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں - اگر پنڈال کی عظمت اور پروپگنڈے کی ہمہ گیری سے اندازہ کرنا صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس سال کانگرس کے اجلاس گزشتہ سال سے بھی زیادہ شاندار ہوں گے - اور بیٹے (جواہر لال) کی پذیرائی باپ (موتی لال) سے بھی زیادہ ہو گی - باقی کامیابی اور ناکامی کے متعلق یکم جنوری سنہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا.

× × ×

ہندوستان کی اقتصادی مشکلات میں اس سال اضافہ ہوتا گیا - ہڑتالوں کی کثرت اور مزدوروں کی بے چینی سے ملک میں دن بدن اضطراب بڑھتا رہا - پچھلے دو تین سال کی بہ نسبت ملکی مصنوعات کی طرف زیادہ توجہ کی گئی - مگر غیر ملکی صناعوں کا مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے سودیشی اشیاء میں پبلک نے انفرادی طور پر کوئی خاص ارزانی نہیں محسوس کی -

سیلاب کی تباہ خیزیوں نے مشرقی بنگال اور پنجاب کو بیحد نقصان پہنچایا - حکومت اور قوم کی طرف سے سیلاب زدہ علاقوں کی بروقت امداد کی گئی مگر اس سے نقصانات کی تلافی غیر ممکن تھی -

× + +

تعلیم کا شوق سارے ملک میں ترقی پذیر رہا - بہت سے مقامات میں جبری تعلیم جاری کی گئی

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کو رحمت اللہ کمیٹی کی سفارشات کے ماتحت

سدھار نے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بانی سر سید مرحوم کے پوتے سید راس مسعود وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹی کی شہرت رفتہ پھر عود کر آئی۔ اور کھوئی ہوئی ساکھ پھر جمنے لگی۔

ہندو یونیورسٹی کے لئے پنڈت مالویہ نے ملک کا دورہ کیا جو بیحد کامیاب رہا۔ اور ہندو راجاؤں سے لاکھوں روپیہ چندہ وصول ہوا۔

جامعہ ملیہ دہلی کی مالی حالت ۱۹۲۹ء کی بہ نسبت اچھی رہی۔ نواب صاحب بھوپال اور آصفجاہ دکن نے جامعہ کے مختلف شعبوں میں معقول وقتی اور مستقل امداد دینے کا وعدہ کیا۔

امریکہ کی علم پروری

گزشتہ سال امریکہ کے مخیر اصحاب نے صرف علمی کاموں پر چار کروڑ پونڈ صرف کیا۔ اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ ایک سال کے اندر صرف علمی کاموں پر اسقدر صرف کرنے کی امریکہ کے سوا موجودہ دنیا میں اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس رقم میں سے ایک کروڑ پونڈ مسٹر فورڈ کی اور چالیس لاکھ پونڈ مسز ایمبرے کی عطا کردہ ہے۔ جو امریکہ کے علمی اور تعلیمی اداروں کو دی گئی ہے۔ راک فیلر نے چالیس لاکھ پونڈ جمیعتہ الاقوام کے کتبخانے کو دیا ہے۔ اور ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ لندن یونیورسٹی کو عطا کیا ہے۔ وہاں کے ایک مالدار یہودی نے بیس ہزار پونڈ بیت المقدس کی عبرانی یونیورسٹی کو دیا ہے۔

طب جدید

اگر سو سال پہلے کے طبیب اپنے طریقۂ علاج کا آجکل کے طریق علاج سے مقابلہ کریں تو زمین آسمان کا تفاوت پائیں گے۔ اب سے سو بلکہ پچاس ہی سال پہلے علاج کا سارا دارومدار جڑی بوٹیوں اور نشتر پر تھا۔ مگر اب جدید معالجات کو گھاس پھونس سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اب رنگ برنگ کی طبعی مصنوعی شعاعوں سے، بجلی سے اور ریڈیم سے علاج معالجہ ہو رہا ہے۔ تدریج پھر جوشاندہ خیسانده اور کڑوی دواؤں کے بدلے بدن میں دواؤں کا جوہر داخل کر دیا جاتا ہے اور یہ طریقہ آجکل اسقدر عام ہو گیا ہے کہ بہت سے ڈاکٹر صرف انجکشن ہی کے ذریعے تمام امراض کا علاج کر رہے ہیں۔ مگر علم نفس کی ترقی اور مہارت کی وجہ سے علاج کا ایک اور طریقہ بھی ہاتھ آگیا ہے۔ جس کے متعلق تجربے جاری ہیں اور امید ہے کہ عنقریب یہ طریقۂ علاج ساری دنیا میں پھیل جائیگا۔ اس طریقے میں نہ کسی قسم کی دوا دیجاتی ہے۔ نہ انجکشن ہوتا ہے۔ بلکہ صرف ڈاکٹر تیسرے چوتھے دن مریض سے تھوڑی دیر گفتگو کرتا ہے۔ اور چند بار کی گفتگو میں مریض کے نفس سے بیماری کا اثر زائل کر دیتا ہے۔ اور مریض صحتیاب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بیماری کا اثر جسم پر خواہ کتنا ہی ظاہر ہو مگر دراصل ہر بیماری نفس ہی کو لاحق ہوتی ہے۔

کاغذ کا استعمال

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کاغذ صرف لکھنے کے کام آتا ہے مگر جاپان میں فوجیوں اور عوام کا لباس عموماً کاغذ ہی کا ہوتا ہے جو اگرچہ کپڑے کی طرح مضبوط نہیں ہوتا مگر اس سے ارزاں ہوتا ہے۔ جاپان میں عام طور پر اور یورپ میں بھی بعض ٹوپیاں کاغذ کی بنائی جاتی ہیں۔ ہوٹلوں میں تولئے کے طور پر کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔ جو ارزانی کی وجہ سے ہر شخص کے استعمال کرنے کے بعد بیکار کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر بار کاغذ کا نیا تولیہ استعمال کرنیوالا بیماریوں کی چھوت اور دوسروں کے جراثیم کی سرایت سے محفوظ رہتا ہے۔ کاغذ کی ردی کو گلا کر ہندوستان میں ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ جو خشک جنس رکھنے کے کام میں آتی ہیں مگر اسی سے امریکہ میں قسم قسم کے برتن اور پیپے بنائے جانے لگے ہیں جن پر چینی جیسا روغن چڑھا دیا جاتا ہے اور ان میں سیال چیزیں بھی رکھی جا سکتی ہیں۔

ایک فصل صرف ۲۵ دن میں

زراعت میں سب سے بڑا عیب سست رفتاری اور فصل کی تیاری کی دیر ہے۔ ایک نہایت چست کاشتکار بھی گرم ترین ملک میں جہاں پودے جلد بڑھتے ہیں۔ سال میں تین فصلوں سے زیادہ نہیں حاصل کر سکتا۔ مگر یہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ورنہ عام طور پر دو فصلیں لگائی جا سکتی ہیں۔ اسی سست رفتاری کی وجہ سے زراعت صنعت و حرفت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مثلاً فورڈ روزانہ اپنے کارخانے میں ایک ہزار موٹر کاریں تیار کرتا ہے۔ اور روزانہ بارہ ہزار کاریں تیار کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ مگر دنیا میں کوئی کاشتکار ایسا نہیں ہے جو بھولکر بھی اپنی کاشت کی روزانہ یا ہفتہ وار پیداوار بڑھانے کے متعلق کچھ سوچے اور یہ صرف اس لئے کہ صنعت و حرفت میں سرعت

ترقی اور کارگزاری کی زیادتی کا مادہ موجود ہے۔ مگر زراعت طبعی طور پر سست رفتار واقع ہوئی ہے۔ پودے سے جلد بڑھا دینا اور قبل از وقت غلہ حاصل کرلینا کاشتکار کے بس کی بات نہیں ہے۔

مگر جو چیز ابتک ناممکن سمجھی جارہی تھی اسکو نیویارک (امریکہ) کے ایک زراعتی فارم نے ممکن بنادیا ہے۔ وہاں گیہوں بونے کے پینتیس ۳۵ دن خوب اچھی طرح پک جانے کے بعد کاٹا گیا۔ اس تجربے نے سال میں دو تین فصلوں کے بدلے نو دس فصلیں حاصل کرنا ممکن بنادیا ہے۔

اس فارم نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پودوں کو روزانہ رات بھر بجلی کی بہت تیز روشنی میں رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ فضا سے کافی غذا حاصل کرسکے اور ان کی حرارت زیادہ ہوگئی جو ان کی غیر معمولی نشوونما کا باعث ہوئی۔ مذکورہ فارم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ گیہوں کے پودے بغیر آرام کئے ہوئے رات دن مسلسل روشنی برداشت کرسکتے ہیں۔ (بعض پودوں کے لئے کم سے کم چھ گھنٹے تاریکی میں آرام ضروری ہوتا ہے)

اس میں شک نہیں کہ فارم نے جو طریقہ استعمال کیا ہے وہ ہر کاشتکار کیلئے ممکن نہیں ہے۔ اور نہ بجلی کے اسقدر خرچ کے بعد اس سے چنداں فائدہ ہوسکتا ہے مگر اس سے نشوونما کی سرعت کا امکان ضرور ثابت ہوگیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ اس کی کوئی ارزاں تدبیر ہاتھ آجائے۔

کارآمد تعلیم کیلئے ہزار پونڈ کا اعلان

آپ کسی کالج کے کسی طالبعلم سے چاہیں سوال کریں کہ آجکل دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کی خصوصیات کیا ہیں؟ مختلف قوموں کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟ مختلف ممالک کی معاشرت میں کیا فرق ہے؟ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان سوالات میں سے ایک کا بھی صحیح جواب آپ کو نہیں مل سکیگا۔

کسی پرائمری سکول کے کسی بچے سے پوچھیں کہ اب سے دو ہزار سال پہلے ہندوستان کا بادشاہ کون تھا؟ اس کے پاس کتنی فوج تھی؟ اس نے کون کون سی لڑائیاں لڑیں اس کا زمانہ رعایا کے لئے کیسا تھا؟ ان میں سے ہر سوال کا آپ کو حرف بحرف صحیح جواب ملیگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ تعلیم میں موجودہ وقت کی بہ نسبت اگلوں کی رام کہانیوں پر زیادہ توجہ کیجاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوان کالج سے نکل کر کاروباری زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو اس دنیا کو اپنے لئے ایک نئی چیز پاتے ہیں اور ان کا فرسودہ علم ان کی عملی رہنمائی سے قاصر رہتا ہے۔

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی صورت حال نظر آرہی ہے اور اسی سے متاثر ہوکر انگلستان کی ایک خاتون مسز ٹائلر نے اخباروں میں اعلان کیا ہے کہ "میں کسی کارخانے کے مالک کے مشورہ کے مطابق اپنے لڑکے کی تعلیم پر ایک ہزار پونڈ صرف کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تعلیم کے بعد وہ اسے اپنے کارخانے میں ملازم رکھ لے"

اس اعلان میں مسز ٹائیلر نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی تعلیم پر دو ہزار پونڈ صرف کیا مگر جب وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوکر نکلا اور کوئی کام تلاش کرنے لگا تو ہر کارخانے کی طرف سے یہی جواب ملا کہ وہ کاروبار کے کام کا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب کارخانے ہی والے تعلیم کے ایسے طریقے مقرر کریں جن کی وجہ سے ملک میں ان کے کام کے نوجوان پیدا ہوسکیں۔"

عورتوں کی قوت ایجاد

عورتیں مشرق میں بھی ہیں اور مغرب میں بھی مگر تعلیم و تربیت اور آزاد ماحول نے مغربی عورتوں کی عقلی اور عملی قوی کو بیدار کرکے انہیں مشرقی عورت سے اسقدر ممتاز بنادیا ہے کہ اب یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ دونوں کی نوع ایک ہی ہے۔ عورتیں تو عورتیں مشرق کے مرد بھی ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔

گزشتہ سال امریکہ میں جو چیزیں رجسٹرڈ کرائی گئی ہیں ان میں سے پانچسو عورتوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ ایک سال میں کسی مشرقی ملک کے مردوں نے بھی شاید اتنی تعداد میں ایجاد تو الگ رہی۔ نقالی بھی نہ کی ہوگی۔

تاجور

۲۵ دسمبر سنہ ۲۹ء

کسان

رہین بندگیٔ خلق ہے حیات تری
بنی ہے دردِ محبت سے کائنات تری

ہراک کی پرورش اپنے لہو سے کرتا ہے
تو سب کے پیکرِ سادہ میں رنگ بھرتا ہے

نہیں تغیّرِ عالم سے کوئی کام تجھے
ملے ہیں اپنے لئے صرف صبح و شام تجھے

تو جب زمین کے سینے پہ ہل چلاتا ہے
تو ذرّہ ذرّہ ترے ساتھ مل کے گاتا ہے

مسرتیں تجھے ہر وقت گدگداتی ہیں
مصیبتیں بھی خوشی کا پیام لاتی ہیں

غریب ہونے پہ بھی آج بادشاہ ہے تو
کہ اپنے گاؤں کا بے تاج بادشاہ ہے تو

نظر کے سامنے ہے دولتِ گراں تری
وہ لہلہاتی ہیں جنگل میں کھیتیاں تیری

ہوا میں جھوم رہی ہیں ہری بھری فصلیں
بنی ہوئی ہیں بیابان کی پری فصلیں؛

کہ تیری سادہ تمنائیں رنگ لائی ہیں
زمیں کے سینۂ ویراں سے پھوٹ آئی ہیں

نہ کیوں عزیز ہو یہ شے تجھے زمانے میں
جھلک رہا ہے ترا خون دانے دانے میں

یہ شور برپا ہے جمہوریت پسندوں میں
کہ تو اسیر ہے اب تک طلائی پھندوں میں

پھنسا ہے دامِ غلامی میں بال بال ترا
کیا ہے قرض نے خستہ خراب حال ترا

بجا ہے - تنگ ہے تو دورِ آسمانی سے
حقیر تر ہے ترا خون آج پانی سے

نہیں نصیب تجھے پیٹ بھر کے کھانے کو
رہے گی تیری ضرورت مگر زمانے کو

یونہی زمین کے سینے پہ ہل چلائے جا
بہارِ عیش و مسرت کے گیت گائے جا

خزاں کی فصل میں بھی برگ و بار پیدا کر
اسی خزاں سے تو اپنی بہار پیدا کر

ہے آج عیش کا دار و مدار دولت پر
نہیں خوشی کا مگر انحصار دولت پر

یہ چیز تجھکو ہمیشہ نصیب رہتی ہے
ترے جگر ترے دل کے قریب رہتی ہے

قریبِ خاتمہ افسونِ شہریاری ہے
ہر ایک گوشہ میں اک انقلاب جاری ہے

پھریں گے تیرے موافق بھی صبح شام ترے
کبھی تو آئے گی گردشِ جہاں کی کام ترے

فاخر ہریانوی بی۔اے

سوانح عمری صنعت کے نقطۂ نظر سے

اگر یہ ممکن ہے کہ ہم کسی طرح اپنی زندگیوں کو ایک صناع کے نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکیں تو ہمیں بے انتہا مسرت حاصل ہوگی۔ کوئی ناول نویس یا سوانح نگار جذبات و احساسات کی ایسی دلکش تصاویر نہیں کھینچ سکتا جس طرح کی ہم خود کھینچ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم میں یہ طاقت موجود ہو۔ کہ ہم خود اپنی مسرتوں، تکلیفوں اور عشرتوں کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھ سکیں۔

مشکل تو یہ ہو جاتی ہے کہ جس وقت ہم پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم خود اس جذبے کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں۔ ہمارے جذبات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ ہم میں صحیح فنی اور تنقیدی ذوق عارضی طور پر قایم نہیں رہتا۔ یہ نسبتاً آسان ہے کہ ہم دوسرے اشخاص کے سوانح حیات سے مسرت حاصل کریں۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ دقت پیش آتی ہے کہ ہمارے دل میں ان اشخاص کی طرف سے یا تو محبت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے اور یا ہمیں اُن سے نفرت ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ غیر متعصبانہ ذوق نابود ہوتا ہے۔ جو ضروری ہے۔

ایک مشہور مصنف نے اس کی وجہ یوں ظاہر کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔ "کسی شے کو صنعت کا شاہکار سمجھکر دیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہمارے ذہن سے ہنگامہ ہائے حیات کے تمام شور و شغب نکال دئے گئے ہوں۔ اور ہم صرف تماشائی کی حیثیت اختیار کریں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی صنعتی کارنامے کو جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ جواب ظاہر ہے۔

فرض کرو کہ ہمارا ایک دوست دریا میں غرق ہو رہا ہے۔ اس صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اس خوبصورت زاویے کا خیال کریں جو اس کا بدن دریا میں ڈوبتے ہوئے قایم کرتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم سورج کی ان کرنوں سے لطف اندوز ہوں۔ جو پانی کے بلبلوں کو چھو رہی ہیں۔ ناممکن ہے۔ ہم انسان نہیں بلکہ شیطان ہوں گے اگر اس وقت ہمارے ذہن میں اس قسم کا کوئی خیال آئے۔

پھر اس کی کیا وجہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ہم فطرت کے ان حسین مناظر سے لطف اندوز ہوں گے تو ہمارے دوست کو کوئی نقصان نہیں پہونچیگا۔ بشرطیکہ ہم اس کے لئے ایک رسی بھی دریا میں پھینک دیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ ہماری تمام حسیات اس وقت "عمل" پر مرکوز ہیں۔ ہم اس کیلئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہمیں اس غم اور رنج کا احساس بھی نہیں ہوتا جو اس کے ڈوب جانے کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے سوانح حیات سے ہمیں مسرت حاصل ہو۔ اول تو یہ کہ اس شخص کی زندگی کو ہماری زندگی سے اسقدر دور کا تعلق ہونا چاہئے۔ کہ جس وقت ہم اس شخص کے کوائف و سوانح کا مطالعہ کریں تو ہمارے دل میں کسی "عمل" کا خیال نہ پیدا ہو۔ کوئی محرک ایسا نہ ہو جو ہمارے اخلاقی یا ذہنی توازن میں اختلال پیدا کرے۔ سب سے بہتر قسم کی سوانح عمری ناول ہے جس کے تمام واقعات فرضی تصور کئے جاتے ہیں اگر ہم اپنے آپ کو کسی ناول کے فرد کی حیثیت میں محسوس کرنے لگیں تو ناول کا تمام لطف جاتا رہتا ہے۔ جب کسی ناول میں کسی جہاز کے ڈوبنے کا ذکر آتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہم فوراً اٹھکر مدد کرنے کے لئے دوڑیں۔ ناول کے الفاظ ہمارے ذہن کو تصاویر کے خط و خال کی طرح متاثر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ناول نویس اپنے قارئین کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خود بھی افراد قصہ کے جذبات سے متاثر ہوں خاص طور پر ان حالتوں میں جب مصنف ایک اخلاقی مسئلے کو حل کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قارئین اس کے حل کو صحیح تسلیم کریں۔

اس قسم کے ناول صنعتی نقطۂ نظر سے نامکمل ہیں۔ چیخاف مشہور روسی مصنف نے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"تم دو چیزوں کو لیکر غلط مبحث کر رہے ہو۔ ایک تو حل ہے اور دوسرے مسئلہ زیر بحث کا صحیح بیان۔ ناول کو صرف دوسری بات سے تعلق ہے۔ "اینا کرینا" میں کسی مسئلے کو حل نہیں کیا گیا مگر کتاب فنی حیثیت سے مکمل ہے وجہ یہ ہے کہ اس میں تمام زیر بحث مسائل کو نہایت واضح طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔

ناول جو ہمارے دل سے غموں کے بوجھ کو اتار دیتے ہیں اس کی وجوہ صرف یہی ہیں جو مذکور ہوئیں۔ ناول ایک اس قسم کی شے ہے جسے ہم خوب سمجھتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں جیتے جاگتے اشخاص خطرناک ہوتے ہیں ناممکن ہے کہ ان کے افعال و کردار کے متعلق کوئی پیشینگوئی کی جاسکے۔ ان کے دماغ میں خیال آتے ہیں اور پھر فوراً ہی غائب ہو جاتے ہیں ایس

بے ترتیبی اور بے انتظامی میں ذہن کو بہت دقت پیش آتی ہے دنیا میں ہمارے دوست اور ہمارے دشمن ایک نہ ختم ہونے والا ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس ڈرامے کا موضوع کیا ہے۔ نہ ہمیں یہ علم ہو سکتا ہے کہ اس ڈرامے کا انجام کیا ہوگا۔ یہ کومیڈی ہے یا ٹریجیڈی۔ ڈرامے کے دوران میں اسقدر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کہ انکا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا اس کے برخلاف ناول کا ہر فرد مصنف کے ذہن و دماغ کی پیداوار ہے۔ اور چند قائم شدہ اصولوں پر کاربند رہتا ہے۔ یہ فرد انسانی دماغ نے پیدا کیا ہے۔ اور اسی لئے انسانی دماغ اسکو سمجھ بھی سکتا ہے۔

اس صورت میں ہمیں قدرت کی پیچیدہ پیداوار سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ انسان کی پیدا کردہ سادگی سے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فرد کے کردار میں پیچیدگی پائی جاتی ہو۔ لیکن اس پیچیدگی کو بھی چند اصولوں کے ماتحت رکھا جاتا ہے ذرا مسٹر فاسٹر کے "سفر ہندوستان" پر غور کرو۔ اس کے تمام افراد نہایت کوشش سے پیدا کئے گئے ہیں۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ ایشیائی اور مغربی طبائع کا اختلاف ظاہر کرے۔ اور اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اسکی کتاب نہایت صاف اور سادہ ہے کیا "ہندوستان" بھی اسی طرح صاف اور سادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر اسرار براعظم میں لاکھوں ایسے رموز ہیں جو تا حال ہم پر منکشف نہیں ہوئے اور اگر کوئی شخص برسوں اس ملک میں رہے تو بھی اُسے ان رموز سے آگاہی نہ ہوگی۔

تو ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اچھی سوانح عمری کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ غیر جانبداری۔ اور انسانی تخلیق فطرت۔

لیکن اگر سوانح عمری کو اس صنعتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو دو چیزیں اس موضوع سے خارج ہو جاتی ہیں۔ ایک تو معمولی سوانح عمری جو فنی نقطۂ نظر سے نہ لکھی گئی ہو۔ اور دوسرے تاریخ۔ ظاہر ہے کہ سوانح عمری کے افراد ناول کے افراد کی طرح فرضی نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم ان کے حالات پڑھکر ضرور کوئی نتیجہ قایم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ہماری ذہنی قوتیں پھر عمل پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ جب ہم بایرن مشہور انگریزی شاعر کی سوانح پڑھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ لیڈی بایرن حقیقت میں موجود تھی۔ اور ہمیں اس کی حالت پر رحم آتا ہے۔ اس طرح ہم سوانح کو صنعتی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے۔ جب کسی مدبر یا سیاست دان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ تو اور بھی دقت پیش آتی ہے۔ جب کوئی انگریز گلیڈ اسٹون کے سوانح حیات پڑھتا ہے تو اس کے تعصبات ذاتی یقیناً اُسے کتاب کا صحیح اندازہ قایم کرنے سے روکتے ہیں۔ لیکن جہانتک زندہ مشاہیر کا تعلق ہے۔ اس اعتراض کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ہیرو کے مرجانے کے بعد تمام جذبات دب جاتے ہیں۔ موت سب سے عظیم صناع ہے۔ اس کی آمد سے تمام جذبات و حسیات سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاید کہا جا سکے کہ سوانح عمری کو ناول پر ایک حیثیت سے ترجیح حاصل ہے۔ جب ہم کسی مشہور آدمی کے سوانح پڑھتے ہیں تو ہمیں پیشتر ہی سے اس کی زندگی کے اکثر واقعات کا علم ہوتا ہے۔ بادی النظر میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب کی دلچسپی گھٹ جاتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے اگر کتاب فنی طریق سے لکھی گئی ہو تو دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

جب ہم کوئی ٹریجیڈی دیکھنے کیلئے جاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سیزر بروٹس کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ شاہ لیر دیوانہ ہو جائے گا لیکن جوں جوں ڈرامے میں واقعات پیش آتے جاتے ہیں۔ اور وہ حادثے جنکا ہمیں انتظار ہوتا ہے قریب آجاتے ہیں۔ ہماری روح ہیبت عظمت کا احساس کرتی ہے۔ اور ویسی ہی شاعرانہ ہیبت و عظمت جو "تقدیر" کے ناقابل ترمیم قوانین یونانی ٹریجیڈی میں پیدا کرتے ہیں۔

تاریخ کی شخصیتیں گویا پتھر کی بنی ہوئی ہیں ان کو صنعت کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ ہم کسی تاریخی شخصیت میں ذراسی بھی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ رسکن اور گلیڈ اسٹون دو معمے تھے۔ جن کے متعلق انکی زندگی میں بھی ان کے دوست اور دشمن مختلف اندازے قایم کرتے تھے۔

سوانح نگار کا کیا فرض ہے؟

کیا وہ ان شخصیتوں کو معموں کی صورت میں پیش کرے؟ یہ ناممکن ہے ان کی زندگی کی تمام جزئیات اس قدر پھیلی ہوئی ہیں کہ عمر نوح بھی ان کو جمع کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

تو کیا وہ بعض جزئیات کو لیکر ایک تصویر کھینچنے کی کوشش کرے؟ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے قارئین کے سامنے ایک صحیح نقشہ اس شخص کا پیش نہیں کیا جسکے سوانح لکھنے کا وہ مدعی ہے۔ سوانح نگار کیلئے اپنے ہیرو کا انتخاب بھی ایک بہت عظیم اور اہم مسئلہ ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی محض صنعت سے لبریز ہے۔ کسی میں وہ پراسرار تناسب پایا جاتا ہے جو کپڑوں میں نہیں چھپ سکتا۔ اور جسے عام طور پر جسمانی حسن کا لقب دیا جاتا ہے۔ اور کسی میں کوئی ذہنی حسن ملتا ہے۔ بہر نوع ہیرو کا انتخاب بہت غور سے کرنا چاہیئے۔

سر سڈنی لی لکھتے ہیں کہ ہیرو میں عظمت و شوکت کا ہونا لازمی ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ایک بھکاری کے سوانح میں بھی وہ عظمت و شوکت موجود ہے جو صنعت کا مقصد ہے۔ اگر کوئی ناول نویس کسی غریب سے غریب اور

معمولی سے معمولی انسان کے جذبات کا تجربہ کرے۔ اس کے احساسات کی تصویر کھینچے اور اس کے تمام تصورات کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کر دے تو یقیناً نتیجۃً ایسا شاندار اور حسین ہو کہ قیصر روم کی زندگی بھی ایسا اثر مرتب نہ کر سکے۔

کارلائل کا خیال ہے کہ عام طور سے سوانح نگار خیال کرتے ہیں کہ صرف مشاہیر کی زندگی کسی اچھی سوانح عمری کا موضوع بن سکتی ہے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے صنعت کو اس بات کی کوئی پروا نہیں۔ ایک مصور کی نظر تصویر کے موضوع سے گذر کر نقوش و رنگ کے مجموعی تاثرات کو دیکھتی ہے۔ نقاد کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ تصویر کسی مشہور و معروف شخصیت کی ہے یا کسی بھکاری کی۔ اُسے تو صرف اس بات سے تعلق ہے کہ مصور نے تصویر میں کہاں تک صنعت سے کام لیا ہے۔ سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ شیکسپیر اور کسی معمولی ایکٹر میں کوئی تمیز نہ کرے۔

ہماری فطرت کا ایک نہایت کمزور پہلو یہ ہے کہ ہم مشاہیر کے سوانح کو زیادہ دلچسپی سے سنتے ہیں۔ لیکن صناع کو اس پہلو کی کوئی پروا نہیں ہونی چاہئے۔ "مونالزا" کے چہرے پر جو پُراسرار تبسم پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ اور ہمیں مونالزا کے متعلق یہ بھی علم نہیں کہ وہ کون تھی۔ ہو سکتا ہے کہ مصور نے ایک مرد کو سامنے رکھکر تصویر کھینچی ہو۔ ہوکوسائی مشہور جاپانی مصور جب چہرے کی کسی کیفیت کی تصویر کھینچتا ہے تو ذہن کو تفکر پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اگر سوانح نگار چاہتا ہے کہ وہ دوسرا باسول ثابت ہو تو ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی زندگی اور اس کی جزئیات کی طرف بے نہایت توجہ کرے۔

یہ خیالات بہت گراں قدر ہیں لیکن کسی حد تک غلط ہیں۔ معمولی آدمی کی زندگی ایسے حالات میں گذرتی ہے کہ موت کے بعد اسکا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ ناول نویس کے لئے مواد کی ضرورت نہیں وہ تو خود ایسے فرد کو پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے اس کے کردار و افعال کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ مگر جس شخص نے اپنے بعد کوئی خط نہ چھوڑا ہو۔ اس کی زندگی لکھنے میں سوانح نگار کو بہت دقت پیش آئیگی۔

اچھا تو اب ہم فرض کر لیتے ہیں کہ موضوع کا انتخاب ہو گیا۔

کیا کوئی ایسے مدون اصول ہیں جنکے ماتحت ہم اپنے موضوع کو شگفتہ بنا سکتے ہیں؟ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اگر سوانح نگار صداقت سے کام لے تو ناممکن ہے۔ کہ وہ صنعت کے اصول پر چل سکے۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے بعض سوانح نگار فطرتاً اس قسم کا دل و دماغ لیکر آئے ہیں کہ وہ خشک سے خشک موضوع میں شگفتگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ہمارا روئے سخن صرف اُنہیں کی طرف ہے۔

پہلے تو تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ قدیم مورخین اور سوانح نگار اس اصول کے پابند نہ تھے۔ پلوٹارک پہلے اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد اس قسم کے واقعات درج کرتا ہے جن سے ہیرو کے کردار پر روشنی پڑ سکے۔ یہ ایک نہایت عجیب طریقہ کار ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ناظرین کو ہیرو کی شخصیت کا کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اس کے کارناموں کو دلچسپی سے نہیں پڑھتے۔ اس طریقے کی پیروی میں ڈاکٹر جانسن نے بھی سوانح لکھے ہیں۔ پہلے واقعات پھر کردار۔

میرا خیال ہے کہ اگر واقعات میں تاریخی ترتیب کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے تو پڑھنے والے کیلئے کتاب میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ کسی شخص کے سوانح کا سب سے دلچسپ حصہ اس کا انجام ہے۔ اگر سوانح نگار ناظرین کو اپنے ہیرو کے انجام سے پہلے ہی آشنا کر دے تو لازماً کتاب کی دلچسپی میں فرق آجائے گا۔

ایک مصنف چارلس ڈکنس کی سوانح عمری کو ان الفاظ سے شروع کرتا ہے۔

"انگلستان کا سب سے کامیاب ظریف اور مقبول ناول نویس ۷ فروری سنہ ۱۸۱۲ء کو پیدا ہوا تھا"

اب یہ فقرہ قطعاً غلط ہے۔ آجتک کوئی مقبول اور کامیاب ظریف پیدا نہیں ہوا۔ فطرت کا اصول ہے کہ ہمیشہ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ۷ فروری سنہ ۱۸۱۲ء کو ایک لڑکا ضرور پیدا ہوا تھا۔ جس کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ انگلستان کا مقبول ترین مصنف بن جائے لیکن اس کی پیدائش سے لیکر اس کے ادبی عروج تک کے حالات ہی ناظرین کو دلچسپی لینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

تو کیا ہمارے لئے ضروری ہے کہ جب ہم کسی کامیاب اور مشہور شخصیت کے سوانح حیات رقم کریں تو یہ بات بالکل فراموش کر دیں کہ وہ مشاہیر عالم میں سے ایک گنا جاتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ضروری ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ سراسر بناوٹ اور تصنع ہے۔ لیکن یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صنعت اور تصنع ایک ہی مادے سے مشتق ہیں۔ ٹریجیڈی کا مصنف پہلے صفحے پر اپنے ہیرو کی بربادی کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ سوانح نگار کے لئے بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ پہلے ہی صفحے پر اپنے ہیرو کی عظمت کا اشتہار شائع کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریر کی خوبی سے ناظرین کے لئے ایک ایسی فضا پیدا کرے کہ وہ ہیرو کے اوائل عمر کے حالات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ شاید موجودہ عہد کے سوانح نگار کے لئے اس اصول کا خیال رکھنا قدیم مورخین کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ وہ لوگ تو اٹل تقدیر کے مقدر قائل تھے کہ ان کے خیال میں واقعات کا اثر کردار پر ضرور نہیں ہوتا تھا ہم لوگ جو ماحول کے اثرات کے قائل ہیں اس اصول کی پابندی پر خلاقاً

مجبور ہیں۔ ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ افراد کے کردار میں اسی طرح ارتقا ہوتا ہے جس طرح اقوام میں۔ گرد و پیش کے حالات۔ مختلف آدمیوں کی صحبت کردار پر ایک بہت گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔ ہم کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر سکتے جس کا کردار اسقدر یکساں اور ہموار ہو کہ اس سے کبھی کوئی خلاف توقع بات ظہور میں نہ آسکے۔ اس قسم کا شخص ناول نویس اور افسانہ نویس کے دماغ میں پایا جاتا ہو تو ہو مگر حقیقی زندگی میں یہ بات ناممکن ہے۔

مس اڈل نے مشہور شاعر کیٹس کے سوانح حیات کے دیباچے میں لکھا ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ میں قارئین کے لئے ایسی فضا پیدا کر دوں کہ وہ کیٹس کے جذبات کا اندازہ قایم کر سکیں میں ان کے ارد گرد اس قسم کے جال تننا چاہتی ہوں کہ وہ اپنے آپ کو ان تمام اثرات و حالات کے درمیان گھرا ہوا پائیں جنہیں کیٹس گھرا ہوا تھا۔ انہیں اس الہام ربانی کا احساس ہو جو کیٹس سے شعر کہلوایا کرتا تھا۔"

سوانح عمری" اس صنعت کا شاہکار تصور کی جائیگی جب اس کے اوراق اثرات سے لبریز ہوں جنکی وجہ سے ہیرو کی زندگی میں انقلاب پیدا ہوا ہے۔

زندگی میں عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے دوستوں طبیعتوں میں ترمیم و تغیر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قایم رہتا ہے کل تک جس شخص کو ہم مردانگی کا مکمل نمونہ تصور کرتے تھے۔ آج وہی غیر مکمل نظر آتا ہے۔ سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کے بیان میں بھی تاریخی ترتیب کو قایم رکھے۔ نہایت لغو ہو گا اگر وہ لکھدے۔ " اگرچہ وہ . . . . سے ملکر بہت مسرور ہوا تھا مگر دو تین سال کے بعد اُسے معلوم ہو جانے الا تھا کہ اس کی مسرت ایک فریب خیال سے زیادہ نہیں تھی۔"

اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ واقعات کی تاریخی ترتیب کو اُلٹ دیا گیا ہے۔

مسٹر ناسٹر نے ناول پر لیکچر دیتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کئے تھے۔

" ناول تین طرح سے لکھا جاتا ہے۔ یا تو ہر ایک واقعے کو ہیرو کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ یا مختلف افراد پر جو اثرات واقعات قایم کرتے ہیں انکی تشریح کی جائے۔ اور یا پھر مصنف کی شخصیت کو اسقدر اہمیت حاصل ہو کہ وہ تمام کتاب کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دے "

سوانح نگاری میں مجھے پہلا طریقہ بہت پسند ہے۔

خاص طور سے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ تاریخی واقعات جو ہیرو سے وابستہ ہیں۔ ہیرو کی شخصیت کو حقیر نہ کر دیں۔ سوانح کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہیرو کی اخلاقی روحانی اور جذباتی زندگی کا ارتقا ظاہر کیا جا سکے۔ تاریخی واقعات کا بیان صرف اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک ان کو ہیرو کے جذباتی ارتقا سے تعلق رہا ہے۔

صنعتی سوانح عمری کی ایک اور خصوصیت جزئیات کا انتخاب ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی عالم حقایق کا ایک وسیع ذخیرہ جمع کرے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ عالم صناع جزئیات میں سے صرف ان چیزوں کا انتخاب کرتا ہے۔ جن کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ "سوانح عمری" کا مقصد یہ نہیں کہ مصنف اپنی قابلیت کا اظہار کرے۔ اور ہیرو کے متعلق جو کچھ بھی اسے معلوم ہے۔ اُسے سپرد قلم کر دے۔ اس طرح تو سوانح عمری کبھی ختم ہی نہ ہو گی۔ بلکہ ضروری یہ ہے کہ صرف ان چیزوں کا ذکر کیا جائے جن کے بغیر سوانح نامکمل رہتے۔

مصنف کو انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ بعض اوقات حقیر جزئیات قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں ہیرو کے انداز کلام۔ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ اس کے اخلاق یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور سوال باقی ہے۔

کیا کسی سوانح عمری میں کوئی "شعریت" ہو سکتی ہے ؟ کیا کسی اچھی سوانح عمری کو ہم "شعر" کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کا جواب اثبات میں ہے۔ میری نظر میں شاعری کی تعریف یہ ہے کہ فطرت کے کسی منظر یا مظہر کو ایک ایسی جمیل شکل دی جائے۔ جس میں توازن و ترنم کے باعث ایک رقص کا سا عنصر شامل ہو گیا ہو۔

بعض اشخاص کی زندگی میں کوئی شے خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ شیلے کی زندگی پانی اور اس کی مختلف شکلوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ بیکنفیلڈ کی زندگی میں "پھول" ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اگر سوانح عمری میں ان چیزوں سے توازن و ترنم کا کام لیا جائے تو پھر حقیقی معنوں میں "سوانح عمری" شاعری کہلائے گی۔

مہتاب رائے ایم ایس سی

شام

شام کا وقت تھا۔ وہ حسب معمول ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ ہوا میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے نقاب کھولی اور مطالعہ میں غرق ہو گئی۔ اس کا لباس سادہ مگر قیمتی تھا ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی میں نیلم کا بروچ چمک رہا تھا۔ کانوں میں سبز رنگ کے آویزے تھے لیکن ان چیزوں سے زیادہ چمکدار اسکی آنکھیں تھیں۔ جن میں چاندنی کی شعاعیں لرز رہی تھیں۔ اس کے معطر بالوں کی سیاہی میں غم کی تاریکی ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسی وقت۔ ہر روز۔ اسی جگہ وہ آکر مطالعے میں غرق ہو جاتی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر باریک جالی کا نقاب تھا۔ نوجوان کو اس بات کا علم تھا۔

وہ قریب ہی کھڑا ہوا کسی موقعہ کا انتظار کر رہا تھا۔

یکایک پڑھتے پڑھتے ایک صفحہ اُلٹتے وقت کتاب نازنین کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ نوجوان جلدی سے آگے بڑھا۔ اور کتاب اُٹھا کر خاتون کے سامنے پیش کی۔ ایسے انداز میں جو عام تفریح گاہوں سے خاص ہے۔ اس انداز میں خوف۔ امید۔ اور ریا کی ملی ہوئی تھی۔

اس نے نہایت نرم لہجے میں موسم کے متعلق (وہ شے جو انسان کی بہت سی مصیبتوں کی ذمہ دار ہے) کچھ کہا۔ اور پھر اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے تیار ہو کر خاموش ہو گیا۔۔

نازنین نے نوجوان کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ اُس کے لباس پر گہری نظر ڈالی جس میں اُسے دوسرے نوجوانوں سے ممتاز کرنے کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ اسکے چہرے کے تمام نقوش کا جائزہ لیا۔ جس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ پھر شیریں آواز میں کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو آپ بیٹھ سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ میں پڑھتی پڑھتی تھک گئی ہوں۔ اور آپ سے میرا جی باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ روشنی بھی کم ہو چکی ہے"

نوجوان نازنین کے پاس بیٹھ گیا۔ اور پھر اس نے اس طرح گویا کانگرس کا صدر اپنا صدارتی خطبہ پڑھ رہا ہے۔ کہنا شروع کیا۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ میں نے آپ جیسی خوبصورت اور باوقار عورت آج تک نہیں دیکھی۔ کل بھی میں نے آپ کو یہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن شاید آپ کو نہ معلوم ہوا ہو کہ کوئی شخص آپ کی تیغ ابرو کا گھائل ہو چکا ہے۔"

نازنین نے برف کی طرح سرد لہجے میں جواب دیا۔ "تم جو کوئی بھی ہو۔ تمھیں اس بات کا خیال ہونا چاہیئے کہ میں ایک معزز عورت ہوں۔ میں تمھاری اس لغویت کو معاف کرتی ہوں۔ کیونکہ جس فضا میں تم نے پرورش پائی ہے اُس کا تقاضہ ہی ہے۔ کہ عورتوں کو صرف ذوق نظر کے اسباب میں سے ایک سبب گنا جائے۔ میں نے تم کو بیٹھ جانے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اگر اس رسمی دعوت کا مطلب اپنے یہ سمجھا۔ کہ میں آپ کو اپنی "تیغ ابرو" سے گھائل کرنا چاہتی ہوں تو آپ میری دعوت کو منسوخ تصور فرمائیے۔"

نوجوان نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ آپکو معلوم نہیں۔ عام تفریح گاہوں میں عام طور پر اس قسم کی عورتیں۔۔۔"

نازنین نے کہا "اس موضوع کو ترک کر دیجئے۔ آپ دیکھتے ہیں کس طرح لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ انھیں کس بات کی جلدی ہے؟ کیا یہ لوگ خوش ہیں؟"

نوجوان نے نازنین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "حقیقت میں ان لوگوں کو اس طرح دیکھنا بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ لوگ زندگی کے ڈرامے کے ایکٹر ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ہوٹل کی طرف جا رہے ہیں۔ کچھ ایسے مقامات کی طرف رواں ہیں جن کا ذکر آپ کے سامنے گستاخی کا مترادف ہے۔ مجھے اکثر خیال گذرا ہے۔ کہ ان کی زندگی کی تاریخ کن واقعات سے لبریز ہو گی۔"

نازنین نے کہا "مجھے کبھی اس قسم کا خیال نہیں گذرا۔ میرے دل میں نسوانی اشتیاق اسقدر شدت سے موجود ہیں۔ کہ خواہی نخواہی لوگوں کی زندگی کے حالات کریدنے کی کوشش کروں۔ میں تو یہاں صرف اس لئے آئی ہوں کہ دنیا کے دھڑکتے ہوئے دل سے ذرا نزدیک ہو جاؤں۔ بدقسمتی سے میں ایسی فضا میں زندگی کے دن بسر کر رہی ہوں جہاں دل کی دھڑک ایک بے معنے لفظ ہے۔ اور جہاں جذبات کا اظہار ایک غیر مہذب فعل تصور کیا جاتا ہے۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ میں نے آپ سے کیوں کلام کیا ہے مسٹر۔۔۔۔"

"نصیر احمد" نوجوان نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

نازنین مسکرائی - اس کے تبسم میں کچھ طنز کی سی جھلک تھی -
"افسوس ہے - کہ میں آپ کو اپنے نام سے مطلع نہیں کرسکتی - زنانہ رسائل کی بھرمار اور زنانہ جلسوں کی نمایش نے ناممکن کر دیا ہے - کہ کوئی روشن خیال خاتون اپنی تصویر یا اپنے نام کو پوشیدہ رکھ سکے - آپ فوراً میرا نام سن کر پہچان جائیں گے کہ میں کون ہوں - اس ہلکی سی نقاب کو میں نے اپنی شخصیت کا پردہ بنا لیا ہے - سچ یہ ہے - کہ بعض خاندان ایسے ہیں جن کے نام ان عام تفریح گاہوں کے سلسلے میں لئے جائیں - تو اسقدر رسوائی اور بدنامی ہوگی - کہ توبہ بھلی میں انہیں خاندانوں میں سے ایک خاندان کی رکن ہوں - میں نے آپ سے اس لئے باتیں شروع کی تھیں - مسٹر نظیر احمد . . . . . .
"نصیر احمد" نوجوان نے عجز کے لہجے میں ترمیم کی -
مسٹر نصیر احمد - کیونکہ میں کسی ایسے شخص سے باتیں کرنے کی متمنی تھی جس پر دولت کی نمائشی اور رسمی لطافت و تہذیب نے کوئی اثر نہ کیا ہو - جو معاشرتی تفوق کے اثرات سے بے نیاز رہا ہو - جس کے پاؤں میں طلائی زنجیریں نہ ہوں - مسٹر نصیر احمد آپ تصور کر سکتے ہیں - کہ میں کسقدر تھک گئی ہوں - میری روح - میرا دل - میرا جسم سب کچھ تھک گیا ہے - دولت - دولت - دولت - یہ لفظ دن رات میرے کانوں میں گونجتا رہتا ہے - میرے ارد گرد ایسے اشخاص کا مجمع رہتا ہے - جو ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - میں اُکتا گئی ہوں -
جواہرات - دولت - تہذیب - تمدن - الغرض میں اپنی زندگی کے ہر پہلو سے اُکتا گئی ہوں -
نوجوان نے متحیر ہو کر کہا "میرا خیال تھا - کہ دولت نہایت اچھی چیز ہے"
"ٹھیک ہے - ایک حد تک دولت کی ضرورت ہے - مگر جب انسان کے پاس لاکھوں - بلکہ کروڑوں روپے جمع ہو جائیں اُسوقت دولت کی تمام دلچسپی زائل ہو جاتی ہے - مجھے تو دولت کے مظاہر کا نہ ٹوٹنے والا تسلسل مارے ڈالتا ہے - جلسے - نمایش - دعوتیں - تھیٹر - سینما - کبھی کبھی تو لیمونیڈ کے گلاس میں محض برف کے ٹکرانے کی آواز مجھے گھائل کر دیتی ہے"
نصیر احمد دلچسپی سے ان باتوں کو سن رہا تھا - آخر بولا "میں نے شروع سے امیر آدمیوں کے حالات اخباروں میں بہت دلچسپی سے پڑھے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک قسم کی خودنمائی اور خود پسندی ہے - مگر میں ہر معاملے میں صحیح اطلاعات بہم پہنچانا پسند کرتا ہوں - اب تک میرا خیال تھا - کہ لیمونیڈ کو برف میں لگا کر پیا جاتا ہے - اور گلاس میں برف نہیں ڈالی جاتی"
نازنین ہنس پڑی -
"آپ کو معلوم ہونا چاہئے - کہ جس سوسائٹی کا میں ذکر کر رہی ہوں اُنکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے - کہ اس کے ارکین ہمیشہ رسمیات عہد کے خلاف جہاد کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں - اور ہمیشہ فیشن کے خلاف عمل کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں - آج کل ہمارا طریقہ یہ ہے کہ برف لیمونیڈ کے گلاس میں ڈال کر پیتے ہیں - یہ طریقہ در اصل ہمارا ہی نے ایجاد کیا تھا - کل کی بات ہے - کہ جب شہزادہ . . . . ہمارے مہمان ہوئے ہیں - تو ہمارے منتظمین نے مہمانوں کی پلیٹوں کے ساتھ ایک ایک انگوری رنگ کا دستانہ بھی رکھ دیا - کہ انگور کھانے کے وقت پہن لیا جائے -
نوجوان خاموش ہو گیا - پھر بولا "افسوس ہے کہ امرا کے طبقے کی یہ باتیں عام لوگوں تک نہیں پہنچتیں -
نازنین نے اپنی آنکھیں زمین پر گاڑ لیں - اور ایسا معلوم ہوا گویا کچھ کھوسی گئی ہے - تھوڑا عرصہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولی - بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے - کہ مجھے صرف ایسے شخص سے محبت ہو سکتی ہے - جو طبقۂ امرا میں سے نہ ہو - جو ادنیٰ کام کر سکتا ہو - اور اپنی زندگی کو عیش و عشرت ہی میں نہ گذارے - لیکن ظاہر ہے - کہ میری دولت اور میرے حسب و نسب کی تمام روایات ان خیالات کو مغلوب کریں گی - اور آخر کار مجھے کسی اور گھرانے میں شادی کرنی پڑے گی - آج کل دو حضرات مجھ سے شادی کرنے کے درپے ہیں - ایک تو ریاست کے فرماں روا ہیں - ان کے متعلق مشہور ہے - کہ ان کی پہلی بیوی ظلم و ستم اٹھا اٹھا کر اپنی زندگی کے باقیماندہ ایام کو پاگل خانے میں بسر کر رہی ہے - دوسرے خان بہادر . . . . ہیں - ان کا انداز اور لہجہ غرور سے اس قدر بھرا ہوا ہوتا ہے - کہ میں شیطان کو ان سے بہتر خیال کرتی ہوں - . . . . کیا بات ہے - کہ میں آپ کو یہ باتیں سنا رہی ہوں؟ - مسٹر نصیر احمد"
نصیر احمد نوجوان نے آہستہ سے کہا -
"آپ تصور نہیں کرسکتیں - کہ میں آپ کی گفتگو سے کس قدر متاثر ہو رہا ہوں"
نازنین نے نوجوان کی طرف پھر غور سے دیکھا -
"آپ کیا کرتے ہیں مسٹر نصیر احمد"؟
"میں ایک نہایت معمولی سا کام کرتا ہوں - مگر مجھے ترقی کی امید ہے"

پھر مسترحمانہ انداز میں پوچھنے لگا۔ کیا سچ مچ آپ کسی غریب آدمی سے محبت کرنا چاہتی ہیں؟

نازنین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ہاں کبھی کبھی ایسا خیال آتا ہے۔ لیکن آپ نے بتایا نہیں۔ کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

نصیر احمد نے جواب دیا۔ میں تھیٹر میں ملازم ہوں۔

نازنین نے چونک کر پوچھا۔ تھیٹر میں۔ اس میں شک نہیں کہ غربت کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر نقالی۔ بہروپ بھرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نصیر احمد نے کہا "ہاں میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہوں۔ اور روز جذبات کی نقالی کرتا ہوں"

نازنین نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

نصیر احمد نے پوچھا "کیا میں پھر کبھی آپ سے ملنے کی امید رکھ سکتا ہوں؟

"ممکن ہو سکتا ہے کہ میں پھر یہاں آؤں۔ اب مجھے جلدی جانا چاہیئے کیونکہ ہمارے ہاں نواب سکندر نواز جنگ کا شام کا کھانا ہے۔ میں آپکو الزام نہیں دینا چاہتی۔ مگر شاید آپ کو معلوم ہو کہ بعض اوقات موٹروں کے نام سے مالک کے نام کا پتہ چل سکتا ہے۔ اچھا تو شب بخیر۔

نصیر احمد نے کہا "ذرا سنیئے تو۔ اندھیرا ہو چکا ہے۔ اور باغ تقریباً تقریباً خالی ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نازنین نے زوردار لہجے میں کہا "اگر آپ کو میری ذرہ برابر پروا ہے تو میرے جانے کے دس منٹ بعد تک یہاں سے حرکت نہ کیجئے۔ اچھا شب بخیر"

یہ کہہ کر وہ ایک غزال رعنا کی طرح بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ نوجوان کچھ عرصہ وہاں بیٹھا رہا۔ جب نازنین مال روڈ پر پہنچ گئی تو وہ تیزی سے لپکتا ہوا پیچھے چل پڑا۔ تمام مال روڈ طے کرنے کے بعد وہ انارکلی کی طرف چل دی۔ نوجوان بھی تعاقب کرتا رہا۔ آخرکار وہ دونوں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے پاس پہنچ گئے۔ تھیٹر کی عمارت بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ نازنین تیزی سے تھیٹر کی طرف لپکی۔ نوجوان بھی سائے کی طرح ساتھ تھا تھیٹر کے دروازے کے قریب ایک آدمی جو وضع قطع سے ایکٹر معلوم ہوتا تھا۔ نازنین کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگا۔ اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ نسیم تم کہاں چلی گئی تھیں۔ تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام لوگ ہاپوں ہو چکے ہیں۔ تمہیں یاد نہیں رہا تھا۔ کہ آج کھیل جلدی شروع ہو گا۔ چلو جلدی کرو کپڑے بدلو تمہارے پارٹ کا وقت قریب ہے"

نوجوان مسکراتا ہوا واپس مڑا۔ لارنس گارڈنز کے پاس پہنچ کر۔ وہ ایک موٹر کی طرف چل دیا۔ شوفر نے اُسے آتے دیکھ کر پھرتی سے سلام کر کے موٹر کا دروازہ کھولا۔ اور نوجوان موٹر میں بیٹھ گیا۔

موٹر روانہ ہو گئی موٹر کی پیچھے کی پلیٹ پر ریاست فرید آباد لکھا ہوا تھا +

عابد

رباعیات

غافل یہ نشاطِ زندگانی کب تک
ہنگامۂ کیفِ نوجوانی کب تک
اس شورشِ بیجا کی کوئی حد بھی ہے
آخر کب تک یہ لن ترانی کب تک

عرش ملسیانی

نیرنگی قدرت کے تماشے دیکھے
کیا کیا تری صنعت کے تماشے دیکھے
اک شکل کی لاکھوں میں نہیں دو شکلیں
کثرت میں بھی وحدت کے تماشے دیکھے

عرش ملسیانی

تمدنِ یونان کا ایک اہم باب

علم و ادب کا ایک عظیم الشان مرکز اسکندریہ کا مدرسہ

یونان نے پہلے زمانے میں تہذیب و تمدن کی جو زبردست خدمات انجام دیں اور اپنے اہم اثرات سے مشرق و مغرب میں انسانی مرتبہ کو جس بلند مرکز پر پہنچایا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم میں سے بہت سے اشخاص ناواقف ہیں اگرچہ ہمارے زمانے میں سو میں سے دس آدمی بھی ایسے نہیں ہوں گے جو یونانیوں کی حقیقی تہذیبی خدمات سے واقف ہوں کہ قدیم ایران کا تمدن۔ بابل کی تہذیب حتیٰ کہ قدیم مصریوں اور فینیقیوں کا عروج یونانی تہذیب و تمدن کے آفتاب کے مقابلے میں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونان نے مشرق سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ لیکن اس کے تمدن کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک رائی جیسی ہے۔ جسکو اس نے اپنی حکمت آموزی سے پہاڑ بنا دیا۔ اس نے ہمارے خرمن سے ایک دانہ اٹھایا اور اس سے ڈھیر جمع کر لیا۔ لیکن ہم مشرقیوں نے علم و دولت کے خزانے برباد کر دئے۔ ہمارے پاس ایک ڈھیر تھا۔ لیکن اب ایک دانہ بھی نہیں ہے۔

یونانیوں نے اپنی تہذیب کو اتنے کمال کے مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ آج ہم یورپ کی جدید تہذیب سے اسکا مقابلہ کرتے ہیں تو اکثر امور میں دونوں کو یکساں پاتے ہیں۔

یونان کی تاریخ ذہن کے بڑے بڑے عالموں۔ حکیموں۔ فلسفیوں اور قانون دانوں کے حالات سے بھری پڑی ہے۔ جنکی دماغی بلند پروازیاں اور حکیمانہ نظریے ابتک دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ اور جن کا نام ابتک پیغمبروں اور ریفارمروں کی طرح صفحۂ دنیا پر ثبت ہے۔

یونان قدیم کے ترقی یافتہ حالات کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہشت کا ایک خطہ تھا۔

یونانی تمدن کے تمام گوشوں کو بے نقاب کرنا ایک ایسا وسیع موضوع ہے جسپر کافی وقت، کافی دماغ اور مستقل کاوش کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف مدرسہ اسکندریہ کے متعلق بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس موضوع سے بھی یونانی تمدن پر کافی روشنی پڑیگی۔

سکندر مقدونی تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے اپنے والد کے بلند پایہ خیالات کو انجام تک پہنچانیکا عزم صمیم کیا۔ اور ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ جسمیں چونتیس ہزار پیادے اور چار ہزار سوار تھے ۳۳۴ قبل مسیح میں ایشیا پر قابض ہو گیا۔ اس نے ایشیا کا رخ کیا تو اس کے خزانے میں صرف اسّی "ٹالنٹ" (ایک قدیم یونانی سکہ) سے زیادہ موجود نہ تھا۔

یونانیوں نے ان لوگوں میں مشرقی دنیا کے عجائب کی سیر کی اس کے تاریخی آثار کو غور سے دیکھا۔ دریائے ڈنیوب سے لیکر دریائے نیل تک اور دریائے نیل سے دریائے سندھ تک ایک علمی نظر ڈالی۔ مختلف اقوام کی خصوصیات اور مشرق کے مختلف رسوم و عادات کو دیکھا۔ اور صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ جس خرمن کو دیکھا اس سے خوشہ چینی کی۔ مصر میں اہرام دیکھے جو ان سے بیس صدی پہلے بن چکے تھے۔ قصر کے ستون دیکھے جنپر عجیب و غریب نقش و نگار کئے ہوئے تھے۔ وہ نہایت مخفی راستوں سے "ابوالہول" کی ان گپھاؤں تک پہنچے جو موجودہ ترقی یافتہ نسل کے لئے بھی معمہ بنی ہوئی ہیں۔ انہوں نے فراعنہ مصر کے مجسمے اور سنگی پیکر دیکھے۔ جن کی شوکت حکمرانی کا پرچم مغربی دنیا کے بڑے حصے پر لہرایا کرتا تھا۔

انہوں نے اپنی فوجوں کو وہاں لیجا کر کھڑا کیا جہاں قدیم آشوریوں نے سلطنت کی تھی۔

انہوں نے بابل کے کھنڈروں میں جاکر اس تاریخی دیوار کا معائنہ کیا جو کسی وقت پندرہ میل لمبی تھی۔

وہ بابل کی سرزمین میں "بعل" کے بلند معبد پر پہنچے اور اس کی بلندیوں پر وہ رسدگاہ دیکھی جس میں بیٹھکر کلدانی ہئیت داں ستاروں کا نظارہ کیا کرتے تھے۔

انہوں نے اسی سرزمین میں معلق (ہوائی) باغ دیکھے۔ جنکے درخت فضائے آسمانی میں اُگے ہوئے تھے۔

کلدانی اور آشوری عجائبات دیکھنے کے بعد انہوں نے قدیم ایرانی

عمارتیں ۔ تاریخی محلات ۔ تخت جمشید کو دیکھا ۔ اور اکتابان کا جو بادشاہان ایران کا دار الحکومت تھا نہایت دلچسپی سے معائنہ کیا ۔ اس شہر کے گرد سات رنگین حصار تھے ۔ بادشاہی محلات چاندی اور سونے کی اینٹوں سے بنائے گئے تھے شہر کے درمیان میں ایک باغ تھا جو شہر کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کو دوبالا کر رہا تھا ۔

غرضیکہ انہوں نے درۂ دانیال سے لیکر (جسکو زمانۂ قدیم میں "ہلیسپونٹ" کہتے تھے) دریائے سندھ تک کے تمام بہشتی خطے کی سیر کی اور اس جہاں نوردی اور عجائب عالم کے مشاہدات کے دوران میں اس قدر اہم معلومات فراہم کرلیں کہ ان کے دل حقائق اور علوم و فنون کی تخم ریزی سے سرسبز ہو گئے اور ان میں واقفیت اور معنویت کے شاداب پودے لہلہانے لگے ۔ ان معلومات نے ان کے دماغ میں علمی کاوش ۔ تاریخی معلومات اور ہر چیز کی تحقیق کا شوق بھر دیا ۔ حقیقت یہ ہے انکی جنگی سرگرمیوں اور ایشیا پر انکے حملوں نے اُن پر علم و حکمت کے دروازے کھول دئے ۔ اور کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرنے پایا تھا کہ اُفق یونان پر دانش و بینش کا ایک آفتاب عالمتاب طلوع ہو گیا ۔ جس نے اپنی نورانی کرنوں سے تمام عالم کو منور کر دیا ۔

سکندر کی فوج کشی کے علمی نتائج اسقدر اہم ہیں کہ "تاریخ مقابلۂ علم و مذہب" کا مشہور امریکن مصنف ڈراپر اپنے ایک مقالے میں لکھتا ہے ۔

"یہ امر مسلمہ ہے کہ آج ہم تمام علوم میں اسکندر کی فوج کے ممنون ہیں" ۔ کیونکہ اس کی فوج کشی کے وقت علماء فضلا اور فلاسفروں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے ساتھ تھی ۔ جو اپنی فطری ذکاوت طبعی تحقیق اور ذہنی کاوش کی وجہ سے اپنے سفر میں برابر علمی تحقیقات میں لگی رہی ۔

چنانچہ کالس تھنس نے جو اسکندریہ کا مشہور اور خاص مورخ تھا دوران سفر میں بابل سے بہت سے کلدانی جدول ۔ نقش اور اثری اشیاء وغیرہ نکالیں اور اُس نے اُن اینٹوں کو جن پر تاریخی نقش و نگار تھا ارسطو کے پاس بھیجدیا ۔

انہیں سے ایک نقشہ بطلیموس کے ہاتھ لگا ۔ جو پہلے ہی سے چاند گرہن اور سورج گرہن کا پتہ دیا کرتا تھا ۔ موجودہ زمانے میں بھی اس جدول سے علم نجوم کی بعض معلومات کے حاصل کرنے میں بہت کام لیا گیا ہے ۔

اسکندر رومی نے عین عالم جوانی میں ۳۲۳ قبل مسیح میں انتقال کیا تو اپنی فتوحات کے نتیجے میں علمی تحقیقات کے لئے بہت کچھ کر چکا تھا ۔ اس کا بھائی بطلیموس جب مصر کی حکومت کا مالک ہوا تو اس نے اسکندریہ کو جسکی بنیاد اسکندر نے ڈالی تھی اپنا پایۂ تخت بنایا ۔ اور اسکندریہ دنیا کا ایک بہت بڑا شہر بن گیا ۔ اس کی بلند عمارتوں عظیم الشان عبادتگاہوں اور بڑے بڑے تماشہ گاہوں کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور پھیل گئی بطلیموس نے ایک بہت بڑے عجائب خانہ کی بنا ڈالی اور اس کے بعد اس کے لڑکے نے اسے مکمل کیا ۔

یہ عجائب خانہ اسکندریہ کے سب سے بڑے محلے "برجیوم" میں شاہی محلات کے قریب بنایا گیا تھا ۔ اس کے اردگرد ایک وسیع گیلری بنائی گئی تھی جس میں علما و فضلا علمی بحث مباحثے کیا کرتے تھے ۔

اس عجائب خانے کا حصہ تصاویر مجسموں اور مختلف تاریخی نقشوں سے مزین تھا ۔ فلاڈلفیا کا کتبخانہ بھی اس کے ایک حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا جس میں چار لاکھ کتابیں تھیں ۔ لیکن ایک عرصہ بعد نئی نئی تصنیفات کے لئے اس کتبخانے میں گنجائش نہیں رہی تو شہر کے دوسرے حصے میں جو راکوٹس کے نام سے مشہور تھا ایک نیا کتبخانہ قائم کیا گیا ۔ جس میں چند ہی دن میں تین لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں گویا اس کتبخانے کی کتابوں کی تعداد آٹھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ۔

اسکندریہ اسی طرح آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا ۔ یہانتک کہ تمام دنیا میں علم و تحقیق کا سب سے بڑا مرکز ہو گیا ۔ اور اس کی ترقیوں نے اُسے مشرق و مغرب کی علمی رقابت کا ایک عظیم الشان دنگل بنا دیا ۔

عہد قدیم میں اسکندریہ کی علمی و عملی سرگرمیوں کو دیکھکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس زمانے کا پیرس تھا ۔ مصر کے یونانی نژاد بادشاہوں کے سامنے اس عظیم الشان عجائب خانے کے قیام کے تین مقصد تھے ۔

پہلا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے اس وقت کی علمی سرگرمیوں کے نتائج محفوظ ہو جائیں اس مقصد کے حصول کے لئے کتبخانے کے منتظم کو پورا اختیار تھا ۔ کہ حکومت کے خرچ سے جہانتک ممکن ہو کتابیں خریدے اور کوئی کتاب خواہ کسی جگہ شائع ہو اسکو کتبخانے کے لئے حاصل کرے ۔

کتبخانے میں بہترین اور منتخب کاتب مقرر تھے جو ایسی کتابوں کو کتبخانے کیلئے لکھتے تھے جن کے مالک اُن کو بیچنے کیلئے تیار نہ ہوتے تھے ۔ کتابت میں جسقدر روپیہ خرچ ہوتا تھا ۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بطلیموس نے یونان کے صرف تین شعراء اوری پیڈس ۔ سیفوکلیس ۔ ایشلیوس کی تصانیف کے لئے ایک لاکھ پچاس ہزار تومان دئے تھے ۔

اس کے علاوہ اس زمانے کی بہترین تصانیف کے ترجمے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا ۔ چنانچہ ۲۸۵ قبل مسیح میں توریت کا ترجمہ کیا گیا ۔ اس ترجمہ کا نام یونانی میں "سپتواجلیتا" یعنی توریت سبعہ" ہے ۔

اس عجائب خانے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ علم و ادب کو وسعت دیجائے چنانچہ سرکاری تنخواہوں پر بہت بڑے بڑے علما و فضلا مقرر کئے گئے جو علمی تحقیقات میں مصروف رہتے تھے ۔ یہ علما اس قدر وقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے

کبھی کبھی بادشاہ خود ان سے ملنے آتا تھا۔

اس عجائب خانے کے ماتحت ریاضی۔ نجوم۔ طب۔ ادبیات کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ ہر فن کے لئے علیحدہ علیحدہ مدرسے قایم کئے گئے تھے۔ ان فنون کے علاوہ دوسرے فنون کی تعلیم بھی دیجاتی تھی۔ عجائب خانے کا ناظم اعلیٰ کوئی بڑا فوجی افسر ہوا کرتا تھا۔ سب سے پہلے اس عہدے پر جس شخص کو مقرر کیا گیا وہ ڈیمٹریوس فلاورس نامی شخص تھا۔

یہ شخص اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا اور یونان کے دارالسلطنت شہر ایتھنز میں حکومت کرچکا تھا۔ توریت کا ترجمہ اسی کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔

دوسرا منصب لائبریرین کا ہوتا تھا۔ اور اس کا انتخاب بھی ماہر علماء میں سے ہوتا تھا۔ جن لوگوں کا اس عہدہ پر تقرر ہوا انمیں سے ایراٹوستھنس بلونیوس سب سے مشہور ہیں۔

اس عجائب خانے کے سلسلے میں دو باغ بھی تھے جن میں سے ایک باغ حیوانات کیلئے اور دوسرا جڑی بوٹیوں اور پودوں کے لئے خاص تھا۔ ان دونوں باغوں میں بڑے بڑے علما اور علم حیوانات و نباتات کے مشہور ماہر اپنے تحقیقات میں مشغول رہتے تھے۔

اسی سلسلے میں ایک رصدخانہ بھی تھا جس میں علم نجوم کے متعلق عام آلات کرہ ہائے جغرافیائی اور نجومی نقوش وغیرہ موجود تھے۔

کیمیائی اور طبی تحقیقات کے لئے علیحدہ علیحدہ تجربہ گاہیں تھیں جہاں ماہرین فن طب اپنے تجربات اور نعشوں کی چیر پھاڑ کیا کرتے تھے۔

تیسرا مقصد اس عظیم الشان عجائب خانے کے قیام کا یہ تھا کہ نئی علمی تحقیقات کو شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے سوسائٹیاں اور علمی مجلسیں مقرر کیگئی تھیں جن میں علماء، حکماء اور فلاسفر اپنی اپنی تحقیقات پر لیکچر دیا کرتے تھے۔

ان لیکچروں کو سننے اور ان کی علمی تحقیقات سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے دور دراز ملکوں سے علم کے پیاسے جمع ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک وقت اس قسم کے شوقین طلبا کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اسکندریہ کے دارالعلوم میں سب سے پہلے ارسطو کے فلسفہ کی طرف توجہ کی گئی اور علما نے اس کی وجہ سے تحقیقات میں ایک نیا راستہ پیدا کرلیا اور اس کے ذریعے بڑے بڑے نتائج حاصل کئے۔

چنانچہ ثقل کے متعلق ارشمیدس کی تحقیقات اور علم مناظر میں بطلیموس کی تحریریں ہمارے زمانے کے علما کی تحقیقات کے بالکل موافق ہیں۔

یونانیوں نے اس زمانے میں جو کتابیں تصنیف کیں وہ صدیاں گذرجانے کے بعد آج بھی مستند سمجھی جاتی ہیں۔

ڈراپر لکھتا ہے کہ

"اقلیدس (کتاب) کو تصنیف ہوئے ۲۲ صدیاں گذرچکیں لیکن اس وقت تک اس کی تحقیق کی صداقت اور صحت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ارشمیدس کی تحقیقات ریاضی۔ مناظرہ وغیرہ میں بہت وسیع تھیں۔ اقلیدس کے علاوہ بھی اس کی کئی کتابیں ایسی ہیں جو تحقیق کی دنیا میں بہت اہم تسلیم کی گئی ہیں۔ ریاضی میں حکیم ارشمیدس کو جو بلند مرتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ اُس امریکن فلاسفر کے قول سے ہوسکتا ہے جس نے کہا ہے۔

کہ یورپ ارشمیدس کے مرنیکے دو ہزار سال بعد تک بھی ریاضی میں ایسا شخص پیدا نہیں کرسکا جو اس کا مقابلہ کرسکے۔

ارشمیدس نے علم اوزان اور علم جرثقیل کے متعلق جو نظریے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے ان سے ابتک یورپ فائدہ حاصل کررہا ہے۔

اس زمانے کے مشہور علماء میں سے دوسرا شخص اراٹوستاس تھا یہ شخص کتبخانے کا منتظم اعلیٰ بھی رہ چکا تھا۔ اسکی تصنیف "کرۂ زمین" کے اندازے کے متعلق خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اسکے علاوہ بطلیموس۔ اپالونیوس۔ ارسٹالیس ہیموخارس وغیرہ نے علم نجوم کو جسقدر ترقی دی وہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ عہد قدیم کی یونانی علمی تحقیقات کو دیکھکر اسکا یقین ہوجاتا ہے کہ یورپ کی موجودہ علمی ترقیوں کا عظیم الشان قصر یونانی نظریوں کی بنیاد پر قایم ہے

(ماخوذ از کاوہ۔ برلن)

حامد الانصاری

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں گردوں کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
انہیں یورپ میں ہم دیکھیں تو دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روز سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

علامہ اقبال

ناتجربہ کار بھوت

In experienced ghost
H. G. Wells

ابتک میں وہ کمرہ دیکھ سکتا ہوں۔ بھائی لطیف نے اپنی آخری کہانی سنائی تھی۔ میری چشم تخیل کے سامنے اُس دن کے واقعات پھرتے ہیں تو میرا بدن کانپنے لگتا ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہے۔ وہ کونے میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی رشید سگرٹ پینے میں مصروف تھا۔ احمد حسن سنیما کا مشہور ایکٹر آتشدان کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مشتاق دروازے کی طرف منہ کئے ہوئے کھڑا تھا جب لطیف نے اپنی کہانی شروع کی تو ہمارا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ممکن ہے ہمارا خیال ٹھیک ہو۔ بہت جلد قارئین کرام کو بھی اس کا اندازہ قائم کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کل میں نے ایک بھوت کو پکڑا تھا"

رشید نے پوچھا "تو وہ بھوت کہاں ہے؟"

اور احمد حسن نے کہا "سچ مچ۔ اچھا لطیف کہانی مزے دار معلوم ہوتی ہے شروع سے سناؤ۔"

لطیف نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور معذرت خواہی کے لہجے میں کہا "میں نہیں چاہتا کہ نوکر چاکر بھوت اور روح کے افسانے بیان کر کے ہمارا یہاں رہنا حرام کر دیں۔ اور کسی نوکر کو ہمارے مکان میں آنے کی جرأت نہ ہو۔ اور علاوہ ازیں میرے والا بھوت کوئی ٹھیک مستقل بھوت نہ تھا میرا خیال ہے کہ وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔

رشید بولا "تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ تم نے اس کو پکڑ کر پھر چھوڑ دیا۔"

لطیف نے کہا "میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسی ناتجربہ کار اور بے بس روح کو گرفتار کر لوں۔"

احمد حسن نے کہا عجب بات ہے۔ تم اور روح پر رحم کرو"

ہم تمام ہنسنے لگے۔ اور لطیف کو اس بات کا رنج ہوا۔

پھر وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ جس شے کو میں نے دیکھا تھا۔ وہ حقیقت میں ایک بھوت ہی تھا۔

رشید نے سگرٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ اس کی خاموشی از حد درجہ معنی خیز تھی۔

لطیف نے اس چھپے ہوئے طنز کی کوئی پرواہ نہ کی

اس نے کہا "یہ واقعہ میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ ہے تمھیں معلوم ہے ناکہ مجھے بھوتوں اور روحوں پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ میں ان کے وجود کا قطعاً منکر تھا۔ اور اب یہ حالت ہے۔ کہ میرا سابقہ ایک روح سے پڑ چکا ہے۔ اور میں روحوں کے تمام رموز سے واقف ہو چکا ہوں۔

لطیف نے نہایت اطمینان سے ایک سگرٹ جلایا اور خاموش ہو گیا۔

مشتاق نے پوچھا "تم نے اس سے باتیں بھی کی تھیں؟

" ایک گھنٹے سے زائد میں اس سے باتیں کرنے میں مصروف رہا تھا۔"

میں نے متشککین کے گروہ میں شامل ہوتے ہوئے کہا "بڑا بکواسی بھوت معلوم ہوتا ہے۔"

لطیف بولا "غریب بہت تکلیف میں تھا" اور اپنے سگرٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کسی ایک نے پوچھا " رو رہا تھا؟"

لطیف نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ہاں۔ ہاں۔ رو رہا تھا غریب۔ رو رہا تھا۔

احمد حسن نے کہا "تم نے اُس پر حملہ بھی کیا تھا؟"

لطیف نے جواب دیا "مجھے معلوم نہ تھا کہ غریب بھوت اس قسم کی بے بس چیز ہوتی ہے۔ اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

پھر بولا " جسم کے فنا ہو جانے کے بعد انسان کا کردار نہیں بدلتا۔ کردار کا تعلق براہ راست روح سے ہے۔ اور موت کے بعد بھی بھوت اپنے کردار کو نہیں بدل سکتے۔ لیکن ہم اکثر اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کے ارادے مستقل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی طبیعت میں کسی خاص مقصد کا خیال جاگزیں ہوتا ہے۔ اُن لوگوں کی روح میں بھی یہی صفات پائی جاتی ہیں۔ جو بھوت میں نے دیکھا ہے وہ غریب تو بہت شکی اور وہمی مزاج کا تھا۔ اس میں استقلال تو بالکل مفقود تھا۔ پہلی ہی نظر میں میں نے جانچ لیا کہ وہ ایسا کمزور طبیعت کا ہے۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

" میں یہ بات طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرا صحیح اندازہ یہی ہے۔ کہ اس کے کردار میں بہت سی کمزوریاں موجود تھیں۔

بات یہ ہے۔ کہ میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ کہ میں نے پہلے پہل اُسکی پیٹھ دیکھی۔ اور مجھے فوراً معلوم ہو گیا۔ کہ وہ بھوت ہے۔ اس کا رنگ سفید تھا

اور وہ تمام تر شفاف تھا۔ میں اُس کی چھاتی کے آر پار دور کھڑکی میں سے روشنی دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ صرف اس کا بدن بلکہ اس کا انداز بھی کمزوری سے مملو نظر آتا تھا۔ گویا وہ کچھ کھویا ہوا سا ہے۔ گویا اُسے معلوم نہیں کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے"۔

مشتاق نے پوچھا "اسکی ہیئت کس قسم کی تھی؟"

لطیف نے کہا "وہ دُبلا پتلا بھوت تھا۔ اُس کے کان نیلے تھے۔ اور چہرے کے نقوش سے بھی کمزوری کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھ کر میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن مجھے خوف کا احساس بالکل نہیں ہوا۔ صرف تحیر کا احساس ہوا۔ اور کچھ دلچسپی بھی ہوئی میں نے اپنے دل میں کہا خدایا آخر میں نے بھوت بھی دیکھ ہی لیا۔ حالانکہ پچھلے چند سالوں سے مجھے ایسی باتوں پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔

"ٹھیک" رشید نے کہا۔

بھوت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ بلند کئے۔ اور بھوتوں کی طرح مجھے ڈرانے کی غرض سے آگے بڑھا۔ ساتھ ہی اس نے نحیف سی آواز میں "ہو۔ ہو" بھی کہا۔ لیکن اس آواز میں ڈرنے کی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے کہا یہ ہُو۔ ہُو کیا کر رہے ہو۔ فضول بکواس۔ تمھیں معلوم ہے نا۔ کہ تمھیں اس جگہ پھرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈر گیا ہے۔ مگر اس نے صرف یہی کہا "ہو۔ ہو۔ ہو ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو پر ہزار لعنت"

اور میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا۔ کہ میں اُس سے بالکل نہیں ڈرتا۔ اس کے جسم کے ایک حصے میں سے گذر کر میں نے لیمپ جلایا آخر کار میرے پیہم اصرار پر بھوت نے کہا۔ ہاں مجھے اس جگہ پھرنے کا کوئی حق نہیں میں بھوت ہوں"۔

تو اس کے یہ معنے تو نہیں کہ تم میرے مکان میں گھوما کرو۔ کیا تم کسی شے کی تلاش میں ہو۔ آخر کیا بات ہے؟"

بھوت نے کہا "میں نے اس مکان کو اپنا مسکن بنا لیا ہے"

میں نے کہا "کیا تمھیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ کسی کے مکان کو بھوتوں کا مسکن بنا لو؟"

اس نے اپنی بات کی تائید میں کہا "لیکن میں تو بھوت ہوں نا"

"یہ ٹھیک ہے۔ مگر کسی بھوت کو یہ حق نہیں کہ میرے مکان میں آکر ٹھتیا پا کرے۔ یہاں عورتیں بھی رہتی ہیں۔ بچے بھی رہتے ہیں۔ فرض کیا تمھیں کوئی بچہ دیکھ پائے۔ اس غریب کا تو خوف کے مارے دم نکل جائے گا یہ بات بھی سوچی تم نے؟

بھوت نے عاجزی کے لہجے میں کہا "نہیں جناب یہ بات تو نہیں سوچی میں نے"

"تمھیں اس بات کا خیال کرنا چاہیئے تھا۔ تمھیں اس مکان پر کوئی حق نہیں ہے نا۔ تم اس مکان میں قتل تو نہیں کئے گئے تھے؟

"نہیں جناب میں نے سوچا تھا کہ مکان صدیوں کا پرانا ہے۔ اور ایسے مکان میں اکثر بھوت رہتے ہیں"

میں نے زور دار لہجے میں کہا۔ یہ کوئی قابل قبول عذر نہیں ہے۔ تم نے یہاں آنے میں بہت غلطی کی۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب مناسب ہے۔ کہ تم فوراً غائب ہو جاؤ"

وہ کچھ پریشان سا نظر آتا تھا۔ اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

جناب عالی بات یہ ہے!

میں نے بلند آواز میں کہا "بس بات وات کوئی نہیں۔ غائب ہو جاؤ!

جناب عالی! بات یہ ہے کہ میں غائب نہیں ہو سکتا"

"غائب نہیں ہو سکتے یہ کیا بات ہے؟"

دراصل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں نے کوئی چیز فراموش کردی ہے۔ کل آدھی رات سے میں یہیں چکر لگا رہا ہوں۔ کبھی کہیں چھپ رہتا ہوں کبھی کہیں۔ مجھے غائب ہونے کا طریقہ بھول گیا ہے"

اس کی یہ بات سن کر مجھے تعجب بھی ہوا۔ اور اس کی حالت پر رحم بھی آیا۔

میں نے کہا "یہ تو بہت عجیب بات ہے۔ اچھا آؤ میرے سونے کے کمرے میں چلو۔ وہاں تفصیل سے باتیں کریں گے۔ کمرے میں پہنچ کر میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور اُسے آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

پھر میں نے کہا اچھا اب اپنی داستان سناؤ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمھاری حالت رحم کے قابل ہے۔

اب ہم نے باتیں شروع کیں۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک معمولی اُستاد تھا۔ اور گیس کے ایک حادثے میں اس کی موت بھی واقع ہوئی تھی۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ والدین نے اس کی مناسب تربیت نہیں کی۔ یوں بھی دنیا کی طرف سے شاکی نظر آتا تھا۔ کہتا تھا کہ ساری عمر میں اُسے کوئی بھی مخلص دوست نصیب نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ امتحانوں میں فیل ہوتا رہا تھا۔

"میں نے پوچھا "اب تمھاری کیا حالت ہے؟

اس نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ بہر نوع اسکی باتوں سے یہ اندازہ

ہوتا تھا - کہ وہ ایک مبہم اور تاریک سی دنیا میں رہتا ہے - جو اُن روحوں کا مسکن ہے - جو نہ تو بدی کی گہرائیوں میں غرق ہوئی ہیں - اور نہ سراسر نیک رہی ہیں -

ایسا معلوم ہوتا تھا - گویا اُسے اس بھوتوں کی دنیا میں بھی اپنی طرح کے کمزور طبیعت آدمی مل گئے تھے - اور انہی کے ساتھ مل جُل کے وہ اپنا وقت گذار رہا تھا -

احمد حسن نے آگ کی طرف مخاطب ہوکر کہا "خوب رہی"

لطیف نے کہا "یہ اثرات تھے جو اس کی گفتگو نے مجموعی حیثیت سے میرے دل پر مرتب کئے - اس وقت میری قوت فیصلہ اور اصابت رائے کسی حد تک ضرور کمزور ہو گی - کیونکہ اس قسم کا واقعہ مجھے پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا - مگر میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں - کہ جو واقعات میں نے بیان کئے ہیں انہیں جھوٹ کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہے - اُس کے دوستوں نے اسے بتایا تھا - کہ کسی مکان کو اپنا مسکن بنا لینا بہت خوشگوار مشغلہ ہے لیکن اسکے خیال میں اُسے اس تجربے میں بہت ناکامی ہوئی تھی - اُس نے میرے ہمدردانہ رویئے کا شکریہ ادا کیا"

مجھے تم لوگ وحشی کہتے ہو لیکن اس کی حالت دیکھ کر پتھر کا دل بھی پسیج جاتا - میں نے اُس کو ڈھارس دی - اس کا حوصلہ بڑھایا اور کہا -

"کوئی فکر کی بات نہیں - تم ذرا تن کر سیدھے ہو جاؤ - اور غائب ہونے کی کوشش کرو"

میری باتیں سُنکر اُس نے غائب ہونے کی کوشش شروع کر دی -

مشتاق نے پوچھا "کوشش کس طرح؟"

"ہاتھوں کی حرکت سے"

"ہاتھوں کی حرکت سے؟"

"ہاں! اس نے اپنے ہاتھوں کو ادھر اُدھر ہلانا شروع کر دیا - وہ کہتا تھا کہ چند خاص حرکتیں ایسی ہیں - کہ اُن کا نتیجہ غائب ہو جانے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے - اور چند خاص حرکتیں اس قسم کی ہیں - کہ اُن کے بعد بھوت بھوتوں کی دنیا سے عالم اسباب میں آجاتا ہے - تھوڑے عرصہ کے بعد وہ اپنے ہاتھوں کو مناسب طریقے سے ہلانے میں کامیاب ہو گیا - اور یکدم میری نظروں سے غائب ہو گیا"

احمد حسین نے آہستہ سے پوچھا "کیا تمہیں وہ حرکتیں یاد ہیں؟"

لطیف نے کہا "بخوبی اور تمام و کمال"

میری آنکھوں کے آگے وہ منظر پھر رہا ہے - رات کا وقت - خاموش کمرے میں ایک موم بتی کی روشنی - تاریکی کو اور گہرا کر رہی ہے - ایک بھوت جس کا بدن سفید اور شفاف ہے - ہاتھوں سے اشارے کر رہا ہے اور میں چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہوں - وہ اشارے کرتے کرتے تھک گیا آخر کار کہنے لگا "میں تھک گیا ہوں - میرا خیال ہے - کہ میں کبھی کامیاب نہ ہوں گا"

آخر میں نے اُس سے کہا - کہ وہ مجھے اُن تمام اشاروں اور حرکات کا راز بتائے - تاکہ میں خود آزما کے اس کی مدد کر سکوں - چنانچہ اُس نے مجھے حرکات کی تعداد اور نوعیت سے اطلاع دی - تھوڑے عرصے کے بعد سوائے آخری حرکت کے باقی تمام حرکتیں میں نے دہرائیں وہ خود بھی دیکھا کیا - پھر ہمت کر کے اپنے ہاتھوں کو ادھر اُدھر ہلا رہا تھا - یکا یک وہ غائب ہو گیا - لیکن میں نے اُس کی آخری حرکت بخوبی دیکھ لی -

اب کمرہ خالی تھا - ایک موم بتی جل رہی تھی - ہوا کی سرسراہٹ سے خوف معلوم ہوتا تھا - اور میں اکیلا تھا -

یہ سارا قصہ ہے"

ہم نے پوچھا "اور پھر تم سو گئے؟"

"اور کیا کرتا"

میں نے مشتاق سے آنکھیں چار کیں - میرا جی چاہتا تھا - کہ میں لطیف کا مذاق اُڑاؤں لیکن لطیف کے انداز بیان اور اُس کی باتوں میں کوئی اس قسم کی خاص چیز پوشیدہ تھی کہ میں جرأت نہ کر سکتا تھا -

احمد حسن نے کہا "اور وہ ہاتھوں کے اشارے"

"مجھے بخوبی یاد ہیں - اور میں اُن کو دُہرا سکتا ہوں"

"تو کر کے دکھاؤ"

"میں خود اُن کو دُہرانے ہی لگا تھا"

مشتاق نے سنجیدگی سے کہا - "لطیف ایسا نہ کرو"

میں نے کہا "کیوں؟"

"بس میرا دل کہتا ہے - کہ اس کام میں خطرہ ہے -

ہم نے اس معاملے پر بحث شروع کر دی - مگر مشتاق اپنی بات پر مصر رہا - اس کا خیال تھا - کہ اس معاملے میں بھوت کی حرکات کو دُہرانا گویا ایک نہایت ہی سنجیدہ اور اہم بات کا مذاق اُڑانا تھا -

آخر کار میں نے کہا "لطیف جھگڑا اس طرح طے ہو جاتا ہے - کہ تم تسلیم کر لو - کہ تم نے سراسر دروغ بافی سے کام لیا ہے"

لطیف اُٹھ کھڑا ہوا - اُس کے چہرے سے اُس کے جذبات کا بالکل پتہ نہ چلتا تھا - اس نے اپنے ہاتھوں کو ہلانا شروع کیا

مشتاق نے پھر کہا لطیف ایسا نہ کرو۔

احمد حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مشتاق تم دیوانے تو نہیں ہو گئے۔ مادہ فنا نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہاتھوں کے اشارے سے کوئی شخص غائب ہو جائے۔ اس دنیا کے ماورا کسی اور دنیا میں پہنچ جائے۔ لطیف تم اپنا کام کرو۔ دیکھیں تو کیا ہوتا ہے؟

مشتاق کو غصہ چڑھ گیا۔ اور اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اچھا کئے جاؤ۔ مگر یاد رکھو۔ میرا ایمان ہے۔ کہ جبوقت لطیف اپنے ہاتھوں سے آخری اشارہ کرے گا اُسوقت وہ غائب ہو جائے گا۔

احمد حسن نے کہا "کیا بکواس ہے" انسان کے لئے اس دنیا سے گذر جانے کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ موت ہے۔ اس طرح کوئی انسان غائب نہیں ہو سکتا۔

لطیف مسکرایا۔

"مشتاق کا خیال ٹھیک ہے۔ اور تم لوگ تمام غلطی پر ہو۔ جب میں اپنے ہاتھوں کو آخری حرکت دوں گا۔ اُسوقت کمرہ میرے وجود سے خالی ہوگا۔ اور ایک اچھا اور تنومند آدمی سایوں کی مملکت میں چلا جائیگا۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے۔ اور میں مزید بحث کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ اب تم لوگ خاموش ہو جاؤ۔ میں تجربہ کرنے لگا ہوں۔

لطیف نے اپنے ہاتھوں کو پھر ہلانا شروع کر دیا۔ اُسوقت ہم ایک عجیب حالت میں تھے۔ لیکن اس حالت کو محض مشتاق کے خوف نے پیدا کیا تھا۔ ہم لطیف کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا میرے بدن میں خون جم گیا ہے یکایک لطیف جھک گیا۔ اور آخرکار اُس نے اپنے ہاتھوں کو آخری حرکت دی۔ اس نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ اور منہ کو چھت کی طرف کرکے تن کر کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحے تک جبیں ایک عمر ابد نہاں تھی۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اور اس لمحے کے بعد میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ کیونکہ بظاہر لطیف میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا تھا۔ اور پھر یکایک لطیف کے چہرے پر موت کی علامات طاری ہونی شروع ہوئیں۔ اسکا چہرہ بالکل بدل گیا۔ عین اسی طرح جس طرح ایک مکان جو روشنی سے جگمگا رہا ہو تمام چراغ گل ہو جانے کے بعد بدل جائے۔ اس کی آنکھیں یکایک پتھرا گئیں۔ اس کا تبسم اسکے ہونٹوں پر جم گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ منہ کے بل گر پڑا

احمد حسین نے اُسے دوڑ کر تھام لیا۔ اور اُسکے دل کی حرکت کو دیکھا لیکن دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ حقیقت میں لطیف کسی اور دنیا میں جو ہماری دنیا کے ماورا ہے جا چکا تھا۔ اور وہ اسی رستے سے گیا تھا جسکے ذریعے انسان اُس دنیا میں جا سکتا ہے یعنی موت

سید شمس الحق بی۔ اے

چند شعر

جنوری ۱۹۳۰

محبت آہ جو تو کامیاب ہو نہ سکی
ہوس میں عمر کو صرفِ گناہ کر دونگا

نہ دے پناہ اگر حسنِ بے نیاز مجھے
غرورِ عشق کو میں بے پناہ کر دونگا

جو مجھسے چھین لیا دہرِ خود غرض نے تمہیں
مٹونگا لیکن اُسے بھی تباہ کر دونگا

اب عشق سے لَو لگائیں گے ہم
اس درد کو دل بنائیں گے ہم

روٹھے تو انہیں منائیگا کون
وہ بگڑے تو کیا بنائیں گے ہم

اب آپ نہیں سنگے اپنی دنیا
دنیا تجھے بھول جائیں گے ہم

تاجور

سائنس دانوں کی اولوالعزمیاں

سُرعت سے ترقی کرنے والی دنیا نے اپنے عجائبات سے ایک عالم کو ششدر کر رکھا ہے۔ ہر آنے والا دن ایک ناممکن چیز کو ممکن بنا دیتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے کسقدر عجیب۔ کسقدر حیرت افزا اور کتنا شاندار ہے۔ آدم کی اولاد نے مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ کہ وہ شاہد فطرت کو پردہ راز سے باہر نکال لائے گا۔ ناظرین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا۔ کہ ان کے ہم جنسوں نے "موت" پر فتح پانے کی کوشش شروع کر دی ہے اور دس کے حکما اس کے متعلق تجربے کر رہے ہیں۔

"مردے" زندہ کرنے کا خیال کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ حکماء یونان و ہند کے متعلق بھی سُنا جاتا ہے۔ کہ انھوں نے اس کی کوشش کی تھی۔ مگر ان کے نتائج سے ہم ناواقف ہیں۔ زمانہ حال کے بہتیرے سائنس داں بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش [illegible] ہیں۔ جن میں سے ایک روسی ڈاکٹر ایس بجے شیچولن کے تجربے قابل ذکر ہیں۔

عام حالات میں مرکزی نظام اعصابی کے اعمال و افعال دوران خون میں خلل پڑ جانے کے سبب جسم کے دوسرے نظام کے اعمال و افعال سے پہلے رک جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے تجربوں کا خاص مقصد اس بات کو ثابت کر دکھانا تھا۔ کہ مرکزی اعصابی نظام حسب خواہ مصنوعی حالات کے ماتحت اپنے اعمال جاری رکھ سکتے ہیں۔ اور اس رنگ میں وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے مختلف نہیں۔

مرکزی اعصابی نظام۔ دماغ اور نخاع (Spinal Cord) کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ جسم کے سارے عضو کی باگ ڈور اسی کے قبضے میں ہے۔ اور اعضا کے اعمال کی کمی بیشی یا حد اعتدال پر قائم رکھنا اسی کے بس کی بات ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مرکزی اعصابی نظام کے اعمال کا دوبارہ جاری کرنا جاندار میں زندگی کے روزمرہ آثار پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اور یوں تو پہلے بھی جسم کے دوسرے نظام اور اعضا کے اعمال کو وقتی طور پر دوبارہ قائم کرنا ممکن تھا۔

ڈاکٹر شیچولن نے اپنا تجربہ کتے کے سر پر کیا۔ کتے کا سر اس کے جسم سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور اس کو ایک سیال مادے کے ذریعے غذا پہنچائی گئی۔ یہ مادہ خون کا بدل تھا۔ غذا پہنچانے کا عمل ایک خاص آلے کی مدد سے کیا گیا۔ اس تجربے میں دماغ کے بنیادی اعمال برقرار رہے۔ آنکھوں میں آثار حیات باقی تھے۔ سر کو چھونے سے اس میں حرکت پیدا ہوتی تھی۔ کتے کے منہ میں ایک تلخ چیز ڈالی گئی تو اس نے لوٹا دی اور پنیر کا ایک ٹکڑا اس کی زبان پر رکھا گیا۔ تو اس نے اسے قبول کر لیا۔ یہ اثرات سر کاٹنے کے بعد ۳ ½ چار گھنٹے تک موجود رہے

اس مشاہدے سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ اعضا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سارے جسم سے بالکل ملحق رہیں۔ حتےٰ کہ دماغ جیسے سریع الحس عضو کے لئے بھی یہ ضروری نہیں۔

مذکورۂ بالا تجربے سے چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ تجربے کے طور پر دوران خون دوبارہ جاری کرنا مشکل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ فطری دوران خون کی نقل ایک ایسے مصنوعی آلہ کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ جو شرائین میں خون پہنچا سکے۔ اور ورید سے خون نکالنے کے قابل ہو۔ اور اس طرح دل کا بدل بن سکے۔ ایسا آلہ جو دل کے مصنوعی اعمال و افعال کی نقل کر سکتا ہو۔ اس کام کو بخوبی انجام دے گا۔ ایسے آلے کو نقلی دل کہہ سکتے ہیں۔

سب سے پہلی مشکل جس پر فتح پانا ضروری ہے۔ وہ ایک ایسا سیال مادہ پیدا کرنا ہے۔ جو واقعی خون کا قائم مقام ہو سکے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ جسم کے سارے نظام بیک وقت منقطع نہیں ہوتے۔ اور سارے اعضا پر ایک ہی وقت میں موت نہیں آتی۔ اور یہ کہ "انتشار بعد الموت" Post martem disintegration. کا عمل مثلاً "خود غارتگری" (Autolysis) جسم کے ہر کیسہ (Cell) میں ایک ہی ساتھ نہیں شروع ہوتا

مرکزی اعصابی نظام میں "موت" کے بعد فوراً انتشار شروع ہو جاتا ہے۔ اور دماغ کے افعال کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے فوراً عمل کرنا لازمی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے تجربوں کی بنا پر دماغ کے اعمال کا اعادہ موت کے دس منٹ بعد نہیں ہو سکتا۔

سب سے بڑھ کر ان خیالات کا پتہ چلانا ضروری ہے جن کے ماتحت انتشار بعد الموت کی رو کو پھیر کر استقلال کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اور زندہ پروٹین Protein کو پھر اس کی فطری حالت کی طرف واپس لایا جاسکتا ہے

ایسے جاندار کے جسم میں مصنوعی سیلان خون پیدا کرنے کا مسئلہ - جو حقیقتاً "مردہ" نہیں - بلکہ اُس کا صرف دوران خون بند ہوگیا ہو - ایک حد تک حل ہوچکا ہے - مگر ابھی تک کسی ایسے سیال مادے کا پتہ نہیں چلا - جو بلکل خون کا بدل ہوسکے - اور جسم کے سب سے زیادہ اہم نظام یعنی مرکزی اعصابی نظام کے افعال کا محرک اور اس کے قیام کا باعث بن سکے -

ڈاکٹر موصوف کے تجربوں سے یہ پتہ چلا ہے - کہ اعصابی افعال کا احیا بڑی حد تک اعصابی اجزا کو کافی طور پر آکسیجن گیس پہنچانے پر منحصر ہے -

کامل مصنوعی خون میں آکسیجن گیس کو جذب کرنے کی - اور پھر اس جذب شدہ آکسیجن کو مختلف اعضا میں پہنچانے کی خاصیت اصلی خون جیسی ہونی چاہئے - اب تک کوئی ایسا سیال مادہ نہیں دریافت ہوسکا ہے - جس میں یہ خاصیت کامل طور پر موجود ہو - اسلئے ابھی مرکزی اعصابی نظام کو دوبارہ زندہ کرنا - اور کسی مصنوعی سیال مادے سے جاری رکھنا غیر ممکن ہے -

ڈاکٹر شیچولن نے کتے کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ تجربہ کرنے میں دوسرے کتے کا خون استعمال کیا - اور اس کو جمنے سے روکنے کے لئے ایک دوا ملائی گئی - یہ دوا جرمنی کے ایک کارخانہ نے تیار کی تھی - اسی مناسبت سے دوا کا نام "جرمنین" رکھا گیا - جس دوسرے کتے کا خون استعمال کیا جانے والا تھا - اس کی ایک ورید میں مذکورہ بالا دوا کا انجکشن دیا گیا - اس طرح چند گھنٹوں کے لئے انجماد خون رک گیا - اور یہی عمل اس تجربے کو کامیاب بنانے میں ممد ہوا - کیونکہ سیال خون کے ذریعے دماغ کے کیسوں کو آکسیجن کی غذا ملتی رہی - اور اس کے اعمال و افعال قائم رہے -

اس تجربے کی کامیابی سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے - کہ مردہ زندہ کرنے کا مسئلہ حل ہوگیا - ابھی بے شمار مشکلات کا مقابلہ کرنا باقی ہے - ابھی تک کسی نے انسان کے مردہ جسم کو جلانے کی کوشش نہیں کی ہے - گرچہ یہ سعی ایک بڑا بول ہوگی لیکن سائنس کے نقطہ نظر سے ایک جائز فعل ہوگا +

سید اختر احمد

رباعیات

حالِ دلِ دردناک معلوم نہیں　　کیفیتِ روحِ پاک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی　　خاکی انسان کو خاک معلوم نہیں

امجد حیدر آبادی

پابندیٔ جان و دل ہے تدبیرِ حیات　　اللہ اللہ ری فکر توقیرِ حیات
آغاز کی کچھ خبر نہ انجام کا علم　　کونین ہے پھر بھی محوِ تدبیرِ حیات

رواںؔ ایم۔ اے

سنیاسی

اناتول فرانس کے شاہکار تائیس اور ٹیگور کے اس ڈرامے کے پلاٹ کی یک گونہ یکسانی کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب کے تخیل میں توارد ہوگیا ہے۔

(۱)

اپنی گپھا کے باہر

میرے لئے دن اور رات کی تقسیم نہیں ہے۔ مہینوں اور سالوں کا چکر بھی نہیں۔ میرے لئے تو گویا زندگی کی نہر تھم گئی ہے۔ اور دنیا اس نہر کی لہروں پر خس و خاشاک کی طرح ناچ رہی ہے۔ میں اس تاریک گپھا میں اکیلا ہوں۔ خود اپنے آپ میں غرق۔ اور ازلی روشنی خاموش ہے۔ ایک ایسی پہاڑی جھیل کی طرح جو خود اپنی گہرائی سے خوف کھا رہی ہو۔ پانی بہہ رہا ہے اور ندیوں میں پرانے مینڈک تیر رہے ہیں۔ میں فنا کے گیت گا رہا ہوں۔ دنیا کی حدود۔ ہٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اور ستارے بالکل شراروں کی طرح۔ وقت کے اہرن سے اڑ کر غائب ہوگئے ہیں۔ میرے لئے وہ مسرت ہے جو شاعر کو حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے ازلی خواب سے بیدار ہو کر دیکھتا ہے کہ لا انتہا عدم میں صرف وہ باقی ہے۔ میں آزاد ہوں۔ میں وحدت ہوں۔ وحدت محض ہوں۔ اے فطرت! جب میں تیرا غلام تھا۔ تو نے میرے دل کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے خلاف خودکشی کی لڑائی جاری رکھی۔ آرزوؤں نے۔ خواہشوں نے۔ ایسی خواہشوں نے۔ جو اپنے آپ کو کھا کھا کر پلتی ہیں۔ مجھے ایک طوفان غیظ میں مبتلا کر دیا۔ میں ادھر ادھر بھاگتا رہا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے سایہ کا تعاقب کرے۔ تو نے مجھے مسرتوں کے برق مثال بے حد پائدار خلا میں داخل کر دیا۔ اور بھوک نے جو تیرا آلہ کار ہے میری اس بے انتہا قحط کی طرف رہبری کی۔ جہاں ماکولات مٹی بنجاتی ہیں۔ اور مشروبات بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ پھر۔ جب میری دنیا خاکستر اور آنسوؤں سے بھر گئی تو میں نے قسم کھائی۔ کہ میں تجھ سے تو جو نہ ختم ہونے والی ظاہری شکلوں سے عبارت ہے۔ انتقام لونگا میں نے تاریکی میں پناہ لی۔ جو ازلیت کا قلعہ ہے۔ اور میں نے فریب کار روشنی سے لڑائی شروع کر دی تاوقتیکہ اس کے تمام ہتھیار نکمے ہو گئے۔ اور وہ بے بس ہو کر میرے قدموں پر گر پڑی اب میں خوف اور آرزوؤں سے آزاد ہوں۔ کہرے اور دھند کے پردے چاک ہو گئے ہیں۔ اور میری عقل صاف اور روشن ہو گئی ہے۔ چلوں۔ میں ذرا جھوٹ کی دنیا میں چلوں۔ اور اس سے بالکل غیر متاثر رہ کر اس کی چھاتی پر مونگ دلوں۔

(۲)

سنیاسی ایک سڑک کے کنارے

دنیا کسقدر مختصر ہے۔ درخت۔ گھر۔ اور دوسری اشیا میری آنکھوں کے سامنے گزر رہی ہیں۔ روشنی نے ایک قفس کی طرح تاریک ازلی فضا کو مقید کر لیا ہے۔ اور ماہ و سال اس پنجرے کے اندر مقید جانوروں کی طرح پھڑک رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کیوں ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دنیا کسی شے کی تلاش میں ہے۔ جو اسے کبھی نہیں ملتی۔

لوگوں کا ایک مجمع گزر جاتا ہے

گاؤں کا ایک رئیس اور دو عورتیں داخل ہوتی ہیں۔

پہلی عورت۔ توبہ! تمہاری باتیں سُن سُن کے ہنسی آتی ہے۔

دوسری عورت۔ کون کہتا ہے کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو۔

رئیس۔ وہ لوگ جو مردوں کو ان کی ظاہری صورت سے جانچتے ہیں۔ بیوقوف ہیں۔

پہلی عورت۔ کتنی دردناک بات ہے۔ ہم تمہیں شروع سے ایک ہی حالت میں دیکھتے رہے ہیں۔

رئیس۔ صبح کے سورج کی طرح۔

پہلی عورت۔ ہاں۔ صبح کے سورج کی طرح۔ اس کی تمام چمکتی ہوئی عریانی میں۔

رئیس۔ محترم خاتون۔ آپ کی تنقید بہت سخت ہے۔ آپ غیر ضروری چیزوں کو دیکھتی ہیں۔

دوسری عورت (پہلی عورت سے) چھوڑو بھی! انکا ان باتوں کو۔ چلو

گھر چلیں۔ میرے پتی ناراض ہوں گے۔

پہلی عورت۔ لیجئے جناب۔ ہم جاتی ہیں۔ آپ ہمیں بے شک ظاہری صورت سے جانچا کیجئے۔

رئیس۔ ہاں کیونکہ تمہارا باطن کوئی ہے ہی نہیں۔

چلی جاتی ہیں۔

تین گنوار داخل ہوتے ہیں۔

پہلا گنوار۔ اُس بدمعاش نے میری توہین کی ہے۔؟ اچھا وہ پچھتائیگا۔

دوسرا اُسے سبق ملنا چاہیئے۔

پہلا۔ ہاں اُسے اس قسم کا سبق ملنا چاہیئے جسکی یاد قبر تک اسکے ساتھ جائے۔

تیسرا۔ ہاں بھائی۔ اپنا ارادہ مستقل کرلو۔ وہ رحم کے قابل نہیں اس پر بالکل رحم نہ کرو۔

دوسرا۔ وہ بہت طاقتور ہوگیا ہے۔

پہلا۔ جب چیونٹی کی موت آتی ہے۔ اسکو پر لگ جاتے ہیں۔

دوسرا۔ کیا تم نے کوئی تدبیر بھی سوچ رکھی ہے۔

پہلا۔ ایک نہیں سینکڑوں۔ میں اس کے گھر پر ہل پھیر دونگا۔ میں اُسے گدھے پر سوار کرا کے گاؤں میں پھراؤنگا۔ میں دنیا کو اس کے لئے حرام کردونگا۔

دو طالبعلم داخل ہوتے ہیں

پہلا۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر مادیپ بحث میں جیت گئے۔

دوسرا۔ نہیں۔ بازی پروفیسر خیاروان کے ہاتھ رہی۔

پہلا۔ پروفیسر مادیپ نے آخر تک اپنے استدلال کو برقرار رکھا۔ وہ کہتے تھے کہ کثافت لطافت سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا۔ مگر پروفیسر خیاروان نے ثابت کر دیا کہ لطافت ہی کثافت کی ابتدا ہے۔

پہلا۔ ناممکن۔

دوسرا۔ روز روشن کی طرح صاف۔

پہلا۔ بیج درخت سے حاصل ہوتے ہیں

دوسرا۔ لیکن درخت بیج ہی سے اگتا ہے۔

پہلا (سنیاسی کی طرف مخاطب ہو کر) باباجی! ان میں سے کونسی بات درست ہے۔ ابتدا کاہے سے ہوئی تھی۔ کثافت سے یا لطافت سے۔

سنیاسی۔ کسی سے بھی نہیں۔

دوسرا طالبعلم۔ کسی سے بھی نہیں۔ خیر یہ جواب تو مطمئن کر دینے والا ہوتا ہے۔

سنیاسی۔ ابتدا انتہا ہے۔ اور انتہا ابتدا۔ یہ ایک چکر ہے۔ اس لطافت اور کثافت میں فرق کرنا تمہاری جہالت ہے۔

پہلا۔ کسقدر صاف ہے۔ میرے استاد کا یہی مطلب تھا۔

دوسرا۔ ٹھیک ہے۔ میرے استاد کا یہی مطلب تھا۔

دونوں چلے جاتے ہیں۔

سنیاسی۔ یہ پرندے الفاظ چگتے پھرتے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی بے معنی بات سُن لیتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں۔

دو پھول والیاں گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں۔

دن گزر جائیں گے محبت کے

....

موتیا نسترن گلاب کے پھول
ماہ پارے ہیں نور فطرت کے

....

وہ نہ آئینگے۔ وہ نہ آئینگے
دن گزر جائینگے محبت کے
گوندھ لوں موتیے کے ہاروں کو لوٹ لوں عشق کی بہاروں کو
دن گزر جائینگے محبت کے

ایک مسافر۔ کیوں اے ماہوش نازنینوں! تم ہار تو گوندھو۔ گردنیں ان کے لئے بیتاب ہیں۔

پہلی پھول والی۔ بہت گستاخ ہو تم۔ کیوں قریب آ رہے ہو اسقدر

مسافر۔ تم تو ہوا سے لڑتی ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان تو ابھی اتنا فاصلہ ہے کہ ایک ہاتھی درمیان سے گزر سکتا ہے۔

دوسری۔ تو ہم اسقدر بدصورت ہیں کہ تم قریب ہی نہیں آتے۔ اچھا۔

ہنستی ہوئی دوڑ جاتی ہیں۔

ایک فقیر داخل ہوتا ہے۔

فقیر۔ لوگو! رحم۔ ایک شکستہ حال بھکاری پر رحم۔ اپنے بے شمار خزانوں میں سے مجھے کچھ عنایت کرو۔

ایک سپاہی داخل ہوتا ہے۔

سپاہی۔ ہٹ جا۔ ذلیل بھکاری۔ کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ وزیر کے بیٹے کی سواری آ رہی ہے؟

دونوں چلے جاتے ہیں۔

سنیاسی۔ دوپہر کا وقت ہوگیا۔ سورج کی گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ زمین گرم گرم آہیں بھر رہی ہے۔ اور آسمان تپتے ہوئے تانبے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ ریت کے ناچنے والے ذرّے ادھر سے اُدھر اُڑتے ہوئے جا رہے ہیں۔ میں نے انسان کو عجیب عجیب حالت میں دیکھا ہے۔ کیا میں پھر کبھی ان ذلیل جانداروں کی طرح ہو سکتا ہوں؟ نہیں میں آزاد ہوں۔ میرے ارد گرد دُنیا کے جال نہیں ہیں۔ میں ایک مقدس ویرانی میں رہتا ہوں۔

ایک لڑکی دمنتی اور ایک عورت داخل ہوتی ہیں

عورت۔ لڑکی۔ تو رگھو کی بیٹی ہے نا؟ تو اس سڑک سے دور رہ! تجھے معلوم نہیں یہ راستہ مندر کی طرف جاتا ہے۔

دمنتی۔ میں تو راستے سے بہت دور ہوں۔ دیوی جی!

عورت۔ میرا خیال تھا کہ میرا لباس تیرے بدن سے چھو گیا ہے۔ میں دیوی کی پوجا کے لئے جا رہی ہوں۔ میں ڈرتی ہوں میری چیزیں ناپاک نہ ہو گئی ہوں۔

دمنتی۔ نہیں دیوی آپکے کپڑے سے میرا بدن نہیں چھوا۔

عورت چلی جاتی ہے

(سنیاسی سے) میں دمنتی ہوں۔ رگھو کی بیٹی۔ مہاراج میں آپکے پاس آجاؤں۔

سنیاسی۔ کیوں نہیں بچی!

دمنتی۔ میں ناپاک ہوں۔ مجھے لوگ بھرشٹ کہتے ہیں۔

سنیاسی۔ لیکن لوگ تو تمام خود ناپاک ہیں۔ لوگ تو زندگی کی خاک میں لوٹتے ہیں۔ صرف وہی پاک ہے جس نے دنیا کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیا ہے۔ لیکن تم سے کیا گناہ ہوا ہے بچی۔

دمنتی۔ میرے باپ نے۔ مرحوم باپ نے ان لوگوں کے دھرم کے خلاف عمل کیا تھا۔ وہ ان کے رسم و رواج کا پابند نہ تھا۔

سنیاسی۔ تم مجھ سے دُور کیوں کھڑی ہو؟

دمنتی۔ کیا تم مجھے چھو لوگے۔

سنیاسی۔ ہاں۔ کیونکہ اب کوئی چیز مجھے حقیقی معنی میں چھو نہیں سکتی۔ میں تو ازلیت میں رہتا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو یہاں بیٹھ سکتی ہو۔

دمنتی۔ (رونے لگتی ہے) جب میں تمہارے پاس آجاؤں۔ پھر مجھے کبھی اپنے پاس سے جانے کے لئے نہ کہنا!

سنیاسی۔ اپنے آنسو پونچھ دے بیٹی۔ میرے دل میں نہ محبت ہے نہ نفرت۔ میں تمہیں اپنی نہیں سمجھتا کہ تمہیں چھوڑ دینے کا امکان باقی رہ جائے۔ تم میرے لئے اس نیلے اکاش کی طرح ہو۔ تم ہو۔ اور نہیں بھی ہو۔

دمنتی۔ مہاراج! مجھے دیوتاؤں نے اور آدمیوں نے چھوڑ دیا ہے

سنیاسی۔ یہی حال میرا ہے۔ میں نے بھی دیوتاؤں اور آدمیوں کو چھوڑ دیا ہے۔

دمنتی۔ آپ کی ماتا کوئی نہیں مہاراج!

سنیاسی۔ نہیں!

دمنتی۔ کوئی دوست بھی نہیں۔

سنیاسی۔ نہیں!

دمنتی۔ تو پھر میں آپ کے پاس رہونگی مہاراج۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہ دینگے؟

سنیاسی۔ میں نے "چھوڑ دینا" چھوڑ دیا ہے۔ تو میرے پاس رہ بچی۔ لیکن میرے قریب نہ آسکیگی۔

دمنتی۔ میں آپ کی باتیں نہیں سمجھتی مہاراج! کیا میرے لئے دنیا میں کہیں پناہ نہیں ہے؟

سنیاسی۔ پناہ بچی۔ تجھے معلوم نہیں کہ یہ دنیا ایک اتھاہ گڑھا ہے۔ جانداروں کے گروہ فنا کی گہرائیوں میں سے نکل کر پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ خلا کے منہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ تیرے اردگرد جھوٹ کے سایے ہیں۔ اور جھوٹ کے بھوت ہیں۔ جو کبھی کبھی اپنے دا ہے کا بازار گرم کرتے ہیں۔ اور جو چیزیں یہ لوگ بیچتے ہیں وہ بھی سایہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بھوک کو فریب دیتے ہیں۔ مگر ان کا دل نہیں بھرتا۔ آجا بچی۔ اس جگہ کو چھوڑ دے۔

دمنتی۔ مگر مہاراج۔ یہ لوگ تو اس جگہ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم سڑک پر بیٹھے ہوئے انہیں دیکھتے رہیں۔

سنیاسی۔ افسوس ہے یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ دنیا موت ہے جو ازل اور بقا کی حدوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس دنیا کی جاندار موت پر پل پل کر جوان ہوتے ہیں۔

دمنتی۔ مہاراج۔ آپ کی باتوں سے مجھے خوف آتا ہے۔

ایک مسافر داخل ہوتا ہے۔

مسافر - کیا مجھے یہاں کہیں آرام کے لئے جگہ مل سکتی ہے ؟
سنیاسی - آرام کہیں نہیں بیٹا! سوائے اپنے دل کی گہرائیوں کے۔
اسے ڈھونڈو۔ تو محفوظ رہو گے۔
مسافر - مگر میں تھک گیا ہوں اور آرام چاہتا ہوں۔
دمنتی - میری جھونپڑی یہاں سے دور نہیں - اگر آپ وہاں آرام لینا پسند کریں تو چلئے۔
مسافر - تم کون ہو ؟
دمنتی - رگھو کی بیٹی۔
مسافر - پرماتما تمہیں خوش رکھے - بیٹی - میں نہیں ٹھہر سکتا۔

کچھ آدمی چارپائی پر کسی آدمی کو ڈالے ہوئے آتے ہیں۔

پہلا - ابھی سو رہا ہے۔
دوسرا - کسقدر بوجھل ہے کم بخت۔
ایک مسافر - کون ہے یہ جسے تم لئے جا رہے ہو ؟
تیسرا - بندے جلاہے کو - اس پر موت کی سی نیند طاری ہے - اور ہم اسے لیجا رہے ہیں۔
دوسرا - بھائیو میں تھک گیا ہوں - آؤ اسے جگا دیں -

نیند سے جاگ اٹھتا ہے

بندے - ای آ ....
تیسرا - کیا آواز ہے ؟
بندے - میں پوچھتا ہوں یہ کیا ہو رہا ہے ؟ تم کون ہو ؟ اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو ؟

آدمی چارپائی زمین پر رکھ دیتے ہیں -

تیسرا - تم مرے ہوئے آدمیوں کی طرح خاموش نہیں رہ سکتے۔
دوسرا - دیکھو تو ذرا اس کی بے شرمی - یہ مر کر بھی باتیں کرتا جائیگا۔
تیسرا - مناسب یہ ہے کہ تم خاموش ہو جاؤ۔
بندے - لیکن بھائیو میں تو سو رہا تھا - میں مرا تھوڑا ہی تھا -
دوسرا - یہ خوب رہی - ذرا دیکھئے نا - مرنا تو ایک طرف - بحث بھی شروع کر دی ہے۔
تیسرا - یہ کبھی سچ نہیں بولیگا - چلو ہم رسمیں پوری کریں -
بندے - مجھے پرماتما کی قسم ہے کہ میں زندہ ہوں -

وہ ہنستے ہوئے اسے اٹھا کر لیجاتے ہیں -

سنیاسی - یہ لڑکی اپنے ہاتھ کو سر کے نیچے رکھ کر سو گئی ہے - بزدل خیال ہو کہ اب مجھے اسے یہیں چھوڑ کر چلا جانا چاہئے - لیکن بزدل! کم ہمت! کیا تو ضرور بھاگ جائیگا! اس چھوٹی سی - حقیر سی چیز سے بھاگ جائیگا - یہ چیزیں مکڑی کے جالے کی طرح ہیں - جس میں مکھیاں پھنس سکتی ہیں - تو سنیاسی ہے - تجھے ان جالوں سے کیا واسطہ ؟
دمنتی - (اٹھکر) مہاراج - آپ نے مجھے چھوڑ دیا ؟ آپ چلے گئے ؟
سنیاسی - کیوں بچی ؟ میں کیوں جاؤں ؟ میں کس شے سے ڈروں ؟ سایے سے ؟
دمنتی - مہاراج آپ یہ آواز سُن رہے ہیں ؟
سنیاسی - میری روح میں خاموشی ہے -

ایک نوجوان عورت داخل ہوتی ہے -
اس کے پیچھے کئی ایک مرد ہیں -

عورت - جاؤ میرے سامنے محبت کی باتیں نہ کرو -
پہلا مرد - کیوں میرا کیا گناہ ہے ؟
عورت - مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں -
پہلا مرد - ناممکن - اگر ہمارے دل پتھر کے ہوں تو کامدیو کے تیر ہمارے دلوں کو کس طرح زخمی کر سکتے ہیں ؟
دوسرے مرد - خوب کہی -
دوسرا مرد - کیوں پیاری اس کا کیا جواب ہے ؟
عورت - جواب - تم لوگ سمجھتے ہو کہ تم نے بہت اچھی بات کہی ہے - سب فضول !
پہلا مرد - صاحبان - میں فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں - میں نے یہ کہا تھا کہ اگر مردوں کے دل پتھر ہوں تو ....
تیسرا مرد - ہاں - ہاں - اس کا کوئی جواب نہیں ہے -
پہلا مرد - میں آپ کو سمجھاتا ہوں - میری پیاری نے کہا تھا کہ مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں - میں نے جواب میں کہا کہ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو کامدیو کے تیر ہمارے دلوں کو کس طرح مجروح کر دیتے ہیں - سمجھے -
دوسرا - ہاں خوب سمجھ لیا -

چلے جاتے ہیں -

سنیاسی - کیا کر رہی ہے تو بچی ؟
دمنتی - میں آپ کی ہتھیلی کی طرف دیکھ رہی ہوں مہاراج ! میرا ہاتھ ایک پرندے کی طرح ہے - جس نے ایک ہتھیلی میں

آشیانہ بنالیا ہے۔ آپ کی ہتھیلی دنیا کی طرح بڑی مضبوط ہے۔ لکیریں دریا کی طرح ہیں۔

رخسار سنیاسی کی ہتھیلی پر رکھدیتی ہے۔

سنیاسی۔ بچی۔ تیرے رخسار گلاب کے مس کی طرح گداز اور نرم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے بدن میں اس عظیم الشان ظلمت کا کوئی حصہ پوشیدہ ہے۔ جو روحوں کو اپنی ازلی چھڑی سے چھوتی ہے۔ لیکن بچی تو دن کی تیتری ہے۔ تیرے لئے پرندے پھول اور روشنی موجود ہے۔ تو مجھ میں کیا دیکھتی ہے جو وحشت میں غرق ہے۔

دمنتی۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی مہاراج۔ آپ کی محبت میرے لئے کافی ہے۔

سنیاسی۔ یہ لڑکی سمجھتی ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس خیال میں خوش ہے۔ خوش رہنے دو اسے۔ یہ لوگ وہم پر پلے ہیں۔ اور ان کی مسرت کے لئے وہم ضروری ہے۔

دمنتی۔ مہاراج! یہ بیل جو گھاس پر بل کھا رہی ہے۔ اور کسی درخت کی تلاش میں ہے۔ میری پرورش کی ہوئی ہے۔ جسدن سے یہ بیل پیدا ہوئی ہے میں نے اس کا خیال رکھا ہے۔ میں بھی اسی بیل کی طرح ہوں۔ مجھے ہاتھ کی ایک حرکت سے برباد کیا جا سکتا ہے۔ مہاراج۔ آپ ان خوبصورت اور ننھے ننھے پھولوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جنکا رنگ ہلکا نیلا ہے۔ اور جن کے دل پر ایک سفید نشان ہے؟ یہ سفید نشان ان پھولوں کے خواب ہیں۔ لائیے میں آپ کے ماتھے کو ان پھولوں سے صاف کردوں۔ میرے لئے خوبصورت چیزیں ان تمام چیزوں کی کنجی ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھیں

سنیاسی۔ نہیں بچی۔ حسن مایا ہے۔ سب مایا ہے۔ جو جاتا ہے۔ اس کے لئے خاک اور پھول یکساں ہیں۔ لیکن یہ کیا ہے؟ یہ پژمردگی۔ یہ نقاہت سی کیا ہے جو میرے خون میں ملتی جا رہی ہے؟ میری آنکھوں کے آگے دھنک کے سے رنگوں کا ایک پردہ آرہا ہے۔ کیا فطرت۔ مایا۔ میرے اردگرد اپنے خواب آلود جال بُن رہی ہے۔

وہ بیل کو ہاتھ سے اکھیڑ دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔

بس اب ایسا نہ ہوگا۔ کہ ایسا ہونا موت ہے۔ بچی۔ تو مجھ سے کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ میں سنیاسی ہوں۔ میں نے تمام گرہیں کھول دی ہیں۔ میں آزاد ہوں۔ بس۔ کر۔ یہ آنسو پونچھ ڈال۔ مجھے تیرے آنسوؤں کی برداشت نہیں ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ میرے دل میں یہ سانپ کہاں سے آیا؟ یہ کہاں کنڈل مارے ہوئے سو رہا تھا۔ یہ بھوک کا سانپ۔ آہ! شاید یہ سانپ مرتے نہیں۔ بھوک انہیں مار نہیں سکتی۔ دوزخ کے جانور میرے دل میں رقص کر رہے ہیں۔ اور اپنی سوکھی ہوئی ہڈیاں۔ اپنے پنجر کھڑکا رہے ہیں۔ ڈر مت بچی۔ ادھر آ۔ قریب آ۔ اور قریب آ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا تو ایک بھولی ہوئی دنیا کی آواز ہے۔ کسی سیر کرنے والے سیارے کا گیت ہے۔ تو میرے ذہن میں کئی خیالات پیدا کر رہی ہے۔ ایسے خیالات جو چاند سورج۔ ستاروں سے زیادہ عظیم ہیں۔ یہ خیالات تاریکی کی طرح نہ ختم ہونے والے ہیں۔ میں ایسے خیال سے کبھی دوچار نہیں ہوا۔ اور اس لئے ڈرتا ہوں۔ تجھ سے ڈرتا ہوں میں بچی۔ میں جاتا ہوں۔ جا۔ بچی۔ جہاں سے تو آئی ہے۔ وہاں جا! نامعلوم باتوں کے قاصد۔ جا!

دمنتی۔ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے مہاراج۔ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے!

سنیاسی۔ نہیں میرا جانا ضروری ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں معلوم کر کے رہونگا۔ میں جاتا ہوں۔ یہ دریافت کرنے کہ تم کون ہو؟

دمنتی۔ مہاراج اگر آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میں مرجاؤنگی۔

سنیاسی۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے بچی۔ میں آزاد ہوں۔

بھاگ جاتا ہے۔

(۲)

ایک پہاڑی راستے پر سنیاسی ایک پتھر پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک رکھوالا لڑکا گاتا ہوا گزرتا ہے۔ ؎

چہرے کو چھپائے جا رہے ہو
کانٹے سے چھپائے جا رہے ہو
یہ حسن کی زرنگار دُنیا
رنگین و گہر نگار دُنیا
پیغام سرور دے رہی ہے
چہرے کو چھپائے جا رہے ہو

سنیاسی۔ رات سونے کے ڈلے کی طرح نیلے سمندر میں غرق ہو رہی ہے۔ پہاڑ پر جنگل کے درخت روشنی کا آخری پیالہ ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ بائیں جانب جھونپڑیاں درختوں کے جھنڈ میں سے نظر آ رہی ہیں۔ چراغ جل رہے ہیں۔ فطرت۔ مایا۔ تو میری غلام ہے۔

رکھوالی لڑکیاں گاتی ہوئی گزرتی ہیں۔

نغمے برس رہے ہیں فردوس آسماں سے
فردوس آسماں سے
مخمور ہو رہی ہوں۔ اس حسن ارغواں سے
اس حسن ارغواں سے
وہ حُسن ارغواں ہے جنت کا ایک منظر
جنت کا ایک منظر
معلوم تھا میرا دل۔ ناآشنائے غم تھا   نغمے برس رہے ہیں فردوس آسماں سے
زخمی ہوا ہے الفت کی تیغ خونچکاں سے   نغمے برس رہے ہیں فردوس آسماں سے

سنیاسی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایکبار اس تیغ خونچکاں کا مزہ چکھا ہے۔ کسی اگلے جنم میں۔ اس وقت میرا ساغر عیش موسیقی اور لذت سے لبریز تھا۔ آہ! کہاں ہے وہ ننھی سی لڑکی۔ آہ! اس کی غمگین آنکھیں۔ جن میں آنسو چمک رہے تھے۔ کیا اب بھی وہ اپنی جھونپڑی کے آگے کسی ستارے کو دیکھ رہی ہے۔ مگر ستارہ غروب ہوگا۔ شام اس کی آنکھوں پر نیند کے پردے ڈالیگی۔ اور اس کی ہچکیاں بند ہو جائیں گی۔ نہیں میں واپس نہ جاؤنگا۔ دنیا والوں کو اپنے خوابوں میں مصروف رہنے دو۔ میں مایا کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ مجھے سوچنے دو۔ اور سمجھنے دو۔

ایک شکستہ حال۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس لڑکی داخل ہوتی ہے۔

لڑکی۔ مہاراج۔ آپ یہاں ہیں؟

سنیاسی۔ آجا بچی۔ میرے پاس بیٹھ۔ میں چاہتا ہوں کہ تیرا پتا کہلاؤں۔ کسی نے ایکبار مجھے پتا کہہ کر۔ مہاراج کہکر بلایا تھا۔ اور اس کی آواز تیری آواز سے ملتی جلتی تھی۔

لڑکی۔ آپ کون ہیں؟

سنیاسی۔ میں ایک سنیاسی ہوں۔ تیرا باپ کیا کرتا ہے بچی؟

لڑکی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہے۔

سنیاسی۔ تیری ماتا بھی ہیں؟

لڑکی۔ نہیں۔ وہ سرگباش ہو چکی ہیں۔

سنیاسی۔ تو اپنے پتا سے پیار کرتی ہے بچی؟

لڑکی۔ ہاں ان کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔

سنیاسی۔ میں سمجھتا ہوں۔ لا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے۔

لڑکی۔ مہاراج۔ کیا آپ میرے ہاتھ سے میری زندگی کا حال پڑھ سکتے ہیں۔

سنیاسی۔ ابھی نہیں۔ بیٹی۔ لیکن جلد ہی میں پڑھ لینے کے قابل ہو جاؤنگا۔

لڑکی۔ میں اپنے پتا کے پاس جاتی ہوں۔

سنیاسی۔ کہاں۔

لڑکی۔ جہاں سڑک جنگل کی طرف مڑتی ہے۔

سنیاسی۔ ادھر کر۔ بیٹی اپنا سر۔ میں تجھے اشیرباد دیتا ہوں۔

ایک عورت دو بچوں کو ہمراہ لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔

عورت۔ (بچوں سے) تم کیوں دُبلے ہوتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں جتنا کھلاتی ہوں اتنا ہی الٹا اثر ہوتا ہے۔

بچی۔ ماتا جی ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔

عورت۔ تم سارا دن کھیلتی رہتی ہو اور ذرا آرام سے نہیں بیٹھتی۔

دوسری بچی۔ لیکن ماتا جی۔ ہم تمہارے ہی کام تو کرتی رہتی ہیں۔

عورت۔ تم اسقدر منہ پھٹ کس طرح ہو گئی ہو!

سنیاسی۔ بیٹی تم کہاں جا رہی ہو۔

عورت۔ گھر جا رہی ہوں۔ پتا جی۔

سنیاسی۔ تم کتنے آدمی ہو۔

عورت۔ ایک میں۔ ایک میرے پتی دو بچے۔ اور ایک میری ساس ہے۔

سنیاسی۔ تم اپنے دن کس طرح بسر کرتے ہو۔

عورت۔ یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ میرے پتی کھیتی باڑی کرنے جاتے ہیں اور میں گھر کا کام کاج کرتی ہوں۔

چلی جاتی ہیں۔

سنیاسی۔ رات تاریک اور بھیانک ہو رہی ہے۔ اور اس طرح تنہا بیٹھی ہوئی ہے جس طرح کوئی وفادار عورت اپنے محبوب کے فراق میں سوگوار بیٹھی ہوئی ہو۔ ستارے اس کے آنسو ہیں۔ جو آگ بن گئے ہیں۔ آہ! بچی۔ تیرے غم نے میری ملاقات

کو دکھ درد سے بھر دیا ہے ۔ تیرے نرم ہاتھوں کا لمس ہوا کی مچھلی میں ملکر میرے بدن کو چھو رہا ہے ۔ میرے ماتھے پر تیرے آنسو پسینہ بن کر نمودار ہو رہے ہیں ۔ پیاری ۔ تیرے رونے نے میرے دل کو مجروح کر دیا ہے ۔ میں اپنی قبر میں اس رونے کا خیال لے جاؤنگا ۔

(۴)

سنیاسی گاؤں کے راستے پر چل رہا ہے ۔

سنیاسی ۔ چھوڑ دوں ۔ جی چاہتا ہے ۔ میں اپنی دنیا چھوڑ دوں ۔ اپنا سونٹا توڑ دوں ۔ بھیک مانگنے کا پیالہ پھینک دوں ۔ آہ ۔ کسقدر پاگل ہے وہ جو تیرنے میں اپنی حفاظت چاہتا تھا ۔ اور سورج اور چاند سے بے پروا رہتا تھا ۔ جگنو کی روشنی اسے کافی معلوم ہوتی تھی ۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اس لئے نہیں کہ پھر کبھی واپس ہی نہ آئیں ۔ بلکہ اس لئے کہ سب اپنے آشیانوں کو لوٹ کر آسکیں ۔ میں آزاد ہوں ۔ میں فنا کے سلسلے میں آزاد ہوں ۔ اس تمام مایا کے درمیان میں آزاد ہوں ۔ فانی دنیا ہی اصل میں ازلی اور ازلی زندگی ہے ۔ اور محبت کو یہ حقیقت معلوم ہے ۔ لڑکی ۔ تو ان تمام چیزوں کی روح ہے ۔ میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا ۔

گاؤں کا ایک رئیس داخل ہوتا ہے

سنیاسی ۔ بھائی ۔ تمہیں معلوم ہے رگھو کی لڑکی کہاں ہے ۔

رئیس ۔ وہ گاؤں سے چلی گئی ہے ۔ اور ہم بہت خوش ہیں ۔

سنیاسی ۔ کہاں چلی گئی ہے وہ ۔

رئیس ۔ پرماتما جانے ۔ اس کے لئے ہر ایک جگہ ایک سی ہے ۔

سنیاسی ۔ میری پیاری ۔ میری روح ۔ اس خلا میں کسی کو ڈھونڈنے گئی ہے ۔ وہ ضرور مجھے پالیگی ۔

گاؤں کے بہت سے لوگ داخل ہوتے ہیں ۔

سنیاسی ۔ رگھو کی لڑکی کہاں ہے ۔

ایک عورت ۔ چلی گئی ۔

سنیاسی ۔ کہاں ۔

ایک مرد ۔ نہیں معلوم ۔

ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں ۔

ایک عورت بچے کو لئے ہوئے داخل ہوتی ہے ۔

عورت ۔ مہاراج ۔ میرے لڑکے کو اشیرباد دیجئے ۔ وہ بیمار ہے

سنیاسی ۔ میں سنیاسی نہیں ہوں بیٹی ۔

عورت ۔ تو پھر آپ کون ہیں ۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ۔

سنیاسی ۔ میں ڈھونڈھ رہا ہوں ۔

عورت کسے ڈھونڈ رہے ہیں آپ ۔

سنیاسی ۔ میں اپنی کھوئی ہوئی دنیا ڈھونڈ رہا ہوں ۔ تمہیں معلوم ہے رگھو کی لڑکی کہاں گئی ۔

عورت ۔ رگھو کی لڑکی ؟ وہ تو مر گئی ؟

سنیاسی ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ وہ نہیں مر سکتی ۔ نہیں ۔ کبھی نہیں ۔

عورت ۔ لیکن سنیاسی تجھے اس کی موت اور زندگی سے کیا ہے ؟

سنیاسی ۔ صرف میرے لئے نہیں ۔ اس کی موت سب کی موت ہوگی ۔

عورت ۔ میں نہیں سمجھی ۔

سنیاسی ۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ۔

(ٹیگور) — عابد

رباعی

کیا افسرِ جمشید ہے کیا دولتِ کَے — بیکار ہے زرفشانیٔ حاتم طے
مَیں بادہ گسار ہوں مجھے کافی ہے — یا ساغرِ ماہتاب یا ساغرِ مے

عابد

وارن ہیسٹنگز کا مقدمہ

وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی کمپنی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے تجارتی کاروبار کے ساتھ ساتھ اس میں بادشاہت کے سے خصائص پیدا ہو گئے۔ لارڈ کلایو کی محنتوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت باقی سب اقوام سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اور اب لوگ امیدوار تھے کہ مشرق کے روایتی خزائن سے انہیں بھی حصہ ملیگا۔ برطانوی حکومت کمپنی سے خراج وصول کر لیتی تھی۔ اور حصہ دار زیادہ منافع کے طالب تھے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مقامی حکام جو ایک ایسے ملک کی بہتری میں کوشاں تھے جس کو خونریز لڑائیوں نے تباہ کر دیا تھا اور جو ان کوششوں کے باوجود روپے کی ایک بہت کثیر رقم انگلستان بھیجنے پر مجبور تھے۔ اپنے آپکو گہری مشکلات میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگے۔ چند سالوں کے قلیل عرصے میں کمپنی کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اور اُسے مجبوراً حکومت کی مدد طلب کرنا پڑی حکومت نے مدد تو دی مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ ہندوستان کا نظم و نسق ایک حد تک حکومت کے ماتحت ہوگا۔ وہ قوانین نافذ کئے گئے جنکا مقصد یہ تھا۔ اخراجات و انتظامات کی ترتیب کی جائے۔ اور ایک متعینہ نظام عمل تیار کیا جائے۔

ہندوستان کی حکومت ایک گورنر جنرل کے سپرد کی گئی۔ اور ایک انتظامی کونسل قایم کی گئی جسکے ماسوائے گورنر جنرل کے چار اور رکن تھے۔ علاوہ ازیں ایک عدالت بھی قایم کی گئی۔ گورنر جنرل کا دار الخلافہ کلکتہ قرار دیا گیا۔ اُسے مدراس اور بمبئی کے گورنروں پر انتظامی اختیارات دئے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قانون کے الفاظ بہت مبہم تھے۔ جو انتظامی معاملات سے متعلق تھے۔ اور اس میں کوئی ایسا ضابطۂ عمل متعین نہیں کیا گیا تھا جس کی مدد سے نظم و نسق کی تمام مشکلات حل ہو جائیں۔ گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے اراکین کے باہمی تعلقات واضح طور پر درج نہ تھے۔ اور کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ گورنر جنرل اپنے آپ کو اقلیت میں پاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ذمہ داری صرف اسی پر تھی اور کونسل کے اراکین کو کسی تجویز کی کامیابی یا ناکامیابی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بمبئی اور مدراس کے انتظامی معاملات بھی کلی طور پر گورنر جنرل کے ماتحت نہ تھے۔ اور بعض اوقات ان علاقوں میں ایسے قوانین نافذ ہو جاتے تھے جو گورنر جنرل کے خیال میں مناسب نہیں ہوتے تھے۔ یہ بھی ایک غیر معین امر تھا کہ عدالت میں اور انتظامی کونسل میں کیا رابطہ ہے؟ اور انکے دائرہ ہائے عمل بھی غیر متعین تھے۔ اس امر کی بھی کوئی تصریح نہیں کی گئی تھی کہ عدالت کو اصل الاصول کے طور پر کس قانون کی پیروی کرنی ہے۔

ان تمام مشکلات کے علاوہ کمپنی کی دو حیثیتیں تھیں۔ وہ حکومت تھی اور تجارتی کمپنی بھی۔ حکومت کی حیثیت سے کمپنی کے تمام اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کے عطا کردہ تھے۔ یا پھر ان عہدناموں پر مبنی تھے جو کمپنی نے ہندوستان کے راجاؤں اور مہاراجاؤں سے کئے تھے۔ ان راجاؤں اور حکمرانوں کی قانونی حیثیت اسقدر پیچیدہ تھی کہ شاید ہی کوئی ایسا قانون ہو جو ان کے اور مغل بادشاہوں کے تعلقات کو متعینہ طور پر واضح کر سکے۔

وارن ہیسٹنگز کا انتخاب اس کی باعزت اور دیانتدارانہ زندگی کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ اس نے وسٹمنسٹر میں تعلیم پائی تھی۔ اور وہیں اس کی دوستی انگلستان کے مشہور شاعر کوپر سے ہو گئی تھی۔ جوانی کے آغاز میں اس کے والد فوت ہو گئے اور مزید تعلیم کا حصول ناممکن ہو گیا۔ وارن ہیسٹنگز کے سرپرست نے اُسے ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور کلرک کے ملازم رکھا دیا۔ جہاں وہ کچھ عرصہ دیانتداری سے کام کرتا رہا۔

ہندوستان آکر وہ ایک معمولی عہدے پر مامور ہو گیا۔ مگر جب مشکلات آپڑیں تو اُسکی حقیقی قابلیت کھلی۔ اور وہ سراج الدولہ کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ جب میر جعفر نے بنگال کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اُسوقت بھی ہیسٹنگز ہی سفارت کا کام سرانجام دے رہا تھا۔

اس کے بعد وہ انگلستان واپس چلا گیا۔ اور چند سال سستانے کے بعد کلکتہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اس عہدے سے ترقی کرکے ہندوستان کا گورنر جنرل ہو گیا۔ اس کی انتظامی کونسل حسب ذیل اراکین پر مشتمل تھی۔

(۱) جنرل کلیورنگ
(۲) بارول
(۳) کرنل مانسن
(۴) فلپ فرانسس

ان لوگوں نے فرانسس کی قیادت میں گورنر جنرل کی منظم و مرتب

مزاحمت شروع کردی ایک طرف تو یہ اندرونی مشکلات تھیں۔ اور دوسری یہ حالت تھی کہ گورنر جنرل بہ خود اپنی حیثیت اچھی طرح واضح نہ تھی۔

مغلوں کی بادشاہت (برائے نام) تاحال قایم تھی۔ اور ریاستوں کے فرمانروا قانونی حیثیت سے مغل بادشاہ کے ماتحت تھے کمپنی اپنے عمال حکام کے ذریعے ان اختیارات کا استعمال کرتی تھی جو نواب بنگال نے انکو عطا کئے تھے۔ فرمانرواؤں پر کمپنی کو اقتدار و حکومت کا دعویٰ تھا۔ اور کچھ والیان ریاست کے ساتھ اس کے عہد نامے قایم تھے۔ بعض صورتوں میں گورنر جنرل کے اختیارات غیر محدود تھے۔ اور بعض صورتوں میں اس کی حیثیت صرف ایک نمائندے کی سی تھی۔ پھر گورنر جنرل کے اختیارات کمپنی کے اختیارات پر مبنی تھے جو خود پارلیمنٹ کے قوانین وضوابط کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لطف یہ تھا کہ ان قوانین وضوابط کی زبان ایسی مبہم اور غیر واضح تھی کہ ان کی ہر طرح تاویل کی جاسکتی تھی۔ مدراس اور بمبئی کی حکومتیں علیحدہ تھیں۔ ہیسٹنگز کے سامنے ایک ایسا ملک تھا۔ جسے لڑائیوں اور خانہ جنگیوں نے برباد کردیا تھا۔ اُسے ضرورت محسوس ہوئی کہ نظم ونسق میں ایک انقلابی تبدیلی کی جائے۔ لیکن اس کی کونسل کے اراکین نے اس تجویز کی شدومد سے مخالفت کی۔ ادھر انگلستان سے روپے کے تقاضے ہونے لگے۔

اکثریت گورنر جنرل کو مستعفی ہوجانے پر مجبور کررہی تھی۔ ان تمام مشکلات میں گورنر جنرل نے اپنے حواس قایم رکھے۔ اور برطانوی تدبر وفراست کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا۔

ہیسٹنگز نے اپنی پالیسی کی تکمیل میں پہلا کام یہ کیا کہ سنہ ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ کے ساتھ ایک عہد نامہ کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کے خلاف اودھ کی طاقت کو ایک سدباب کے طور پر کام لیا جاسکے۔ نواب نے انگریزی افواج کی مدد طلب کی تھی تاکہ وہ روہیلوں کو مغلوب کرسکے۔

مدودی گئی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ روہیلے مفتوح ہوگئے۔ نواب نے اور نواب کے حکام نے فتح کے بعد مفتوحین پر ایسے ایسے ظلم توڑے کہ خدا کی پناہ۔ اس واقع کے تھوڑے عرصے کے بعد نندکمار نے گورنر جنرل کے خلاف رشوت کا الزام لگایا۔ بات یہ ہوئی کہ نندکمار حاکم بنگال کی نیابت کے عہدے کا امیدوار تھا مگر یہ منصب کسی اور کو دیدیا گیا۔ گذشتہ سالوں میں نندکمار اور گورنر جنرل میں لڑائی ہوچکی تھی۔ اب نندکمار نے ہیسٹنگز کے خلاف رشوت کا الزام لگایا تو کونسل نے تحقیقات کا حکم دیا۔ اس واقع کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نندکمار پر سازش اور جعلسازی کے الزامات میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور چیف جسٹس نے اُسے موت کا حکم سنایا جس کی تعمیل کی گئی۔ یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ ان سیاسی اور قانونی پیچیدگیوں پر بحث کی جائے جو لازماً اس مقدمہ کے دوران میں پیدا ہوئی ہونگی۔ مگر یہ کہنا ضروری ہے کہ اس حکم کے بعد گورنر جنرل نے قسم کھائی کہ مقدمہ کھڑا کرنے میں اسکا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

سنہ ۱۷۷۷ء میں گورنر جنرل کے ایجنٹ نے برطانوی حکومت کے طرز عمل سے گھبرا کر کمپنی کے ڈائکٹروں کے سامنے گورنر جنرل کا استعفیٰ رکھدیا۔ مگر ہیسٹنگز نے اس بات پر اصرار کیا کہ اُسے اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ امر آخر کار کلکتہ ہائی کورٹ نے ہیسٹنگز کے حق میں فیصلہ کیا۔

اسوقت حالت یہ تھی کہ بغاوت "انقلاب امریکہ" کا ہنگامہ برپا تھا۔ اور برطانیہ کے سیاست دانوں کی توجہ کا مرکز یہی انقلاب تھا۔ فرانس لڑائی کا اعلان کرنے پر آمادہ تھا۔ اور فرانسیسی جاسوس ہندوستانی فرمانرواؤں کو اکسا رہے تھے کہ وہ بھی ان کا ساتھ دیں۔ ادھر سنہ ۱۷۷۸ء میں حکومت کمپنی کی مرہٹوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ گورنر جنرل کی تدابیر مکمل تھیں۔ مگر دوسری دوسری طرف حیدرعلی نے مدراس پر حملہ کردیا تھا۔ دوسری بار حیدرعلی کی فوجیں کرناٹک پر چھاگئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی کوششوں سے کلایو کا بنایا ہوا کام بگڑ جائیگا۔ کیونکہ انگریزی افواج کو علی التواتر شکست ہورہی تھی۔ اب گورنر جنرل نے ہمہ تن اپنی توجہات کو ان امور کی طرف مبذول کردیا۔ اسے محسوس ہوگیا کہ حیدرعلی سے خطرہ ہے اور اس نے اسی طرف زیادہ توجہ دی۔ آخر کار فرانس کی مدد کے باوجود سنہ ۱۷۸۱ء میں حیدرعلی کی افواج کو شکست ہوئی۔

اس اثنا میں مرہٹوں سے صلح ہوچکی تھی۔ معاہدۂ پیرس کے بعد فرانسیسی افواج بھی ہندوستان سے رخصت ہوچکی تھیں۔ حیدرعلی وفات پاگیا۔ اور اسکے بعد اس کے بیٹے نے انگریزوں سے صلح کرلی۔ لڑائی ختم ہوچکی تھی۔ اور برطانیہ کا اقتدار قایم تھا۔ اس دوران میں گورنر جنرل کے سامنے سب سے بڑی مہم اخراجات کا پورا کرنا تھا۔ اور روپے کی ضرورت کی وجہ سے دو افسوسناک حادثے وقوع میں آئے۔

(۱) بنارس کا راجہ کمپنی کے ماتحت تھا۔ چنانچہ لڑائی کے اخراجات کے لئے کمپنی نے اس سے روپیہ طلب کیا۔ اس نے انکار کیا۔ حکام نے اس پر ۵۰۰۰۰ پونڈ جرمانہ کردیا۔ گورنر جنرل خود جرمانہ وصول کرنے کے لئے گیا۔ مگر بنارس کے لوگوں نے اپنے راجہ کی حمایت میں اسے محصور کرلیا۔ ایک خفیف سی چپقلش ہوئی۔ راجہ کی افواج کو شکست ہوئی۔ اور اُسے گدی سے اُتار دیا گیا اس معاملے کی نوعیت بھی شبہ سے خالی نہیں۔ راجہ سے روپے کا طلب کیا جانا ایسا معاملہ تھا جو پریذیڈنسی علاقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اور یہ ایک مشکوک امر ہے کہ آیا گورنر جنرل کو اس معاملے میں عمل کرنے کا اختیار تھا یا نہیں بدقسمتی سے راجہ کے بعد کے جانشین بہت ظالم اور جابر ثابت ہوئے۔ اور یکے بعد دیگرے گدی سے اتار دئے گئے۔

(۲) بنارس کے واقع کے بعد اودھ کا حادثہ رونما ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ اودھ کا نواب فوت ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تھا۔ نئے نواب کی دادی اور ماں نے مرحوم نواب کے خزاین واملاک کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اور کونسل نے فیصلہ کیا تھا کہ بیگمات اودھ کا قبضہ برقرار رہنے دیا جائے آخر الامر گورنر جنرل نے نواب سے ایک نیا معاہدہ کر لیا۔ معاہدہ کی شائع شدہ شرائط میں خزانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مگر یہ بات بالکل عیاں تھی کہ اس کے متعلق بھی کوئی سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ نواب نے ان خواجہ سراؤں کو گرفتار کر لیا جو بیگمات کی جائداد کا انتظام کرتے تھے۔ اور ان سے جبراً دستاویزات لکھوالیں فروری ۱۷۸۲ء تک ..... ۵ پونڈ وصول ہو چکے تھے۔ باقی ماندہ رقم کے لئے غریبوں کو طرح طرح کی ایذا اور تکالیف دی گئیں۔ مگر بے سود۔ آخر کار انہیں رہا کر دیا گیا۔ نواب نے ...... ا پونڈ کی گراں قدر رقم گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی گو پہلے کمپنی کے احکامات صادر ہو چکے تھے۔ کہ گورنر جنرل کبھی کوئی تحفہ نہ لیا کریں۔ تاہم ہسیٹنگز نے یہ تحفہ قبول کر لیا۔ اور کمپنی کے حساب میں جمع کرا دیا۔

اب انگلستان کے واقعات سنئے

۱۷۷۵ء میں ڈائرکٹروں نے کونسل کے فیصلے کی تائید کی تھی۔ اور لارڈ نارتھ وزیر اعظم بھی ان کے ہم خیال تھے۔ اور گورنر جنرل کے خلاف۔ اس واقع کے بعد ملک کی توجہ انقلاب امریکہ کی طرف بٹ گئی۔ مگر ۱۷۸۱ء میں پھر ہندوستان کے معاملات کا سوال پیدا ہوا۔ دارالعوام نے دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ اور ان کی رپورٹ ہسیٹنگز کے خلاف پائی گئی۔ چنانچہ دارالعوام کی ایک کمیٹی میں ڈنداس نے ایک قرارداد پیش کی جسمیں گورنر جنرل کے طرف ملک گیری کے خلاف ملامت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور یہ قرارداد پاس ہو گئی۔

۱۷۸۵ء میں گورنر جنرل اپنے عہدے کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر وطن لوٹ آیا۔ اور لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ ۱۷۸۶ء میں میجر سکاٹ کے غیر دانشمندانہ طرز عمل کے باعث برک نے پارلیمنٹ میں ہیسٹنگز کے خلاف ۲۰ الزامات کی اطلاع دی ہیسٹنگز نے درخواست دی کہ اُسے جواب دہی کی اجازت دیجائے۔ اجازت مل گئی۔ اور وہ پارلیمنٹ کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس موقع پر اس سے یہ غلطی ہوئی کہ اسنے ایک لمبا چوڑا جواب پڑھنا شروع کر دیا جس سے اراکین کی طبیعت اکتا گئی۔

پہلی جون ۱۷۸۶ء کو برک کی تجویز جس میں روہیلوں کے خلاف جنگ کی مذمت کیگئی تھی فرو کر دی گئی۔ مگر ۱۳ جون کو بنارس والے معاملے کی تحریک پیش ہوئی۔ اور پٹ کی مدد سے کامیاب ہو گئی۔ آخر کار اپریل ۱۷۸۷ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا فرض یہ تھا کہ الزامات کی فہرست اور تفصیل مرتب کرے۔ ۱۰ مئی ۱۷۸۷ء کو استغاثہ دائر کرنے کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اور دارالعوام کے اراکین نے برک فاکس اور شریڈن منتظمین کے ہنما مقرر کئے۔ ہیسٹنگز نے۔ لا، بلر، اور فرلاس کو اپنا مشیر قانون مقرر کیا۔

۱۷۸۸ء ۱۳ فروری کو مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ لارڈ تھرلو عدالت کے صدر تھے۔ مقدمہ اپریل ۱۷۹۵ء تک چلتا رہا۔ آخر کار ہیسٹنگز کی بریت کا حکم صادر ہوا۔ مگر اس دوران میں وہ قریب قریب ہر طرح سے برباد ہو چکا تھا۔ جب پارلیمنٹ میں لارڈ داخل ہوئے ہیں اسوقت کا منظر بہت مرعوب کن اور جاذب نظر تھا۔

پہلے ہیسٹنگز کٹہرے میں داخل ہو کر عدالت کے صدر لارڈ تھرلو کے سامنے جھک گیا۔ اور اس کے بعد الزامات کی تفصیل پڑھی گئی۔ ان میں سے اہم الزامات واقعہ بنارس۔ بیگمات اودھ اور رشوت ستانی کے متعلق تھے ۱۵ فروری ۱۷۸۸ء کو انگلستان کے مشہور ترین مقرر برک نے استغاثے کی طرف سے ابتدائی تقریر شروع کی۔ چار دن تک فصیح البیان مقرر ناقابل اتباع روانی و بلاغت کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ۔ سیاسی اور معاشری حالات اور وہاں کے دوسرے حالات کی تصویر کھینچتا رہا۔

۱۸ فروری کو اس نے اپنی تقریر اسطرح ختم کی۔

میں مسٹر ہیسٹنگز پر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ذاتی اغراض کے لئے نظام حکومت کو فنا کر دیا۔ اور ایسا کرنے کا انہیں کوئی حق نہ تھا۔

میں ان پر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے ان مخصوص اختیارات کو دوسرے اشخاص کی طرف منتقل کر دیا۔ جو پارلیمنٹ کے قوانین کی رو سے منتقل نہ ہو سکتے تھے۔ اور جو اُنکی ذات کے ساتھ خاص تھے۔

میں انپر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے ... ۶۲ ہزار پونڈ کے سالانہ خرچ پر ایک انجمن قایم کی جسکے رکن انکے لئے محض آلہ کار تھے۔ اور جنکی اپنی کوئی رائے نہ تھی۔

میں انپر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے ایک ہندوستانی کو ان اراکین کا دیوان مقرر کر دیا جو ان کے آقا کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو تمام ملک میں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جسکے متعلق وہ خود جانتے تھے۔ کہ بدنامیوں سے داغدار ہو چکا ہے۔ میں انپر الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے اس دیوان کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل کر دئے جو صرف انہیں کے ساتھ خاص تھے۔

میں ان پر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے گنگا گوبند سنگھ سے رشوت لی۔

میں ان پر الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے فریب سے کام لیکر بنیوہ ،

عورتوں کی ملکیت کو خرد برد کر لیا۔

میں انپر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے بغیر کسی استحقاق قانونی کے یتیموں کی جائدادیں چھین لیں اور بدطینت واوباش لوگوں کو ان جائدادوں کا متولی مقرر کر دیا۔

میں انپر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے ایک نابالغ کے قانونی ولیوں کو برطرف کرکے ان کی جگہ بدطینت واوباش دیبی سنگھ کو مقرر کر دیا۔

میں انپر یہ الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے جان بوجھکر اپنے افعال کے نتائج کو سمجھتے ہوئے دیبی سنگھ کو تین صوبوں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اور یوں وہ براہ راست ایسے ایسے مظالم کا باعث ہوئے۔ جو ضبط تحریر میں نہیں آسکتے۔

میں انپر الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے ملک برباد کر دیا۔ کاشتکاروں کو تباہ کر دیا۔ ان کے مکانوں کو جلا دیا۔ ان کے فصلوں کو قرق کر لیا۔ انکو طرح طرح کے عذاب پہونچائے۔ اور ہندوستان کی صنف نازک کی توہین وتذلیل کی۔ میں انگلستان کے دارالعوام کی طرف سے وارن ہیسٹنگز پر استغاثہ کرتا ہوں۔

میں ان کے خلاف شدید اور سنگین جرائم کے ارتکاب کرنے کا الزام قائم کرتا ہوں

میں ان کے خلاف پارلیمنٹ کی طرف سے استغاثہ کرتا ہوں۔ اس پارلیمنٹ کی طرف سے جسکے اعتماد کو وارن ہیسٹنگز نے مجروح کر دیا ہے۔ اور جس سے فریب ودغابازی کی گئی ہے۔

میں انکے خلاف برطانیہ کے ان لوگوں کی طرف سے استغاثہ کرتا ہوں جنکے قومی کردار کی توہین وتذلیل ہوئی ہے۔ جنکو وارن ہیسٹنگز نے دنیا بھر میں رسوا کر دیا ہے۔

میں وارن ہیسٹنگز پر ہندوستان کے ان لوگوں کی طرف سے استغاثہ کرتا ہوں۔ جنکے حقوق اور آزادی کو اسنے اپنے پاؤں کے تلے روندا ہے۔ جن کے املاک کو اس نے برباد کیا ہے۔ جن کے ملک کو اسنے تباہ کر دیا ہے۔ میں ان کے خلاف انصاف کے ان ازلی قوانین کی طرف سے استغاثہ کرتا ہوں جنکی انہوں نے خلاف ورزی کی ہے۔

اس تقریر کا اثر اتنا تھا۔ کہ امرانے بھی اپنی تالیوں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن تقریر کرنا آسان ہے اور استغاثے کو کامیابی تک پہونچانا مشکل۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی کہ دارالعوام نے ان لوگوں کو اپنا مہتمم مقرر کیا تھا جو قانون داں نہیں تھے۔ جو قانون داں ان لوگوں کو مشورہ دیتے تھے۔ وہ بھی غیر قانون داں حضرات کے ماتحت تھے۔ اور ان میں سے اکثر کیا تمام لوگ شہادت کے مسائل سے ناواقف تھے۔ ان لوگوں کو نہ ضابطے کی خبر تھی۔ نہ اصول شہادت کی۔ شروع ہی میں ضابطے کے متعلق ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

برک چاہتا تھا کہ ہر ایک الزام کے ساتھ ملزم اپنی صفائی بھی پیش کرے مگر ملزم کے وکلا کہتے تھے۔

"پہلے تم اپنے تمام الزامات ثابت کرو۔ اس کے بعد ہم صفائی پیش کرینگے"

عدالت نے فیصلہ کیا کہ وکلائے صفائی کا اعتراض درست ہے۔

اس کے بعد مسٹر فاس نے بنارس کے الزام کے متعلق تقریر کی۔ اسکے بعد مسٹر گرے کی باری آئی۔ اور پھر ایک عجیب دلکش منظر دیکھنے میں آیا۔ یعنی سلجھے ہوئے تین قانون داں کوشش کر رہے تھے کہ مسل پر غیر متعلق باتیں نہ آنے پائیں۔ انہوں نے اعتراضات کا جھاڑ باندھ دیا۔ اور دارالعوام کے مہتمم پریشان ہوگئے۔ ہر اعتراض کا فیصلہ صفائی کے حق میں ہوتا تھا۔

چودھویں دن پارلیمنٹ کا اجلاس ختم ہوا۔

۱۷۸۹ء کو جب پارلیمنٹ کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ تو برک نے اپریل ۱۷۸۹ء کو رشوت ستانی کے الزام کے متعلق تقریر شروع کی۔ برک نے انہوں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ ملزم نے نندکمار کو چیف جسٹس کے ہاتھوں پھانسی دلوائی تھی۔ اور یوں قتل عمد کا مرتکب ہوا تھا۔ دارالعوام نے بحث کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ انہوں نے قتل کا الزام قائم کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ چنانچہ یہ الزام واپس لے لیا گیا۔ ہیسٹنگز کے معاون یہ سمجھتے تھے کہ اس واقع کے بعد برک مستعفی ہوجائے گا۔ مگر اسنے اپنا الزام واپس لیتے ہوئے اس بات کی تصریح کردی کہ مقدمہ کے اختتام سے پہلے وہ دم نہیں ماریگا۔ ۸ جولائی کو اجلاس پھر ختم ہوا۔ ملزم نے اس مقدمے کی طوالت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی

میرا خیال ہے کہ اگر ملزم شروع سے اپنے جرائم کا اعتراف کرلیتا تو اسے کبھی اتنی سزا نہ ملتی جتنی روپے کے صرف اور مقدمے کی طوالت سے مل رہی تھی

آخرکار مئی ۱۷۹۲ء کو صفائی کی شہادت شروع ہوئی۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں رہ چکے تھے اور ان خطرات سے واقف تھے جو گورنر جنرل کو پیش آئے ہیں گواہ کے طور پر طلب کئے گئے۔ عام طور پر ہندوستان میں ملازمت کرنے والے انگریز ملزم کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور اس لئے فوراً گواہی کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔

یوں بھی پروپیگنڈا جاری تھا۔ اور ملک میں ملزم کے فائدے کے لئے بہت ہی تحریکیں کام کررہی تھیں۔

برک صفائی کے گواہوں پر بہت سختی سے جرح کرتا تھا۔ حتیٰ کہ آرچ بشپ آف یارک یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ شاید مسٹر برک گواہان صفائی کو اچکا تصور کرتے ہیں

آخرکار شہادت صفائی اور اس کے بعد مزید شہادت استغاثہ ختم ہوئی۔ ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دیا۔ دارالامرا کے اراکین کے ووٹ لئے گئے اور اراکین مندرجہ بالا نے ملزم کو تمام الزامات سے

بے تصور ظاہر کیا۔ یوں آٹھ سال کی طویل مدت کے بعد یہ مشہور مقدمہ ختم ہوا۔

مقدمے کے اصل واقعات کیا تھے؟

برک اور اس کے رفقا اپنے الزامات کو بالکل صحیح تصور کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی مظلوم رعایا کے حالات سنکر ہی متاثر ہو چکے تھے۔ اور رعایا کی مظلومیت کا باعث وارن ہیسٹنگز کو ٹھہراتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس نے رشوت لی۔

اس کی بریت کا فیصلہ واقعی انصاف کا فیصلہ تھا۔

لارڈ برکن ہیڈ

وفا

مے گسار شاعر کا ترانہ

فلک پہ مہر و ماہ مری محفلوں کے جام ہیں ستارے سب غلام ہیں کہ رقص میں دوام ہیں
مناظرِ شب و سحر جو زندگی میں عام ہیں کئی ضیا پذیر ہیں، کئی سیاہ فام ہیں

تمام پر جھلک رہا ہے اِک حجاب نور کا
کوئی کہے کہ عکس ہے یہ جلوہ گاہ طور کا

شراب دلگداز سے ہے گرمجوش زندگی ہجوم کیف سے ہے صرف ناو نوش زندگی
بہار کیش کائنات لالہ پوش زندگی سمن فروش زندگی۔ شراب نوش زندگی

سرور کے وفور سے نگاہ پُر بہار ہے
میرے لئے جہان پر نکھار ہی نکھار ہے

ہوا کی جنبشوں میں لرزشیں شراب کی طرح خدا کی نعمتوں کی بارشیں شراب کی طرح
فروغ دلکشی میں تابشیں شراب کی طرح خمار عاشقی میں کاہشیں شراب کی طرح

غرض ہر ایک چیز جو حسین ہے جمیل ہے
سرور کی کفیل ہے شراب کی مثیل ہے

عابد

انقلاب

راحت حسین کا افسانہ۔ اور اس کے مختلف پہلو اس قدر عجیب و غریب ہیں۔ کہ توازن شہادت کے اعتبار سے یہ تو ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ ایک طرف تو معتبر گواہ ہیں۔ اور ایک ناقابل تردید حقیقت۔ اور دوسری طرف کیا ہے! رسوم عقل و ذہن کی پابندی۔ تعصب عقل اور ذہن کی کارفرمائیاں شاید آج تک ایسے معتبر گواہ کسی مقدمے میں شہادت کے لئے پیش نہیں ہوئے ہوں گے۔ شاید دنیا میں کوئی حقیقت اس قدر واضح و قاطع دلایل سے ثابت نہیں ہوئی ہوگی۔ راحت کا جسمانی انقلاب اور تبدیل ہئیت ثابت ہو چکی ہے۔ لیکن جس قدر یہ افسانہ عجیب و غریب ہے۔ شاید اسقدر متحیر کن واقعہ بھی کوئی نہ ہوگا۔

سب سے زیادہ اہم شہادت خود راحت حسین کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے بھی گواہوں کے زمرے میں شامل کرنا ضروری ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں بے تعصبی کے جوش میں واہمے کو حقیقت کا لقب دوں۔ تکلف برطرف۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس افسانے میں ضرور کوئی ٹم ہے۔ لیکن مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ میں ابتک اس ٹم کو معلوم نہیں کر سکا۔

بعض نہایت معزز حلقوں میں اس کہانی کو تمام و کمال تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اب میں اس افسانے کے تمام واقعات قارئین کے سامنے رکھ دوں۔ راحت حسین معمولی غریب آدمی کا لڑکا تھا۔ اور اس نے بی۔اے تک تعلیم پائی تھی۔ وہ جنوبی پنجاب کے ایک سکول میں مشرقی زبانوں کا استاد تھا۔ اور اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو اس کو دوسرے اشخاص سے ممتاز کرتی ہو۔ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ پوری طرح متناسب نہ تھا۔ اس کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے خفیف سی بڑی تھی۔ مگر ان باتوں کے علاوہ اس میں اور کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔ اگر آپ اس کے دل کی حرکت کو محسوس کرتے تو آپ کو اس کے دل کی حرکت اور دوسرے اشخاص کے دل کی حرکت میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ لیکن جو شخص ہر ایک شے کو بغور دیکھنے کا عادی ہے۔ اس پر اس کے دل کے متعلق ایک عجیب و غریب بات کا انکشاف ہوا۔ اور وہ یہ تھی کہ اس کا دل بجائے بائیں جانب ہونے کے دائیں جانب تھا۔ ایک ماہر سرجن کے معائنے سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ خصوصیت صرف اس کے دل ہی میں موجود نہ تھی بلکہ اس کے تمام اعضا اسی طرح بدلے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں پھیپھڑے کی جگہ دائیں پھیپھڑے نے لے لی تھی۔ اور اس کا دایاں ہاتھ بایاں بن گیا تھا۔

ان باتوں کے ثبوت میں راحت حسین نے اپنے بچپن کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ایک تصویر پانچ یا چھ سال کی عمر میں اتروائی گئی ہے۔ اس تصویر میں اس کی بائیں آنکھ دائیں سے ذرا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی دوسری تصویر سے جو ۱۲ سال کی عمر میں کھنچوائی گئی تھی۔ پہلی تصویر کی تائید ہوتی ہے الغرض یہ تمام باتیں اس امر کی کافی شہادت معلوم ہوتی ہیں کہ راحت نے اپنے جسم کا دایاں حصہ بائیں سے بدل لیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ راحت نے اپنے دل کی غیر معمولی حالت سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو متحیر کرنے کے لئے جعلی تصاویر تیار کر لی ہیں۔ لیکن اس کے کردار اور چال چلن سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔ وہ اپنے معاملات میں خوش اخلاق اور راستباز ہے۔ اور شروع ہی سے جھوٹ سے متنفر رہا ہے۔ میرے خیال میں اس کے متعلق کسی طرح بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دنیا کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

علاوہ ازیں اس نے کبھی اپنا افسانہ سنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ الٹا اس معاملے میں بہت خاموش اور کم گو رہا ہے۔ اسے اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ اس کو ایسا عجیب واقعہ پیش آیا ہو۔ افسوس ہے کہ راحت نے اپنی موت کے بعد اپنے جسم کی چیر پھاڑ کی بالکل اجازت نہیں دی۔ اور اس قسم کی تجویز کی بہت شدت سے مخالفت کی ہے۔ ورنہ یہ معاملہ اس کی موت کے بعد عینی شہادت سے طے ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ جن معانی میں ہم عام طور پر زمان و مکان کو سمجھتے ہیں۔ انکی رو سے کسی ٹھوس جسم کے پہلوؤں کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ریاضی کے ماہر کہتے ہیں کہ کسی ٹھوس جسم کے پہلو یا حصے اسی وقت بدلے جا سکتے ہیں۔ کہ ہم اسے اس دنیا کی قیود و مکان سے آزاد کر دیں۔ اور اُسے کسی اور دنیا میں جہاں یہ اصول مکانی رائج نہ ہوں۔ لیجا کر اُس کے پہلو بدل دیں۔ یہ فقرہ بظاہر مہمل نظر آتا ہے۔ مگر قارئین کو چاہیئے کہ کسی ریاضی داں کی مدد سے اس کی صداقت کا امتحان کر دیں۔

اگر ہم اس بات کو اصطلاحی الفاظ میں ادا کرنا چاہیں۔ تو یوں کہینگے کہ راحت کے پہلوؤں کا بدلا ہوا ہونا اس بات کا قاطع ثبوت ہے کہ وہ ہمارے حلقۂ مکان سے نکل کر۔ یعنی ابعادِ ثلاثہ سے آزاد ہو کر بعدِ رابع میں چلا گیا تھا۔ اور کسی طرح پھر اس دنیا میں واپس آگیا ہے۔

اب ہم ان واقعات کی طرف آتے ہیں۔ جن کی وجہ سے راحت اس دنیا سے کچھ عرصہ کے لئے غائب رہا۔ شہادت سے پایا جاتا ہے کہ اپنے سکول میں راحت نہ صرف السنۂ شرقیہ کی تعلیم دیتا تھا۔ بلکہ سائنس ماسٹر کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ اُسے سائنس سے کوئی مس نہ تھا۔ اور نہ اس نے کبھی سائنس پڑھی تھی۔ علم الکیمیا سے خاص طور سے ناواقف تھا۔ لیکن اُسے کوئی خاص دقتیں نہیں پیش آئیں۔ کیونکہ لڑکے اس سے کم سائنس جانتے تھے۔ کچھ لڑکے راحت کی تعلیم سے متاثر ہو کر اس کے پاس مرکبات لیکر آجاتے تھے۔ جن کا وہ تجربہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اکثر ان کے اجزائے ترکیبی کے متعلق جو کچھ جی میں آتا۔ کہہ دیا کرتا تھا۔ تاآنکہ خود اُسے کیمیا سے دلچسپی ہونے لگی۔ اور اس نے اس موضوع پر ایک کتاب خرید کر بغور اس کا مطالعہ کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ علم الکیمیا بہت دلچسپ اور جاذبِ توجہ شے ہے۔

اس وقت تک تو صرف معمولی واقعات کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب سبز سفوف کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے سبز سفوف کے انکشاف کی ابتدا الاعلمی کے سیاہ پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر اتنا علم ہے کہ ایک روز ایک طالب علم مسمی ظفر نے یہ سبز سفوف ایک بوتل میں ڈال کر راحت کو دیا۔ راحت اس وقت پڑھا پڑھا کر کچھ اکتایا ہوا سا تھا چنانچہ اس نے فوراً سفوف کو لیکر اس کا کیمیاوی تجربہ کرنا شروع کر دیا۔

سکول بند ہو چکا تھا مگر لڑکے جو جماعت میں بہت کمزور تھے۔ حکماً روک لئے گئے تھے۔ اب ان پانچوں گواہوں کی شہادت بالکل متفق اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے۔

ان کا بیان ہے کہ راحت نے سفوف کو ایک آلے میں ڈالا۔ اور پھر اسی آلے میں مختلف قسم کے تیزاب ڈالنا شروع کر دئے۔ جب ان باتوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تو اس نے تھوڑا سا سفوف کاغذ پر الٹا۔ اور اُسے دیا سلائی دکھا دی۔ پہلے تو سفوف سلگتا رہا۔ پھر یکایک ایک زور کا دھماکا ہوا۔ اور بجلی کی طرح سے تیز روشنی تمام کمرے میں ایک لمحے کے لئے چمک گئی۔

لڑکوں نے اپنے سر ڈسکوں کے نیچے چھپا لئے۔ اور ان میں سے کوئی بھی غیر معمولی طور پر زخمی نہیں ہوا۔ کھڑکی ٹوٹ گئی۔ سلیٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ جب لڑکوں نے راحت کو نہ دیکھا تو انہوں نے خیال کیا کہ شاید وہ بیہوش ہو گیا ہے۔ مگر جب انہوں نے تمام کمرے کا چپہ چپہ دیکھ لیا۔ اور راحت کا کوئی نشان نہ پایا تو وہ فطرتاً متحیر ہوئے۔

وہ کمرے سے نکل ہی رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے پوچھا مسٹر راحت کہاں ہیں۔؟

لیکن اس سوال کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مسٹر راحت حسین کا تمام جسم کسی آتشگیر مادے کے ساتھ ہی ہوا میں ذرہ ذرہ بن کر تحلیل ہو گیا ہے۔ کسی جگہ راحت کا کوئی کپڑا۔ کوئی نشان موجود نہ تھا۔ کسی جگہ خون کا دھبا بھی تو نہ تھا۔ کہ یہ کہا جا سکے کہ راحت حسین کبھی زندہ تھا۔

تو اس بات کی قطعی شہادت موجود ہے کہ اس دھماکے کے بعد راحت اس دنیا سے بالکل غائب ہو گیا۔

میرے خیال میں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس اضطراب کا تفصیلی بیان کروں۔ جو راحت کی گمشدگی سے سکول اور سکول کے گرد و نواح میں پیدا ہو گیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے بے انتہا کوشش کی کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ راحت سکول چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اس کی گمشدگی کو سبز سفوف اور دھماکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اس کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔ اور بعض لڑکوں کے والدین نے انہیں ایسے سکول سے اٹھا لیا جہاں آتشگیر مادوں کی کوئی حفاظت نہیں کی جاتی۔

راحت کی واپسی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی۔ راحت جس سکول میں ملازم تھا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے باغ میں روش پر ٹہل رہے تھے۔ یکایک بجلی کی طرح کی ایک تیز روشنی چمکی اور پھر کوئی بھاری بھرکم ٹھوس چیز ہیڈ ماسٹر صاحب کے سر پر آرہی۔ وہ اوندھے منہ گر پڑے اور جب انہیں ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ جو شے ان پر بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوئی تھی وہ مسٹر راحت کا وجودِ مبارک تھا۔ اس کے کپڑے تمام پھٹے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ٹوپی ندارد تھی۔ اور پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔

نامناسب ہوگا اگر میں اس منظر کی تصویر کھینچنے کی کوشش کروں۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے ماتحت کے اس بے ادبانہ طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہوں گے۔ اور وہ ان کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔

مسٹر راحت کی تبدیلِ ہئیت کا راز دو تین دن تک پوشیدہ رہا۔ کیونکہ وہ خود اس امر کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر آخرکار ڈاکٹروں کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی۔ اس کا معائنہ کیا گیا اور مختلف طبی رسائل میں اس موضوع پر معرکۃ الآرا مضامین شائع ہوئے۔

یہ تو ہوئے واقعات۔ جن کی صحت سے انکار کرنا گویا مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

باقی رہ گیا راحت کا اپنا بیان۔ لیکن اس کا بیان قلمبند کرنے سے پہلے میں پھر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جہانتک گذشتہ واقعات کا جو سطور مذکورہ بالا میں بیان ہوئے ہیں تعلق ہے۔ اس کے لئے ایسی معتبر اور قطعی شہادت موجود ہے کہ سخت سے سخت قانون داں بھی اُسے کافی تصور کرے گا۔

جس شخص کو اس معاملے میں ذرا سا بھی شک ہو وہ ان اشخاص سے مل کر اپنا شبہ رفع کر سکتا ہے جن کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کا جی چاہے راحت کے بدن کا معائنہ کر کے دیکھ لے آیا اس کا دل واقعی دائیں جانب دھڑک رہا ہے یا نہیں۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اچھا بھلا اس دنیا سے غائب ہوا تھا۔ اور جب وہ واپس آیا تو اس کے جسم کا ہر ایک حصہ منقلب ہو چکا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کے اپنے بیان کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جن واقعات سے اس بیان کا تعلق ہے وہ ایسے ہیں کہ سوائے راحت کے بیان کے ان کا اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا بیان پہلے واقعات کی مطابقت میں رکھا جائے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ انسانی عقل اس قسم کے عجیب واقعات کو تسلیم کرنے سے یک قلم انکار کر دیتی ہے۔

اس کا بیان ہے کہ جب پہلے پہل دھماکا ہوا تو اس نے خیال کیا کہ شاید وہ مر رہا ہے۔ اُسے کسی طاقت نے زمین پر سے اٹھا لیا۔ اور کسی نامعلوم جانب دھکیلنے لگی۔ آخرکار وہ ایک نرم سی چیز پر گر پڑا۔ کچھ عرصے کے لئے اس کے حواس نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فوراً ہی اُسے جلے ہوئے بالوں کی بو آئی۔ اور ہیڈ ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ تھوڑے عرصے تک اس کا خیال یہ رہا کہ وہ جماعت ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے لڑکوں کے تعجب اور ہیڈ ماسٹر کی حیرانی کو صاف دیکھا۔ وہ لڑکوں کی آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ دھماکے کی وجہ سے شاید اس کی قوت سماعت میں کوئی فرق آگیا ہے

اُسے اپنے اردگرد کی اشیا دھندلی دھندلی سی محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن اسنے یہ فرض کر کے اپنے دل کو تسلی دے لی کہ شاید کمرے میں دھواں پھیل گیا ہے اور اس کی وجہ سے اشیا صاف نظر نہ آتی ہوں۔ اس دھندلی سی فضا میں لڑکوں کی شکلیں بھوتوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔

پہلا خیال جو اُسے آیا وہ یہ تھا کہ شاید وہ اندھا ہو گیا ہے چنانچہ اس نے اپنے منہ کو ہاتھوں سے بغور ٹٹول کر دیکھنا شروع کیا۔

آخرکار تھوڑے سے عرصے کے بعد اس کے اردگرد کی فضا یا نظر صاف ہو گئی۔ جماعت کا کمرہ اور طلبا بالکل غائب ہو گئے ان کی جگہ تاریک سی شکلیں موجود تھیں۔ اور اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اس نے خوف کے مارے چیخ ماری۔

دو لڑکے اس کے بدن کے آر پار گذر گئے۔ اور دونوں میں سے کسی نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے پتہ چلے کہ انکو راحت حسین کی موجودگی کا کوئی علم ہے۔ اس کے جذبات کو بیان کرنا تو کجا ان کا تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ اس کا اپنا بیان ہے۔ کہ جب وہ دونوں لڑکے اس کے بدن کے آر پار گذر گئے تو اسے قطعاً کوئی صدمہ محسوس نہیں ہوا۔

اب راحت کو یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ ازبسکہ وہ شروع ہی سے مذہبی تعلیمات سے آشنا رہا تھا۔ اور حیات بعد الممات کے متعلق اس کے عقاید واضح اور مستقل تھے۔ اسے بہت حیرانی ہوئی کہ موت کے بعد یہ جسم کیا معنی رکھتا ہے؟

اس بات کو سوچکر اُسے اپنے یقین میں ترمیم کرنا پڑی اور وہ یہ خیال کرنے لگا کہ شاید اس کے سوا باقی تمام لوگ مر گئے ہیں اور صرف وہ زندہ بچ گیا ہے۔ لیکن اس خیال سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے اِدھر اُدھر تعجب سے دیکھنا شروع کیا

اب اس کے اردگرد مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی میں صرف ایک شعاع۔ سبز روشنی کی تھی۔ جو سیاہ آسمان کے ایک جانب چمک رہی تھی۔ یہ اس کے پہلے تاثرات تھے۔ لیکن جوں جوں اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوتی چلی گئیں۔ اسے محسوس ہوتا گیا کہ فضا میں ایک ہلکی سی سبز روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

اس نے کئی بار کوشش کی کہ جماعت میں جو لوگ چل پھر رہے تھے ان کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرے۔ لیکن ہر بار کوئی غیبی طاقت اُسے روکتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اِس دنیا اور اُس دنیا کے درمیان ایک ایسی حد فاصل قایم ہے جو کسی طرح طے نہیں ہو سکتی۔

آخر اس نے اپنے دوسرے ماحول کی طرف توجہ پھیری۔ اس وقت تک اس کے ہاتھ میں سبز سفوف کی ٹوٹی ہوئی بوتل موجود تھی اس نے بوتل کو جیب میں ڈال لیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس پر ہری ہری دوب مخمل کی طرح نرم۔ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

دور افق کے قریب۔ سبز روشنی کی شعاعیں زیادہ تیز ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ ایک دو قدم چلا۔ مگر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اور پھر بیٹھ کر صبح کا منظر دیکھنے لگا۔ اس وقت اُسے محسوس ہوا کہ اس کے اردگرد کی دنیا پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ اگرچہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ تاہم سبزے کی سرسراہٹ اور درخت کے پتوں کی آواز بالکل مفقود تھی۔

آہستہ آہستہ سبز روشنی زیادہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور اب سبز رنگ میں ایک خونیں سرخ رنگ کی آمیزش ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے تاریکی اور بھی زیادہ گہری اور خوفناک معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت میں یہ اندازہ قایم کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ شاید اُسے رنگوں کا اندازہ قایم کرنے میں دھوکا ہوا۔ اور سرخ رنگ محض اسکے دماغ کا کرشمہ تھا۔

آسمان کے سبز حصے کے آگے کچھ عرصے کے لئے کوئی سیاہ شے آ گئی۔ اور پھر اس طرح معلوم ہوا گویا وادی کی گہرائیوں میں سے کسی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے۔ جوں جوں روشنی بڑھتی جاتی تھی۔ فضا میں گویا کسی متوقع حادثے کے آثار پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے اس نے جھک کر وادی کی طرف دیکھا۔ اور اُسے نظر آیا کہ وادی کی گہرائیوں میں بھی روشنی پہونچ چکی تھی۔ اور تاریکی کے گہرے پردے اُسی سبز روشنی نے چاک کر دیے تھے۔ لیکن وہاں روشنی ابھی تک مدہم تھی۔ جس طرح جگنو ٹمٹما رہا ہو۔

یکایک کوئی آسمانی جسم بلند ہو کر پہاڑیوں کی چوٹیوں کے قریب ظاہر ہوا۔ سبز۔ گہرا سبز۔ اور اُس کی تیز روشنی میں پہاڑیوں کے ویران اور ہیبتناک گڑھے نظر آنے لگے۔ پھر اُسے کچھ چیزیں جو گولائی کی وجہ سے گیندوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ دکھائی دیں۔ وہ ہوا میں تیر رہی تھیں۔ اب گھنٹی کی آواز بہت تیز ہو گئی۔ اور روشنی کے بقعے فضا میں تیرنے لگے۔

راحت اس بات پر بہت مصر ہے کہ اُسے ہماری دنیا کی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ مگر جوں ہی اس دنیا کا سبز آفتاب طلوع ہوا۔ یہ عالم اسباب بالکل غائب ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس دنیا کی رات کے دوران میں حرکت کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ اُس دنیا کی اشیا نظر آتی رہتی ہیں۔ اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ ان میں سے کسی سے ٹکرا جائے گا اگر یہ بات ٹھیک سمجھی جائے تو اس مشکل کا کوئی حل نہیں کہ اس دنیا والوں کو اُس دنیا کی اشیاء بعض دفعہ کیوں نہیں نظر آتیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہمارے آفتاب کی تیز اور روشن شعاعوں کی وجہ سے جو نسبتاً بہت خیرہ کن ہے۔ ہمیں اس دنیا کی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ان کمروں میں بھی اس دنیا کی اشیا نہیں نظر آتیں جن میں نسبتاً اندھیرا ہوتا ہے۔

میں نے راحت سے یہ قصہ سننے کے بعد کئی بار کوشش کی ہے کہ تاریک سے تاریک کمروں میں بیٹھ کر جہاں سورج کی روشنی کا بالکل گذر نہ ہو۔ اس دنیا کے مناظر کو دیکھ سکوں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ درست ہے کہ میں نے اکثر سبز رنگ کی کچھ اشیا فضا میں تیرتی ہوئی دیکھی ہیں مگر وہ اس قدر مبہم تھیں کہ ان کو اشیا کا لقب دینا مہمل ہے۔ شاید ناظرین کو مجھ سے زیادہ کامیابی ہو۔ بہرنوع تجربہ دلچسپ ہے۔ اور یقیناً اس قابل ہے کہ عام لوگ اسے دہرائیں۔

راحت کا بیان ہے کہ اس واقعے کے بعد اس نے اکثر خواب میں دوسری دنیا کے مناظر دیکھے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذہن میں جو تاثرات اس دنیا کے نقش ہو چکے تھے۔ وہی بار بار دہرائے گئے ہوں گے۔ شاید اس دنیا کے تیز نظر لوگ ہماری دنیا کی ایک جھلک کبھی کبھار دیکھ لیتے ہوں۔

خیر۔ تو جونہی سبز آفتاب طلوع ہوا۔ راحت نے دیکھا کہ

وادی میں سیاہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس نے چٹان پر سے اترنا شروع کیا۔ یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا۔ کیونکہ چٹان کے پتھر اس قسم کے تھے کہ پاؤں کی جنبش سے اپنی جگہ سے لڑھک جاتے تھے۔ اور خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ کہ شاید راحت بھی تحت الثریٰ میں جا گریگا۔

وہ نیچے اتر رہا تھا۔ اور اس کے قدموں کی چاپ اس فضا کی ہیبتناک خاموشی میں ایک غیر متوازن ہنگامہ پیدا کر رہی تھی۔ جوں جوں وہ مکانات کے قریب آتا چلا گیا اُسے معلوم ہوتا گیا کہ عمارات مقبروں کی طرح بنی ہوئی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کا رنگ سیاہ تھا۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ بہت ہی سبزی مائل۔ گول سی شکلیں ایک عمارت میں سے نکل رہی تھیں۔

یہ اشکال چوک میں آ کر بکھر گئیں۔ کچھ تو عمارتوں میں داخل ہو گئیں اور کچھ دوسری گلیوں کی طرف مڑ گئیں۔ کچھ اس پہاڑی پر نمودار ہیں جس پر راحت کھڑا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

راحت نقش بدیوار ہو کر رہ گیا۔ یہ اشکال بجائے چلنے کے ہوا میں تیر رہی ہیں۔ حقیقت میں ان کے اعضا موجود ہی نہ تھے۔ ہاں ان کے سر انسانی سروں کی طرح تھے۔ لیکن اس کے علاوہ انکے سر سے نچلا حصہ ایک تارپیڈو کی طرح ہوا میں تیر رہا تھا۔ راحت کو اس قدر تعجب ہوا کہ وہ ڈرنا بھی بھول گیا۔

یہ شکلیں اس کی طرف اڑی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ عین اس طرح جس طرح پانی کے بلبلے ہوا کے جھونکوں سے اُڑتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

جب وہ شکلیں اس کے قریب آئیں تو اس نے غور سے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کے سر انسانی سروں ہی کی طرح تھے۔ اس نے ایک شکل کی طرف زیادہ غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر غم والم کے اتنے گہرے نقوش ثبت تھے کہ راحت نے اپنی تمام عمر میں کسی اور انسان کے چہرے پر نہ دیکھے تھے سوائے اس بات کے کہ اس شکل کی آنکھیں نسبتاً بڑی تھیں۔ اس کے چہرے میں اور کسی معمولی انسان کے چہرے میں اور کوئی خاص فرق نہ تھا۔

اُسے اس بات پر بے انتہا تعجب ہوا کہ اس شکل نے راحت کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ اس طرح گذر گئی گویا کسی شے کا تعاقب کر رہی ہے پہلے پہل تو اُسے اس بات کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مگر پھر اُسے احساس ہوا کہ یہ شکل ہماری دنیا میں کسی واقعے یا کسی شے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جب وہ شکل اس کے پاس سے گذری تو ایک عجیب سی آواز الم پیدا ہوئی۔ بعد ازاں اس کا جسم اس شکل سے ٹکرا گیا۔ جو سرد موت کی طرح سرد تھی۔ اور پھر وہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف صعود کر گئی۔

راحت کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے دوڑ گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اس شکل اور اس سکول کے ہیڈ ماسٹر کے چہرے میں ایک خاص قسم کی مشابہت پائی جاتی تھی۔ جہاں وہ کام کرتا رہا تھا۔

لیکن جلدی ہی اس کی توجہ دوسری شکلوں کی طرف منعطف ہو گئی۔ ان میں سے کسی کی طرف سے جان پہچان کا اظہار نہیں ہوا۔ بعض شکلیں اس کے بہت قریب آ گئیں اور اُس کے جسم سے ٹکرانا ہی چاہتی تھیں مگر وہ آگے سے ہٹ گیا۔ ان اشکال میں سے تقریباً تمام کے چہروں پر اسی انتہائی کرب والم کے آثار ہویدا تھے جو راحت نے پہلی شکل کے چہرے پر دیکھے تھے۔ اور جب وہ شکلیں اس کے قریب سے گذرتی تھیں تو اسی طرح کی ایک یاس انگیز اور غم افزا آواز پیدا ہوتی تھی۔

ان میں سے ایک شکل تو رو رہی تھی۔ اور ایک کے چہرے پر حقارت اور غصے کے نشان پیدا تھے۔ لیکن بعض شکلوں کے چہرے جذبات کے نشان سے بالکل معرا تھے۔ اور بعض کے چہروں پر مسرت کی جھلک بھی دکھلائی دیتی تھی۔ ایک کے چہرے پر تو انتہائی خوشی برس رہی تھی۔

راحت بہت عرصہ ان شکلوں کو چٹان کی چوٹی کی طرف جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اور جب عمارات میں سے ان اشکال کی آمد بند ہو گئی تو اس نے پھر نیچے اترنا شروع کیا۔ اب آسمان گہرے سبز رنگ میں رنگا گیا تھا۔

راحت کو مطلقاً بھوک پیاس محسوس نہ ہوتی تھی۔ آخر جب اُسے بھوک لگی بھی تو اس نے ایک بہتی ہوئی ندی کے کنارے جو کائی جمی ہوئی تھی اُسے کرید کر کھا لیا۔ یہ کائی لذیذ تو نہ تھی مگر ناخوشگوار بھی نہیں تھی۔ آخر وہ اس بڑی عمارت کے قریب آ پہونچا جہاں سے سبز اشکال برآمد ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلا تھا اور اس نے دیکھا کہ اندر ایک قربانگاہ بنی ہوئی ہے جس پر سبز روشنی دینے والی شمعیں جل رہی تھیں۔ ابھی وہ اس عمارت کی نوعیت پر غور ہی کر رہا تھا کہ باہر سڑک پر بھاری بھرکم قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بھاگ کر تاریک گوشوں میں چھپ گیا۔ اسے خیال آیا کہ گھنٹی بجا کر دیکھے

لیکن بعد ازاں اس نے قدموں کی چاپ کا تعاقب کرنے کا ارادہ کر لیا وہ بہتیرا بھاگا۔ اس نے آوازیں بھی دیں۔ مگر بے سود۔

راحت نے سات آٹھ دن پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے آوازوں کا تعاقب کرنے اور سیاہ عمارتوں کو دیکھنے میں گذارے لیکن اس اثنا میں وہ کسی ایسی چیز یا شکل سے ملاقی نہیں ہوا۔ جس سے وہ کوئی بات کر سکے۔ رات کو وہ کائی جمے ہوئے پتھروں پر سو رہتا۔ آخر کار اُسے معلوم ہوا کہ جتنے لوگ اس دنیا میں بستے ہیں انکا تعلق ان بے جسم کے سروں سے ہے۔ اور ہر شخص کے افعال و حرکات کو ان شکلوں میں سے کم از کم ایک شکل ضرور غور سے دیکھتی رہتی ہے۔

راحت کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ زندوں کو دیکھنے والے" کون ہیں۔ مگر اسے اس بات کا ضرور احساس ہوا کہ جو دو شکلیں کبھی کبھی اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ ان کے چہرے اس کے والدین سے مشابہت رکھتے تھے۔ جب کبھی وہ دو شکلیں اس کی طرف دیکھتیں راحت حسین کو یہ محسوس ہوتا گویا اس کی ذمہ واریوں میں ایک بہت بڑے بوجھ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ وہاں اور بھی کئی شکلیں تھیں جنہیں وہ اب پہچان سکتا تھا۔ کوئی اس کے دوست تھے۔ کوئی دشمن۔ مگر وہ شکلیں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی تھیں۔ ہاں اس کی ماں اس کی طرف نگاہیں گاڑ کر پہروں دیکھا کرتی۔ اگرچہ راحت کو یہ جرأت کبھی نہیں ہوئی کہ اس سے سلسلہ کلام شروع کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی نگاہوں میں محبت اور سرزنش کے عناصر ملے ہوئے تھے۔

راحت صرف اپنے افسانے کو بیان کرتا ہے اور اس حیرت انگیز قصے کی صراحت یا وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

یہ ہمارے ذمے ہے کہ ہم ان لوگوں کی نوعیت اور فطرت سے اپنے آپ کو باخبر کریں۔

یہ لوگ کون ہیں۔ جو اس طرح زندہ آدمیوں کے افعال کی نگرانی کرتے ہیں؟

اگر وہ مردہ ہیں تو ان کو اس دنیا کے کاموں سے کیا تعلق ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں جس بات کے لئے اسباب پیدا کئے ہیں۔ موت کے بعد بھی ہمیں اس بات سے دلچسپی رہے۔ اور ہم مجبور ہوں کہ اپنے کئے ہوئے کاموں کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ آخر کار نویں دن ان قدموں کی چاپ قریب تر آتی گئی۔ جن کا ہمیشہ وہ تعاقب کیا کرتا تھا۔

وہ وادی کے قریب آگیا۔ اور یہاں آکر اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

وادی میں ہر طرح کی شکلیں موجود تھیں۔ اور ان کا اتنا اجتماع تھا کہ راحت نے ان کو اس تعداد میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب راحت اس جگہ پہنچا جہاں وہ شکلیں جمع تھیں۔ تو وہ ہجوم کی وجہ سے آگے نہ جا سکا۔ اور کھڑا ہو گیا۔ یکا یک اُسے اپنے شہر کا ایک کمرہ نظر آیا۔

ارد گرد تاریکی تھی۔ اور وہ کمرہ اس تاریکی میں ایک شعاع نور معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں ایک شمع جل رہی تھی۔ بستر پر ایک نوجوان۔ ناتواں شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ قریب ہی ایک میز تھی۔ جس پر دوائی کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس مریض نوجوان کے لب ہلکر رہ جاتے تھے۔ کمرے میں ایک طرف ایک عورت کھڑی ہوئی کاغذات کے ایک پلندے کو الٹ پلٹ رہی تھی۔

پہلے پہل تو یہ تصویر بالکل صاف نظر آتی تھی۔ لیکن پھر سبز آفتاب طلوع ہونے لگا۔ اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ اب بھی کمرے کی چیزیں مبہم طور پر نظر آرہی تھیں۔ قدموں کی چاپ قریب تر آتی گئی۔

یوں تو تمام شکلیں اس منظر کو بہت گہری دلچسپی اور توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن دو شکلیں ان سے بہت متاثر نظر آتی تھیں ایک تو عورت کی شکل تھی۔ جس کے چہرے پر استقلال اور صبر و رضا کی علامات تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ سمجھ رہی ہے کہ اب ایسا فعل ہونے والا ہے۔ جس کو روکنا اس کے اختیار میں نہیں۔ دوسری شکل ایک مرد کی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی حزن و ملال کے آثار پائے جاتے تھے۔

ان شکلوں کے پیچھے اور کئی شکلیں کھڑی تھیں۔ اور ان کے چہروں پر بھی بہ نسبت دوسری شکلوں کے اس منظر کے تاثرات زیادہ گہرے تھے۔

یکا یک قدموں کی چاپ بند ہو گئی۔ یکسر خاموشی۔ مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ اور پھر گھنٹی کی آواز آنی شروع ہوئی۔ جب گھنٹی دوسری بار بجی۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا۔ موت کی طرح سرد۔ سنسناتا ہوا گذر گیا

اور پھر راحت نے دیکھا کہ سایے کی طرح۔ تاریک۔ اور مبہم ایک ہاتھ پیدا ہوا جس کی تاریک انگلیوں نے کمرے کی فضا میں اندھیرا پیدا کر دیا۔ یہ ہاتھ شکلوں کے اوپر سے گذر کر۔ سایے کی طرح۔ کمرے میں پہونچ رہا تھا۔

بستر پر نوجوان۔ ناتواں اور مریض نوجوان۔ تڑپا اور پھر۔ اس تاریک ہاتھ۔ موت کے تاریک ہاتھ نے۔ اس کی روح اپنے قبضۂ قدرت میں لے لی۔

راحت نے اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔ اور اس مبہم سایہ مثال ہاتھ کی ہیبت سے ڈر کر۔ بھاگنا شروع کیا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ وہ گر رہا ہے۔ اور جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے باغ میں موجود تھا۔

یہ تو راحت کا قصہ ہے۔

صرف اتنا کہنا اور ضروری ہے کہ جس دن کا قصہ راحت سناتا ہے۔ اسی دن اس کے شہر میں محمد عظیم ایک نوجوان لڑکے کی موت واقع ہوئی تھی۔

ان تمام باتوں کے بعد میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہاں تک تو ناقابل تردید شہادت سے ثابت ہو چکا ہے کہ راحت ۹ دن تک اپنے سکول سے غائب رہا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا افسانہ بھی سچ ہے۔ ممکن ہے کہ مکان کی قیود کے باہر بھی آدمی توہم کا شکار ہو سکتا ہو۔

(ایچ۔ جی ویلز) سید جواد حیدر ایم۔ اے

بھونرا

طائرِ خوش خبر ہے نام مرا — الفتِ حُسن ہے پیام مرا
میری بستی ہے پھُول کی خوشبو — غنچۂ گُل کی دید کام مرا
وادیٔ کوہ سیر گاہ مری — باغ مسکن ہے صبح و شام مرا
نہیں کس گل سے رسم و راہ مری! — سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا
پھول پھولے نہیں سماتے ہیں — مسکراتے ہیں سن کے نام مرا
جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں! — جُھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا
مانتے ہیں صنوبر و شمشاد — سروِ آزاد ہے غلام مرا
بادۂ انس کا نشہ ہے مجھے — مۓ اُلفت سے پر ہے جام مرا
حُسن کو ڈھونڈتا ہوں ہر گل میں — ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستیٔ من
ہوشیاری نثارِ مستیٔ من

شاہدِ گل کا حُسن جاں پرور — کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھکر؟
ابھی اس کے جمالِ رعنا تک — نہیں پہونچی نگاہِ ذوقِ نظر
ابھی اس بھینی بھینی خوشبو سے — نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر
ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو — نہیں دھویا ہے اوس نے آکر
حال پر عندلیب نالاں کے — نہیں کی اُس نے مُسکرا کے نظر
میں ہوں اس حال میں بھی گُل سے قریں — ہیں عنایات اس قدر مجھ پر
ہم نفس ہوں انیس و محرم ہوں — میری اُلفت میں اسقدر ہے اثر

حجلہ آرائے خلوتستم من
بزم پیرائے جلوتستم من

نیرنگ

زمانۂ مستقبل کی معاشرت

سو سال پہلے کپڑے ہاتھ سے تیار ہوتے تھے۔ اشیائے خوردنی ہاتھ سے تیار کیجاتی تھیں۔ جہاز ہوا کے زور سے چلتے تھے۔ اور ہم اکثر پیدل یا گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے تھے۔ مگر اب یہ باتیں قصۂ پارینہ بن گئی ہیں۔

اب مشینوں کا زمانہ ہے۔ جدھر دیکھو صنعت و حرفت کے کام مشینوں سے انجام پا رہے ہیں۔ سامان راحت کلوں کے ذریعے مہیا ہو رہے ہیں۔ اگرچہ مشینوں کی سہولت بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ تازہ خالص ہوا سے ہم محروم ہو گئے ہیں مگر مشینوں نے ہمارے دل و دماغ اور معاشرت پر ایسا تصرف حاصل کر لیا ہے کہ اب ان کے بغیر ہمارا کوئی کام ہی نہیں چل سکتا۔ ہماری پوشاک مشینوں سے تیار ہوتی ہے۔ ہماری غذا کلوں کی مرہون احسان ہے ہم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے شہر کے مختلف حصوں یا قرب و جوار میں مشینوں کے ذریعے بات چیت کرتے ہیں۔ دنیا کے دور و دراز حصوں کی خبریں ہمیں کلوں ہی کے وسیلے سے وصول ہوتی ہیں۔ سفر موٹر کاروں۔ ریلوں ہوائی اور بحری جہازوں سے طے ہوتا ہے۔

گھریلو زندگی میں بھی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ پہلے گھر کے سارے دھندے عورتوں کے سپرد تھے اب مشینوں سے ہو رہے ہیں۔ جو باقی رہ گئے ہیں آئندہ وہ بھی مشینوں سے ہوا کرینگے۔ وہ دن دور نہیں ہے۔ کہ گھر کے تمام چھوٹے بڑے کام جیسے سوئیے۔ رفو کرنے۔ کھانا پکانے۔ دسترخوان چننے بستر بچھانے کا کام عورتوں کے بجائے مشینیں کیا کرینگی۔ آنے والے زمانے میں یہ توشک اور تکیے نہیں ہوں گے۔ بلکہ نرم اور خوبصورت کپڑے کی لمبی چوڑی تھیلیوں میں ہوا بھر کر بچھونے کا کام لیا جائیگا۔ اوڑھنے کے واسطے کمبل نہ ہونگے۔ بلکہ ریشم کی ملایم اور ہلکی مگر نہایت گرم چادریں ہونگی۔ اس طرح سارا اوڑھنا بچھونا لمبے لفافے سے زیادہ بڑا نہ ہوگا۔ اور جب چاہے ہر شخص اپنا اوڑھنا بچھونا لپیٹ کر جیب میں ڈال لیگا۔ اور جب چاہے گا ہوا بھر کر بچھا لیگا پلنگ کی بھی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ وہی ہوائی گدیلا پلنگ کا کام دے گا۔

آنے والے زمانے میں موسم سرما میں کمرے برقی تاروں سے گرم کئے جائینگے۔ جو فرش میں چھپے ہوں گے۔

سونے کے کمرے میں پلنگ کے قریب بجلی کی تاروں کا سلسلہ ہوگا جسکے وسیلے سے ہر چیز پلنگ ہی پر منگالی جائے گی۔ ہر ایک تار سے ڈھکنے لگے ہونگے کسی پر چائے۔ کسی پر قہوہ۔ کسی پر گوشت۔ کسی پر انڈا لکھا ہوگا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے الگ الگ نام منقش ہوں گے جس چیز کی ضرورت ہوئی ڈھکنے والا تار دبایا۔ اور فوراً منگالی۔ ادھر باورچی خانے کے اندر پکانے کا تمام کام برقی تاروں اور مشینوں سے ہوا کرے گا۔ مشین سے انڈا پھوٹ کر فرائی پین میں گر پڑے گا۔ دوسری کل اس میں روغن اور مصالحہ ڈال دے گی۔ کسی مشین سے پانی اور کسی سے دودھ گرم ہوا کرے گا۔

آنے والے زمانے میں کھانے کی میز ایسی نہ ہوگی۔ جیسی اب ہے بلکہ یہ ایک قسم کی مشین ہوگی۔ کھانا کھانے والوں کے لئے مختلف حصے مقرر ہوں گے۔ مگر میز صندوق نما ہوگی۔ ہر ایک حصے پر ڈھکنے لگے ہوں گے جس پر کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے نام لکھے ہوں گے۔ پانی قہوہ۔ چائے وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے نل ہوں گے۔ جن کا سلسلہ باورچی خانے سے پیوستہ ہوگا۔ جہاں بجلی کے تاروں اور کلوں سے مختلف چیزیں پکا کرینگی۔ اور نالیوں کے ذریعے کھانے کی میز پر آجایا کریں گی۔ صرف بٹن دبانا کافی ہوگا۔ کسی کو اٹھ کر جانے یا کسی کو بلانے اور کہنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

بٹن دبانے سے بستر لپٹ کر ایک کونے میں جا رہے گا۔ دوسرا بٹن دبانے سے کمرے کی گرد صاف ہو جائے گی۔ ایک اور بٹن دبانے سے دیواروں تک کی گرد مشین میں جمع ہونی شروع ہو جائے گی۔ اور چند منٹوں میں سارا کمرہ بالکل صاف ہو جائے گا۔ پہننے کے کپڑے بالکل اور ہی قسم کے ہوں گے جنہیں اکٹھے کر کے ایک صندوق کے اندر ڈال دینگے۔ وہ تھوڑی دیر میں دھل کر صاف ہو جایا کرینگے۔ مشین سے استری بھی جھٹ پٹ ہو جایا کرے گی۔ آئندہ زمانے میں پانی سے غسل کا کام نہ لیا جائے گا۔ بلکہ بھاپ وغیرہ سے جسم کو دھویا جائیگا جسکی بدولت جسم بہت تنومند اور توانا رہے گا گھروں میں فرشوں پر نمالیچے نہ بچھائے جائیں گے بلکہ ربڑ کی چادریں فرش پر لگائی جائیں گی۔ جو قالین کی مانند خوبصورت اور نرم ہوں گی۔ کرسیاں سوفے۔ کوچ وغیرہ میں ہوا بھری ہوگی۔ اگر کسی دوست یا عزیز کے ہاں جاتے ہوئے اگر چاہیں تو کرسی اور بستر بغل میں دبا کر لیجا سکیں گے۔

چند دن ہوئے نیویارک کی نمایش گاہ میں ایک دو منزلہ مکان دکھایا گیا تھا۔ جو نصف گھوڑے کی طاقت کے برقی موٹر انجن سے گھوم سکتا ہے۔ آنے والے زمانے کے مکان غالباً اسی نمونے کے ہوں گے اور سورج مکھی پھول کی طرح سورج کے رخ کے ساتھ ساتھ گھوما کرینگے

دیواریں غالباً کھوکھلی کانچ کی ہونگی - نل کا منہ کھول کر اس کے اندر دودھیا رنگ کی کوئی سیال چیز بھر دینے سے اس کے آر پار کچھ دکھائی نہ دیگا - مگر روشنی بے روک ٹوک مکان کے اندر آتی رہے گی -

گھر میں بیٹھے بیٹھے جس چیز کی ضرورت ہوگی بازار سے منگالی جائیگی جس طرح گھر کے تمام کام مشینوں سے انجام پذیر ہونگے - اسی طرح جسمانی اور دماغی کام بھی کلوں ہی سے ہوا کریں گے - کلرکوں کا کام مشینوں سے لیا جائے گا -

آجکل جس طرح حسابی سوالات کا جواب کلرکوں کو دینا پڑتا ہے - آئندہ مشین دیا کرے گی - ڈاکخانے کے کلرکوں کا کام بھی مشینوں ہی سے ہوا کرے گا - آجکل بھی ٹکٹ فروخت کرنے کی مشین کام دے رہی ہے - آئندہ تار گھر میں بھی مشین ہی سے کام چلا کرے گا - پارسل بھی مشین ہی لیا دیا کریگی - سیونگ بنک کا کام بھی مشینوں ہی سے ہوگا - ڈاکخانے سے خطوط تاروں اور نلوں کے وسیلے سے گھروں میں پہنچ جایا کرینگے - جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا انسان کا جسمانی کام کم مگر دماغی کام بڑھتا جائے گا -

یعنی لوگ غور و فکر میں زیادہ مصروف ہوا کریں گے - اور تمام دنیا ان مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہے گی - جن کی طرف ابھی ہماری توجہ بھی نہیں ہے - مشینوں کی ہدایت اور انتظام کے لئے بہت سے آدمی درکار ہوں گے - دفتروں کے بجائے کیمیا خانے اور کارخانوں کے بجائے بجلی گھر ہوا کرینگے - لوگوں کو سیر اور تفریح کا اب سے کہیں زیادہ وقت ملیگا -

(ماخوذ از سنڈے ایکسپریس - لندن)　　"شمیم"

تریبنی

(۱)

پریاگ پہ بچھڑی ہوئی بہنیں جو ملی ہیں　　پانی کی زمیں پر بھی تو کلیاں سی کھلی ہیں
کچھ گنگا کا ڈکنا　　کچھ جمنا کا جھکنا
پھر دونوں کا ملنا　　وہ پھول سے کھلنا
کس شوق سے اٹھلاتی ہوئی ساتھ چلی ہیں　　یہ عشق و محبت کے نظارے ازلی ہیں

(۲)

کہتے ہیں کہ جنت سے آئی ہے بہن ایک　　گو تینوں کا ہے اصل میں گھر ایک وطن ایک
گھر جب سے چھٹا تھا　　دل سرد ہوا تھا
وہ کوہ سے گرنا　　وہ دشت میں پھرنا
راتوں کو وہ سنسان بیابان میں پھرنا　　سہمے ہوئے تاروں کا وہ سینے پہ مچلنا

(۳)

تنہا وہ سفر دشت میں میدان میں بن میں　　خاموش پہاڑوں میں بیاباں میں چمن میں
جنگل سے نکلنا　　رکتے ہوئے چلنا
بڑھ بڑھ کے پلٹنا　　ڈر ڈر کے سمٹنا
مر مر کے اکیلے یہ گذارا ہے زمانہ　　جیسے کوئی دنیا میں نہ ہو اپنا یگانہ

(۴)

خالی کبھی جاتی نہیں بے لفظ صدائیں　　آخر کو اثر کر گئیں خاموش دعائیں
جاگا ہے مقدر　　پریاگ یہ آ کر
اب غم نہ سہیں گی　　تنہا نہ رہیں گی
پریاگ پہ بہنوں کو ملایا ہے خدا نے　　مدت میں یہ دن آج دکھایا ہے خدا نے

افسر میرٹھی

دِل کا قصور

کزیہ بطخوں کے کچھ انڈے ایک قریبی رشتہ دار کو نذر کرنے کے لئے ہتیسٹرین فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

یہ خوبصورت دوشیزہ ایک مالدار کسان کی اکلوتی بیٹی تھی گھر کے ڈربے سے بطخوں کے جتنے انڈے حاصل ہوتے۔ نوجوان بیٹی کی جائز ملکیت خیال کئے جاتے تھے۔ کزیہ بطخوں کی عاشق زار اور اُن کے پالنے میں بہت زیادہ مشہور تھی یہانتک کہ گرد و نواح کے شوقین مزاج زمیندار اس فن میں اُس سے مشورہ لیتے تھے۔

کفایت شعاری دیہات کی لڑکیوں کا خاصہ ہے۔ انہیں جو قلیل رقم والدین سے ملتی ہے۔ وہ اُسے خرچ کرنے کی بجائے جوڑتی رہتی ہیں۔ جو کچھ عرصے میں ایک معقول رقم بن جاتی ہے۔ مگر کزیہ اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ ایک مرفہ الحال کسان کی نازپروردہ بیٹی کے لئے یہ ضروری نہ تھا۔ کہ وہ آئندہ ضرورتوں کے لئے کوڑی کوڑی جمع کرے۔ اُسے جو کچھ والدین سے ملتا ہنسکر لیتی اور آرائش لباس پر صرف کر دیتی۔

آج حسب معمول اُس نے زرد آسمانی رنگ کے زمین کا خوشنما اور چست گون پہن رکھا تھا جس پر سفید چھوٹا سا گلوبند شانوں پر عقیدتمندانہ نثار ہو رہا تھا۔ پیرس کی بنی ہوئی خوبصورت ٹوپی جو اس کے چچا زاد بھائی نے اپنی دوکان سے انتخاب کر کے بھیجی تھی۔ اس کے نرم نرم بالوں پر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے پھولوں کا ایک گلدستہ زمردیں فرش پر الٹا پڑا ہو۔

وہ حسین تھی۔ اور قدرتی طور پر اس کے چاہنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ دیہاتی نوجوان یکے بعد دیگرے [illegible] باپ کی دقیانوسی کہانیوں سے لطف اندوز ہونے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پیکر جمال کو پیغام محبت پہنچانے اس کے گھر آئے۔ اور واپس چلے گئے۔ کزیہ نے کئی مرتبہ ان قدیم نیازمندوں کو شادی کی درخواست کرتے سُنا اور سر ہلا دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اتنی مشاق ہو گئی۔ کہ متکلم کی گفتگو سے اس کے دلی جذبات کا فوراً اندازہ کر لیتی اور پیش بندی کے طور پر استہزا و تضحیک کو کام میں لا کر ہونے والے امیدوار کی امیدوں کو قبل از وقت اس طرح مجروح کر دیتی کہ اُسے دوبارہ عرض نیاز کی جسارت ہی نہ ہوتی۔ سب سے زیادہ مشہور واقعہ وہ ہے جو جون کے ساتھ پیش آیا۔ کزیہ نے اس کا ذکر مطلقاً کسی سے نہیں کیا۔ مگر ناکام عاشق نے ایک دن حالت نشہ میں سارا قصہ من وعن کہہ سنایا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے

جون کو کزیہ سے تنہائی میں بالمشافہ گفتگو کرنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔ اس زرین موقع کو غنیمت سمجھکر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں حضرت عشق کی خوش اتفاقیوں کا ذکر خیر شروع کر دیا۔ کزیہ اس وقت کچھ سہم سی گئی تھی۔ پھر بھی اس نے استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور پانی کا بھرا ہوا ڈول نوجوان عاشق کے سر پر انڈیل کر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

صرف ایک مرتبہ اس کا دل پسیجا تھا۔ ایک ہی مرتبہ جب رلیف نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ دونوں بچپن میں ہم سبق رہ چکے تھے۔

اُن پرندوں کی طرح جو اکٹھے ایک گھونسلے میں پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ مگر بال و پر نکلتے ہی مختلف سمتوں میں پرواز کر جاتے ہیں۔ کزیہ دل ہی دل میں رلیف سے مانوس ہو چلی تھی۔ یہ کیوں؟ وہ خود اس راز سے ناواقف تھی۔ مگر جب اس اکھڑ دیہاتی نے شادی کی درخواست کر دی تو اس نے نہ صرف اس کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ بلکہ اس کے جذبات کی اتنی توہین کی کہ نامراد عاشق ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کی ایک نمایاں وجہ رلیف کی ناداری تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اندھے دیوتا کا تیر جگر میں پیوست ہو چکا تھا۔ محبت کی نہ بجھنے والی آگ رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اگرچہ خوددار عاشق کی خاموش نگاہوں سے ہمیشہ چھپائے رکھا۔

خیر! کزیہ چلتے چلتے شاہراہ کے اس موڑ پر جہاں پھولوں کی جھاڑیاں کثرت سے اُگی ہوئی تھیں رُک گئی اور سوچنے لگی کہ اسے کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے اگر وہ سیدھی سفید سڑک پر سے جائے تو دو میل کی مسافت بڑھ جاتی ہے۔ اگر مختصر راستہ اختیار کرے (جس کا یہ مطلب ہے کہ اسے رلیف کے کھیتوں میں سے ہو کر جو نے کی کچی دیواروں پر سے گذرنا ہو گا۔ جہاں راستے میں قدم قدم پر پھسلنے کا اندیشہ ہے) تو وہ منزل مقصود پر پاؤ گھنٹے سے بھی کم عرصے میں پہنچ سکتی ہے۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ راستے کی مصیبتوں کا مقابلہ کریگی۔

یہ سوچتے ہی اس نے ٹوکری کو اچھی طرح سنبھال لیا۔ اور تناور درختوں کی پیچ در پیچ شاخوں کے خلا میں [illegible] گئی۔ اب وہ نہر کے اس کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ جہاں کنول آب رواں میں اپنا عکس دیکھکر مسکرا رہے تھے جھرنے پر جس جگہ پانی پتھروں کے نیچے سے فوارہ بنکر اُچھل رہا تھا۔ وہ اچانک مڑی مڑتے ہی ایک فرسودہ چوبی دروازے کا رُخ کیا۔ جس کے دوسری طرف گندم کے سبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ کھیتوں میں سے

گذرتی ہوئی جونے کی پہلی بلند دیوار کے سامنے جا پہنچی۔ اس دیوار کو پھاندنا آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ مقابل کی سطح اس کے سر سے بھی اونچی تھی۔ تاہم نوجوانی کا خون اس کی رگوں میں موجزن تھا۔ وہ مطلق ہراساں نہ ہوئی۔ انڈوں کی ٹوکری کو سب سے اونچے پتھر کے ایک محفوظ مقام پر رکھدیا اور دیوار پر چڑھنا شروع کیا یہ حقیقت میں بہت خطرناک کام تھا۔ نازک دیوار اس کے رعب سے کانپ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ دیوار کے سرے پر پہنچ گئی۔ دیوار کے ساتھ ہی اس کا دل سینے میں کانپنے لگ گیا۔ اب ایک چھلانگ میں وہ مرتفع کھیت کی سبز گھاس پر پہنچ چکی تھی۔ مگر ساتھ ہی دیوار کا کچھ حصہ گر کر کھیت کے ساتھ ہموار ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ زمین پر سے اٹھی۔ خوف کے ساتھ ہی اس کے چہرہ پر شرارت کی خفیف سی سرخی دوڑ گئی پھر زور سے ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگی۔

"یہ رلیف کے لئے کافی سزا ہے۔ اگر کسی غیر شخص کی دیوار ہوتی تو شاید میں دوبارہ تعمیر کرا دیتی۔ مگر چونکہ یہ رلیف کا کھیت ہے"

یہ جملا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ قریب ہی کھیت میں ایک سیب کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے رلیف چاقو سے لکڑی کی ایک بینچ درست کر رہا تھا اور ایک خاص انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نمایاں تھی۔ کزیہ نے جلدی میں ٹوکری سنبھالی (جسے ابتک کوئی نقصان نہ پہنچا تھا) اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر رلیف نے بھی لمبی لمبی ڈگوں سے تعاقب شروع کر دیا۔ اور بھاری بھر کم آواز میں کہنے لگا۔

"کزیہ! میں نے تمہارا ایک ایک حرف سن لیا ہے۔ یہاں دستور ہے کہ جو شخص دیوار کو گراتا ہے وہی اسے دوبارہ تعمیر کرتا ہے۔ تمہیں اس کی تعمیل کرنی ہوگی"

"وہ مڑی اور تن کر کہنے لگی" ہرگز نہیں۔

رلیف "کیوں نہیں۔ تمہیں یہ کام کرنا پڑے گا"

کزیہ کا چہرہ ارغوانی ہو گیا ہے۔ کہنے لگی۔

"ایک طرف ہٹ جاؤ اور مجھے گذر جانے دو"

"یہ ناممکن ہے۔ تم نے بیجا مداخلت کی ہے" پھر ایک بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

وہ دیکھو بیجا مداخلت کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس دیوار کو میرے سامنے ٹھیک کرو"

کزیہ نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں زور سے چیخوں گی اور کوئی خدا کا بندہ میری فریاد سن لیگا"

چاہے چیختے چیختے تمہارا گلا کیوں نہ بیٹھ جائے کوئی نہیں سننے کا یہ میرا کھیت ہے بس ایک دفعہ کہہ دیا کہ بے چون و چرا کام شروع کر دو۔

رلیف:۔ تم ایک عورت کی کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ میں اس کام کی عادی نہیں۔

رلیف نے ایک ملاطفت آمیز نظر کزیہ کے چہرے پر ڈالی اور کہنے لگا۔

کزیہ! تم نے ایک دفعہ میرے جذبات کی توہین کی تھی۔ میں آج تمہارے غرور کو نیچا دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ سزا آئندہ تمہیں ایک سبق کا کام دے گی ہاں! سب سے پہلے بڑے بڑے پتھر اٹھاؤ۔

آج کزیہ نے پہلی مرتبہ رلیف کے چہرے کا پوری طرح معائنہ کیا جس میں مردانہ وقار کی تمام علامات موجود تھیں اور اس پر آج پہلی مرتبہ اس کا انکشاف ہوا کہ یہ تندرست اور سڈول جسم کا انسان جس کی کہنیوں تک چڑھی ہوئی قمیص گرمی کے مارے پسینے میں لت پت ہو رہی تھی۔ حقیقت میں ایک نہایت وجیہ اور خوبصورت انسان ہے۔ اور گاؤں میں اس کی ٹکر کا کوئی ایسا آدمی مشکل سے نظر آئیگا جو صحیح معنوں میں مرد جیہ کہلانے کا مستحق ہو۔ کزیہ نے جس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور جس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ایک فوری کیفیت سے متاثر ہو کر زرد دستانوں کو ہاتھوں سے علیحدہ کیا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے متنفر ہوں۔ مگر اب میں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اس کام کو سرانجام دوں گی۔ یقیناً یہ محنت مجھے ہلاک کر دیگی"

رلیف نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔

"میں یہ گناہ گردن پر نہیں لے سکتا۔ اچھا آؤ ملکر کام کریں۔ میں تمہیں صرف اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ تم چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھاؤ اور بھاری بھاری پتھر میں اٹھاؤں گا"

کام شروع ہو گیا۔ رلیف نے دیکھا اور دیکھکر بہت خوش ہوا کہ کزیہ جو پتھر اٹھا کر لاتی وہ جسامت میں سیب سے بھی چھوٹے تھے اور ایک پھیرے میں پانچ منٹ صرف کر دیتی تھی۔ دونوں خاموشی سے کام کرتے رہے یہاں تک کہ دو قطاریں مکمل ہو گئیں۔

آخر رلیف کہنے لگا۔

اس طرح ہمارا ایک دن صرف ہو جائیگا۔ اب ناشتے کا وقت ہے سامنے درختوں کے سایے میں کچھ کھانا اور مکھن موجود ہے۔ چلیں اور چلکر ناشتہ کر لیں۔

کزیہ بولی! اگر گاؤں والوں کے کان میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی۔ تو کیا کیا چہ میگوئیاں ہونگی۔ نہیں نہیں میں اس کی تعمیل سے معذور ہوں۔

رلیف نے ایک سخت لہجہ میں کہا۔

"تمہیں کھانا پڑیگا۔

سوائے اطاعت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ روٹی کے نوالے اس کے حلق سے بہ مشکل نیچے اترتے تھے۔ پانی پتھر کی طرح بھاری ہو گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر کزیہ نے کام شروع کرنے کے لئے کہا تو رلیف نے مصلحتاً ٹال دیا اور روک کر کہنے لگا۔

میں کھانے کے بعد تمباکو کا عادی ہوں۔ ذری دیر میں چلتے ہیں۔ اس اثنا میں ہم گذری ہوئی صحبتوں کی پر لطف یاد کو تازہ کرینگے۔ (کزیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر) کزیہ تمہیں یاد ہوگا۔ ایک دفعہ میں نے ایک کبوتر تمہارے لئے شکار کیا تھا۔ جو نیچے گرتے وقت سب سے اونچے درخت کی بالائی شاخوں میں اٹک گیا تھا۔ مگر میں گلہری کی طرح چڑھا اور اُسے تمہارے لئے اتار کر لے آیا۔

کزیہ نے ایسا ظاہر کیا۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کے سامنے جاکر پھر پتھروں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مگر کزیہ جسقدر عجلت سے کام لیتی تھی رلیف اتنا ہی سست ہو رہا تھا۔ چار بجے تک صرف نصف دیوار ختم ہو سکی۔ آخر کزیہ نے تھک کر رونا شروع کر دیا۔ رلیف اس آواز سے بے تاب ہو گیا۔ اور ملائم آواز میں کہنے لگا۔

کزیہ تمہیں کافی سزا مل چکی ہے۔ بس اب باقی ماندہ دیوار میں خود ختم کر لوں گا۔"

کزیہ پر ان الفاظ کا مطلق کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے اور بھی تیزی سے کام شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ واقعی اُسے پورا کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ رلیف بھی ہوشیار ہو گیا اور دیوار دو گھنٹے کے اندر ختم ہو گئی۔

کزیہ نے ٹوکری اٹھائی اور گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ اس دفعہ بالکل خاموش جا رہی تھی۔ اس کا سر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا جب کچھ دور نکل گئی۔ تو یکایک رلیف کو کچھ خیال آیا اور جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ وہ کزیہ کے پیچھے لپکا اور جونہی دروازہ میں پہنچنے سے پیشتر ہی اُسے جا لیا۔ پھر ندامت بھرے لہجہ میں کزیہ کے شانوں پر جھک کر کہنے لگا۔

کزیہ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔

کزیہ نے ٹوکری زمین پر رکھدی اور اپنے ہاتھ دکھائے۔ انگلیوں سے خون بہ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھکر رلیف کی آنکھیں بھی پر آب ہو گئیں۔ اور لجاجت سے کہنے لگا۔

پیاری کزیہ۔ کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی؟

غم کے بادل کزیہ کے چہرے سے دور ہو گئے۔ کہنے لگی:-

تم نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ مگر میں معاف کرتی ہوں میں تمہاری دیوار کو کبھی نہ چھوؤں گی۔

رلیف اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔

میں نے جو کچھ کیا ہے محبت سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ یہ میرا نہیں بلکہ دل کا قصور ہے۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو شاید یہ واقعہ ہی پیش نہ آتا۔

کزیہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور اُسے سڑک تک چھوڑنے گئی۔

فاخر ہریانوی۔ بی۔ اے

یادِ سلف

شگفتہ لالہ و گل اب بھی ہوتی ہیں بہاروں میں ۔۔۔ وہی ہے لمبی لمبی دوب اب بھی سبزہ زاروں میں

وُہی اب ہے جو پہلے تھا ترنم آبشاروں میں ۔۔۔ دکھاتی ہے کرشمے اب بھی قدرت کوہساروں میں

نظارے ہیں وطن کے دلنشیں، جیسے کہ پہلے تھے

مگر افسوس ہم ویسے نہیں جیسے کہ پہلے تھے

نہ وہ دل ہے۔ نہ ہے وہ دیدۂ معنی نگر باقی ۔۔۔ بزرگوں کی خصائل کا نہیں ہم میں اثر باقی

کمالات اُنکے باقی ہیں نہ وہ علم و ہنر باقی ۔۔۔ جو یاد انکی ہے وہ سونے کی چڑیا کے ہیں پر باقی

امینِ معرفت کہتے ہیں اتنک جنکے سینوں کو

ستم ہے اے زمیں تو کھا گئی ایسے دفینوں کو

محروم

مثالی شوہر

اسکر وائلڈ کے آئی ڈیل ہسبنڈ کا ترجمہ

از

مسٹر محمد نذیر الدین ایم۔ اے

اشخاصِ ڈرامہ

ارل آف کیورشم۔
وسکونٹ گورنگ۔ اس کا بیٹا۔
سر رابرٹ چلٹرن۔ نائب معتمد وزیر خارجہ۔
نان جیک۔ لندن میں فرانسیسی سفارت خانہ کا ایلچی۔
مسٹر مانٹ فورڈ۔
میسن۔ رابرٹ چلٹرن کا بٹلر۔
فپس۔ گورنگ کا ملازم۔

جیمس } ہرکارے
ہیرالڈ }
لیڈی چلٹرن۔
لیڈی مارکبی۔
کونٹ آف بیاسلڈن۔
مسز مارچ مانٹ۔
مس میبل چلٹرن۔ چلٹرن کی بہن۔
مسز شیولی۔

پہلا ایکٹ

سین

رابرٹ چلٹرن کے مکان کا ہشت پہلو کمرہ

کمرہ خوب روشن اور مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ زینے پر لیڈی چلٹرن کھڑی دعوتیوں کا استقبال کر رہی ہے۔ زینے پر کی محراب میں ایک بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا ہے۔ جو موم بتیوں کی روشنی سے جگ مگ کر رہا ہے۔ اسکی روشنی دیوار پر لٹکے ہوئے ایک پردے پر پڑ رہی ہے جس میں "محبت کی فتح" کے منظر کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ داہنی جانب کمرۂ موسیقی کا راستہ ہے۔ جہاں سے پیانوں کی سریلی۔ مگر دھیمی آواز آ رہی ہے۔

میسن۔ (مہمانوں کی آمد کا اعلان زینے پر سے کرتے ہوئے)

مسٹر اور لیڈی جین بارفورڈ۔ لارڈ کیورشم۔

(لارڈ کیورشم ستر سال کا بوڑھا مگر مضبوط کاٹھی کا شخص ہے)

لارڈ کیورشم :۔ لیڈی چلٹرن! آداب عرض ہے۔ میرا ناکارہ لڑکا یہاں ہو تو نہیں گیا۔؟

لیڈی چلٹرن :۔ (مسکراتے ہوئے) لارڈ گورنگ شاید ابھی نہیں آئے۔

میبل چلٹرن :۔ (لارڈ کیورشم کے قریب آکر) لارڈ گورنگ کو آپ کیوں ناکارہ فرماتے ہیں؟

(میبل چلٹرن انگریزی طرز کے حسن کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ جو رنگترے کی نو شگفتہ کلی جیسی شان رکھتا ہے۔ اس میں پھول جیسی نکہت اور نکہت جیسی آزادی پائی جاتی ہے۔ اس کے کھلے بال ہوا سے ہل ہل کر سنہری موجوں کا سماں پیش نظر کر دیتے ہیں۔ اس کی ہر ادا میں لطیف ظلم کا راز پنہاں ہے۔ اور معصومیت کی حیرت فزا جرأت اس کی رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہے۔ اس کا چھوٹا سا منہ کسی کے جواب کے انتظار میں نیم وا ہے)

لارڈ کیورشہم:- اس لئے کہ وہ اپنی زندگی بیکاری میں صرف کرتا ہے۔

میبل چلٹرن:- آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جو شخص شفق پھوٹتے ہی اسپ سبک رفتار پر تفریح کرنے نکلے۔ ہفتہ میں تین بار رقص و سرود سے لطف اُٹھائے۔ دن میں پانچ دفعہ کپڑے بدلے۔ اور رات بھر ضیافتوں میں مصروف رہے۔ اس کو بیکار کہا جائے! حیرت ہے!

لارڈ کیورشہم:- (مسکرا کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تم تو بہت جادو بیان معلوم ہوتی ہو۔ اور اس کے ساتھ نہایت حسین۔

میبل چلٹرن:- شکریہ۔ کبھی کبھی تو آیا کیجئے۔ آپ جانتے ہیں بدھ کا دن ہم گھر پر گذارا کرتے ہیں۔

لارڈ کیورشہم:- آج کل کہیں نہیں جاتا۔ لندن کی سوسائٹی سے بیزار ہوں۔

میبل چلٹرن:- خوب۔ میں تو لندن کی سوسائٹی کو بہت عزیز رکھتی ہوں۔ میرے خیال میں اس میں بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے۔ کیونکہ اب وہ کلیتہً خوشنما احمقوں اور بھڑکدار پاگلوں پر مشتمل ہے۔ سوسائٹی کی روح رواں یہی افراد ہیں۔

لارڈ کیورشہم:- ہا ہا۔ اچھا گورنگ کیا ہے خوشنما احمق یا........؟

میبل چلٹرن:- (متانت سے) میں لارڈ گورنگ کو فی الحال ایک بالکل جداگانہ گروہ میں شامل کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن بہرحال وہ بہت جلد اپنی حالت بدل دیں گے۔

لارڈ کیورشہم:- کس طرح؟

میبل چلٹرن:- (ادباً ذرا جھک کر) لارڈ کیورشہم! اس سے آپ عنقریب واقف ہو جائیں گے۔

میسن:- (مہمانوں کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے) لیڈی مارکبی۔ مسز شیویلی (لیڈی مارکبی اور مسز شیویلی داخل ہوتی ہیں۔ لیڈی مارکبی خوش اخلاق۔ کریم النفس اور معزز عورت ہے۔ مسز شیویلی جو اسی کے ساتھ ہے۔ بلند قامت اور کچھ دُبلی ہے۔ ہونٹ بہت پتلے ہیں جو بہت گہرے رنگ سے رنگے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زردی مائل چہرہ پر ایک سرخ لکیر ہے۔ بالوں میں سرخی کی جھلک ہے۔ ناک عقابی اور گردن قدرے دراز ہے۔ سبزی مائل بھوری آنکھیں قرار سے نہیں رہتیں۔ سرخ رنگ کا غازہ چہرہ کی فطری زردی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اپنی تمام حرکات و سکنات میں وہ بے انتہا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ آرٹ کا شہ پارہ ہے۔ جس میں مختلف دلفریبیاں جلوہ گر ہیں۔)

لیڈی مارکبی:- پیاری گرٹروڈ! تسلیم۔ میں ممنون ہوں آپ نے مسز شیویلی کو ساتھ لانے کی اجازت دی۔ دو ایسی خوبصورت عورتیں کس طرح ایک دوسرے سے ناآشنا رہ سکتی ہیں۔

لیڈی چلٹرن:- (مسکراتے ہوئے مسز شیویلی کی طرف بڑھتی ہے لیکن یکایک رُک کر دوری سے سلام لیتی ہے) خیال پڑتا ہے کہ مسز شیویلی اور میں اس سے پہلے مل چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مسز شیویلی نے دوسری شادی کر لی ہو گی۔

لیڈی مارکبی:- (خوش مزاجی سے) آج کل تو جتنی دفعہ شادی کرنیکا موقع ملے لوگ شادی کر لیتے ہیں۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔
(ڈچس آف ماربرو سے) پیاری ڈچس ڈیوک کا کیا حال ہے؟ دماغ ابھی کمزور ہے؟ خیر۔ اس کی تو امید ہی تھی۔ ان کے والد کا بھی یہی حال تھا۔ نسلی امراض کا کیا علاج؟

مسز شیویلی:- (اپنے پنکھے سے کھیلتے ہوئے) لیڈی چلٹرن! کیا درحقیقت ہم اس سے پہلے مل چکی ہیں؟ مجھے یاد نہیں کہ کہاں؟ میں مدت سے انگلستان سے باہر تھی۔

لیڈی چلٹرن:- مسز شیویلی! مدرسے میں ہم دونوں ساتھ رہے ہیں۔

مسز شیویلی:- (تکبرانہ انداز میں) اچھا! میں نے تو مدرسے کی زندگی کو بالکل بھلا دیا۔ دھندلا سا خیال ہے کہ اس زمانہ کو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔

لیڈی چلٹرن:- کیا تعجب!

مسز شیویلی:- (از حد لطیف پیرایہ میں)۔ لیڈی چلٹرن۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے شوہر سے ملنے کی آرزومند ہوں۔ جب سے وہ دفتر خارجہ میں آئے ہیں دنیا میں اُن کی شہرت بڑھ رہی ہے اخباروں میں لوگ انکا نام صحیح لکھنے لگے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کی شہرت خاص ہو چکی ہے۔

لیڈی چلٹرن:- میں نہیں سمجھتی کہ آپ میں اور اُن میں کوئی چیز مشترک ہو سکتی ہے۔

(چلی جاتی ہے)

نان جیک:- اوہو! مسز شیویلی۔ آپ یہاں کیسے! برلن کی ملاقات کے بعد اب کہیں اس چاند پر نظر پڑی۔

مسز شیویلی:- بالکل درست۔ پانچ سال قبل۔

نان جیک:- اور آپ چشم بددور پہلے سے زیادہ کمسن اور حسین معلوم ہوتی ہیں۔ کیا بات ہے کہ آپ کا حسن روز افزوں ہے؟

مسز شیویلی:- بات یہ ہے کہ میں صرف تم جیسے حسین افراد سے ہمکلام ہوا کرتی ہوں۔

نان جیک:- یہ آپ کا حسن نظر ہے!

(سر رابرٹ چلٹرن داخل ہوتا ہے۔ عمر چالیس سال ہے لیکن چہرے اور کاٹھی سے کم عمر معلوم ہوتا ہے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف جسم سڈول ہے۔ بال اور آنکھیں سیاہ ہیں۔ اہم شخصیت لیکن غیر معروف جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ نہایت معزز و مہذب۔ اس کی حرکات و سکنات سے ایک خاص وقار نمایاں ہے جس میں غرور کی جھلک پائی جاتی ہے لوگ اس کے انداز سے محسوس کرتے ہیں کہ اس کو اپنی کامیابی کا احساس ہے۔ متلون مزاج۔ منہ چھوٹا اور ٹھڈی ذرا لوکدار۔ آنکھیں اندر گھسی ہوئیں۔ مگر نشیلی۔ چہرے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جذبے (passion) اور عقل (Intellect) دونوں میں انتہائی فصل ہے۔ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑتا۔ گویا قوت ارادی کے کسی نامعلوم لائحہ عمل سے تعقل اور جذبے کو بالکل جدا کر دیا گیا ہے۔ ہاتھوں میں قدرے رعشہ ہے۔ خوبصورت کہنا غیر صحیح ہوگا۔ لیکن قبول صورت ضرور کہا جا سکتا ہے)

سر رابرٹ چلٹرن:- لیڈی مارکبی آداب عرض ہے۔ میرے خیال میں سرجان کو آپ اپنے ساتھ لیتی آئی ہیں۔

لیڈی مارکبی:- جی نہیں سرجان سے زیادہ جاذب ہستی میرے ساتھ ہے۔ ان کا مزاج جب سے وہ سیاسیات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب سے دارالعوام سودمند ہونیکی طرف کوشاں ہے۔ اس سے بہت کچھ نقصان پہنچ رہا ہے۔

چلٹرن:- معاف کیجئے ایسا نہیں ہے۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ وہ کون صاحبہ ہیں جن کو یہاں لا کر آپ نے ہمیں ممنون فرمایا۔

لیڈی مارکبی:- ان کا نام مسز شیویلی ہے شاید ڈورسٹ شائر کے خاندان سے ہیں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ میں ناواقف ہوں۔ فی زمانہ خاندانوں میں اس قدر آمیزش ہو چکی ہے کہ کسی شخص کو ہم سمجھتے ہیں کچھ اور وہ نکلتا ہے کچھ۔

چلٹرن:- مسز شیویلی! یاد پڑتا ہے کہ میں اس نام سے واقف ہوں۔

لیڈی مارکبی:- وہ حال ہی میں ویانا سے تشریف لائی ہیں۔

چلٹرن:- ہاں ٹھیک ہے میں سمجھ گیا وہ کون ہیں۔

لیڈی مارکبی:- لیجئے میں آپ سے ملائے دیتی ہوں (مسز شیویلی سے)

ڈیر شیویلی۔ سر رابرٹ چلٹرن، تو اشتیاق دید میں مرے جاتے ہیں۔

چلٹرن:- (سلام کرتے ہیں) میں کیا ہر شخص مسز شیویلی پر مرتا ہے۔ ویانا میں جو ہمارے سفیر ہیں وہ تو سوائے ان کے ذکر کے کچھ لکھتے ہی نہیں۔

مسز شیویلی:- شکریہ۔ سر رابرٹ! شناسائی جب تعریف و توصیف سے شروع ہوتی ہے تو یقیناً اس کا انجام سچی دوستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا کا یہی ٹھیک راستہ ہے۔ یہ معلوم کرکے مجھے مسرت ہوئی کہ لیڈی چلٹرن اور میں ہم جماعت تھے۔

چلٹرن:- واقعی؟

مسز شیویلی:- جی ہاں انہوں نے مجھے ابھی یاد دلایا کہ ہم دونوں مدرسہ میں ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کو ہمیشہ نیک چلنی کا انعام ملا کرتا تھا۔

چلٹرن:- (مسکراتے ہوئے) اور آپ نے کون سے انعامات حاصل کئے؟

مسز شیویلی:- مجھے تو تعلیمی زمانے کے بعد انعامات ملے اور شاید ان میں سے کوئی بھی نیک چلنی کا نہ تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

چلٹرن:- مجھے یقین ہے کہ وہ کسی خاص دلفریب چیز سے متعلق ہونگے۔

مسز شیویلی:- میں نہیں جانتی کہ آیا عورتوں کو ہمیشہ اپنی دلکشی و خوبروی کا صلہ ملا کرتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ الٹا انکو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ آجکل نسوانی حسن کو اس کے پرستاروں کی وفا شعاری سے جسقدر نقصان پہونچ رہا ہے اسقدر کسی اور چیز سے نہیں پہنچ رہا۔ ورنہ کیا بات ہے کہ لندن کی تقریباً تمام حسین عورتوں کے چہروں پر مردنی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

چلٹرن:- کس قدر ہمت شکن فلسفہ آپ بیان کر رہی ہیں! آپ کو مسز شیویلی۔ کسی گروہ میں شامل کرنیکی جرأت کرنا بے ادبی میں داخل ہوگا۔ لیکن کیا میں آپ سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آیا آپ در حقیقت رجائی ( ) ہیں یا قنوطی ( ) اب صرف یہی دو مذہب رہ گئے ہیں۔

مسز شیویلی:- میں کچھ بھی نہیں۔ رجائیت کی ابتدا ازہرخندے اور قنوطیت کی انتہا نیلی عینک پر ہوا کرتی ہے؟ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب دکھاوے ہیں۔

چلٹرن:- گویا آپ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔

مسز شیویلی:- ہاں بعض اوقات۔ لیکن یہ اسقدر مشکل کام ہے کہ اس کا نبھانا ممکن نہیں۔

چلٹرن :- تو پھر علماء نفسیات جن کا اس قدر چرچا ہے اس نظریہ کو کیا کہیں گے۔

مسز شیویلی - گستاخی معاف، عورتوں کی قوت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ نفسیات اُن کی تفسیر سے عاجز ہے۔ مردوں کو تحلیل کیا جاسکتا ہے لیکن عورتوں کی صرف پرستش کی جا سکتی ہے

چلٹرن :- کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ سائنس عورتوں کے معمہ کو حل نہیں کر سکتی۔

مسز شیویلی :- سائنس غیر ظاہر کی تشریح سے قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں اس علم کا مستقبل بھی تاریک ہے۔

چلٹرن :- گویا عورتیں غیر ظاہر کو تعبیر کرتی ہیں۔

مسز شیویلی :- ہاں خوش پوش عورتیں۔

چلٹرن :- (ذرا جھک کر) معاف کیجئے آپ اس کو کلیہ قرار نہیں دے سکتیں لیکن ذرا بیٹھ جائیے۔ اور فرمائیے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ کو اپنے پُر رونق شہر ویانا کو چھوڑ کر ہمارے غمکدہ لنڈن تک زحمت فرمائی پر مجبور کیا۔ آیا یہ سوال بیکار تو نہیں؟

مسز شیویلی :- سوالات کبھی بیکار نہیں ہوتے۔ ہاں جوابات بعض اوقات ہوا کرتے ہیں۔

چلٹرن :- خیر۔ بہرصورت کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ غرض سیاسیات سے ہے یا صرف تفریح۔

مسز شیویلی :- سیاسیات ہی میری تفریح ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آجکل چوچلے اور ناز و انداز کرنا تہذیب میں داخل نہیں جب تک کہ چالیس کی عمر نہ ہو جائے۔ اس طرح ہم غریب عورتوں کے لئے جو تیس کے اندر ہیں سوائے سیاسیات اور امور رفاہ عام کے اور کیا رہ جاتا ہے اور امور رفاہ عام میں حصہ لینا میرے خیال میں صرف ان لوگوں کا شیوہ ہے۔ جو اپنے دوستوں کی جیبوں کو خالی کرنا امر مستحسن سمجھتے ہیں۔ میں سیاسیات کو ترجیح دیتی ہوں۔ میرے اپنے خیال میں یہی چیز... زیادہ موزوں ہے۔

چلٹرن :- اس میں شک نہیں کہ سیاسی زندگی ایک شریفانہ زندگی ہے۔

مسز شیویلی :- بعض اوقات۔ اور بعض اوقات ایک آلۂ خود غرضی۔

چلٹرن :- اور بعض اوقات ایک مصیبت۔
آپ اس کو کیا محسوس کرتی ہیں۔

مسز شیویلی :- میں؟ ان تینوں کا مجموعہ (اپنا پنکھا گرا دیتی ہے)

چلٹرن :- (پنکھا اٹھا کر دیتا ہے) اجازت دیجئے۔

مسز شیویلی :- شکریہ۔

چلٹرن :- لیکن آپ نے ابتک یہ نہیں فرمایا کہ لنڈن کی اس طرح اچانک عزت افزائی کا باعث کیا ہے۔ ہمارا موسم (بہار) تو تقریباً ختم ہے۔

مسز شیویلی :- معاف فرمائیے مجھے لنڈن کی موسم کی پروا نہیں۔ اس میں ازدواجیت کا زہر بہت سرایت کر گیا ہے۔ یہاں عورتیں یا تو شوہروں کا شکار کرنے میں رہتی ہیں یا ان سے گریز کی فکر میں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ آپ جانتے ہیں عورت کا منتہائے نظر کیا ہوا کرتا ہے۔ اتنا ہی بلند جتنا مرد کا۔ مجھے بے انتہا خواہش تھی کہ آپ سے ملوں اور..... آپ سے درخواست کروں کہ آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔

چلٹرن :- مسز شیویلی مجھے امید ہے کہ وہ کوئی معمولی کام نہ ہوگا۔ میں چھوٹے چھوٹے کام بہت مشکل سمجھتا ہوں۔

مسز شیویلی :- (کچھ غور کرکے) نہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ کوئی چھوٹا کام ہے۔

چلٹرن :- تو فرمائیے وہ کیا ہے۔

مسز شیویلی :- پھر کبھی (اٹھتی ہے) سنتی ہوں کہ آپ کے ہاں تصویریں نہایت دلفریب ہیں۔ غریب بیرن آرنہیم ——— کیا وہ آپ کو یاد ہے ——— کہا کرتا تھا کہ آپ کے پاس چند عجیب (تصویریں) ہیں۔

چلٹرن :- (نامعلوم طور پر چونک کر) کیا آپ بیرن آرنہیم سے بہت اچھی طرح واقف ہیں؟

مسز شیویلی :- (مسکراتے ہوئے) بہت اچھی طرح۔ اور آپ بھی؟

چلٹرن :- کسی زمانے میں تھا۔

مسز شیویلی :- حیرت انگیز آدمی تھا۔ کیوں ٹھیک ہے؟

چلٹرن :- (کچھ وقفہ کے بعد) وہ بہت ممتاز تھا۔ بہت سی باتوں میں

مسز شیویلی - افسوس اس بات کا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند نہیں کئے۔ وہ بیحد دلچسپ ہوتے۔

چلٹرن :- ہاں انکے مشاہدات بہت وسیع تھے۔

میسن :- لارڈ گورنگ...

(گورنگ داخل ہوتا ہے اور چلٹرن کو سلام کرتا ہے۔ چونتیس سال کا مگر خود کو ہمیشہ کم عمر کہتا ہے۔ چہرہ صاف جس سے اس کے باطن کا پتہ نہیں چلتا۔ چالاک و ہوشیار مگر یہ گوارا نہیں کہ دوسرے اسے ایسا سمجھیں۔ بے عیب و بے پروا امیر۔ رومانیت سے کوسوں دور۔ زندگی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اور دنیا بھر کا دوست ہے۔ دوسروں کو

غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی اس کو عادت ہے۔ اور اس سے خوش ہوتا ہے)

چلٹرن:۔ مسز شیویلی، اجازت دیجئے کہ لارڈ گورنگ کا آپ سے تعارف کراؤں جو لندن بھر میں کاہل ترین فرد ہیں۔

مسز شیویلی:۔ ان کو میں پہلے سے جانتی ہوں۔

گورنگ:۔ مجھے امید نہ تھی کہ آپ مجھے یاد رکھیں گی۔

مسز شیویلی:۔ مجھے اپنے حافظہ پر حیرت انگیز طور پر قدرت حاصل ہے۔ اور کیا آپ ابتک بے بیاہے ہیں۔

گورنگ:۔ ہاں۔ ایسا ہی ... کہا جاتا ہے۔

مسز شیویلی:۔ کس قدر عجیب!

گورنگ:۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے! میری عمر ہی کیا ہے؟ مجھ سے سینیر بہت سے پڑے ہیں۔ ان کے بعد میری باری آئے تو آئے۔

چلٹرن:۔ آپ جانتی نہیں لارڈ گورنگ بوڈلی کلب کی پیداوار ہیں۔

مسز شیویلی:۔ جانتی ہوں اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی ترقی کا ان کو بڑا خیال رہتا ہے۔

گورنگ:۔ کیا میں آپ سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ لندن میں کبتک قیام فرمائیگا؟

مسز شیویلی:۔ یہ کچھ تو یہاں کی آب ہوا پر۔ کچھ یہاں کی غذا پر۔ اور کچھ سر رابرٹ پر منحصر ہے۔

چلٹرن:۔ کہیں آپ جنگ عظیم میں تو ہمیں نہیں گھسیٹ رہی ہیں؟

مسز شیویلی:۔ فی الحال کوئی خطرہ نہیں۔

(لارڈ گورنگ کو دلربایانہ انداز میں سلام کرتی ہے اور چلٹرن کے ساتھ چلی جاتی ہے۔)

میبل چلٹرن:۔ تم نے آنے میں بڑی دیر کی۔

گورنگ:۔ کیا تم انتظار کر رہی تھیں؟

میبل چلٹرن:۔ بڑی بے صبری سے۔

گورنگ:۔ تو مجھے افسوس ہے میں نے اور دیر کیوں نہ لگائی۔ کسی کو انتظار میں رکھنے سے مجھے لطف آتا ہے۔

میبل چلٹرن:۔ یہ تو تمہاری بڑی خودغرضی ہے۔

گورنگ:۔ میں بہت خودغرض ہوں۔

میبل چلٹرن:۔ تم ہمیشہ اپنے عیب ہی بیان کرتے ہو۔

گورنگ:۔ میں نے ابتک ان میں سے صرف آدھے کہے ہیں۔

میبل چلٹرن:۔ کیا دوسرے بہت خراب ہیں؟

گورنگ:۔ بہت خوفناک۔ جب کبھی رات کو ان کا خیال کرتا ہوں فوراً سوجاتا ہوں۔

میبل چلٹرن:۔ بہت خوب! پھر تو میں تمہارے عیوب سے لطف اٹھایا کروں گی۔ اور مجھے یہ گوارا نہ ہوگا کہ تم ان میں سے ایک کو بھی چھوڑ دو۔

گورنگ:۔ کس قدر بھولی بھالی ہو۔ مگر میں تم سے ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔ مس میبل۔ مسز شیویلی کو یہاں کون لایا؟ وہ عورت جو ابھی یہاں سے تمہارے بھائی کے ساتھ گئی ہے۔

میبل چلٹرن:۔ شاید لیڈی مارکبی لائی ہیں۔ یہ تم کیوں پوچھتے ہو؟

گورنگ:۔ میں نے اس کو ایک زمانہ سے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس لئے۔

میبل چلٹرن:۔ کس قدر بیہودہ وجہ!

گورنگ:۔ تمام وجوہ بیہودہ ہی ہوا کرتے ہیں۔

میبل چلٹرن:۔ وہ عورت کیسی ہے۔

گورنگ:۔ دن کی ذکاوت اور رات کا حسن۔

میبل چلٹرن:۔ مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

گورنگ:۔ یہ تمہارے حسن مذاق کی دلیل ہے۔

نان جیک:۔ (قریب آتے ہوئے) وہ خاتون حسن مذاق کا شہ پارہ ہے۔ کیوں کیسی کہی؟

گورنگ:۔ ہاں۔ اخبار ایسا ہی کہتے ہیں۔

نان جیک:۔ میں یہاں کے تمام انگریزی اخبار پڑھتا ہوں وہ بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔

گورنگ:۔ تو پھر عزیز نان جیک آپ غالباً بین السطور پڑھتے ہوں گے۔

نان جیک:۔ یقیناً میں ایسا کرتا اگر اس کو کیا کیا جائے کہ پروفیسر منع کرتے ہیں۔ (میبل چلٹرن سے) کیا میں آپ کو کمرہ موسیقی تک لیجانے کی عزت حاصل کر سکتا ہوں۔

میبل چلٹرن:۔ (مایوس ہوکر) بخوشی۔ جناب۔ بخوشی۔ (لارڈ گورنگ کی طرف مڑکر) کیا تم نہ چلوگے۔

گورنگ:۔ نہیں۔ ہاں اگر وہاں موسیقی سامعہ خراشی کر رہی ہو۔

میبل چلٹرن:۔ (سختی سے) موسیقی جرمنی زبان میں ہے۔ تم سمجھ نہ سکوگے۔

(نان جیک کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ لارڈ کیورشم اپنے بیٹے کے پاس پہنچتا ہے)

کیورشم:۔ بہت خوب جناب بہت خوب۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ حسب معمول اپنی زندگی برباد کر رہے ہوں گے۔ تم کو اس وقت بستر پر ہونا چاہیے تھا۔ تم بہت دیر تک جاگا کرتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔

تمہارے متعلق سنا ہے کہ تم نے لیڈی روفرڈ کے ہاں محفل رقص میں رات کے چار بجا دیے۔

گورنگ:۔ صرف پونے چار تھے، اباجان۔

کیورشہم:۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لندن کی سوسائٹی سے تم کیوں بیزار نہیں ہوتے۔ اس میں تو ایسی سخت ہستیاں ہیں جو ہذلیات کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں۔

گورنگ:۔ ہذلیات میرے پسند کی چیز ہے۔ ابا صرف یہی ایک چیز ہے جس کے متعلق میں کچھ جانتا ہوں۔

کیورشہم:۔ تو تم صرف عیش کے لئے جیتے ہو۔

گورنگ:۔ اس کے سوا پھر انسان کس کے لئے جئے؟ اباجان عیش ہی تو سب کچھ ہے۔

کیورشہم:۔ آپ کے پہلو میں دل نہیں، جناب دل نہیں۔

گورنگ:۔ نہیں اباجان۔ ایسا نہیں ہے۔ آداب عرض ہے۔ لیڈی بیسلڈن

لیڈی بیسلڈن:۔ (ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے) آپ اور یہاں! میرے شان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سیاسی ضیافتوں میں بھی رونق افروز ہوا کرتے ہیں۔

گورنگ:۔ میں سیاسی ضیافتوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتا ہوں کہ صرف یہی ایک جگہ باقی رہ گئی ہے جہاں لوگ سیاسیات پر گفتگو نہیں کرتے۔

لیڈی بیسلڈن:۔ میں ہر جگہ سیاسیات پر بڑی دلچسپی سے گفتگو کرتی ہوں۔ دن بھر میرا شغل یہی ہوتا ہے۔ لیکن کسی سے سننا گوارا نہیں۔ خدا جانے دارالعوام میں لوگ کس طرح لمبی لمبی تقریروں اور مباحثوں کو سنا کرتے ہیں۔

گورنگ:۔ صرف اس طرح کہ سنتے نہیں۔

لیڈی بیسلڈن:۔ واقعی؟

گورنگ:۔ (نہایت سنجیدگی کے ساتھ) یقیناً۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سننا بڑی خطرناک چیز ہے۔ اگر کوئی سنتا رہے تو وہ استدلال سے مرعوب ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں جو شخص استدلال سے مرعوب ہو جاتا ہے وہ بالکل نامعقول شخص ہے۔

لیڈی بیسلڈن:۔ اہا! شاید یہی وجہ ہے کہ میں بہت سے مردوں کو نہ سمجھ سکی اور شاید یہی وجہ ہو کہ مرد عورتوں کی خصوصیات کی خاطر خواہ قدر نہیں کرتے۔

مسز مارچ مانٹ:۔ (آہ بھر کے) ہمارے مرد ہماری کسی چیز کی قدر نہیں کرتے۔ اس کے لئے ہمیں دوسرے کے پاس جانا پڑتا ہے۔

لیڈی بیسلڈن:۔ (زور دیکر) ہمیشہ دوسروں کے پاس۔

گورنگ:۔ (مسکراتے ہوئے) اور یہ ان دو عورتوں کے خیالات ہیں جن کے شوہر لندن میں سب سے زیادہ قابل تعریف شوہر مانے جاتے ہیں۔

مسز مارچ مانٹ:۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے میرا رجنلڈ یاس انگیز طور پر بے عیب ہے۔ مگر یہی چیز فی الواقع ناقابل برداشت ہے۔ اس کو دیکھنے سے پاس سے گفتگو کرنے سے جذبات میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔

گورنگ:۔ کس قدر حیرت ناک!

لیڈی بیسلڈن:۔ بیسلڈن بھی اتنا ہی خراب ہے۔ وہ کنواروں کی طرح ہمیشہ گھر ہی میں پڑا رہتا ہے۔

مسز مارچ مانٹ:۔ (لیڈی بیسلڈن کا ہاتھ دبا کر) پیاری! ہم نے بہترین مردوں سے شادی کی اور اس کی ہمیں کافی سزا ملی۔

گورنگ:۔ میرے اپنے خیال میں بیچارے وہ شوہر ہیں جو سزا بھگت رہے ہیں۔

مسز مارچ مانٹ:۔ نہیں نہیں۔ وہ بہت بشاش ہیں۔ اب رہا ہم پر اعتماد کرنے کا معاملہ تو وہ اس قدر اعتماد کرتے ہیں کہ ہمیں اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

لیڈی بیسلڈن:۔ بہت ہی تکلیف۔

گورنگ:۔ یا بہت خوشی۔ لیڈی بیسلڈن۔

لیڈی بیسلڈن:۔ ہرگز خوشی نہیں۔ آپ کے یہ کہنے سے ہمیں رنج پہنچا۔

مسز مارچ مانٹ:۔ مجھے خوف ہے کہ لارڈ گورنگ معمول کی طرح رقیب کے طرفداروں میں ہیں۔ میں نے داخل ہوتے وقت انہیں مسز شیویلی سے گفتگو کرتے دیکھا ہے۔

گورنگ:۔ چشم بد دور وہ حسین ضرور ہے۔

لیڈی بیسلڈن:۔ (سختی سے) براہ مہربانی ہمارے سامنے کسی کی خوبروی کا راگ نہ چھیڑیے۔ آپ کو اس کیلئے ہمارا انتظار کرنا چاہئے۔

گورنگ:۔ میں ابتک منتظر رہا۔

مسز مارچ مانٹ:۔ تو ہم اس کی تعریف کرنا نہیں چاہتیں۔ سنتی ہوں کہ وہ پیر کے رات محفل رقص میں گئی تھی۔ اور ٹامی روفرڈ سے کہتی تھی کہ لنڈن کی سوسائٹی کلیۃً پھوہڑوں اور رنگیلوں پر مشتمل ہے۔

گورنگ:۔ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ تمام مرد پھوہڑ ہیں اور تمام عورتیں رنگیلی ایسی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

مسز مارچ مانٹ:۔ (کچھ ٹھہر کر) کیا آپ کے خیال میں مسز شیویلی کا یہی مطلب ہے؟

گورنگ:۔ بالکل یہی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مسز شیویلی کا یہ قول حقیقت پر

(باقی آئندہ)

ایران اور جرمنی کے قدیم سیاسی تعلقات

گزشتہ سے پیوستہ

گزشتہ اشاعت میں جس خط کا ترجمہ ہوچکا ہے وہ لاطینی زبان میں لکھا گیا ہے جسے شاہ اسمٰعیل نے پطرس سے لکھوایا تھا ۔ جو شاہ آسٹریلیا کا خط لیکر شاہ اسمٰعیل کے پاس آیا تھا ۔

یہ خط ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا تھا اور پورے چار سال کے بعد کارل پنجم کے پاس پہنچا ۔ اس خط کے ملنے کے بعد کارل نے اس کا جو جواب لکھا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط پر نہ تو شاہ اسمٰعیل کی مُہر موجود تھی اور نہ دستخط ہی تھا ۔

کارل پنجم کا جواب

کارل پنجم نے شاہ کے جواب میں جو خط پطرس کو دیا اس کا ترجمہ یہ ہے :-

"ہمارے بہترین دوست ۔ شاہزادۂ والا مقام و قوی شوکت اسمٰعیل صفوی شہنشاہ ایران " شہزادۂ بلند مقام کارل جو خدا تعالیٰ کی مہربانی سے روم اور دنیائے مسیحیت " کا شہنشاہ ، جرمنی اور ممالک ہسپانیہ کا بادشاہ ہے اور جس کا " قلمروئے حکومت ، سرزمین ناوآر ۔ غرناطہ ۔ بالٹر ۔ جزائر سعیدہ ۔ جزائر ہند ۔ جنوبی امریکہ تک وسیع ہے ۔ اور جس کی حکومت افریقہ کے دور دراز ملکوں تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اپنے بہترین دوست ۔ سعادتمند بھائی اور پرہیزگار بادشاہ ۔ اسمٰعیل صفوی بادشاہ ایران کے لئے خدائے قادر سے کامیابی اور نیک بختی کی دُعا کرتا ہے ۔ شاہِ عالی مقام و برادرِ محبوب !

پچھلے سال پطرس نامی شخص جو جبل لبنان کے پادریوں میں سے ایک پادری ہے آپ کی طرف سے میرے پاس خط لایا جسمیں آپ نے مجھے دعوت دی کہ میں اپریل کے مہینے سے پہلے تیار رہوں تاکہ ہم دونوں متفقہ طور پر اپنے مشترک دشمن سلطان ترکی سے جنگ کریں ۔ لیکن افسوس کہ آپ کا خط اس وقت پہنچا جب وقت معینہ نکل چکا تھا ۔

یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ آپکے خط پر بادشاہوں کے قاعدے کے مطابق نہ سلطانی مہر تھی اور نہ دستخط تھے ۔ میں حیرت میں ہوں کہ اس خط کو قبول کروں یا نہ کروں اور سوچتا ہوں کہ اس قاصد پر اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ لیکن آپ کی خاطر اور ان تعلقات کی بنا پر جا نبین میں قائم ہیں اس خط کو قبول کرتا ہوں ۔

اگر اس خط کے جواب میں تاخیر ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں اس امر کا منتظر تھا کہ شاید آپ کی طرف سے اس کے متعلق کوئی دوسری اطلاع آئے اور شاید ایک ایسے امر کے متعلق جو بیحد اہمیت رکھتا ہے ۔ کوئی اور نئی بات معلوم ہوجائے ۔ لیکن اس وقت تک انتظار کرنے کے بعد جب کوئی خبر نہ معلوم ہوئی تو اچانک یہ اطلاع پہنچی کہ اعلیٰ حضرت کو کوئی حادثہ پیش آیا اور انتقال فرما گئے ۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس خبر میں صداقت نہیں ہے ۔

چونکہ اس قسم کی زبردست لشکرکشی خالی از وقت نہیں ۔ اس لئے اس کے واسطے ہر قسم کے اسباب اور تیاری کی ضرورت ہے مجھ کو چند ماہ مجبوراً فرانس سے جنگ کرنی پڑی ۔ خدا کے فضل اور اس کی امداد سے شاہ فرانس نے میرے مقابلے میں شکست پر شکست کھائی ۔ اور خود بھی میرے لشکر کے ہاتھ گرفتار ہوگیا ۔

اب میں اس مہم سے فارغ ہوچکا ہوں ۔ اور اس وقت سامنے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے کہ آپس میں محبت اور خلوص کی طرح ڈالکر تمام حکومتوں کو اپنے مشترکہ دشمن عثمانیوں سے جنگ کے لئے آمادہ کروں ۔ اس لئے میں اس قاصد کو بھیج رہا ہوں تاکہ جنگ کے متعلق میرے ارادوں کی اطلاع اعلیحضرت تک پہنچ جائے ۔

آپ بھی بہت جلد میرے پاس اپنے قابل اعتماد آدمی بھیجدیں اور جنگ کے لئے فوراً تیار ہوجائیں تاکہ جلد اس دشمن سے جو واقعی بے شرم اور بے حیا ہے جنگ شروع کردیجائے ۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو صحت اور سلامتی سے رکھکر آپکی تمام خواہشات کو پورا فرمائے ۔

تحریر ۲۰ اوت سنہ ۱۰۲۰ء از شہر طلیطلہ ۔

جیسا کہ اس تحریر کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے یہ خط ۲۰ اوت سنہ ۱۰۲۰ء کو لکھا گیا ہے ۔ یہ تاریخ ۶ ذی قعد سنہ ۹۳۱ھ کے مطابق ہوتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ اسمٰعیل وفات پاچکا تھا اور تخت حکومت پر اس کا بیٹا شاہ طہماسپ بیٹھ چکا تھا ۔

شاہ طہماسپ ایران کا ایک خشک اور مقدس بادشاہ تھا اور یہ یقین کر لینے کے وجوہ موجود ہیں کہ وہ کافی متعصب تھا۔

اگرچہ تاریخی یادداشتوں سے یہ بالکل نہ معلوم ہو سکا کہ کارل کا خط اسمٰعیل کے مرنے کے بعد طہماسپ کے پاس پہنچا یا نہیں اور اگر پہنچا تو اس نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لیکن طہماسپ ملکۂ انگلستان اور شاہ روس کے سفیروں کے ساتھ جس طرح پیش آیا اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس نے کارل کے قاصد کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا ہو گا۔

قیصر روس اور ملکۂ انگلستان نے ملکہ جنکنسن نامی شخص کو ان دونوں ممالک کی طرف سے ایران سے تجارتی تعلقات کے قیام پر گفتگو کرنے کے لئے روانہ کیا جنکنسن کے پاس اس سفر میں ایک خط بھی تھا جو ملکہ الزبتھ نے شاہ ایران کے نام لکھا تھا۔

سر جان میلکم نے اپنی کتاب تاریخ ایران میں جنکنسن کی ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ چونکہ جنکنسن ایران کے داخلی حالات اور تجارتی معاملات سے واقف تھا۔ اس لئے سر میلکم نے اس کو "تاجر" کے نام سے خطاب کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

تاجر مذکور دربار میں بلایا گیا تو اس کو ایک خاص قسم کے جوتے کا ایک جوڑا دیا گیا کہ وہ پہن کر حاضر ہو تاکہ ایک فرنگی کے نجس پیروں سے ایک مسلمان بادشاہ کی پاک زمین نجس نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب دربار میں حاضر ہوا تو سب سے پہلے بادشاہ نے جو سوال کیا وہ یہ تھا۔ کہ کافر ہے یا مسلمان؟ قاصد نے کہا کہ نہ میں کافر ہوں نہ مسلمان۔ بلکہ عیسائی ہوں اور میرا اعتقاد یہ ہے کہ مسیح تمام پیغمبروں سے افضل ہے۔ یہ سنکر طہماسپ نے کہا کہ ہمیں کفار کی مدد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے تم اپنے ملک کو واپس لوٹ جاؤ۔ جب وہ واپس آیا تو ایک شخص نے اٹھکر جہاں جہاں اس کے قدم پڑے تھے وہاں مٹی ڈالدی۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جنکنسن کو کسقدر نجس اور ناپاک سمجھتا تھا۔

اسی واقعے سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاہ طہماسپ نے کارل شاہ جرمنی کے بادشاہی قاصد کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔

اگرچہ کارل کے مکتوبات کے مجموعہ میں کوئی ایسا خط موجود نہیں جو شاہ طہماسپ کا بھیجا ہوا ہو تاہم اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کارل اس کے بعد بھی ایران سے اتحاد اور دوستی کا خواہشمند رہا۔

اس نے چند سال بعد ایک نیا سفیر پھر ایران بھیجا۔ اور اس کو اپنی طرف سے ایک خط بھی دیا چونکہ یہ خط بھی شاہ اسمٰعیل صفوی کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۷ جمادی الآخر ۹۳۰ھ تک یعنی شاہ اسمٰعیل کے مرنے کے پانچ سال بعد تک بھی شاہ جرمنی کو تحقیقی طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شاہ موصوف کا انتقال ہو گیا ہے۔

کارل کے دوسرے خط کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"بخدمت شہزادۂ بلند مرتبہ اور قوی شوکت مخلص دوست اور محترم بھائی"

"میں پھر آپ کی ان زبردست جنگی سرگرمیوں کی صدا اپنے کانوں سے سن رہا ہوں جنہوں نے تمام سرزار ان ایشیا اور امرائے مشرق کا سر آپ کے سامنے خم کر رکھا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کی زبردست قوت ہمیشہ دشمن اور مخالفوں کی سرکوبی کے لئے تیار اور مستعد رہتی ہے۔ اور اس وقت بھی ظلم اور استبداد کو کچلنے کے لئے آمادۂ جنگ ہے۔"

"اسی لئے مجھے بھی ہمت ہوتی ہے اور میں بھی اپنے آپ کو اس کے لئے بالکل تیار پاتا ہوں کہ آپ کے ساتھ ایک مکمل معاہدہ جس کو جانبین مان سکیں۔ ہو جائے۔

میں نے اس امر کا مکمل ارادہ کرنے کے بعد یہ طے کر لیا ہے۔ کہ مقرب بارگاہ یوحنا بابلی کو اظہار صداقت اور وفاداری کا اطمینان دلانے کے لئے آپ کی خدمت میں روانہ کروں۔

شخص مذکور میری حکومت کے قابل اعتماد ارکان میں سے ہے۔ اور میری فوج کا ایک ممتاز افسر ہے۔

یہ بارگاہ حکومت میں میرے ارادوں کی اطلاع کریگا اور میری خواہشات کو آپ کے سامنے بیان کریگا۔

میری تمنا ہے کہ قاصد مذکور کو آپ کامل اطمینان کی نظروں سے دیکھیں۔ اور وہ جو کچھ عرض کرے اس کو بالکل درست اور واقعی سمجھیں تاکہ عالیجاہ کو معلوم ہو جائے کہ میری اصلی خواہش صرف دنیا کی بھلائی اور آزادی ہے۔

امید ہے کہ اس مبارک مقصد کے لئے آپ اسی طرح میری موافقت فرمائیں گے۔ جس طرح ہر قوت اور حشمت والے بادشاہ کو کرنی چاہیئے۔

مجھے یقین ہے کہ مجھ سے عالیجاہ کی کوئی خدمت ممکن ہو تو

مجھے ضرور اس کا موقع بہم پہنچایا جائیگا ۔

میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ اپنی صداقت کے اظہار کے لیئے آپ کی بارگاہ میں کوئی حقیقی وعدہ کروں ۔ میں دعا کرتا ہوں ۔ کہ خداوند بلند آپ کی زندگی میں ترقی عطا فرمائے ۔

شہر ٹولیڈو ۵ رفروری ۱۵۲۹ء مطابق سنہ ۱۰ (سال سلطنتی)

کارل

بنام بادشاہ بلند مرتبہ اور قوی شوکت ۔ مقتدر ترین بادشاہ ایشیا ۔ نیک بخت اور متقی بادشاہ محترم بھائی کا کا اسمٰعیل صفوی شہنشاہ ایران ۔

جیسا کہ خط سے معلوم ہوتا ہے ایلچی کا نام یوحنا بالبی تھا اور یہ شخص شاہ کارل کے خاص درباریوں میں سے تھا ۔

خط فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کا املا قدیم فرانسیسی زبان میں کیا گیا تھا ۔

بادشاہ نے یہ خط دیکر ایلچی مذکور سے کہا کہ وہ شاہ عباس کے دربار میں ہماری ان فتوحات کو تفصیلی طور پر پیش کرے جو فرانس کے خلاف ہماری حکومت کو حاصل ہوئی ہیں ۔ اور اس کے ساتھ ہی شاہ فرانس کی گرفتاری کی اطلاع بھی دے اور یہ خبر بھی پہنچائے کہ شاہ فرانس کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا ہے اور اس کی سلطنت واپس کر دی گئی ہے کہ وہ لڑائی کے موقع پر عثمانی ترکوں کے خلاف جنگ کے لیئے نکلے ۔ اس کے بعد اس کو حکم دیا کہ ہماری طرف سے ذیل کی اطلاعات بھی دربار ایران تک پہنچائی جائیں ۔

ترکوں کی آسٹریا پر لشکرکشی ۔ اور آسٹریا کی ناکامی ۔ کارل کے بہنوئی شاہ آسٹریا کا لڑائی میں قتل ہونا ۔ کارل کے بھائی کا شاہ آسٹریا ہونا ۔

اس کے علاوہ کارل نے یوحنا سے ایک دستور العمل بھی بھیجا ۔ جس میں لکھا ہے کہ اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں خود اٹلی کے راستے سے حملہ کروں ۔ اور میرا بھائی آسٹریا کی طرف سے ترکوں پر ہجوم کر لے ۔

میں آپ کی خدمت میں یہ ایلچی اسی لئے بھیج رہا ہوں کہ آپ بھی فوراً ضروری فوجی سامان تیار کر کے ترکوں پر حملہ کر دیں ۔ کم از کم اسقدر تو ضرور کریں کہ کچھ فوج ترکی سرحد پر بھیج دیں ۔ تاکہ عثمانی فوج کی کافی تعداد اسطرف مصروف ہو جائے ۔"

کارل نے اس دستور العمل میں جہاں اپنے بہنوئی بادشاہ آسٹریا کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے لوئس دوم مراد ہے جو سنہ ۹۲۲ھ میں آسٹریا کے تخت حکومت پر بیٹھا تھا ۔ اور سنہ ۹۳۲ھ میں سلطان سلیمان اعظم سے جنگ کرتے ہوئے موہاکس کے قریب مارا گیا تھا ۔ اور اس کے بعد شاہ کارل کا بھائی فرڈیننڈ کو تخت آسٹریا پر بٹھا دیا گیا ۔

یوحنا بحر ابیض کے راستے سے شام روانہ ہوا ۔ اور شام سے ایران کی طرف ۔

چنانچہ وہ محرم سنہ ۹۳۶ھ مطابق (۳۰) حوت سنہ ۲۹ کو حلب پہنچا ۔ اور وہاں سے شاہ کارل کو ایک خط لکھا جس میں اپنے پہنچنے کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ میں یہاں سے روانگی کے لیئے کسی مناسب موقعہ کا منتظر ہوں ۔

یہ خط " کارل پنجم کے مراسلات " میں اپنی اصلی حالت میں ابتک موجود ہے ۔

ایلچی مذکور نے اس خط میں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ایران نے ترکوں کے خلاف حملہ کر دیا ہے ۔ اس لیئے مناسب ہے کہ آپ بھی حملہ کر دیں ۔ تاکہ باہم ملکر عثمانیوں کے خلاف مہم کامیاب ہو سکے ۔

بالبی نے عثمانیوں اور ایرانیوں کی جس لڑائی کی اطلاع دی ہے اس کا واقعہ تاریخی طور پر اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ طہماسپ چونکہ کم عمر تھا ۔ اس لیئے حکام بغداد نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شاہ طہماسپ کے خلاف خود سرانہ لڑائی لڑنے لگے ۔ چنانچہ شاہ طہماسپ نے انکے خلاف تادیبی کارروائی کی اور ۳ رشوال سنہ ۹۳۵ھ میں شہر مذکور فتح کر لیا ۔ اور ذوالفقار بیگ کو جو سرکشی کر رہا تھا قتل کر دیا ۔ ایک تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بالبی نے اس خط میں اور ان خطوں میں جو اس نے اس خط کے بعد شاہ کارل کو مختلف موقعوں پر لکھے ہیں شاہ اسمٰعیل کے مرنے کا کہیں تذکرہ نہیں کیا اور نہ یہ اطلاع دی کہ شاہ اسمٰعیل کے بعد اس کا بیٹا شاہ طہماسپ ایران کے تخت پر بیٹھ گیا ہے ۔

بالبی نے اس خط میں اپنے سفر کے متعلق لکھا ہے مجھے خاک ایران تک پہنچنے میں ابھی سترہ دن کی مسافت باقی ہے ۔ یہ خط ۱۹ ر ربیع الاول سنہ ۹۳۶ھ کو بولونی (اٹلی) میں کارل کو ملا ۔

" مراسلات کارل پنجم " میں اس خط کے علاوہ بالبی کے تین اور خط بھی موجود ہیں ۔

جن میں سے پہلا خط ۳۰ ربیع الاول سنہ ۹۳۶ھ کو شہر حما سے لکھا گیا اور ۱۱ رشعبان سنہ ۹۳۶ھ کو مونٹو میں کارل کو ملا

دوسرا خط ۱۰ رجمادی الآخر سنہ ۹۳۶ھ کو بالبی نے حلب سے لکھا اور تیسرا خط ۱۵ ررمضان سنہ ۹۳۶ھ کو بابل سے لکھا گیا ہے ۔

تیسرے خط میں بالبی نے کوئی خوشی کی بات نہیں لکھی - بلکہ سفر ایران میں جو مشکلات اس کو پیش آئیں انکو بالتفصیل ذکر کیا ہے -

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں کہ شاہ طہماسپ اور شہنشاہ جرمنی کے تعلقات کی کیفیت کیا ہی کارل کے خطوں کی کتاب میں ہمیں تلاش کے باوجود کوئی ایسا خط نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو کہ بالبی اپنی منزل مقصود پر پہونچا یا نہیں -

لیکن یہاں پہنچکر امید کی صرف ایک شعاع باقی رہجاتی ہے - وہ یہ کہ ہماری معلومات کا تعلق کارل کے صرف اُن خطوط تک محدود ہے جو ابتک چھپ چکے ہیں - لیکن ابھی کارل کے بہت سے خطوط ایسے ہیں جو ابھی تک نہیں چھپے - مگر اُن کے چھپنے - کے انتظامات ہو رہے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ان میں کچھ ایسا ذخیرہ مِل جائے جس سے جرمنی اور ایران کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو - لیکن حالات کو دیکھکر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایران اور جرمنی میں تعلقات قائم نہ ہو سکے -

بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ایرانی مورخین خاموش ہیں -

ایرانی تاریخوں میں "شرفنامہ" صرف ایسی کتاب ہے جس کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارل پنجم اس کے بعد ایران سے دوستی کرلے کے خیال میں برابر لگا رہا -

اگرچہ ایران اور جرمنی کے اتحاد کے لئے کارل نے جس طرح ایران کی طرف قدم بڑھایا اس طرح حکومت ایران نے اس کا استقبال نہیں کیا - مگر اس کے باوجود کارل نے ایران اور جرمنی کے اتحاد کے خیال کو نہیں چھوڑا -

تاریخ "شرفنامہ" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۹۰۸ھ میں یعنی بالبی کے ایران جانے سے پورے بتیس سال بعد ایک سفیر اسپین کے بادشاہ (مراد کارل پنجم) کی طرف سے حضور (ایران) میں وارد ہوا - اور دربار شاہی میں بھی اُس نے حاضری دی -

اس سے یہ بات تو صاف معلوم ہوگئی کہ اس ایلچی کے بھیجنے کا مقصد بھی یہی تھا - کہ ترکوں کے خلاف حکومت ایران اور سلطنت جرمنی کو متحد کر دیا جائے - لیکن تفصیلی طور پر نتیجہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں کارل کی بقیہ خط وکتابت کے شائع ہونے کا انتظار کرنا پڑیگا -

مگر شاہ طہماسپ کے زہد خشک اور تعصب کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کر لینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا - کہ یہ سفیر بھی ملکہ الزبتھ اور شاہ روس کے ایلچی کی طرح چند سخت وسست کلمات "کافر" "فرنگی" "نجس" وغیرہ کے علاوہ اور کوئی یادگار دربار ایران سے نہیں لایا ہوگا -

اور ایسی صورت میں جبکہ سلطان سلیمان نے شاہ طہماسپ کو دوبارہ شکست دیکر اس کے دارالسلطنت تک اس کو پیچھے ہٹا دیا تھا - عقل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شاہ کارل کی تجاویز کو بخوشی قبول کر لیتا - اور اس کی مدد سے عثمانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر ایک کاری ضرب لگا سکتا لیکن افسوس ہے کہ اسکو جہل اور تعصب نے ایک مخلص کو اس کی نظروں میں ایک دشمن کی صورت میں پیش کر کے دکھایا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ترکوں نے تیسری بار ایران پر حملہ کیا اور سنہ ۹۶۱ھ میں اسے "عہد نامۂ ننگین" کو منظور کرنے پر مجبور کر دیا -

ان حالات کو دیکھکر ہر شخص پورے یقین سے اس بات کا دعوٰی کر سکتا ہے - کہ صفوی خاندان کے بادشاہوں کے تعصب اور جہل نے ایران میں ترقی کی استعداد موجود ہونے کے باوجود اس کو ترقی کا موقعہ نہیں دیا -

اگر اسوقت تعصب سے کام نہ لیا جاتا اور یورپ کی بڑی حکومتوں سے ایران کے تعلقات قائم ہو جاتے تو یقیناً ایران اُن تعلقات سے بہت فائدہ اٹھاتا - اور جدید تمدن کے اعتبار سے آج دنیا کی ترقی یافتہ حکومتوں میں شمار ہوتا -

یورپ کی حکومتوں سے ایران کے تعلقات قائم ہونے کے بعد کیا فوائد حاصل ہوتے - اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایران کو معدودے چند یورپین فضلا (۱) ونسنیو الساندری (۲) شرلی (۳) پیٹر ڈیلا ویلے (۴) ڈوٹن گارسیا سفیر ہسپانیہ - (۵) جے بی ٹاورنیر (۶) اسے اولی ادس (۷) چارڈن وغیرہ سے کسقدر بڑے بڑے منافع حاصل ہوئے -

مذکورہ بالا سیاحوں نے اپنی اپنی سیاحت کے متعلق جو معلومات کتابی صورت میں بہم پہنچائی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایران میں اقتصادی، اخلاقی اور انتظامی ترقی کی کسقدر استعداد موجود تھی -

مذکورہ بالا فضلاء یورپ میں سے ہر ایک نے ایران کی ترقی میں کافی حصہ لیا جن کے نتائج سے اسوقت بھی ایران مستفید ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے - لیکن یہ صرف انفرادی پہلو ہے اگر حکومت ایران کے اجتماعی تعلقات یورپ سے قائم ہو جاتے تو اس کے فوائد اور بھی عظیم الشان ہوتے -

حامد الانصاری غازی

ارشاد ہوتا ہے کہ موزوں اور بااثر کلام کو شعر کہتے ہیں۔ کوتہ اندیش جو فلسفیوں کے طرز بیان سے نا آشنا ہیں اعتراض کریں گے۔ کہ لفظوں کا لباس نثر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور شاید یہ بھی کہیں کہ اگلے وقتوں کے عروضی شعر کے لئے کلام موزوں کا بالقصد ہونا بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ لیکن یہ عیب جوئی فضول ہے اگر کلام موزوں کو شعر بنانے کے لئے متکلم کا ارادہ بھی لازمی قرار دیا جائے تو بہت سی آیات و احادیث شعر کی تعریف سے خارج ہو جائیں گی۔ اور نثر مقفے کو اگر شعر نہ قرار دیا جائے تو جن عاشق مزاج دردمندوں کی طبیعت ناموزوں واقع ہوئی ہے۔ وہ طبقہ شعرا میں محسوب نہ ہو سکیں گے۔ لہذا دور جدید کے فلاسفر شعر کی تعریف صرف انہی الفاظ سے کر سکتے ہیں جو حضرت علامہ نے اس گراں قدر مضمون میں تحریر فرمائے ہیں۔ صفحہ ۷ پر آپ نے ایک معرکہ آرا البحث کا دو جملوں میں فیصلہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ قوت متخیلہ کی ترقی اور جذبات کی ترتیب کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ حکمائے قدیم کا گمان تھا کہ توسیع خیال کے لئے تصویر سے بڑھکر اور جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے موسیقی سے زیادہ سریع الاثر کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن حضرت علامہ کے قول فیصل نے بغیر کسی دلیل کے ثابت کر دیا۔ کہ شعر کا مرتبہ تصویر اور موسیقی دونوں سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ دلائل کی تلاش میں وقت ضائع کرنا عوام کے لئے مضر ہے۔ اور ایمان بالغیب کا مقتضا ہی ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کا وجود بغیر کسی دلیل کے تسلیم کرنا چاہیئے۔ اسی طرح شعر کا مرتبہ موسیقی سے بلند آنکھ بند کر کے مان لینا چاہیئے۔

مقدمہ کے صفحہ ۱۵ سے ۲۲ تک شعر کی معنوی خوبیوں پر تبصرہ ہے۔ اور اس میں طے کیا گیا ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس میں اصلیت۔ سادگی۔ بلندی۔ باریکی اور تڑپ ہو۔

انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے گذشتہ زمانے میں شعر کی خوبی کے لئے صرف سادگی۔ نازک خیالی اور اثر کو ضروری سمجھا تھا۔ مگر حضرت علامہ نے زمانہ حال کی ترقیوں کو پیش نظر رکھ کر اثر کا مفہوم "تڑپ" سے ادا کیا۔ نازک خیالی کو بلندی اور باریکی کی متضاد صفات سے موسوم کیا۔ اور سادگی کی تشریح کے لئے اصلیت کو ایک جداگانہ وصف قرار دیا۔ بعض صفات کو عام فہم بنانے کے لئے مثالیں دینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے

اصلیت کی مثال ؎ دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائیگا

ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا۔

علاوہ اور تمام خوبیوں کے اس شعر میں یہ تعلیم بھی ہے۔ کہ مردہ دل خلد میں جانے نہ پائیگا۔

سادگی کی مثال ندارد۔

بلندی کی مثال ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے۔ وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

اگر اس شعر کی شرح عام فہم زبان میں لکھ دیجائے تو شاعر کی بلند خیالی آئینہ ہو جائے۔

باریکی کی مثال ؎

اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت
کافی نہ ہوئی وسعت میدان تمنا

(میدان تمنا کے پل صراط سے زیادہ باریکی ظاہر ہے اور کسی تشریح کی محتاج نہیں)

تڑپ کی مثال۔

اے ناشناس اہل وفا میں ترے نثار
کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھ کر

بسمل سے زیادہ تڑپ کس میں ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۲۳ سے ساٹھ تک شعر کی "لفظی خوبیوں" پر محاکمہ ہے۔ اور اس ضمن میں بعض قدیم شعرا کے کلام پر بیش بہا اصلاحیں دی گئی ہیں مثلاً مرزا دبیر مغفور کی مشہور رباعی ہے۔

ناداں کہوں دل کو کہ خردمند کہوں یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر بندوں کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

اس مضمون کو دو مصرعوں میں یوں ادا کیا ہے۔

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ شعر خوبصورتی روانی اور اثر میں رباعی سے بڑھ گیا ہے۔ اگرچہ تیسرے مصرعہ کا مضمون اس شعر میں بالکل نہیں آیا۔ اور چوتھا مصرعہ جو رباعی کی جان تھا۔ مسخ ہو کر فسانہ عجائب کا بندر بن گیا۔ لیکن ایک فاضل لکچرار نے اس شعر کو رباعی پر فضیلت دی ہے۔ تو نافہموں کو ہرگز حق نہیں ہے کہ وہ اس شعر کی افضلیت تسلیم کرنے میں چون و چرا کریں۔

حضرت مولف نے اسی طرح خدائے سخن میر تقی کے ایک شعر پر بھی اصلاح دی ہے۔ اور نظیر اکبرآبادی کے ایک قطعہ کا خلاصہ

تیار کیا ہے۔ لیکن یہ سب اصلاحیں نقل کی جائیں۔ تو ریویو بہت طویل ہو جائے گا۔

مقدمے کے اس حصے میں صفحہ ۴۳ پر علامہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ جس کلام میں کوئی کیفیت۔ کوئی جذبہ بشدت کے ساتھ دکھایا جائے اُسے زور دار کہنا درست ہے۔ اور مثال میں دوسرے اشعار کے علاوہ یہ شعر بھی درج فرمایا ہے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں۔ ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر۔

یہ شعر ممکن ہے۔ کہ بنیا دلوں کی نظر میں زور کلام کی مثال ہو۔ لیکن حضرت علامہ کی تعریف کے مطابق میر جعفر زٹل کا کلام نہایت زور دار ہے۔ مثلاً

من آن رستم وقت و روئیں تنم کہ دہ پاپڑ از مشت خود بشکنم

صفحہ ۴۴ پر داغ کا مشہور مطلع نقل کیا ہے۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور اس پر ابتذال اور چھچھورا پن کا اعتراض کیا ہے۔ یہ حضرت علامہ کی انصاف پسندی کی دلیل ہے۔ باوجودیکہ دیباچے کے صفحہ ۵ پر تحریر فرمایا تھا کہ

اُردو شاعری کا عیب دار حصہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن ایک مبتذل شعر مجبوراً نقل کرنا پڑا تو صاف الفاظ میں اُس کا عیب ظاہر کر دیا ہے۔

صفحہ ۵۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "کہنا یہ ہے کہ عشق اختیاری فعل نہیں ہے۔ شاعر اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے۔ کہ دل منے لیتا ہے۔

دل تابع کشش تھا کشش تابع جمال
ہاں۔ ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

اگر واقعی شاعر کا مقصود پہلے مصرعہ سے صرف یہی تھا کہ عشق اختیاری فعل نہیں ہے۔ تو جدت طرز ادا کی اس شعر سے بہتر مثال موجود تھی یعنی:۔

کس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانوں کا ہو گا۔

قصہ مختصر اس طویل مقدمے کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے جکی سرخی ہے۔ اردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ۔ جو واقفان رموز "نظر" اور "نگاہ" کے نازک فرق سے آشنا ہیں۔ وہی اس سرخی کی لطافت کی داد دے سکتے ہیں!

مخالفین کے اعتراضات زور شور سے بیان کئے ہیں۔ اور تحقیق کی نگاہ سے اُن کا جواب دیا ہے۔ اگر اس مضمون کی تمام خوبیاں ریویو میں ظاہر کر دی جائیں تو کتاب کے پڑھنے والے کیلئے کیا باقی رہیگا۔ اور مولف کی دماغ سوزی کی کون داد دے گا۔ صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے مضمون کے اس حصے میں عقائد۔ لغت زبان اور تاریخ کی تعلیم کا بھی بندوبست فرمایا ہے۔ تاکہ اُردو شاعری کے محاسن سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون سے بھی آگاہی ہو جائے

مثلاً صفحہ ۹۹ پر قارون کے حالات میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔ "بڑا دولتمند مگر بڑا بخیل بادشاہ تھا" مسلمان عام طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قارون حضرت موسیٰ کے بنی اعمام میں سے تھا۔ اور اُسکو علم کیمیا کی بدولت ثروت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن فاضل لیکچرار اس تاریخی غلطی کی اصلاح کرتے ہیں اور تلقین فرماتے ہیں۔ کہ وہ ایک بادشاہ تھا اور اُس کی دولتمندی تخت سلطنت کے طفیل میں تھی۔ اس تعلیم سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ چند روز کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان عربی سیر و تواریخ سے ناآشنا ہو جائیں گے۔ تو وہ بے تامل تسلیم کرلیں گے کہ شاہ کروسس جس کی دولت مندی کے افسانے قدیم یونانی داستان گویوں نے بیان کئے ہیں ایک واقعی شخص تھا۔ اور اُسی کا نام بگاڑ کر قارون بنا دیا گیا ہے!

اسی صفحے پر سکندر کے حالات میں لکھا ہے" یاجوج و ماجوج کو آبادی عالم سے نکال کر سد سکندر تعمیر کروایا"۔ علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس فقرے سے یہ مشتبہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یاجوج و ماجوج پہلے دنیا میں آباد تھے۔ سکندر نے اُنکو یہاں سے نکال دیا۔

صفحہ ۲۶ پر تحریر ہے " ہندوستان کے دل میں سکندر کی عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اور ایران اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

نظامی گنجوی نے سکندر نامے میں اور بعض دیگر شعرائے فارس نے اپنے کلام میں سکندر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن حضرت علامہ کی تحقیق کے مطابق سکندر کے خداموں میں سے کوئی بھی ایرانی نہ تھا۔

صفحہ ۳۴ پر صوفیوں کے عقائد نہایت وضاحت سے بیان کئے ہیں۔ اور سرکار شتر سے اُن کے کفر کا فتوےٰ صادر فرمایا ہے

لیکن تمام تفصیلات کی اس مختصر ریویو میں گنجائش نہیں

غرض کتاب کے محاسن کہاں تک بیاں کئے جائیں۔ سارا تبصرہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ لکھنؤ کی صاف شستہ ٹکسالی زبان استعمال کیگئی ہے۔ مثلاً مقدمہ کے صفحہ ٥ پر لکھتے ہیں۔ "تمثیل کے استعمال سے دل کے خیالوں اور طبیعت کے احوالوں کی تصویریں کھنچی جاتی ہیں۔ خیالوں اور احوالوں کا قافیہ! حال کی جمع اجمع سبحان اللہ صفحہ ٣٦ پر رقم فرماتے ہیں۔ "جو تصویر وہ کھینچنا چاہتا ہے اس کا نقش اُجاگر ہے"۔ لغات کے مدون کرنے والے غور کریں۔ کہ "اجاگر" کا طرز استعمال بتانے کے لئے۔ اس فقرے سے زیادہ دلکش مثال کہاں ملسکتی ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کتاب کی قیمت کچھ نہیں۔ حضرت مولف سے درخواست کرنے پر غالباً مفت ملے گی +

صابر علی خاں

مطلع انوار

مہاراج بہادر برق دہلوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس کے شروع میں چودہری جگت موہن لال رواں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور منشی اصغر صاحب گونڈوی مصنف نشاط روح کا ایک مقدمہ اور دیباچہ بھی شامل ہے۔

کتاب کا نام:- دبدبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

کے مصنف کی یاد تازہ کرتا ہے۔ لیکن سوائے دو مضمونوں کے جو "جلوۂ حق" اور "ہمہ اوست" کے ناموں سے موسوم ہیں۔ عقائد صوفیہ کے متعلق کوئی نظم مجموعے میں موجود نہیں ہے۔

مندرجہ بالا دو نظمیں اسی صوفیانہ عقیدے کی ایک صدائے بازگشت ہیں جو اردو شاعری نے فارسی سے اخذ کیا ہے۔

اس عقیدے کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ کائنات کے تمام مظاہر ایک ہی نور ازلی کا پرتو ہیں اور "خالق" اور "تخلیق" کے درمیان نہ ختم ہونیوالی کڑیاں قایم ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا آیا برق صاحب نے یہ دونوں نظمیں فارسی شاعری کی تقلید میں لکھی ہیں یا "ویدانت" کی تعلیمات سے متاثر ہو کر۔ ممکن ہے کہ فارسی تصوف کی بجائے وہ "ویدانت" کے فلسفۂ حیات اور "مایا" کے تصور سے براہ راست متاثر ہوئے ہوں۔ پروفیسر نکلسن نے جو ایک نہایت مشہور مستشرق ہیں مقدمہ دیوان شمس تبریز میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی تصوف میں "ویدانت" کے حلقۂ زندگی کے عناصر بھی ملے ہوئے ہیں۔ اور اس اعتبار سے مندرجہ بالا نظمیں خالص ہندوستانی فلسفے کا نتیجہ کہلا سکتی ہیں۔ بہر نوع ان میں کوئی خصوصیت قابل ذکر نہیں جو انہیں دیگر صوفیانہ نظموں سے ممتاز کرتی ہو۔

جہاں تک برق صاحب کی منظریہ شاعری کا تعلق ہے مجھے اصغر صاحب سے اس معاملے میں اختلاف ہے کہ برق صاحب نے بجائے "عکاسی" کے تخلیق سے کام لیا ہے۔ اور فطرت کی بیجان اشیا کو اپنے زور صنعت سے زندگی بخش کر معارف و اسرار کے خزائن پیش کئے ہیں۔

میں دیر سے اصغر صاحب کے ذوق شعری کا مداح ہوں اور ان کا دیباچہ پڑھنے کے بعد میں نے ان نظموں کو نہایت غور سے پڑھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان نظموں میں صرف استعارات و تشبیہات کی بہتات ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں "کرمکِ شب تاب" ستارۂ صبح۔ جلوۂ سحر۔ شفق۔ ایسے موضوع ہیں جن میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے اور جو انسانی دل میں احساسات کا ایک طوفان برپا کر سکتے ہیں لیکن برق صاحب کی نظمیں پڑھنے کے بعد انسان محسوس کرتا ہے کہ ان اشیا نے شاعر کے دل میں کوئی احساس کوئی تاثر۔ کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں ان کی نگاہ آب و رنگ کے پردوں ہی تک رہی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے استعارات و تشبیہات بھی بے روح ہیں۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ استعارات و تشبیہات کو محض آرائش کلام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو لوگ صنعت ادب کے رموز سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ شاعر اور صناع مظاہر و عناصر کے مختلف پہلو اور ان کے مختلف اثرات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ شاعر کے لئے فطرت کی ہر جمیل شے ایک درخشاں جوہر ہے جس کے پہلو تراشے ہوئے ہیں۔ روشنی کم و بیش ان پہلوؤں میں مختلف رنگ اور مختلف دل آویزیاں پیدا کرتی ہے۔

ان مختلف نوعیتوں کو واضح کرنے کے لئے شاعر کو الفاظ کا معمولی استعمال ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ تشبیہات و استعارات

کو کام میں لاتا ہے۔ یہ وہ بجلیاں ہیں جو صنعت کی فضا کو روشن کرتی ہیں۔ اور جو معنی کسی طرح ادا نہ ہو سکتے تھے بطریق احسن ادا ہو جاتے ہیں۔

شاعری کی ناقابل بیان اکثر حقیقتیں استعارے اور تشبیہ کے ذریعے ادا ہو جاتی ہیں اور جو اس سے بھی نہیں ہوتیں ان کو نغمہ ادا کر دیتا ہے۔

اقبال نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

نگاہ مے رسد از نغمہ دل افروزے بمعنیٔ کہ برو جامۂ سخن تنگ است

برق صاحب کی تشبیہات نہ تو مناظر کا کوئی نیا پہلو واضح کرتی ہیں اور نہ اچھوتی اور نادر ہیں۔ صرف یہ ہے کہ آپ کے پاس تشبیہات اور استعارات کا ایک نامحدود ذخیرہ ہے جسے وہ نہایت فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں۔

"کرمک شب تاب" کے چند شعر سنیئے:۔

محو پرواز یہ لعل یمنی ہے شاید اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہو شاید
شمع رخسار گل تر کا جو دیوانہ ہے پیرہن نور کا پہنے ہوئے پروانہ ہے

"گنگا پدمنی"، "ہندوستان جنت نشان"، "زیب النسا"، شاعر کے "وطن"، سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان میں منظریہ نظموں سے زیادہ دلکشی پائی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعر نے یہ نظمیں خود متأثر ہو کر لکھی ہیں۔

گنگا سے خطاب کر کے کہتے ہیں:۔

آب رواں میں تیرے جذب کشش وہی ہے
تیرے فدائیوں کا ذوق تپش وہی ہے
ہے جذبۂ پرستش خاطر نشیں دلوں میں
دیوی تری عقیدت ہے جاگزیں دلوں میں
لہروں میں تیری ملکر ہستی ہو پاک میری
اے کاش یوں ٹھکانے لگ جائے خاک میری

آخری شعر خصوصیت سے دلکش ہے۔

مندرجہ بالا اشعار میں "خاطر نشیں دلوں میں" میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خاطر تو خود دل کے معنی میں آتا ہے۔ "پدمنی" کا نام سنتے ہی تاریخ کا ایک ایسا خونچکاں منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جس کی اثر آفرینی شعر کی محتاج نہیں۔ برق صاحب نے اس واقع کو بھی نظم کیا ہے۔ نظم بری نہیں ہے۔

اسی ضمن میں مہارانا پرتاپ کی تلوار۔ ہندوستان جنت نشان اچھی نظمیں ہیں۔ بہرنوع اردو کے قدردانوں کو اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور منگوانا چاہیئے۔ قیمت ایک روپیہ۔ منیجر آریہ بک ڈپو نئی سڑک دہلی سے ملسکتی ہے۔

ع...

سیر یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

گذشتہ سے پیوستہ

انیس کے تعلقات مالکۂ مکان اور دوسرے مہمانوں کے ساتھ نہایت خوشگوار تھے اور اس کے فرصت کا وقت بڑے لطف سے گذرتا تھا۔ لیکن پھر بھی عزیزوں اور وطن کی یاد اُسے اکثر ستاتی اور شام کے وقت خصوصیت سے اس کی طبیعت افسردہ ہو جایا کرتی تھی۔ ہندوستان کی ڈاک پہنچنے کا دن اس کے لئے عجب انتظار بیقراری اور خوشی کا مجموعہ ہوا کرتا۔ اور ڈاک کے ملنے کے وقت اس کی خوشی کا اندازہ خطوں کی تعداد اور ان کی لمبائی کے مطابق ہوتا تھا۔ انیس اپنی ڈاک کے معاملے میں خصوصیت سے محتاط تھا۔ اور ہندوستان کی ڈاک کے متعلق تو وہ بڑی سختی سے پابندی کیا کرتا تھا۔ والد کو خط لکھنے میں کبھی ناغہ یا دیر نہ کرتا دوسروں کی طرف سے بھی کوئی خط وصول ہوتا تو واپسی ڈاک میں اس کا جواب دید ینا۔ اس کے لئے لازم تھا۔ چنانچہ تین سال کے عرصہ میں بلاناغہ ہر ہفتے کی ولائتی ڈاک میں اس کی خیریت اور دیگر حالات کی اطلاع اس کے والد کو پہنچتی رہی اور انیس نے انہیں اپنے متعلق کسی قسم کی تشویش کا کبھی کوئی موقعہ نہیں دیا۔

باقی امور میں انیس کی زندگی انگلستان میں نہایت خوشگوار تھی۔ انگریزی خوراک کے متعلق اسے شروع ہی سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ اس کی صحت اچھی رہی اور متواتر ترقی ہی کرتی گئی جسن اتفاق سے اُسے ساتھی اور دوست بھی ایسے میسر آگئے جن کی صحبت اس کی دلچسپیوں کی وسعت اور اس کی مسرتوں کی آزادی کا باعث ہوتی رہی۔ جو دوست اسے اس وقت میسر آئے انہوں نے دوستانہ تعلقات انیس کے ہندوستان واپس آجانے پر بھی بدستور ویسے ہی تازہ رکھے۔ اس سرگزشت کے دوران میں انیس کے اکثر دوستوں کا ذکر وقتاً فوقتاً آتا رہیگا۔ لیکن ان میں سے دو کا تعارف ناظرین کے ساتھ اسی مرحلے پر کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء کے وسط میں انیس کو انگلستان پہنچے ابھی صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو انیس اپنے کمرے میں حسب معمول مطالعہ میں مصروف تھا اور حسب معمول بارش ہو رہی تھی۔ نوکر نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ کہ یہ صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ انیس کارڈ دیکھکر حیران ہوا کہ اس نام کے تو کسی صاحب سے میرا تعارف نہیں۔ کارڈ پر یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے:۔

جے۔ ایل۔ جلینز۔ ویزلین کالج۔ رچمنڈ۔

انیس کارڈ ہاتھ میں لئے ملاقات کے کمرے میں گیا اور ان صاحب سے ملا۔ اس کے چہرہ پر کچھ حیرت کے آثار دیکھ کر انہوں نے خود ہی کہدیا کہ آپ حیران ہونگے کہ میں بغیر کسی تعارف کے آپ سے ملنے کے لئے کیوں آیا ہوں۔ مجھ سے مسٹر چیشائر نے آپ کا پتہ دیا تھا اور بتایا تھا کہ آپ حال ہی میں ہندوستان سے مطالعہ کی غرض سے اس ملک میں آئے ہیں۔ اور بہت کم لوگوں سے آپکا تعارف ہے۔ میں بھی آپ کی طرح طالب علم ہوں اور مجھے آپ سے ملاقات کی خواہش اس لئے پیدا ہوئی کہ اگر ہو سکے تو میں اپنے ملک میں آپکے قیام کو زیادہ خوشگوار بنانے میں مدد دوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری اس بے تکلفی کو معاف فرمائیں گے۔ انیس نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور ادھر اُدھر کی گفتگو شروع ہو گئی۔ دوران گفتگو میں انیس نے محسوس کیا کہ مسٹر جلینز ایک نہایت ہمدرد۔ ملنسار اور خوش اخلاق نوجوان ہیں۔ وہ اپنی زندگی مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر چکے ہیں اور ویزلین کالج میں مذہبی تعلیم کی تکمیل کر رہے ہیں۔ انیس نے انہیں باصرار چائے پلائی۔ رخصت ہونے لگے تو انیس سے وعدہ لیا۔ کہ فلاں دن ان کے کالج میں ان سے ملنے آئیگا۔ چنانچہ اسدن انیس ان سے ملنے کے لئے برقی ریل گاڑی پر رچمنڈ گیا۔ جلینز سٹیشن پر موجود تھے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ انیس ان کے ساتھ کالج پہنچا۔ ان کے کمرے میں چائے پی اور بعض دوسرے طلبہ اور ایک دو پروفیسروں سے ملاقات کی۔ واپسی کے وقت بارش تھم چکی تھی

لیکن اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے انیس رچمنڈ کے نظارے کا کوئی لطف نہ اٹھا سکا۔ مسٹر جلینز سٹیشن تک ساتھ آئے۔ انیس نے محسوس کیا کہ اس کی یہ سہ پہر بیحد خوشگوار گزری۔ اس کے بعد مہینے میں ایک دو دفعہ دونوں کی ملاقات ہو جاتی۔ کبھی انیس ان کے پاس چلا جاتا کبھی یہ انیس کے پاس چلے آتے۔ اور ہر ملاقات کے نتیجے میں ان کے دوستانہ تعلقات اور بھی مضبوط ہوتے چلے جاتے تھے۔ گرمیوں میں جب سیر کا وقت زیادہ میسر آنے لگا تو انہوں نے انیس کو اپنے گھر پر بھی بلایا جہاں ان کی بہنوں اور ان کے والدین سے انیس کی ملاقات ہوئی۔ اور باوجود اس تفاوت کے کہ مسٹر جلینز عیسائی پادری بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور انیس اسلام کا شیدائی تھا ان دونوں کے درمیان مذہبی اختلاف کی وجہ سے کبھی کسی قسم کی بدمزگی نہیں پیدا ہوئی۔ مسٹر جلینز نے جلد ہی یہ معلوم کر لیا تھا کہ انیس عیسائیت کے اصولوں سے خاصا واقف ہے۔ اور دوسرے انبیا کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی دل سے تکریم و تعظیم کرتا ہے۔ انیس کی صحبت سے ان کے دل میں بھی اسلام کی عزت پیدا ہو گئی۔ اور وہ اکثر انیس سے اسلام کے اصولوں کے متعلق دریافت کرتے رہتے اور کبھی کبھی انیس کوئی اسلامی کتاب ہدیۃً انہیں دیدیتا تو یہ بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے مذہب کے اصولوں پر پختگی سے کاربند ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے عقائد اور احساسات کا پورا احترام کرتے تھے۔

جب مسٹر جلینز اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد پادری بن گئے اور لندن سے دور دراز ایک مقام پر ان کی تعیناتی ہو گئی۔ تو انیس وہاں بھی ان سے ملنے کے لئے گیا۔ یہ مقام ریلوے سٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ جب انیس کے لندن واپس آنے کا دن آیا تو اس نے مسٹر جلینز سے کہا کہ ریل کی روانگی کا وقت ذرا سویرے ہے اس لئے مجھے شاید آپ کے سوتے ہی سوتے رخصت ہونا پڑیگا آپ مزدور کا انتظام کر دیں جو علی الصباح میرا بیگ سٹیشن تک پہنچا دے۔ مسٹر جلینز نے کہا کہ میں آپ کو رخصت کرنے کے لئے خود اٹھونگا۔ اور ناشتے کے بعد آپ کو رخصت کرونگا۔ مزدور بھی آ جائیگا۔ صبح انیس اٹھا اور سفر کے لئے تیار ہو کر نیچے آیا تو مسٹر جلینز کو موجود پایا۔ اگرچہ بہت سویرا تھا اس وقت عموماً اس ملک کے لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن مالکہ مکان ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ فارغ ہو کر انیس نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ تو مسٹر جلینز نے کہا کہ چلو مکان کے باہر تک میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ اور یہ کہتے ہوئے انیس کا وزنی بیگ اٹھا لیا۔ مکان سے باہر آ کر انیس نے مسکرا کر کہا خاکسار حاضر ہے۔ انیس نے اصرار کیا کہ میں بیگ آپ کو نہیں اٹھانے دونگا۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ حتیٰ کہ اس سے بھی انکار کر دیا کہ دونوں باری باری سے بیگ کو اٹھائیں یا اکٹھے اٹھا کر چلیں۔ بیگ کے ہینڈل میں سے اپنی موٹی چھڑی گزار کر پادری صاحب نے بیگ اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا۔ اور تین میل اسی طرح یہ وزنی بیگ اٹھائے انیس کے ساتھ چلتے رہے۔ اور اسے گاڑی میں سوار کرا کے رخصت ہوئے۔

بعد میں جب کبھی انیس کو انگلستان جانے کا اتفاق ہوتا وہ مسٹر جلینز کے پاس چند دن ضرور ٹھہرتا۔ مسٹر جلینز کی شادی ہو گئی۔ تو ان کی بیوی بھی انیس کا بہت احترام کیا کرتی تھیں۔ اور اس کے دوران قیام میں اس کی تواضع میں ہمہ تن مصروف رہا کرتی تھیں۔

دس سال بعد ایک دفعہ انیس مسٹر جلینز کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ تو دوران گفتگو میں اُس زمانے کا تذکرہ آ گیا جب انیس لندن میں پڑھا کرتا تھا۔ انیس نے کہا مجھے اس وقت کا تمہارے متعلق سب سے دل خوش کن واقعہ وہ یاد آیا کرتا ہے جب تم تین میل تک میرا بیگ اٹھا کر سٹیشن تک مجھے رخصت کرنے کے لئے گئے تھے۔ میں ہندوستان میں اپنے دوستوں سے اکثر اس واقعے کا تذکرہ کیا کرتا ہوں۔ جیک (یہ مسٹر جلنیز کا بے تکلفی کا نام تھا) نے جواب دیا کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ مجھے تمہارے متعلق کونسا واقعہ سب سے زیادہ یاد آتا ہے۔ انیس نے سوچ سوچ کر کہا کہ مجھے تو کوئی ایسی بات خصوصیت سے یاد نہیں۔ جیک نے کہا تمہیں یاد ہے کہ جب بعض ہم موٹر بس کی چھت پر سوار ہو کر سینٹ آلبنس کی سیر کو جا رہے تھے۔ راستے میں نماز کا وقت آ گیا تو دوران گفتگو میں بغیر کسی قسم کے تکلف کے نہایت سنجیدگی سے تم نے مجھے کہا ذرا ٹھہرو میں نماز ادا کر لوں۔ یہ کہتے ہی تم نے تیمم کیا اور نماز میں مصروف ہو گئے۔ اور چلتی ہوئی موٹر بس کی چھت پر تم نے بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی۔ تم نماز میں محو تھے اور میں اس نظارہ میں محو تھا۔ میرا دل اُس وقت ایک عجیب قسم کی حیرت اور سرور میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس شخص کا ایمان اپنے مذہب پر کسقدر زندہ اور مضبوط ہے اور اسے اپنا رب کسقدر پیارا ہے کہ انگلستان جیسے ملک میں۔ موٹر بس پر سوار۔ دوران سفر میں دوسرے مسافروں کی نگاہوں کے سامنے یہ شخص اپنے رب کی یاد میں مصروف

ہے - اور جب دربار الٰہی میں حاضری کا وقت آیا تو اس نے بلا تکلف اپنے گردو پیش سے اپنا تعلق قطع کر لیا اور اپنے معبود کے سامنے جھک گیا میں محسوس کرتا تھا کہ دوسرے مسافروں پر بھی اس کا اثر ہوا - لیکن مجھے یہ نظارہ نہایت ہی دلکش اور پیارا معلوم ہوتا تھا اور اس وقت سے میرے دل میں تمہاری عزت اور محبت اور بھی بڑھ گئی - اور بعد میں جب کبھی تم مجھے یاد آتے تھے تو ساتھ ہی یہ نظارہ بھی میری نظروں کے سامنے آجاتا تھا - اس کا نقش میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا -

ان دو معمولی سے واقعات سے ان دونوں کی دوستی کا اندازہ ہو سکتا ہے -

---

رنگ و بُو

حسن کی انتہا نہیں جلوۂ دلربائے ناز — حسن میں ایک چیز ہے اور بھی ماورائے ناز

فتنہ گری میں کم نہیں طور سے انکی انجمن — شوخیٔ برقِ دلبری گرمیٔ شعلہ ہائے ناز

مست ہوں جا رہا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں — دل میں گدازِ عاشقی چہرے پہ خاکپائے ناز

بزمِ جمال کیلئے شمع ضیا طراز ہے — عشق خدائے ناز ہے عشق نہیں گدائے ناز

رنگِ بہار کا اثر دامن عرش و فرش پر — فرش ہے یا قبائے گل عرش ہی یا لئے ناز

ساغرِ حسن یار میں بادہ و زہر جمع ہیں — زہر جگر گداز قہر بادۂ جانفزائے ناز

بہار کی دلفریبیوں میں ہوا گلستاں تمام رنگیں — فروغِ نسریں و نسترن سے نگاہ روشن ہے گام رنگیں

وہ غنچۂ بلاغ نوجوانی ہے ایک تصویرِ شادمانی — نظر فسونگر خرام دلکش مزاج شیریں کلام رنگیں

آسماں پر انجمن تاروں کی ہے دنیائے رنگ — ساغر مہتاب میں بیتاب ہے صہبائے رنگ

اُن کا جلوہ ہے کہ رقصِ نور ہے بالائے نور — اُنکا چہرہ ہے کہ موجِ رنگ ہے بالائے رنگ

پھر حسینوں نے کیا زیبِ بدن رنگیں لباس — عالمِ ایجاد یکسر بن گیا پہنائے رنگ

عابد

ہماری شاعری

مصنفہ سید مسعود حسن رضوی آدیب مطبوعہ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

مشرقی علوم کے ایک فاضل مبصر نے چند دن ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ اردو میں نئی تصنیف و تالیف کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اور ہر سال کئی سو نئی کتابیں شائع ہو جاتی ہیں۔ لیکن اُن کے مضامین سطحی ہوتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کا اُن میں نام و نشان نہیں ہوتا۔ اور کوئی مفید نتیجہ اُن سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ چینی ایک حد تک درست تھی۔ زمانہ حال کی اکثر کتابوں میں یہ خامی دیکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ بدگمانی صحیح نہیں ہے کہ تمام جدید کتابیں ایسی ہی فضول اور بے مصرف ہوتی ہیں۔

ہمارے محترم عنایت فرما سید مسعود حسن صاحب رضوی اُن منتخب انشا پردازوں میں سے ہیں جن کو حضرت نیاز اور فضلاء اکبر آباد کی طرح قسام ازل نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ دقیق سے دقیق اور بلند سے بلند خیالات اپنی ملکی زبان میں ظاہر فرماتے ہیں۔ اور ادب اردو کا پایہ اُسکی ہمسایہ زبانوں سے بلند کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتے ہیں۔

علامہ موصوف لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرار ہیں۔ لیکن فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد اوقات فرصت میں اردو ادب کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ حال میں آپ نے ایک گراں بہا تبصرہ "ہماری شاعری" پر شائع کیا ہے۔ جو اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اور ان سطور کی تحریر کا محرک ہوا ہے۔

دیباچہ میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کتاب کا موضوع فلسفی کا دماغ۔ شاعر کا دل اور مصور کا قلم" چاہتا ہے۔ اور چونکہ اس موضوع پر خیالات ظاہر فرمانے میں وہ کامیاب ہوئے۔ لہذا ارشاد ہوتا ہے۔ کہ "اگر میں خدانخواستہ تنگ ظرف ہوتا۔ تو اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھنے لگتا۔ حضرت علامہ کا ظرف الحمدللہ عالی ہے۔ اسلئے وہ صاف الفاظ میں اپنے کو فوق الفطرت ظاہر نہیں فرماتے۔ لیکن جو دانشمند اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد اس کا موضوع دریافت کرلے گا۔ وہ مجبور ہوگا کہ علامہ کو فلسفی شاعر اور مصور تسلیم کرے۔

یہ کتاب منقسم ہے ایک "ہدیۂ ارادت" ایک "فہرست مضامین" ایک دیباچہ ایک مقدمہ۔ اور ایک تبصرے پر۔ اور یہی آخری جزو جسکی ضخامت ۱۴۴ صفحے کی ہے اصل مضمون ہے۔

تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ پیش نظر کتاب کے ہر ایک باب سے اس رسالے کے ناظرین کو روشناس کرائے۔

ہدیۂ ارادت ڈیڈیکیشن کا ترجمہ ہے۔ اور یہ قیمتی تصنیف سعدی اسٹیونسن اور آزاد کے متبرک ناموں سے معنون کی گئی ہے۔ مولف صاحب فرماتے ہیں کہ اسٹیونسن وغیرہ کی شگفتہ متانت۔ سنجیدہ ظرافت۔ سادہ رنگینی۔ پرکار سادگی نے خضر راہ اور شمع ہدایت بنکر ذوق ادب کی رہنمائی کی ہے۔ "اگر حاشیہ پر" پرکار سادگی کے دل پسند معانی سادہ عبارت میں لکھدئے جاتے تو عوام الناس اس رنگین عبارت سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے۔ لیکن خطا و نسیان سے کوئی بشر خالی نہیں ہے۔ اور ایسی خفیف فروگذاشت کا لحاظ کرنا نہ چاہئے۔ خصوصاً جبکہ یہ تالیف اسٹیونسن جیسے دشوار پسند انشا پرداز سے معنون ہے جس کو ایسے ہی معنے خیز فقروں سے ذوق تھا۔

ہدیۂ ارادت کے بعد پورے چھ صفحے پر فہرست مضامین ہے۔ ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب کا خلاصہ تین ورق میں تیار کر دینا معمولی مصنف کا کام نہیں۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ فہرست پڑھنے کے بعد اگر کتاب کی ورق گردانی کی جائے تو معلومات میں بہت کم اضافہ ہو سکے۔

اصل مضمون سے پہلے ساٹھ صفحے کا ایک طویل مقدمہ جس میں علامہ نے شعر کی اہمیت اور ماہیت پر بحث کی ہے۔ اس مقدمہ میں فلسفے اور منطق کے مسائل وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اردو کو ایک حد تک عالمانہ زبان بنا دیا ہے۔

مقدمہ کے صفحہ ۳ پر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جذبات جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں۔ اور صفحہ ۱۲ پر

اس کو جنون تھا کہ وہ اپنا نام اخبار میں چھپا ہوا دیکھ لے۔ ہیرس یوں بھی کوئی برا نام نہ تھا۔ خصوصاً اخبار کی سطروں میں تو وہ نظر کو بہت ہی بھلا لگتا۔ اس نے لاکھ کوشش کی مگر اسے یہ وقعت نصیب نہ ہو سکی۔

وہ چین کے ایک ایسے مقام پر پیدا ہوا تھا کہ جہاں کوئی اخبار ہی نہ تھا جس میں نوٹس دیا جا سکے۔ اس کے والد کا ایک طویل عرصہ تک وہیں قیام رہا۔ اور جب وہ مہذب دنیا میں واپس آیا تو ہیرس دو سال کا ہو چکا تھا۔ اب ولادت کا اشتہار دیا جانا یقیناً معیوب تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس ہو کر ایک تھیٹر میں گیا تاکہ وہاں کے گانیوالوں میں ملازم ہو جائے۔ منتظم نے اس کا امتحان لیا اور خط کے ذریعہ سے جواب دینے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن خط آیا۔ ہیرس نے بڑے شوق سے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا کہ تماشائیوں کے ہیٹوں اور کوٹوں کے کمرے کی حفاظت کے لئے ایک نوکری کی جگہ خالی ہے۔ اگر منظور ہو تو اس جگہ پر تمہارا تقرر کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے موقع پر اس نے ایک گھر میں نقب لگائی۔ کہ اگر پکڑا جائے تو نیکنامی کی شہرت اگر نہیں تو بدنامی کی شہرت تو کم از کم ہو جائے۔ بہر حال اس کا فوٹو اور نام اخبار میں تو ضرور دیکھنے میں آئے گا۔ وہ کھڑکی توڑ کر مکان کے اندر داخل ہوا۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہ ملا کہ اس کی قیمتی پتلون کئی جگہ سے پھٹ گئی۔

اس کی شادی ہوئی مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کی دلہن کے والدین اس رشتے کے سخت مخالف تھے۔ شادی ہو گئی مگر ان کی چوری سے چپ چپاتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رسم ادا کی گئی۔ پھر اخبار میں اس کی اطلاع کیسے شائع کی جا سکتی تھی؟

اسی طرح زمانہ گذرتا گیا۔ ہیرس جوان سے بوڑھا ہو گیا مگر کوئی موقع اخبار میں نام چھپوانے کا نہ ملا۔ انہیں کوئی اولاد بھی نہ ہوئی۔ وہ بزعم خود ایک گمنام زندگی بسر کرتا تھا۔ اسے وہم ہو گیا کہ اس کے گاؤں والے۔ اس کے ہمسایہ حتیٰ کہ اس سے لین دین کرنے والے تک اس کا نام نہیں جانتے۔

اس کی زندگی اسی امید میں بسر ہو رہی تھی کہ اس کا نام اخبار کے سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی میں چمکتا ہوا ایک نہ ایک دن ضرور دکھائی دے گا۔ اس نے عمداً اپنی ٹانگ توڑ لی کہ کسی اشتہاری دوا سے اچھا ہو جائے اور فوٹو کے ساتھ اس دواخانہ کو اپنا شکریہ لکھ بھیجے۔ جہاں سے وہ لوگ اسے ضرور اخبار میں طبع کرائیں گے۔ مگر افسوس کہ وہ کسی اشتہاری دوا سے اچھا نہ ہو سکا۔ اور پاؤں کے درد کی بلا مفت میں گلے پڑ گئی۔

اس درد نے اتنا طول کھینچا کہ وہ صاحب فراش ہو گیا۔ چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ پاؤں سوج کر گپا بن گیا۔ ورم رفتہ رفتہ چڑھنے لگا۔ آخر کار ایک دن مقامی اخبار کے حصہ اموات میں یہ خبر نظر آئی۔

"جارج ہیرس۔ بعمر اسّی سال بمقام اکے شیا ولاس ڈیلنی۔ انتقال کر گیا"

محمد محی الدین تنویر

قدیم ہندوستان کا تھیٹر

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں ڈرامہ کے باقاعدہ اسٹیج پر ہونیکے متعلق کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا۔ صرف بھرت کی مشہور تصنیف "بھارتیا نیا شاستر" ایک ایسی کتاب ہم کو مل سکی ہے جس میں قدیم ہندوستان کے اسٹیج سے بحث کیگئی ہے۔ اور اسٹیج کی تعمیر اور ناظرین کی نشست کا نقشہ پیش کیا گیا اس کتاب کو دیکھکر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں تھیٹر کا وجود تھا۔ مگر یہ نہیں پتہ چلتا کہ اس کی ابتدا ملک کے کس حصے میں اور کس صدی میں ہوئی۔ اور ہندوستان نے اس فن کو خود ایجاد کیا یا کسی دوسری قوم سے حاصل کیا۔

ایک نئی روشنی جو اس مضمون پر پڑتی ہے وہ ڈاکٹر بلوچ کی ایک قدیم غار کی جدید دریافت ہے۔ جس کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ ڈرامے کا روپ بھرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ غار سرگجا اسٹیٹ میں لکھن پور کے قریب رام گرمہ پہاڑی میں واقع ہے۔ یہ جگہ بنگال ناگپور ریلوے کے سٹیشن لکھر سیا سے تقریباً سو میل دور ہے۔ اس غار کے سامنے ایک چھوٹی سی تماشہ گاہ ہے۔ جس میں چٹانیں کاٹکر نصف دائرے کی شکل میں چبوترے جیسی سیٹیں بنائی گئی ہیں۔ جن کی قطاریں درجہ بدرجہ ایک دوسرے سے اونچی ہوتی گئی ہیں۔ سیٹوں کے درمیان پگڈنڈیاں ہیں جو ہم مرکز دائرے کی طرح ترتیب دی گئی ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ کا خیال ہے کہ اس چھوٹی سی تماشہ گاہ کا نقشہ کسیقدر یونانی تھیٹروں سے ملتا جلتا ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی ڈرامے پر یونان کا ایک حد تک اثر تھا۔

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک یہ غار تیسری صدی قبل مسیح میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس وقت اس قسم کے دوسرے غار بھی اس مقصد کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ پروفیسر لیوڈر کی بھی یہی رائے ہے اور انہوں نے اس کی تائید میں "کالیداس کے بہت سے حصوں کا حوالہ دیا ہے۔ خاصکر لفظ "لینا سو بھیکا" کی طرف اشارہ کیا ہے جسکے معنی غار کی ایکٹرس کے ہیں۔

قدیم ہندوستان کے اسٹیج پر یونانی اثر کو ڈاکٹر بلوچ خلاف قیاس نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں اپالو کی مورت اور اندا غار سے نکلی ہوئی دوسری مورتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان پر کئی بار یونانی اقتدار قائم ہونیکی وجہ سے یہ بات بعید نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کی معاشرت اس سے متاثر ہوئی ہو۔ مگر جب تک کوئی تاریخی واقعہ نہیں ملتا اس وقت تک رام گرمہ ہل کے اس چھوٹی سی تماشہ گاہ کی واحد دریافت اور صرف اس کے طرز تعمیر کو دیکھکر "ہندوستانی ڈرامے پر یونانی اقتدار" جیسے اہم اور بحث طلب مسئلہ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

مشہور بنگالی ڈرامہ یاترا قدیم ہندوستان کی یادگار ہے۔ مگر اس کے متعلق بھی جہاں تک معلوم ہو سکا ہے۔ یہی ہے کہ اس کی موجودہ صورت اور باقاعدہ اسٹیج پر کھیلا جانا انیسویں صدی عیسوی کے ابتدا کی پیداوار ہے۔ جبکہ انگریزوں کے ساتھ بنگال میں نئے خیالات کا طوفان آ رہا تھا۔ اور مغرب کے نئے صناع ہندوستان کے قدیم نقش و نگار کو دھندلا بنا رہے تھے۔ پھر بھی یاترا میں ابتک قدیم سادگی موجود ہے۔ اور اب بھی یہ بنگالی ہندوؤں کے ایک اجتماعی اور مذہبی کھیل کی حیثیت سے کھیلا جاتا ہے۔

غرضیکہ یاترا کی قدامت سے قدیم ہندوستان کے اسٹیج کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور چونکہ بذات خود یہ ڈرامہ خالص مذہبی اور ہندوؤں کے دیوی اور دیوتاؤں کی پوجا کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے پلاٹ کے لحاظ سے بھی اسے کسی طرح یونانی اثر سے متاثر نہیں کہا جا سکتا۔

(ہندوستان ریویو) تاباں عظیم آبادی

دنیائے ادب

دیوار پر چہرہ

(از حامد علی خاں۔ بی۔ اے)

گزشتہ شام ڈینی کے ہاں ایک واقعہ پر مجھے اتنی خفت اٹھانی پڑی کہ اب تک میں سخت منفعل ہوں۔ ہاں اتنا اطمینان ہے کہ اس انفعال میں بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے شریک حال ہیں۔

مرگ انبوہ جشنے دارد

فوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع جتنا لاحاصل ہے اسی قدر دلفریب بھی ہے۔ چنانچہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا لیکن ان بیانات سے سننے والے کچھ بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ جن لوگوں سے میری شناسائی نہ تھی ان میں مختصر سے قد و قامت کا ایک زرد رو شخص بھی تھا جو بشرے سے بہت متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص کو رڈسن واٹ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کا بیان نہایت توجہ سے سنتا رہا لیکن اپنی زبان کو اس نے مطلق جنبش نہ دی پھر اسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کے لیے ڈینی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابل ذکر ہو۔ کوئی ایسی داستان جس کا کوئی حصہ ناقابل توجیہہ ہو؟"

اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا۔

"اچھا تو پھر سنیئے۔ مگر یہ کوئی داستان نہیں۔ داستان کا لفظ عرف عام میں جس مفہوم کا حامل سمجھا جاتا ہے اس کا اطلاق میرے بیان پر نہیں ہو سکتا۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے محض سنی سنائی باتیں بیان کی ہیں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حقیقت افسانہ کے مقابلہ میں نہ صرف بدرجہا تحیر خیز ہوتی ہے بلکہ بدرجہا زیادہ دل آویز بھی ہوتی ہے۔ میری داستان آپ بیتی ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی سہ پہر کے وقت یہ داستان تکمیل کو پہنچی۔"

ہم نے باصرار اس سے داستان شروع کرنے کی درخواست کی۔ اس نے کہا۔

سال یا دو سال قبل میں نے "گریٹ آرمنڈ سٹریٹ" میں ایک قدیم مکان کے چند کمرے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ سونے کے کمرے کی دیواروں پر کسی سابق کرایہ دار نے رنگ کرایا تھا لیکن چونکہ جگہ سیلی تھی اس لیے دیواروں پر جابجا رنگ کے چٹخنے سے بڑے بڑے نقش بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے ہوبہو انسانی چہرے سے مشابہ تھا اور یہ مشابہت معمول سے بہت زیادہ قریبی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ چونکا دینے والی تھی۔ صبح کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے اور بیٹھتے اٹھتے یہ چہرہ دم بدم میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے ایک حقیقی چہرہ معلوم ہونے لگا اور میں اسے اپنا شریک خانہ سمجھنے لگا۔ تعجب یہ تھا کہ دیواروں پر اس قسم کے تمام نقوش بڑھتے اور اپنی ہیئت تبدیل کرتے رہتے تھے لیکن یہ ہمیشہ بالکل غیر متغیر اور ہمیشہ بالکل ویسے کا ویسا رہتا۔

اسی زمانہ میں مجھ پر نزلہ اور بخار کا ایک شدید حملہ ہوا اور مرض نے کسی قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ میں دن بھر بستر پر لیٹا مطالعہ اور سوچ بچار میں مستغرق رہتا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ انھیں دنوں وہ چہرہ میرے دل و دماغ پر اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ مستولی ہونے لگا۔ میں اسے روز بروز زیادہ حقیقی اور روز بروز زیادہ جاذب توجہ پاتا تھا بلکہ وہ دن اور رات ہر وقت میرے خیالات پر حاوی رہتا تھا۔ ناک کی ایک نرالی وضع اور پیشانی کے ایک مخصوص جھکاؤ کی وجہ سے اس چہرے میں انفرادیت کا امتیاز بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے ہم ہزارہا انسانوں میں سے صاف الگ پہچان سکتے ہیں۔

صحت پانے کے بعد بھی میرے خیالات اس چہرے کی قید سے

آزاد نہ ہونے پائے۔ میں بازاروں میں اس کے ہم صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں ایسا ایک حقیقی شخص بھی ضرور موجود ہے اور میرا اس سے ملنا ناگزیر ہے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں اپنی اور اس کی ملاقات کو کیوں اٹل سمجھتا تھا۔ مجھے صرف اتنا یقین تھا کہ کارفرمایان قضا و قدر نے کسی پُراسرار طریقہ سے میری اور اس کی ذات کو باہم وابستہ کر رکھا ہے۔ میں عام اجتماعات میں کثرت سے آنے جانے لگا۔ سیاسی مجالس۔ فٹ بال وغیرہ کے مقابلوں اور ریلوے سٹیشنوں پر میری جستجو پرور نگاہیں ہر طرف دیوانہ وار پھرا کرتی تھیں۔ بالخصوص صبح کے وقت جب مضافاتی ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ کر انسانوں کو انبوہ در انبوہ اگل دیتی تھیں اور پھر شام کے وقت جب وہ انھیں دوبارہ نگل جانے کے لیے آمادہ ہوتی تھیں لیکن میری یہ تمام تگ و دو بالکل بے حاصل ثابت ہوئی۔

یہ حقیقت اس سے قبل مجھ پر کبھی اتنی واضح طور پر نہ کھلی تھی کہ انسانی چہرے کی اس قدر کثیر التعداد مختلف صورتیں ہیں اور پھر اس قدر کم! کیونکہ اس اختلاف کے باوجود ہم ان کو از روئے اصطلاحات اتنے قلیل التعداد گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ ان کا شمار ہاتھوں کی انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔

یہ جستجو میرے لیے ایک سودا بن گئی۔ اور میں بجز اس جستجو کے دوسری ہر بات سے غافل ہو گیا۔ میں پیچ بیوپار کی منڈیوں اور عام گزرگاہوں میں لوگوں کی بھیڑ پر نظر جمائے برابر پہروں کھڑا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے۔ ادھر کوتوالی کی توجہ میری طرف منعطف ہو گئی اور وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ نسوانی چہروں سے میری غلط انداز نگاہیں کوئی واسطہ نہ رکھتی تھیں بس مرد اور صرف مرد ہی میری نظربازی کا مرکز تھے۔"

احساس کوفت کی شدت کے باعث اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا اور پھر اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آخر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک ٹیکسی میں سوار تھا جو پکیڈلی میں مشرقی سمت کو جا رہی تھی۔ میں دفعتاً مڑا اور کچھ دور تک اس کے ساتھ بھاگا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے ڈرائیور سے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس ٹیکسی کا تعاقب کرو اور خود اچھل کر اس میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے اس ٹیکسی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ آخر ہم چیرنگ کراس پہنچے اور میں ٹیکسی سے اترتے ہی پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے اس شخص کو دو خاتونوں اور ایک ننھی بچی کے ساتھ کھڑا پایا۔ وہ دو بج کر بیس منٹ کی گاڑی سے فرانس کو روانہ ہونے والے تھے۔ میں اس کے ساتھ ایک دو بات کرنے کا موقع پانے کے لیے اس کے قریب ادھر ادھر منڈلاتا رہا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہت سے اور لوگ بھی انہیں رخصت کرنے کے لیے سٹیشن پر آ پہنچے تھے اور وہ ان کے درمیان گھرا ہوا گاڑی میں سوار ہو گیا۔ پھر میں نے بھی جلدی سے فوکسٹن کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں جہاز کے روانہ ہونے سے قبل میں اس سے مل سکوں گا لیکن فوکسٹن میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھ سے قبل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاز کے اس حصے میں اس نے متعدد کمرے اپنے لیے مخصوص کرا رکھے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی نہایت متمول شخص ہے۔

مجھے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس پر میں نے بھی سمندر کو عبور کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جہاز کا سفر شروع ہونے کے بعد وہ خاتونوں کو تنہا چھوڑ کر عرشے پر ٹہلنے کے لیے باہر آئیگا میرے پاس اس وقت بولون تک صرف ایک طرف کے کرایہ کی رقم تھی لیکن ان باتوں سے میرا عزم کہاں متزلزل ہونے والا تھا میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی بیٹھ کر انتظار کی ساعتیں گننے لگا۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا لیکن چھوٹی بچی اس کے ساتھ تھی۔ میرا دل نہایت زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اس کے چہرے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔ ایک ایک خال اور ایک ایک خط اسی دیوار والے چہرے کا تھا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر عرشہ جہاز کے بالائی حصے پر جانے کے لیے ایک بغلی راستے کی طرف ہو لیا میں نے دل میں کہا کہ اگر اب بھی میں ناکام رہا تو پھر مجھے کامیابی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ ہی دیا۔ معاف فرمائیے میں حارج ہوا لیکن اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ عنایت فرمائیے۔ میں نہایت اہم وجوہ کی بنا پر آپ سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں۔

وہ یہ سن کر کچھ متحیر سا رہ گیا لیکن اس نے میری درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ نہایت دلجمعی کے ساتھ اس نے جیب میں سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے میرے حوالے کر کے خوبصورت تمام بچی

کی معیت میں آئے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے مجھے دیوانہ خیال کیا اور یہی زیادہ مناسب سمجھا کہ میری خواہش پوری کر دی جائے۔

میں کارڈ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کر اسے پڑھنے کے لیئے جہاز کے ایک تنہا گوشے میں چلا گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں اور میرا سر چکرانے لگا۔ جب میں نے کارڈ پر اس کا نام پڑھا "مسٹر آرمنڈ وال ٹپس برگ، ریاستہائے متحدہ امریکہ" اس کے بعد مجھے اور کچھ یاد نہیں۔ جب ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو بولون کے ایک شفاخانے میں پایا۔ وہاں میں ہفتوں خراب و خستہ حالت میں پڑا رہا اور اب مجھے وہاں سے واپس آئے بہ مشکل مہینہ بھر گزرا ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لیئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب فرط حیرت سے کبھی اس کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اس شام ہم نے جس قدر باتیں سنی تھیں وہ اس چھوٹے سے زرد رو آدمی کی داستان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد اس نے کہا:۔

میں نے گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں واپس آکر اس امریکن کے حالات کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع کیا جس کی زندگی میں بعض پُر اسرار اتفاقات نے مجھے یوں دخل انداز کر دیا تھا۔ میں نے ٹپس برگ میں لوگوں کو خطوط لکھے۔ امریکن ایڈیٹروں سے مراسلت کی اور لندن میں جو امریکن مقیم تھے ان سے میل ملاقات شروع کی لیکن مجھے بجز اس کے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک کروڑپتی ہے اور اس کے والدین انگریز تھے جو لندن میں رہا کرتے تھے۔ یہ مجھے باوجود انتہائی کوشش کے معلوم نہ ہو سکا کہ لندن میں ان کی جائے سکونت کس مقام میں تھی۔

گزشتہ صبح تک حالات بدستور رہے۔ میں رات کو معمول سے زیادہ تھکا ماندہ لیٹا تھا اس لیئے دیر تک سوتا رہا۔ جب میں بیدار ہوا کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی میں نے حسب عادت سب سے پہلے دیوار پر چہرہ دیکھنے کے لیئے نظر اٹھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل مل کر دیکھا اور خوف و ہراس سے کانپ اٹھا۔ چہرے کے محض دھندلے سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ گزشتہ ہی شب چہرہ بہ حسب سابق بالکل صاف صاف نظر آتا تھا بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیا ہی چاہتا ہے۔ لیکن اب صرف ایک ہیولا باقی رہ گیا تھا۔

میں افسردہ و سراسیمہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ صبح کے اخبار چھپ کر بازاروں میں فروخت ہونے کے لیئے آ چکے تھے۔ فہرست مضامین کے اشتہاروں میں میری نظر اس عنوان پر پڑی "امریکن کروڑپتی کو موٹر کا حادثہ" آپ سب نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا۔ میں نے فوراً اخبار خرید لیا اور جو خبر پڑھنی چاہیئے تھی پڑھی۔

"ٹپس برگ کے کروڑپتی مسٹر آرمنڈ وال متعلقین کے ساتھ اپنی موٹر کار میں سپیزا سے پیسا کو جا رہے تھے کہ ان کی موٹر ایک چٹان سے متصادم ہو کر الٹ گئی۔ مسٹر وال کی حالت نازک ہے۔"

میں اسی سراسیمگی کی حالت میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دیوار پر چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسی حالت میں چہرہ دفعتہً بالکل غائب ہو گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضربات کی شدت کے باعث مسٹر وال غالباً ٹھیک اسی وقت جاں بحق ہو گئے تھے۔

اس کے بعد وہ پھر کچھ دیر کے لیئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب نے فرداً فرداً مختلف کلمات سے اظہار تعجب کیا اور فی الواقع یہ مقام استعجاب تھا۔ پھر اجنبی نے کہا:۔

مجھے اس واقعہ میں تین باتیں نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ لندن کے ایک مکان کی دیوار کے پھٹنے سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی صورت بن گئی جو امریکہ میں تھا بلکہ یہ صورت اس شخص کی زندگی کے ساتھ نہایت گہرا ربط بھی رکھتی تھی۔ اس واقعہ کی توجیہہ سائنس سے فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کا نام بھی اسی مقام سے ایک نسبت رکھتا تھا جہاں کسی پوشیدہ قوت نے ایک عجیب و غریب طریقے سے اس کی صورت بنا دی تھی۔ یقیناً آپ کو بھی ان واقعات پر حیرت ہوئی ہو گی۔"

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا اور پھر ہم لوگوں کے درمیان فوق الفطرت مظاہر کے متعلق دوبارہ وہی بحث پہلے سے دہ چند جوش و خروش کے ساتھ چھڑ گئی۔ اس اثنا میں وہ اجنبی شخص اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ ابھی وہ

ہی میں پہنچا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص نے دمقام مسرت ہے کہ وہ ہیں
اس سے اس عجیب واقعہ کے متعلق تیسری حیرت انگیز بات دریافت
ہی گرما گرم بحث کے محرک کی طرف دوبارہ متوجہ کیا سینٹین نے اسے یاد
نے تین حیرت انگیز باتیں کہی تھیں"۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
ں: وہ تیسری بات۔ میں اسے بھول ہی رہا تھا تو اس داستان

کے متعلق وہ تیسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے اسے نصف گھنٹہ
ساعت قبل تصنیف کیا تھا۔ لیجئے خدا حافظ"۔
ہوش وحواس درست ہونے کے بعد ہم نے ڈرسن وائٹ کو تلاش کیا جو اس
مار آسٹین کو محفل میں لے کر آیا تھا لیکن وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا۔
(ہمایوں)

ہندی

ے پانی کے گرم قطرے! تو نے موت کی مانند سرد اور
ی طرح طویل آہ کے ساتھ باہر آکر کیا پایا؟ ذرا سی بات
ت نہ کر سکا۔ آپ بے صبر بنا، مجھے بے صبر بنایا اور آخر
و کھو بیٹھا۔
تو نرم دل کے نازک ترین حصہ میں پیدا ہوا۔ پھر تیری طبیعت
بلد باز اور گرم کیوں ہو گئی۔ تو نے آنکھ میں آکر کر لسا درد انگیز
دیکھا جس سے پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ ظالم تو نے دل کا عرق نکال
لیا آنکھوں کی چمک بجھانے کا ارادہ تھا؟

ٹھہر اے آنسو کے درخشاں قطرے ٹھہر۔ میرے دل کی
آمید بر آلینے دے۔ میرا مقصد پورا ہو لینے دے پھر
آنکھوں سے نکل جانا، اور نکلتے وقت اپنے ساتھ قوتِ بینائی
بھی لئے جانا۔ کیونکہ اس وقت مجھے کچھ اور دیکھنے کی خواہش
نہ رہیگی۔ مگر تو نے میری آہ وزاری نہ سنی، اور آنکھوں سے
نکل کر خاک میں کود پڑا۔
تو میری مرحوم بیوی کی یاد کی مانند شیریں تھا۔ تو میرے معصوم بچے کے
حسین پتلے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کی طرح سنجیدہ اور سمندری طوفان کی طرح خوشی منانے والا تھا

پنجابی

جو آنکھیں تیرے چہرے کا جلال دیکھکر مسرور ہو چکی ہیں وہ کسی اور چیز
طرف نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کے سامنے ہزاروں زریں تخت
ہی رکھ دئے جائیں تو بھی وہ ان کی طرف نہیں مائل ہو سکتیں کیف
مسرت سے بند آنکھیں کسی چیز کو کیونکر دیکھ سکتی ہیں۔
تیرے رخسار پر جو تل ہے دنیا اس کی موزونیت اور

اس کے حسن پر مری جارہی ہے تیری زلفوں پر کتنوں کا دین و ایمان
قربان ہو رہا ہے۔ تیرے سامنے مقدس ترین چیزیں بھی ہیچ ہیں میری
روح کو کس قدر مسرت حاصل ہوگی جب میرے مرنے کے
بعد میرے دشمن کہیں گے کہ " تیرا سودائی در بدر مارا پھرتا تھا۔

گجراتی

وقت ہو گیا، مجھے چلنے کی فکر ہوئی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک
ال بن گیا۔ میرے جسم کے بال بال میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔
میرے دوست رو رہے تھے، ان کی آنکھیں میری طرف
بچاسیری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، میرے پاؤں میں زنجیریں پڑ
ئیں۔ مگر شوق دیدار اور ذوق وصل نے انکو پاش پاش کر کے

زمین پر بکھیر دیا۔ اور میں روانہ ہونے کو کھڑا ہو گیا۔
یکایک میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک حسین
اجنبی میری طرف نخوں سے لدا ہوا آرہا ہے۔ اور جب
وہ قریب آیا، تو میں حیرت سے ساکت رہ گیا کہ وہ اجنبی
تو تھا۔

تامل

شکتی (قدرت غیر محدود) کی شناگرو۔ جس کی تشریح زبان سے
ر ممکن ہے۔ وہ عظمت و جلالت کا سرچشمہ ہے وہ شانتی سروپ

اور اتھاہ ہے۔ اس کا ذاتی جوہر علم ہے۔ علم شکتی ہے شکتی
علم ہے۔

بنگالی

میں تم سے ملنے کے لئے تاریکی میں بیٹھا ہوں، مگر تم چراغ لیکر میرے پاس آتے ہو۔

میں صرف تمہاری خاطر تنہائی چاہتا ہوں اور راہ کا بھکاری بن کر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر تم باجوں کے شور کے ساتھ بیش قیمت زیور پہنکر میرے پاس آتے ہو۔

میں نے تمہاری خاطر سب کچھ لٹا دیا ہے۔ مگر تم سب کچھ لیکر ہی میرے پاس آتے ہو۔

میں تمہاری ملاقات کے لئے رات کا وقت بہترین سمجھتا ہوں۔ مگر تم سورج کی کرنوں کا تاج پہنکر میرے پاس آتے ہو۔ میں خاموشی کا جویا ہوں۔ تم گیت کے مشتاق ہو۔

کیا تم بھی نمایش پسند ہو؟ ——— میں نے تمہیں آجتک نہ پہچانا تھا۔

کشمیری

وہ انسان جو غرور کی خطرناک بلندیوں سے سرسبز وادیوں میں اتر آیا ہے۔ جو دوسرے کو انسانوں کو عزت اور ہمسری کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس کے مملکتِ دل میں عیش و عشرت کے روز روشن کی مسرت تکالیف و مصائب کی تاریک اور بھیانک راتوں کا غم ایک ہی درجہ رکھتے ہیں۔ جس کا ضمیر گناہوں کی موسلا دھار بارش میں سینہ سپر ہے۔ اور جس کا دل دنیاوی مصائب میں آرام۔ مسرت۔ سکون کا گہوارہ ہے۔ صرف وہی انسان مقرب الٰہی ہے۔ اور صرف وہی منزل توحید کی پُرخار شاہراہ پر گامزن ہے۔

سنسکرت

زمین نے نیکوں اور بدوں دونوں کو سنبھال رکھا ہے۔ سورج کی گرمی اور دھوپ دونوں کو مساوی پہنچتی ہے۔ فرحت بخش ہوا بھی دونوں میں امتیاز نہیں کرتی اور بارش کا دیوتا اپنی نفع بخش بارش سے دونوں کو بہرہ ور کرتا ہے۔ مگر یہ مساوات اسی دنیا تک محدود ہے۔ عاقبت میں دونوں الگ الگ کر دئے جائیں گے۔ اور راست باز کو اقلیم نور میں رکھا جائے گا۔ ان کی شادمانی کو کبھی زوال لاحق نہ ہوگا۔ ان کی مسرت غیر فانی ہوگی۔ بدکار دوزخ میں بھیجدئے جائینگے جسکا گڑھا نہایت گہرا اور بیحد تاریک ہے۔ جہاں دکھ درد کے سوا اور کوئی چیز میسر نہیں آسکتی۔

تلنگو

میں نے سونے چاندی کی تلاش میں زمین کھود ڈالی۔ میں سمندر پار بھی گیا ہوں۔ میں نے بڑی حکمت سے بادشاہوں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے شمسان بھومی میں راتیں بسر کی ہیں۔ میں نے معرفت کے حصول کیلئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر میری ساری کوشش بیکار گئی۔ مجھے کسیطرح اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ نہ میری تمنائیں ختم ہوتی ہیں اور نہ مجھے طمانیت نصیب ہوئی۔

عربی

مقرر کے صفات

ایک کامیاب مقرر بننے کیلئے ضروری ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ دوران تقریر میں جسم کو بہت زیادہ حرکت نہ دے۔ موقع کے مناسب الفاظ استعمال کر سکتا ہو۔ خواص کے مجمع میں بازاریوں کے عام الفاظ نہ استعمال کرے۔ رؤسا اور امرا کو عوام کی طرح مخاطب کرے ہر طبقے کے سامنے اس کے فہم کے مطابق اسلوب اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہو۔ اتنی مختصر تقریر نہ کرے کہ مطلب چیستاں بنکر رہ جائے اس قدر طوالت سے کام نہ لے کہ اس کا کلام صرف الفاظ کا بے رنگ و بو گلدستہ سمجھا جائے۔ اتنی زیادہ عبارت آرائی کو دخل نہ دے کہ تقریر عوام کی سمجھ سے باہر ہو جائے۔ ایک مقرر کے لئے ضروری ہے کہ تمام رائج علوم و فنون سے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو۔ منطق میں بھی (ایک فن کی حیثیت سے نہ کہ اعتراض ومناظرہ کے لحاظ سے) دسترس رکھتا ہو۔

فارسی

لامکان کی فضائے لامتناہی اس کا دربار ہے اور بے نیازیوں کا ہجوم اس کی فوج۔ قصر وحدت پر اس کا شاہی نقارہ بجتا ہے۔ باغ خلقت اس کی نگرانی کی وجہ سے "مغفرخاں" بنے ہوئے ہیں۔ بیشک اس باغ پر اس کا علم لہرا رہا ہے اس وقت تک اس باغ کا نافرمان بھی اس کے تابع حکم ہے۔ بلبل پھول کے ممبر پر ہمیشہ اسی کے نام کا خطبہ پڑھتی ہے۔ اور قمری اسی کے راز کی آگاہی کے سبب اسقدر مسرور نظر آتی ہے۔ جب سے اس نے شبنم کے کوتوال کو شب گردی کا حکم دیا ہے باغ کے گلی کوچوں میں پاسبان کی حاجت نہ رہی۔ اس کے لطف و کرم کا پر بہار باغ بے خزاں ہے۔

جاوی

بارش نے کھیتوں جھیلوں اور تالابوں کو پانی سے بھر دیا میرے دھان کے کھیت ابتک نہیں کاٹے گئے۔ سب نے اپنے کھیت کاٹ لئے۔ سب نے اپنے خرمن جمع کر لئے۔ مگر میں بدنصیب اب قسمت کو رو رہا ہوں۔ میں اپنے کھیت کاٹنے کا ہر روز ارادہ کرتا تھا۔ مگر کاہلی نے راہ عمل پر کبھی گامزن نہ ہونے دیا۔ میرے کھیت ویسے ہی کھڑے رہے اور کسی نے بھی انکو نہ کاٹا۔ بھلا کوئی کسی کا کام کرتا ہے۔

افسوس۔ میں نے زندگی کی بہار کو کھیل کود میں گنوا دیا۔ اور کام کے وقت کو عیش و عشرت میں برباد کر دیا۔ اب میں خود اپنے لئے ایک زحمت بنگیا ہوں۔

چینی

ہماری زندگی بیحد مختصر ہے۔ سو سال تک شاید ہی کوئی خوش نصیب زندہ رہتا ہے۔ مگر یہ مدت مصائب کی وجہ سے ہزاروں سال کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ مسرت سے دن کٹنے دشوار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آؤ خوشی مناؤ۔ دن جلد کٹ جائیں گے

ہر بات میں دور اندیشی اور جزرسی کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ مگر مسرت کے حصول میں یہ خیال ترک کر دینا چاہیئے اپنی زندگی کو بے قاعدہ بنا دو۔ سب سے بڑا احمق وہ ہے جو اپنی زندگی کو قاعدے کا مطیع کرنا چاہتا ہے۔

جاپانی

دانا آدمی شہر بساتا ہے مگر عیار عورت اسے اجاڑ دیتی ہے۔ عورت میں چاہے کتنی ہی خوبیاں ہوں وہ چالاک اور عیار ہے تو وہ ایک منحوس پرندہ ہے

زبان دراز عورت انسان کو تباہی کے گڑھے میں اتارنے کا زینہ ہے۔ بدحالی اور ابتری آسمان سے نازل نہیں ہوتی بلکہ پھوہڑ عورتوں کے وسیلے سے آتی ہے۔

قبطی

جو علم حاصل کرتا ہے اُسے سفیر بنا کر دوسرے بادشاہوں کے دربار میں بھیجا جاتا ہے۔ لوہار کو کون ایلچی بناتا ہے۔ وہ دن بھر اپنی بھٹی کے سامنے بیٹھا لوہا کوٹتا رہتا ہے اس کی انگلیاں گھڑیال کے چمڑے جیسی ہو جاتی ہیں اس کے کپڑوں سے بدبو آتی ہے۔ بڑھئی بھی اس سے بڑھکر نہیں ہے۔ نائی دن بھر بازاروں میں مارا پھرتا ہے اور رات کو بھی کام میں لگا رہتا ہے۔ ماہی گیر کا کام سب سے بدتر ہے۔ دریائے نیل کے خوفناک گھڑیال اس کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور موقع پاکر اُسے پانی میں گھسیٹ لیجاتے ہیں۔ اس کے بدن میں مچھلی کے انڈے جیسی بو آتی ہے۔ مگر علم و دانش والا آدمی سب پر فائق ہے۔ اگر تو بڑا بننا چاہتا ہے تو حکمت سیکھ۔ اور علم کے نور سے اپنے دل کو روشن کر۔

بابلی

کامیابی حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم قانون قدرت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور دیوتاؤں کے نقش قدم پر چلیں۔ وہ ہر نعمت بلا معاوضہ عطا کرتے ہیں اگر ہم ان کی تقلید کریں تو ہمیں احسان فراموشوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا چاہئے۔ مینہ کو دیکھو اچھے بُرے ہر ایک کے لئے ایک ہی جیسا برستا ہے۔

اگر تم اپنے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ دوسروں کیلئے رہو۔ زندگی کے آخری لمحے تک دشمن سے بھی رواداری برتو۔ اس دنیا کی دشمنی تمہارے ساتھ نہیں جائیگی۔ تم کسی کی دشمنی لیکر نہیں آئے تھے۔ کسی کی دشمنی لیکر نہیں جاؤگے۔ یہ چیزیں روح کی حدود سے خارج ہیں۔ روح بلند ترین مقام پر رہتی ہے۔

یونانی

اس کائنات میں جسقدر بھی علم ہے۔ کاش کوئی مجھے سکھائے۔ میں سیکھنے کے لئے بیقرار ہوں۔ کوئی نئی چیز بتلائے میں اس کی خدمت کرنے کو حاضر ہوں۔ میں در علم کی تلاش میں سرگرداں ہوں اور خدا کی رحمت کا امیدوار۔ اب مجھے قسمت کا کوئی دلدادہ بتائے کہ جب تک کوئی کسی چیز کی تلاش کا خواہشمند نہ ہو۔ قسمت اُسے کہاں سے مہیا کر سکتی ہے۔

اگر اس دنیا میں قسمت ہی تمام چیزوں، تمام واقعات اور تمام حادثات کا مختار کل ہے تو پھر بھلا بادشاہ کس لئے ہوتے ہیں۔ وزیروں، امیروں مدبروں۔ مقرروں کی کیا ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان خودغرض واقع ہوا ہے۔ بھلائی اپنے نام کی طرف منسوب کرتا ہے اور برائی قسمت کے سر تھوپ دیتا ہے۔

انگریزی

اُونہ! ایسے پست فطرت انسان کا میرے سامنے کیا ذکر جو داستان کا ہیرو بننے پر فخر کرے! ——— ہماری جوانی کا پُرشور زمانہ ہماری سچی عظمت وشان کے دن ہیں!

ایک مستِ شباب نونہال کے لئے جنگل کا ایک خودرو پھول (لعل) گوہرمند کے سنہرے ہاروں سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے! طُرّے اور کلغیاں اس پیشانی کے لئے نہیں نہیں جس پر جھُریاں آگئی ہوں! جس طرح ایک مرجھائے ہوئے پھول کے رخسار سے بر ابر بہار کے قطرے بے رونق معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پُرشکن پیشانی پر عظمت وشوکت کا تاج بھی دھندلا اور بے محل نظر آتا ہے۔

میری نگاہ میں تو ایسے ہاروں، ایسے تاجوں اور ایسے طُرّوں اور کلغیوں کی ذرا بھی عزت نہیں جن کا مدعا صرف شان ہو ——— صرف شہرت ونمود ہو!!

ناپائیدار اور مغرور شُہرت! تو ہرگز یہ گمان نہ کر کہ میں نے کبھی تجھے تیرے لئے یا تیرے بڑے بڑے بارُعب خطابوں کے لئے چاہا۔ تیری چاہت تو صرف اس لئے ہو گئی کہ کسی کی آنکھوں نے مجھے اپنی محبت کے لئے حقیر ....! ان آنکھوں ہی میں پہلی بار میں نے تجھے پہنچانا۔ اس سے قبل میں تجھ سے ناآشنا تھا!

میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تیرے گرد جتنی کرنیں چمک رہی ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ تیز اُسی آنکھ کی کرن تھی جس نے تجھے میری نگاہ میں چمکایا! اور ہائے! وہی کرن جب میرے سرابِ زندگی کے ایک ذرّے پر بھی پڑ گئی جس کو میں اب تک حقیر اور ناقابلِ التفات سمجھتا رہا۔ تو وہ ذرّہ میری زندگی کا ایک شہ کار بن کر چمک اٹھا اور میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ محبت اور عظمت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں!!

(شیلے) نمکین رامپوری

جرمن

بہار کی پیاری جانفزا نظر نے ندیوں اور چشموں کو جنہیں برف نے جکڑ رکھا تھا، رہا کر دیا ہے، وادیوں میں اُمید کی مسرت سرسبز ہو رہی ہے۔ مسن جاڑے نے ضعف کے سبب پسپا ہو کر ناہموار پہاڑیو

میں پناہ لی ہے، اور بھاگتے بھاگتے وہاں سے بھی میدانوں کی سبز
پوش سطح پر برف کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی بوچھار کر رہا ہے۔
میں گاؤں کی چہل پہل کی آواز سنتا ہوں۔
یہی ہے غریبوں کا نیلا آسمان۔
ہر چھوٹا بڑا خوشی کے نعرے بلند کر رہا ہے۔
یہاں میں انسان ہوں۔
اور یہیں میں انسان ہو سکتا ہوں۔"

فرانسیسی

محبت مثل اُس پھول کے ہے جو صحرا میں کھلا ہو۔ یہ مصیبت سقوطری کی مانند ہے جو ایک مرتبہ شگفتہ ہوتا اور پھر پژمردہ ہو جاتا ہے یہ زندگی کے شورہ زار میں کھلتا ہے اور اُس کا چہرۂ سیمیں اُسی طرح بربادی و ویرانی کا محرک ہوتا ہے جس طرح کہ ستارہ (مریخ) طوفان کا باعث۔

محبت کا ایک آفتاب ہے اس کے اوپر روح رواں اور اس سے بالاتر اس کی وحدانیت کی ہوا چلتی ہے۔ قدم کی آواز پر محبت ظاہر ہوتی اور اپنا چہرۂ گلنار اس کی طرف جھکا دیتی ہے جو پاس سے گذرتا ہے وہ اس کو توڑ لیتا ہے۔ وہ اُس کٹوری کو توڑ لیتا ہے جو شہد سے بھری ہوتی ہے اور اپنے ہمراہ لے چلتا ہے۔ صحرا کے پار دُور جنگل کا پھول کُملا جاتا ہے۔ اور صحرا ختم ہو جاتا ہے۔

زندگی کے ویرانہ میں صرف ایک ہی کامل پھول ہوتا ہے اور وہ پھول محبت ہے۔

ہماری گردشوں کے گرد و غبار اور نشیب و فراز میں صرف ایک ہی مستقل روشنی ہوتی ہے اور وہ روشنی محبت ہے۔ ہماری ناامیدی کی راتوں میں صرف ایک ہی اُمید ہوتی ہے اور وہ امید محبت ہے اور تمام کچھ فریب ہے۔ پانی پر سایہ رواں ہے۔ ہوا ہے۔ خیال باطل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ محبت کا وزن اور مقدار کیا ہے؟ یہ جسم میں پیدا ہوتی اور روح میں بسیرا کرتی ہے اور ہر ایک شئے میں اپنے آرام کی جویا ہوتی ہے۔ حسن کے لئے یہ مثل ستارہ کے ہے۔ اس کی بہت سی شکلیں ہیں لیکن تمام فریفتہ کرنے والی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ستارہ کہاں سے روشن ہوا اور کس جگہ غروب ہو گا۔

اطالوی

ایک عورت تھی، جو نہایت حسین تھی اُس کی آنکھیں سوتے وقت بھی مسکراتی رہتی تھیں۔

وہ جس محفل میں جاتی تھی۔ اپنے حُسن کے جادو سے اُسے زیر و زبر کر دیتی تھی۔ جس آدمی کو چاہتی تھی۔ تسکین قلب سے محروم کر دیتی تھی۔

ایک دن مکڑی کا جالا ٹوٹ گیا۔ اُس نے اپنی بہترین کوششیں صرف کر دیں۔ لیکن جالے کے تار نہ جُڑ سکے۔

اس کے بعد اس کا آئینہ ٹوٹا۔ اور اس کا روپہلی سایہ فضا میں گم ہو گیا۔ اُس نے اُس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اٹھائے لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔

اُس کے قریب کوئی متنفس نہ تھا۔ لیکن اپنی بے بسی پر اُسے اس قدر رنج ہوا۔ کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اس رنج کو ایک پُر لطف نغمہ میں غرق کرنا چاہا۔ لیکن اُس کی انگلیوں اور آواز دونوں نے جواب دیا۔

مغرور حسینہ بے بس ہو کر صوفہ پر گر گئی۔ اور گرم گرم آنسو اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

لاطینی

تم سے پوچھا جائے کہ تم کس ملک کے رہنے والے ہو تو اس کے جواب میں ایتھنز کا نام نہ لو۔ بلکہ یوں کہو کہ مَیں دنیا کا رہنے والا ہوں سارے آدمی خدا کے بیٹے ہیں۔ اور اس نے اپنے بیٹوں ہی کے لئے یہ دنیا بنائی ہے۔ پھر اپنے کو دنیا کا باشندہ کہتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو۔ جب خدا ہمارا باپ اور ہمارا محافظ ہے تو خوف و خطر کیسا۔ تم بادشاہ کے رشتے دار ہو تو بھی اپنے ہم جنسوں کی نفرت و عداوت سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ تم سے جہاں تک ہو سکے اپنے ہم جنسوں سے مروت اور محبت کا برتاؤ کرو۔ وصالِ خدا کی شادمانی حاصل

باہتمام محمد یوسف تاباں پرنٹر پبلشر رفیق عام پریس لاہور میں چھپ کر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

رجسٹرڈ　　　　ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۲　　　　بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء　　　　نمبر ۲

فراق کا گیت

(مطربہ)

فروغِ مہتاب اِک فسانہ ہے اس کے رخسارِ آتشیں کا
بہارِ فردوس اک ترانہ ہے اس کی رنگینیٔ جبیں کا

یہ تابشیں جسمِ مرمریں کی یہ رنگ ملبوسِ ریشمیں کا
شرارہ ہے آتشِ وفا کا ستارہ ہے عرشِ ہفتمیں کا

یہ گیسوئے مشکبار اس کا۔ یہ جلوۂ زرنگار اس کا
بسا ہوا ہے شباب جس میں تمام گلہائے نازنیں کا

یہ اور بھی پر لگے ہوئے ہیں نگاہ کے تیرِ دلنشیں کو
لرز رہا ہے شرابِ غم سے جو میکدہ چشمِ سرمگیں کا

جبیں کی رنگینیوں پہ سایے غمِ محبت کے چھا گئے ہیں
ہٹیں جو یہ بادلوں کے ٹکڑے چمک اُٹھے چاند چودھویں کا

وہ کیا تمنا ہے جسکی سوزش سے ہے ستار اسکا شعلہ پرور
وہ کیا ہوائیں تھیں جن سے مُرجھا گیا ہے یہ پھول یاسمیں کا

وہ خود بھی اک گونج بنکے مٹ جائیگی یہ محسوس ہو رہا ہے
وہ خود بھی اک جزوِ نغمگی ہے ستار کے نغمۂ حزیں کا

ہر ایک شے کائنات کی اضطراب سے تھرتھرا رہی ہے
فسانۂ غم سُنا رہی ہے فراق کا گیت گا رہی ہے

گیت

ہجومِ غم سے ہو مضطرب دل تو عمر کا اعتبار کیا ہے؟
بھڑک رہے ہوں جہاں یہ شعلے وہاں نمودِ شرار کیا ہے؟

بجائے پھولوں کے داغ پائے ہیں مَیں نے گلزارِ عاشقی سے!
جو حاصلِ روزگار یہ ہے تو حاصلِ روزگار کیا ہے؟

"اُنہیں" سے تھی زرنگار دنیا "اُنہیں" سے تھی نغمہ زار دنیا
مرے لئے اک سیلِ غم ہے فروغِ رنگِ بہار کیا ہے!

دیارِ عشرت میں رہنے والو وفا کو بیکار کہنے والو
کوئی تمہیں کس طرح بتائے مصیبتِ انتظار کیا ہے؟

فغانِ غم بے اثر نہیں تھی شکستہ پر سرلبہ نہیں تھی
مجھے ابھی تک خبر نہیں تھی مئے طرب کا خمار کیا ہے؟

جو ساز میں تھرتھرا رہی ہیں وہ درد کی لرزشیں کہاں ہیں؟
جو روح میں جگمگا رہا ہے وہ شعلۂ بیقرار کیا ہے؟

اسی غمِ ناتمام سے ہے فروغِ کاشانۂ محبت
بنائی جاتی ہے آنسوؤں سے شرابِ میخانۂ محبت

عابد

حال وقال

ادبی دنیا کے ناظرین جو اسے قوم وملک کے لئے ایک مفید اضافہ تصور فرماتے ہیں یہ سُنکر مسرور ہونگے کہ ان کے رسالے کا یہ دسواں نمبر پانچ ہزار ایکسو چھپ رہا ہے - ادبی دنیا جیسے شاندار اور بلند پایہ رسالے کے لئے یہ تعداد اشاعت کچھ زیادہ نہیں کہی جاسکتی - مگر نو ماہ کی قلیل مدت اور علمی وادبی رسائل سے دلچسپی لینے والے ملک کے محدود طبقے کو مدنظر رکھتے ہوئے اخبارات ورسائل کی دنیا میں اس سے زیادہ ہمت افزا کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی - اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ تعداد اشاعت نہ صرف اردو کے تمام ماہوار اور ہفتہ وار پرچوں بلکہ اکثر روزناموں سے بھی زیادہ ہے -

ادبی دنیا جیسے رسالے کا اجراء اردو ادب کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا - اب صرف نو ماہ کے اندر اس کی اشاعت پانچہزار سے زیادہ ہوجانا بھی اردو رسالوں کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے - فروری نمبر کی تیاری میں تقریباً ڈھائی ہزار پونڈ (۳۱ من سے بھی زائد) کاغذ صرف ہوا ہے - اور اردو دنیا میں کسی رسالے کے ایک نمبر کی اتنی گرانباری بھی اپنی قسم کی پہلی مثال ہے - پھر یہ بھی اپنے قسم کی پہلی ہی نظیر ہے کہ ہم اپنے ایجنٹوں کے مطالبات کبھی پورا نہیں کرسکے اور سو پرچے مانگنے والوں کو پچیس پرچے بھیجتے ہیں -

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ دو تین ماہ کے بعد ادبی دنیا آٹھ نو ہزار چھپا کریگا - اہل نظر حضرات نے یہ تو پہلے ہی کہدیا تھا کہ ادبی دنیا جیسا شاندار اور گرانقدر رسالہ اتنک کسی زبان میں شائع نہیں ہوا مگر اب عنقریب اردو کے دامن سے یہ بدنما داغ بھی دور ہوجائیگا - کہ اردو رسائل کی محدود اشاعت دوسری زبانوں کے اخبارات ورسائل کا مقابلہ نہیں کرسکتی -

---

ہم نے کسی گزشتہ نمبر میں اعلان کیا تھا کہ دفتر ایسے مضامین کا معاوضہ دینے سے قاصر ہے جن کو ادبی دنیا کے معیار کے مطابق بنانے میں ادارے کا اتنا وقت صرف ہوجاتا ہے جتنے میں ان سے اچھا مضمون لکھ لیا جاسکتا ہے - اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے - کہ آئندہ ادبی دنیا میں جتنے مضامین شائع ہونگے - ہر ایک کا معاوضہ دیا جائیگا - مگر شائع صرف ایسے مضامین کئے جائینگے جو ادبی دنیا کے معیار کے مطابق ہوں اور ان کی اصلاح اور قطع وبرید میں ادارے کو اپنا وقت ضائع نہ کرنا پڑے -

---

ادبی دنیا کے ابتدائی نمبروں میں کئی پرائیویٹ فرموں کے اشتہارات شائع ہوتے رہے ہیں - مگر بعض مشتہرین کی بدمعاملگی اور اشتہاری فریب کے تلخ تجربے نے دفتر کو اس اصول پر پابندی کے ساتھ عمل کرنے پر مجبور کردیا ہے - کہ کسی پرائیویٹ فرم کا اشتہار پیشگی اجرت وصول ہوئے بغیر نہیں شائع ہوسکتا - کوئی ایسا اشتہار ادبی دنیا میں نہیں جاسکتا جس کے صحیح ہونے کے متعلق ہمیں شبہ اور خریداروں کے فریب میں پھنس جانے کا امکان ہو - علاوہ بریں کوئی ایسا اشتہار بھی شائع نہیں ہوسکتا جو شرمناک بیماریوں سے تعلق رکھتا ہو یا جس کی عبارت غیر مہذبانہ اور عریاں ہو -

---

ملک میں مختلف زبانوں میں بیسیوں روزنامے شائع ہوتے ہیں - سیاسی - مذہبی - قومی - حتیٰ کہ تجارتی اور صنعتی جماعتوں اور پارٹیوں کو کسی نہ کسی روزانہ اخبار کی طاقت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ پارٹی اپنے حقوق کی حفاظت کرتی ہے - اور مقابل قوت سے اپنے مطالبات تسلیم کراتی ہے - مگر بدقسمتی سے ملک کی تعلیمی خدمت کرنیوالی جماعت کی ترجمانی کرنے والا ہندوستان بھر میں کسی زبان میں کوئی روزنامہ نہیں تھا جو انکی آواز قوم اور حکومت تک پہنچا کر ان کے جائز مطالبات تسلیم کرائے - ان کے حقوق کی حفاظت کرے اور خود انہیں ملک وقوم کیلئے زیادہ مفید بننے کے طریقے بتائے -

ادبی دنیا کے دفتر سے ایک ہفتہ وار اخبار (اتحاد) بھی شائع ہوتا تھا - اب یکم فروری ۱۹۳۰ء سے اسے روزانہ کردیا گیا ہے - جو مذکورہ بالا مقاصد کے لحاظ سے ہندوستان کا واحد تعلیمی روزنامہ ہے تعلیمی نمائندگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اسکی پالیسی میں داخل ہے کہ ملک کے مختلف فرقوں میں عموماً اور مدرسین اور طلبہ میں خصوصاً محسوس اور م

م غیر محسوس طریقے پر اتحاد اور ملاپ کا پرچار کیا جائے - تاکہ آئندہ ملک میں تعلیم یافتہ طبقے کی ایک ایسی جماعت تیار ہوسکے جس کا دماغ فرقہ دارانہ تعصبات سے بلند ہو ...

آئینۂ عالم

پنجاب یونیورسٹی اور ہندوستانی زبان

یہ حقیقت اب عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم ناقص اور ادھوری رہجاتی ہے۔ اور اسی حقیقت کے احساس نے ہندوستانی یونیورسٹیوں کو اپنا رویہ بدلنے اور تدریج ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر ہندوستانی زبان کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کا غیر ہمدردانہ رویہ بتا رہا ہے کہ اس یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے نزدیک یہ روشن حقیقت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں دیسی زبانیں ایم۔اے تک باریاب ہو چکی ہیں مگر پنجاب یونیورسٹی نے دو تین سال سے بڑی دریا دلی سے کام لیکر بی۔اے تک دیسی زبانوں کے داخلے کی اجازت دی ہے۔ لیکن اپنی اس انتہائی فراخدلی کی تلافی اور غالباً اس کو بے اثر بنانے کے لئے تعلیمی حیثیت سے ان کی وقعت اس طرح کم کر دی ہے کہ اب پہلے کی طرح دیسی زبانوں کے نمبر طلبہ کو ڈویژن حاصل کرنے میں مدد نہیں دیتے۔ اور اب امیدوار دیسی زبان کے نمبر ملا کر چاہے فرسٹ ڈویژن ہی میں کیوں نہ آتا ہو مگر یونیورسٹی کی نگاہ میں اس کی یہ قابلیت کوئی وقعت نہیں رکھتی اور ڈویژن تقسیم کرتے وقت اس سے قطع نظر کر لیجاتی ہے۔ گویا دیسی زبان میں مہارت حاصل کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ یونیورسٹی کے اس انوکھے اور دیسی زبان کو حقیر قرار دینے والے قانون کے اجرا سے پہلے طلبہ فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی خاطر دیسی زبان پر زیادہ نہیں تو کم سے کم دوسرے مضامین کے برابر توجہ صرف کیا کرتے تھے۔ مگر اس قانون نے انہیں اس سے بے نیاز کر دیا ہے اور اب ان میں دیسی زبان کی طرف سے غفلت سی آتی جا رہی ہے۔ اور پنجاب میں دیسی زبان ترقی کرنے کے بجائے تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ جو نہ صرف زبان بلکہ ملکی معاشرت اور قومی خصوصیات کے لئے بھی خطرناک ہے۔

مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ مشرقی زبانوں کی حمایت کی آڑ میں کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ صحیح طریق کار یہ تھا کہ دیسی زبانوں کی اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے مشرقی زبانوں کے لئے ترغیبی وظائف مقرر کر دئے جاتے اور عربی فارسی یا سنسکرت کی خاطر طلبہ کو دیسی زبانوں سے بے بہرہ رکھنے کی حکمت عملی اختیار نہ کی جاتی۔

یونیورسٹی کی اس حکمت عملی سے دیسی زبانوں کو بیحد نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور پنجاب سے ان کے فنا ہو جانے ورنہ کم سے کم ان کی ترقی رک جانے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے دیسی زبانوں کے بہی خواہوں اور بتدریج اسے ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی پالیسی کو بہتر سمجھنے والوں کا وقت کے لحاظ سے سب سے اہم فرض یہ ہے کہ دیسی زبانوں کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے اس غیر ہمدردانہ رویے کے خلاف منظم طریقے پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور پنجاب بھر میں احتجاجی جلسے منعقد کر کے یونیورسٹی کے اس ناقابل برداشت قانون کے خلاف قرارداد مرتب کر کے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بھیجیں۔ ورنہ اس کو گوارا کر لینے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم ہندوستان کے سب سے ترقی یافتہ صوبے میں اپنے ہاتھوں اپنی زبان کی قبر کھود رہے ہیں۔

فرانس کا ادبی انعام

فرانسیسی جرائد کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹ ردسمبر کو وہاں کے وزیر تعلیم کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا اور ۱۹۲۹ء کا ادبی انعام (دس ہزار فرانک) ایک مشرقی افسانہ لوکوماد جو غالباً لقمہ کا فرانسیسی تلفظ ہے) کی مصنفہ میڈم جلیمٹ میریر کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

فرانس کی سب سے قیمتی تصویر

امریکہ اور انگلستان والے آرٹ کی تصاویر پر بیدریغ روپیہ صرف کرنے میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں مگر فرانسیسی رسائل و اخبارات سے معلوم ہو رہا ہے کہ اب فرانس بھی اس میدان کا مرد بن رہا ہے اور پیرس میں ایک فرانسیسی تاجر نے ایک تصویر ایک لاکھ اسی ہزار فرانک کو خریدی ہے۔

رازِ حیات

شیکاگو یونیورسٹی نے دورِ حاضر کی علمی ترقی پر ایک کتاب شایع کی ہے جسے وہاں کے سولہ پروفیسروں نے ملکر تصنیف کیا ہے۔ کتاب میں ذیل کی عبارت پر پہنچکر انسانی ذہن رُک جاتا ہے:۔

"ہم نہایت صراحت سے یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اصلِ حیات (زندگی کی ابتدا) کا سوال، ایک ایسا سوال ہے جو ابتک حل نہیں ہوا۔ ابتک جو اچھا سے اچھا حل پیش کیا جاسکا ہے اُس کی حیثیت محض ابتدائی فرضیات کی ہے۔ اور زندگی کی ابتدائی حقیقت اس کے بعد بھی عقدۂ لاینحل ہے اور بے جان و جاندار اشیاء کے درمیان جو بُعد ہے وہ جوں کا توں موجود ہے"۔

فرمائیے اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے وقت برباد کرنا بہتر ہے یا مِنْ اَمْرِ رَبِّی تسلیم کرلینا۔

ہندسہ اور کیمیا

انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب علم ہندسہ کی ترقی اور اہل ہندسہ کی مہارت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے کلیں۔ انجن اور ریل گاڑی ایجاد کی۔ اور آجکل اجتماعی و معاشرتی انقلاب خواہ حکومت میں ہو یا قوم میں اسی صنعتی انقلاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ بالشوازم جس نے آجکل دنیا میں تہلکہ برپا کر رکھا ہے سر پھیرے انقلابیوں کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس نے کلوں اور کارخانوں میں جنم لیا ہے۔

لیکن قرائن سے معلوم ہو رہا ہے کہ بیسویں صدی کے انقلاب میں علم ہندسہ کی جگہ علم کیمیا لے لیگا۔ آجکل کیمیا اور زراعت کے درمیان جنگ ہو رہی ہے اور کیمیا کی فتح کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں عنقریب جب دنیا سے زراعت بالکل فنا ہو جائیگی یا برائے نام باقی رہجائیگی۔ تو اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں ایسے انقلابات رونما ہونگے جو انیسویں صدی کے انقلابات سے کسی طرح کم نہ ہونگے۔

کیمیا کی ابتدائی فتوحات یہ ہیں کہ آجکل ماہرین کیمیا ذیل کی اشیاء کو کیمیاوی طریقے پر بنانے لگے ہیں۔

۱۔ ریشم لکڑی اور مختلف درختوں کی چھال سے بنایا جارہا ہے۔ اور دنیا ریشم کے کیڑے پالنے سے اور کسی حد تک روئی کی زراعت سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔

۲۔ شکر جنگلی لکڑیوں کے بُرادے سے حاصل کی جارہی ہے اور گنے کی کاشت کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔

۳۔ ہر قسم کا رنگ کیمیاوی مواد سے سے تیار کیا جارہا ہے حتیٰ کہ نیل کی کاشت کا بالکل خاتمہ ہوچکا ہے۔

۴۔ ربڑ بھی کیمیاوی مواد سے بنائی جانے لگی ہے اور اس کی کاشت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔

یہ بالکل ابتدائی نتائج ہیں۔ سو سال کے بعد ۲۰۳۰ء اور اسکے انتہائی نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے ۱۹۳۰ء اور اس وقت کی کلوں اور آلات سنجاریہ اور ان کے نتائج پر نظر کرلینا کافی ہے۔

متحرک اعضا کی تصویر

ایکس رے کے ذریعے سے ابتک عموماً صرف ساکن اعضا اور ہڈیوں کی تصویر لیجاتی تھی لیکن اب دو جرمن ڈاکٹروں نے ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے انسان کے متحرک اعضا مثلاً معدہ کے فعل بعد دل کی حرکت وغیرہ کی تصاویر لیجاسکینگی۔

گرمیٔ عشق کی پیمائش

ایجادات و انکشافات کی دنیا یورپ کے ایک ڈاکٹر نے دستی گھڑی کی شکل کا ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس سے عشق و محبت کی حرارت کا اندازہ کیا جاسکیگا۔ اور "مغرب کی لنواریاں" دل پھینک نوجوانوں کی "ہوس" اور "عشق" میں امتیاز کرسکینگی۔ جس طرح تھرمامیٹر سے حرارت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس آلے سے محبت کی گرمی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اور عشاق کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت اور اصلیت آئینہ ہوجاتی ہے۔

ایک عجیب و غریب گھڑی

سیر یڈا رکیٹا ٹونیا کے ایک نوجوان نے ایک ایسی گھڑی چلو کی ہے جو بغیر کوک کے ہوئے ہمیشہ چلتی رہیگی۔ یہ گھڑی سکنڈ۔ منٹ۔ گھنٹے کے علاوہ دن۔ ہفتہ۔ مہینہ۔ سال اور طلوع و غروب آفتاب کی کیفیت بھی بتائیگی۔ اس گھڑی میں تقریباً آدھ میٹر سے استعمال کئے گئے ہیں۔ اور اس کی تیاری میں گیارہ سو گھنٹے صرف ہوئے ہیں اس لئے گھڑی سے زیادہ اس کے بنانے والے کی ہمت اور استقلال قابلِ داد ہے۔

تاجور

خود نوشتہ سوانح عمری

ڈاکٹر جانسن کا مقولہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص خود اپنی سوانح حیات قلمبند کرے۔ تو یہ کام بدرجہ احسن تکمیل تک پہنچیگا۔ کیا صاحب موصوف کا خیال درست تھا؛ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کے تمام حالات سے مکمل واقفیت ہوتی ہے۔ اور سوانح عمری کی تکمیل کے لئے بس یہ کافی ہے۔ کہ وہ تمام واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دے۔ خاص طور پر جب سوانح و کوائف کو تحلیل نفسی کے طریقے پر رقم کیا جانا مقصود ہو۔ اس وقت تو وہی شخص جذبات و احساسات کی تشریح کر سکتا ہے۔ جو ان سے متاثر ہؤا ہو۔ سوائے اس شخص کے جو خاص ان کیفیات سے متاثر ہؤا ہو۔ کون ہے۔ جو خاص خاص اعمال و افعال کے محرکات اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کے انقلابات کو بیان کر سکتا ہے۔

لیکن غور کرنے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا خیال کلیتاً درست نہیں۔ بہت سے اسباب ایسے ہیں۔ جن کی وجہ سے خود نوشتہ سوانحعمریاں اکثر جھوٹ اور غلطیوں سے لبریز ہوتی ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے۔ کہ ہمارا حافظہ ہمیں دھوکا دیتا ہے۔ اور ہم اکثر بعض اہم باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ جب ہم اپنے سوانح رقم کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنی زندگی کے اکثر واقعات کو کلیتاً فراموش کر چکے ہیں۔ ہم میں سے اکثر اصحاب کے لئے بچپن کا زمانہ ایک بھولے ہوئے خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں تو کہہ سکتا ہوں۔ کہ سات سال کی عمر تک کے مجھے بہت کم واقعات یاد ہیں۔ اور وہ بھی اس قسم کے جس طرح تصاویر کے گرد سیاہ پردے لپیٹ دیئے جائیں۔ شاید یہ بات مجھ سے خاص ہے۔ کیونکہ بعض اہل قلم اپنے بچپن کے تمام واقعات کو یاد کر سکتے ہیں۔ اور سات سال سے پہلے کی عمر کے بھی واقعات ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ٹالسٹائی مشہور روسی مصنف کے ذہن میں اپنے بچپن کے چھ ماہ کی عمر کے بھی کئی ایک واقعات محفوظ تھے۔

گوئٹے کو بخوبی یاد تھا۔ کہ وہ بچپن میں فرینک فورٹ کے دیواروں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ یہ ایک نہایت عجیب بات ہے۔ گوئٹے کی طبیعت میں جو خواہش موجود تھی۔ کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کرے۔ اس کے ذہن پر فرینک فورٹ کے باغات نے جو اثر کیا ہے۔ وہ اتنا پختہ کار ہے۔ کہ شاید تجربہ کار ادیب بھی ان باغات کا اس وقت نظر سے مطالعہ نہ کرے۔

بہت سے سوانح حیات پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچپن کے صرف وہی واقعات یاد رہتے ہیں۔ جن کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ اور جنہوں نے ہمارے نظام عصبی کو بری طرح متاثر کیا ہو۔

یہی وجہ ہے۔ کہ جن لوگوں کا بچپن لڑائی یا انقلاب کے ایام میں گذرا ہے۔ ان کے ذہن میں دیگر اشخاص کی نسبت زیادہ واقعات و تاثرات محفوظ ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ ان واقعات کی یاد بھی ان کہانیوں اور افسانوں پر مبنی ہوتی ہے۔ جو ہمارے بوڑھے رشتہ دار ہمیں بچپن کے دنوں کے متعلق سنایا کرتے ہیں۔ الغرض ہمارے بچپن کے حالات کچھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ کہ ہم جذبات اور واقعات میں تمیز نہیں کر سکتے۔ الفاظ کا ذخیرہ ہم نے کس طرح جمع کیا؛ ہم اپنے بچپن کے دوستوں سے پہلے پہل کس طرح آشنا ہوئے؛ لوگوں سے ہمارا اور لوگوں کا ہم سے کس طرح کا برتاؤ ہوتا تھا؛ ایسی باتیں ہیں۔ جن کے متعلق اکثر ہمیں کچھ یاد نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی خود نوشتہ سوانح عمری حقیقت میں تمام تر صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ چاہے مصنف نے قصداً جھوٹ کہیں بھی نہ بولا ہو۔

باقی دیگر کیفیات کے علاوہ۔ ہم اپنے خوابوں کو خصوصیت سے بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ جاگنے کے کچھ منٹ بعد ہی ہمیں احساس ہوتا ہے۔ کہ خواب کا ایک حصہ ہمارے ذہن سے بالکل نکل گیا ہے۔ عام طور پر یہ سوانحعمریاں صداقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ یعنی خوابوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ حالانکہ خوابوں کو ہمارے دل و دماغ کی مختلف نفسانی کیفیات سے گہرا تعلق ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ خود نوشتہ سوانحعمری میں ان جذبات اور احساسات کا بھی کوئی بیان نہیں پایا جاتا۔ جن سے ہم ہر روز ہر لمحہ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو حقیر اور غیر اہم خیال کر کے رقم کرنا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ ان حقیر چیزوں کو ہمارے کردار کے ارتقا اور ہماری زندگی کے کئی پہلوؤں میں بہت بڑا دخل ہے۔ ایک مصنف نے ایک ۸۰ صفحہ کا مقالہ لکھا ہے جس میں اس نے ایک

شخص کے ایک دن کے واقعات و احساسات کی مکمل تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود اس ضخامت کے، وہ اس دن کے احساسات کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکا۔ دوسری چیز جو خود نوشتہ سوانحِ عمری میں جھوٹ کی آمیزش کرتی ہے۔ وہ ارادتاً بعض واقعات کا حذف کر دینا ہے۔ ہم اکثر ان واقعات کو حذف کر دیتے ہیں۔ جو کتاب کی صنعتی لطافت میں خارج ہوں۔ اور جن سے قارئین کے ذوقِ سلیم کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو۔ ہر ایک مصنف یہ چاہتا ہے۔ کہ اپنی زندگی کو صنعت کے ایک شاہکار کی صورت میں پیش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کو مدِنظر رکھ کر اکثر واقعات کا حذف ضروری خیال کرنا ہوگا۔ تاکہ نہ تو کلام ہی میں طوالت کا اندیشہ ہو۔ اور نہ کتاب کی صنعتی لطافت کو کوئی صدمہ پہنچے۔ مسٹر سپنسر کا خیال ہے۔ کہ سوانح نگار عام طور پر ان تمام واقعات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جن کی نوعیت ضربیات کی سی ہو۔ اور صرف ان واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ جن کو ضروری اہم اور دلچسپ تصور کرتے ہیں۔ زندگی کے فرسودہ مسلسل اور ہم آہنگ واقعات کا تذکرہ مناسب نہیں تصور کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقِ عمل بہت ہی موزوں ہے۔ کیونکہ دوسری صورتوں میں کتابیں اس قدر ضخیم ہو جاتیں۔ کہ ان کا سمجھنا اور ان پر غور کرنا تو کجا ان کا پڑھنا بھی دشوار ہوگا۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کی خصوصیات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ جن کی وجہ سے اُسے عوام الناس پر تفوق یا ان سے امتیاز حاصل ہے۔ یہ عیب واقعتاً ناگزیر ہے" سپنسر کی یہ رائے حروفِ زریں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اور ہمارے خیال کی تائید کرتی ہے۔ جب ہم کسی شخص کے سوانح حیات پڑھتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ کہ اس کی زندگی نسبتاً عجیب و غریب واقعات سے تھی۔ اور ہم تصور کرتے ہیں۔ کہ وہ حقیقت میں ایک غیر معمولی شخص ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہیرو کوئی غیر معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ کیونکہ معمولی آدمیوں کے سوانح حیات لکھنے کی کوئی مصنف تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ مگر جن واقعات کو ہم متحیر کن اور عجیب و نادر تصور کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے بہت ہی تھوڑے حصے میں تمام کے تمام پیش آ چکے ہوتے ہیں۔ اور اس کی باقی ماندہ زندگی ہماری زندگی کی طرح دنیا کے معمولی۔ فرسودہ۔ واقعات و کوائف سے پر ہوتی ہے۔

خود نوشتہ سوانح عمری کے اکثر جھوٹ سے لبریز ہونے کی تیسری وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ مصنف ارادتاً ان واقعات کو حذف کر دیتا ہے۔ جن کا بیان آپ کے رنج کا باعث ہو۔ ہم صرف انہیں واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جن کے تاثرات شگفتہ ہوتے ہیں۔ جو واقعہ ہمارے لئے پریشان کن اور دردناک ثابت ہوتا ہے۔ ہم اُسے بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کا ذکر کر کے اپنے رنج کو تازہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں ہم کبھی ایسے واقعات کا تذکرہ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ جن کا اظہار کسی طرح ہماری تذلیل و توہین یا رسوائی کا باعث ہو۔ دنیا میں بہت کم ایسے شخص ہیں جو بلا تکلیف اپنے معاصرین کی آرا سے بے نیاز ہو کر ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ کر دیں۔ جو اس کے لئے باعثِ شرم ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ روسو نے بعض جگہ اپنی زندگی کے کوائف و احساسات بیان کرنے میں بہت بے باکی سے کام لیا ہے۔ لیکن وہ انشائی صورتوں میں آ جاتا ہے۔

پھر بعض اوقات ہماری قوتِ متخیلہ واقعات کے حرکات تخلیق کرتی ہے۔ ہم ایک کام غیر شعوری طور پر بغیر کسی یقین [illegible] کے کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں ہمارا تخیل خود فریبی اور خود تاثری کی غرض سے اس کام کے لئے شریفانہ حرکات۔ اور لطیف مقاصد پیدا کرتا ہے۔ تاکہ ہم خود اپنی نظر میں عزت حاصل کر لیں۔ بعض اوقات کوئی واقعہ محض اتفاقی امور کی بنا پر ظہور میں آتا ہے۔ اور ہم اس کے اسباب و علل کی تلاش کر کے اس واقعے کو فرضی اسباب و علل کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے اور کئی پہلو ہیں۔ جن کی وجہ سے خود نوشتہ سوانحِ عمری میں اکثر جھوٹ کی آمیزش ناگزیر ہوتی ہے۔

اچھا تو آئیے۔ ذرا روسو کے "اعترافات" کا مطالعہ کریں۔ یہ مطالعہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی پیروی میں اکثر اربابِ قلم نے اپنی اپنی خود نوشتہ سوانحِ عمریاں قلمبند کی ہیں۔ خود روسو اپنے دیباچے میں رقمطراز ہے۔

"میں ایک ایسے کام کی ابتدا کر رہا ہوں جس کی نہ تو پہلے کوئی مثال ہے اور نہ آئندہ اس کی پیروی کی جائیگی۔"

جہاں تک روسو کا تعلق ہے۔ ہمارے پاس اس بات کی شہادت موجود ہے۔ کہ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کے تمام کوائف و سوانح نتائج سے بے نیاز ہو کر سپردِ قلم کرے۔ روسو کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض واقعات کا ذکر اس نے خطوط میں کیا ہے۔ اور "اعترافات" میں حذف کر دیا ہے۔ اور بعض واقعات کو [illegible] شدہ صورت میں پیش کیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایک ایسا شخص جس کی دلی آرزو تھی۔ کہ وہ ایک سچی سوانحِ عمری لکھے۔ عیوب و نقائص سے محفوظ نہ رہ سکا۔ تو عام مصنف جن کا نصب العین اس قدر بلند نہیں ہوتا۔ اس عیب سے کس طرح بچ سکتے ہیں؟

مسافر

انتہائی کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ ممکن ہے کہ شور میری بے خوابی کا باعث رہا ہو۔ بہرحال یہ درست ہے۔ کہ جہاز کا ہر ایک حصہ کراہ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا۔ میرے ساتھ کے کمرے میں کوئی شخص ڈک کے تختے اکھیڑنے کی مشق میں مصروف تھا۔ گویا ایک شیطان میرے سر پہ آرہ چلا رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ جہاز کی مسلسل حرکت بھی خواب آور نہ تھی۔ ماسوائے اس مقناطیسی طاقت کے جو انسان کے ارادے میں موجود ہوتی ہے۔ مجھے اپنے بستر پہ لیٹے رہنے میں کوئی چیز مدد نہ دے سکتی تھی۔ اگر میں اپنی قوت ارادی کا استعمال ایک لمحے کے لئے بھی ترک کر دیتا۔ تو یقیناً زمین پہ جا رہتا۔

اسی اثنا میں میرے برتھ کے نیچے سے میرا ٹرنک لڑھک کر باہر آ گرا۔ میں نے بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ تاکہ اس کی حرکات کا مشاہدہ کر سکوں میرا ٹرنک باوقار۔ اور متین انداز سے کمرے سے باہر نکلنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ جہاز کو خیرباد کہنا چاہتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ اس معاملے میں مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی۔ کہ ابھی ٹرنک دروازے تک بھی نہ پہنچا تھا۔ کہ میرا سوٹ کیس بھی باہر آیا۔ اور ٹرنک سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے بتی بجھا دی۔ اور ان دونوں کو اندھیرے میں اپنے اختلافات طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تو ایسا محسوس ہوتا رہا۔ گویا مباحثہ بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنی جگہ سے انچ برابر بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد نسبتاً خاموشی ہو گئی۔

مجھے خیال آیا کہ گذشتہ شام کو کسی پاس آشنا صاحب نظر نے کہا تھا۔ کہ ہمارا جہاز مناسب بوجھ سے زیادہ گرانبار ہے۔ اور اگر طوفان آیا۔ تو یقیناً دو ٹکڑے ہو جائیگا۔ اس کے بعد ایسا خیال گزرا۔ کہ میں کسی حبشی سے شطرنج کھیل رہا ہوں۔ جو بار بار کہتا تھا۔ جب میں کالے مہروں کی چال چلتا ہوں۔ تو میرا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور سفید مہروں سے کھیلتا ہوں۔ تو گورا ہو جاتا ہوں۔"

ابھی میں کھیل ہی رہا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ کہ "نہانے کے لئے پانی تیار ہے"۔

آخری بات سچ ثابت ہوئی۔ کیونکہ حبشی والا کھیل تو خواب نکلا۔ میں نہانے کیلئے گیا۔ تو پانی مجھے آغوش میں لینے کے لئے بیتاب نظر آتا تھا۔ آخرکار وہ اپنی بے تابی اور اضطرابی سے مجبور ہو کر میرے گلے سے آ ہی لگا۔ اس کے بعد جب پانی اور میں آپس میں خوب لڑ جھگڑ لئے۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ سٹیورڈ (جہاز کا خادم) میری چائے لئے ہوئے عرشہ جہاز اور اپنے جسم کے درمیان ۲۰ درجے کا زاویہ بناتا ہوا سیدھا چلا آ رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں کمرۂ طعام میں چلا گیا۔ بہت کم لوگوں (رات کے خوابہائے پریشاں کے بعد) نے آنے کی تکلیف گوارا کی تھی۔ مگر بیگم نرجس موجود تھیں۔

بیگم نرجس حسن اور لطافت کی دیوی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر کچھ افسردگی کے سے آثار نظر آتے تھے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد بیگم بولی۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ کو فرصت ہے نا؟ اچھا تو کھانے کے بعد اوپر عرشہ پر تشریف لائیے گا"۔

بیگم نرجس جہاز کے سفر کی عادی تھی۔ اور اس سے پیشتر کئی بار چھوٹے چھوٹے معاملات میں مجھ سے مشورہ لیتی رہتی تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ اس دفعہ بھی وہ کسی معمولی بات کے متعلق مجھ سے مشورہ لے گی۔ کھانے کے بعد میں اوپر کے عرشے پر گیا۔ تو وہ ایک کرسی پر قیمتی سمور اور قاقم کے درمیان لپٹی ہوئی بیٹھی ہوئی تھی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس پر سمندر کے سفر کا کوئی اثر نہیں۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ وہ تمام رات نہیں سوئی۔ میں نے اسے رات کے خواب سنائے۔ اگر کوئی اور دن ہوتا۔ تو یقیناً وہ مسکرا دیتی۔ کیونکہ اس کے لب تبسم ہی کے لئے بنائے گئے تھے۔ مگر آج وہ خلاف معمول افسردہ رہی اور لہروں پر نظر گاڑے ہوئے میری باتیں سنتی رہی گویا۔ الفاظ تو سُن رہی ہے۔ مگر معانی سے بالکل ناواقف ہے۔

بیگم نرجس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کا حسن خوشنما تراکیب اور مرصع الفاظ سے بالا تھا۔ شاعر کے خواب اس قدر شیریں و دل آویز نہیں ہو سکتے۔ فردوس کا تصور اتنا رنگیں نہیں کہلا سکتا۔ اس کا چہرہ آنکھوں کے ساتھ دل کو بھی جذب کر لیتا تھا۔ اور پھر یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا دل میں ان گھنگریالے بالوں کی گرہوں میں کھویا گیا ہے۔ جو اس کی پیشانی کو چومنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ کہ ایک ہندوستانی عورت اس قدر مہذب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قدر ہنس مکھ۔ اس قدر خوبصورت کیونکر ہو سکتی ہے۔ کئی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ شاید کسی اور ملک کی رہنے والی ہے۔ مگر اس کی گفتگو۔ صاف اور شستہ اردو بولنے کا انداز۔ آواز اور لہجہ تمام چیزیں اس خیال کی تکذیب کرتی تھیں۔

جہاز کے مسافروں کے لئے اس کی ذات ایک معمے سے کم نہ تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے۔ کہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔ اور کہاں جا رہی ہے۔

میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہوا میں نسبتاً سکون پیدا ہو گیا ہے۔ اُمید ہے آج رات چین سے گذرے گی۔ آپ کچھ افسردہ نظر آتی ہیں۔ کیا بات ہے؟"

اس نے یاس سے لبریز آواز میں جواب دیا۔ "میرا خیال ہے۔ کہ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ آپ نے اکثر اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں میں مجھے اپنے مشورے سے فائدہ پہنچایا ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش میں اس جہاز کی کپتان ہوتی۔

"تو آپ کیا کرتیں"

"میں جہاز کا رُخ واپس انگلستان کی طرف موڑ دیتی"

"ناممکن ہے۔ جہاز کے ذخائر میں اتنا کوئلہ ہی موجود نہیں ہے۔ بہرنوع اس حیرت انگیز خواہش کی وجہ تو ارشاد فرمائیں۔

نرجس نے غور سے اپنے نازک صاف ہاتھ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ آخر بولی۔ "بات یہ ہے کہ میں ڈر گئی ہوں"۔

میں نے حیرانی سے بیگم کی طرف دیکھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی بہت خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔

"میں نے کہا" بیگم نرجس۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ لیکن یہ تو صد درجہ کا احمق پن معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جہاز بہت بوجھل ہے۔ اور ڈولتا بھی زیادہ ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ اس قسم کی باتوں سے مجھے خوف نہیں آتا۔ بات اور ہی ہے۔ اور جب میں آپ کو افسانہ سنا چکوں گی۔ تو آپ سمجھیں گے کہ شاید میرے دماغ میں فتور واقع ہو گیا ہے۔

میں نے کہا "میں ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا"

اچھا۔ میں نے آپ کو بتلایا تھا۔ کہ میں بیوہ ہوں۔ لیکن میں نے آپ کو اس بات کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کہ میرے خاوند ڈاکٹر وحید صرف تین ماہ ہوئے۔ لندن میں فوت ہو گئے۔ نہ میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کرنا مناسب خیال کیا تھا کہ میں ہندوستان ایک اور شخص سے شادی کرنے کے ارادے سے جا رہی ہوں"

"خوب۔ آگے چلئے"

"میرے خاوند کو مرے ہوئے تین ماہ ہو گئے۔ لیکن کل میں نے اُسے جہاز پر دیکھا ہے"

بیگم نے یہ متحیر کن فقرہ انتہائے سکون و دلجمعی سے کہا۔ گویا اس میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ناممکن ہے۔ کہ دن کے نو بجے جب سورج چمک رہا ہو۔ اور دھوپ تمام چیزوں کو اپنی روشنی میں رنگ کر درخشاں کر رہی ہو۔ آپ بھوتوں یا روحوں کے افسانے سُنا کر کسی کو بہت جلد متاثر کر سکیں۔ میں تو یہ سوچنے لگ گیا۔ کہ آخر اس کے ذہن میں اس قسم کا خیال آیا کیسے؟

آخر کار میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ ناممکن ہے"

"ہاں۔ کل تک میرا بھی یہی خیال تھا"

اور کل بھی آپ کا یہی خیال ہوگا۔ آپ فرمائیں کہ آپ نے کیا دیکھا ہے۔ میں آپ کو قائل کر دوں گا۔ کہ بھوت اور روح کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کل رات کو گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے کمرے کے پاس پہنچی۔ تو دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے بجلی کا لیمپ جلا دیا۔ اس وقت میرا خاوند میرے برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ روشنی اس کے سر کے ان حصوں پر چمک رہی تھی۔ جو بالوں سے خالی تھے۔ اس نے کھلے آسمانی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور پاؤں میں سرخ رنگ کے سلیپر تھے۔ جو وہ ہمیشہ پہنا کرتا تھا۔ اس کے کوٹ کی جیب کسی شے سے بوجھل معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ اس کا سر آہستہ آہستہ مڑ رہا تھا۔ اس طرح گویا وہ بہت کوشش سے کام لے رہا ہے۔ اب تک میرے دل میں قطعاً خوف پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنا چہرہ پوری طرح میری طرف پھرا لیا۔ تو میں ڈر گئی۔ بہت ڈر گئی وہ میرا خاوند تھا۔ اور جیسے نہیں بھی تھا"

"یہ کس طرح"

"کم از کم اس کا چہرہ تو بالکل میرے خاوند کا سا تھا۔ داڑھی مونچھیں منڈی ہوئیں۔ ماتھے پر جھریاں (وہ مجھ سے ۲۰ سال عمر میں بڑا تھا) گنجان بھویں۔ اور بہت ہی چھوٹا سا منہ۔ دراصل اس کا منہ غیر فطری طور پر چھوٹا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص آپ کی طرف

دیکھے۔ تو فطرتاً آپ کو یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ اس کی آنکھیں آپ ہی کی طرف ہیں۔ لیکن اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ عین اسی طرح جس طرح موت کے بعد اس کی آنکھیں ہو گئی تھیں۔ اور پھر اس طرح معلوم ہوتا تھا۔ گویا خود میرا خاوند موجود نہیں۔ بلکہ اس کی جگہ موم کا بُت بنا کے اُس پر نقش و نگار کر دیئے گئے ہیں۔

میں نے خوف سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تاہم میں یہ کہنے کے بغیر نہ رہ سکی "تم کیوں آئے ہو؟" اس کے لبوں کو خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور اس کے بعد اس کی آواز نکلی۔ اس طرح جس طرح کوئی بچہ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہے۔ جھکی ہوئی۔ لرزتی ہوئی۔ درد و کرب سے لرزتی ہوئی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں" اس کے بعد خادمہ آ گئی۔ اور اس کی شکل غائب ہو گئی۔

"آپ نے خادمہ کو اس واقع کی اطلاع دی؟"

"نہیں۔ اس وقت میرا ارادہ تھا۔ کہ میں اس واقع کی اطلاع کسی کو بھی نہ دوں۔ میں نے خادمہ پر یہ ظاہر کیا۔ کہ میں جہاز کی حرکت سے ڈر گئی ہوں۔ اور کافی عرصہ میں نے اُسے باتوں میں لگائے رکھا۔ خادمہ چاہتی تھی۔ کہ ڈاکٹر کے ہاں سے کوئی خواب آور دوا لے آئے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا"

"کیوں؟"

"مجھے نیند سے خوف آنے لگا تھا۔ میں ڈرتی تھی۔ کہ اگر میں نے خواب میں اُسے دیکھا۔ تو شاید مر جاؤنگی۔ میں چاہتی تھی۔ کہ میں اس کے لئے تیار رہوں۔ میں جانتی ہوں۔ کہ وہ کیوں میرے سامنے ظاہر ہوا ہے؟"

"آپ نہیں جانتیں بیگم! کہ وہ کیوں آیا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں۔ کہ کیا ہوا ہے؟ اس واقعے کی وجہ بالکل صاف سہل اور سادہ ہے"

"وہ کیا"

"آپ کے واہمے کا باعث محض سمندری سفر کی تکلیف تھی"

"لیکن مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی"

درست ہے۔ اگر آپ سمندر کے سفر کی تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتیں۔ جس طرح باقی مسافر کر رہے ہیں۔ تو آپ کو یہ شکل بھی کبھی دکھائی نہ دیتی۔ اس سفر میں دماغ اور معدہ ایک دوسرے پر عمل ردعمل کرتے رہتے ہیں۔ جہاز کی نقل و حرکت بھی بینائی کی قوت کو بہت نقصان پہنچاتی ہے بعض صورتوں میں دماغ خاص طور پر متاثر ہو جاتا ہے اور نتیجہ آور واہمے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس واقعے کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اور سمندر کے سفر کی تکالیف کے اثرات محض میری تخلیقی قوت کے اختراعی نتائج تھے۔ بیگم نرجس کو خوف مارے ڈالتا تھا۔ اور میرا فرض تھا۔ کہ میں کوئی نہ کوئی تدبیر سوچوں۔

"اگر میں یہ سمجھ سکوں۔ تو مجھے کس قدر اطمینان ہو جائیگا"

"آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ کم از کم حقیقت یہی ہے"

اس کے بعد میں نے اُسے اس طرح کے کئی فرضی واقعات سنا کر اس کی تشفی کرنے کی کوشش کی۔

آخر کار اس نے کہا۔ "کاش مجھے یہ واقعات پہلے معلوم ہوتے۔ مجھے خوف سے زیادہ اور کوئی چیز ہیبت ناک نہیں معلوم ہوتی۔ کل جس وقت میں بجلی جلا کر اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ واقعی خوف انسان کو فاتر العقل بنا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے خوف آنے کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ اور وہ وجہ یہ تھی۔ کہ میرا خاوند بہت تنگی مزاج تھا۔ اور دراصل اس کے شکوک و شبہات ایک حد تک درست بھی تھے"

بیگم نرجس نے مجھے اپنی زندگی کے واقعات سنانا شروع کئے۔

"میں ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور میرے والد مشہور تاجر تھے۔ دولت دنیا سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے تعلیمیافتہ بھی تھے۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت خالص مغربی انداز سے کی۔ جب میں ۱۸ سال کی ہوئی۔ تو اُن کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ اس وقت زندہ تھیں۔ انہوں نے کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نقصان پر نقصان ہوتا گیا۔ اور آخر کار مجھے اپنے خاندان کی عزت بچانے کی خاطر ڈاکٹر ظہیر الدین سے شادی کرنی پڑی۔ کہ وہ ہمارے سب سے بڑے قرض خواہ تھے۔ ہماری شادی جیسا کہ ظاہر ہے محض ایک کاروباری اور اقتصادی نقطۂ نظر سے کی گئی تھی۔ اور اس میں محبت کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔

شادی سے پہلے میری منگنی ایک نوجوان صناع سے ہو چکی تھی۔ جو بنارس میں موسیقی کے پروفیسر تھے۔ شادی کے دوران میں بھی میں نے اُن سے خط و کتابت جاری رکھی۔ اتفاق سے میرے خاوند کو اس کا علم ہو گیا چنانچہ وہ مجھے ہندوستان سے انگلستان لے آئے۔ اور وہیں میں نے اپنی عمر کے ۵ سال گذارے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس

دوران میں بھی میں نے اپنے سابق منگیتر کو خط لکھنے سے گریز نہیں کیا۔ اور یہ ایک غیر شریفانہ حرکت تھی۔ مگر مجھے امید ہے۔ کہ خدا میرے اس گناہ کو میری محبت کی صداقت اور پاکیزگی کے صدقے معاف کر دیگا۔

ان تمام باتوں کا خیال کرتے ہوئے میں سمجھتی ہوں۔ کہ شاید میرا خاوند مجھے تنگ کرنے کے لئے اور مجھے شادی سے روکنے کے لئے آگیا ہو"۔

میں نے کہا "مطمئن رہئے۔ روحیں انسانوں کو تنگ کرنے کیلئے نہیں آتیں۔ مگر دماغ ضرور واہمہ کا موجب ہوتا ہے۔

(۲)

اس واقعہ کے بعد بیگم نرجس کی افسردگی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے جہاز کے ڈاکٹر کو تمام افسانہ سنایا۔ مگر انہوں نے کوئی واضح رائے دینے سے انکار کیا۔ میرا اپنا خیال تھا۔ کہ اب کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آئے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

دوسری شام کا واقعہ ہے۔ کہ مسٹر احمد حسین مجھے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ بمبئی میں انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ اور گپیں ہانکنے کے اس قدر عادی کہ بعض اوقات صبح سے شام تک باتیں ہی کرتے چلے جاتے تھے۔

جب ہم کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تو وہ بولے "آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔ کہ میں ایک بار جس شخص کا چہرہ دیکھ لوں۔ پھر مدت العمر اس کو فراموش نہیں کر سکتا۔ چہرے کے نقوش میرے حافظے پر اس طرح ثبت ہو جاتے ہیں۔ کہ میں ایک دفعہ دیکھنے کے بعد آدمی کو لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے کل ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے۔ جسے میں نے اس سے قبل جہاز پر نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت فرسٹ کلاس میں ۷۰ آدمی سفر کر رہے ہیں۔ اور مجھے ان تمام کی صورتیں بخوبی یاد ہیں مگر جس شخص کو کل میں نے دیکھا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک کمرے سے نکل رہا تھا۔ اور مجھے اس کا چہرہ بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا"۔

میں نے دلچسپی لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بیمار ہو گا"۔

"شاید"۔

پھر میں نے چونک کر کہا۔ "یہ تو بتائیے اس کا چہرہ کس قسم کا تھا"۔

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "اس کی عمر کوئی ۵۰ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ سر گنجا تھا۔ اس کی جیب کسی بوجھل چیز سے گرانبار معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ سرخ سلیپر پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ خصوصیت سے جاذب توجہ تھا۔ اس کا منہ بہت چھوٹا تھا۔ میں نے آج تک ایسا چھوٹا منہ نہیں دیکھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی۔ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی نے مومی بت بنا کر بعد میں اسے رنگ دیا ہے۔ وہ جیتا جاگتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گویا اپنی زندگی سے بیزار ہے"۔

میں نے پوچھا "آپ نے اس واقعے کا ذکر کسی اور سے تو نہیں کیا"؟

"مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ میں نے بیگم نرجس سے اس واقع کا ذکر کیا تھا"

میں ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ پروفیسر کے افسانے نے میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات پیدا کر دیئے تھے۔ میں نے جو سمندر کی تکلیف کا افسانہ وضع کیا تھا۔ وہ تاش کے پتوں کی طرح زمین پر آرہا سچ تو یوں ہے۔ کہ میں خود بھی اس سرخ سلیپر والی روح سے ملنے سے خائف تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں راہ میں میری ملاقات بھی اتفاقیہ طور پر اس سے نہ ہو جائے۔ لیکن اپنے سے زیادہ مجھے بیگم نرجس کا خیال تھا۔ اس کی حالت کا تصور بھی مجھے پریشان کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں سیدھا بیگم کے کمرے کی طرف چلدیا۔

پیشتر اس کے کہ میں دروازہ کھولوں۔ بیگم خود باہر نکل آئی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ ایک ہاتھ اپنے گلے پر رکھے ہوئے تھی دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ گویا کسی شخص کو باہر آنے سے روکنا چاہتی تھی۔

مجھے دیکھکر اُس نے چیخ ماری اور بے اختیار رونے لگ پڑی۔

اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ضروری ہے کہ میں سمندر میں کود جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا مجھے اس کے پاس جانا پڑیگا"۔

"آپ نے کوئی پریشان کن خواب دیکھا ہے۔ بیگم۔ اور آپ ڈر گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے"۔

"نہیں نہیں۔ یہ خواب نہیں تھا"۔

"آپ کو تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر تھا دراصل خواب ہی"۔

بیگم نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا یہیں کھڑے رہیے۔ ابھی تک "وہ" اندر موجود ہے"۔

میں نے جرأت سے کہا "نہیں یہ بات غلط ہے۔ آئیے میں آپ پر ثابت کر دوں۔ کہ یہ بات غلط ہے"۔

میں نے دروازہ کھولا۔ اندر گھپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

بیگم نے کہا "میں نے تو بجلی جلائی ہوئی تھی"۔

ٹھیک ہے۔ مگر آتی دفعہ آپ کے آستین کی رگڑ سے سوئچ

اُڑ گیا ہوگا"

میں نے پھر بجلی جلائی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ بستر پر کپڑے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک تکیہ زمین پر گرا ہؤا تھا۔

میں نے بیگم کو تسلی دی۔ اور آخر کار کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ اس قابل ہوئی۔ کہ اپنا افسانہ سُنا سکے۔

بیگم نے کہا "آج صبح مسٹر احمد حسین نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی میرے خاوند کو دیکھا ہے۔ یوں تو اسی وقت سے میرے دل میں خوف کا ایک طوفان بیتاب تھا۔ مگر شام کو جب میں اپنے کمرے میں آئی۔ اس وقت تو کمرے کی ہر ایک شئے مجھے ڈراؤنی اور خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ میں نے آکر بتی روشن کی۔ تو مجھے معلوم ہؤا۔ کہ میرے خاوند کی روح میرے کمرے میں موجود ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک قینچی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور اپنی مردہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر کہا "نرجس میرے پاس آجاؤ۔ سمندر میں کود پڑو۔ میرے پاس پہنچ جاؤ گی۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آؤ۔ نرجس"

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کیا ہؤا۔ پھر شاید میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

یہ تمام خواب کی سی بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ تھک کر سو رہیں۔ اور اس کے بعد خوف کے مارے آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا۔ کہ آپ نے خواب دیکھا ہے۔ لیکن یہ تو بتائیے۔ کہ یہ آپ نے کس طرح کہا۔ کہ مسٹر احمد حسین نے آپ کے خاوند کی روح کو دیکھا ہے؟"

"وہ کہتے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو سُرخ سلیپر پہنے ہوئے فسٹ کلاس کے ایک کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا"

میں نے کہا "یہ خوب رہی۔ وہ تو مسٹر نسیم حسین تھے"

میں نے فوراً مسٹر نسیم حسین ایک فرضی شخصیت کا نام لے کر اپنی قوت تخلیق کا ثبوت دیا۔

"مگر مسٹر احمد حسین تو کہتے تھے۔ کہ انہوں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا"

یہ بھی ٹھیک کہتے تھے۔ وہ بات یہ ہے۔ کہ مسٹر نسیم حسین سمندر کے سفر کے عادی نہیں ہیں۔ وہ اتنا عرصہ اپنے کمرے ہی میں بند رہے۔ کل اتفاق سے وہ نکل رہے تھے۔ کہ مسٹر احمد حسین نے اُنہیں دیکھ لیا"

"تو پھر سلیپروں کا رنگ اور....."

"محض ایک اتفاق"

بیگم نرجس بالکل مطمئن ہو گئی۔ اس کے چہرے پر تبسم کھلنے لگا۔ اس شیریں دل آویز الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے از حد درجہ مسرت تھی۔ کہ میں نے مسٹر نسیم حسین جیسی کارآمد شخصیت کا انتخاب کر لیا تھا۔

(۳)

اب تک مجھے بیگم نرجس کے خطوط موصول ہوتے ہیں۔

جس طرح اس کی صورت دل کش تھی۔ اسی طرح اس کی تحریر دلکش ہے۔ وہ معمولی الفاظ میں اس قسم کا جادو پھیر دیتی ہے کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے "شکریہ" ایک عام لفظ ہے۔ اور اب تو اس کی حیثیت تمدن و تہذیب کے زیر اثر ایک مروج رسم کی رہ گئی ہے۔ جس کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ مگر جب یہی لفظ بیگم کے مُنہ سے نکلتا تھا۔ تو ہر طرح واقعی تشکر و امتنان کی دنیا لرز رہی ہوتی تھی۔ اُس نے بارہا خطوط میں طرح طرح کے نئے طریقوں سے میرا شکریہ ادا کیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ کہ جس کے لئے اس قدر شکریہ کا مستحق سمجھا جاؤں۔

اس کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے اپنے پہلے منگیتر سے شادی کر لی ہے۔ اور وہ دونوں ایک فردوس ارضی میں محو عشرت ہیں۔ اس کے بعد کبھی مسٹر ظہیر احمد کی روح نے انہیں تنگ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں بیگم نے مجھے ایک سگرٹ کیس تحفے کے طور پر ارسال کیا ہے۔ جو طلائے خالص کا بنا ہؤا ہے۔ اس کے ڈھکنے پر ایک بیش قیمت الماس جڑا ہؤا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اس تحفے کو لوگوں کے سامنے استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے خوف ہے۔ کہ اس طرح لوگوں کو میری آمدنی کے ذرائع کے متعلق ایک غلط خیال پیدا ہو جائے گا۔

بہر نوع مقام مسرت ہے۔ کہ بیگم نرجس کو میری تخلیقی قوت نے خوف کے ہیبت ناک چنگل سے رہائی دی۔ یہ تو سب کچھ ہوتا۔ مگر میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ جس جہاز پر میں نے اور بیگم نرجس نے سفر کیا تھا۔ اس پر ایک ایسا مسافر بھی سفر کر رہا تھا۔ جس کا نام مسافروں کی فہرست میں درج نہ تھا۔

مجھے ایک ضروری کام سے واپس لندن جانا ہے۔ مگر میں اس جہاز کی بجائے کسی دوسرے جہاز کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جہاز پر ہر سفر میں ایک ایسا مسافر سوار ہؤا کرے گا۔ جس کے متعلق جہاز کے کپتان اور مالک کو کوئی اطلاع نہ ہوگی۔

میں نے قصداً اپنا نام اور جہاز کا نام پردۂ اخفا میں رکھا ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا۔ کہ جہاز کے مالک کا کاروبار خراب ہو۔ اور لوگ اس جہاز پر سفر کرنے سے انکار کر دیں۔

(باقی)

کی نسبت مسعود سے ہوگی۔ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شادی احمد حسن سے طے شدہ بات ہے۔ سب لوگوں نے احمد حسن کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے امتیاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اس واقعے کا شبہ ہوچکا تھا کیونکہ پچھلے دنوں سے امتیاز اس سے بہت تلخ سلوک کرتی تھی۔ مگر اسے یہ خیال تک نہ تھا کہ اس کی نسبت کا اسقدر جلد اعلان ہوجائیگا۔

دوسری طرف اس اعلان نے حنیف کے دل میں اضطراب و غم۔ قہر و نفرت کا ایک طوفان پیدا کردیا۔ ایکٹر دونوں کو مبارکباد دے رہے تھے۔ اور اس ہنگامے میں کسی نے حنیف کی مضطرب حالت کی طرف توجہ نہ کی۔ ورنہ اس کا راز اسی وقت فاش ہوگیا ہوتا وہ مدت سے امتیاز سے محبت کرتا تھا۔ محبت ایک فرسودہ لفظ ہے۔ اس کے جذبات کی شدت اور تیزی کو کسی شے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس کمپنی میں محض امتیاز کے لئے ملازمت کر رہا تھا۔ ورنہ اس کی کوئی قدردانی نہ ہوتی تھی۔ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور مسکرا مسکرا کر امتیاز اور مسعود کو مبارکباد دینے لگا۔ اب کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس شخص کے دل میں اس وقت آگ بھڑک رہی ہے جو تھوڑے عرصے میں دو زندگیوں کی مسرتوں کو راکھ کرکے رکھدیگی۔ اس نے اپنے انداز سے قطعاً یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس پر کسی قسم کا اثر ہوا ہے۔ مگر وہ ایک تجربہ کار مجرم کی طرح اپنے دل میں مسعود کو قتل کرنے کی بہترین تجویز سوچنے میں مصروف تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ....

کسقدر ہولناک خیال تھا۔ مسعود کا قتل۔ احمد حسن پر اس ہولناک جرم کا الزام! وہ اپنے جی ہی جی میں ان باتوں کا تصور کرکے خوش ہو رہا تھا۔ کسقدر پر لطف بات ہوگی۔ مسعود قتل ہوجائیگا۔ احمد حسن قتل کے الزام میں گرفتار ہوگا۔ اور یوں ایک ہی تدبیر سے دونوں رقیب اس کے راہ سے ہٹ جائیں گے۔

ڈرامے میں احمد حسن کو ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ جب ڈرامے کے پہلے دو ایکٹ گزر چکے اور احمد حسن تیسرے ایکٹ کے لئے تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں آیا تو اس کی میز پر پانی کا ایک گلاس نیم لبریز رکھا ہوا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ گلاس منہ سے لگایا اور غٹ غٹ چڑھا گیا .....

دبے پاؤں حنیف احمد حسن کے کمرے میں داخل ہوا۔ احمد حسن بیہوش تھا۔ اپنی تدبیر کو کامیاب دیکھکر اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ جب وہ احمد حسن کے گلاس میں خواب آور دوا ملا کر گیا تھا۔ اس وقت اسے یقین نہ تھا کہ اس کی تدبیر کامیاب ہوگی۔ ممکن تھا کہ احمد حسن کو بالکل پیاس محسوس نہ ہو۔ اور اس صورت میں حنیف کا انتظام بیکار جاتا۔ مگر اس صورت میں اسے نقصان بھی تو کوئی نہ تھا........

حنیف نے جلد جلد احمد حسن کے کپڑے پہننے شروع کئے۔ جو کچھ منٹوں کے بعد احمد حسن کا پارٹ ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔ آنکھوں کے نیچے ذرا سی سیاہی۔ ماتھے پر شکن۔ پینٹ کے ذریعے رخساروں پر کہیں کہیں جھریاں۔ اور حنیف اس صورت میں آچکا تھا جس صورت میں احمد حسن کو تیسرے ایکٹ میں قاتل کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ اور یہ باتیں بھی اس نے احتیاطاً کرلی تھیں۔ ورنہ تیسرے ایکٹ کے دوران میں قاتل کو اپنا خوفناک کام نقاب پہنکر کرنا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ باقی چہرہ لوگوں سے پوشیدہ رہتا تھا۔

اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے کے بعد اس نے سیاہ نقاب پہن لی۔ اور چپ چاپ پردے کے پیچھے کھڑا ہوکر انتظار کرنے لگا۔

ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ اور تیسرے ایکٹ میں احمد حسن کے پارٹ کا وقت آگیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ایکٹر نہیں جو اس سے پہلے دو ایکٹوں میں کام کرچکا ہے۔ اس کا قد احمد حسن کے قد کے برابر ہی تھا۔ شاید ایک دو انچ کا فرق ہو۔

مسعود ایک آرام کرسی پر دراز تھا۔ حنیف کو تماشائیوں کے چہرے موم کی بنی ہوئی صورتوں کی طرح نظر آتے تھے۔ چپکے چپکے وہ مسعود کی طرف بڑھتا گیا۔ تماشائیوں کی نظریں اس کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اب تماشا گاہ میں مکمل خاموشی تھی۔ یکایک اس نے مسعود کا گلا دبوچ لیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مسعود کو کسی طریقے سے معلوم ہوگیا ہے کہ ان نازک انگلیوں میں موت پوشیدہ تھی۔ پھٹی ہوئی! وحشتناک۔ خوف سے لبریز۔ مسعود کی آنکھیں حنیف کے منہ کی طرف مڑ گئیں۔ حنیف سوچ رہا تھا ان خوبصورت آنکھوں کی گہرائیوں میں کس شے کا عکس ہے۔ خوف کا؟ یا پہچان کا؟ لوہے کی تاروں کی طرح حنیف کی انگلیاں مسعود کی رگوں میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ مسعود چیخنا چاہتا تھا۔ مگر قاتل نے اس کی چیخوں کو گلے ہی میں دبا دیا۔ اسے ان چیخوں کو رگوں میں دبا دینے سے ایک وحشیانہ خوشی ہو رہی تھی۔ اب مسعود کی آنکھیں اُبل آئیں سانس

رُک رُک کر آنے لگا۔ .... موت!

قاتل واپس بھاگ گیا۔ ایکٹ کرنے کا لباس اتار کر اس نے اپنی الماری میں بند کر دیا۔ اور احمد حسن کے کمرے کی طرف چلدیا۔

تمام لوگ وہیں جمع تھے۔ امتیاز ایک پژمردہ پھول کی طرح زمین پر گری ہوئی تھی۔ ضیاالدین احمد حسن کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار اسے ہوش آیا۔

ضیاالدین نے کہا "دیکھو احمد حسن ہوش میں آؤ۔ تم نے مارا ہے مسعود کو؟"

احمد حسن نے اپنی آنکھیں اٹھائیں "مسعود کو مارا ہے! کس نے مارا ہے؟ مسعود مر گیا! کون کہتا ہے مسعود مر گیا؟ اتنے میں پولیس کے سپاہی کمرے میں داخل ہو گئے۔

ضیاالدین نے پھر کہا "احمد حسن! مسعود مر گیا! کیا تم نے اسے تیسرے ایکٹ میں مار دیا تھا؟"

اب احمد حسن کو پوری طرح ہوش آ گیا۔ اس نے کہا "کیا تماشا ہے۔ میں دوسرے ایکٹ کے بعد یہاں آیا تو .... میں نے پانی کا ایک گلاس پیا تھا۔ اس کے بعد تو مجھے کچھ یاد نہیں ...."

اس نے اپنے سر کو دبانا شروع کیا۔

ضیاالدین نے گلاس اٹھا لیا۔ ابتک اس میں خشک سا سفوف پانی تھا!

یکایک ضیاالدین چلا اٹھا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے! احمد حسن تم سچ کہتے ہو۔ تم نے مسعود کو نہیں مارا۔ اب میں سمجھا ہوں کہ وہ شخص کیا کہہ رہا تھا۔"

ضیاالدین کا بدن وفور جوش و اضطراب سے کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا "تیسرے ایکٹ میں جب قاتل سٹیج پر داخل ہوا ہے۔ میں پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک میرے کان میں خاص درجے کی نشستوں میں سے کسی کی آواز آئی۔ کیا آواز آئی تمہارے خیال میں؟

ضیاالدین رُک گیا۔ حنیف کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ خوف کے مارے اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا اس سے کیا غلطی سرزد ہو گئی ہے؟

ضیاالدین نے کہا "مجھے آواز یہ آئی تھی "سعید ذرا غور سے دیکھنا! دوسرے ایکٹ میں اس ایکٹر کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اور اب بالکل بھوری ہو گئی ہیں۔ کیا بات ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے حنیف کی طرف دیکھا۔ لیکن حنیف بیہوش ہو چکا تھا۔ تمام ایکٹروں میں سے صرف اسی کی آنکھیں بھوری تھیں۔ اور اس کی الماری میں قاتل کا لباس بند تھا!

(رپٹین)

جواد حیدر ایم۔ اے

شاعر اور مصلح

تو قوم کو نکال رہا ہے زوال سے
میں روشناس کرتا ہوں فکرِ مآل سے

تیرا سخن ہے عالمِ اسباب کے لئے
میرا کلام روح کے آداب کے لئے

تجھ کو ہجومِ فکرِ پریشاں کئے ہوئے
میں مطمئن تصورِ جاناں کئے ہوئے

تیرے بیان میں ہے تپش آفتاب کی
نرمی مری زباں میں شبِ ماہتاب کی

تیری نظر خراش کے پہلو لئے ہوئے
میں پردہ ہائے چشم میں آنسو لئے ہوئے

غازہ ہے تو، میں عارضِ زیبائے قوم ہوں
تو "فکرِ قوم" ہے میں "تمنائے قوم" ہوں

دل سے عروجِ قوم کی دھن تیری خو میں ہے
اور قوم کا عروج مری جستجو میں ہے

تو باغباں ہے اور مری ذات باغ ہے
میں دل ہوں اپنی قوم کا اور تو دماغ ہے

وہ دل ہوں جس میں سرخ محبت کے داغ ہیں
ہر داغ پر نثار ہزاروں دماغ ہیں

(منتخبہ)

جوش ملیح آبادی

مالنی

پہلا منظر

محل کا برآمدہ - جو بازار کی طرف واقع ہے

مالنی! وقت آگیا ہے اور میری زندگی اس وقت اسی طرح لرز رہی ہے جس طرح کنول کے پھول پر اوس کا قطرہ لرزتا ہے - میں اپنی آنکھیں بند کرتی ہوں تو آسمانوں کے نغمے میرے کانوں میں گونجتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - میرے دل میں ایک خلش ایک تڑپ کی ہے - جو خدا جانے کس چیز کی ہے -

رانی داخل ہوتی ہے

رانی - کیا ہے بچی! تو اپنے حسن اور جوانی کے لائق کپڑے کیوں نہیں پہنتی - تیرے زیور کہاں ہیں - تو چمکتی ہوئی صبح ہوکر سونے کے رنگ سے کیوں ڈرتی ہے - میں دیکھتی ہوں تیرے بدن کو سونا چھوتا بھی نہیں -

مالنی - ماتا! کچھ لوگ ایسے ہیں جو غریب پیدا ہوتے ہیں - چاہے راجہ کے گھر میں کیوں نہ ہوں - جن کی قسمت میں غربت کی دولت لکھی ہے - ان کے ساتھ دنیا کی دولت نہیں رہتی -

رانی - کیا باتیں کر رہی ہے تو بچی! کل تو مجھ سے دودھ مانگتی تھی آج پہیلیاں سناتی ہے - تیری باتیں سنکر خوف کے مارے میرا دل بیٹھ جاتا ہے - تو نے اپنا نیا دھرم کہاں سے سیکھا ہے؟ جس کی باتیں ہماری کتابوں کے خلاف ہیں - بچی! لوگ کہتے ہیں کہ جن بودھ رشیوں سے تم سبق لیتی ہو - وہ جادوگر ہیں - لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں کو منتروں اور جادوؤں سے بدل دیتے ہیں - مگر میں تجھ سے پوچھتی ہوں کہ دھرم کہیں ڈھونڈنے سے ملتا ہے؟

دھرم سورج کی روشنی کی طرح ہے - جو تمام دن رہتی ہے - میں تو سیدھی سادی عورت ہوں - اور مردوں کے دھرم وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں جانتی - صرف اس قدر جانتی ہوں کہ عورتوں کے دیوتا ان کی باتوں میں خود بخود آجاتے ہیں - عورتوں کے دیوتا ان کے نیچے اور رہتے ہیں -

راجہ داخل ہوتا ہے

راجہ - بچی! راجہ کے محل پر گھرے سیاہ بادل چھائے جا رہے ہیں - اس خطرناک راستے پر چلنا [illegible] دے - ذرا ٹھہر جا -

رانی - یہ کیا ڈراؤنے لفظ ہیں -

راجہ - بچی - اگر تجھے اپنے لئے [illegible] کے اصول سیکھنا ہیں تو سیکھ - مگر اس پرانے ملک میں [illegible] دھرم کو ایک تیز بہتے ہوئے طوفان کی طرح نہ لا - کہ [illegible] پر رہنے والے لوگ ڈوب جائیں - اپنے دھرم کو [illegible] رکھ - لوگوں کو چین سے رہنے دے کہ وہ اس دھرم [illegible] اور مذاق کی آواز نہ اٹھائیں -

رانی - میری بچی کو نہ چھیڑ کیا اس کے سامنے ملکی مذہبوں کی [illegible] نہ سلجھاؤ - اسے ان پیچدار راستوں سے ناواقف [illegible] دو - اگر میری بچی اپنا دھرم اختیار کرنا چاہتی ہے تو کسی کا [illegible] میں کیا ہے - اسے کون الزام دے سکتا ہے؟

راجہ - رانی - میری رعایا مالنی کی جلاوطنی کا مطالبہ کرتی ہے -

رانی - جلاوطنی - اپنی لڑکی کو جلاوطن کر دو گے؟

راجہ - برہمن مالنی کے نئے دھرم سے ڈر گئے ہیں - اور ملکر.....

رانی - نیا دھرم! کیا دنیا کی تمام سچائیاں ان کی پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں - ان سے کہہ دو کہ اپنی پرانی گھن کھائی ہوئی کتابوں کو جلا دیں اور میری بچی سے آکر سبق لیں - میں تم سے کہتی ہوں کہ مالنی معمولی لڑکی نہیں ہے - وہ آگ کا پاک شعلہ ہے - اس کے جسم میں کوئی دیوتا سما گیا ہے - اس کو حقارت نہ دیکھو - کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رونا پڑے -

مالنی - پتا جی! مجھے بن باس دیدو - وقت آگیا ہے - کہ آپ اپنی رعایا کی بات مان لیں -

راجہ - کیوں بچی! تجھے اپنے پتا کے گھر میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

مالنی - سن [illegible]! وہ لوگ جو میرا بن باس چاہتے ہیں - میرے [illegible]

بیٹی: نہیں ماتا جی! جو کچھ میرے دل میں ہے۔ وہ میں آپکو بتا نہیں
سکتی آپ مجھے بھول جائیں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ جس طرح درخت
پت جھڑ کے موسم میں اپنے پتے گرا دیتا ہے۔ آپ مجھے نظروں
سے گرا دیں۔ مجھے آپ دنیا کے پاس جانے دیں۔ دنیا مجھے
آپ کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتی ہے۔

راجہ۔ بچی! مجھے تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

مالنی۔ پتا جی۔ آپ راجہ ہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔ اپنا دل مضبوط
کیجئے۔

رانی۔ بچی! میرے لئے اس محل میں کوئی جگہ نہیں رہی جہاں تو پیدا
ہوئی تھی؟ دنیا کا بوجھ تیرے نازک کندھوں کا انتظار کر
رہا ہے کیا؟

مالنی۔ میں جاگتی جاگتی خواب دیکھتی ہوں۔ مگر ہوا پُر شور ہے اور
ایک وحشیانہ انداز میں چل رہی ہے۔ پانی بیتاب ہے۔
رات اندھیری ہے۔ اور کشتی آسمان میں لنگر انداز ہے۔ ناخدا
کہاں ہے؟ جو آوارہ پھرنے والوں کو وطن پہنچائے۔ میں
سمجھتی ہوں کہ مجھے راستہ معلوم ہے۔ اور مجھ سے چھو کر کشتی
زندگی سے تڑپنے لگیگی اور رواں ہو جائیگی۔

رانی۔ سن رہے ہو راجہ! کیا باتیں کر رہی ہے یہ! کیا یہ باتیں ننھی
سی لڑکی کی ہیں۔ کیا یہ لڑکی تمہاری ہے۔ اور کیا میں نے ہی
اسے جنا ہے!

راجہ۔ تم نے اسی طرح جنا ہے۔ جس طرح صبح رات سے پیدا
ہوتی ہے۔ صبح جو رات کے لئے نہیں۔ بلکہ تمام دنیا کے لئے
ہوتی ہے۔

رانی۔ راجہ۔ تمہارے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جو میری بچی کو
روک سکے۔ مالنی! میری آنکھوں کی روشنی! تیرے بال
بکھر کر تیرے کندھوں پر آ گئے ہیں۔ لا میں انہیں گوندھ کر
جوڑا باندھ دوں۔ راجہ۔ رعایا بن باس کی باتیں کرتی ہے۔
اگر ان کا دھرم یہی کہتا ہے تو پھر مالنی کا نیا دھرم اچھا ہے۔
برہمنوں کو اس نئے دھرم سے سبق لینا چاہئے۔

راجہ۔ رانی! آؤ۔ اس لڑکی کو یہاں سے لے چلیں۔ دیکھتی ہو۔
لوگ کس طرح بازار میں جمع ہو رہے ہیں۔

تمام چلے جاتے ہیں

برہمنوں کا ایک گروہ داخل ہوتا ہے وہ بلند آواز میں پکارتے ہیں

برہمن۔ راجہ کی بیٹی کو بن باس۔

کیمنکار۔ دوستو! اپنی بات پر قائم رہو۔ یہ عورت ہماری سب
سے خطرناک دشمن ہے۔ کیونکہ عقل اس کے خلاف کام نہیں
کرتی۔ اور طاقتیں اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔ شرمندہ ہو
جاتی ہیں۔ مردوں کی قوت اس کی بے بسی کے قدموں میں سر
ڈال دیتی ہے۔ اور یہ عورت ہمارے دل کے قلعوں میں پناہ
لیتی ہے۔

پہلا برہمن! ہم راجہ سے ملینگے اور صاف کہہ دیں گے کہ اس کے
محل میں سے ایک زہریلے سانپ نے اپنا سر بلند کیا ہے اور
ہمارے دھرم کے دل پر ڈنک مارنا چاہتا ہے۔

سپریا۔ دھرم! میں بھی کسقدر بیوقوف ہوں۔ مجھے یہ باتیں سمجھ نہیں
آتیں۔ مجھے ذرا سمجھائیے۔ کیا انکا دھرم ایک بے گناہ
لڑکی کو بن باس دینا چاہتا ہے۔

پہلا برہمن۔ سپریا تم ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو۔ تم ہمیشہ
ہمارے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتے ہو۔

دوسرا برہمن۔ ہم اپنے دھرم کی حفاظت کر رہے ہیں اور تم ہو
کہ حقارت کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک پھیکے سے تبسم
کی طرح ظاہر ہوتے ہو۔

سپریا۔ تو تم سمجھتے ہو کہ اپنی تعداد کے بل پر سچائی کا فیصلہ کرو گے۔
اور اپنی آواز سے عقل کو دبا لو گے؟

پہلا برہمن۔ کسقدر گستاخی ہے۔ سپریا!

سپریا۔ میں گستاخ نہیں۔ بلکہ گستاخ وہ ہیں جو آسمانی کتابوں کو
اپنی خواہشوں کے مطابق معنی پہناتے ہیں۔

دوسرا برہمن۔ نکال دو اسے یہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

پہلا برہمن۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مالنی کو بن باس دیا جائیگا۔
جو اس کے خلاف ہے یہاں سے چلا جائے۔

سپریا۔ برہمنو! تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کیا۔
میں تمہارا سایہ نہیں ہوں۔ نہ تمہاری کتابوں کی گونج ہوں۔
میں نہیں مانتا کہ سچائی اونچی آواز میں چلانے والوں کے ساتھ
ہوتی ہے۔ اور میں اس دھرم کو اپنا دھرم سمجھنے میں شرم
محسوس کرتا ہوں جو اپنی زندگی کے لئے طاقت کا محتاج ہے
کیمنکار۔ مجھے جانے دو۔

کیمنکار۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ تم عمل میں پکے ہو

مگر بحث کرتے وقت تم کو کئی طرح کے شبہے ہوتے ہیں۔ چپ رہو میرے دوست۔ وقت بہت برا ہے۔

سپریا۔ میرے لئے بیوقوفی کا اندھا یقین سب چیزوں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ کیا حماقت ہے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو بن باس دیکر ہم اپنا دھرم بچا لینگے۔ کم از کم مجھے یہ تو پتا ہونا چاہئے کہ اس کی غلطی کیا ہے۔ اس نے کیا گناہ کیا ہے۔ کیا وہ یہ نہیں کہتی کہ محبت اور سچائی دھرم کا جسم اور روح ہیں اور کیا یہی بات تمام دھرموں کی جان نہیں ہے۔

کیمنکار۔ تمام دھرم اصل میں ایک ہیں لیکن ان کی شکلیں مختلف ہیں۔ پانی ایک ہے۔ لیکن کناروں سے اس کی حدیں قائم کر دیجاتی ہیں۔ اور مختلف کنارے مختلف آدمیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے دل میں پانی کا ایک چشمہ ہے تو ہو۔ لیکن تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم ان ہمسایوں کا مذاق اڑاؤ۔ جو اس چشمے سے پانی لینے کے لئے جاتے ہیں جو ان کے باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے۔ جس کے درختوں پر ازل کے پھل لگتے ہیں۔ اور جس کی سبزی پرانے وقتوں سے خوبصورت رہی ہے۔

سپریا۔ دوست میں تمہارے پیچھے چلونگا جس طرح تمام عمر چلتا رہا ہوں۔ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔

تیسرا برہمن داخل ہوتا ہے

تیسرا برہمن۔ میں اچھی خبر لایا ہوں۔ ہمارے الفاظ کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ اور راجہ کی فوج ہمارے ساتھ ہے۔

دوسرا برہمن۔ فوج۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔

پہلا برہمن۔ ٹھیک ہے۔ ان باتوں سے بغاوت کی بو آتی ہے۔

دوسرا برہمن۔ کیمنکار۔ مجھے ایسی سخت تدبیریں پسند نہیں۔

پہلا برہمن۔ ہماری فتح ایمان سے ہوگی۔ ہتھیاروں سے نہیں۔ آؤ۔ تپسیا کریں۔ منتر پڑھیں۔ اور دیوتاؤں کو یاد کریں۔

دوسرا برہمن۔ دیوی! آ! تیرا غصہ تیرے پجاریوں کا ہتھیار ہے۔ نہ ماننے والوں کے غرور کو خاک میں ملا دے۔ دھرم کی مدد کر۔ دھرم کی سچائی کو ظاہر کر۔ ہمیں فتح کی طرف لے چل۔

تمام مل کر

دیوی۔ آ آسمان کی بلندیوں سے اتر کر۔ فانی انسانوں میں آجا۔ اور اپنا کام کر۔

مالنی داخل ہوتی ہے۔

مالنی۔ آگئی ہوں میں۔

تمام اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔
مگر کیمنکار اور سپریا علیحدہ کھڑے دیکھتے ہیں

دوسرا برہمن۔ دیوی! آخر تو نے درشن دئے۔ انسان کی صورت میں۔ تو نے اپنی ڈراونی قوت کو عورت کی نازک خوبصورتی میں تبدیل کر لیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے تو ماتا! کیا اچھیا ہے تیری؟

مالنی۔ تمہارے کہنے پر میں وطن چھوڑ کر آگئی ہوں۔

دوسرا برہمن۔ آسمان سے دنیا میں۔ کیونکہ میرے بچوں نے تجھے یاد کیا ہے۔

پہلا برہمن۔ دیوی۔ ہمیں معاف کر دے۔ دنیا برباد ہو رہی ہے۔ اور تیری مدد کے لئے بیقرار ہے۔

مالنی۔ تم مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں سکتے۔ میں جانتی تھی کہ میرے لئے تمہارے دروازے کھلے ہیں۔ تم نے میرے بن باس کے لئے آواز اٹھائی اور میری آنکھ کھل گئی۔ راجہ کے بارونق محل اور دولت کی خوشی کے درمیان میری آنکھ کھل گئی۔

کیمنکار۔ شہزادی مالنی!

تمام۔ راجہ کی لڑکی۔

مالنی۔ میں نے اپنے گھر بار کو تمہارے لئے چھوڑ دیا ہے۔ سچ کہو۔ کیا تمہیں میری ضرورت ہے۔ جب میں تنہائی میں اپنی زندگی بسر کر رہی تھی تو کیا تمہیں نے دوسری دنیا سے مجھے بلایا تھا؟

پہلا برہمن۔ ماتا۔ تم نے ہمارے دلوں میں جگہ لے لی ہے۔

مالنی۔ میں راجہ کے گھر میں پیدا ہوئی۔ لیکن میں نے کبھی کھڑکی سے باہر جھانک کر نہیں دیکھا۔ میں سنتی تھی کہ دنیا غم اور دکھ سے بھری ہوئی ہے۔ وہ دنیا جو میری نظروں سے پوشیدہ تھی جو میرے اختیار سے باہر تھی۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ دکھ اور دکھ کس جگہ محسوس ہوتے ہیں۔

پہلا برہمن۔ تمہاری میٹھی آواز سے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔

مالنی۔ دیکھو! چاند بادلوں میں سے نکل آیا۔ آسمان پر امن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا امن نے تمام دنیا کو چاندنی کی

آغوش میں لے لیا ہے۔ وہ راستہ جا رہا ہے۔ جو دھندلاؤ نے
درختوں کے چپ چاپ سایوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ گھر
ہیں۔ وہ مندر ہے۔ وہ۔ دریا کا کنارہ۔ دھندلا اور ویران
نظر آتا ہے۔ میں خواب کے بادلوں کے چھینٹے کی طرح برس
پڑی ہوں۔ اس دنیا میں آگئی ہوں

پہلا برہمن۔ تم دنیا کی ازلی روح ہو۔
دوسرا برہمن۔ جب ہم تمہارے بن باس کے لئے چلا رہے تھے
اس وقت ہماری زبان خشک کیوں نہ ہو گئی۔
پہلا برہمن۔ آؤ برہمنو۔ ماتا کو گھر چھوڑ آئیں۔

تمام چلاتے ہیں

دنیا کی ماتا کی فتح۔

مالنی برہمنوں میں گھری ہوئی چلی جاتی ہے۔

کیمنکار۔ اس خواب کو مٹ جانے دو۔ سپریا تم کہاں جا رہے ہو
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نیند میں چل رہے ہو۔
سپریا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔
کیمنکار۔ سپریا ہوش کرو۔ تم بھی ان اندھے پروانوں کی طرح آگ
میں گر کر جل جانا چاہتے ہو۔
سپریا۔ کیمنکار۔ کیا یہ سب خواب تھا۔
کیمنکار۔ ہاں۔ خواب تھا۔ آنکھیں کھولو اور ہوش میں آ جاؤ۔
سپریا۔ کیمنکار جنت کی امیدیں موہوم ہیں۔ میں عرصہ تک صحراؤں
کی ویرانی میں پھرتا رہا ہوں۔ لیکن کہیں امن نہیں ملا۔ عام لوگوں
کا خدا اور کتابوں کا خدا میرا خدا نہیں ہے۔ ان خداؤں نے
میرے سوالات کا جواب نہیں دیا۔ نہ مجھے کبھی تسلی ہوئی۔ لیکن
آخر کار مجھے خدا کا سانس ایک جیتے جاگتے انسان میں محسوس
ہوا ہے۔
کیمنکار۔ آہ۔ دوست جب انسان کا دل دھوکا دیتا ہے اس وقت
کی ڈراؤنی حالت بیان نہیں ہو سکتی۔ اندھی آرزو اس پر مسلط
ہو جاتی ہے۔ اور اس کا خیال اس کا وہم دیوتاؤں کو اتار کر
خود دل کے تخت پر بیٹھ جاتا ہے کیا وہ نظر آنے والا چاند جو
نرم نرم روئی کے گالوں کی طرح اڑنے والے بادلوں میں
سو رہا ہے۔ سچائی کا نشان ہے۔ کل دن کی ننگی روشنی میں
یہ لوگ پھر زندگی کے سمندر میں ہزاروں جال ڈال دیں گے۔
اور اس وقت یہ چاندنی رات بھول جائے گی۔ یہ منظر وہم

اور خیال اور سایوں سے ملکر بنا ہوا معلوم ہوگا۔ عورت کے
کرشموں سے بنا ہوا طلسمی جال اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کیا
یہ جال سچائی اور حق کی جگہ لے سکتا ہے۔
سپریا۔ آہ مجھے معلوم نہیں۔
کیمنکار۔ تو پھر ہوش کرو۔ ہمارا پرانا مکان جس کو وقت نے
بنایا ہے۔ جل رہا ہے۔ ہمارے باپ دادا کی روحیں اس
مکان پر اسی طرح منڈلا رہی ہیں۔ جس طرح پرندے اپنے
جلتے ہوئے آشیانوں پر منڈلاتے ہیں۔ کیا یہ خیالوں کا
وقت ہے۔ سکون کا وقت ہے۔ جب رات اندھیری ہے۔
دشمن دروازے پر ہے۔ شہری سو رہے ہیں۔ اور انسانوں
نے خواب کے طلسم میں مبتلا ہو کر اپنے بھائیوں کا گلا گھونٹنا
شروع کر دیا ہے۔
سپریا۔ میں تمہارے ساتھ رہونگا۔
کیمنکار۔ میرا یہاں سے جانا ضروری ہے۔
سپریا۔ کہاں؟ کیوں؟
کیمنکار۔ دوسرے ملکوں کی جانب۔ میں دوسرے ملکوں سے
سپاہی لاؤنگا۔ کیونکہ یہ بھڑکی ہوئی آگ صرف خون سے
بجھیگی۔
سپریا۔ لیکن ہمارے اپنے سپاہی تیار ہیں۔
کیمنکار۔ ان سے امداد کی توقع فضول ہے۔ وہ بھی پروانوں کی
آگ میں کود رہے ہیں۔ تم سنتے نہیں وہ کس طرح چلا رہے ہیں۔
تمام شہر پاگل ہو گیا ہے اور دھرم کی لاش پر چراغ جلا جلا کر
خوش ہو رہا ہے۔
سپریا۔ تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو۔
کیمنکار۔ نہیں تم یہاں رہو۔ اور مجھے واقعات کی اطلاع دیتے
رہو۔ مگر دیکھو دوست تمہارے دل پر جھوٹ کی جدت کا کچھ
اثر نہ ہو۔
سپریا۔ جھوٹ نیا ہے۔ مگر ہماری دوستی پرانی ہے۔ ہم بچپن
سے اکٹھے رہے ہیں۔ آج ہم پہلی بار جدا ہو رہے ہیں۔
کیمنکار۔ پرماتما کرے یہ آخری بار ہو۔ بڑے دنوں میں بڑے
بڑے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بھائی بھائی کے خون کا
پیاسا ہو جاتا ہے۔ دوست دوست کے خلاف ہو جاتے ہیں۔
میں رات کی تاریکی میں جا رہا ہوں۔ کیا واپسی تک تم میرا

دوست چراغ جلاکر میرا انتظار کر رہا ہوگا؟ اس امید کے ساتھ میں جاتا ہوں۔

راجہ۔ راج کنور کے ساتھ برآمدے میں ظاہر ہوتا ہے

راجہ۔ مجھے اپنی لڑکی کو بن باس دینا پڑیگا۔

راج کمار۔ ہاں پتا جی۔ اب دیر کرنا خطرناک ہوگا۔

راجہ۔ صبر۔ راج کمار۔ صبر۔ میں اپنا فرض ادا کرونگا۔ میں اپنی لڑکی کو بن باس دیدونگا۔ مطمئن رہو۔

راج کنور چلا جاتا ہے

رانی داخل ہوتی ہے۔

رانی۔ راجہ۔ مالنی کہاں ہے۔ کیا تم نے اسے میری نظروں سے پوشیدہ کرنے کے لئے کہیں چھپا دیا ہے۔

راجہ۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں؟

رانی۔ نہیں۔ جاؤ۔ اپنے سپاہیوں کو ساتھ لیکر شہر کی تلاشی لو۔ شہر والوں نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک چرالی ہے۔ ان کو شہر بدر کردو۔

راجہ۔ میں مالنی کو واپس لاؤنگا۔ چاہے میری راجدھانی برباد ہوجائے۔

برہمن اور سپاہی مالنی کو لئے ہوئے آتے ہیں۔
مشعلیں جل رہی ہیں۔

رانی۔ میری پیاری تو کہاں گئی تھی بچی!

دوسرا برہمن۔ خفا نہ ہوجئے۔ ماتا جی! راجکماری اشیرباد دینے کے لئے ہمارے گھر گئی تھیں۔

پہلا برہمن۔ کیا راجکماری صرف آپ کی ہے۔ ہماری نہیں۔

دوسرا برہمن۔ ماتا! ہمیں بھول نہ جانا۔ ہمارے لئے تم ستارے کی طرح ہو۔

مالنی۔ محل کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں۔ آئندہ سے دیواریں تمہارے اور میرے درمیان حائل نہ ہونگی۔

برہمن۔ مبارک ہیں ہم۔ اور ہماری دھرتی۔

مالنی۔ ماتا جی۔ میں دنیا کے لوگوں کو آپکے محل میں لے آئی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میرے جسم کی کوئی حد نہیں رہی میں دنیا کی زندگی سے مل گئی ہوں۔

رانی۔ ٹھیک ہے بچی! اب تجھے باہر جانے کی ضرورت نہ رہیگی۔ دنیا کو اپنی ماتا کے پاس لے آ۔ ذرا دم لے لے بچی۔ یہ زندگی کا شعلہ تیری آنکھوں سے نیند کو فنا کئے دیتا ہے۔

مالنی۔ (رانی سے ہم آغوش ہوکر) ماتا جی۔ میں تھک گئی ہوں۔ میرا بدن کانپ رہا ہے۔ دنیا کسقدر وسیع ہے۔ ماتا جی مجھے گاکر سلا دیجئے۔ میری آنکھوں میں آنسو آرہے ہیں اور دل پر کسی غم کا بھاری بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

دوسرا منظر

محل کا باغ

مالنی اور سپریا

مالنی۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے تمہاری کتابیں نہیں پڑھیں میں بحث کرنا نہیں جانتی۔

سپریا۔ میں صرف بیوقوفوں کے سامنے پڑھا لکھا ہوا بنتا ہوں میں تمام کتابیں اور مباحثے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ راجکماری میری رہبری کرو۔ میں تمہارے پیچھے چلونگا جس طرح سایہ چراغ کے پیچھے چلتا ہے۔

مالنی۔ مگر برہمن جی۔ جب تم مجھ سے سوال کرتے ہو تو میری طاقت سلب ہوجاتی ہے۔ اور میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ میں حیران ہوں کہ تم سب کچھ سمجھ بوجھکر کیوں مجھ سے پوچھنے کے لئے آتے ہو۔

سپریا۔ میں تمہارے پاس علم کے لئے نہیں آتا۔ مجھے سب پڑھا لکھا بھول جانے دو۔ راستے تو بہت ہیں مگر روشنی مفقود ہے۔

مالنی۔ آہ۔ جسقدر تم مجھ سے پوچھتے ہو۔ اسی قدر مجھے اپنی غربت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ آواز کہاں ہے جو آسمان سے ان دیکھی بجلی کی طرح کوندتی ہوئی میرے دل میں داخل ہوگئی تھی۔ اسدن تم کیوں نہیں آئے۔ دنیا میں داخل ہوکر میرا دل کمزور اور شرمیلا ہوگیا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتی کہ اس کشتی کو کس طرح کھیوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ اور میں اکیلی ہوں۔ لہریں طوفان خیز ہیں اور آسمان سے بجلی کی روشنی ایک لمحے کے لئے چمک کر پھر غائب ہوجاتی ہے۔ تم دانا ہو۔ عالم ہو۔ میری مدد کرو۔

سپریا۔ اگر تم میری مدد طلب کرو تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرونگا۔

مالنی - بعض وقت ایسے آتے ہیں - جب مایوسی میری زندگی کا گلا گھونٹ دیتی ہے - لوگوں کے گروہوں کے درمیان میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس کرتی ہوں - اس وقت میں اپنی طرف دیکھتی ہوں اور ڈر جاتی ہوں - اس وقت - مایوسی کے ان تاریک لمحوں میں اگر تم امید کا ایک لفظ میرے کان میں پھونک دو تو میں پھر زندہ ہو جاؤں -

سپریا - میں تیار ہونگا - میں اپنے دل کو پاک و صاف کرونگا - اور سچے دل سے تمہاری خدمت کرونگا -

ملازم داخل ہوتے ہیں -

ملازم - شہر کے لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں -

مالنی - آج نہیں - میری طرف سے معافی مانگ لو - مجھے آرام کی ضرورت ہے - تاکہ میں اپنے تھکے ہوئے دماغ کو کچھ سکون دے سکوں -

ملازم جاتا ہے

کیمنکار کے متعلق مجھے اور کچھ سناؤ - مجھے تمہاری زندگی کی آزمایشوں سے بہت دلچسپی ہے -

سپریا - کیمنکار میرا بھائی ہے - میرا آقا ہے - میرا دوست ہے - اس کا دل شروع ہی سے مضبوط رہا ہے - مگر میرے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں - تاہم اس نے ہمیشہ مجھے اپنے قریب رکھا ہے - جس طرح چاند اپنے سیاہ داغوں کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھتا ہے - میں سمجھتا ہوں کہ جہاز کسقدر ہی مضبوط کیوں نہ ہو اگر اس کے پیندے میں سوراخ ہو چکا ہے تو وہ ضرور ڈوبیگا - میں نے کیمنکار کو ڈبو دیا - اور یہ فطرت کا قانون تھا -

مالنی - تم نے اسے ڈبو دیا -

سپریا - ہاں جسدن تمہارے آواز کی شیریں گیتوں اور تمہارے چہرے کے نور کے سامنے بغاوت نے شرمندگی میں منہ چھپا لیا تھا - اسدن کیمنکار بالکل غیر متاثر رہا تھا - وہ یہ کہکر رخصت ہو گیا تھا - کہ سپاہیوں کی ضرورت ہے - آگے تمہیں معلوم ہے - تم نے مجھے دوبارہ زندگی بخشی " تمام دنیا سے محبت کرو " ایک اصول تھا جس کو تم نے عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیا - میرا دل دوست کے لئے بیتاب تھا - لیکن وہ دور تھا - پھر اس نے مجھے ایک چٹھی لکھی جس میں درج تھا کہ وہ کسی دوسرے بادشاہ کی فوج لیکر آرہا ہے - میں نے وہ چٹھی راجہ کو دکھا دی - کیونکہ اس میں درج تھا کہ وہ تمہیں موت کی سزا دیگا -

مالنی - سپریا تم ڈر گئے - کیا تمہیں معلوم نہیں - کہ اس محل میں کیمنکار اور اس کے سپاہیوں کے لئے کافی جگہ ہے -

راجہ داخل ہوتا ہے -

راجہ - سپریا - ادھر آؤ - میری آغوش میں آجاؤ - میں کیمنکار کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں - ایک گھنٹہ اور گزر جاتا تو آسمان سے گویا ایک بجلی سی میرے محل پر گر پڑتی - ادھر آؤ سپریا ....

سپریا - پرماتما مجھے معاف کرے - صرف ....

راجہ - تمہیں معلوم نہیں کہ بادشاہ کی محبت الفاظ تک محدود نہیں ہوتی - تم مجھ سے جو چاہتے ہو مانگو - کیا چاہتے ہو تم؟

سپریا - کچھ نہیں مہاراج - میں بھیک مانگ کر جیونگا -

راجہ - مانگو - میں تمہیں ایسے ایسے ملک دینے کے لئے تیار ہوں جو راجاؤں کے لئے رشک کا باعث ہوں -

سپریا - میرا جی ملکوں پر نہیں للچتا -

راجہ - میں جانتا ہوں تم کس چاند کی طرح ہاتھ بڑھا رہے ہو - حوصلہ کرو - مانگو تمہیں سب کچھ ملیگا -

مالنی - تمہیں معلوم ہے کہ اس شریف نوجوان نے تمہاری جان بچائی ہے - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خدمت کا کوئی صلہ ....

سپریا - پرماتما کے لئے مہاراج - خاموش رہئیے! پجاری تو کئی ہونگے - جنہوں نے تمام عمر کی پرستش اور تپسیا کے بعد اپنی آرزو پا لی ہے - (اور اگر مجھے پجاری سمجھا جائے تو میں خوش ہوں) مگر دغا بازی اور فریب کے صلے میں محبت کا انعام حاصل کرنا زہر سے زیادہ تکلیف دہ ہے - دیوی! تمہیں میرے دل - میری روح کی پوشیدہ تمناؤں کی خبر نہیں - مجھے جرأت نہیں کہ میں تم سے اس رحم سے ذرہ بھر زیادہ طلب کروں جو تمہارے دل میں تمام انسانوں کی طرف سے موجود ہے -

مالنی - پتاجی! آپ کیمنکار سے کیا سلوک کریں گے -

راجہ - اسے قتل کر دیا جائیگا -

مالنی - پرماتما کے لئے پتاجی - اس کی جان بخشی کر دیجئے -

راجہ - مگر بچی! وہ تو باغی ہے -

سپریا - آپ انصاف کرتے ہیں - وہ بھی تو انصاف ہی کی خاطر

آپ کو مارنے آیا تھا۔ اسے ملک کی تو کوئی خواہش نہ تھی۔
مالنی۔ اس کی جان بخشی کر دیجئے پتاجی۔ پھر آپ اپنے محسن کے حقیقی دوست ہو سکیں گے۔
راجہ۔ کیا کہتے ہو سپریا۔ میں ایک دوست کو دوست کے آغوش میں دیدوں؟
سپریا۔ یہ تو مہاراجوں جیسی بات ہو گی؟
راجہ۔ اچھا تمہاری خواہش پوری کی جائیگی۔ لیکن میری بادشاہانہ فیاضی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میں تم کو تمہاری امیدوں سے بڑھکر انعام دینا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھ پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ اور میں تمہیں اپنا بہترین سرمایہ دینے تک کے لئے تیار ہوں۔ (مالنی سے مخاطب ہو کر) کیوں بچی۔ تیرے رخسار سرخ کیوں ہو گئے؟ آج تک تیری آنکھوں میں تقدس کی چمک تھی مگر اس وقت اس چمک میں شرم کی سرخی مل گئی ہے۔ آج میں نے اپنی بچی کو پالیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بچی آسمانی سلطنت کا ایک ستارہ ہے۔ مگر مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی دنیا کے شعلوں اور مٹی سے بنی ہے۔ آ۔ میری بچی!

ملازم داخل ہوتے ہیں۔

ملازم۔ قیدی کیمنکار حاضر ہے۔
راجہ۔ لے آؤ۔ وہ آرہا ہے۔ دیکھو اس کی آنکھوں میں غرور کی جھلک ہے۔ اس نے اپنا سر بلند کر رکھا ہے۔ اس کے ماتھے پر گہرے سیاہ سائے چھائے ہوئے ہیں عین اسی طرح جس طرح طوفان کے زور و شور سے پہلے بادل چھا جاتے ہیں۔
مالنی۔ لوہے کی زنجیریں شرم محسوس کر رہی ہیں۔ بڑائی کی توہین خود توہین کی توہین ہے۔ کیمنکار ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے۔

کیمنکار داخل ہوتا ہے۔

راجہ۔ تمہیں میرے ہاتھوں کس سزا کی توقع ہے۔
کیمنکار۔ موت کی۔
راجہ۔ اور اگر میں تمہیں معاف کر دوں۔
کیمنکار۔ تو میں اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا کے رہونگا۔
راجہ۔ تم اپنی زندگی سے بیزار معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟
کیمنکار۔ میں اپنے دوست سپریا کو ملنا چاہتا ہوں۔
راجہ۔ (ملازم سے) سپریا کو بلاؤ۔
مالنی۔ پتاجی کیمنکار کے چہرے میں کوئی ایسی شے ہے جس سے خوف آتا ہے۔ سپریا کو نہ بلائیے۔
راجہ۔ فضول خوف ہے مالنی!

سپریا داخل ہوتا ہے اور کیمنکار کیطرف ہاتھ پھیلا کے بڑھتا ہے۔

کیمنکار۔ ابھی نہیں۔ پہلے اور باتیں کر لیں۔ پھر محبت کے سلام و پیام ہونگے۔ میرے پاس آجاؤ۔ تم جانتے ہو کہ میں الفاظ پر قادر نہیں۔ اور وقت تھوڑا ہے۔ میری آزمائش ختم ہو چکی۔ مگر تمہارا امتحان باقی ہے۔ مجھے سمجھاؤ تم نے یہ کام کیوں کیا ہے؟
سپریا۔ تم نہیں سمجھو گے کیمنکار۔ مجھے اپنے دھرم کا پاس تھا۔ میں نے تمہاری محبت کو دھرم پر قربان کر دیا ہے۔
کیمنکار۔ میں خوب سمجھتا ہوں سپریا! میں نے اس عورت کے چہرے کو دیکھا ہے۔ جو ایک اندرونی نور سے جگمگا رہا تھا۔ جو ایک غیبی آواز کی طرح شیریں سرگوشیوں میں باتیں کرتا تھا۔ تم نے اس کی آنکھوں کے شعلوں پر اپنے باپ دادا کا دھرم بھینٹ چڑھا دیا۔ اور اس قربانی کی خاک پر ایک نئے دھرم کی بنیاد رکھی۔ فریب کی بنیادوں پر۔ دغابازی کی بنیادوں پر تم ایک عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہو۔
سپریا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ عزیز دوست۔ میرے لئے دھرم نے اس عورت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ تمہاری مقدس کتابیں میرے لئے گونگی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں کی روشنی میں پرانی کتابوں کے معنی کو سمجھا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جہاں دھرم ہے وہاں محبت ہے۔ جب میں نے مالنی کے چہرے پر نظر کی تو مجھے معلوم ہوا کہ دھرم اور محبت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔
کیمنکار۔ میں نے بھی ایکبار اس چہرے پر نظر کی تھی۔ اور اسوقت ایسا ہی معلوم ہوتا تھا گویا مالنی کوئی دیوی ہے جو لوگوں کو جنت کی طرف لے جائیگی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آسمانی نغموں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اور میری زندگی کی امیدیں پھولوں کی طرح شگفتہ ہو گئیں۔ لیکن کیا اس کے

بعد میں نے ان تمام وہموں کو چھوڑ کر سفر اختیار نہیں کیا؟ کیا میں نے ذلیل آدمیوں کے طعنے نہیں سنے؟ اور اس اثنا میں جب میں اپنے آرزوں کے خون سے فوج تیار کرتا رہا ہوں تم کیا کرتے رہے ہو؟ تم راجہ کے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے محبت کے گیت گاتے رہے ہے۔ اور اس محبت کو دھرم کا نام دینے کے لئے اپنے دل کو فریب دیتے رہے ہے۔

سپریا۔ عزیز دوست کیا دنیا اسقدر وسیع نہیں ہے کہ دو مختلف طبیعتوں کے انسان اس میں سما سکیں۔ کیا آسمان کے ان گنت ستارے آپس میں لڑتے ہیں! کیا دھرم علیحدہ علیحدہ بن لڑائی کے نہیں رہ سکتے۔

کیمنکار۔ الفاظ۔ محض الفاظ۔ دنیا میں۔ وسیع دنیا میں۔ جھوٹ اور سچ پہلو بہ پہلو نہیں رہ سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک دوست جلا وطن ہونے کے بعد مجرموں کی طرح قتل کر دیا جائے۔ اور دوسرا عزت اور محبت کی مسرتوں میں غرق رہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

سپریا۔ مالنی۔ دیوی! یہ سب باتیں میں تمہاری خاطر سن رہا ہوں کیمنکار تم اپنے دھرم کے لئے صرف جان کی قربانی کر رہے ہو۔ مگر میں تو اپنی عزت کو بھینٹ چڑھا رہا ہوں۔ جو جان سے زیادہ قیمتی ہے۔

کیمنکار۔ بس موت کی عدالت میں تمام سچائیوں کا امتحان ہو جائیگا۔ عزیز دوست تمہیں وہ دن یاد نہیں۔ جب تم رات کو علمی بحثیں کیا کرتے تھے۔ اور صبح کو اپنے گرو سے تمام مشکل مسائل کو حل کرتے تھے۔ آؤ۔ آج ہم اپنے سوال موت کے سامنے رکھدیں۔ جہاں شبہوں کی دھند ایک پھونک میں اڑ جائے گی۔ اور ازلی سچائی کی چوٹیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ اور ہم دونوں احمق۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھکر ہنسیں گے۔

سپریا۔ اچھا۔ عزیز دوست۔ تمہارا کہنا پورا ہو۔

کیمنکار۔ تو آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ تم اپنے دوست سے جدا ہو گئے تھے۔ اب میرے پاس آ جاؤ۔ میرے دل میں داخل ہو جاؤ۔ اور اپنے محبت کرنے والے دوست سے موت قبول کرو۔

یکبارگی کیمنکار دونوں ہاتھ بلند کر کے زنجیریں سپریا کے سر پر ملتا ہے۔ سپریا گر جاتا ہے۔

کیمنکار۔ (اپنے دوست کی لاش سے ہم آغوش ہو کر) بلا لو اپنے جلاد کو اب۔

راجہ۔ (اٹھکر) کہاں ہے میری تلوار؟

مالنی۔ معاف کرو کیمنکار کو پتا جی!

(ٹاگور) عابد

صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر

محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

اقبال

دُنیا کے دسؔ بڑے آدمی[1]

(مصر کے مشہور اہلِ قلم استاذ سلامہ موسیٰ کی نظر میں)

ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بڑے آدمیوں کی تعداد دس سے زیادہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دس سے کم ہو مگر اس وقت ہم نے اپنا موضوع دنیا کے دس بڑے آدمی مقرر کر لیا ہے۔

اخبارات اور وسائل رسل و رسائل کی فراوانی کی وجہ سے دنیا آجکل گویا سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ قاہرہ میں بیٹھے ہمیں روزانہ دنیا بھر کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اور ان کو روز روز پڑھتے پڑھتے دنیا بھر سے ہمکو ایسی دلچسپی ہو گئی ہے کہ معمورۂ عالم کے دور دراز گوشوں میں رونما ہونے والے واقعات بھی ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ہمارے شہر میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اور ان کے متعلق مسلسل بحث و مباحثہ سے ہمیں وہم سا ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا ہمارا وطن ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ اب وطنیت کے حدود روز بروز وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف اخبارات اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت مختلف قوموں کے وطنی اور مذہبی تعصبات کو کم کرتی جا رہی ہے تو دوسری طرف جمعیۃ الاقوام (لیگ آف نیشنز) اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ ساری دنیا کو ایک نظام میں منسلک کر دے

انگلستان سے ہمارے تعلقات کی ناخوشگواری ہم میں وطنیت کے جذبے کو ترقی دے رہی ہے یہ جذبہ ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھنے کی راہ میں حائل ہے پھر بھی دنیا کو ایک نظام کے ماتحت لانے اور تعصبات کو دور کرنے کے سلسلے میں جو جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشرق و مغرب کا بُعد گھٹتا جا رہا ہے اور ان کی مغایرت دور ہو رہی ہے۔ مشرق اپنی مشرقیت کھو رہا ہے اور مغرب، مشرق اور مشرقیت کا احترام کر رہا ہے۔ ایشیا میں مغربی معاشرت اختیار کی جا رہی ہے اور یورپ میں ہندی تصوف اور مشرقی مذاہب کا درس دیا جا رہا ہے۔

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عنقریب ساری دنیا کا تمدن ایک ہوگا۔ اور تمام قوموں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی تحریک یقیناً کامیاب ہوگی۔ تمام قومیں ملکر دنیا کی ترقی اور بھلائی کے لئے جدوجہد کرینگی۔ خود غرضیاں ناپید ہو جائینگی۔ اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ اور ایک متحدہ نظامِ سلطنت کے ماتحت دنیا میں امن و امان کا دَور دورہ ہوگا۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اس ہمہ گیر اتحاد کا پرچار کر رہے ہیں۔ اور دنیا بھر میں ایک تمدن اور ایک تہذیب رائج کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً یہی لوگ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں موجودہ دنیا کی عظیم شخصیتیں اور "بڑے آدمی" کہا جائے۔ اس لحاظ سے میرے خیال میں آجکل دنیا کے دس بڑے آدمی کہلانے کے حقیقی مستحق مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔

۱۔ ویلز

انگلستان کے اس مشہور انشا پرداز نے اپنی ذات کو صرف انگلستان کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ دنیا کو "ہمارا بڑا گاؤں" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برطانیہ عظمیٰ ایک سیاسی دور کی حیثیت رکھتی ہے جو جلد ہی ختم ہو جائیگا اور یہ سلطنت جمعیۃ الاقوام کی عالمگیر حکومت میں ختم ہو جائیگی۔ ویلز نے تقریباً چالیس کتابیں لکھی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں یہی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔

ویلز عوام میں یا کم سے کم روشن خیال طبقے میں سابقہ مذہبی عقائد کے خلاف ایک نیا عقیدہ پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کی نظر صرف مستقبل پر ہے وہ صرف آنیوالی نسلوں کے متعلق غور و فکر کرتا ہے اور اس کی جولانگاہ صرف یہی دنیا ہے۔ جس میں وہ اور اس کے ہمجنس بستے ہیں۔ وہ عام خوشحالی اور عوام کو روزی کی طرف سے مطمئن بنا کر ان کے اخلاق بلند اور وسیع کرنے کی خاطر نسل کو محدود کرنے کا حامی ہے۔

---

[1] ہندوستان کے اہلِ قلم حضرات میں سے کوئی صاحب استاذ سلامہ کے مقرر کردہ معیارِ عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "دنیا کے دس بڑے آدمی" یا "ہندوستان کے پانچ بڑے آدمی" کی تخصیص کر سکیں اور ان پر اسی طرح مختصر مگر جامع روشنی ڈالیں تو ہم شکریہ کے ساتھ شائع کرینگے۔

وہ جن خیالات کا پرچار کرتا ہے نظاہراُن کا تعلق صرف مادیت سے نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ خدا کے وجود شخصی کا قائل ہے۔ اور اُس کی تعلیم میں روحانیت کا رنگ جھلکتا ہے جسکی وجہ سے وہ بیحد سرعت سے مقبول ہو رہی ہے۔

۲۔ مہاتما گاندھی

مہاتما جی دنیا کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے ملک کو پریم بھاؤ کے ذریعے آزاد کرانے کی جد وجہد شروع کی۔ ان کی یہ پُرامن جنگ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے باعث نجات ثابت ہوگی۔ اور مستقبل میں ہمیشہ اُن کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کی جائیگی۔ ہندوستانیوں نے اُن کو بجا طور پر "روح اکبر" (مہاتما۔ مہا آتما) کا خطاب دے رکھا ہے۔ اور وہ قطعی طور پر اس کے مستحق ہیں۔ انہوں نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی سادہ گزران کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔

وہ شخص جس کے سامنے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی جبین عقیدت جھک جاتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پورے آشرم کی غلاظت صاف کر لینا عار نہیں سمجھتا وہ شخص جو ہندوستان کے دل ودماغ پر حکومت کرتا ہے صرف اس لئے اپنے ہاتھ سے چرخہ کاتتا ہے کہ اپنے ملک کے لئے کپڑے کا ایک ٹکڑا مہیا کر کے اسے غیر ملکی برآمد سے مستغنی بنا سکے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی حالتِ زار کے احساس نے اُن میں مغربی استعمار کے مقابلے کی ایسی غیر محدود طاقت پیدا کر دی ہے کہ اس کو دنیا کی طاقت فنا نہیں کر سکتی۔

ہم اُن کے جوش عمل اور اس نفس کشی پر غور کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے اور ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی بنی نوع انسان کی خدمت ہی حقیقی عظمت اور سچی بڑائی ہے۔

مہاتما جی اپنی انتہائی سادگی اور انتہائی کسر نفسی کے باوجود کوئی جاہل آدمی نہیں ہیں بلکہ اُن کا مطالعہ اسقدر وسیع ہے اور اُنکی ثقافت (کلچر) اسقدر بڑھی ہوئی ہے کہ اُن کے پایہ کی شخصیتیں انگلیوں پر بھی نہیں گنی جا سکتیں۔ وہ اپنے آشرم کی نگرانی اور ملک کی سیاسی مشغولیتوں کے باوجود دو اخبار ایڈٹ کرتے ہیں جن کا اکثر حصہ خود اُن کے قلم کا ہوتا ہے۔

وہ پریم کا پرچار کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک افراد کے مجموعے کو قوم بنانے والی اور سب کو ایک رشتے میں منسلک کرنے والی چیز صرف محبت اور صرف پریم ہے۔

اُن کا خیال ہے کہ ہر قوم اُسی قدر آزادی کی حقدار ہے جتنا اس کی آزادی سے دنیا کو فائدہ پہنچ سکے۔

۳۔ مسز بسینٹ

مسز بسینٹ کو جاننے کے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ ایک انگریز عورت ہے۔ جس کو انگریزوں نے اس جرم میں قید اور نظر بند کر رکھا تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنا ملک آزاد کرانے کے لئے برانگیختہ کرتی ہے۔

مسز بسینٹ ہی نے مغرب کو ہندوستان کی قدیم ثقافت سے روشناس کرایا۔ اور یورپ کے جوش مادیت کے کم کرنے کا باعث ہوئیں۔ اب مسز موصوفہ کی صوفیہ مشرق اور مغرب میں محبت اور رواداری کی روح پیدا کر رہی ہے جو ایک دن دنیا سے مذہبی تعصبات کا خاتمہ کر کے رہیگی۔

۴۔ فورڈ

فورڈ کی زندگی اور اُس کا عمل دونوں ہی مہاتما گاندھی اور مسز بسینٹ کے عقائد کے خلاف ہیں۔ مہاتما جی آلات اور کلوں کے رواج کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور خالص صنعتی تمدن سے دنیا کی فلاح وبہبود کی توقع نہیں رکھتے۔ انہوں نے صنعت کے سلسلے میں اپنے ہاتھ سے چلنے والے چرخے پر قناعت کر لی ہے۔ مسز بسینٹ نے مادیات سے قطع نظر کر کے اپنی ساری توجہ روحانیات کی طرف مبذول کر رکھی ہے۔ مگر اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مستقبل کا تمدن صنعتی ہوگا اور اس کی بنیاد کلوں اور آلات پر قائم ہوگی۔

اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے کہ فورڈ مستقبل کے صنعتی تمدن کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہے اور لوہے اور آگ کو انسان کے اعضا وجوارح کا قائم مقام بنانا چاہتا ہے تو اس کی عظمت آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگی۔

اس کا یہ عقیدہ بالکل حق ہے کہ جسمانی جدوجہد سے آزاد ہو کر

مطمئن زندگی حاصل کرنے کے بعد ہی انسان علوم وفنون حاصل کرسکتا ہے۔ اور کامل طور پر تہذیبِ نفس بھی اُسی وقت ممکن ہے جب عوام میں تعلیم پاکیزگی اور خوشحالی عام ہو اور یہ تمام چیزیں اسی وقت حاصل ہوسکتی ہیں کہ ان کے لئے وقت اور فرصت ملے اور جن کاموں میں ہماری زندگیاں ضائع ہو رہی ہیں انہیں کلیں انجام دیں۔

فورڈ ہم کو مستقبل کے صنعتی تمدن سے روشناس کرا رہا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ ویلز۔ گاندھی اور مسز بسینٹ کے مقاصد کی تکمیل فورڈ کی اسی جدوجہد میں مضمر ہے۔

۵۔ مصطفیٰ کمال

میں مصطفیٰ کمال کو اُن کی وطن پرستی کی وجہ سے بڑا آدمی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وطن پرستی اور حب وطن میں لارڈ گرے مسٹر لائڈ جارج اور مسیو پوانکار اُن سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے وطن کی انتہائی خدمت کی ہے لیکن ان کی وطن دوستی سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ وہ اپنے ملک کے لئے جسقدر مفید بنے اسی قدر دوسرے ممالک کے لئے باعث مصیبت ثابت ہوئے۔

مصطفےٰ کمال کی عظمت کا میں اس لئے قائل ہوں کہ انہوں نے دنیا بھر میں ایک تمدن رائج ہونے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ مشرق ومغرب کے امتیازات وخصوصیات سے آنکھیں بند کرکے اور تعصبات سے بالا ہوکر مشرقی اور مغربی تمدن کا مطالعہ کرکے فیصلہ کرلیا۔ کہ مغربی تمدن ہی میں عالمگیر تمدن ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور دنیا میں امن وامان اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا اسی رنگ میں رنگ جائے اور مشرق ومغرب کا بُعد کم ہو۔

مصطفےٰ کمال کی جرأت اور ترکی کے یورپی تمدن اختیار کرلینے کی وجہ سے دوسرے مشرقی ممالک میں بھی رواداری کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ اور مشرق موجودہ دَور کے مناسب ترین تمدن میں داخل ہوکر مغرب کے قلب پر اپنی وقعت اور معقولیت کا سکہ جما رہا ہے۔ جس کے بغیر مشرق ومغرب کا اتحاد اور دنیا کا ایک متحدہ نظام کے ماتحت آنا غیر ممکن ہے۔

۶۔ میکسم گورکی

روس کے حالات پر لاعلمی کے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اُس کے متعلق لکھنے والوں میں کوئی صرف اس کا روشن پہلو پیش کرتا ہے اور کوئی صرف تاریک۔ پھر بھی میکسم گورکی کی شخصیت کا نمایاں نظر آنا اُس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

میکسم گورکی ادبیات روس کے اُس دور کی نمائندگی کر رہا ہے جو غریب طبقے کے احترام اور قدیم عقائد وتقالید کی مخالفت کے ساتھ ڈسٹووسکی سے شروع ہوکر روس کے گزشتہ انقلاب کا باعث ہوا جسکے متعلق ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ روس کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں۔

ہم میکسم گورکی کو اُس کی ذاتی حیثیت سے بڑا آدمی نہیں سمجھتے بلکہ اُسے اس حیثیت سے بڑا کہتے ہیں کہ وہ ڈسٹووسکی اینڈریف اور ٹالسٹائی جیسے روس کے ادیبوں کی نیابت کر رہا ہے۔ اُن روسی ادیبوں کو بھی ہم اِس لئے بڑا آدمی نہیں سمجھتے کہ وہ تباہ کن انقلاب کا باعث ہوئے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اور اُن کے اتباع میں میکسم گورکی نے انسان کو جائداد سے برتر قرار دیا۔

لارڈ مانسفیلڈ نے کہا تھا کہ "قوانین انسان کی حمایت کے لئے نہیں بنائے جاتے بلکہ جائداد اور ملکیت کی حفاظت کے لئے وضع کئے جاتے ہیں" لیکن روس کے ادیبوں نے اس نظریے کو غلط ثابت کرنے پر اپنی ساری کوشش صرف کردی۔ اُن کی سعی اس حد تک مشکور ہوئی کہ آج دنیا بھر میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا ایک نہ ختم ہونیوالا جذبہ پیدا ہوگیا ہے جس کا اثر اب یورپ اور امریکہ میں بھی صاف نظر آرہا ہے۔

انسان کے رتبے کو جائداد کے رتبے سے بالا وبرتر قرار دینا ایک ایسا اصول ہے جس سے مستقبل قریب میں ساری دنیا کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے استعماریت کی روح فنا ہوجائیگی اور تجارتی منافرت کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔

میکسم گورکی نے انقلاب روس کی تحریک میں بہت کچھ کام کیا لیکن جب اُن برائیوں اور لغزشوں کو محسوس کیا جو اس سلسلے میں اُس سے سرزد ہوئی تھیں تو نادم ہوکر گمراہ کن سیاسیات سے کنارہ کش ہوگیا اور اس نے اقرار کیا کہ اس اندھا دھند انقلاب کی ذمہ داری اُن انشاپردازوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے ملک میں ایک خاص قسم کا انقلابی لٹریچر رائج کیا۔

لیکن روس کا انقلاب خواہ کسی قدر مہلک ہو اور اُس تحریک

ہیں حصہ لینے والے خواہ کتنے ہی بڑے مجرم قرار دئے جائیں اسمیں
شک نہیں کہ روس نے جانداد پر انسان کی برتری کا جو اصول رائج
کیا ہے وہ ایک زریں اصول ہے اور مستقبل میں اس کے ذریعے
ساری دنیا کی فلاح وبہبود کی توقع ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے
روسی ادب کو جو بین الاقوامی کشمکش کو دور کرنا چاہتا ہے بین الاقوامی
ادب کہنا بیجا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو موجودہ وقت میں
اس ادب کے سب سے بڑے پرچارک میکسم گورکی کو دنیا کے
بڑے آدمیوں میں شمار کرنا بالکل بجا و درست ہوگا۔

۷۔ مادام کوری

میں اس کی عظمت کا اس لئے قائل نہیں ہوں کہ وہ اپنے انکشاف
اور دریافت میں تمام علما سے فائق ہے کیونکہ علما میں اس سے زیادہ
ذکی اور علمی حیثیت سے ریڈیم سے زیادہ اہم نظریے کے منکشف
موجود ہیں۔ مگر میرا موضوع صرف اس قسم کی عظمت ہے جو تمام دنیا کی
فلاح کا باعث ہو۔ بیشک آئینسٹین یہ مادام کوری سے [illegible] کی
ہے۔ اور اس کا نظریہ علمی دنیا کے لئے ریڈیم سے زیادہ جاذب
توجہ ہے۔ لیکن مستقبل کے تمدن کو جو فائدہ ریڈیم سے پہنچ سکتا ہے
وہ آئینسٹین کے نظریے سے نہیں پہنچ سکتا۔

تمام دنیا میں حتیٰ کہ یورپ میں بھی عورتیں مردوں کی قید میں ہیں
اور اُن کو اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کرنی پڑتی ہے جس سے مرد
خوش ہوں مگر یورپ کی چند عورتوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ علم و
فضل کے میدان میں کسیطرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔ اُن عورتوں
میں سب سے بڑی شخصیت مادام کوری ہی کی ہے۔

ماضی وحال کے تمدن کے متعلق ہر غور کرنے والا اعتراف
کرے گا کہ یہ مردوں کا تمدن ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اس
تمدن کو مثالی (IDEAL) تمدن نہیں کہا جاسکتا۔ مادام کوری
کی جدوجہد دنیا میں ایسے تمدن کی بنیاد ڈال رہی ہے جس میں عورت
مرد برابر کے شریک ہوں اور اسے مثالی تمدن کہا جاسکے۔

۸۔ فرائڈ

فرائڈ کا نظریہ عقل باطن اب کافی شہرت پاچکا ہے اور تسلیم کیا
جاچکا ہے کہ اس وقت نفسیات میں فرائڈ کا مرتبہ علم ہیئت میں کلیلو
اور ارتقا میں ڈارون کے رتبے سے کسیطرح کم نہیں ہے۔ مستقبل
قریب میں تربیت اور جرائم کے انسداد میں اس نظریے سے جو توقعات
وابستہ ہیں اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہونے لگے ہیں۔

نظریۂ عقل باطن اسقدر سادہ اور بسیط نظریہ ہے کہ اس کے
مطالعے کے وقت ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نفس کی
حقیقت ہم پر واضح ہوتی جارہی ہے۔ اور اس پر ہمیں تعجب ہوتا ہے
کہ ایسے واضح حقائق کا علم ہمیں پہلے سے کیوں نہ ہوا۔

فرائڈ نے ایک ایسے علم۔ بلکہ فن۔ کا افتتاح کیا ہے جس کو
آئندہ نسلیں اپنے تمدن کی ترقی اور اخلاقی بلندی کے لئے استعمال
کرینگی۔ اس لحاظ سے فرائڈ کی عظمت فورڈ کی عظمت جیسی ہے
کیونکہ فورڈ مستقبل میں انسان کے ضعیف کندھوں کو عمل اور
جدوجہد کی مشقت سے آزاد کرکے اس کا کام کلوں اور انجنوں
کے سپرد کرنے کی سبیل نکال رہا ہے۔ اور فرائڈ مستقبل میں انسان
کے لئے صحیح تربیت اور بلندیٔ اخلاق کے طریقے بہم پہنچا رہا ہے

۹۔ برنارڈ شا

برنارڈ شا کو کون نہیں جانتا؟ اپنی ذات کا اعلان کرنے میں دنیا
میں اس سے بڑا ماہر کون ہے۔ کاش اس میں وہ نقص نہ ہوتا جو کبھی
کبھی اُس کے ادب پر غالب آجاتا ہے اور اُس کے قلم سے اُن چیزوں
کی تعریف کرا دیتا ہے جنکو وہ بُرا اور مکروہ سمجھتا ہے۔ قوت اور استبدادی
حکومت برنارڈ شا کے نزدیک تمدن اور اخلاق کے منافی ہے
پھر بھی اُس نے بعض مواقع پر روزویلٹ اور مسولینی جیسے اقتدار پسند
لوگوں کی تعریف کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی شہنشاہیت
کی طرف ایسا مائل نظر آتا ہے کہ اُس کو ان لوگوں میں شمار کرنا مشکل
ہوجاتا ہے جو دنیا کی فلاح وبہبود کے لئے کام کررہے ہیں۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود برنارڈ شا کی نظر عام طور پر وسیع
ہے اور وہ دنیا میں امن وامان قائم کرنے کے سلسلے میں بہت
بڑا کام کررہا ہے۔ اُس نے جرأت کے ساتھ بالشوزم کا خیرمقدم
کیا اور اُس کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے
تصنیف وتالیف میں عوام کی زبان کو ترجیح دی عورتوں اور مزدوروں
کے حقوق کی حمایت کی اور اُن کے لئے اپنے بلند اور نرم لہجے
میں اسقدر پروپیگنڈا کیا کہ ساری دنیا اس سے متاثر ہوگئی۔

۱۰- ٹیگور

ٹیگور مشرق و مغرب کے اتحاد کی بنیاد علم و ادب پر رکھنا چاہتا ہے - اور اس اعتبار سے وہ بین الاقوامی ادیب ہے - اسکی تصانیف انگلستان - فرانس - جرمنی - امریکہ وغیرہ میں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں - اُس نے اپنے نکھرے ہوئے اور ترقی یافتہ ادب کے ذریعے مغرب والوں کی نظر میں مشرق کی اور خصوصاً ہندوستان کی وقعت بڑھا دی ہے - اس نے ثابت کر دیا ہے کہ مشرقی دماغ بھی قابل احترام ہے - اور مشرق میں علم و ادب کا پرچار ہو اور کابوس استعمار سے اسے نجات ملے تو وہ بھی دنیا کو علم و ادب سے مالامال کر کے محبت اور پریم کے رشتے میں منسلک کر سکتا ہے -

ٹیگور کی تقریباً تمام تصانیف کا مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے - جن میں ٹیگور نے قدیم ہندی تصوف کو زمانے کے مطابق نئے قالب میں ڈھالکر اپنے ملک اور مشرقی فلسفے کی عظمت و بزرگی کا سکہ بٹھا دیا ہے - اس کی وجہ سے اہل مغرب کے ذہن سے مشرق کے انحطاط اور اخلاقی پستی کی وہ داستان محو ہوتی جا رہی ہے جو مغرب کے خود غرض مستعمرین نے مشرق کے متعلق گھڑی تھی -

گویا ٹیگور مشرق و مغرب کے اتحاد اور ایک عالمگیر تمدن رائج کرنے کے لئے علمی و ادبی ذرائع سے وہی کام لے رہا ہے جو مسز بیسنٹ دین اور تصوف سے لے رہی ہے - اور گویا وہ بھی ویلز کی طرح دنیا کو "ہمارا بڑا اکائی" کہتا ہے -

---

ہمارے خیال میں یہی دس آدمی قصداً یا بلا قصد بین الاقوامی اتحاد ایک عالمگیر نظام حکومت اور دنیا بھر میں یکساں تہذیب و تمدن رائج کرنے کے سلسلے میں علمی - ادبی فلسفی یا صنعتی ذرائع سے دنیا کی حقیقی خدمت کر رہے ہیں - "وسید القوم خادمہم"۔

(الہلال - مصر)　　　"تاجور"

"دھوکا"

میرے اکثر دوست میری اس عادت سے واقف ہیں کہ میں روزمرہ پیش آنے والے معموں کو حل کرنے کا بیحد شائق ہوں کچھ لوگ اس سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ ایک بڑا عیب ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں کے پھٹے میں پاؤں ڈالتا پھرتا ہوں - کچھ میرا مذاق اڑاتے ہیں - لیکن مجھ پر نہ تو اس تضحیک کا کچھ اثر ہوتا ہے اور نہ اُس فتوے کا -

میں ایک ضعیف آدمی ہوں اور بڑھاپے کے محدود خدا داد اوصاف میں خود رائی بھی مجھے عطا ہوئی ہے - میرے لئے ایک ایسی عادت جس سے وقت کٹے باعث دلچسپی ہے - شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے کئی ایسے معموں میں فوق العادت ذہانت کا اظہار کیا جو بادی النظر میں بہت ہی زیادہ الجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر آخر بالکل صحیح حل ہو گئے -

اس کا اعتراف میرے سخت ترین دشمنوں نے بھی کیا - یہ میرا عقیدہ ہے کہ جب کبھی انہیں کوئی پریشان کن مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ اسے لیکر میرے پاس آتے ہیں کہ دیکھیں میں کیا کر سکتا ہوں - لیکن پادری سینٹ جان اردڈی نے کبھی میرا مضحکہ نہیں اڑایا - انہوں نے کبھی بھی کسی شخص یا کسی چیز کو حقارت سے نہیں دیکھا - ان کا عہدہ ایک بزرگ عہدہ ہے - اور وہ خود بھی بیحد سنجیدہ واقع ہوئے ہیں - لوگ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ ان کی نظر وسیع نہیں ہے بلکہ کچھ مجنونانہ ہے - لیکن مجھے اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں - میں پادری صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں اور ان سے پیشتر ان کے والد بزرگوار سے بھی میری ملاقات تھی -

ایک دن صبح کے سات بجے میرے نوکر نے اطلاع دی کہ مسٹر اردڈی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں - مجھے اس وقت اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ وہ میرے لئے ایک دلچسپ معمہ لائے ہونگے - مجھے گمان ہوا شاید وہ اپنے معمول کے مطابق چندہ وصول کرنے آئے ہیں -

میں گیبری کو جلدی جلدی طے کر کے ملاقات کے کمرے میں جھنجھلاتا ہوا جا پہنچا - مسٹر اردڈی سے میرا یہ سوال "کیا میں آپ کی

خدمت کرسکتا ہوں؟" بالکل بے معنی تھا کیونکہ میرا ارادہ قطعی امداد کا نہ تھا۔

وہ دیکھنے میں بظاہر برے نہیں ہیں۔ صادق القول اور مستقل مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بکمال متانت گویا ہوئے۔

"مسٹر فش! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "افسوس میرے پاس روپے کی کمی ہے اور...."

اسپر بولے "آپ غلط سمجھے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے خیراتی کام جن کو میں نے اختیار کر رکھا ہے روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یونہی پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اس وقت میں آپ کو اس معاملے کے لئے زحمت دینے کو حاضر نہیں ہوا ہوں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ مجھکو اتفاق سے ایک ایسا معمہ مل گیا ہے جس میں کوئی خاص راز معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس معاملے میں آپ میری کچھ مدد فرماسکیں۔"

اب تو گفتگو کا رنگ ہی بدل گیا۔ میں واقعات سننے کیلئے بیحد بیچین تھا انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ دنوں سے ایلڈیبرگ میں رہتا ہوں۔ زیادہ کام کرنے سے میرے اعصاب پر برا اثر ہوا۔ ڈاکٹر نے رائے دی ہے کہ کچھ آرام کروں اور اس کے ساتھ تبدیل آب و ہوا بھی۔ کل صبح کے وقت میں قصبے کے باہر گھوم رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میری نگاہ اتفاق سے اوس پڑے ہوئے سبز کاغذ پر پڑی۔ اس کی تحریر سے میں بہت متاثر ہوا۔"

انہوں نے اپنی نوٹ بک میں سے سبز کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اس پر یہ الفاظ تحریر تھے۔

"نقاب سے کام لو"

تحریر کسی مرد کی معلوم ہوتی تھی اور غالباً تعلیم یافتہ مرد کی۔ میں نے دریافت کیا "اچھا اس کے علاوہ آپ کو اور کیا ملا"، انہوں نے کہا "میں اسوقت قصبے کی طرف واپس آرہا تھا۔ وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ صرف ایک اور ایسا ہی سبز کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ جو کچھ فاصلے پر جھاڑی میں تھا۔

پادری صاحب نے دوسرا پرزہ بھی نکالکر مجھے دیا۔

اس میں تحریر تھا "ان کے برہم ہونے کی قطعی پروا نہ کرو۔"

مسٹر ارڈی نے کہا "مسٹر فش میں آپ کی ذہانت پر پیش دستی نہیں کرسکتا۔ صرف اپنی رائے کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ یہ کہ غالباً کسی بیچاری لڑکی کو پھسلا کر اس کے والدین کی خواہش کے خلاف گرجے میں داخل کیا جارہا ہے۔ اس وجہ سے وہ ضرور برہم ہونگے۔ تعجب یہ ہے کہ آجکل بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ اس لئے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو اس کو بچاؤں لیکن نہ تو مجھے لڑکی کا نام معلوم ہے اور نہ اس پادری کا جس نے یہ تحریر لکھی ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ مسٹر فش! کیا آپ مجھے ان باتوں کا پتہ لگانے میں مدد دے سکیں گے؟ کیونکہ آپ کو اپنی غیر معروف قابلیت کو عملی جامہ پہنانے کا اس وقت خوب موقع ہے۔"

میں نے کہا "دیکھئے جو کچھ کرسکتا ہوں وہ ضرور کروں گا"

یہ کہکر میں نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی۔ جواب میں معلوم ہوا، شمال مشرقی ہوا چلتی تھی۔ اور آج بھی یہی چل رہی ہے۔ اس کے بعد اپنے ملاقاتی سے میں نے کہا "یہ تو ایک حد تک قابل اطمینان ہے"

مسٹر ارڈی نے پوچھا "کیوں؟"

میں نے کہا اس لئے کہ اس قسم کے دوسرے پرزے خشکی میں رہ گئے ہوں گے اور سمندر میں نہیں گئے ہوں گے۔ اس لئے ان کا ملنا ممکن ہے۔ ذرا توقف اور صبر سے سب کام بنجاتے ہیں۔ مجھکو اسی وقت ایلڈیبرگ جانا چاہئے۔ امید ہے کہ ایک ہفتے کے اندر آپ کو یقیناً واقعات کا علم ہوجائے گا۔ اور پھر آپ مناسب تدابیر اختیار کرسکیں گے۔"

مسٹر ارڈی نے ایک نہایت عقلمندی یہ کی تھی کہ اس جگہ کا بہت صحیح اور صاف خاکہ کھینچ لیا تھا جہاں انہیں سبز کاغذ کے پرزے ملے تھے۔

انہوں نے دریافت کیا "کیا آپ واقعی ایلڈیبرگ جائیں گے اور وہاں کچھ دنوں صرف اس لئے ٹھہریں گے کہ ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کریں۔ جس کا نام تک آپ کو معلوم نہیں ہے۔

مسٹر فش! بیشک یہ کام آپ کے لئے طرۂ امتیاز ہوگا۔

میں نے کہا "لیکن جناب میں تو وہاں اس لئے جارہا ہوں کہ ایک معمہ حل کروں جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ مجھے وقت کاٹنا مشکل ہورہا تھا۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے میرا دلچسپ مشغلہ مہیا کردیا۔

(۲)

میں دوپہر کے بعد ایلڈیبرگ پہنچ گیا۔ ہوٹل میں ایک کمرہ لیکر اسباب چھوڑدیا۔ اور فوراً مسٹر ارڈی کی بتائی ہوئی جگہ پر جا پہنچا۔ مجھے ان کے خاکے سے بہت مدد ملی۔ اگرچہ مجھے وہاں سبز کاغذ کا کوئی

ٹکڑا نظر نہیں آیا لیکن ایک اور چیز مل گئی جس کو میں نے زیادہ کار آمد خیال کیا یعنی ایک اسکاؤٹ (Scout) لڑکا بیٹھا ہوا نقشہ بنا رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا" کیوں بھئی کیا تم اسکاؤٹ ہو"

لڑکے نے مشتبہ لہجے میں کہا" جی ہاں" اس کا مشکوک ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ اُسے مخاطب کرنے کا بظاہر کوئی معقول سبب نہ تھا۔

میں نے کہا" یہ بہت اچھا ہے۔ میں نے اسکاؤٹوں کی بابت سنا ہے کہ وہ لوگ ہر بات سے کافی دلچسپی لیتے ہیں اور نہایت جفاکش بھی ہوتے ہیں"

اس نے میرے قول کی تصدیق کی۔

میں نے کہا اچھا! دلچسپی کے اندازہ لگانے کے لئے لاؤ ذرا تمہارا امتحان تو لوں۔ تم نے سب سے آخری مرتبہ سبز کاغذ کے ٹکڑے کہاں اور کب دیکھے۔

اس نے کہا" پرسوں دوپہر کو ۲ بجے اسی جگہ جہاں اس وقت میں ہوں"

میں نے کہا" بالکل درست ہے۔ تم عقلمند معلوم ہوتے ہو۔ اچھا یہ تو بتلاؤ ان ٹکڑوں پر کیا لکھا تھا"

"وہ کسی خط کے پرزے تھے۔ میں دوسروں کے خط پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ کیا مجھ کو ایسا کرنا چاہیئے؟"

میرا سوال ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا" کبھی نہیں۔ میں بھی کبھی کسی کا خط نہیں پڑھتا۔ لیکن یہ ایک مستثنیٰ روداد ہے۔ ان پرزوں کے پتہ لگنے پر ایک لڑکی کی سلامتی کا دارومدار ہے"

لڑکے نے کہا" مجھے دھوکے سے سخت نفرت ہے"

"تم ضرور اس کو دھوکا ہی سمجھو گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہاں اس معاملے میں ایک پادری صاحب پیٹی من ارڈی کی خاطر کام کر رہا ہوں یہ لو ان کا کارڈ ہے۔ اور یہ ایک خاکہ ہے جس سے تم کو معلوم ہو جائیگا کہ کاغذ کے ٹکڑے کس جگہ ملے تھے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتلا سکتا ہوں۔ لیکن میں نے اس بات کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ یہ دھوکا نہیں ہے بلکہ اس کی اصلیت ثابت ہے۔

لڑکے نے کہا" ہم کو ذرا خاکہ غور سے دیکھنا چاہیئے" اس نے نہایت متانت سے اُسے دیکھا پھر کہنے لگا" اچھی بات ہے۔ اگر مجھے ٹکڑے مل سکے تو میں ضرور آپ کو دیدونگا۔

میں نے کہا" تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ ہوا کا رُخ ۔۔۔۔"

"جناب مجھے سب معلوم ہے۔ میں خیال رکھوں گا موسم خشک ہے، اور گھاس بھی چھوٹی چھوٹی ہے۔ وہ ٹکڑے زیادہ دور نہیں گئے ہونگے میں حتی الامکان کوشش کرونگا اور انہیں ضرور لاؤں گا" میں نے اُسے اپنا نام اور ہوٹل کا پتہ بتلایا۔ اور یہ بھی کہدیا کہ میرا قیام وہاں دو تین روز تک رہے گا"

لڑکے نے کہا" میں کل صبح یہاں نہیں رہوں گا۔ لیکن میں ایک مرتبہ تو ابھی تلاش کر دوں اور پھر کل سہ پہر کو۔ اگر پھر بھی نہ ملا تو میں اس کا خیال چھوڑ دونگا"

میں نے کہا" بھائی اس کا خیال چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ بلکہ کوشش کرنا، پھر کوشش کرنا اور پھر کوشش کرنا۔ تم کو اسکاٹ لینڈ کے کا حال معلوم ہے"

لڑکے نے کہا" جی ہاں۔ لیکن مجھے صرف یہی ایک کام نہیں ہے اگر میں انہیں نہ پا سکا تو پھر آپ کو تلاش کرنے میں کیا دقت ہو سکتی ہے"

لڑکے کا طرز کلام بظاہر مہذب تھا لیکن وہ کچھ پریشان معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی چہرے سے بہادری اور جفاکشی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اس میں تجسس کا مادہ پیدا کر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر اسے کوئی بھی سبز کاغذ ملا تو وہ فوراً فاتحانہ انداز میں میرے پاس لے آئیگا۔

(۳)

دوسرے دن صبح کو میں خود اس کی تلاش میں بے سود پھرا۔ شام کو کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ ایک لڑکا مجھ سے ملنے کا خواہشمند ہے۔ میں نے اپنے نوجوان دوست کو ہال میں پایا۔ لڑکے نے کہا" مجھے سبز کاغذ کے تین ٹکڑے ملے ہیں۔ جہاں آپ کل انہیں تلاش کر رہے تھے وہاں سے وہ ۴۰۳۰ گز کے فاصلے پر تھے۔ اور سمت بھی مختلف تھی"

میں نے کہا" شاباش۔ لاؤ دیکھیں ان پرچوں میں کیا لکھا ہے"

اس نے مجھے وہ سب یکے بعد دیگرے دیدیئے۔ پہلے ٹکڑے پر یہ الفاظ تھے۔

"تم کو بھروسہ کرنا چاہیئے"

یہ پرچے پچھلے پرچوں سے پوری مناسبت رکھتے تھے۔ لیکن ان سے کوئی نیا انکشاف نہیں ہوا۔ بہر حال دوسرا ٹکڑا بہت چھوٹا تھا اس پر صرف لفظ "دھواں" مرقوم تھا۔

اس کو دیکھتے ہی میرا ذہن (خوشبودار چیزوں کی) دھونی کی طرف منتقل ہوا۔

تیسرا ٹکڑا سب سے بڑا تھا اور اس پر ایک پورا جملہ درج تھا۔ تقریباً ایک منٹ تک میں اس کو بار بار دھراتا رہا آخر مجھکو اس میں کامیابی کی جھلک نظر آئی اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔ جس سے لڑکا بہت متعجب ہوا۔

میں نے کہا "بس اب سب معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ تمہیں اب مزید تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اسے جنجر بیر (Ginger Beer) کا گلاس دیا جسے اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔ اور اس اثناء میں جبکہ وہ اُسے پی رہا تھا میں نے اس کو پورا قصہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد میں نے اُسے دو گنیاں دیں جسے اُس نے کچھ انکار کے بعد یہ کہتے ہوئے لے لیا کہ اس نے یہ کام روپے کی طمع سے نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم نے میری جو مدد کی ہے اس کی قیمت میرے نزدیک اس سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ اس کا بدلہ ناممکن ہے۔" میں نے اسی وقت مسٹر ارڈی کو تار دیا کہ اسٹیشن پر ملیں اور یہ بھی لکھ دیا کہ راز معلوم ہو گیا۔

(۴)

وہ مجھے پلیٹ فارم پر بے چینی سے چہل قدمی کرتے ہوئے ملے۔ اور انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا "مسٹر فش! سب سے پہلے لڑکی کا نام بتلاؤ۔"

"اس معمے میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

"ضرور ہو گی۔ غالباً آپ نقاب کے حوالے کو بھول گئے۔ یاد آیا؟"

"جی نہیں میں نے سبز کاغذ کے تین ٹکڑے پائے ہیں۔ اور میں آپ کو پہلے صرف دو دکھلاؤں گا۔"

چنانچہ میں نے انہیں وہ دونوں دیدیئے۔

انہوں نے کہا "لیجئے دیکھئے میرا خیال بالکل صحیح نکلا۔ آپ ذرا الفاظ پر غور کیجئے۔ لڑکی کو اپنے والدین کے برہم ہونے کی قطعی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ اس کو پادری پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور نقاب سے کام لینا چاہیئے۔

لفظ دھوئیں سے کسی رومن اسم کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا ٹکڑا دکھلائیے۔"

"مسٹر ارڈی ذرا توقف کیجئے۔ میں آپکو ایک لطیفہ سناتا ہوں" ایک شخص نے ایک مکان لیا جس میں شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا کچھ عرصہ بعد اس نے شہد نکالنا چاہا۔ لیکن اُسے شہد نکالنے کا طریقہ نہیں معلوم تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا جو ان معاملات میں بہت تجربہ کار تھا۔ دوست نے جواب میں لکھا "نقاب سے چہرہ کو چھپا کر مکھیوں کو اڑا دو۔ دھوئیں پر بھروسہ کرو اور ان کے برہم ہونے کی پروا نہ کرو۔ شاید آپ کو علم ہو گا کہ شہد کی مکھیاں پالنے والے دھوکنی سے دھواں دیتے ہیں جس سے مکھیاں بھاگ جاتی ہیں۔ اور آپ کو اگر زیادہ ثبوت کی ضرورت ہے تو لیجئے یہ تیسرا ٹکڑا ہے جس پر لکھا ہے "اپنے پاجامے کے پائینچوں کو ٹخنے پر ڈوری سے مضبوط باندھ لو" یہ ایک بہترین تحفظ ہے۔ اس سے ٹانگیں مکھیوں سے بالکل محفوظ رہتی ہیں۔

مسٹر ارڈی نے کہا "مسٹر فش! آپ نے کمال کر دیا" میں نے دیکھا مسٹر ارڈی کا چہرہ پژمردہ ہو گیا تھا۔ فوراً خیال آیا اس بیچارے کے سارے منصوبے جو اس واقعے سے وابستہ تھے خاک میں مل گئے۔

(ترجمہ) شمشیر بہادر صمدی لکھنوی

گلاب کی پتیاں

(انگلستان کی مشہور افسانہ نویس مارجری لوَن کا ایک افسانہ)

(۱)

جیمز ڈوڈ ہر سرما میں سوچا کرتا کہ وہ اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ بہار میں اسے وقت کی تیز روانی کا احساس نہ ہوتا تھا، مگر سال کی ابتدا ہوتے ہی اسے یہ محسوس ہونا شروع ہو جاتا کہ پتوں اور پھولوں کے ساتھ وہ بھی کسی غیر معلوم قیامت یا انحطاط کی جستجو میں مرجھایا جا رہا ہے۔ اپنی عادت کے خلاف وہ اب مطالعے میں زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اس کی مشہور خوش اخلاقی میں اب ہلکی سی ریاکاری پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اپنی روز افزوں دولت، دیرینہ احباب کے جمگھٹوں، لندن کی شہرت اور اپنے ان خوشامدیوں سے کچھ حظ حاصل نہ ہوتا تھا جو اس نشستگاہ میں آ کر گرم آتشدان کے سامنے شراب نوشی کرتے تھے۔

اس سال ہوا بہت زیادہ سرد تھی۔ اور محل کی چھت پر لگے ہوئے "موسم نما" کو دائیں بائیں ہلاتی رہتی تھی۔ جیمز ڈوڈ کی دوکان کا سائن بورڈ "ٹیلی سیڈ" باہر کی طرف جھکا ہوا الگ سے نظر آتا تھا۔ کھڑکیوں میں سے قیمتی کتابوں کی عنبری، بادامی اور روغنی جلدیں خوبصورتی سے سجی ہوئی دکھائی دیا کرتی تھیں۔ باہر کی تاریکی مائل شفق اور سردی سے بچنے کے لئے محفوظ دوکان میں آگ کے سامنے ایک میز کے گرد فانوسِ شمع کے نیچے چند آدمی بیٹھے تھے۔

دوکان کے اندر بھی نئی، چمکدار اور تازہ چمڑے کی بُو والی جلدوں کی کتابیں قطار در قطار سجی ہوئی تھیں۔ منتشر اوراق اور نسخوں وغیرہ کے رکھنے کے لئے نہایت قیمتی جزدان کھلے ہوئے اپنے سرپرستوں کی خریداری کا انتظار کر رہے تھے۔

جیمز ڈوڈ فنونِ لطیفہ، شاعری اور بذلہ سنجی کا سطحی دلدادہ، چپ چاپ اپنی نشستگاہ میں آرام کرسی پر لیٹا رہا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف جیبوں میں کنجیاں اور بنکوں میں روپیہ موجود تھا تو دوسری طرف اس کی شہرت و ناموری حاصل تھی۔

سب لوگ اس کتب فروش کی عزت کرتے تھے مگر محبت نہ کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اپنی شفقت و محبت کے معاملے میں بہت محتاط تھا۔ اُس نے آج تک شادی نہ کی تھی اور سوائے ایک بھانجے کے اس کا کوئی رشتہ دار زندہ نہ تھا۔

گو جیمز نے کبھی اس بات کا اقرار نہ کیا تھا کہ وہ اپنے بھانجے سے محبت کرتا ہے، مگر ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو صرف اپنی بہن کے اس بیٹے سے۔

پھر بھی جیمز ڈوڈ اس سے ناراض تھا۔ لیکن اس ناراضگی کو ریاکاری کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ کیونکہ اسے یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ ایک شخص جس نے پچاس سال گوشۂ تنہائی میں جذباتِ انسانی سے بے پروا زندگی گزار دی ہو۔ اس عمر میں آ کر دنیا کی کسی چیز کے پیچھے پریشان ہو۔

وہ کرسی سے اٹھا گو وہ بہت ضعیف ہو گیا تھا۔ مگر تحکمانہ انداز اور اس کی شاہانہ خصلت ابتک باقی تھی جنہیں وہ مشفقانہ شان سے ادا کیا کرتا تھا، اور اپنی نشستگاہ کا دروازہ نہایت آہستہ سے کھول کر تنگ مگر گاہکوں سے پُر دوکان کی طرف دیکھا جس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی اور جو سالہا سال سے، فیشن خواہشات اور ذہانتوں کا مستقل مرکز رہی تھی۔

جیمز ڈوڈ نے ترش مگر پُرشوق نگاہوں سے اپنے بھانجے مروان کو دیکھنا شروع کیا۔ جس کا چہرہ زردی مائل، اور بال سنہری تھے۔ وہ ایک چاندی کا بکسوا لگائے ہوئے تھا۔——

وہ شمعدان کی روشنی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی کرنیں اس کی سیاہ ساٹن کی واسکٹ پر جس میں ریشم کے سفید پھول کڑھے ہوئے تھے، پڑ رہی تھیں۔

مروان کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ اور لیڈی میری لیجن سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ خاتون موصوفہ بھی کتابوں پر انگشت نمائی کر رہی تھیں اور جب دونوں کی نگاہیں دوچار ہوتی تھیں تو ہاتھ بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے…… اور بس یہی کافی تھا!

جیمز ڈوڈ ریاکارانہ مہربانی اور کسی پوشیدہ ارادے سے متاثر ہو کر ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

(۲)

جیمز ڈوڈ شاہانہ استغنا سے آگے بڑھا اور اپنی توجہ کو ہٹانے والی تمام کوششوں سے چشم پوشی کرتا ہوا سیدھا لیڈی میری کے پاس پہنچا جو منتشر اوراق کی مطبوعہ کتاب میں مستغرق اور مسٹر جیمز کی آمد سے بالکل بے خبر تھی۔

مسٹر جیمز نے ایک بوڑھے آدمی کی طرح نہایت پرتپاک سلام کیا۔ اور کہا کہ "آپ نے اشعار کی جس کتاب کا ذکر کیا تھا وہ حال ہی میں پیرس سے آگئی ہے اور میں اسے دکھا کر بہت خوش ــــــــ"

نوجوان مرواں نے فقرہ کو یوں پورا کیا۔

"مجھے معلوم نہ تھا ــــــــ میں ابھی یہ کتاب لاتا ہوں ــــــــ"

"نہیں نہیں ــــ ٹھہرو۔ میں لیڈی صاحبہ کو خود دکھانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ میرے غریب خانے تک چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔"

"بسر و چشم" خاتون نے کہا اور کتاب بند کر کے نہایت آہستہ سے زیر لب مسکرایا اور مرواں کی جانب دیکھا جو وہاں سے اُٹھ کر لوگوں کی بھیڑ میں جا ملا تھا اور اب تک اس کی طرف گھور رہا تھا گویا کمرہ میں بس ایک وہی ذی روح تھی۔

میری متحیر تھی (مرواں کے چہرے سے بھی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا) مگر میری نے اپنے چہرے سے اس تحیر کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور جیمز ڈوڈ کے پیچھے پیچھے اس خاموش اور گرم کمرے میں پہنچی جو روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میری نے پوچھا۔ مہربانِ من! وہ کتاب کہاں ہے!"

میری آتشدان کے سامنے کھڑی تھی ــــــ ایک بوڑھے گوشہ نشین کا آتشدان بھی کیا ہی عجیب نظارہ ہوتا ہے! یہ نظارہ ویسا ہی خوشنما تھا جیسا خاتون کے گلابی ساٹن کے ہیٹ میں چمکدار پروں کا گچھا جو سیاہ آنکھوں پر ڈھکی ہوئی تھیں اور اس کے بھاری کوٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نگاہیں خنداں اور بے غرض تھیں ــــــــ عمر ابھی بیس سے زیادہ نہ تھی۔

مگر جیمز ڈوڈ اس کے حُسن کو ہمیشہ رقیبانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔

جیمز ڈوڈ نے میری کو فرانسیسی اشعار کی وہ کتاب دکھائی جس کی جلد پر سنہری گلابوں کا ایک ہار چھپا ہوا تھا۔ جیمز ڈوڈ نے سنجیدگی سے کہا "میری اب میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں جو کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

میری اس اندازِ خطاب کی عادی نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کی آنکھوں سے جوش ٹپکنے لگا اور رخسارے تمتما اُٹھے۔ جیمز نے کہنا شروع کیا، "آپ تشریف رکھئے اور جو کچھ عرض کروں اسے تحمل کے ساتھ سنئے ــــــــ (مُسکرا کر) اب میں اس قدر بوڑھا ہو چکا ہوں کہ میری طرف سے مسابقت (دہل) ہونی مشکل ہے۔"

نوجوان خاتون یہ جملہ سن کر مدافعت کی فکر میں پڑ گئی۔ بوڑھا کتب فروش لڑکی کے چھوٹے سے گول مول چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بہت آہستہ سے بولا کہ "آپ کو مرواں سے محبت ہے۔"

میری کے جسم میں اس کو ایک جُھرجُھری دی مگر اس نے جلد قابو پا لیا۔

جیمز بولا کہ "مرواں کو بھی آپ سے محبت ہے"

لیڈی میری نے نہایت بردباری سے جواب دیا "تو کیا یہ جناب کو ناگوار معلوم ہوتا ہے؟"

"جی ہاں ــــ بہت ناگوار اتنا ناگوار کہ اس سے زیادہ کوئی چیز ناگوار نہیں معلوم ہوتی۔"

لڑکی نے اپنی پتلی پتلی نازک انگلیوں سے "گل پوش" کتاب کو پکڑا۔ سفید فیتوں کے نیچے نازک سینے نے اُبھر کر ٹھنڈا سانس بھرا اور چہرے پر ہیجانِ جذبات بپا ہوا مگر اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ "مسٹر جیمز آپ کی زبان سے یہ بات مجھے بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اس فقرے کا کچھ اندرونی مطلب ہے"

بوڑھا کتب فروش لڑکی کی اس معاملہ فہمی پر دل ہی دل میں خوش ہوا اور پوچھا کہ "کیا آپ کو مرواں سے کسی چیز کی امید ہے؟"

لڑکی اس سوال کو سن کر اس طرح مسکرائی۔

"جی ہاں، بعض اوقات کچھ امید ہوتی ہے۔"

"تو تشریف اور تحمل کے ساتھ میری گزارش سنئے۔"

میری اس کرسی پر بیٹھ گئی جو فیتوں سے ڈھکی ہوئی تھی ۔
جیمز ووڈ آگ کی طرف پشت کئے ہوئے کھڑا تھا اور میری کے ناقابلِ اختیار جوش کو غیر محبانہ انداز سے دیکھ رہے تھے ۔ اس نے میری کو مخاطب کیا " مرواؔن میرا بھانجہ ہے اور وارث بننے والا ہے ۔ لیکن اگر وہ بیوقوف نکلا اور محبت کے جھگڑوں بکھیڑوں میں پڑ گیا ——— تو مفلس و نادار ثابت ہوگا ۔"

(۲)

لڑکی کی سیاہ خوبصورت آنکھیں اس کی طرف دیکھ کر اس طرح دمکنے لگیں گویا وہ اس جملے کا مطلب ہی نہ سمجھی تھی جیمز ڈوڈ نے سلسلہ کلام جاری رکھا کہ " اگر مرواؔن کسی عورت سے شادی کریگا ، یا ایسی خواہش کریگا ، کسی عورت کا پیچھا کریگا یا کسی عورت کو اپنا پیچھا کرنے دیگا ، وہ عورت خواہ خادمہ ہو ، دوشیزہ ہو ، یا نواب زادی ، بہرحال وہ وراثت سے محروم کر دیا جائیگا ۔ اور چونکہ اس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی ہے اس لئے اپنی قوت بازو سے کچھ نہ کما سکیگا ۔"

میری نے متکبرانہ انداز میں سوال کیا ۔ " لیکن مسٹر ڈوڈ اس چیز کا مجھ سے کیا تعلق ہے ؟ "

ڈوڈ نے تعظیماً جھک کر کہا " جناب ! آپ کو چونکہ مرواؔن سے دلچسپی ہے ۔ اس لئے میں نے اسے یہ کہدیا ہے ——— علاوہ ازیں مرواؔن بھی آپ کا گرویدہ ہے ۔"

اس آخری جملے سے میری تو کسی قدر محجوب سی ہوگئی ۔ رخساروں پر رنگِ شباب دوڑ گیا اور سرنگوں ہوگئی مگر بہت کشمکش کے بعد ہجوم جذبات کو پامال کرتے ہوئے کڑی آواز میں بولی " گو یہ ممکن ہے کہ آپ کے بھانجے سے میری کچھ امیدیں وابستہ ہوں ——— مگر آپ نے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا کہ وہ میرا خاوند بھی ہوگا ۔

ڈوڈ مسکرایا اور جواب دیا " جی ہاں ، میں جانتا ہوں ——— اور یہی وجہ تھی کہ مجھے لب کشائی کی ضرورت محسوس ہوئی ۔"

میری خاموش ہوگئی وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا تھی ۔ آگ کی روشنی اس کے سنہری رنگ پر پڑ کر عجب بہار دے رہی تھی اور بوڑھا کتب فروش بیٹھا اس کے حسن کی بلائیں لے رہا تھا ۔

میری نے قابلِ تعریف صاف گوئی اور نازک خیالی سے جواب دیا " غالباً آپ نے یہ سمجھا ہوگا کہ میں غمزہ باز عورتوں کی طرح اپنے ناز و انداز سے آپ کے بھانجے پر ڈورے ڈال رہی ہوں اگر واقعی آپ نے یہی سمجھا ہے تو یقیناً ایک فاحش غلطی میں مبتلا ہیں ۔"

یہ کہکر میری پھر خاموش ہوگئی اس کی آنکھیں اس بات کی جستجو کرنے لگیں کہ شائد بڈھے کا دل پسیجے مگر وہ ابتک تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا ۔

میری نے پھر کہنا شروع کیا " اگر آپ نے میری اتنی ناقدری کی تو سخت غلطی کی ——— لیکن یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ اگر مرواؔن نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تو میں یقیناً " ہاں " کہہ دونگی ۔"

جیمز ڈوڈ نے اپنے ہاتھ اس طرح ہلاتے گویا وہ تمام صاف گوئی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا اور سرد مہری سے جواب دیا " اگر یہ بات ہے تو میں اس کا جواب " نہیں " سے دونگا ——— اگر آپ نے مرواؔن سے شادی کی تو سمجھ لیجئے ایک ایسے شخص سے کی جس کی دنیا میں نہ کوئی تجارت ہے ۔ نہ پیشہ جانتا ہے ، نہ پلے کوڑی ہے ۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس صورت میں وہ وراثت سے محروم کر دیا جائیگا ۔"

جیمز ڈوڈ ایک دولتمند آدمی تھا مگر میری کا باپ ایک لارڈ ہونے کے باوجود مفلس اور مفلوک الحال ۔ اس پریشانی کی چند خوبصورت لڑکیاں تھیں اور بس ۔ جونہی لیڈی میری کو اس صورتحال کا خیال آیا وہ اس صاف گوئی سے متاثر ہوکر دل ہی دل میں کڑھی ۔

مگر بوڑھے کتب فروش کو اس کی حالت پر مطلق ترس نہ آیا اس لئے چبا چبا کر یوں باتیں کرنی شروع کیں ——— " میں نہیں سمجھتا کہ میرا مرواؔن کسی ایسی عورت سے شادی کریگا جو فیشن ایبل ہو ۔ نواب زادیوں کے سے عالی دماغ رکھتی ہو اگرچہ جیب میں ایک حبہ نہ ہو ۔"

میری یہ سُنکر طیش میں کھڑی ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر یوں جواب دیا ۔

" میں جناب کو اس بے ضرورت سرد مہری ، اور مضحکہ خیز بے رُخی پر جو اخلاق کی کھلی توہین ہے ۔ معاف کرتی ہوں ۔"

خاتون کی ریشمی گود سے عاشقانہ اشعار کی کتاب آتش دان کے قریب گر پڑی مگر دونوں میں سے کسی نے اس طرف توجہ نہ کی ۔

مسٹر ڈوڈ نے مسکرا کر کہا " جناب آپ کو چھوڑنا گویا ایک بہت اچھے گاہک سے ہاتھ دھونا ہے اور یہ تجارت و دوکانداری کے آداب و اصول کے خلاف ہے ۔ مگر ایک دوکاندار کے لئے یہ ——— "

خاتون نے اس طنز آمیز جملے کے جواب میں صرف سر جھکا

دینا کافی سمجھا اور کہا کہ "میری ہمجولیاں میری منتظر ہونگی۔"

(۴)

جینی نے خشک تپاک کے ساتھ دروازہ کھولا اور میری وہاں سے نکل کر دوکان میں پہنچی۔ اس کے چلے جانے کے بعد کمرے میں مردنی اور بے رونقی چھا گئی۔

کتب فروش نے اپنی بھاری کرسی آتشدان کے آگے سرکائی دہکتی ہوئی آگ پر لکڑی ڈال کر کرسی پر دراز ہوگیا۔ اب اس نے اس سمت کی طرف دیکھنا شروع کیا جہاں تھوڑی دیر پہلے ایک شعلۂ جوالہ جلوہ افروز تھا۔ اس وقت ایک بوڑھے کی اس کے دل میں بھی جوانی کے خواب موجزن تھے وہ اس طرح بہت دیر تک سوچتا رہا۔ مگر مرواں نے کمرے میں داخل ہوکر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

مرواں۔ "سب لوگ چلے گئے۔ اور دوکان بند کر دی گئی ہے۔"

ڈوڈ۔ "کیا واقعی بہت دیر ہوچکی ہے؟"

"جی ہاں، بہت دیر ہوچکی ہے۔ دوسرے ہوا بھی تیز چل رہی ہے۔ برف کی بارش ہو رہی ہے۔ ابکے کرسمس بہت اداس اور پھیکا رہیگا۔"

کسی قدر بددل ہوکر ماموں کو دیکھا اور کہا "لیڈی میری دفعتاً چلی گئی؟ ——— غالباً آپ سے برگشتہ خاطر ہوکر ———"

"تو کیا یہ بہت اہم بات ہوئی؟"

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"اچھا اگر یہی بات ہے تو سمجھ لو اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لو کہ میں نے اسے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے۔" یہ کہکر مسٹر ڈوڈ نے فرش پر پڑی ہوئی کتاب کو اپنے پیر سے چھوا اور کہا کہ جس طرح اس نے اس کتاب کو زمین پر پٹک دیا ہے اسی طرح ہم بھی اسے ——— "

نوجوان نے وفور محبت سے بیقرار ہوکر اس کتاب کو اٹھا لیا۔ اور بیچین ہوکر بولا "خیرباد کیوں کہدیا!؟"

"ہاں میں نے اس کی توہین کی ہے اور اسے بہت ذلیل کیا ہے۔ اب اسے ہمیشہ کے لئے فراموش کرتا ہوں۔"

"فراموش! مگر میں تو اس سے محبت کرتا ہوں!"

"مجھے خوب معلوم ہے!"

"مگر آپ نے پھر بھی قطع تعلق کر لیا؟"

"ہاں، ہاں" بوڑھے کتب فروش نے نوجوان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا "اسی طرح کی ایک عورت نے میری زندگی برباد کر دی تھی ——— پہلے واقعہ سن لو، پھر کچھ کہنا ——— "

مرواں اپنے غصہ کو پی گیا اور بادل ناخواستہ اپنے بوڑھے ماموں کے تحکمانہ انداز خطاب اور پدرانہ نصیحت سے مغلوب ہوکر سننے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

مسٹر ڈوڈ نے فرمایا "جب میں تمہاری عمر کا تھا تو ایک عورت سے محبت کرتا تھا گو وہ خاندانی حیثیت سے مجھ سے کمتر تھی مگر دولت کے اعتبار سے نہیں ——— کیونکہ میں اپنے والد کی دولت کا اسی طرح وارث بننے والا تھا جس طرح تم میری دولت کے بننے والے ہو۔ اس عورت کا خاندان بھی اسی طرح دیوالیہ ہوگیا تھا جس طرح لیڈی میری کا ——— "

(۵)

اپنی محبوبہ کا اس طرح ذکر سنکر مرواں دیوانہ وار بیچ میں بول پڑا مگر مسٹر ڈوڈ نے اسے خاموش کر دیا اور کہا "میں اپنے واقعے کو سہل ترین بنانے کے لئے جو بات کہنی چاہتا ہوں کہونگا ——— خیر میں اس عورت سے محبت کرتا تھا اور شاید وہ بھی مجھ سے کرتی تھی۔ اس بات کو پورے پچاس سال گزر گئے" (خود بخود مسکراکر) "میں نے کرسمس کے انہی دنوں میں اپنا دل اس عورت کے قدموں پر ڈال دیا۔ اور کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھدیا۔ ایک خط لکھا ——— ویسا ہی جیسا تم اس لڑکی کو لکھ سکتے ہو۔ پھر اس خط کو عاشقانہ اشعار کی ایک خوبصورت کتاب کے ساتھ اسے بھجوا دیا۔ اس واقعے کو آج سے پورے پچاس سال گزر چکے ہیں۔

"وہ چیزیں ——— یعنی مجھ جیسے غریب کی ساری پونجی ——— نہایت احتیاط سے اس کے ہاتھ میں پہنچا دی گئی اور میرا آدمی بیان کرتا تھا کہ اس نے اس خط کو ——— خود اس کی موجودگی ہی میں ——— اپنے سینے سے لگایا ——— "

ڈوڈ یہاں پہنچکر ٹھہر گیا اور آگ کی طرف دیکھکر ایک ایسی سرد آہ کھینچی جو بڑھاپے میں شاذونادر ہی نکلتی ہے۔ "میں نے اس خط میں شادی کی درخواست کی تھی ——— مجھے اس کی جرأت اس لئے ہوئی کہ وہ بظاہر وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔"

مرواں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"دو دن کے بعد کتاب واپس آگئی ——— جس کے ساتھ

نہ تو کوئی خط تھا نہ زبانی پیغام۔ وہ دیکھو وہ کتاب وہاں رکھی ہے
—————"

"وہ کتاب واپس آئی تو میں اسی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے لانے والے سے پوچھا کہ "کچھ اور بھی لائے ہو؟" اس نے جواب دیا "نہیں اور کچھ نہیں" میں نے دل برگشتہ ہو کر اس کو وہیں ٹھونس دیا اور اس کے بعد اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس دن سے اسے دیکھکر ہمیشہ اپنی حماقت ——— محبت ——— یاد آتی رہتی ہے۔"

مرواؔن نے کہا کہ "اور غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ نے شادی نہیں کی۔"

"ہاں، یہی وجہ ——— میں اسی ریاکارانہ عشوہ و انداز کا شہید ہوں۔ ڈوڈ کا سر سینہ کی طرف جھک گیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا۔" چند ہی دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔"

تاریک کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور سرما کی سرد ہوائیں آگ کی لپٹوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

مسٹر ڈوڈ نے کہا کہ صاحبزادے! میں نے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ اور اسی طرح دوسروں کو بھی بچانا چاہتا ہوں۔ پس یا تو ان شان و شوکت والی لیڈیوں سے کنارہ کشی کرو یا مجھ کو چھوڑ دو میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیسکتا کہ جس طرح میرا دل ٹوٹا ہوا ہے اسی طرح کوئی اور بھی اپنا دل توڑے۔"

نوجوان نے نہایت نرمی سے کہا کہ "حضرت! اگر میں چلا گیا تو آپ اکیلے رہجائیں گے۔"

مسٹر ڈوڈ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا مگر مرواؔن نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا "اگر میرے لئے یہ دونوں راہیں کھلی ہوئی ہوں تو میں اسے منتخب کرونگا کیونکہ اسے چاہتا ہوں، اگر اس سے میرا دل بھی ٹوٹ جائے تو کوئی پرواہ نہیں ——— کیونکہ میں محبت کرتا ہوں۔"

ڈوڈ نے سنا ان سنا کر کے یوں کہنا شروع کیا۔" یہ لڑکی ویسی ہی خوبصورت ہے جیسی میری محبوبہ تھی ——— یہ اس وقت بالکل ویسی ہی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ آہ! کتنی رعنا! بظاہر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ گذشتہ پچاس سال گذرے ہی نہ تھے۔"

مرواؔن نے کہا "اگر یہ لڑکی بھی ویسی ہی ثابت ہوئی جیسی آپ کی محبوبہ تب بھی میں اس کا ساتھ دونگا۔"

ڈوڈ نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا "تو پھر تم مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے جاؤ ——— جس طرح تمہاری مرضی آئے روزی کماؤ ——— میں بوڑھا یونہی اکیلا مر جاؤنگا!"

"کیا آپ واقعی یہی چاہتے ہیں؟"

"قطعی طور پر یہی"

"اچھا تو شب بخیر ——— خدا حافظ!"

(۶)

وہ چلا گیا اور ڈوڈ نے اپنی نظر اس کی پشت سے ہٹائی تو مسکرا کر کہا "بے شک اس نے وہی کیا جو خود میں اس عمر میں کرتا، اس عمر کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ مگر میں اسے یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کہ اپنا دل اسی طرح توڑے جس طرح میرا ٹوٹ چکا ہے۔"

ہوا دُود کش (چمنی) اور دروازوں میں شور مچاتی ہوئی آئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کمرے کی تاریک فضا میں سے کسی حسین عورت کی شبیہ نکلکر ڈوڈ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی ہے۔

ڈوڈ اپنی کرسی سے اٹھا اور الماری میں سے عاشقانہ اشعار کی وہ کتاب نکالی جو پچاس سال سے بے چھوئے جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔

(۷)

غم و اندوہ کے جذبات سے مجروح و مغلوب ہو کر ایک غضبناک جوان نے اس کتاب کو الماری میں ٹھونس دیا تھا مگر آج پچاس سال بعد اسی جوان نے جو اب ایک شیخ خمیدہ، خاموش اور مرنجان مرنج بوڑھا تھا اسی جگہ سے وہی کتاب نکالی۔

اس نے بہت جرأت کے ساتھ اسی دقیانوسی کتاب کو کھولا اور اوراق الٹے پلٹے ——— اس میں بھورے رنگ کی کوئی چیز کھڑکھڑاتی ہوئی دکھائی دی اور اسے ڈوڈ نے اپنی سخت انگلیوں سے چھوا ——— یہ کیا چیز تھی؟ ——— ایک پھول کی خشک پتیاں یعنی کرسمس کے **گلاب کی پتیاں**

کیا کتاب کے سرورق کے نیچے یہ مکتوب نہ تھا!؟

مسٹر ڈوڈ نے بہت تکلیف کے ساتھ ایک شمع روشن کی اور پھر بہت اذیت کے ساتھ ناک پر عینک لگا کر اس خط کو پڑھنا

شروع کیا جو عاشقانہ اشعار کی اس کتاب میں رکھا ہوا ملا تھا جسے پچاس برس سے شجر ممنوعہ کی طرح الگ تھلگ رکھ دیا گیا تھا۔

خط حسب ذیل تھا۔

"میرے پیارے محبوب!"

"میں اس کتاب کو دوبارہ آپ ہی کے پاس بھیجتی ہوں اور کرسمس کے پھولوں میں سے ایک پھول کے ہمراہ دے رہی ہوں تاکہ آپ اس کے سادہ ورق پر میرا اور اپنا دونوں کا نام تحریر کر کے اسے لیکر خود تشریف لائیں ——— پھر میرے محبوب! یہ ہماری شادی شدہ زندگی کا (جو بہت ہی پُر مسرت اور طویل ہوگی) ایک عہدنامہ ہوگا! جلد آؤ! تاکہ دل کو تسکین ہو اور ہماری حقیقی محبت پر مہر ثبت ہو جائے۔ یہ خط تمہاری بھولی بھالی "جینی" نے لکھا ہے ——— جو اپنے پیارے کو تمہیں لبیک کہہ رہی ہے ——— میں تمہاری بیوی بننے کے لئے تیار ہوں ———"

ان الفاظ کو لکھے ہوئے پچاس برس گزر گئے تھے جیمز ڈوڈ نے اپنی طبیعت کے ہیجان کی وجہ سے جو مہلک غلطی کی تھی وہ یہ تھی کہ جب وہ کتاب واپس آئی تو اسے کھول کر نہ دیکھا۔ کاش! وہ اسے کھول کر دیکھ لیتا تو دونوں کی مسرتیں فنا نہ ہوتیں۔

وہ "جینی" کے پاس نہ گیا اور جینی اس کی منتظر رہی ——— حتیٰ کہ انتظار کرتے کرتے دم دیدیا ———

"اوہ! جینی! جینی، میری محبوب بیوی!"

(۸)

بوڑھے کا سر آہستہ آہستہ اس کے سینے پر آ لگا۔ آتشدان کی آگ بھی ہلکے ہلکے مدہم پڑ گئی اور شمعدان میں شمع بھی ٹمٹمائی ——— اس وقت غزلوں کی قدیم کتاب ڈوڈ کے سینہ سے لپٹی ہوئی تھی!۔

اس سے پہلے کہ کامل تاریکی مسلط ہوتی۔ دونوں جوان عاشق و معشوق اس کمرہ میں دوبارہ داخل ہوئے۔

مرڈان نے آتے ہی کہا "جناب! لیڈی میری اس غرض سے تشریف لائی ہیں کہ اپنی نظموں کی کتاب لیجائیں ——— اور میں آخری الوداع کہنے آیا ہوں"

زود پشیمان بوڑھے نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ یہ جوڑہ کسقدر خوبصورت و دلنشیں تھا ——— آہ دونوں حبیب و محبوب کسقدر دلدادہ تھے۔ مگر یہ بھی ایکدن بوڑھے ہو جانے والے تھے لیکن محبت غیر فانی ہوتی ہے! ——— اب یہ لڑکی "جینی" کی جگہ پر تھی۔

نوجوان نے عزت و تاسف سے کہا "جناب! یہ مجھے حاصل کرنا چاہتی ہے اور میں ——— آپ کو!"

"ٹھہرو، ٹھہرو، میرے عزیز! ایک غمزدہ بوڑھے پر ترس کھاؤ! جینی! ایک لمحہ ٹھہر!"

کمرے میں اس قدر تاریکی تھی کہ جیمز ڈوڈ یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے سامنے کون عورت کھڑی کہہ رہی تھی، کہ "میں ٹھہری ہوئی ہوں"

مرڈان نے لڑکی کی جانب ہو کر کہا "پیاری! میرا خیال ہے کہ مسٹر ڈوڈ یا تو بیمار ہیں یا دم توڑ رہے ہیں"

لڑکی نے ڈوڈ کے سامنے دو زانو ہو کر اس کے ہاتھ کو اٹھا کر جس میں اشعار کی کتاب پکڑے ہوئے تھا جواب دیا:-

"خاموش! ——— ان کو سچی مسرت حاصل ہو چکی ہے ——— اس ابدی مسرت میں دخل نہ دو"

ظفر قریشی دہلوی

دفتری اطلاع

ادبی دنیا ہر ماہ میں ہر خریدار کو بعد احتیاط سے رجسٹر سے چیک کر کے روانہ کیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ پہنچے تو دفتر کو اطلاع دیجئے۔ اور اپنے ڈاکخانے سے بھی شکایت کیجئے۔

خط و کتابت میں خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ ورنہ آپ کے ارشاد کی تعمیل غیر ممکن ہے۔

۴۸۲ ؍کسی کا خریداری نمبر نہیں ہے۔ یہ ڈاکخانے کا رجسٹرڈ نمبر ہے۔ خریدار کا نمبر اس کے نام سے پہلے چھپا ہوا ہے یا ریپر پر لکھدیا جاتا ہے۔

منیجر ادبی دنیا

بزمِ تحقیق

خواجہ آتش نے لکھنؤ کے کسی مشاعرے کی غزل میں لفظ المُضاعَفْ کو المُضَافْ اور بیگم کو غم اور نم کے قافیے میں کاف فارسی کے فتحے کے ساتھ باندھا تھا۔ اِس پر اُن کے حریفوں نے سرِ مشاعرہ اُنہیں ٹوکا۔ کہ المُضَاعَفْ عربی ہے۔ اور بیگم ترکی۔ اہلِ عرب المُضَاعَفْ بولتے ہیں۔ نہ کہ المُضَافْ اور ترکی زبان میں بیگم بضم کاف فارسی بروزنِ گندم ہے۔ نہ کہ بہ فتح کاف فارسی

خواجہ آتش نے جواب میں فرمایا تھا۔ کہ ہم جب عربی اور ترکی میں شعر کہیں گے۔ تو المُضَاعَفْ اور بیگمُ لکھیں گے۔ اردو میں کوئی بیگمُ اور المُضَاعَفْ نہیں بولتا۔ اِس لئے ان الفاظ کا جو اردو تلفظ ہے اردو میں صرف وہ ہی صحیح ہوگا۔"

مولینا آزاد آبِ حیات میں اِس واقعے کو بیان کر کے اپنے طرزِ خاص میں اسے ناقابلِ قبول بتاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ خواجہ آتش نے اپنے جواب میں ایک نہایت صحیح اصول بیان کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک زبان میں دوسری کسی زبان کا کوئی لفظ جس تلفظ اور املا کے ساتھ جس معنی میں رائج ہو گیا ہے۔ اُس زبان میں وہ لفظ اپنی مروجہ صورت میں صحیح ہوگا۔ بلکہ بعض حالات میں تو وہ صرف مروجہ صورت ہی میں صحیح ہو سکتا ہے۔ اور اپنی شکل و صورت میں غلط ہو جاتا ہے۔

"خاطر اور تواضع" کے الفاظ عربی میں کچھ اور معنی رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ لیکن اردو میں خاطر تواضع ہم معنی ہیں۔ اور ان کے اردو کے معنی عربی کے معنی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے اگر کوئی اردو میں لفظ خاطر کو اُس خیال کے لئے جو دل میں کسی وقت گزرتا ہے۔ یا خطور کرتا ہے۔ استعمال کرنے لگے۔ تو یہ استعمال قطعاً غلط ہوگا۔ آؤ بھگت کرنے کے معنی میں خاطر تواضع کے الفاظ عربی نہیں رہے۔ بلکہ اردو بن چکے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ اس قسم کے الفاظ کا اردو میں صحیح تلفظ اور صحیح املا وہی ہوگا۔ جو فصحا کی اردو میں رائج ہو چکا ہے لیکن حروفِ حلقی کا اصلی تلفظ ادا کرنے والے عربی دانوں یا اپنے کو عربی دان ظاہر کرنے والوں کو اگر اصرار ہو۔ تو بعض صورتوں میں انہیں الفاظ کو اصلی لب و لہجہ میں بھی بولنے کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ اِس اصول کی روشنی میں ذیل کے الفاظ کے معنی، املا، اور تلفظ حسبِ تفصیل ذیل ہوں گے۔

(۱) نُقص۔ کمی کے معنی ہیں۔ عربی میں بہ فتح نون نَقص آتا ہے۔ بعض اہلِ قلم اِس پر مصر ہیں کہ اس کا عربی تلفظ اردو میں بھی رائج کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ نُقص کو بہ ضمِ نون غلط بھی بتاتے ہیں۔

ہماری رائے میں نُقص کا اردو تلفظ بضم نون صحیح ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ نَقص اپنے عربی لہجے میں یعنی بہ فتح نون نَقص بھی درست ہے۔

(۲) شُغل۔ مشغلے کے معنی ہیں۔ مد، ان علم و فضل نے اسے شُغل شین کے پیش سے اِس لئے غلط بتایا ہے۔ کہ ان کے خیال میں شُغل کا عربی تلفظ شین کے زبر سے ہے۔ اور اِس لئے اُنھوں نے شُغل بولنے والوں کو کم سواد قرار دے کر اُسے شُغل سے شَغل بنا دیا۔ حالانکہ عربی میں اِس کے دو ہی وزن مستعمل ہیں شُغْل شین کے پیش اور غین کے جزم کے ساتھ یا شُغُل شین اور غین دونوں کے پیش سے۔ ہماری دانست میں شُغل کا اردو تلفظ وہی صحیح ہے جو عام تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔ اور جو اس کے اصلی تلفظ کی نقل ہے یعنی شین کے پیش اور غین کے جزم کے ساتھ شُغْل۔ اِس لئے نہیں کہ عوام کا اردو لہجہ عربی تلفظ کے مطابق ہے۔ بلکہ اِس لئے کہ عام طور پر اردو میں یہی تلفظ رائج ہے۔

(۳) مشکور۔ شکر گذار کے معنی ہیں مال پس کی جگہ شاکر متشکر اور ممنون کا استعمال بے ضرورت ہے مشکور عربی میں کچھ ہی معنی رکھتا ہو۔ اُردو میں شکر گذار کے معنی میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اِس لئے اردو میں مشکور بمعنی شکر گذار قطعاً صحیح ہے۔ مشکور کی بجائے ممنون تو خیر لیکن شاکر اور متشکر تو بہت ہی اوپرے لفظ معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا غالب نے ایک خط میں "مکرمت حال کا شاکر ہوں" لکھا ہے۔ مگر شاکر کا بیگانہ پن بدستور باقی ہے۔

(۴) رہائش۔ سکونت اور قیام کے معنی میں۔ بے کھٹکے درست ہے۔ فصحا بے تکلف بولتے ہیں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اور کئی اہلِ زبان کی زبانی یہ لفظ اس معنی میں سُنا گیا ہے۔

(۵) مولانا۔ اِس کا عربی املا مولینا ہے۔ مولیٰ بمعنی سردار اور نا ضمیر جمع متکلم کی مولیٰ کو نا کی طرف مضاف کیا۔ تو عربی قاعدے سے "مولینا" بن گیا۔ ہمیں اِس لفظ کے عربی املا پر اصرار کرنا غیر مناسب ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مولانا لکھتے ہیں۔ اور اردو میں یہ بالکل درست

نفسی تاثرات کے جسمانی مظاہر

غضبناک بلی

یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ انسان بولنے کی استعداد حاصل کرنے سے پہلے رغبتِ انسانی اور مفہوم باطنی کی تعبیر گونگوں کی طرح ہاتھ کے اشارے سے کیا کرتا تھا۔ اپنے اسلاف کا یہ اثر ابتک ہم میں باقی ہے اور بولنے کے ساتھ ہی ہم اپنی بعض اندرونی کیفیات کو جسم کی کسی خاص حرکت سے ظاہر کرنے کے عادی ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے کوئی ناموافق چیز پیش کی جاتی ہے تو زبان سے انکار کرنے کے ساتھ ہی اپنے سر کو دائیں بائیں افقی حرکت دیتے ہیں۔ ہم کسی ایسے شخص کو بلانا چاہتے ہیں جو ہم سے کچھ دور ہے تو پکارنے کے علاوہ ہاتھ سے بھی اس طرح اشارہ کرتے ہیں گویا اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اپنے خادم کو کوئی چیز لانے کو بھیجتے ہیں تو بسا اوقات ہم ایک خاص قسم کے اشارے سے بھی کام لیتے ہیں۔ گویا اسے اپنے سے دور کر رہے ہیں اور جانے میں مدد دے رہے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے اکثر باطنی تاثرات مثلاً غصہ۔ خوف۔ غم انقباض۔ کراہت۔ مسرت۔ حیرت۔ ندامت وغیرہ کو الفاظ کے علاوہ جسم کی کسی خاص حرکت سے ظاہر کرتے ہیں۔

ہم اس مختصر سے مضمون میں ڈارون کی نظریے کی روشنی میں یہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ اندرونی کیفیت کے اظہار کے لئے کوئی ظاہری حرکت کیسے پیدا ہوئی۔ اور ہم بولنے پر قادر ہونے اور صرف زبان سے مفہوم ادا ہو جانے کے باوجود اس حرکت اور خاص وضع سے کیوں کام لیتے ہیں؟

ڈری ہوئی بلی

کوئی جانور کسی وجہ سے غضب میں آتا ہے تو اس کے بال خصوصاً گردن اور پیٹھ کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی پتلیاں پھیل

جاتی ہیں۔ وہ دانت کھول دیتا ہے اور اپنے جسم کو تن کر ایک خاص
وضع کا بنا لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ اس کی شکل صورت
ڈراونی معلوم ہو اور دشمن کے دل میں اس کا خوف بیٹھ جائے۔

اسی طرح غضب کے وقت انسان میں بھی یہی یا تقریباً ایسی
ہی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ آدمی منہ بند کر لیتا ہے۔ دانت پیسنے
لگتا ہے۔ جس سے دشمن کو اس کا یقین دلانا چاہتا ہے کہ اب وہ
جو کچھ کرنے والا ہے اس کا حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔ آستینیں چڑھا
لیتا ہے۔ ہاتھ موڑ کر کہنیاں پیچھے کو ہٹا کر مٹھیاں بند کر لیتا ہے۔
اور اس طرح ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے مقابل کو مارنے کے
لئے بالکل تیار ہے۔ حالتِ غضب میں جسم میں دورانِ خون تیز
ہو جاتا ہے۔ اور خون کی صفائی کے لئے نسبتاً ہوا کی زیادہ ضرورت
ہوتی ہے اس لئے سانس پھولنے لگتی ہے۔ انتہائی غضب میں
منہ سے جھاگ آنے لگتی۔ اور یہ اس لئے کہ انسان اپنی ابتدائی
وحشیانہ زندگی میں ان حالات میں دشمن کو مار کر کھا جاتا تھا۔ اس
کے چبانے اور جبڑوں کی حرکت سے لعاب دہن زیادہ پیدا ہوتا تھا
اور دشمن کو نگلنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اس عمل کے بار بار اعادے
کی وجہ سے لعاب کے غدود میں غضبناکی سے غیر محسوس طور پر ترشح
ہونے کی استعداد پیدا ہو گئی۔ اور اپنے وحشی اسلاف سے بہت
سی دوسری کیفیات کی طرح بطور ورثہ یہ کیفیت بھی ہم میں منتقل
ہوتی رہی۔

چمپانزی حالت غضب میں

خوف کی حالت میں منہ کھل جاتا ہے۔ آنکھیں پھیل جاتی ہیں

تاکہ ڈرنے والا اس چیز کو اچھی طرح دیکھ سکے جس سے ڈر رہا ہے
اور متوقع خوف سے فرار کے لئے مستعد ہو جانے کی وجہ سے
دوران خون میں تیزی آجاتی ہے۔ قلب کی حرکت بڑھ جاتی ہے
اور دم پھولنے لگتا ہے۔ حالتِ خوف کے متعلق ایک نہایت اہم
بات یہ ہے کہ لعاب دہن کم ہو جاتا ہے۔ زبان خشک ہو جاتی ہے۔
اور حلق میں کانٹے پڑنے لگتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اس حالت میں
دماغ کے مضطرب ہونے کی وجہ سے اعصاب کے نظام میں
خلل پڑ جاتا ہے۔ اور لعاب کے غدود بےحس ہو کر اپنا وظیفہ ادا کرنے
سے عاجز ہو جاتے ہیں۔

جب یہ بات مدِ نظر رکھی جائے کہ انسان قدیم زمانے میں جنگلوں
میں رہتا تھا۔ اور چوبیس گھنٹے اسے درندوں کا خوف ستاتا رہتا
تھا تو ہم میں مذکورہ کیفیات کا راسخ ہو جانا اور خوف کے وقت ان
کا ظہور پذیر ہونا کچھ عجیب نہیں معلوم ہوگا۔

غم کے وقت آنکھوں کے اندرونی گوشے کچھ اوپر چڑھ جاتے
ہیں اور بھوؤں کے ملنے کے بعد ان کے زاویے کچھ نیچے لٹک
آتے ہیں۔ چہ آنکھوں کے اعصاب سکڑ جاتے ہیں۔ تاکہ ایسی حالت
میں تیز ہو جانے والے دوران خون کی تکلیف سے آنکھوں کی حفاظت

شدت غم کے تاثرات چہرے پر

کر سکیں۔

آنکھوں کے اعصاب خصوصاً نچلے اعصاب کے سکڑنے کی وجہ سے اوپر کا ہونٹ اوپر کھنچتا ہے اور رونے کے دوران میں منہ کھل جاتا ہے۔ انہی اعصاب کے سکڑنے کی وجہ سے آنسو کے غدود پر دباؤ پڑتا ہے اور آنسو نکل پڑتا ہے۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آنسو کے غدود پر خواہ کسی قسم کا دباؤ پڑے آنسو بہنے لگتا ہے۔ قہقہہ کی حالت میں یا جمائی لینے میں یا تیز روشنی کی طرف دیکھنے میں آنکھیں پرنم ہو جانے کی وجہ یہی ہے۔

رونے کے دوران میں منہ سے رال اور ناک سے پانی اسلئے ٹپکنے لگتا ہے۔ کہ غدودِ اشک میں جوش آجانے کی وجہ سے آنسو اپنے راستے کے علاوہ ناک کی نالی میں بھی گھس آتا ہے۔

کراہت اور انقباض کی حالت میں جس چیز سے کراہت پیدا ہوتی ہے۔ انسان اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایسے مواقع پر اس کے چہرے پر اسی قسم کی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جیسی کوئی بدمزہ چیز منہ میں پڑ جانے کے وقت۔ اور اسی وجہ سے اکثر اوقات کراہت کے وقت انسان تھوک بھی دیتا ہے۔

ہنسنے کے وقت دوران خون میں نشاط اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنکھیں چمک اٹھتی ہیں منہ کے گوشے کچھ اوپر اٹھ کر کانوں کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے رخسارے نکل پڑتے ہیں۔

بن مانس خوشی کی حالت میں

درندے اپنے دشمن کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ تو اس کو کھانے کے خیال سے ان کے فم معدہ میں ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فم معدہ کے اعصاب کا تعلق منہ کے اعصاب سے ہے۔ اس لئے کھانے کو سامنے دیکھکر فم معدہ میں تناؤ اور کھلنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو منہ بھی کھل جاتا ہے۔ اور اس کے گوشے کھنچ جاتے ہیں۔

جانوروں میں اب بھی یہی ہوتا ہے۔ اور قدیم زمانے میں وحشی انسان کے لئے بھی کھانا سامنے ہونے سے زیادہ مسرت انگیز اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی اس وقت چہرے پر جو علامات ظاہر ہوتی تھیں وہ علاماتِ مسرت کے مترادف تھیں

گھوڑا مسرت کا اظہار کر رہا ہے

آخر　　　میں اعصاب مسرت طعام کی اس کیفیت کے اسقدر عادی ہو گئے۔ کہ اب جہاں کوئی مسرت انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ متاثر ہو جاتے ہیں اور منہ کھل جاتا ہے۔

اُود بلاؤ شکار (مچھلی) کے انتظار میں ——

ہم ہنسی کا اور بھی تجزیہ کریں اور اپنے زہرخندہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا ابتداءً منہ کھول کر دانت دکھانے کا مقصد بھی دراصل اپنے دشمن کو مرعوب کرنا تھا۔

بندر حالت سرور میں

کتے کی ہنسی

آہستہ یا دور کی آواز سننے کی خاطر ہم منہ کھولدیتے ہیں تاکہ ناک سے سانس لینا اس آواز کے سنائی دینے میں حائل نہ ہو۔ اور مرکز سماعت تک اس کے پہنچنے کے لئے ایک اور راستہ بھی کھل جائے۔

اکثر جانور کچھ سنتے وقت جدھر سے آواز آتی ہے ادھر اپنے ...دیتے ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اسی جگہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ جانوروں کی ہی انسان بھی اپنے کان ہلانے کی قدرت رکھتا تھا مگر سر کو ہر طرف حرکت دے لینے کی مہولت کی وجہ سے آہستہ آہستہ انسان میں سے اس کی قدرت فنا ہوگئی۔ پھر بھی بعض اشخاص اب بھی اپنے کانوں کو حرکت دینے پر قادر ہیں۔

ایسے ہی انسان میں کبھی جانوروں کی طرح اپنے جسم کے چمڑے کو حرکت دینے کی قدرت بھی موجود تھی اور کسی زمانے میں انسان بھی اپنے بدن پر سے مکھیاں وغیرہ گھوڑوں کی طرح اڑایا کرتا تھا مگر اب ہمارے ہاتھوں نے ہمیں اس سے بے نیاز کردیا ہے۔ اور ہم مکھی اڑانے کی یہ پرانی ترکیب بھول گئے ہیں۔

ہم اپنی قوت فکر کو کسی ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہماری بھویں سکڑ کر نیچے کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔ تاکہ ہماری نگاہ صرف اسی شے تک محصور ہوجائے جو ہمارے سامنے ہے۔ غور سے دیکھنے کی یہ عادت ہم میں ترقی کر گئی تو اعصاب ایسے خیالات سے بھی اسی طرح متاثر ہونے لگے جن پر اپنی ساری قوت فکر صرف کر دینے کی ضرورت ہو۔ اور اب ہمارے سامنے کوئی چیز نہ بھی ہو۔ اور کسی ایسے امر کے متعلق سوچنا ہو جو پیش نظر نہیں ہے تو بھی ہماری بھویں سکڑ کر نیچے کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔

ہم کسی امر پر اپنے قادر نہ ہونے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ہتھیلی کو سامنے کی جانب کرکے حرکت دیتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم خالی ہاتھ ہیں اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بل پر مدافعت کرسکیں یا مقصودہ شے حاصل کرسکیں۔

غالباً مصافحہ کی رسم بھی اسی بنیاد پر قائم ہے۔ اور اس سے یہی ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی آلۂ قتل نہیں ہے۔ اور ہم دوستانہ طریقے پر مل رہے ہیں۔

شرمندگی کے وقت چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے اور شرمندہ ہونیوالے کے حرکات میں اضطراب سا پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ انسان اپنے متعلق لوگوں کی تنقید سے بیحد گھبراتا ہے۔ مخصوصاً جو تنقید اس کی شکل و صورت سے تعلق رکھتی ہو وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

اگر ہم کو محسوس ہو کہ فلاں ہمارے چہرے کی بناوٹ کو اچھا نہیں سمجھتا تو ہمارے چہرے کے اعصاب فوراً اس احساس کو دماغ

کے فوقانی مرکز تک پہنچادینگے۔ یہ مرکز جسم کے مختلف جہات میں خون کی مقدار کے ذریعے اپنے فرمان روانہ کرتا ہے۔ ایسی حالت میں چہرے کی پژمردگی رفع کرنے کے لئے اس مرکز کی طرف سے چہرے میں کچھ زیادہ خون بھیجدیا جاتا ہے اور چہرہ تھوڑی دیر کے لئے سرخ ہوجاتا ہے۔ اس اصول پر مدت تک عمل ہوتے ہوتے اب صورت وشکل کی خصوصیت غائب ہوگئی ہے۔ اور خواہ کسی قسم کی تنقید ہو ہمارے افعال پر ہو یا ہمارے شعور پر جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم کوئی ایسا کام کر بیٹھے ہیں جو رسوائی کا باعث ہے یا ہم سے عام رواج کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہوگئی ہے تو اعصاب اس احساس کو مراکز دماغ تک پہنچادیتے ہیں اور وہاں سے چہرے کی طرف خون کی رو دوڑادی جاتی جو اسے سرخ بنادیتی ہے۔

اس امر کی دلیل کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ہمکو ایک ہی مورث سے بطور ورثہ ملا ہے یہ ہے کہ دنیا کے تمام جاندار اختلاف جنسیہ کے باوجود اپنے تاثراتِ نفس کی ظاہری تعبیر تقریباً ایک ہی جیسی کرتے ہیں۔

بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں بغیر سیکھے ہوئے ان حرکات اور ا پنے اوپر مذکورہ علامات طاری کرنے کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ اند ھے اپنے تاثرات کو اسی طرح ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بھی آنکھ والوں ہی کی طرح ہنستے ہیں۔ ان کے چہرے پر بھی کبھی کبھی شرم آلود سرخی نظر آتی ہے۔ حالانکہ وہ ناقدوں کی بے رحم نظروں سے ناآشنا ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ وہ بھی ہر کیفیت کے اظہار میں آنکھ والوں جیسے ہوتے ہیں۔

شائد کوئی صاحب اعتراض کریں کہ بچے پیدا ہونے کے بعد چند ہفتوں تک یونہی چیخا کرتے ہیں۔ اور آنسو نہیں بہاتے مگر حقیقت یہ ہے اسوقت ان کے غدود اشک بالکل بسیط حالت میں اور کمزور ہوتے ہیں پھر بھی ان کے پلکوں کو کسی کھردری چیز سے مل دیا جائے تو فوراً آنسو نکل پڑتا ہے۔

اسی طرح نوزائیدہ بچوں میں ہنسنے۔ ڈرنے اور خفا ہونے کی استعداد بھی موجود ہوتی ہے مگر یہ ساری چیزیں اس کی زندگی کے ابتدائی چند ہفتوں میں بالکل بسیط وضعیف حالت میں ہوتی ہیں۔ اس لئے چند ہفتے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

صدیق طبیب

ہجومِ جلوہ

ابرِ رحمت کو برس کر عالم آرائی ملی ٭ پتے پتے کو چمن میں شانِ رعنائی ملی
آنکھوں آنکھوں میں ہوئی آرائشِ بزمِ بہار ٭ ذرے ذرے میں فسوں کو کارفرمائی ملی
وسعتِ گیتی پہ فرشِ سبزہ بچھ جانے لگا ٭ لالہ و گل کو اُفق تک جلوہ آرائی ملی
چرخ پر قوسِ قزح سے موجِ رنگ اٹھنے لگی ٭ مے کشوں کو چشمِ ساقی کی شناسائی ملی
جھومتی شاخوں پہ مرغانِ چمن کو ہر طرف ٭ سبزہ پوشی، بادہ نوشی، نغمہ آرائی ملی
صحنِ گلشن میں کھچی تصویرِ حسن و عشق کی ٭ شاخِ گل پر گل سے ملنے عندلیب آئی ملی
خود نمائی کا تقاضا تھا وفورِ حسن کو
دیدۂ شاعر کو اب محفل میں بینائی ملی

(منتخبہ) حامد علی

شاہدِ معصوم

سے

محفل آرائے وفا تو اور میں ننگِ وفا!
دل مرا تاریک ہے تو بحرِ انوار و ضیا!
پست ہے منزل مری اور تو ہے گردوں آشنا!
"نور" تیری ابتدا ہے "خاک" میری انتہا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

میرے آنسو تیرے زرّیں ہار کے قابل نہیں
میرے داغِ دل ترے گلزار کے قابل نہیں
میری الفت آہ تیرے پیار کے قابل نہیں
یعنی میں تیری محبت کیلئے ہوں ناسزا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

میری اُلفت میں نہ اپنی راحتیں برباد کر!
میرے غم میں یوں نہ اپنی زندگی ناشاد کر!
میں تو اک خوابِ پریشاں ہوں نہ مجھکو یاد کر!
چھوڑ دے میرے لئے یہ رات بھر کا جاگنا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

تو نگارِ عفت و عصمت ہے آوارہ ہوں میں
تو مقیمِ جلوہ گاہِ راز اور رسوا ہوں میں
آہ کب تیری محبت کے لئے زیبا ہوں میں
کچھ تو اپنے حسن کی معصومیوں پر رحم کھا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

فطرتِ رنگیں کو تو اے دلربا محبوب ہو!
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو!
آہ! ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو!
اور تیرے دل کو ہو محبوب اک غم آشنا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

ایک ساعت کیلئے حاصل مجھے راحت نہیں!
میرے سازِ زندگی میں نغمۂ عشرت نہیں!
آہ میں ناشاد ہرگز قابلِ اُلفت نہیں!
ایک ننگِ زندگی کا غم کرے تیری بلا!

بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

حاملانِ عرش کے دل میں ترا ارماں رہے!
عظمتِ کونین تیرے نام پر قرباں رہے!
اور تو اک بے نوا کی یاد میں نالاں رہے؟
کچھ نہیں کھلتا؟ کہ تجھ پر کس نے جادو کر دیا!
بھول جا! اے شاہدِ معصوم! مجھکو بھول جا!

ٹالسٹائی

یسنایاپالیانمینٹ پیٹرسبرگ جون ۱۹۰۸ء

والیوسکی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے پروفیسر میکسیم نے جو بین الاقوامی قوانین کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں مجھے کہا۔

"آپ روس کے اس فرزند سے ملاقات کرنے جارہے ہیں جو زار کے سامنے بھی سچ بولتا ہے۔ اور باوجود اس بیباکی کے سزا سے محفوظ رہتا ہے"

جس دن روس کے اخبارنویسوں کی پہلی انجمن منعقد ہوئی ہے بس اس سے دوسرے دن سینٹ پیٹرزبرگ جانے کے لئے چل پڑا۔ روس کے منتخب مشاہیر فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے کہ ٹالسٹائی کی انیسویں سالگرہ کس طرح منائی جائے۔ بوڑھے۔ جوان۔ مرد عورتیں تمام اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ تاکہ فخر روس کی عزت افزائی کے لئے کوئی مناسب طریق کار سوچا جائے۔ ان لوگوں کی گفتگو میں وہ سنجیدگی اور آتش فشانی موجود تھی جو ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو صدیوں کی غلامی کے بعد یکبارگی آزاد ہوگئے ہوں۔ ایک نوجوان اخبارنویس نے کہا:

"ٹالسٹائی کی سالگرہ منانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ روس کے تمام اخبارات ۲۳ اگست کو متفقہ طور پر ان ہولناک مظالم کے خلاف آواز بلند کریں۔ جو ہر روز سرزمین روس میں واقع ہوتے ہیں۔ حکام بے پروا ہو کر رعایا کی جانوں کو تلف کرتے جارہے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہمارا گروہ رائے عامہ کو اس طرح سدھارے کہ اس کی دباؤ کی وجہ سے حکام کو قتل کی سزا منسوخ کرنی پڑے"۔

اس کے بعد ایک افسر داخل ہوا اور اس نے زوردار لہجے میں اعلان کیا کہ اگر مندوبین سزائے قتل کے متعلق تقریریں کرتے رہیں گے تو اجلاس کو منتشر کرنے کا حکم دیا جائیگا۔

اس واقعے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ روس کے تمام لوگوں نے اپنے اختلافات کو عارضی طور پر مٹادیا ہے اور ایک نقطہ مرکزی پر جمع ہوگئے ہیں۔ اور وہ نقطہ مرکزی ٹالسٹائی کا احترام ہے۔ روس کے لوگ روسی پارلیمنٹ سے زیادہ ٹالسٹائی کے حالات سے دلچسپی لیتے ہیں۔ کبھی کبھی "اصلی روسی رعایا" کی انجمنیں جو حکومت کی تائید سے قائم ہوئی ہیں۔ ٹالسٹائی کے خلاف پروپیگنڈا کرتی ہیں۔ اور اسے "دشمن عیسیٰ" "دغاباز" کے القاب سے یاد کرتی ہیں۔ روس کے مذہبی پیشواؤں نے بھی حتی الامکان اس سالگرہ کے انتظامات میں خلل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ حکومت نے ایک انجمن کو جس کا نام "لیو ٹالسٹائی انجمن" رکھا گیا تھا۔ خلاف قانون قرار دیدیا ہے۔

گاڑی میں میرے ساتھ ایک روسی پادری سفر کر رہا تھا۔ میں نے اس سے باتیں شروع کیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ روس کے باشندوں کا ٹالسٹائی کے متعلق کیا خیال ہے جب اسے معلوم ہوا کہ میں اس آزادی کے دیوتا سے ملاقات کرنے کے لئے جارہا ہوں تو فرط مسرت سے اس کے رخسارے تمتمانے لگے۔ اور اس نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

"آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ جب آپ کو اس مقدس ولی کی زیارت حاصل ہو تو اس کی خدمت میں میرا نیازمندانہ سلام پہنچا دیجئے گا۔ اور کہئے گا کہ ایک پادری مذہبی پیشواؤں کے نفرت انگیز سلوک کی وجہ سے اپنے دل میں بیحد نادم ہے۔ شرم سے اس کا سر اہل دنیا کے سامنے اٹھ نہیں سکتا۔ یہ بھی کہئے گا کہ روس کے باشندے سوائے بائبل اور اس کی تصانیف کے اور کچھ نہیں پڑھتے"۔

جب ہم یسنایا پولیانا کے مختصر سے گرجے کے پاس سے گزرے تو میں نے کچھ عورتوں کو دیکھا جو سرخ رنگ کے لباس پہنے ہوئے کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے شادمانی اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور ان کے گیت ایک امید افزا پیغام کے حامل معلوم ہوتے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں مالویا ان کی تصویر کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ "طوفان" جو میری نظر میں خون میں نہائے ہوئے سُرخ۔ مختل روس کا منظر ہے۔ آخرالامر صبح کے ۷½ بجے کے قریب پیچدار راستوں کو طے کرکے میں نے اپنے آپ کو ایک مختصر سے سفید مکان کے سامنے پایا۔ جہاں دنیا کا سب سے بڑا صناع اور موجودہ زمانے کا ممتاز ترین شخص رہتا ہے۔ ٹالسٹائی کا سکرٹری مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد خود ٹالسٹائی

داخل ہوا۔ مجھے اب یاد نہیں کہ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کیا کیا تھا۔ مگر اتنا خوب یاد ہے کہ وہ فوراً مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اس بات نے میرے ذہن میں اس حقیقت کو روشن کر دیا کہ دنیا کے بڑے آدمی مزاج کی سادگی میں بھی باقی لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح فنون لطیفہ کے تمام شاہکار سادگی کے وصف سے مزین ہیں۔

ٹالسٹائی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جس طرح ریمبرانڈت کی کوئی تصویر ہو۔ اس کی آنکھیں تلطف کے جذبات سے بھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس نے انگریزی زبان میں کہا:۔

"اگر میں دوران گفتگو میں کافی پیتا جاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ آپ مجھے معاف کر دیں گے نا؟"

اس کے بعد اس نے روسی زبان میں ان اثرات کے متعلق دریافت کیا جو روس کے متعلق میرے دل پر ثبت ہو چکے تھے میں نے اخبار نویسوں کی انجمن میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کا ذکر کیا۔

اس نے کہا "ہاں اگر اخبارات سزائے قتل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں تو مجھے بہت خوشی ہوگی" اس کا لہجہ نرم تھا۔ اسکی آنکھوں میں کچھ اس طرح کی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کا نور سا برستا تھا۔ کہ وہ واقعتاً ولی ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ روس کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"؟

ایک منٹ کے بعد ٹالسٹائی نے کہا "دنیا میں بہت سے معتقدات باطلہ ہیں۔ مگر ان میں سے جو اعتقاد سب سے زیادہ مہیب اور خطرناک ہے۔ جس کی وجہ سے خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں۔ جس نے مذہب کے جنون تعصب کو بھی شرما دیا ہے۔ یہ وہ ہے کہ مٹھی بھر آدمی جبر و طاقت سے کام لیکر تمام قوم کی معاشری زندگی کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

میں نے پوچھا "اور ان آرٹ کی تصانیف کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو پچھلے دس سالوں میں لکھی گئی ہیں۔

آپکا مطلب غالباً "حشر" اور اس قسم کی تصانیف سے ہے انکی اہمیت اس حد تک ہے جس حد تک ان میں مذہبی تکمیل نفس کا ذکر آتا ہے۔ جسے ہم صنعتی (آرٹسٹک) کہتے ہیں۔ وہ امیرانہ اور شاہانہ آرٹ ہے۔ اسی لیئے میں اس آرٹ کے خلاف ہوں۔ مجھے کہنا چاہیئے تھا کہ عام لوگوں کے متعلق میں نے جو افسانے لکھے ہیں وہ میرے نزدیک بہت قیمتی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مطالعے کا چکر" میرے نزدیک سب سے بہتر ہے یہ کتاب تمام تر میری تصنیف نہیں۔ اس کا دسواں حصہ میں نے لکھا ہے۔ یہ کتاب مشاہیر کے تصانیف کے بہترین انتخابات پر مشتمل ہے۔ یہی کتاب میرے لیئے "دعا کی کتاب ہے"۔

روسی ادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ٹالسٹائی نے کہا "میں روسی ادب کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ خدایا! تیری پناہ۔ کہاں اس کی تصانیف۔ اور کہاں وہ موجودہ کی کتابیں۔ جب میں روسی مصنفین کا خیال کرتا ہوں تو ڈسٹارسیو کی ٹرگ اسٹراوسکی پر رک جاتا ہوں۔ ہاں چیکاف کا انداز تحریر بہت دلکش اور دلفریب ہے۔ وہ طنز اور تمسخر کا ماہر ہے۔ مگر اسکی تصانیف بہت گراں قدر نہیں۔ اس کے جذبات میں گہرائی اور شدت مفقود ہے"۔

وہ مسکرانے لگا۔ کچھ عرصہ خاموش رہا اور پھر آہستہ سے کہا۔

"روس کے تمام مصنف خودستائی کے عیب میں مبتلا ہیں۔ موجودہ عہد روس کا عہد زوال و انحطاط ہے۔ یورپ کے ممالک میں بھی یہی حالت ہے۔ السن۔ اسکر وائیلڈ اور کئی دوسرے مصنف (ٹالسٹائی نے اکثر مشاہیر انگریزی مصنفین کا نام کہا تھا۔ مگر لبعد ازاں مجھے منع کر دیا تھا کہ ان کے نام عوام پر ظاہر نہ کردں) بھی اس بھونڈی خودستائی میں مبتلا ہیں۔ جب میں پشکن کو پڑھتا ہوں تو مجھے ہر سطر میں خوبصورتی نظر آتی ہے۔ ڈکنس بھی پشکن کی طرح اپنی تراکیب اور اپنے الفاظ کو بہت غور سے انتخاب کرتا ہے۔ دنیا میں آجکل امارت وکبر سب سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔ مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جن دونوں صناع امرائے کبار و عظام کو خوش کرنے کے لیئے شاہکار تخلیق کیا کرتے تھے۔ ان دنوں فنون لطیفہ میں لطافت و نفاست باقی تھی۔ جس دن سے صناعوں نے عام لوگوں کے لیئے کام کرنا شروع کیا ہے اسدن سے کہیں کہیں صنعت میں ابتذال کے عناصر نظر آتے ہیں۔

ایک کہاوت مشہور ہے "عام لوگوں کے جذبات کا خیال رکھو۔ کیونکہ ان کی اکثریت ہے"۔ یہی اصول ہے جس کے ماتحت آجکل کے صناع کام کرتے ہیں۔ اگرچہ مجھے ڈکنس کی کتابیں پسند

نہیں تاہم میں اس قسم کے آرٹ کے خلاف ہوں۔

میں نے پوچھا "روس کے یہودیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے جواب دیا "جو باتیں میری طرف منسوب ہیں ان میں سے اکثر غلط ہیں۔ میرے لئے تمام مسائل کا حل مذہبی نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ تمام لوگ برابر ہیں "مسئلہ یہود" مفقود ہو جانا چاہئے۔ یہ سوال اسی طرح کا ہے جس طرح آپ مجھ سے مسئلہ اہل جرمن مسئلہ اہل شرق۔ مسئلہ اہل انگلستان کے متعلق کچھ دریافت کریں۔ اس قسم کے مسائل نہیں ہونے چاہیں۔ تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔ اگر روس کے یہودیوں میں کچھ نقائص ہیں تو وہ تمام تر ان مظالم کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جو ہم ان پر توڑتے رہتے ہیں۔ میں اہل یہود کے خلاف جو دشمنی کے خیالات پھیل گئے ہیں ان کی توجیہہ کس طرح کر سکتا ہوں؟ ہم اکثر ان لوگوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن کو ہم تکلیف پہنچاتے ہوں بہ نسبت ان لوگوں کے جو ہمیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔"

رات کو کھانے کے بعد ٹالسٹائی نے پھر یہود کا مسئلہ چھیڑا۔

"ہرزن ایک کہانی سنایا کرتا تھا کہ ایک بار ایک یونانی کیتھولک رومن کیتھولک۔ اور ایک پروٹسٹنٹ کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یونانی کیتھولک کا ادعا تھا کہ چڑیلیں اور جادوگرنیاں کیسو سے آتی ہیں۔ رومن کیتھولک کہتا تھا کہ یہ بات غلط ہے۔ وہ تو صرف چرنیگوف سے آئی ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ قسم کھا کر کہتا تھا کہ دو لوگ ان ارواح خبیثہ کا مسکن ہے۔ ہرزن سے استدعا کی گئی کہ وہ ان جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ اس نے کہا۔

میں اس بات کا نااہل ہوں کیونکہ مجھے چڑیلوں اور جادوگرنیوں کے وجود کا اعتبار ہی نہیں ہے۔ میں مسئلہ یہود کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ عین اسی طرح جس طرح میں چڑیلوں پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتا۔ اس مختلف مسائل کے وجود پر بھی کوئی اعتقاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد ٹالسٹائی نے شطرنج کی کئی بازیاں ڈاکٹر گولڈن ویزر سے کھیلیں۔ اور اس اثنا میں کونٹس ٹالسٹائی مجھ سے اپنی خود نوشت سوانحعمری کا ذکر کرتی رہی جو زیر تصنیف تھی۔

"ہماری شادی کو ۴۸ سال ہو گئے ہیں۔ اور چار سال کے بعد ہم اپنی سنہری شادی کی یادگار منائیں گے۔ میں اپنے خیال میں صرف انہیں واقعات کا ذکر کر رہی ہوں جن کو کونٹ کی زندگی سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ میں دو جلدیں لکھ چکی ہوں۔ مگر ابھی تک ۱۸۹۰ء کے حالات مکمل نہیں ہوئے۔ یہ تصنیف میری موت کے بعد شائع ہو گی۔"

تھوڑے عرصے کے بعد مہمان رخصت ہو گئے ٹالسٹائی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور باہر جھانکنے لگا۔ یکایک اس کے منہ سے نکلا۔ "کسقدر حیرت انگیز منظر ہے"۔

واقعی اسدن کی شفق ایسی جمیل و حسین تھی کہ میں نے اس سے پہلے یا اسکے بعد کبھی ایسی شفق پھولی ہوئی نہیں دیکھی۔ کچھ عرصہ وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری موت قریب ہے۔ مگر جوں جوں میری موت کے دن نزدیک آتے جاتے ہیں۔ میری مسرت بڑھتی جاتی ہے۔ آپ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب میں آپ کی طرح جوان تھا مجھے بھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ ہاں جوں جوں میں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں میری مسرت بڑھتی جاتی ہے۔

یہ تحریک جس کو موجودہ نظام کار کو بدل دیتا ہے ترقی کی راہ میں سنگ براہ ثابت ہوتی ہے انقلاب پسندوں کی سرگرمیاں کسی طرح بھی حکومت کے تشدد سے زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکیں ان جرائم سے ہمارے ملک کو کوئی ترقی حاصل نہ ہو گی۔ اس کے برخلاف سٹالپین جو ہر روز سیکڑوں آدمیوں کو پھانسی دیتا ہے۔ اور وہ انقلاب پسند جو نکوس درم کی جان کے درپے ہیں۔ دونوں واقعات کے فطری عمل ارتقا کو روکنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ تاریخ اس قسم کی مثالوں سے لبریز ہے۔ اندرونی بدامنی نے امریکہ میں حبشیوں والا ہولناک جھگڑا کھڑا کر دیا۔

ٹالسٹائی نے اپنے سر کو حرکت دی اور گویا اپنے آپ سے کہا۔

"کتنی عجیب بات ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔"

اس نے آہستہ سے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا

"آج سے پچاس سال پہلے جو مسئلہ تمام لوگوں کی نظروں کے سامنے تھا وہ۔ آزادی کا سوال تھا۔ اس وقت زمین کی ملکیت کا سوال ہے۔ کاشتکاروں نے درحقیقت زمین کی انفرادی ملکیت کبھی تسلیم نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین خدا کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بات احمقانہ خیال کی جائے گی۔ مگر میں

کہونگا۔ کہ اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ تمام ملک میں ہنری جارج کا نظام کار رائج کر دیا جائے۔ میں نے ایک ایسا طریقہ سوچا ہے جس سے یہ سوال حل ہو جائیگا۔ اس طریقہ کار کی ایک نقل حکومت کے سرکردہ عمال کو ارسال کر چکا ہوں۔ اس بات کے متعلق میں نے ایک بہت بارسوخ سرکاری ملازم کو لکھا ہے لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی ہے کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آتا ہے۔ افسوس ہے کہ حکام یہ نہیں سمجھتے کہ اسوقت جو چیز لوگوں کے بھڑکے ہوئے جذبات کو فرو کر سکتی ہے۔ تقسیم زمین کے مسئلے کا حل ہو جانا ہے۔

جیسا کہ میں "معاشری مسائل کی تمہید" میں لکھ چکا ہوں۔ ہنری جارج کا وسیع طریقہ کار ابتک عام لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے۔ ہنری جارج کا نظام کار اس قسم کا ہے کہ اقوام کی زندگی کے تمام انتظامات کو بدل دیتا ہے۔ اس طرح بدلتا ہے کہ مظلوم بے زبان تھکی ہوئی اکثریت نفع میں رہتی ہے۔ اور حکومت کرنے والی اقلیت گھاٹے میں طریقۂ کار اس قدر سادہ اور معقول ہے کہ یہ ناممکن کہ آدمی سے پڑھے اور سمجھے نہیں۔ اور جب سمجھ جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اسے عملی طور پر کام میں نہ لائے۔ ایسے خیالات سے مقابلہ کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو اسکی صورت کو مسخ کر دیا جائے اور یا اس کے متعلق کچھ نہ کہا جائے۔ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ یہ طریق کار بھی یا تو مسخ کر دیا گیا ہے یا اس کے متعلق مطلق خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۳۰ سال کے بعد بھی عام لوگ اس نظام کار سے ناآشنا ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت انگلستان۔ کینڈا اضلاع متحدہ امریکہ۔ اور جرمنی میں ایسے اخبارات و جرائد موجود ہیں جو اس نظام کے قایل ہیں۔ مگر ان سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا کے پڑھے لکھے لوگوں میں عام طور پر ہنری جارج کے خیالات کا کوئی اثر نہیں بلکہ دن بدن اس کے خیالات کی طرف سے تغافل بڑھتا جا رہا ہے۔ سوسائٹی ایسے خیالات سے جو موجودہ نظام کار کے امن و سکون کے مخالف ہوں۔ وہی سلوک کرتی ہے جو مکھی ان کیڑوں سے کرتی ہے۔ جنہیں وہ خطرناک خیال کرتی ہے۔ مگر جن کو فنا کرنے کی قوت اپنے آپ میں نہیں پاتی۔ یعنی ان کیڑوں کے آشیانوں کو بند کر دیتی ہے۔ تاکہ ان کی نسل بڑھنے نہ پائے۔ اسی طرح کا سلوک یورپی اقوام ان خیالات سے کرتی ہیں۔ جو اس امن بلکہ بدامنی کے خلاف ہوتے ہیں۔ جس کے وہ عادی ہو چکی ہیں۔ مگر نور ظلمت میں درخشاں ہوتا ہے۔ اور ظلمت نور کی درخشانی کو چھپا نہیں سکتی۔" کوئی ایماندارانہ نتیجہ بخش خیال فنا ہو نہیں سکتا۔ آپ اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کریں مگر بے سود ہوگا۔ خیال زندہ رہیگا۔ اور ان تمام خیالات سے زیادہ زندہ رہیگا۔ جس کے ذریعے لوگ اسے فنا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس خیال کو روس میں رائج کیا جائے۔ لوگ اس وقت زمین کی انفرادی ملکیت کے قایل نہیں روس کی ۹/۱۰ آبادی کاشتکار ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے تو یہ خیال صرف اس صحیح عقیدے کا آزادانہ اظہار ہے جو ان میں سے ہر ایک کے دل میں موجزن تھا۔ اس وقت جب روس کا معاشرتی نظام زیر و زبر ہو رہا ہے۔ اس خیال کو رائج کرنے کی اور اس سے عملی فائدہ اٹھانے کی بیحد ضرورت ہے اس وقت جب انقلاب پسند ملک کو خون کے سرخ سمندر میں غرق کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ خیال رائج ہو گیا تو گویا روس کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ یہ ہے میرا جواب۔

جب تک ہنری جارج کے اس خیال کو عملی شکل نہ دیجائیگی۔ روس کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ یوں ہماری پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ہنری جارج کے مترجم سے ضرور ملوں۔

اس نے کہا اس سے بھی اچھی طرح بحث کر لیجئے۔ اور اس کے بعد ہم اپنی گفتگو جاری رکھیں گے۔ "اور آیئے بریکفاسٹ تو کھا لیجئے۔"

وہ مجھے کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ دروازے میں میڈم ٹالسٹائی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔

باہر برآمدے کی طرف آکر میری ملاقات ڈاکٹر ڈشین سے ہوئی جو ٹالسٹائی کا علاج کرتا ہے۔ میں نے اس سے ٹالسٹائی کی صحت کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا۔

"پچھلے دنوں سے سیلان خون کی وجہ سے کونٹ بہت کمزور ہو گیا تھا مگر اب اس کی صحت اچھی ہے۔"

نکوسدلو سے ملنے کے بعد میں پھر واپس آگیا۔ ٹالسٹائی مجھ سے اپنی تازہ ترین تصنیف "میں خاموش نہیں رہ سکتا" کے متعلق

دنیائے ادب

ابتدائی تعلیم کا مقصد

ابتدائی تعلیم یعنی وہ تعلیم جو اسکول کے نقطۂ نظر سے مدارس تحتانیہ میں دیجاتی ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ طلبار کی ذات و شخصیت کو مدنظر رکھتے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ متعلم عموماً کمسن ہوتا ہے۔ اس کمسنی کا ثبوت نہ صرف اس کی جسمانی کیفیت بلکہ اخلاقی درروحانی و دماغی حالت سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر طلبار اس زمانے میں ایسی حالت میں ہوتے ہیں۔ کہ ان میں استقلال کا مادہ یا تو ہوتا ہی ہنیں۔ اور اگر ہوتا بھی ہے۔ تو بالکل برائے نام۔ گو عادات وخصائل اس زمانے سے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس میں ردوبدل بآسانی ہوسکتا ہے۔ یا اگر انہیں ایسا ہی چھوڑ دیا جائے۔ تو آیندہ پائداری ہو جاتی ہے۔ غرض کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں اچھے اور برُے عادات کا ملکہ ڈالا جاتا۔ یا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں کمسنی میں لڑکے کا شوق اور رجحان کمزور ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ آیندہ چل کر طالب علم میں کس قسم کا شوق ممکن ہے۔ اور ہم موجودہ ملکہ یا رجحان کو دیکھکر اس کی آیندہ زندگی میں اس قسم کی تائید پہنچانے کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔

تعلیم اس زمانے میں کسی خاص فن کے لئے ہنیں ہوتی کیونکہ خاص چیزوں کی تعلیم اس وقت دینا لڑکے کے لئے مضر ہوتا ہے۔ خاص تعلیم سے اس کے نشو ونما میں ہرج ہوتا ہے۔ اس زمانے میں طالب علم کی ہر ایک قوت کو آزادانہ یا بےروک علمی ترقی کرنے دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی قوت نقصان بخش بھی ہو۔ تو اس کا قلع قمع ہنیں کرتے۔ بلکہ اسی قوت کو کسی اور طرف مائل کرکے لڑکے کے لئے مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ کمسنی میں لڑکوں کی   کو روکنے سے زیادہ نقصان اُن لڑکوں کا ہوا ہے۔ اسی قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اب ان مثالونسے سبق حاصل کرکے ماہران فن تعلیم نے یہ نیتجہ اخذ کیا ہے۔ کہ پہلے لڑکے کو اس کی حالت پر چھوڑ کر یہ مشاہدہ کیا جائے۔ کہ وہ آیندہ چل کر کس کام میں نام پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اور کیونکر وہ نہ صرف خود اپنے لئے۔ بلکہ دوسرونکے لئے بھی فائدہ مند ہوسکتا ہے۔ بعد میں لڑکے کی روش کو دیکھکر آہستہ آہستہ مضر اثرات کرنے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان خیالات کا عملی صورت میں دنیا کے مشہور ومعروف مدارس میں رواج دیا گیا ہے۔

چونکہ بغیر مشاہدے وغور اور سوچ کے یہ کہنا ممکن ہنیں۔ کہ ایک کمسن طالب علم آیندہ چل کر کس فن میں کامیابی و ناموری حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے جب تک کافی ثبوت لڑکوں کی دلچسپی وشوق کا نہ ملے ان کو ایک خاص شعبے میں شروع ہی سے لگا دینا ضرور نقصان کا باعث ہوگا۔ گو صنعتی تعلیم مفید ہے لیکن لڑکوں کا خیال کرتے ہوئے مدارس تحتانیہ میں طلبار کو صنعتی کارندے بنانے کی کوشش کرنا نامناسب ہے۔ ہاں بعد اس منزل کے صنعتی تعلیم کو داخل نصاب کرنے میں نقصان ہنیں۔ بلکہ فائدہ ہے۔ المعلم

تامل

گرمیوں کا سہانا اور بھلا موسم تھا۔ اور دریا کا کنارا۔ ہاں! وہ دیکھو ذرا اس طرف دیکھو۔ سورج پہاڑیوں میں سے آہستہ آہستہ نکل کر دنیا کو رات کی تاریکی سے نجات دلا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ کچھ دنوں پہلے بھی رات کی تاریکی کو دن کی روشنی سے بدل دیا کرتا تھا۔ اور ہم یہاں بیٹھ کر راز ونیاز کی باتیں کیا کرتے تھے۔ آج بھی ہم دونوں بیٹھے ہیں۔ وہی جگہ ہے۔ وہی کنارا ہے۔ وہی سماں ہے۔ مگر افسوس ہمارے دل ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ وہ الگ چپ بیٹھی ہے میں اسطرف سر

[illegible]

سنسکرت

زندگی

جب انسانی روح جسم کے چولے میں آتی ہے تو اسکی مصیبتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ دکھ اور سکھ اس کے ساتھی ہو جاتے ہیں۔ اسے دکھ ہو یا سکھ۔ ہر حالت میں اس کی عقل ضائع ہو جاتی ہے۔ جذبات اس کی عقل کو اس طرح اُڑا کر لے جاتے ہیں۔ جس طرح ہوا بادلوں کو لیجاتی ہے۔

انسان سوچتا ہے۔ میں کیسے شریف خاندان میں سے ہوں۔ میں اپنی زندگی میں شادکام ہوں۔ میں صرف حقیر انسان ہی نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہوں۔

اس کے بعد وہ اپنے باپ دادا کے اندوختے کو برباد کر دیتا ہے۔ عشرت کی جستجو میں ایک جگہ قرار نہیں لیتا۔ باپ دادا کا اندوختہ برباد کرنے کے بعد وہ دوسروں کی دولت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔

ہر ایک ذہنی غم کا باعث دماغ کی پریشانی ہے۔ یا اندوہ کی فراوانی۔ تیسری وجہ کوئی نہیں۔

دو خونخوار بھیڑیوں کی طرح موت اور بڑھاپا انسان کو نگلے جاتے ہیں۔

کوئی شخص ان خونخوار بھیڑیوں کے چنگل سے نہیں بچ سکتا۔ اگرچہ اس نے زمین کو سمندر کے دوسرے کنارے تک فتح کرلیا ہو۔

جب اندوہ وغم انسان پر حملہ کریں۔ تو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں۔

بنگالی

تیری خواہش میری خواہش تھی۔ اور تیری خوشی میری مسرت تیرا دیدار میرے بے قرار دل کا سرور۔ اور تیری ملاقات میری منتظر آنکھوں کا نور۔ ہوا کرتی تھی۔ تیرے غم و الم سے میرے دل کو ایسی ٹھیس لگتی تھی۔ گویا کسی قاتل نے خنجر مارا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ تو جدا ہو جائے گا۔ اگر مجھے اس جدائی کی خبر ہوتی۔ تو میں محبت ہی کیوں کرتا۔

چینی

کنفوشس کے اقوال

شیریں کلامی اور رنگیں بیانی نیکی کے ساتھ کبھی نہیں پائی جائے گی۔

وفاداری اور صداقت کو اپنی شمعِ راہ بناؤ۔ صرف انہیں کو درست سمجھو جن میں یہ باتیں موجود ہوں۔

مطالعہ تفکر و تدبر کے بغیر فضول ہے۔ تفکر مطالعہ کے بغیر ذہنی موت ہے۔

مافوق الفطرت مناظر و مظاہر کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش نہ کرو نقصان ہوگا۔

میں تمہیں بتاؤں علم کیا ہے۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے۔ کہ تم کیا جانتے ہو۔ اور کیا نہیں جانتے۔ تو یہ علم کی تکمیل ہے۔

خدا کو ناراض کر دینے والو! یاد رکھو اسے خفا کر دینے کے بعد تمہارا کوئی سہارا نہیں ہے۔

انسان کی برائیوں کا جائزہ لو۔ اس کی نیکیاں تم پر خود بخود روشن ہو جائیں گی۔

(وچی ون نے عمل کرنے سے پہلے تین بار سوچا۔ کنفوشس کہا "دو بار کافی تھا")

جو لوگ صداقت کے معنے سمجھتے ہیں۔ وہ اُن سے پست تر ہیں جو صداقت کو پیار کرتے ہیں۔

انسانیت محبت کا دوسرا نام ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی ہے۔ بدی کا بدلہ انصاف

موت۔ اور زندگی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ موت سے ڈرنا فضول ہے۔

لوگ دولت کے لئے دیوانے ہو رہے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔ کہ آگ ضرور جلائے گی۔

. . . .

عرب کا ایک تاریخی افسانہ

مروّت

"عبدالملک بن مروان اپنے عزم اپنے حزم اپنے تدبر اور حسن تدبیر کی بنا پر بجا طور پر دولت امویہ کا دوسرا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے وقت کا سخن سنج اور سخن فہم ادیب بھی خیال کیا جاتا ہے۔ اُسے شعر و شاعری سے شغف تھا۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ ایک شاعر کی حساس طبیعت عشق و محبت سے کسقدر متاثر ہوتی ہے۔ اور حسن و جمال سے وہ کتنا جلد مرعوب ہو جاتا ہے

عبدالملک کو سلطنت کی مادی طاقت بھی حاصل تھی اور علم و ادب کی روحانی قوت بھی۔ پھر اپنے وقت کی سب سے حسین و جمیل اور سب سے فطین و ذہین اپنی حجازادہن عاتکہ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جانا اسکے لئے کونسی بڑی بات تھی۔ عاتکہ حسین تھی جمیل تھی۔ اُس کا حسن ماہتاب سے زیادہ لطیف۔ اور اُس کا جمال آفتاب سے زیادہ پر جلال تھا۔ اُس کا قد نیزے کی طرح سیدھا۔ اور اس کا جسم پھول جیسا شاداب تھا۔ وہ چلتی تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ باد نسیم کے جھونکے درخت بان کی سرسبز شاخ کو حرکت دے رہے ہیں۔ وہ بولتی تو محسوس ہوتا کہ کوئی فرشتہ اپنے زریں نغموں کے ساتھ سرزمین دمشق پر اُتر پڑا ہے

عبدالملک شاعر تھا۔ حسن پرست تھا۔ جمال اور جمالیات کا نقاد تھا۔ پھر عاتکہ جیسی مجسمۂ جمال کی ناز برداری اس سے زیادہ اور کس سے ہو سکتی تھی۔ عاتکہ شمع تھی اور وہ پروانہ۔ عاتکہ حسن کی دیوی تھی اور وہ اس کا پجاری۔ عاتکہ ایک بار روٹھ گئی۔ اور عبدالملک جس کے تدبر اور تدبیر کے سامنے ہر گتھی سلجھی ہوتی تھی۔ جس کی جنگی قابلیت نے باغیوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ جسکی ادبی لیاقت کا بڑے بڑے ادیب لوہا مانتے تھے۔ اس کی عاتکہ کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اور وہ روٹھی ہوئی عاتکہ کو کسی طرح نہ منا سکا۔ آخر اس نے اپنے رازدار مصاحب عمر ابن بلال اسدی سے سارا ماجرا بیان کیا۔

عمر امیر المومنین معاویہ کے عہد سے دربار میں رہتا چلا آیا تھا۔ اور اس کی کبرسنی اور بنی اُمیہ کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ کی وجہ سے شاہی خاندان میں اس کا خاص احترام کیا جاتا تھا۔ اور اکثر اس کی بات مان لی جاتی تھی۔

عبدالملک سے رخصت ہو کر عمر عاتکہ کے ہاں پہنچا۔

عاتکہ۔ کیسے آنا ہوا؟

عمر۔ کیا بتاؤں زمانے کے حوادث نے مجھے پیس ڈالا ہیں۔ اور میرا خاندان تباہ ہو گیا۔ میرا لڑکا گم ہو گیا ہے۔ امیر المومنین کا خیال ہے۔ کہ اسے اس کے بھائی نے قتل کر ڈالا ہے۔ اور اب قصاص کے طور پر وہ اسے قتل کرانا چاہتے ہیں۔ میں دونوں کا باپ ہوں۔ اور میں قصاص سے دست بردار ہو گیا ہوں۔ مگر امیر المومنین نہیں مانتے۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ اس طرح رسم پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی کو قتل کر دے گا۔ دونوں کا ولی معاف کر دیا کرے گا۔ اور اس طرح خون رائگاں جائے گا۔

آپ کو معلوم ہے۔ کہ آپ کے دادا معاویہ اور آپ کے والد یزید میرا کتنا خیال کرتے تھے۔ اور میری پاسداری انھیں کتنی ملحوظ رہتی تھی۔ میں اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر آپ کے پاس امید لے کر آیا ہوں۔ میرے لڑکے کو قتل ہونے سے بچائیے۔ اب دنیا میں صرف وہی میری پشت پناہ ہے۔ مجھے قبر کی کٹھن منزل تک سہارا دینے والا اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

عاتکہ نے بڈھے عمر بن بلال کو دلاسا دیا اور وعدہ کیا کہ اس کی رہائی کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گی۔

بڈھا اپنا تیر نشانے پر پڑنے اور تدبیر کامیاب ہونے کی وجہ سے خوش خوش واپس آیا۔

عائکہ نے اپنے لباس کو نہایت خوشبودار بخورات کی دھونی دی - اور خوب بن سنور کر عبد الملک کی نشستگاہ میں پہنچی - عبد الملک سراپا دردوغم کی تصویر بنا بیٹھا تھا

عائکہ کے سلام کا کچھ سرد دلی سے جواب دیا گیا - عائکہ شرمندہ سی ہوکر عبد الملک کے پہلو میں بیٹھ گئی - اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں - لیکن عبد الملک بہت دیر تک کھچا ہی رہا آخر عائکہ کی آخری تدبیر ــــ عبد الملک کی پیشانی کا ایک بوسہ - کامیاب ثابت ہوئی - اور اس نے عمر بن بلال کے لڑکوں کا قصہ چھیڑ دیا - عبد الملک سب کچھ سمجھ گیا - اور عمر کے لڑکے کی رہائی کے سوال پر مسلسل چون وچرا کرتا رہا - عائکہ نے مایوس ہو جانے کے بعد گر کر اس کے پیروں کو بوسہ دیا - اس کے بعد اب بھلا کونسی حد باقی تھی - عبد الملک نے اسے اُٹھا لیا - عمر کے لڑکے کی جاں بخشی ہوئی - اور دونوں میں صلح وصفائی ہوگئی -

عبد الملک خوش خوش مسکراتا ہوا باہر نکلا - عمر منتظر تھا - پوچھا - کہ یا امیر المومنین کیسی گذری ؟ عبد الملک نے جواب دیا بارک اللہ فیک - تمھاری تدبیر کارگر ثابت ہوئی -

عمر نے کہا واللہ اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا کہ وہ اپنی مروت اور شرافت کی پاسداری میں اپنے غرور حسن کو پامال کردے گی تو میں اس تدبیر کی ہرگز جرأت نہ کرتا +

سید محفوظ

فارسی

وقت کی پابندی

تم کو آج کا کام آج ہی اور اسی وقت کر لینا چاہئے تمھیں کل کے متعلق معلوم ہی کیا ہے - کہ کل کیا ہوگا ؟ کل کا خیال محض ایک سودا اور جنون ہے - وقت کی قیمت نہ پہچاننی ایک بڑی نادانی اور کھلی ہوئی بیوقوفی ہے - پروگرام پر پروگرام اور اسکیم پر اسکیم تیار کیجائے لیکن ٹال مٹول کی وجہ سے اگر ایک پروگرام یا اسکیم کو بھی عملی جامہ پہننا نصیب نہ ہو - تو اس سے بڑھ کر انسان کی کورعقلی اور کیا ہوگی - کیونکہ اس ٹال مٹول میں زندگی کے گنے چنے دن ختم ہو جائیں گے - اور تمھیں خبر تک نہ ہونے پائیگی +

ہندی

زندگی کیا ہے ؟ زندگی ایک خاموش - مگر خوش گوار نیند ہے نہیں - بلکہ ایک فرحت انگیز اور راحت بخش خواب - خیر ! کچھ بھی ہو - لیکن اس خاموش فضا میں ہیجان کیوں پیدا کروں اس پر اپنے ساز کو مضراب حیات زندگی کے مضراب سے کیوں چھیڑ دوں - اور یہ خوابیدہ نغمے کیوں گاؤں - بہتر تو یہ ہے - کہ شراب پیوں - اور مست رہوں - اور اس کی مستی میں گم رہوں - فکر دنیا و آخرت سے آزاد رہوں - کسی کے در پر رہوں - یا اپنے گھر میں مجبور بیٹھا رہوں - جہاں کہیں بھی رہوں آزاد رہوں - مست رہوں - بے فکر رہوں اور بے خبر رہوں +

مرہٹی

اے کمزور اور نادان انسان ! جب تیرے کوچ کا نقارہ بج رہا ہو - شب زندگی ختم ہونے کو ہو - اور شمع حیات موت کے جھونکوں سے چراغ سحری بنی ہوئی ہو - تو - تو آیندہ کے امتحان کے لئے بالکل تیار ہو جا - بہشت بریں کے سنہری دروازوں پر فرشتے تجھے روکیں گے - اور تجھ سے کچھ دریافت کریں گے - مگر وہ تجھ سے تمھارے نسب کی بابت نہیں پوچھیں گے - بلکہ وہ دیکھیں گے - کہ تو اپنے ساتھ کیا لایا ہے ؟ اور تو نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے ؟

جاپانی

جاپانی شاعری

ہماری قومی شاعری کا سرچشمہ انسان کا دل ہے۔ جو بالیدہ ہونے والے بیج کی طرح ہے۔ اور جس سے زبانوں کے پتے پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں انسان کو لاکھوں کام ہیں۔ اور انسانی عقل و ذہن کی کارفرمائیاں بے شمار ہیں۔ جو کچھ انسان سنتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے اُسے بیان کرنے کے لئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ جب ہم بہار میں عندلیب نغمہ سرا کے جانفزا نغمے سُنتے ہیں۔ اور خزاں کے دنوں میں تالابوں میں مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز آتی ہے۔ تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فطرت کے نغمہ آفریں نظام میں ہر شے کار آمد ہے۔ ہماری وطنی شاعری زمان و مکان کے قیود سے بے نیاز ہو کر آسمان اور زمین کو ہلا دیتی ہے۔ نادیدہ دیوتاؤں اور دیویوں کو متاثر کرتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار اور لطیف بنا دیتی ہے۔ جنگجو سورماؤں کے دلوں کو تقویت دیتی ہے۔ جبدن سے آسمان و زمین عالم وجود میں آئے ہیں اُسی دن سے ہماری شاعری نے جنم لیا ہے۔

پھول کی رنگینی کو دیکھ دیکھ کر انسان کا دل وفور مسرت سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ پرندوں کے چہچہانے کی آواز بنکر خود اُن کا ہم نوا بن جاتا ہے۔ بہار خوشگوار۔ نم آلود فضا سے متاثر ہو کر آسمانی بادشاہوں کے خواب دیکھتا ہے۔ صبح کی شبنم کے ساتھ خود بھی اشک آلود ہو جاتا ہے۔ اور ان تمام انسانی محسوسات کے بیان کے لئے الفاظ کے جامے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عین اسی طرح جس طرح ایک ایک قدم چل کر طویل راستہ طے ہو جاتا ہے۔ عین اُسی طرح جس طرح ذرہ ذرہ مل کر عظیم الشان اور بلند پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جن کی چوٹیاں تیرتے ہوئے بادلوں میں لپٹی رہتی ہیں۔ شاعری بھی رفتہ رفتہ ارتقا پا کر ایک بے نقاب جلوہ۔ ایک کھنچی ہوئی تلوار۔ ایک بے پناہ شعلہ بن جاتی ہے۔

. . . .

فرانسیسی

معاشرت

جو شخص انسان کی فطرت سے واقف ہے۔ اُسکے لئے ضروری نہیں۔ کہ وہ خوشامدی اور فریب کار بھی ہو۔ ان باتوں کے بغیر بھی دنیا اس کی تابع فرمان ہوگی۔ ایسا شخص صاف گو اور حق شناس ہوگا۔ وہ کبھی اپنی امارت اور لیاقت ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کی گفتگو موٹے موٹے الفاظ مشکل مشکل ترکیبوں۔ الفاظ اور معانی کی صنعتوں سے بالکل عاری ہوگی۔ وہ کبھی ایسی جگہ اپنے علم و فضل کا اظہار نہ کریگا جہاں لوگوں کو علم و فضل کے موضوعات سے دلچسپی نہ ہو۔ آپ ایسے شخص سے کہیں بھی ملیں۔ وہ فوراً آپ کو متاثر کرلے گا وہ آپ کے سوتے ہوئے جذبات و احساسات کو اپنی ہمدردی سے جگا دیگا۔ آپ کے خیالات اور جذبات کا صحیح اندازہ کریگا

قصہ مختصر تھوڑے عرصہ میں اُسے آپ پر مکمل اقتدار حاصل ہو جائیگا یہی آپ کی دوستی پائدار ہوگی۔ جب اُسے مجلس میں مختلف آدمیوں کے مزاج سے سابقہ پڑے گا تو وہ اپنی گفتگو کا موضوع ایسا انتخاب کرے گا۔ کہ تمام لوگ اُس میں دلچسپی لیں۔ اگر آپ اُسے کسی مغرور و بدمغ شخص کے غصے کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ پائیں۔ تو آپ کہہ اٹھیں گے کس قدر شیریں زبان اور فصیح شخص ہے۔ کسی غم زدہ کو تسلی دیتے ہوئے وہ مجسم گداز و غم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ریاکاری نہیں۔ بلکہ اُس کا دل اس قدر حساس ہے۔ کہ اضطراب و غم کی ہلکی سے ہلکی لہر ایک طوفان برپا کر دیتی ہے۔

جرمن

صنعت میں ابتذال کا عنصر

ہزاروں چیزیں بنفسہ اپنے اجزا کی وجہ سے مبتذل کہلاتی ہیں۔ مگر صنعت موضوع کے ابتذال کو فنا کر کے اسے لطافت و تنزہت کی رفعتوں تک پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے عام طور پر صنعت میں ابتذال سے ہمیشہ ابتذال انداز و صورت مراد ہوتی ہے۔ جس شخص کا ذہن مبتذل جذبات سے لبریز ہے۔ وہ اپنے مبتذل انداز سے لطیف سے لطیف موضوع کو برباد کر دیگا جس شخص کی روح میں نجابت و شرافت کے آثار ہیں۔ وہ ابتذال کو کسی روحانی شئے سے متعلق کر کے اس میں ایک متین اور شریفانہ پہلو ظاہر کرے گا۔

(شلر)

ولندیزی

کارلائل

جب میں کارلائل کا تصور کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے کنگ لیر کی صورت آجاتی ہے۔ ہوا اور بجلی کی بے پناہ طاقتوں کو الزام دینے والا۔ سازش کے مینہ سے لڑنے والا۔ کارلائل عظیم الشان کارلائل۔ وقت کے سیلاب کے سامنے بس مجبور۔ ایسے معتقدات سے وابستہ جن کا فنا ہو جانا تقدیر میں لکھا ہوا تھا۔ حقیقت میں شکسپیر کے ان الفاظ کی یاد دلاتا ہے ہواؤ۔ طوفانی ہواؤ چلتی رہو۔

(ہویٹ)

سویڈن

اناطول فرانس

اناطول فرانس کا سوانح نگار لکھتا ہے "ایک دن اس نے کہا" لوگ میرے علم و فضل کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم بے کار شے ہے۔ ہاں محبت کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ زندگی مختصر ہے اور محبت کے افسانے طویل۔ اس وقت میں صرف صحیفۂ عشق کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ادب کو ایک احمقانہ متانت اور وقار سے گھیر رکھا ہے۔ کس قدر حیرت انگیز اعتراف ہے۔ مندرجہ بالا الفاظ سے جو اناطول فرانس نے اپنے سوانح نگار کے سامنے استعمال کئے تھے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان کی تصانیف میں اس کے دلی جذبات کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اگر وہ اپنے ماحول اور اسکی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا۔ تو خدا جانے دنیا کے سامنے محبت اور عشق کے کیسے کیسے رموز بے نقاب ہو جاتے۔

فن لینڈ

کسی نقاد کا قول ہے۔ کہ فن لینڈ کی شاعری اور ہماری شاعری میں زندگی کے شعلے بھرے ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ کو چیرنا ممکن ہو۔ تو ان سے خون بہنے لگے گا۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات ایک حد تک غلط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہماری شاعری طرح طرح کی دلکشیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مگر اس میں صرف خون ہی کا رنگ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری شاعری شفاف شیشے کی طرح ہے۔ جس میں سے سورج کی کرنیں اپنی پوری تابانی کے ساتھ گذر جاتی ہیں۔ مگر سایہ پیدا نہیں کرتیں۔

(کوسکینمی)

روسی

اپنے متعلق

میں اپنے نام سے تنگ آ گیا ہوں۔ اُکتا گیا ہوں۔ مجھے اپنے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔ جب میں اپنا مضمون ختم کر چکنے کے بعد اپنا نام (روزانو) ثبت کرتا ہوں۔ تو میرے دل میں عجیب قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

ایک روز میں بازار میں جا رہا تھا۔ کہ میری نظر ایک نان پز کی دکان پر جا پڑی۔ اس کے تختے پر لکھا ہوا تھا۔

روزانو نان پز

بالکل ٹھیک۔ واقعی نان پز کا نام روزانو ہی ہونا چاہئے۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ روزانو نان پز ہی ہونا چاہئے

"کلیات روزانو" کس قدر لغو معلوم ہوتا ہے۔ کون بے وقوف میری تصانیف کو پڑھنے کی تکلیف گوارا کرے گا کوئی بھی نہیں۔

کسی دن مجھ سے کوئی شخص پوچھے گا۔ آپ کیا کام کرتے ہیں مسٹر روزانو "

میں کہوں گا میں مضمون نگار ہوں۔ انشا پرداز ہوں۔

وہ جواب دے گا لاحول ولاقوۃ۔ آپ نان پزی کیا کیجئے آپ کو ادب سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بالکل ٹھیک وہ درست کہے گا۔

(واسلی روزانو)

ناروے

بچوں کی کہانیاں

ہمارے ملک کی کہانیوں میں اُن مناظر و مظاہر کا بار بار ذکر آتا ہے۔ جو یہاں سے خاص ہیں۔ مغربی حصوں میں جہاں پہاڑ اور سمندر ایک غم افزا حیات و عظمت حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کی کہانیاں پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خود بھی اپنے ملک کی سبزی سے متاثر ہوا ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

تین عمر رسیدہ آدمی ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سر آسمان کے ساتھ چھوتے تھے۔ اور ان کے پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے تھے کئی سو سال سے وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے چراگاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ شاید وہاں کوئی گائے گھاس کھا رہی ہے۔

دوسرے نے سو سال کے غور کے بعد کہا "ہاں"!

تیسرے نے ۲۵۵ سال کے بعد بلند آواز میں کہا اگر تم لوگ اس طرح باتیں کر کے مجھے تنگ کرو گے۔ تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

(جوہن بوجر)

ہسپانوی

دعا

پودوں کو پانی دینے کے چار طریقے ہیں۔ آدمی خود اپنے ہاتھ سے کنوئیں کا پانی نکال کر پودوں کو سرسبز و شاداب کر سکتا ہے۔ طاقتور بیلوں کے ذریعے بھی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ دریا سے بھی پانی لایا جا سکتا ہے۔ جس سے تمام زمین ہری بھری ہو جائے اور سب سے اخیر میں باران رحمت ہے۔ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اور ہر شے کا منہ دھلاتا ہے۔

عین اسی طرح دعا کے بھی چار طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ کنوئیں کی آبپاشی کی طرح ہے۔ اس میں یہ نقصان ہے کہ کنوئیں کا پانی خراب ہو جائے یا ختم ہو جائے۔ تو پھر مایوسی ہی مایوسی ہے۔ باغبان کے پاس سوائے تلخ آنسوؤں کے کچھ نہیں رہتا۔ دوسرا طریقہ روحانی دعا و ذکر کا ہے۔ اس صورت میں درختوں کی کونپلیں پھوٹ آئیں گی۔ اور پھول شگفتہ ہو جائیں گے

تیسرا طریقہ عشق الٰہی کا ہے - اس صورت میں ہم گویا خدا سے باتیں کرتے ہیں - غنچے کھل اُٹھتے ہیں - اور اُن کی روح پرور خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے - چوتھی قسم کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا - اس قسم کی دعا کے بعد محنت کی ضرورت نہیں رہتی - موسم کبھی نہیں بدلتا - پھول کبھی نہیں مرجھاتے اور پھل ہمیشہ لذیذ اور خوش گوار رہتے ہیں -

(سانٹا ٹریسا)

بلجیم

خاموشی

"خاموشی" کارلائل کہتا ہے - "خاموشی"

اگر اس زمانے میں مندروں اور عبادت گاہوں کی تعمیر جائز ہو - تو میں خاموشی کی پرستش کے لئے ایک مندر بنواؤں - خاموشی وہ سانچہ ہے جس میں دنیا کی بڑی بڑی چیزیں ڈھلتی ہیں - اس سانچے میں ڈھلنے کے بعد وہ اپنی پوری مہابت وعظمت میں نمودار ہوتی ہیں - زندگی کا دن خاموشی میں رات سے پیدا ہوا ہے - مجھے جتنے بڑے آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے - تمام بالطبع خاموش تھے - کام کرنے والے خاموش رہتے ہیں - اپنے کام کا کبھی ذکر نہیں کرتے -

ایک فرانسیسی فلسفی نے کہا ہے - کہ گفتگو خیال کے اخفا کا ایک طریقہ ہے - مگر میں کہتا ہوں - کہ گفتگو خیال کا گلا گھونٹ دیتی ہے - اور چھپانے کے قابل شے ہی نہیں باقی رہتی -

گفتگو وقت ہے - خاموشی ازلیّت اور اُلوہیت -

خیال صرف خاموشی میں پھولتا پھلتا ہے -

نیکی چھپی ہو تو نیکی ہے -

کس قدر لغو خیال ہے - کہ الفاظ کے ذریعے ہم اپنے خیالات کو ادا کر سکتے ہیں - اور مخاطب کو اپنے جذبات وخیالات سے آشنا کر سکتے ہیں -

جب ہم حقیقت میں کوئی قابل ذکر بات کہنا چاہتے ہیں - اُس وقت خاموشی تکلم سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے - ہم خاموش رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں - اگر ایسے لمحات میں ہم خاموش نہ رہیں تو گویا ہم کو ایسا نقصان ہوگا کہ ہم انسانیت کے تمام خزانوں کو کسی ایسی چیز کے عوض کھو دیں گے - (موریس میٹرلنک)

اطالوی

زندگی کی صبح وشام

انسان کی صبح حیات سے کیا مراد ہے ؟

میرے خیال میں تو صبح حیات عہد شیرخوارگی کو کہنا چاہیے - شیرخوارگی کا عہد ایک نازک پودے کی طرح ہے -

اے نوجوان میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بوڑھا ہونے کے بعد پھر تو جوان نہ ہو سکے گا -

اے حسین وجمیل دوشیزہ میں تجھے بتاتا ہوں - کہ دوشیزگی کی آسانی نشان باقی نہ رہے گی - اگر تو نے اپنی زندگی میں بُرے کام کئے ہیں - تو خدا تجھے موقع دے گا - کہ اچھے کاموں سے اُن کی تلافی کرے - مگر یہ نہ ہوگا - کہ تجھے ازسرنو جوانی کی شراب پینے کا موقع دیا جائے -

۳۰ سال کے بعد زندگی کی شام کے سائے گہرے ہونے شروع ہو جائیں گے -

(سان برنارڈینو)

پولینڈ

ڈان کوئکسات کی روح

ہر خیال کے ارتقا کے ایک خاص مرحلے پر ڈان کوئکسات کی روح نمودار ہوتی ہے - اس وقت ضرورت ہوتی ہے کسی نیک نیت شخص کی جو تصوّر اسا بیوقوف بھی ہو - حقارت اور باطل تصورات کی ہوائی چکیوں سے لڑائی کرنے کے لئے تیار ہو - جو راستہ دکھانے کے لئے مستعد ہو - جو مذاق اور طنز کے تیر کھانے کا مشتاق ہو - اس وقت ڈان کوئکسات کی روح کسی شخص میں حلول کر جاتی ہے -

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۸۲

فہرستِ مضامین

جلد ۲ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۳

تصاویر:- (۱) لیلیٰ مجنوں (سہ رنگی) (۲) نور جہاں (چہار رنگی) (۳) زارانِ روس کا مدفن (یک رنگی) (۴) لعبت چین۔ (۵) حسن قرطبہ (۶) قانون دان اور انصاف (۷) ڈاکٹر اور موت (۸) وسط ایشیا کی ایک شہزادی۔

ملکۂ نورجہاں

ہے تجھ پر ہند نازاں نازشِ ہندوستاں تو ہے
نہیں کچھ ہند ہی پر منحصر نورِ جہاں تو ہے
جہاں اک پیکرِ بیجاں ہے اس پیکر میں جاں تو ہے
جہاں اک آسماں ہے آفتابِ آسماں تو ہے

ترا حسن جہاں آرا جہاں افروزِ الفت ہے
ترا مہرِ تجلّی آسماں افروزِ الفت ہے

درخشاں سطحِ راوی پر ہے تیری آب و تاب اب تک
درخشانی ہے تیری سرمۂ چشمِ حباب اب تک
ترے نظّارے ہیں آسودۂ آغوشِ آب اب تک
ہے تیرا منتظر پانی میں عکسِ آفتاب اب تک

لبِ راوی کسی دن دیکھ پائی تھی جھلک تیری
کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں موجیں چمک تیری

جہانداری کو تیری مانتا ہے ہر عقیل اب بھی
ہیں تیرے کارنامے کاروانی کی دلیل اب بھی
مسلّم کشور آرائی تری بے قال و قیل اب بھی
مؤرخ کی زباں پر ہے ترا ذکرِ جمیل اب بھی

زمیں گیری نے تیری کی ہے حاصل آسماں گیری
شکستہ قبر تیری دیتی ہے درسِ جہاں گیری

لگی ہے چُپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے
تری خاموشیٔ مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے
تو زیرِ خاک ہے پھر بھی زیارت گاہِ دنیا ہے
شکستہ قبر تیری کعبۂ چشمِ تماشا ہے

زمیں شاہدرہ! تو ہے حریفِ چرخِ مینائی
کہ تجھ میں دفن ہے ہندوستاں کی کشور آرائی

تاجور

حال وقال

آنریبل جسٹس سر عبدالقادر

ناظرین ادبی دنیا یہ مژدۂ جانفزا سن کر خوش ہونگے کہ ادبی دنیا کے محترم نگراں سر عبدالقادر پنجاب ہائی کورٹ کی ججی کے منصب پر سرفراز کیئے گئے ہیں۔

شیخ صاحب کے اس شاندار اعزاز میں اُن کے ساتھ اُن کا ملک عموماً اور ملک کا علمی و ادبی طبقہ خصوصاً حصہ دار ہوگا کہ اُن کی ذات ملک کے لئے عام طور پر اور علمی و ادبی طبقے کے واسطے خاص طور پر باعث عزت و افتخار ہے۔ رسالہ ادبی دنیا کے لئے یہ امتیاز اُس کی ہر شان اور خصوصیت سے زیادہ بلند اور گراں مایہ ہے کہ اُس کا ڈائرکٹر بین الاقوامی شہرت کا مالک اور ملک کی بڑی سے بڑی عزت سے سرفراز ہے۔ ہم اس گرانقدر اعزاز پر اپنی جانب سے اپنے اسٹاف اور ادبی دنیا کے لاکھوں ناظرین کی طرف سے سر موصوف کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ملک کے علمی ادبی و تعلیمی خدمات انجام دینیوالے طبقوں کی طرف سے پنجاب ہائی کورٹ کے تمام آنریبل ججوں اور آنریبل چیف جسٹس سر شادی لال قبلہ کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس منصب جلیلہ کے لئے سر عبدالقادر کا انتخاب فرما کر اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیا۔

ملک کی تمام ادبی علمی و تعلیمی مجالس و ادارات کو آنریبل چیف جسٹس کے شکریہ کی قرارداد منظور کرکے برقی پیغامات کے ذریعہ ان تک پہونچانی چاہئے۔

رسالہ ادبی دنیا کی مانگ ملک کے ہر گوشے میں بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان سے باہر انگلستان، فرانس امریکہ اور افریقہ کے اُن حصوں سے خریداروں کی درخواستیں پیہم چلی آرہی ہیں۔ جہاں ہندوستانی باشندے بود و باش رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر طبقہ اس کا استقبال کر رہا ہے۔ غریب کلرکوں، ٹیچروں، طالبعلموں دکانداروں، دستکاروں سے لیکر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر، یونیورسٹیوں کے چانسلر اور وائس چانسلر، کونسلوں کے ممبر حکومت اور ریاستوں کے وزیر تک ادبی دنیا کے مستقل طور پر خریدار ہیں۔

اس ہر دلعزیزی کی انتہا اس پر ہوتی ہے کہ ملک کے جن اخبارات و رسائل سے ہم عدم گنجایش یا زبان فہم نہ ہونے کے سبب تبادلہ منظور نہیں کر سکے۔ اُن کے محترم ایڈیٹروں نے خریدار بن کر ادبی دنیا کو حاصل کرنا ضروری سمجھا۔

محترم ملک نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی ادبی دنیا کو ترقی دینے میں مربیانہ امداد فرما رہے ہیں۔ آنریبل مرزا محمد اسمٰعیل صاحب قبلہ دیوان (وزیر اعظم) میسور ادبی دنیا کو خاص طور پر پسند فرماتے ہیں۔ ادبی دنیا کے رجسٹر خریداروں کو آپ کے نام گرامی سے بھی شرف حاصل ہے۔ آنریبل خان بہادر سر شہاب الدین پریذیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ارشاد ہے کہ

"ادبی دنیا جیسے پرچے کی اشاعت تو کم از کم پندرہ ہزار ہونی چاہئے"

ادبی دنیا پران گراں پایہ حضرات کی توجہ کے ساتھ اُن نادار اور ادبی ذوق کے شیدیوں کے خطوط بھی التفات طلب ہیں جو لکھتے ہیں کہ اپنے ذاتی خرچ میں سے دو دو چار چار آنے جوڑ کر جمع کئے ہیں تاکہ ادبی دنیا کو خرید سکوں"۔ غریب مدرسوں اور نادار طالبعلموں کے خطوط اس مضمون کے آئے دن آتے رہتے ہیں۔

ادبی دنیا کی یہ حیرتناک ہمہ گیری و ہمہ رسی ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملک میں اپنے خدمتگذاروں کی قدر افزائی کا جذبہ عام ہو رہا ہے۔ اور یہ کہ اصل و نقل اور نور و ظلمت میں امتیاز قائم کرنے والوں کی ملک میں کمی نہیں ہے۔

ہندوستانی یونیورسٹیاں

ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تعلیمی تحریکات کے متعلق ہم ایک سلسلۂ مضامین جاری کرنا چاہتے ہیں تاکہ ملک کے اس طبقے کو جو انگریزی زبان سے آشنا نہیں۔ ملک کے تعلیمی اداروں کی خدمات سے باخبر رکھا جاسکے۔ اس سلسلے میں ہم ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹی کی تعلیمی ترقیوں اور اس کے آئندہ تعلیمی پروگرام کے متعلق اطلاع دیکر ہماری مدد فرمائیں۔

ایڈیٹر

آئینۂ عالم

لاسلکی اور تعلیم

انگلستان کے ایک علاقے میں ایک سال تک لاسلکی اسباق بطور تجربہ جاری رہے۔ تجربے کے بعد چالیس میں سے ۳۷ اسکولوں نے یہ تصریح کی ہے کہ آجکل تعلیم میں لاسلکی سے مدد نہ لینا بہت بڑے تعلیمی نقصان کا باعث ہے۔ وہاں کے اساتذہ کی رائے میں لاسلکی اسباق سے مندرجہ ذیل فوائد ہوئے :۔

۱۔ طلبہ کو حالات کے مطابق درست واقفیت بہم پہنچی۔
۲۔ طلبہ کی علمی اور ذہنی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر شوق اور توجہ کا عنصر پیدا ہوگیا۔
۳۔ طلبہ کے دل و دماغ پر مفید مطلب اور مستحکم معلومات نقش کئے جا سکے۔
۴۔ ہوشیار طلبہ میں ذاتی کوشش سے معلومات بڑھانے کا شوق پیدا ہوگیا۔
۵۔ ایسے معلومات اور رائیں مہیا کی گئیں۔ جن کا مہیا کرنا مقامی اساتذہ کے لئے بیحد مشکل تھا۔
۶۔ نئے اسباق کی خاطر اساتذہ کے لئے نئے خیالات اور نئے موضوع مہیا کئے گئے۔
۷۔ بہت سے والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

مریخ تک پرواز

اوکلینڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر الوریٹ ہنٹ ایک ایسی مشین کی تعمیر میں مصروف ہیں جو انہیں مریخ تک پہنچا دیگی۔ مسٹر ہنٹ سے پہلے کئی ماہرین طبعیات ایسی مشین بنانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن مسٹر ہنٹ کی مشین سب سے جداگانہ اور اسقدر تیز رفتار ہے کہ اپنے خیال کے مطابق وہ اس پر سوار ہو کر صرف پانچ منٹ میں مریخ تک پہنچ جائیں گے۔ یہ مشین ایک موٹر کی وضع کی ہوگی۔ اور بجلی یا تیل کے بدلے ایتھر کی فضائی لہروں سے حرکت کریگی۔ یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ مسٹر ہنٹ اپنی مہم میں کامیاب ہونگے یا ناکام مگر ان کی ہمت اور بلند پروازی بہرحال قابل داد ہے۔

انصاف کی قیمت

انگلستان کے ایک معمولی مقدمے میں فریقین کو ۳۲ پونڈ اور ۷۰ پونڈ اپنے اپنے وکلا کو بطور فیس ادا کرنے پڑے۔ اس تلخ حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہاں کے ایک فاضل جج مسٹر اسکروٹن ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اگر وکیلوں کی فیس کا معیار یہی رہا تو پھر عدالتوں کو بند ہی کرنا پڑیگا۔ کیونکہ عام لوگ اتنی گراں قیمت پر انصاف حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

ان اخراجات کو اُس ملک کے لوگوں کے لئے ناقابل برداشت بتایا گیا ہے جس میں روزانہ آمدنی فی کس ۶ روپیہ ۱۲ آنے ہے۔ اور اوسطاً ہر آدمی کے پاس ۳۵۰۰ روپے جمع ہیں۔ ذرا ہندوستانیوں کی بے بسی پر بھی غور کیجئے۔ جن کی روزانہ آمدنی فی کس چند پیسوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں زندگی کے بعد سب سے گراں چیز انصاف ہے۔ اردو زبان کی یہ مثل کہ "مقدمے میں جو جیتا وہ ہارا جو ہارا وہ تباہ ہوا" ہندوستان میں انصاف کی گرانی پر اچھی طرح روشنی ڈال رہی ہے۔

روئی کا ایک جدید پودا

نو سال ہوئے برٹش گائنا کے سیاح محققین کی ایک جماعت نے ایک چڑیا کو دیکھا کہ روئی جیسی ایک چیز سے اپنا گھونسلا بنا رہی ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسے پودے کے ریشے ہیں جو اب تک بیکار سمجھا جاتا تھا۔ اس انکشاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سینکڑوں ایکڑ کے رقبے میں اس جدید پودے کی کاشت ہو رہی ہے۔

صدیق طبیب

حالی کی تنقید نگاری

مندرجہ ذیل مضمون پروفیسر سوپال سنگھ ایم۔ اے سنیر پروفیسر انگلش دیال سنگھ کالج لاہور کی فکر ہنگامہ پرور کا نتیجہ ہے۔ اور اصابت رائے اور تحقیق وتدقیق کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلے آپ کے قلم سے ادبی دنیا میں ایک "تنقید "پنجاب میں اردو" مولفہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی پر شائع ہوچکی ہے۔ اس محققانہ تنقید کو پڑھ کر اردو زبان کے وطن کے متعلق "پنجاب میں اردو" کے غیر تاریخی نظریئے بے اصل وبے اثر ہوجاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون جس انداز میں لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہے کہ مضمون نگار اعاظم پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانچ تول کر لکھتا ہے۔

اس مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں یہ عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ادارت کُلّیتہً پروفیسر صاحب موصوف کے نتائج سے متفق نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کا مقصد تخلیق حسن وجمال ہے اور شعر کو معاشرتی یا اخلاقی پہلو سے جانچنا ایک بنیادی غلطی ہے لیکن مولینا حالی کا مقصد یہ نہ تھا کہ شاعری کو محض معاشرتی اور قومی اصلاح کا ذریعہ بنالیا جائے۔ اور اسے انہیں اعتبارات سے جانچا بھی جائے ان کا مقصد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف اِس حقیقت کی توضیح کردیں کہ "شاعری" اور "صداقت" متضاد نہیں ہیں۔ اور شاعری پر تخلیق جمال کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد مترتب ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک چیز حسین بھی ہو اور سودمند بھی تو ظاہر ہے کہ محض سودمند ہونے سے اس کے حسن میں کوئی فرق نہ آئیگا۔

فاضل مضمون نگار خود تسلیم کرتے ہیں کہ جس زمانے میں" مقدمہ حالی لکھا گیا اس وقت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم رتبہ رکھتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ تنقید سے قطع نظر مقدمے میں اور کئی ایسی دلچسپیاں موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کبھی فرق نہیں آسکتا ——— ایڈیٹر

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تنقید نگاری کا چنداں ذوق نہیں۔ مولینا حالی کو اس لحاظ سے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ کہ آپ نے اردو علم ادب کی تنقید کے میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ اگر اس زمانہ پر غور کیا جائے۔ جب اس مقدمہ کو تحریری جامہ پہنایا جارہا تھا (اردو ادب کا دور تغیر) تو یہ تصنیف یقیناً حیرت انگیز ثابت ہوگی۔ حالی کوئی معمولی درجے کا شاعر نہیں ہے۔ اردو نظم میں ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کا سہرا آپ اور مولینا آزاد ہی کے سر بندھتا ہے۔

ان کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی دقیانوسی شاعری کی مخالفت اور اس کی بجائے "نیچرل شاعری" کی حمایت شروع کردی تھی۔ وہ شاعر بھی ہے اور نقاد بھی۔ اور قوت تخلیق و تحقیق کا یہ اجتماع علم ادب میں عموماً بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ نظم کا بہترین نقاد خود شاعر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ قول بذات خود دلفریب ہے۔ مگر اس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں شاعر شاذونادر ہی نقاد ہوتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے شاعر بہت برے نقاد تھے۔ کوئی خاص بات ضرور ہے جس کے باعث قوت نقد اور قوت تخلیق کمتر ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں۔

کی تصنیفات سے بھی تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اجتماع کمیاب ہے۔ حالی کے مقدمہ کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی صداقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

حالی کے مقدمے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) نظم کی نوعیت اور اثر کے متعلق حالی کی رائے۔

(۲) اردو نظم کی موجودہ حالت کے متعلق حالی کے خیالات۔

(۳) اردو غزل قصیدہ اور مثنوی کی اصلاح کے متعلق مولینا حالی کے مشورے ان حصوں میں سے پہلا حصہ یعنی وہ حصہ جس میں حالی نے نظم کی نوعیت اور اثر پر اظہار خیال کیا ہے کم تسلی بخش ہے اس

حصہ میں مولینا حالی نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کو انگریز مصنفوں سے بھی یک گونہ واقفیت ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی ادب کے مطالعے نے ان کی قوت نقد کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا۔ انہوں نے انگریز مصنفوں کے بعض خیالات کو بلا حجت قبول کر لیا ہے اور زیادہ غور کئے بغیر انہوں نے اِن خیالات کو اِس کتاب میں پیش کر دیا ہے اکثر جگہ انہوں نے بے جوڑ اور غیر متعلق حوالے دئیے ہیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ افلاطون نے اپنی ریپبلک (جمہوری طرز کی حکومت) سے شاعروں کو نکال دیا ہے پھر کسی ظاہری مقصد کے بغیر اس بے جان نظریہ کو پیش کر دیا ہے جس کی تلقین مکالے نے کی ہے یعنی یہ کہ نظم کی ترقی جہالت اور تاریکی کے زمانے میں ہوا کرتی ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ شاعرانہ وصف کا برا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے اس قیاس کا حوالہ دیا ہے۔ کہ شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی صداقت کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ بعض اوقات بچے نظم کو موزوں پڑھ لیتے ہیں۔ حالانکہ بعض لکھے پڑھے آدمی نظم کو صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ پھر وہ نظم کی طاقت کی تشریح کرتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعمال کی قدر کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"الغرض یورپ میں لوگوں نے شعر سے بڑے بڑے کام لئے خصوصاً ڈرامائک پوئٹری (ڈرامے کی نظم) نے یورپ کو جسقدر فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے اس واسطے شیکسپیئر کے ڈرامے جن سے پولیٹیکل سوشیل اور مورل ہر طرح کے بیشمار فائدے اہل یورپ کو پہنچے ہیں بائیبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ مذہب کی قید سے آزاد ہیں وہ ان کو بائیبل سے بھی زیادہ سودمند اور فائدہ رساں خیال کرتے ہیں۔"

حالی مرحوم کے تنقیدی فتووں کا یہ پہلا نمونہ ہے۔ وہ نظم کی قدر اس کے اخلاقی ملکی اور معاشرتی فوائد کی خاطر کرتے ہیں۔ آج یورپ کی تنقید نگاری میں نظم کے اثر کے متعلق دو نظریے رائج ہیں پہلے نظریے کے مطابق نظم کا مقصد باقی فنون لطیفہ کی طرح تخلیق حسن ہے۔ دوسرے نظریے کے مطابق اس کا مقصد صرف تہذیب اخلاق ہے۔ قابل غور یہ امر ہے کہ نظم کے اخلاقی نظریے کے بڑے حامی اُن فوائد کا دعوےٰ نہیں کرتے جس کا حالی نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے بارے میں کیا ہے اگر شیکسپیئر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی تصانیف کا مطالعہ ان کے ملکی مجلسی اخلاقی اور دیگر فوائد کی خاطر کیا جاتا ہے۔ تو وہ خواب موت سے بیدار ہو جائے۔ قدرت کی خوبصورت اشیا کی طرح فنون لطیفہ کے شاہکاروں کا اثر بھی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے مگر ارباب فن براہ راست وعظ نہیں کرتے اور اگر وہ وعظ کرنا شروع کر دیں تو وہ حسن اور خوبی نہیں رہتی۔ نظم کے اثر کے متعلق حالی مرحوم کے خیالات بھی اس بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہندوستان میں اکثر لوگوں کے لئے یہ امر ناممکن ہے کہ کسی خوبصورت چیز پر بحث کرنے میں اخلاقی معیار سے بلند تر ہو جائیں وہ اپنے احساسات کا مطالعہ کبھی نہیں کرتے ان کو اس بات کا احساس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی خوبصورت چیز کی تعریف کیوں کرتے ہیں۔

حالی مرحوم نے خود دو قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک قسم کی نظمیں تو صریحاً اخلاقی ہیں ان نظموں کو منظوم وعظ خیال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نظمیں پرانے رنگ میں لکھی ہیں اور اسی طرز کو انہوں نے ترک کرنے کی کوشش کی۔ باذاق ناظرین خود اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں سے کونسے اشعار زیادہ اثر آفریں ہیں۔ ؎

ا- اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کسی سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ب- تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
وہاں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو

اپنے دیوان کے دیباچہ میں اس نظریے میں ترمیم کی ہے لیکن وہ واعظ و ناصح کو شاعر سے زیادہ بلند مرتبہ خیال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"......... مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصلی مقصود فطرت انسانی کی کرید ہے۔"

یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ شاعروں کو اپنے نظریے بھی شاذ و نادر ہی یاد رہتے ہیں۔ ورنہ وہ اس وقت نظم کی بجائے وعظ و فلسفہ کے دریا میں غرق ہو جاتے نظم کے اثر کے بارے

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو وہ اخلاقی ہے اور نہ فلسفیانہ ۔ وہ ایک رنگ حسن لئے ہوئے ہے ۔ اگر شاعر اخلاق کی تلقین کرتے ہیں تو ان کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ ایسا کر رہے ہیں ۔

چند صفحوں کے بعد وہ صاف طور پر اخلاق اور نظم کے گہرے تعلق کا بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں :۔

"شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"

وہ نظم کو باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن اور وسیلہ قرب الٰہی خیال کرتے ہیں ۔

اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ نظم نہ تو اخلاقی تعلیم کا ذریعہ ہے نہ کھانے کے بعد کی تفریح اور نہ فنِ لطیف کے برائے نام عاشقوں کا کھلونا حالی مرحوم نے جھوٹی یا بری شاعری پر چند صفحوں میں بحث کی ہے ۔ جھوٹی شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جس میں خوشامد اور جھوٹی تعریف اور تقلیدی عشق یا متقدمین کی عشقیہ نظم کی شاندار نقل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جس میں

"خیالات میں ۔ الفاظ میں ۔ تراکیب میں اسالیب میں استعارات میں بحر میں، قافیہ میں، ردیف میں، غرضیکہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز میں انہوں نے ان کے قدم بقدم چلنا اختیار کیا ۔"

اگرچہ نظم کے سلسلہ میں اخلاقی صفات مثلاً جھوٹی اور بری کا استعمال بے محل ہے تاہم اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹی شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جس میں اصلیت کا نام تک نہ ہو جس میں دوسروں کے خیالات جذبات اور احساسات کو ایسے الفاظ میں دھرایا جاتا ہے جو کم و بیش موزوں ہوتے ہیں اس قسم کی شاعری نظم نہیں ہوا کرتی یہ کوئی فن نہیں ہے ۔ یہ زوال پذیر نظم ہے یہاں تک تو حالی مرحوم سچ کہتے ہیں لیکن بعد میں آگے چل کر وہ پھر اپنے اسی خیال میں غلطاں و پیچاں ہو جاتے ہیں جو سوسائٹی پر ایسی نظم کے اثر کے متعلق ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ علم ادب اور زبان کی ترقی کے لئے زوال پذیر بے سلیقہ اور نقلی شاعری مضر ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ زوال پذیر شاعری کا انجام قومی اخلاق کی تباہی ہوتا ہے تو وہ اس غلط فہمی کا اظہار کر دیتے ہیں جو نظم کی تاثیر کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی ۔

انگریزی ادبی نقادی کے قوانین کے متعلق ان کے ناقص علم کی ایک اور مثال لیجئے ۔ وہ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ آیا شعر کے لئے وزن ضروری ہے یا نہیں ۔ شعر اور نظم کے درمیان اس طرح سے تمیز کر کے لکھتے ہیں کہ جس طرح انگریزی میں نظم کے لئے وزن ضروری نہیں ہے بلکہ صرف شعر کے لئے ضروری ہے ۔ اسی طرح سے اردو میں نظم کے لئے وزن ضروری نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یہ پابندی فقط شعر کے لئے ہونی چاہیئے ۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا انگریزی میں نظم کے معنے شعر ہیں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں کچھ غلطی ہو گئی ہے ۔ بہر حال نظم اور شعر کے استعمال سے ان کا مفہوم خواہ کچھ ہی ہو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انگریزی میں نظم کے لئے وزن کی ضرورت نہیں ہے ۔

دوسرے اہم سوال کا تعلق نظم کی نوعیت یا اس کے لوازمات میں سے ہے ۔ مولینا حالی کی رائے یہ ہے کہ وزن اور قافیہ نظم کے لئے ضروری نہیں ہیں اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید اردو نظم کا دارومدار انہی پر ہے ان کے بغیر نظم نظم نہیں رہتی ۔ نظم کے لوازمات میں سے پہلا لازمہ تخیل ہے ۔ حالی مرحوم کہتے ہیں کہ ہر ایک شاعر کی عظمت اس کے تخیل کے تناسب کے مطابق ہوا کرتی ہے یہ پیدائشی جوہر ہے چنانچہ مندرجہ ذیل الفاظ میں آپ اس کی تعریف کرتے ہیں :۔

"وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدے کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے ۔" حالی مرحوم کو اس بات سے اتفاق ہے کہ تمام شاعروں کے لئے تخیل ضروری ہوتا ہے لیکن ان کی رائے یہ بھی ہے کہ "اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں"۔

اس فقرے میں حالی مرحوم نے تخیل کی حاصل کردہ مغربی تعریف کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے اور صاف طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر حالت پر اس کی تعریف عائد نہیں ہو سکتی ۔ اس تعریف کے متعلق قابل غور امر یہ ہے کہ تخیل شاعر کے خیالات اور الفاظ کو سانچے میں ڈھالتا ہے اور اگر وہ تخیل کے ذریعے ڈھلے ہوں تو خیالات اور الفاظ کے درمیان اختلاف نہیں ہو سکتا ۔

اس تمام عبارت کو پڑھکر یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ وزن اور قافیہ بقول حالی مرحوم حقیقت میں نظم کے لئے ضروری نہیں ہے ۔

مگر اردو نظم میں وہ بالکل ضروری ہیں اور یہ کہ تخیل کا وہ ڈھالنے والا اثر جو خیالات اور الفاظ پر مشترکہ طور پر پڑتا ہے نظم کے لئے تو ضروری ہے مگر اردو نظم کے لئے ضروری نہیں ہے یہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو نظم کے قوانین انگریزی نظم کے قوانین نہیں ہیں یا اردو نظم نظم ہی نہیں ہے۔

مولینا حالی مرحوم کے نزدیک نظم کا دوسرا لازمہ قدرت اور فطرت انسانی کا مشاہدہ ہے حالی اس کو بڑی اہم صفت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ مشاہدہ ایک ایسا مادہ مہیا کر دیتا ہے جس پر تخیل عمل کرتا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

قوتِ متخیلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی اور جو شخص شعر کی (ترتیب) میں اصلیت کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کے جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے اس کا تخیل اسقدر وسیع ہوگا جسقدر اس کا مطالعہ وسیع ہے۔"

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی مرحوم کو اس تخیل کا علم ہی نہیں ہوا جو شیکسپیر کے نقطہ نگاہ کے مطابق ہوائی قلعوں کو قیود مقام میں لا کر اس کا ایک نام رکھدیتا ہے اور جسے ورڈز ورتھ ایسی روشنی کہتا ہے جو نہ تو سمندر پر تھی اور نہ زمین پر

نظم کے تیسرے لازمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یعنی تفحص الفاظ کا حالی مرحوم پھر تخیل کے عمل کو اور بھی محدود کر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔

اس کو کافی نہ خیال کر کے وہ فرماتے ہیں

"تخیل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم رہنا چاہیئے" (صفحہ ۹۷)

ان تمام حوالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی مرحوم تخیل کو مقابلتاً کم اہمیت دیتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریز شاعروں اور شاعرانہ نقادی کے مطالعہ کی بدولت تخیل کو نظم کا ایک لازمہ خیال کرتے ہیں لیکن خود ان کو اس کے فائدے کا کلی یقین نہیں ہے نظم کے تینوں لوازمات پر بحث کر کے حالی مرحوم ملٹن کے نقطہ نگاہ کے مطابق نظم کی تین خوبیوں پر طویل بحث کرتے ہیں یعنی یہ کہ وہ سادہ پر معنی اور مختصر ہو ملٹن نے ان الفاظ کو نظم کی تعریف کرنے کی نیت سے استعمال نہیں کیا تھا اس نے تو یہ الفاظ مقابلہ کے طور پر استعمال کئے تھے اس نے کہا تھا کہ نظم منطق اور زور بیان کی نسبت کم شاندار اور عمدہ ہوتی ہے لیکن زیادہ سادہ پُر معنی اور موثر ہوتی ہے۔"

ان باتوں سے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اردو ادب میں ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہو جائینگے جنکی اہمیت اور مفہوم بخوبی متعین اور واضح نہیں۔ لہذا ان صفات کی ساری بحث کو کچھ زیادہ وقعت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ان الفاظ سے خود ملٹن کی مراد یہ نہیں تھی کہ ان میں نظم کی مکمل تعریف ہے۔

لیکن یہ بحث اور بھی ناکارہ ہو جاتی ہے جب ہم ان معانی کا مطالعہ کرتے ہیں جو حالی مرحوم ان الفاظ کی جانب منسوب کرتے ہیں بے شک سادہ کے معنی وہ سادہ ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو۔ مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہانتک ممکن ہو شاعری جسقدر روزمرہ کی بول چال سے بعید ہوگی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائیگی۔

حالی مرحوم لفظ سادہ کو خیالات اور زبان دونوں پر عائد کرتے ہیں۔ سادگی کی تعریف جو انہوں نے کی ہے وہ نظم کی نسبت طرز بیان اور انداز تحریر پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ یہ تعریف پھر ان اعتراضات کا نشانہ بن جاتی ہے جو ورڈز ورتھ کے نظریے "شاعرانہ طرز" پر کئے گئے تھے۔ لفظ (Sensuous) پُر معنی کی جو تاویل وہ کرتے ہیں وہ اور بھی قابل اعتراض ہے۔ وہ اس کا ترجمہ "اصلیت پر مبنی" کرتے ہیں اور اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں لوگوں کے عقیدے میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو"

بظاہر یہ مفہوم لفظ (Sensuous) کی غلط تاویل پر مبنی ہے یہ واضح نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ تاویل کیسے کی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ حالی مرحوم کی بحث کا یہ حصہ کسی کام کا نہیں۔ ہم نے پورے تفصیل کے ساتھ نظم کی نوعیت اور اثر کی بحث پر حالی مرحوم کے مضمون کے پہلے حصہ کی تنقیدی تشریح کی ہے۔ ہم اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ حالی مرحوم کا یہ حصہ ہمیں کچھ زیادہ امداد نہیں دیتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ حالی مرحوم نے انگریز شاعروں کے کلام کا مطالعہ اس غرض سے کبھی نہیں کیا کہ نظم کے قوانین معلوم کریں تاکہ وہ اردو نظم پر بھی اس طرح سے عائد کئے

جاسکیں - یہ اور بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ انہوں نے مکالے ہی کو لئے قابل تقلید نقاد خیال کیا ہے - مکالے انگریزی علم ادب کے بدترین نقاد ہیں -

حالی مرحوم کی تعریف میں اس امر کا اظہار ضرور کر دینا چاہئے - کہ ایسے ناقص مادے سے کام لیکر انہوں نے اردو میں ایک قابلقدر کتاب تصنیف کر دی - انہوں نے اردو نظم کی موجودہ حالت پر جو کچھ کہا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے جو مشورے دئے ہیں وہ بہت ہی مفید ہیں کیونکہ یہیں تو ناقص ادبی اصولوں کی قید و بند سے آزاد ہو کر حالی کے جوہر نے آزادی کے ساتھ کام کیا ہے - اردو نظم کی مختلف صورتوں پر جو بحث انہوں نے کی ہے اس سے اور نیز ان کے باہمی تعلقات سے اصلیت، ور نقادی تیز فہمی کا اظہار ہوتا ہے - ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دوسرے دو حصوں کی خوبیوں پر بحث کریں - لیکن نقاد کی حیثیت سے حالی کو جو شہرت حاصل ہے اس کا اندازہ مقدمہ کے پہلے ہی حصّے سے نہیں لگایا جاسکتا - بلکہ اس کا اندازہ دوسرے اور تیسرے حصّہ سے بھی لگانا پڑیگا -

نکتہ چینی کا مذاق ناخوشگوار اور بے شکریہ ہے لیکن ہم نے یہ نکتہ چینی بحث چھیڑنے اور اس مبحث پر غور خوض کرنے کے لئے کی ہے - حالی مرحوم کی کتاب کو پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے کے طالب علم پڑھتے ہیں اور یہ طالب علم انگریزی نظم کا بھی تو مطالعہ کرتے ہیں - اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اردو علم ادب کی ترقی میں اچھا خاصا حصہ لیں گے - ہم چاہتے ہیں کہ وہ ادبی اصولوں کو صاف طور پر ذہن نشین کر لیں مکالے اور دیگر مصنفوں کے وہ نقادی خرافات جو مولینا حالی مرحوم نے اختیار کئے ہیں - ان سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے - پبلک کا مذاق بگڑا ہوا ہے - اردو علم ادب کے تمام شائقین کا فرض ہے کہ وہ اس کو مشعل راہ نہ بنالیں - ان کو چاہئے کہ وہ پبلک کے سامنے ادبی نقادی کے صحیح اصولوں کا نمونہ پیش کریں - ضرورت ہے کہ مولینا حالی مرحوم کی اس کتاب کو بڑی احتیاط سے کانٹ چھانٹ کر کے مرتب کیا جائے اور پھر اس کو نوجوان طلبا کے ہاتھوں میں دیا جائے - ہمیں کم از کم اتنی تو امید ہے کہ اردو نظم کا کوئی ماہر ادیب کسی دن ادبی دُنیا کے ناظرین کے سامنے مندرجہ ذیل مسئلہ پر روشنی ڈالیگا " وہ کونسے قوانین ہیں جن کے ذریعہ ہمکو اردو نظم کی وقعت کا اندازہ لگانا چاہئے کیا وہ قوانین وہی ہیں جن کی وساطت سے ہم انگریزی نظم کی جانچ کرتے ہیں -

حالی مرحوم کی کتاب پر سرسری نظر ڈالتے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ جبتک ہم ان قوانین کی ساری پیچیدگی کو سمجھ نہ لیں تب تک اردو شاعری کی بحث میں مغربی شاعری کے قوانین کا داخل کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے -

بھوپال سنگھ ایم - اے

غزل

برداشت کی حدود سے بڑھنے نہ پائے ظلم　　یہ مہر و التفات کا رشتہ نہ ٹوٹ جائے

اظہارِ اضطراب محبت میں جرم ہے　　یوں ضبط کر کہ ربط امید ٹوٹ جائے

انکی نگاہِ لطف کا دل کو ہے انتظار　　وہ تیر پھینکدیں تو یہ آئینہ ٹوٹ جائے

فطرت مجھے یہ ڈر ہے کہیں رہزنِ ہوس　　آکر نہ کاروانِ محبت کو لوٹ جائے

فطرت

رومن شہنشاہ کی اپنے دل سے باتیں

"مارکو اوریلیوس انٹونیس" قدیم رومن سلطنت کا ایک مشہور شہنشاہ گزرا ہے۔ یہ فرماں روا دوسرے عیاش اور خونریز بادشاہوں کے برخلاف فلسفی دماغ کا آدمی تھا۔ اُس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ جو اب تک موجود ہے۔ اور دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "اپنے دل سے میری باتیں" کہا جاتا ہے یہ کتاب اس نے اپنے لڑکے کے لئے لکھی تھی۔ ذیل میں ہم اُس کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ فلسفی بادشاہ کی تربیت

میرے دادا نے مجھے اس زریں اصول کی تعلیم دی تھی۔ کہ ہمیشہ سچ بولوں۔ اپنے جذبات پر قابو رکھوں اور اپنے نفس پر حکومت کرتا رہوں۔ اپنے باپ کی زندگی سے میں نے یہ سیکھا کہ افراط و تفریط سے دور رہ کر اعتدال کی راہ چلوں اور ہمیشہ غیور اور باہمت رہوں۔ میری ماں نے مجھے یہ سکھایا۔ کہ مذہب کی تعظیم کروں۔ سخی بنوں۔ کسی سے بھی بدی نہ کروں بلکہ برے سے برا خیال ہی دل میں نہ لاؤں۔

میرے دادا کا مجھ پر اتنا بڑا احسان ہے۔ کہ لاکھ شکریہ ادا کروں اُس کا بوجھ ہلکا نہیں ہوسکتا۔ یہ اُسی کی کوشش اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ میں اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر سکا۔

اپنے اتالیق سے میں نے یہ سیکھا کہ کھیل کود میں وقت برباد نہ کروں۔ بلکہ زیور علم سے اپنا دماغ آراستہ کرنے اور اعلیٰ اخلاق سے اپنا نفس سنوارنے میں جان توڑ محنت اور کوشش کروں۔ اور یہ کہ دوسروں کے معاملات میں بے ضرورت کبھی دخل نہ دوں۔

"دیوجینٹس" (رومن فلسفی) نے مجھے تعلیم دی کہ دوسروں کی آزادی کو برداشت کروں۔ اور جس طرح اپنے آپ کو آزاد دیکھنا پسند کرتا ہوں اُسی طرح تمام انسانوں کو آزاد دیکھ کر مجھے خوشی ہونی چاہئے۔ لہذا مجھے لوگوں کی حق گوئی پر خفا نہیں ہونا چاہئے۔ اگرچہ مجھے اُس حق گوئی سے کتنی ہی تکلیف پہنچے۔ نیز اس معلم نے میرے دماغ کو فلسفیانہ بنا دیا۔

روسٹیکس نے میرے اخلاق و عادات درست کئے۔ اور بے ہودہ بحثوں۔ دور از کار فلسفیانہ موشگافیوں۔ اور الفاظ پر بے کار بحثوں سے دور رہنے کی نصیحت کی۔

"اپو للونیس" نے مجھے بتایا کہ آزادخیالی کے ساتھ کس طرح غور و فکر کرنا چاہئے۔ اور یہ کہ خرافات اور فضول خیالات سے کس طرح بچنا چاہئے۔ نیز اُسی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ نازک سے نازک موقعوں پر بھی میں کیونکر سنجیدہ۔ بردبار۔ اور اپنے حواس میں رہ سکتا ہوں۔

"ٹمیس" نے مجھے حاضر جوابی کی تعلیم دی۔ ہشاش بشاش رہنا سکھایا۔ نیز یہ اُسی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ کہ میں جاہلوں اور بے وقوفوں کو بھی برداشت کرلیتا ہوں۔ کبھی غصہ نہیں کرتا ہمیشہ اپنے نفس کی نگرانی کرتا رہتا ہوں ہمیشہ اپنے کام سچائی اور محنت سے پورے کرتا ہوں۔

میرا ایک منہ بولا باپ بھی تھا۔ وہ ایک عقلمند اور نیک آدمی تھا۔ اُس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ یہ اُسی کی تربیت کا اثر ہے کہ میرا چال چلن پاک ہے۔ طبیعت نیکی کی طرف مائل ہے۔ مزاج میں سختی اور شرارت نہیں ہے۔ شان و شوکت کا مالک ہونے اور دنیا کے سب سے بڑے تخت کا وارث ہونے پر بھی غرور کا مجھ میں نام تک نہیں۔ میں بیشمار دلیلوں کے ساتھ غرور کو ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے خوشامد اور چاپلوسی سے نفرت ہے۔ میں دولت جمع کرتا ہوں۔ مگر اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنی قوم کے لئے میرا ذاتی خرچ بہت کم ہے۔ بجد کفایت شعار رہوں۔ میں دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ جہالت ہے میرا دیوتا۔ میرا ملک ہے۔ اور اس کی خدمت میری سب سے بڑی عبادت ہے۔

میں برحق معبودوں کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے تمام باپ دادے۔ بہن۔ عزیز اقارب۔ دوست۔ استاد سب

کے سب اچھے لوگ تھے - اور مجھے کبھی بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی سختی کرنا نہ پڑی - نیز میں خوش ہوں کہ معبودوں نے اپنے فضل وکرم سے مجھے بیوی بھی ایسی دی جو محبت اور عزت کرنے والی اور بہت زیادہ کفایت شعار اور گھر گرست ہے (شہنشاہ یہ لکھتا ہے حالانکہ بعض بعض مورخین کا بیان ہے کہ ملکہ وفادار نہ تھی) معبودوں کا سب سے بڑا احسان مجھ پر یہ ہے - کہ انھوں نے مجھے ایسی عقل بخشی جو فلسفہ اور حکمت کی طرف راغب ہے اور آسانی سے حقیقت تک پہنچ جایا کرتی ہے -

مجھے اعتراف ہے کہ اتنی خصوصیتیں اور بخششیں حاصل نہیں ہوسکتی تھیں - اگر آسمان کے مالک کا مجھ پر خاص لطف وکرم نہ ہوتا -

۲ - عقل کے لئے سب سے بڑی تسکین

ہر صبح تمھیں خوب توجہ سے یاد کرلینا چاہئے - کہ شام سے پہلے تمھیں کوئی ایسا آدمی ضرور ملے گا - جو علم کا جھوٹا مدعی - حق کا منکر - بدزبان جھگڑالو بدمزاج کینہ پرور - اور تمھاری طبیعت پر گراں ہوگا - جب ایسا آدمی ملے - تو طے کرلو کہ تمھارے اُس کے درمیان اختلاف صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے - کہ اچھائی اور برائی کی حدیں مقرر کرنے میں دونوں کا مسلک جداجدا ہے - تمھاری ایک راہ ہے اُس کی دوسری ہے لیکن اس اختلاف کی وجہ سے تمھیں اُس سے عداوت نہیں پیدا کرنی چاہئے - تمھارے لئے یہ کافی ہے کہ تم اپنی دانست میں نیک اور بد کی حقیقت سے واقف ہو - اگر تم یقین کرلو کہ خطا کار بھی تمھارا ایک رشتہ دار ہے - کیونکہ دونوں کی عقل ایک ہی نورانی سرچشمے سے نکلی ہے - اور یہ کہ وہ کسی حال میں بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا - کیونکہ تمھارا اخلاق مضبوط ہے - اور کوئی بھی شخص بدخلقی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا - تو ظاہر ہے کہ تم اپنے مخالف سے ہرگز نفرت وعداوت نہیں رکھ سکو گے - بلکہ اُس کی بھلائی چاہو گے - اور اُسے اپنے خاندان اور کنبے کا ایک آدمی سمجھو گے - کیونکہ تم دونوں اور تمام انسان باہمی مددگاری ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں - انسانیت کی خدمت میں الگ الگ ہر آدمی کا درجہ وہی ہے - جو مجموعی جسم کی خدمت میں الگ الگ اعضا رجسم کا درجہ ہے -

اگر یہ صحیح ہے تو ثابت ہوجاتا ہے کہ انسانوں میں باہم لڑائی جھگڑا فطری نہیں ہے - بلکہ غلط تعلیم وتربیت کا نہایت مکروہ نتیجہ ہے -

یہ مخلوق جسے تو لفظ "میں" سے تعبیر کرتا ہے تین چیزوں سے مرکب ہے جسم - اور سانس - اور وہ عجیب مشین جو پورے جسم کو چلاتی ہے - یہ تیری حقیقت ہے - اب غور کر کہ تجھے کیا کرنا چاہئے؟

جسم کی بس اتنی ہی پروا کر کہ وہ فوراً فنا ہوجانے والا ہے یعنی وہ کوئی چیز نہیں - لہذا اُس کی زیادہ فکر بھی ضروری نہیں -

رہ گئی سانس تو وہ ہوا ہے جو ایک مرتبہ بدن کے اندر جاتی - اور دوسری مرتبہ نکل جاتی ہے -

لیکن ہاں تیرا جسم چلانے والی مشین - یعنی تیری عقل - سو ذرا ٹھہر اور خوب اطمینان سے اپنے اس تیسرے جزو کی اہمیت سمجھ لے - اے شخص میں تجھ سے کہتا ہوں اپنی عقل کی قدر کر کہ اس سے بڑھ کر کوئی دولت اور کوئی نعمت معبودوں نے تجھے نہیں دی - تو اپنی عقل کو کبھی کسی دوسری عقل کی غلامی میں دینے پر راضی نہ ہو - اُس پر اُس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہ ڈال - جذبات کو اُس پر قبضہ کرلینے کا موقعہ نہ دے - تقدیر سے اُسے مت لڑا - ماضی کے غم میں اُسے نہ گھلا حاضر سے گھبرانے کا اُسے عادی نہ بنا - مستقبل کا ڈر اُس سے قریب بھی نہ ہونے دے -

قدرت کی کاریگری معبودوں کے ہر فعل میں جلوہ گر ہے - اور تیری عقل کو غور اور تدبر کی دعوت دے رہی ہے - غور کر ہمیشہ سوچتا رہ - قدرت کے قلم نے ذرے ذرے پر ایک ایک کتاب لکھدی ہے - یہ کتابیں ہی تیرے مطالعے کے لئے بہت ہیں - لہذا انہی میں مشغول رہ - آدمیوں کی لکھی ہوئی بے کار کتابوں میں اپنا وقت خراب نہ کر - اس طرح تجھے خوشی حاصل ہوگی - اور اس خوشی پر تو موت کے وقت معبودوں کا شکر ادا کرسکے گا -

ہمیشہ یاد رکھ کہ تو مرد ہے - اور رومن ہے - لہذا تیرا ہر کام - نیکی - بڑائی - سنجیدگی - انسانیت - آزادی - انصاف کا نمونہ ہونا چاہئے - اپنے ہر کام کو اس خلوص اور سچائی سے انجام دے - گویا وہ تیری زندگی کا آخری کام ہے - اور ہمیشہ یادگار رہنے والا ہے - نفاق - خودی عجب کو اپنے سے دور کردے - یاد رکھ بہت تھوڑی محنت سے آدمی وہ خوش نصیبی حاصل کرسکتا ہے - جو خود دیوتاؤں کو حاصل ہے -

اب اس کے بعد تجھے موت سے ڈرنے کی کیا وجہ باقی رہجاتی ہے - اگر واقعی دیوتا موجود ہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں - تو ظاہر ہے تجھے نڈر رہنا چاہئے - دیوتا خود تیری پاسبانی کریں گے - لیکن اگر نہیں ہیں یا ہیں مگر ہم فانیوں کی حفاظت نہیں کرتے - تو پھر ایسی دنیا میں ایک منٹ بھی زندہ رہنا خوشی کی بات نہیں جس کی پروا دیوتاؤں تک کو نہیں -

زندگی اور موت - عزت اور ذلت - خوشی اور غم - دولت اور غربت

یہ تمام چیزیں اچھوں اور بروں دونوں کے لئے یکساں طور پر مباح ہیں۔ لہٰذا وہ حقیقت میں نہ اچھی ہیں نہ بُری ہیں۔

ہماری زندگی چند روزہ ہے۔ ہمارا وجود تیز رفتار فنا کا دوسرا نام ہے۔ ہماری خواہشیں وہم و حماقت ہیں۔ ہمارے جسم بربادی کا ایندھن ہیں۔ ہمارے نفس آندھیاں ہیں۔ اور ہماری قسمتیں جواری کے پانسے ہیں۔ ہماری شہرتیں صرف اس لئے ہیں۔ کہ ایک دن گمنامی سے بدل جائیں۔

پھر وہ کیا چیز ہے جو حقیقی ہے اور جس پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے؟ صرف فلسفہ...... یعنی ہمیں اپنا باطن پاک اور روح کو بدی اور عیب سے دور رکھنا چاہئے۔

۲۔ سب سے اچھا کیا ہے؟

قدرت کے اس کارخانے میں معمولی سے معمولی چیز اور ہر چیز کا ادنے سے ادنے خط و خال بھی اپنے اندر ایک اور رعنائی رکھتا ہے۔ روٹی پر جا بجا اُبھار اور شگاف پڑ جاتے ہیں۔ پکاتے وقت نان بائی یہ اُبھار اور شگاف نہیں ڈالتا۔ وہ خود بخود پڑ جاتے ہیں۔ اور آدمی میں اشتہا پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے قدرت نے جان بوجھ کر کائنات میں یہ رعنائی کوٹ کوٹ کر نہ بھر دی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پتا پتا اور چپہ چپہ چشم بینا کو مسحور کر رہا ہے۔ انجیر پک کر جماہی لیتا ہے۔ اور پھر اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ زیتون بھی جب سڑنے کے قریب ہوتا ہے تو نہایت لذیذ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گیہوں کی بال کا جھکاؤ شیر کا کھلا ہوا دہانہ۔ سور کے دانت یہ تمام باتیں کہنے کو محض معمولی اور ناقابل ذکر ہیں۔ لیکن دیدۂ عبرت کے لئے اپنے اندر عجیب عجیب اثر رکھتی ہیں۔

بنابریں اگر آدمی چاہے کہ کائنات میں سے حسین ترین چیزیں منتخب کرلے تو قطعاً ناکام رہے گا۔ کیونکہ کائنات میں کوئی تنکا بھی نہیں جو اپنے خاص حُسن و جمال میں کسی بڑی سے بڑی چیز سے کمتر قرار دیا جاسکے۔

اپنا دماغ اور دل دوسروں کے ہاتھ نہ بیچو۔ دوسروں کے خیالات اور افعال کی کرید نہ کرو۔ صرف اپنے ہی دماغ میں سوچو۔ صرف اپنے ہی چال چلن پر نظر رکھو۔ ایسے بنجاؤ کہ اگر تمہارا دل چیر کر دیکھا جائے تو اس میں اخلاص۔ سچائی۔ آزادی۔ نیکی کے سوا کچھ اور نہ نکلے۔ جو آدمی ایسا دل رکھتا ہے۔ وہ درحقیقت معبودوں کا چہیتا ہوتا ہے اور وہ خوبی کے ساتھ اپنی نیکی استعمال میں لا سکتا ہے۔

سدا خوش و خرم رہو۔ غیر کی مدد پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔ اپنی خوش نصیبی کے لئے دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈو۔ مختصر یہ کہ اپنی ٹانگیں چھوڑ کر دوسرے کی لاٹھی کے سہارے نہ چلو۔

اگر اپنی پوری عمر میں کوئی ایک چیز بھی نفیس الصفات۔ سچائی۔ پارسائی۔ ثابت قدمی سے بہتر نظر آئے۔ یا اپنی ٹھوس اور متین عقل سے اچھی کوئی عقل معلوم ہو تو بے شک اپنی بھلائی اور سعادت کے لئے اُسکے حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو۔ لیکن اگر کوئی ایسی چیز نظر نہ آئے تو پھر فضول باتوں کی چھان بین میں پڑ کر اپنے فرائض سے غافل مت ہو۔

۴۔ عقل کی پیروی

لوگوں کا دستور ہے۔ کہ آرام لینے کے لئے غیر آباد مقاموں، سمندر کے ساحلوں اور بلند پہاڑوں پر جایا کرتے ہیں۔ تم بھی بارہا یہی کر چکے ہو۔ اور تنہائی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرے ہو۔ لیکن یہ تمام زحمت بیکار ہے۔ کیونکہ اگر مضبوط ارادہ رکھتے ہو۔ تو ہر جگہ تنہائی حاصل کرسکتے ہو مجلس میں بھی خلوت پا سکتے ہو۔ دنیا میں اتنی تنہائی اور خموشی کہیں بھی نہیں جتنی آدمی کے دل میں ہے۔ بشرطیکہ دماغ غور کرنے کا عادی ہو اور عقل میں ترتیب و سلیقہ موجود ہو۔ اگر تم ایسا دماغ اور عقل رکھتے ہو۔ تو اپنے دل کی طرف رجوع کرو۔ ہر مقام پر تنہائی حاصل کرلوگے۔

اگر ہم لوگوں میں تمیز کا مادہ معمولی ہے۔ تو عقل بھی جو اُس کی موجد ہے معمولی ہوگی۔ نیز وہ قوت مدرکہ بھی معمولی ہوگی جو اخلاق و عادات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ پوری نوع انسانی ایک ہی قانون کی ماتحت ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جسطرح ایک شہر یا ایک ملک کے باشندوں کے لئے ایک ہی قانون ہوتا ہے۔ یعنی تمام انسان ایک ہی قوم ہیں۔ اور پوری دنیا دراصل ایک ہی جمہوریت ہے کیونکہ دنیا میں صرف ایک ہی جماعت ہے جس سے انسان مانوس و متحد ہوسکتا ہے۔ اور وہ خود انسانی جماعت ہی ہے۔

لوگوں کی واہ واہ کی پروا نہ کرو۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ سچی تعریف نہیں کرتے اپنی عقل کو اپنا رہبر قرار دو۔ اُسکے اشاروں پر چلو ایسا کرنے سے وہی لوگ جو آج تمہیں بیوقوف سمجھ رہے ہیں کل دیوتا سمجھکر تمہاری پوجا کرنے لگیں گے۔

ہمارے اقوال اور افعال کا بڑا حصہ غیر ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہم صرف ضروری باتیں ہی کہا اور کیا کریں تو ہمارا بہت سا قیمتی وقت بچ جائے ہمیں نیکی کے لئے زیادہ مہلت ملے اور پریشانیوں سے بہت کچھ نجات ملجائے۔ لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ خیالات اپنے دائرہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ جب دماغ میں بے ترتیبی پیدا ہوجاتی ہے تو آدمی فضول باتوں میں پڑ جایا کرتا ہے۔

"سلیمان خاں"

دوست

افراد

لطیف احمد۔ نسیمہ کا خاوند۔
ضیا الدین۔ لطیف احمد کا لڑکا۔
عرفان۔ لطیف احمد کا ماموں زاد بھائی اور دوست۔

پردہ اُٹھتا ہے

سردیوں کے دن ہیں۔ لطیف احمد ضیا الدین نسیمہ اور عرفان آگ تاپ رہے ہیں۔ لطیف کی عمر ساٹھ برس کے قریب ہے۔ اس کی بیوی نسبتاً کم عمر ہے۔ ضیا الدین ۲۵ برس کا نوجوان ہے لطیف کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اس کے چہرے پر شعلوں کا عکس ایک عجیب دلکش کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی دلربا آنکھیں نور مسرت سے روشن ہیں۔ دو دن ہوئے ہیں اس کی نسبت لاہو کے ایک معزز گھرانے میں قرار پا چکی ہے۔ ایک مہینہ ہوا ہے وہ فوج میں لفٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ شادی کے لئے رخصت لیکر آیا ہے۔ شادی کے بعد اپنی فوج میں چلا جائیگا۔

لطیف۔ (مذاق کے لہجے میں) عرفان تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں طرح مصیبت ہوتی ہے۔ اب ذرا ضیا کی طرف دیکھو۔ اسے پالا پوسا۔ پروان چڑھایا۔ جب دل میں اس کی محبت جاگزیں ہوگئی۔ تو اس نے ہمیں اطلاع دیدی کہ آئندہ سے وہ ملتان اپنی فوج کے ہمراہ رہا کریگا! کیا تماشا ہے!

عرفان۔ (ظاہراً دردناک آواز میں) کسقدر مصیبت ہے۔

نسیمہ ہنستی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

نسیمہ۔ (عرفان سے) مجھے اجازت دیجئے۔ بھائی جان! نیند آ رہی ہے۔

عرفان۔ میں بھی جا رہا ہوں بھائی جان!

لطیف۔ بیٹھو بھی عرفان کہاں جاؤ گے؟ میں اسی کمرے میں سوتا ہوں۔

ضیا۔ تشریف رکھئے چچا جان! آپ کو معلوم ہے نا والد صاحب دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بیٹھئے اور مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کل سے میرے سر میں خفیف سا درد ہے!

عرفان (مسکراتے ہوئے) جی! آپ کے سر میں درد ورد کوئی نہیں ہے! آپ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھکر ایک فردوس تخیل بنانا چاہتے ہیں۔ اچھا جائیے۔

نسیمہ اور ضیا چلے جاتے ہیں۔

عرفان۔ (سنجیدگی سے) لطیف! یہ کیا بات ہے؟ تم اس کمرے میں کیوں سوتے ہو؟ دیر تک کیوں جاگتے رہتے ہو؟

لطیف۔ مجھے تاریکی سے خوف آتا ہے۔ رات کو میں لمپ جلائے رکھتا ہوں۔ اوپر کے کمروں میں روشنی ہونے سے ضیا کو نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے میں نچلی منزل میں اُتر آیا ہوں۔

اس کے چہرے پر ملال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ خاموش سر جھکائے ہوئے نظریں آتشدان پر گاڑے ہوئے بیٹھا ہے۔

عرفان (پریشانی کے عالم میں) لطیف!

لطیف۔ کیا ہے!

عرفان۔ کیوں خاموش ہوگئے ہو اس طرح تم!

لطیف۔ کیا کہوں! میرا خیال تھا کہ شراب کی لعنت سے میں بالکل بچ گیا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس خبیث عادت کے نتائج ضرور برآمد ہوتے ہیں۔

عرفان۔ لیکن تم نے مدت سے شراب چھوڑ رکھی ہے؟

لطیف۔ ہاں۔

عرفان - تو پھر کیا بات ہوئی؟

لطیف - شاید تمہیں معلوم ہے کہ جسدن سے میری شادی ہوئی اس دن سے میں اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں! میں سمجھتا تھا کہ نسیمہ کی زندگی میرے ہاتھوں میں ہے - نرم مٹی کی طرح - میں جس طرح چاہوں اس کو سانچے میں ڈھال سکتا ہوں! نسیمہ سے مجھے عشق تھا! میں نے دل پر جبر کرکے شراب کو ترک کرنے کی کوشش کی اور شکر ہے کہ بہت جلد اس میں کامیاب ہوگیا! جس آسانی سے یہ عادت شروع ہوئی تھی اسی آسانی سے جاتی بھی رہی!

عرفان - لطیف! کیا تمہارے ضمیر نے تمہارے اس فعل کے خلاف آواز نہیں اٹھائی -

لطیف - ضمیر! میں اس شے کے وجود سے منکر ہوں! میرے دل کی گہرائیوں میں کبھی شراب کے خلاف نفرت کا احساس پیدا نہیں ہوا - نسیمہ سے شادی کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اس عادت کو ترک کردوں اس لئے نہیں کہ یہ میرے لئے مضر تھی - بلکہ اس لئے کہ اگر نسیمہ کو اس عادت کا علم ہوجاتا تو اس کا دل مجروح ہوجاتا اور میری زندگی برباد ہوجاتی -

عرفان - تو نسیمہ کو تمہاری ......

لطیف - نہیں - اسے، علم ہوگیا تھا! آہ وہ تاریک بارانی رات مجھے ابتک یاد ہے - نسیمہ کی آنکھوں میں افسردگی اور حیرت کی لہر پیدا ہوگئی تھی - اس کا اثر میرے دل پر اسی طرح ثبت ہے جس طرح کسی نے میرے جسم اور میری روح کو تازیانے مار مار کر زخم آلود کردیا ہو - میں نے اپنا راز محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کی تھی - اور عرفان کسقدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک اس گناہ کے علاوہ میری روح بالکل پاک تھی - میں جھوٹ سے گریز کرتا تھا - اپنے کاروبار میں ایمانداری برتتا تھا - مگر ان تمام باتوں کے باوجود میں شراب نہیں چھوڑ سکتا تھا - آخرکار اسے معلوم ہوگیا! وہ رات!

عرفان - جانے دو لطیف - اس رات کا تذکرہ جانے دو - پھر کیا ہوا!

لطیف - نسیمہ نے بیحد حوصلے سے کام لیا - میں نے کہا میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - مگر نسیمہ نے میرا دل بڑھایا اور ہم دونوں نے اس خبیث عادت کا مقابلہ کرنا شروع کردیا - مگر بے سود! اس کی تمام کوششیں اکارت گئیں! آخرکار اس نے دل ہار دیا - مگر میں نے اپنی کوشش جاری رکھی - پھر ایکدن ایسا آیا کہ میرے دل میں شراب کا کوئی شوق باقی نہ رہا - ایکدن خود بخود یہ عادت مجھے چھوڑ کر چلی گئی!

عرفان - حیرت ہے!

لطیف - پہلے تو نسیمہ نے میرے الفاظ پر یقین نہیں کیا - مگر آخرکار اسے بھی یقین آگیا کہ میں نے شراب چھوڑ دی ہے -

عرفان - تو اب اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے ہیں؟ کیا ضیا الدین کو تمہاری اس عادت کا پتہ لگ گیا ہے؟

لطیف - نہیں نہیں! خدا نہ کرے ضیا کو اپنے باپ کی اس خبیث عادت کا علم ہوجائے -

عرفان - پھر تم کس بات سے ڈرتے ہو؟

لطیف - تاریکی سے - عرفان! میں تاریکی سے ڈرتا ہوں! ذرا دیکھو - سایے دیواروں پر کیسی عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتے ہیں!

عرفان - کیسے سایے - آگ کے شعلوں کے؟

لطیف (غصے سے بھڑک اٹھتا ہے) اور کیسے سایے - شعلوں ہی کے تو سایے ہیں!

عرفان (لطیف کے غیر متوقع غصے سے متعجب ہوکر) کیا بات ہے لطیف؟ تم کس بات سے ڈرتے ہو؟

لطیف - (شرمندگی کی ہنسی ہنس کر) کچھ نہیں کچھ نہیں - یکایک اٹھ کھڑا ہوتا ہے - اس کی آنکھیں وحشتناک ہوجاتی ہیں -

لطیف - سایے - ہاں - سایے - شعلوں کے نہیں! میرے گناہوں کے سایے دیواروں پر رقص کر رہے ہیں - شیطان میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہے - خدا جانے یہ شیطانی ناچ کب تھمیگا -

عرفان - کیا کہہ رہے ہو لطیف - تمہارا دماغ پھر گیا ہے -

لطیف - ہاں میرا دماغ پھر گیا ہے - اسی لئے میں تاریکی سے ڈرتا ہوں - تاریکی مجھے اپنی طرف بلاتی ہے - سایوں کی لانبی لانبی انگلیاں مجھے اشاروں سے موت کی طرف بلاتی ہیں اور میں ان کی طرف کھنچا جاتا ہوں - میں ڈرتا ہوں عرفان کہ میں

بھی ایکدن انہیں سایوں میں مل کر ایک سایہ بن جاؤنگا۔

عرفان - تم نے کسی اور سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا ہے!

لطیف - صرف نسیمہ سے!

عرفان - میری مراد ڈاکٹر سے ہے۔

لطیف - (طنز سے) ڈاکٹر! ڈاکٹر میرے لئے کیا کر سکتا ہے؟

عرفان ! ان خیالات سے متاثر ہونا فضول ہے۔ لطیف! ان باتوں کو بھلا دو اور یہ باتیں تمہیں بھلا دینگی! سایوں سے ڈرنا! کیا حماقت ہے!

لطیف - مجھے اب ان باتوں سے کوئی تسلی نہیں ہوتی۔ ہر وقت میرے سامنے یہ سایے رقص کرتے رہتے ہیں! سایے میری زندگی کے لئے لازم ہو گئے ہیں! سایے دوستوں کی طرح مجھے اپنے گلے سے لگانا چاہتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں۔ اپنی سزا کے خوف سے میری روح لرز رہی ہے۔ شراب نے میرے دماغ اور جسم کو نہیں چھوڑا۔ اس عادت کے نتائج کس لعنت کی صورت میں میرے سر پر نازل ہونگے؟ یہ سوچ سوچ کر میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ میں نے اس گناہ کا کفارہ ابھی ادا نہیں کیا!

عرفان کھڑا ہو جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگ جاتا ہے۔

عرفان ! ہوا کتنی فرحت انگیز ہے۔ آج تمہیں جلدی نیند آ جائیگی۔ میں جاتا ہوں!

چلا جاتا ہے

عرفان کے جانے کے بعد لطیف آگ کی طرف نظریں جمائے ہوئے کھڑا رہتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد لمپ کی روشنی مدھم کر دیتا ہے۔ ایک آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ انگیٹھی میں سے ایک شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ سامنے کی دیواروں پر متحرک سایے دکھائی دیتے ہیں۔ کمرا اب تقریباً تقریباً تاریک ہے۔ ایک طرف الماری میں کچھ بوتلیں رکھی ہیں۔ جن میں شراب کی ایک بوتل ہے۔ پچھلے دنوں نسیمہ کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کے مشورے سے منگوائی گئی تھی۔ دروازہ کھلتا ہے۔ ضیا داخل ہوتا ہے۔ دبے پاؤں وہ آرام کرسی کے قریب آتا ہے۔ باپ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔ پھر دوزانو ہو کر اس کے کوٹ کی جیب میں سے کنجیوں کا گچھا نکال لیتا ہے۔ دبے پاؤں الماری کی طرف جاتا ہے۔ اور الماری کھول کر شراب کی بوتل نکال لیتا ہے۔ لطیف کی نیند کھل جاتی ہے۔ وہ غور سے ضیا کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر یکایک چلا اٹھتا ہے۔

ضیا - آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ سو رہے ہیں۔

لطیف - کیا کر رہے ہو تم ضیا!

ضیا - اماں کو نیند نہ آتی تھی۔ میں ان کے لئے خواب آور دوا لینے آیا تھا!

لطیف - دوا میں اوپر لے جاتا ہوں۔

ضیا - میں ان سے وعدہ کر آیا تھا کہ آپ کو نہ جگاؤنگا۔

لطیف - ضیا!

ضیا - خدا کے لئے چپ رہئے! ابا جان! آپ کی آواز سن کر اماں جاگ اٹھینگی۔

اس نے اپنا راز فاش کر دیا ہے۔

لطیف - آہ لڑکے!

ضیا - (ہاتھ ملتے ہوئے) آہ!

لطیف - کیا کر رہے تھے تم!

ضیا - میری طرف اس طرح نہ دیکھئے۔ ابا جان! میں زمین میں غرق ہو جاؤنگا۔

لطیف - کیوں آتے تھے تم نیچے!

ضیا - مجھے اپنی طبیعت پر قابو نہ تھا!

لطیف - تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

ضیا - میرے ہاتھ میں۔ کچھ نہیں ابا جان!

لطیف - کیا ہے ضیا!

ضیا بوتل دکھاتا ہے۔

ضیا - ابا جان!

لطیف - اچھا! یہ بات ہے! ضیا اس سے پہلے تم نے شراب پی ہے!

ضیا - صرف ایکبار۔

لطیف - کہاں

ضیا - خواب میں۔

ضیا ۔ ہاں ۔ اس دن سے ہیں شراب پینے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا ۔ آج تو گویا اس طرح محسوس ہوا کہ اگر میں شراب نہ پیونگا تو مرجاؤنگا ۔

سسکیاں بھر کے رونے لگتا ہے ۔

لطیف ۔ رومت ۔ رومت بچے ۔ تیرا کوئی قصور نہیں ۔

ضیا ۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھ ایسا ذلیل اور کمینہ لڑکا کس طرح آپ ایسے شریف اور نیک شخص کے ہاں پیدا ہوگیا ۔

لطیف ۔ (بیتاب ہوکر) خاموش لڑکے ۔ تو نہیں جانتا تو کیا کہہ رہا ہے !

نسیمہ داخل ہوتی ہے ۔

نسیمہ ۔ (لطیف سے مخاطب ہوکر) تمہیں معلوم ہوگیا ؟

لطیف ۔ ہاں ۔

سر جھکا لیتا ہے ۔ یکایک کچھ سوچکر چونک اٹھتا ہے ۔

لطیف ۔ تو تمہیں اس سے پہلے علم تھا کہ ضیا شراب پیتا ہے ۔

نسیمہ ۔ ہاں ۔

لطیف ۔ لیکن یہ تو کہتا ہے کہ ان سے آج پہلی بار شراب پینے کی کوشش کی ہے ۔

نسیمہ ۔ (حقارت سے) وہ بھی تمہاری طرح جھوٹا اور فریبی ہے ۔

لطیف ۔ نسیمہ !

نسیمہ ۔ کیا ہے ۔ تم سمجھتے ہو کہ میرے دل میں تمہاری کوئی عزت ہے ؟ ذرہ برابر بھی نہیں ۔ جس دن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ضیا نے یہ عادت تم سے ورثہ میں پائی ہے اس دن سے میری محبت نے نفرت کی شکل اختیار کر لی ہے ۔

ضیا ۔ (چونک کر) ورثہ !

لطیف ۔ ہاں ! ضیا میں برسوں اس ملعون عادت کی آہنی تاروں میں بندھا رہا ہوں ۔ آج تمہیں معلوم ہونا چاہئے ۔ کہ جس باپ کو تم نیکی اور محبت کا فرشتہ تصور کرتے تھے وہ ذلت اور گناہ کا پیکر ہے ۔

ضیا اضطراب اور حیرت کے جوش میں کھڑا ہو جاتا ہے ۔

ضیا ۔ آپ ابا جان ! آپ شراب پیتے رہے ہیں ۔

لطیف ۔ ہاں بیٹا ۔ میں ! آہ ۔ مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا (اس کی آواز بھرا جاتی ہے) کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا مجھے وہم بھی نہ تھا کہ میرے گناہ یہ صورت اختیار کرینگے ۔

نسیمہ ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم نے شراب کو چھوڑ دیا تھا تو شراب تمہیں بھی چھوڑ گئی تھی ۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ جبتک تمہارے جسم میں جوانی کا ایک شعلہ لرز رہا ہے ۔ اس وقت تک یہ لعنت تمہارا پیچھا نہ چھوڑیگی ۔ جب وہ تمہاری رگوں میں سے خون نچوڑ چکی ۔ تمہارے دل میں سے حوصلہ نکال چکی ۔ تمہاری آنکھوں میں سے نور چھین چکی ۔ تمہاری ہڈیوں میں سے مغز کھا چکی تو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ۔ اور پھر دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے تمہارے خون اور پوست سے آملی ۔ مرجھائے ہوئے جسم کو چھوڑ کر صحت مند جسم میں داخل ہوگئی ۔ شراب تمہاری بربادی کو دیکھ رہی تھی ۔ آخرکار ایکدن وہ اس بیکار جسم میں رہتے رہتے تھک گئی اور تمہارے بیٹے کی روح میں داخل ہوگئی ۔

ضیا ۔ خدایا !

لطیف غش کر جاتا ہے ۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے ۔ مدھم لیمپ بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے ۔ کمرے میں تاریکی ہے ۔ ہولناک ۔ وحشت انگیز تاریکی انگیٹھی میں یکایک ایک شعلہ بلند ہوتا ہے ۔ دیواروں پر متحرک سایے نظر آنے لگتے ہیں ۔

ضیا ۔ خدایا !

(مختار) جے ایم بیری

عابد

پردہ گرتا ہے

حضرت زاغ کا نظریہ

کوّوں کا ایک جھنڈ پارک میں ہے۔ ایک کوّا اپنی تحقیق کی بنا پر انسان کی اصل پر لکچر دے رہا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان دراصل کوّا تھا، جو پستی کی طرف گرتا ہوا انقلاب ماہئیت کے بعد موجودہ صورت میں تبدیل ہو گیا ہے معزز مقرر کا خیال ہے کہ انسان اپنی اس پست حالت پر متاسف ہے، اور متمنی اور کوشاں ہے کہ پھر اپنی اصل (یعنی صورت زاغ) پر واپس ہو جائے حضرت زاغ کے خیالات، ان کی تحقیقات کے ذرائع و نتائج خود انکی زبان سے سنئے اور جودتِ طبع کی داد دیجئے اس میں شک نہیں اگر مسٹر ڈارون اس حقیقت سے آشنا ہوتے، تو وہ دنیا کے سامنے مسئلہ ارتقا کو پیش نہ کرتے۔

"حضرات! ہمارے لئے اس مخلوق کی اصل کی تحقیقات کرنی جسے ہم انسان کے نام سے یاد کرتے ہیں، نہایت ضروری ہے۔ انسان کا ہمارے ساتھ برتاؤ، اس کی بابت ہمارے جذبات۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر ہم کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے جب تک کہ ہم انسان کی فطرت سے آگاہ نہوں۔ میں اپنی تحقیقات کو دو اصولوں پر تقسیم کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہر مضمون اور ہر موضوع کی اصلیت کا معلوم کرنا ایک عمدہ بات ہے، دوسرے یہ کہ اگر کوشش کی جائے تو ہر چیز کی اصل معلوم کرنی ممکن ہے۔ جو حضرات میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں وہ ذرا زمین سے پھُدک کر رضامندی کا ثبوت دیں. . . شکریہ! آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔

"کیسے؟ کب! کہاں سے؟ اور کیوں؟ ہمارے سامنے یہ سوالات پیش ہیں اور ہمیں ان کے جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ حقیر مخلوق زمین پر کیسے آئی اور کہاں سے آئی؟ انسان ہمارا دشمن کب سے ہے اور کیوں؟ آخر وہ زمین پر موجود ہی کیوں ہے۔ بیشک یہ نہایت اہم سوالات ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان کا جواب دیں ہمیں صورت حال پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہماری طرف بڑھتا ہے اور ہم بھاگ جاتے ہیں، وہ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم اُڑ جاتے ہیں، وہ ہمارے آشیانوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ہم وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ باتیں ہزارہا برس سے یوں ہی ہوتی آئی ہیں۔ ہمیں اس کا فوری سدباب کرنا بے حد ضروری ہے، ورنہ وہ وقت دور نہیں جبکہ ہماری زندگی ہمیں وبال اور دنیا ہمارے لئے تنگ ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ ہم انسان کے سامنے سے بھاگ کیوں جاتے ہیں۔ اس کا سبب 'خوف' ہے۔ ہم میں سے کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایک نامعلوم عرصہ سے ہمارے دلوں میں انسان کی طرف سے ایک بزدلانہ خوف سما گیا ہے، خوف، کیا ہے؟۔ خوف کیوں ہے؟ اس کا جواب مجھے ہر طرف سے یہی ملا کہ اس کا باعث انسان کا ہم سے برتر ہونا ہے۔ اس لئے ہم اس کی موجودگی سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اس موقعہ پر میں خود بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ میں بھی ایک عرصہ تک اس خیال کا موئید رہا۔ میں نے قدیم مسکنوں کو اُجڑتے، اور پُرانے آشیانوں کو برباد ہوتے دیکھا تھا، میں انسان کے ظلم سے واقف اور اس کی ناانصافی سے باخبر تھا، تو پھر میں اس ہستی کے نام سے کیوں نہ لرزنے لگتا جو اس تمام بربادی و ویرانی کا اصل بانی ہے۔ لیکن اس جدید دور اجتہاد و تحقیق کے قربان، کہ میں ان فرسودۂ روزگار خیالات سے قطعی آزاد ہو گیا۔

"ہمارے بھاگ جانے کے "کیوں؟" کا جواب خوف، تھا، اور خوف، کے "کیوں؟" کا جواب انسان کی ہم پر برتری . . . کم ازکم اس برتری پر سب کو یقین تھا۔ لیکن اس کا ثبوت؟ میں نے اس کی موافقت میں ہر ایک سے ثبوت طلب کئے لیکن سب خاموش۔ ایک ذہین اور طباع ذات کے لئے یہ ایک نہایت اچھا موقعہ تھا۔ تمام باتیں بردۂ راز میں! نامعلوم! اور سب کی سب مسلّم! اور ثبوت؟ ثبوت کچھ نہیں! کیا تعجب ہے کہ اس کے بعد انسان کی برتری پر میرا یقین متزلزل ہونے لگا۔ کیا انسان واقعی ہم پر بزرگی رکھتا ہے؟ کیا یہ عقیدۂ پارینہ اور واہمۂ طفلانہ تو نہیں ہے؟ جس وقت میں نے اپنے دل میں اس قسم کے

سوالات کئے، فی الفور میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس کے بعد میں نے تحقیقات وانکشاف حقیقت کا بیڑا اٹھایا۔ اس محنت کا ثمرہ آج میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

"تمام ظاہری اور سطحی باتیں النسان کی فوقیت کے خلاف ہیں۔ ہم فضائے آسمان کی سیر کر سکتے ہیں لیکن النسان زمین پر چلتا ہے۔ ہماری پرواز آسمان تک ہے۔ لیکن النسان! النسان کی کل کائنات زمین سے ایک خفیف سی جست اور پھر زمین پر گر پڑنا ہے۔ اس کے علاوہ ہر وقت جبکہ اس کی ایک ٹانگ اوپر کو اٹھتی ہے تو دوسری لامحالہ زمین پر ہوتی ہے۔ ورنہ یہ النسان جسے ہم بدقسمتی سے ابتک افضل تر خیال کرتے رہے ہیں بری طرح سے ناک کے بل گر پڑے۔ وہ اسی بھونڈے طریقے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتا پھرتا ہے۔

"ہم قدرتی، خوشنما اور چمکدار پروں کے لباس میں ملبوس ہیں۔ یہ عمدہ لباس، جو ہمیں گرمی کے دنوں اور سردی کے ایام میں ہر وقت میسر ہے۔ النسان کو دیکھو کہ وہ سمور، اور پروں دونوں سے محروم ہے جو اس کے علاوہ دنیا کے ہر ذی روح کو آرام بخشتے ہیں۔ اس کی تکلیف دہ کھال نہ گرمی کے لئے موزوں ہے" اور نہ سردی کے موافق۔ ہر موسم میں اسے کپڑے لادنے پڑتے ہیں حیف! کیسا بھونڈا لباس! کیسا ناگوار بوجھ! یہ کیسی برتری ہے؟

ایک اور فیصلہ کن مثال سنئے جس، کی سچائی ہر فلسفی دماغ ×× کو متاثر کردے گی۔ یعنی ہماری جنس اور ہماری قوم اپنے ماحول، اور ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات سے مطمئن ہے۔ برخلاف اس کے، النسان ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ قناعت اُسے چھو نہیں گئی، سکون اُسے نصیب نہیں۔ وہ تغیر پسند ہے، ہر وقت ہر لمحہ، تبدیلی کا خواہشمند رہتا ہے، جس کی وجہ سے نہ اُسے خود چین اور آرام ملتا ہے اور، جیسا کہ بدقسمتی سے ہمیں تجربہ ہو گیا ہے، نہ وہ دوسروں ہی کو چین لینے دیتا ہے۔ میرے دوستو! اگر بے اطمینانی ہی موجب فوقیت ہے تو اس سے کم رتبہ ہی ہونا اچھا۔ تُف ایسی برتری پر، لعنت ایسی بزرگی پر جس میں قناعت و اطمینان عنقا ہو جائے۔

"مجھے یقین ہے کہ میری اس تقریر نے آپ کے دلوں سے پرانے خیالات کو دور کر دیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اب آپ سب حضرات حقیقت کے سننے اور اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ جو حضرات میرے ان دلائل سے مطمئن ہو گئے ہوں وہ زمین سے اوپر اٹھیں اور اظہار اتفاق رائے کے لئے ایک دفعہ "کاؤں" کریں۔

"... اب ایک اعتراض باقی رہ گیا ہے۔ جب النسان ہمارے آشیانوں پر دست ظلم دراز کرتا ہے تو اکثر غم انگیز حادثات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ کثیف ہستی، یہ النسان ہمارے بسیرا کرنے والے پیڑوں کے نیچے کھڑا ہو کر نہایت ہی حقیر و ذلیل جسامت والی لکڑیوں سے ہمارے آشیانوں پر نشانہ بازی کرتا ہے۔ لیکن کسی خاص ترکیب کی وجہ سے، جس پر غور کرنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا ہے، اُس میں سے نہایت ہی کرخت دھماکے کی آواز ہوتی ہے۔ اور بیحد ناگوار دھواں نکلتا ہے۔ اور اس آواز کے ہوتے ہی یقیناً ہمارے چند بچے نیچے گر پڑتے ہیں جنھیں النسان بلا کسی مزید جد و جہد کے پکڑ کر اپنے ہمراہ لیجاتا ہے۔ اس داستان غم انگیز سے ہم میں سے کون واقف نہیں ہے؟ زیادہ ملال اس بات کا ہے کہ ہمارے پیارے بچوں کی پھر کچھ خبر نہیں ملتی۔

بعض اصحاب اس قسم کے ناگوار واقعات کو النسان کی برتری کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ فعل، جو سراسر ظلم اور جور پر مبنی ہے کس طرح بزرگی پر دلالت کر سکتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ النسان آ آکر ہمیں بے چین کرے اور ہم اس کی برتری ہی کے گیت گاتے رہیں۔ یہ کہاں کی بزرگی ہے؟ اور بھی زیادہ قابل تاسف یہ امر ہے کہ والدین ہزار ہا برس سے اس خیال کو پشت در پشت اپنے بچوں پر منتقل کرتے چلے آئے ہیں جس کی وجہ سے معصوم بچوں میں ایک غیر معمولی دہشت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی بزدلی اور موروثی خوف کی وجہ سے نازک کم فہم، ناتجربہ کار بچے النسان کا شکار بن جاتے ہیں۔ یہ تو شاذ و نادر دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی تجربہ کار اور معمر کوا اس خوف کا شکار ہوا ہو۔ ..... اس معاملہ کی بابت میں بہت کچھ کہہ چکا۔ اب مجھے اپنے فرض کے خوشگوار حصے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور النسان کی اصل پر بحث کرنی چاہیئے۔ یہ مسئلہ حقیقتِ النسان اُن تمام پیچیدہ اور پوشیدہ اُمور، پر نہایت خوبی اور وضاحت سے روشنی ڈالیگا جو اب تک پردۂ اخفا میں تھے۔

میرے دوستو! النسان ہم سے اعلیٰ نہ کبھی تھا نہ اب ہے بلکہ دراصل وہ ہماری ہی جنس کا ایک فرقہ پست اور خستہ حالت

اور دوسری ہئیت میں ہے۔ میں نہایت زور سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہزارہا سال پہلے، بہت ہی قدیم زمانے میں، انسان ہماری طرح کوا تھا۔ ہماری طرح وہ پروں میں ملبوس تھا، ہماری طرح پیڑوں پر رہتا تھا، بجائے چلنے کے اڑتا تھا، پتھر کے صندوق میں رہنے کے بجائے آشیانوں میں بسیرا کرتا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری طرح خوش اور قانع تھا!

"یہ نہایت ہی زبردست نظریہ ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسے فوراً تسلیم کرلیں۔ لیکن اگر اس کو مختلف طریقوں سے آزمانے اور جانچنے کے بعد آپکو یہ ماننا پڑے کہ اس نظریہ کے ذریعے آپ اُن مسائل کو حل کرسکتے ہیں جو ابتک لاینحل خیال کئے جاتے تھے، تو میں بہ بانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ آپ میرے اس نظریے کو، اس سے بہتر اور کوئی نتیجہ پیش کئے بغیر، رد نہیں کرسکتے۔ میں اس مقدمہ پر قایم ہوں کہ اگر حقیقت حال اس طرح پر نہیں ہے جس طرح میں کہتا ہوں تو پھر کس طرح پر ہے؟ میں پھر آپ کو یہ یاد دلاتا ہوں کہ ہر چیز کا حل معلوم کرنا عمدہ ہے اور ممکن بھی ہے۔

"اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسا سوال پیش کرتا ہوں جو واقعات حقیقت اور یقین پر مبنی ہے۔ اور میں آپکو چیلنج دیتا ہوں کہ یا تو آپ میری رائے سے اتفاق کیجئے، یا میرے اس تحقیقاتی سوال کا جواب دیجئے کہ اگر حقیقت حال اس طرح پر نہیں ہے جس طرح میں کہتا ہوں تو پھر کس طرح پر ہے؟ معزز حاضرین جو میرے اس رویہ کو جائز و مناسب خیال کرتے ہیں اعتراف کے طور پر ایک کاؤں کہیں۔۔۔۔

"بالکل متفقہ طور پر! صرف چند میرے بزرگ پس و پیش کرتے ہیں۔ اور عمر کا اقتضا ہے بھی یہی۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے ×× ×××× ×× نظری طور پر جدید خیالات سے نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ میری امیدیں زیادہ تر جوانوں ہی سے وابستہ ہیں لیکن میں سب حضرات کو امید کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ حضرات میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اے فضائے آسمانی کی سیر کرنے والے پرندو! دنیا، اس کی حماقتیں، خودنمائی و خودپسندی ہماری طرح تمہارے دلوں میں بھی جاگزیں ہیں۔۔۔۔ لیکن خاموش! تقریر پھر شروع ہوتی ہے۔

ابتداً اس طرح کیجئے کہ میرا نظریہ صحیح ہے، اور انسان اصل میں کوا تھا۔ تو اب اس کے دماغ کی کیا حالت ہوگی؟ اس کے جذبات کس قسم کے ہوں گے؟ اور ہمارے ساتھ جو اس کی اصل ہیں اس کا کیا سلوک اور کیسا برتاؤ ہوگا؟ کیا اصلیت سے دور ہوجانے اور پستی میں گھر جانے کا احساس اُسے اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن نہ بنادے گا؟ کیا یہ احساس اُسے مجبور نہ کرے گا کہ وہ اپنی اصلی اور ابتدائی حالت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اپنے حقیقی مورثوں کے ساتھ چھوٹے ہوئے تعلقات قائم کرنے میں کوشاں ہو۔ کیا اُسے ہم سے ملنے کی، ہمارے گروہ میں ہونے کی اور پھر ہم جیسا بننے کی تمنا نہ ہوگی۔ ہاں، ہوگی اور ضرور ہوگی! پھر تعجب ہی کیا ہے کہ وہ اپنی حالت سے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں مطمئن نہیں ہے۔ اور حیرت کا کیا موقعہ ہے اگر وہ کوشش سے ہمارا پیچھا کرے، اور جب اُس کے پاس سے چلے جائیں، تو وہ قرب حاصل کرنے کی کوشش کو جاری رکھے۔ خدانخواستہ ایذا کیلئے نہیں، جیسا کہ بدقسمتی سے ہم ابتک خیال کرتے رہے، بلکہ۔۔۔۔ تجدید تعلقات کے لئے، محبت جبلی کی وجہ سے!

"میرے دوستو! میری آنکھیں اس خیال سے اشکبار ہیں کہ اب تک انسان کی طرف سے ہمارے خیالات کسقدر غلط اور بے بنیاد تھے۔ افسوس انسان نے ہماری اس بے اعتنائی اور بے مروتی سے کیا سمجھا ہوگا۔ وہ ہمیں کس قدر بے رحم، بے درد۔۔۔۔ میرے جذبات کو معاف کرو۔۔۔۔ اور ہمدردی کے اظہار کے لئے کاؤں کاؤں کرو۔"

اب ہمارے پیارے بچوں کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی گمشدگی کی وجہ، اور اس کے بعد کے حالات کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اور ہمیں وہ منظر نظر آنے لگتا ہے جس پر ہم کو نازاں ہونا چاہیئے۔ میری تخیل کی آنکھیں اُنہیں دیکھتی ہیں۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اُن پتھر کے صندوقوں میں، جن کے اندر ہم نہیں دیکھ سکتے، بہت خوبی اور آرام سے زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کو قید کرنے والے ان کے ہر فعل کو نظر استحسان سے دیکھتے ہیں۔ انسان اُن کے ہر کام کی تقلید کرتے ہیں۔۔۔۔ یہ صرف خیال ہی نہیں ہے بلکہ اصلیت وحقیقت کا سچا خاکہ ہے۔ جیسے میں ناقابل تردید دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہنچادونگا۔ انسان صرف ہماری ظاہری صورت ہی کی نقل نہیں کرتا ہے بلکہ ہمارے اقوال و افعال، خصائل و عادات کی بھی تقلید کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ انسان کا یہ کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ

ہمارے بچوں کا اس میں زبردست ہاتھ ہے اور وہی انسان کو اس شاہراہ پر چلانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہاں۔ یہ ہمارے ہی مایۂ ناز فرزندوں کی کارگزاری کا شاہد ہے۔ ... ورنہ انسان کو اس طرح رہنمائی کرنے والا اور کون مل سکتا ہے؟

" دوستو! مجھے نہایت مسرت ہے کہ آج میں نے آپ کے سامنے سے وہ پردہ اٹھادیا جس کی وجہ سے حقیقت پوشیدہ تھی۔ آج انسان کے اصلی ارادے، اور بظاہر مشکوک و ناگوار برتاؤ کا حقیقی مقصد ظاہر ہوگیا۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح سہی، لیکن آخر کوّے کس طرح انسان بن سکتے ہیں؟ یہ نہایت معقول سوال ہے اور میں اس کا نہایت مناسب جواب پیش کرونگا۔ میں آپ کو اس وقت کی حالت پر متوجہ کرتا ہوں۔ آپ اور میں، اس وقت، اُس پہلے قدم کی، جو ہماری قوم کے ایک فرقے نے، ابتدا میں پستی کی طرف اٹھایا، زندہ مثال ہیں۔ اپنے آشیانوں سے دور، درختوں کو چھوڑکر، ہر چہار طرف سے، ہم اسوقت انسان کی طرح اس پارک میں جمع ہوئے ہیں، انسان ہی کی طرح بھونڈے طریقے سے زمین پر چلتے ہیں، اڑنے کے بجائے زمین پر پھدکتے ہیں... گویا کہ ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ آئندہ سے اڑنا ہی چھوڑ دینگے، وغیرہ۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ضروری اشیاء مطلوبہ، دانہ، روٹی، یا اون اور تنکے وغیرہ چننے کے لئے تھوڑی دیر کو زمین پر اترنا اور بات ہے لیکن زمین پر اس وقت کی طرح مدت قیام کو طول دینا سراسر مضر و خطرناک فعل ہے۔ اور یہی مہلک فعل، عادت کی صورت اختیار کرکے، ہماری جنس کے ایک گروہ کی رسوائی اور پستی کا باعث ہوا۔ ممکن ہے کہ ہزارہا سال گزرجائیں اور قوم کو اس مہلک عادت کا اثر، جو قوم کے ہر فرد پر حاوی ہو، محسوس نہ ہو، یا من حیث القوم متوجہ نہ کرسکے، کیونکہ تدریجاً سرایت کرنے والی برائی مشکل سے محسوس ہوتی ہے لیکن ان تدریجی اثرات کو (جو عرصۂ دراز میں پھیلے ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں معلوم ہوتے) یکجا جمع کرو اور پھر دیکھو کہ کتنے زبردست اور بظاہر ناممکن اور خلاف امید نتائج پیدا ہوتے ہیں! آپ میں سے جو مجھ سے مخالفت کرنے کی جراءت کرتا ہو تو اس کا اظہار کرے ..... آپ سب خاموش ہیں گویا آپ مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں۔

" اب ذرا ازمنۂ قدیمہ پر نظر ڈالو۔ ہماری جنس کے افراد کا تصور کرو۔ اُن میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں نحیف و نزار ہوں گے۔ اُن کے قوائے پرواز میں عارضی کمزوری لاحق ہوگی۔ یا کوئی اور نقص واقع ہوگا۔ یہ کچھ بعید از قیاس امر نہیں کیونکہ من حیث القوم، ہر قوم میں چند خراب و خستہ، ناچار و کمزور افراد ہوتے ہیں خیر اس کمزوری کے باعث وہ کچھ عرصے کے لئے پرواز سے مجبور ہے۔ اور انہیں مجبوراً زمین ہی پر رہنا پڑا! لیکن بدقسمتی سے اُس کمزوری کے رفع ہوجانے پر بھی انہوں نے زمین پر رہنے کی آسان، لیکن مضرت رساں، عادت کو جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ یہ مہلک طریقہ اُن کی سرشت میں داخل ہونے لگا۔ اور قدرتی طور پر وہ اڑنے سے کترانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر چلنے پھرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی قوت پرواز زائل ہوتی رہی۔ پَر اور پہلو کمزور ہونے لگے۔ یہ کمزوری پشت در پشت منتقل ہوتی رہی۔ قدرت کے قاعدے نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ پر و بال جھڑ گئے کیونکہ ان کے نشوونما کے موافق آب و ہوا ہی میسر نہیں ہوتی... حتیٰ کہ عرصہ دراز کے بعد یہ کمزوری، جو ابتدا میں نہایت ہی معمولی معلوم ہوتی تھی، ترقی کرتے کرتے ناقابل تسخیر ہوگئی۔ ہماری قوم کا یہ فرقہ اڑنے ہی کے قابل نہ رہا۔ یہ تمام امور اس بات کے حامل ہیں کہ ان کے اصلی ڈینے اپنی خوبصورتی اور حسن سے محروم ہوگئے اور صرف وہ ننگا حصہ رہ گیا جو موجودہ انسان کے بازو اور پنجہ کا کام دیتا ہے۔ اشیاء مطلوبہ کی گرفت کے لئے یہی بھونڈا پنجہ کام میں لایا جاتا ہے۔ اس تحقیقات کی سچائی میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا اگر اس بات کو پیش نظر رکھ لیا جائے کہ تغیر تدریجاً، آہستہ آہستہ، غیر محسوس انداز سے نہایت ہی وسیع و دراز عرصے میں واقع ہوا تھا۔

" میں نے انسان کی تصویر آپ کے سامنے پیش کی ہے اُسے دیکھئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جسامت میں بڑھ گیا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیسے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ اس کی مجہول خصائل و عادات کا اقتضا ہے جو اس قسم کی بالیدگی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور نشوونما کی قوت جو پر و بال کی پیدائش پر صرف ہوتی تھی آخر کہاں جائے؟ وہ اب اس طرف رجوع ہوگئی اور انسان کی بڑی جسامت اسی قوتِ نشوونما کی مرہون منت ہے۔ پر و بال اس کے نہیں، کھال اس کی بے حد نازک، بیچارہ نہ پرندوں ہی میں ہے اور نہ چرندوں میں ہی، دوپایہ، روئے زمین کے ہر جانور کی مدد کا محتاج، اپنے ماحول، اپنی ذات سے غیر مطمئن! یہ ہے اُس بدنصیب خراب و خستہ جانور کی تصویر! کیا اس تصویر میں ہر کوئی انسان کی شبیہ نہیں دیکھ سکتا ہے؟... انسان کپڑے کیوں پہنتا ہے؟ یہ ظاہر ہے۔

ہر جانور کی طرح اسے بھی قدرتی لباس میسر تھا جسے اس نے اپنی نااہلی سے ضائع کر دیا۔ اب حفاظت کی خاطر مصنوعی پوشاک مہیا کرتا پھرتا ہے۔

"معزز حضرات! تنگیٔ وقت کے باعث میں ہزارہا معلومات میں سے صرف چند پر اکتفا کروں گا۔ میں نے اپنی قطعی رائے قائم کرنے کے بعد بھی اپنی تحقیقات کو جاری رکھا۔ لیکن چونکہ ذاتی طور پر میری موجودگی بیک ساعت، ایک ہی جگہ ممکن تھی، اس لئے میں نے اس نیک کام میں چند معزز احباب سے بھی مدد لی۔ جن میں مسٹر زاغ دشتی، مسٹر سیاہ منقار اور مسٹر سیاہ چشم خاص طور پر میرے مشکور ہیں۔ ان بزرگوں نے میرے ارادے اور غرض کو اچھی طرح سمجھ کر بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں جن میں سے چیدہ چیدہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں،

مسٹر زاغ دشتی کا عین مقصد یہ تھا کہ وہ انسان کی اس جدوجہد کی بابت شہادت فراہم کریں، جو وہ اپنا اصلی سیاہ رنگ حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ تکمیل تحقیقات کے لئے مسٹر موصوف نے اُن سنگین اور خشتی صندوقوں کے مجمع کے پاس جانے کے ناگوار کام سے گریز نہیں کیا، جنہیں انسان شہر، قصبہ یا گاؤں کہتا ہے، تاکہ وہ وہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت کو دیکھ سکیں۔ مسٹر دشتی پراز معلومات میرے پاس آئے۔ اُن کا بیان ہے کہ انسان سیاہ ہونے میں کوشاں ہے۔ سڑکوں پر سیاہ رنگ تمام اور رنگوں پر غالب ہوتا چلا جاتا ہے، سیاہ رنگ دیواروں کا، چھتوں کا، سیاہ رنگ انسان کی اس بدنما چیز کا جس سے وہ اپنا سر ڈھانکتا ہے! سیاہ رنگ اس کے بھونڈے بوٹوں کا جن سے وہ اپنے پیروں کو چھپاتا ہے! انہوں نے چھوٹے چھوٹے صندوقوں کے سوراخوں میں سے کالا رنگ نکلتے دیکھا! غرض سیاہ رنگ قریب قریب ہر چیز کا اور ہر جگہ! ایک اور دوسرے موقعہ پر، ملک کے بعض حصوں میں انہوں نے انسان کی قطاروں کو صبح کے وقت گھروں سے نکلتے دیکھا۔ وہ سفید تھے، اور شام کو لوٹتے ہوئے دیکھا، وہ سیاہ تھے سب کے سب! ان بیچاروں نے تمام دن سیاہ رنگ حاصل کرنے میں صرف کر دیا تھا۔ تب کہیں انہوں نے کالا رنگ پایا تھا، لیکن یہ نمایاں تغیر کن ذرائع سے روپذیر ہوا تھا، اسے مسٹر دشتی نہ معلوم کر سکے۔ کیونکہ وہ مقامات جن میں جاتے ہی انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے یا تو گہرے گہرے غار تھے، یا آگ، گرمی اور دہنویں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے خشتی صندوق، جن میں جا کر کوئی پرندہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسٹر موصوف اس نتیجے پر پہنچے کہ وہاں ہر چیز سیاہ تھی، اور جو آدمی ان کے اندر عرصہ تک رہتے تھے وہ کالے ہو جاتے تھے۔ لیکن مسٹر زاغ کا بیان ہے کہ یہ رنگ صرف ایک ہی دن قائم رہتا تھا کیونکہ دوسرے دن صبح کو انہیں پھر سب سفید نظر آتے تھے۔ اور پھر وہ سیاہ بننے کی تمنا میں لتنے ہی مصائب برداشت کرنے کو تیار جن کو سہہ کر انہوں نے پہلے دن کالا رنگ حاصل کیا تھا!۔ انسان کی یہ جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ افسوس! انسان اس چہیتے رنگ کو حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کرتا ہے!

لیکن امر مسرت آگیں ہے کہ انسان کا ایک گروہ اس جدوجہد میں مستقل طور پر کامیاب ہو گیا ہے اس گروہ کے ہر فرد کا رنگ بالکل سیاہ ہے اور بہت پختہ رنگ ہے۔ اس گروہ نے کچھ ایسے ذرائع بہم پہنچائے ہیں کہ سیاہ رنگ تا مدت العمر یکساں رہتا ہے، اور سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ یہ رنگ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ کاش یہ نسخہ سفید رنگ والوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ بیچارے کوؤں جیسا بننے کی کوشش میں مرے جاتے ہیں!... حضرات، یہ تمام حالات مسٹر دشتی کے چشم دید ہیں اس لئے اُن کی صداقت میں شمہ بھر شک کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے بعد مسٹر سیاہ منقار کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ اُنہوں نے اس بات کی شہادت فراہم کی ہے کہ انسان پھر درختوں پر بودوباش اختیار کرنے کی فکر میں ہے۔ حضرت منقار کا بیان ہے کہ انہوں نے ملک کے اکثر حصص میں نہایت بلند۔ تنگ اور سیدھے خشتی صندوق استادہ دیکھے۔ جن کا دور ہمارے بڑے بڑے درختوں کی برابر ہے۔ وہ بہت کچھ درختوں سے مشابہ ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اُن میں شاخیں نہیں ہوتیں۔ ان بلند ستونوں کے سروں پر سے انھوں نے سیاہ دھوئیں کے بادل کے بادل نکلتے ہوئے مشاہدہ کئے جس سے مسٹر زاغ دشتی کے بیان کی بھی تائید ہوتی ہے اور یہ بات بھی کلیتہً طے ہو جاتی ہے کہ آجکل انسان کے درمیان ابتدائی صورت کو حاصل کرنے اور قدیم طرز معاشرت کو لوٹنے کے لئے بہت کچھ کوششیں ہو رہی ہیں۔ جس کا ان درخت نما صندوقوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اگر انسان شاخیں مہیا کرتے ہیں اور کامیاب ہو گیا تو دیکھ لینا کہ ایک عرصے ہیں۔ لفظ "ایک عرصے" بخوبی واضح رہے

انسان اِن خشتی درختوں میں آشیانے بنائیں گے، جیسے کہ وہ کبھی قدرتی درختوں میں بنانے کے عادی تھے۔

آخر میں مسٹر سیاہ چشم کی معلومات کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری اور مناسب ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ انسان کھوئی ہوئی قوت پرواز حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ پرواز ہی کے لئے اُس نے مشینیں اور غبارے ایجاد کئے ہیں، جو بدنما اور بدنظر سہی لیکن اس مسئلہ شہادت کی ایک زبردست کڑی ہیں جس سے یہ نظریہ پایہ تصدیق کو پہنچتا ہے کہ انسان واقعیؔ اپنے مورث اعلیٰ کے خصائل و عادات حاصل کرنیکا متمنّی ہے۔ وہ ہم پر اپنی بے بسی اور پستی کا اظہار کر کے ہماری استعانت اور مدد کا خواہاں ہے۔ وہ ہماری طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ ہم اُسے آئندہ کی بہتری کی امید سے مایوس نہ کریں۔ لیکن عرصۂ غیر معلوم سے قطع تعلقات ہونے کے باعث اُس کی زبان بھی ہم سے مختلف ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے تبادلۂ خیالات قریب قریب ناممکن سا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آوازیں وہ اپنے بے چونچ والے منہ سے نکالتا ہے اُن کے سُننے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ انسان کی کاربراری کے لئے کافی ہو لیکن ہمارے لئے وہ قطعی بے معنی جھنکار ہے انسان کے آپس میں بات چیت کرنے میں، اس کی مخلوط آوازوں میں، اس کے چیخنے اور چلانے میں، اس کے ہنسنے۔ نعرے مارنے، سیٹی بجانے میں۔۔۔۔ نہ کچھ وقار ہی پایا جاتا ہے۔ نہ کچھ شان ہی ہوتی ہے، نہ شیرینی ہوتی ہے اور نہ ترنم!

میرے دوستو! اب میری تقریر ختم ہونے والی ہے۔ آج میں نے آپ کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کی صداقت میں کسی کو کلام نہیں۔ جس صبر سے آپ نے میری تقریر کو سُنا اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں، کوّے سے انسان بن جانا، پھر انسان کی ابتدائی حالت پروالیسی کی تمنا، اور پھر تحصیل مدعا کے لئے اُس کی جد و جہد۔ یہ امور سب پر واضح و روشن ہو گئے۔ انسان کا اپنی کوششوں میں کبھی نہ کبھی کامیاب ہونا یقینی ہے۔ ہاں! اب آئندہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچو۔ انسان تمہیں خشتی آشیانوں میں بسیرا تے دکھائی دیگا ہماری طرح پر و بال سے مزین و ملبوس، کیونکہ ضرورت اس کی مقتضی ہو گی کہ پرواز کے لئے پر و بال نکلیں، اور انسان تمہیں شاہراہ ترقی پر گامزن نظر آئے گا۔۔۔۔ یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ ذلیل حرکات کو چھوڑ دے گا۔ اس غیر موزوں زباں کو بھول جائے گا۔ اور اکبار پھر وہ ہماری طرح کوّا ہو کر بصد نغمہ و ترنم کاؤں کاؤں کرنے لگے گا۔ ہاں وہ پھر قانع اور مطمئن ہو جائے گا۔۔۔۔ ہماری آنکھیں اس مبارک دن کو دیکھیں۔ لیکن۔۔۔ دریغا، واحسرتا ۔۔۔ افسوس ہم نہ ہوں گے!"

(مسز گیٹی)　　　　سید رضی الحسن چشتی

غزل

حسن کی جلوہ پاشیاں جب ہوں نظر کے سامنے　　　دل ہو ہزار مرمریں خس ہے شرر کے سامنے

رنگ جمال خواب تھا یاد ہی اسقدر ہے مجھے　　　کوند گئی تھیں بجلیاں میری نظر کے سامنے

عشق کی فتنہ کوشیاں۔ آنکھ کی خون فروشیاں　　　لالہ و گل ہیں داغ داغ قلب و جگر کے سامنے

دونوں جہاں کی چاندنی میری نظر میں آگئی　　　آئے وہ چاندنی میں جب بزمِ قمر کے سامنے

شعلۂ جستجو ہے دل فتنۂ آرزو ہے دل　　　عالم رنگ و بو ہے دل میری نظر کے سامنے

خود ہو شہیدِ جستجو شاکر تشنہ کام تو　　　آبِ حیات کے لئے جھک نہ خضر کے سامنے

(غیر مطبوعہ)　　　شاکر صدیقی

کیا تعلیم ایک بیکار چیز ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم اچھی طرح اس سوال پر غور کریں کہ موجودہ تعلیمی نظام کس وقت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس گراں قدر درخت کے پھل لانے کا وقت کون سا ہے؟ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں۔ کہ شاہ بلوط کی طرح یہ درخت صدیوں کے بعد پھل دیگا۔ تو اس صورت میں اس نظام کے حامیوں کو اپنے استدلال کی بنا مذہبی اصولوں پر قائم کرنا پڑے گی۔

جن لوگوں نے دنیا کی بڑی بڑی عبادت گاہیں تعمیر کی ہیں۔ اُن کا استدلال بھی مذہبی بنیادوں پر قائم تھا۔ اور اس نظام کے لئے پروپیگنڈا کرنے والوں کے دلائل بھی مذہب ہی کے ذریعے تقویت پائیں گے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عمارت کی تکمیل کے لئے پشتہا پشت تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں۔ کہ تھوڑے سے عرصے تک ہم کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تو یہ تعمیری نظام یقیناً خود غرضی کے جذبات کے ماتحت قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو کم از کم وہ دلچسپی جو ایک پشت کے لوگوں کو دوسری پشت کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اس بات کی ضامن ہوگی۔ کہ اس نظام کو قائم رکھا جائے۔

ہم اپنے نتائج کو یوں ترتیب دے سکتے ہیں۔

(۱) کیا اس سے مسرت میں کوئی اضافہ ہوگا؟ عام حالات پر تعلیم کا کیا اثر پڑے گا؟ متعلم کی زندگی مجموعی حیثیت سے کس طرح متاثر ہوگی؟

(۲) کسی فرد واحد کے تعلیم یافتہ ہونے کا اس کی قوم پر کیا اثر ہوگا۔ اور اس تعلیم سے کیا مادی فوائد حاصل ہونگے۔

(۳) نسل انسانی کے ارتقا میں تعلیم کس حد تک مدد دے گی۔

یہ امر بہت مشکوک ہے۔ کہ آیا پہلی شق کے ماتحت کچھ فائدے مرتب ہونگے یا نہیں۔ اس امر کے قاطع دلائل موجود ہیں۔ کہ علم کے ساتھ غم بھی یوماً فیوماً متزاید ہوتا جاتا ہے۔ اور جہاں تک مادی فوائد کا تعلق ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ زمانۂ ماضی میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہوئے آدمی نہ تو سب سے زیادہ دولت مند ہوتے تھے۔ نہ سب سے زیادہ با اقتدار اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ مستقبل میں اس کے خلاف واقع ہوگا۔

جن طریقوں سے دولت جمع کی جاتی ہے۔ ان کا سمجھنا دشوار نہیں لیکن جب یہ طریقے سمجھ میں آ جائیں۔ تو ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ کسب زر کے طریقے آسان ہیں۔ مگر ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اور یہ ایک ایسا مرحلہ ہے۔ کہ ذہنی ارتقا اور تعلیمی اسناد کے باوجود ان طریقوں پر عمل کرنے میں کوئی آسانی نہیں ہوتی۔ علم کی بھوک جو باقی تمام خواہشات کو مغلوب کر لیتی ہے۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ بغنہ ایک ایسی شے ہے۔ جس کو ایک بے لذت جذبے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا بے لذت جذبہ جس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں اور تمنائیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ جن لوگوں نے تعلیم کے انتہائی مدارج پر پہنچکر دم لیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

حد حسن تو با دراک نشاید دانست
ویں سخن نیز باندازۂ ادراک منست

یہ خیال کہ تعلیم یافتہ اشخاص غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی نسبت اپنی روزی زیادہ آسانی سے کما سکتے ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ طبقے کا ایک وہم ہے۔ اگر کوئی شخص یہ ارادہ کرے۔ کہ میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے ذریعے روزی کماؤں گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس نے روزی کمانے کے لئے بہت مشکل کام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ عام طور پر مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے۔ کہ جتنی کوشش تعلیم یافتہ اشخاص کو کسب معاش میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس معین مقدار سے کہیں زیادہ ہے۔ جس کی پابندی معاشرت کے اصولوں کے ماتحت لازمی قرار دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جس شخص نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے تحصیل علم میں گزار دیئے ہیں وہ اس شخص سے کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس کا مقصد سوائے کسب زر کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو تعلیم سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اثر و اقتدار کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے۔ وہ ان عالموں سے بدرجہا زیادہ مقتدر ثابت ہونگے۔ جن کی ذہنی صلاحیتیں تحصیل علم نے جذب کر رکھی ہیں۔ تعلیم انسان کو کسی شعبۂ حیات میں کوئی خاص مدد نہیں دے سکتی۔ کسب زر ایک جادوگری ہے۔ اور عوام الناس کے قلوب پر ان عظیم الشان لوگوں کا دائمی اثر ہے۔ جن کے نام اور کام سے تعلیم یافتہ آدمی قطعاً ناواقف ہے۔ یا اگر ایسا نہیں تو پھر اقتدار ان لوگوں کو میسر ہے۔ جو تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات سے بالکل بے پرواہ ہیں۔

صرف وہی شخص عوام الناس کی قیادت کرسکتا ہے۔ جو اس امر کی صلاحیت لے کر پیدا ہوا ہو۔ کہ وقت کے ساتھ عوام الناس کے جذبات کی پیروی کرتا رہے۔ اور انہیں خیالات و جذبات کا اعلان کرے۔ جو عوام الناس کے دل میں موجزن ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی شے ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کے منافی ہے۔

اس بات سے قطع نظر کسب زر کے وسائل سائنٹیفک اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور اس لئے لازماً ان لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں جنہوں نے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرلیا ہے۔ اور اس طرح موعلمہ گیر دست کا احساس کرنے سے عاجز ہوگئے ہیں اگر یہ لوگ اس بڑھتے ہوئے ذخیرے کو دیکھ سکنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ جس کو وسیع کرنے میں وہ خود ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ پھر بھی اس بات کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ نہ تو اس ذخیرے کے جمع کا سہرا ان کے سر ہوگا۔ اور نہ وہ اس ذخیرے کو مناسب طریقے پر خرچ کرنے کے اہل ثابت ہوں گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب شرکت افتکار کے وجود کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے قیام و تکمیل کے لئے صدیوں کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ سٹیم ریلوے کا نظام میرے دعوے کی تائید کرتا ہے۔ آخرکار نفع کا بیشتر حصہ ان لوگوں کو ملتا ہے۔ جنہوں نے نظام کی تعمیر و تکمیل میں کوئی گراں قدر حصہ نہیں لیا۔

کسی کے خیال یا نئی ایجاد کو لے لیجئے۔ اگر اس کی تاریخ کے مطالعے کے لئے کافی مسالہ موجود ہے۔ اور آپ اس مسالے کو تنقیدی نقطۂ نظر سے استعمال کرتے ہیں۔ تو آپ پر ثابت ہو جائے گا۔ کہ ہر ایک ایجاد یا نیا خیال زیادہ تر ان لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ جو اپنی حیات میں اپنے لگائے ہوئے درخت کو بارآور ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکے۔ اور جنہوں نے ان مادی فوائد سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ جن کی وجہ سے دوسرے لوگ شاہانہ طریق پر رہنے کے قابل ہوگئے ہیں۔

ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ تعلیم کسی ایک فرد کے لئے اتنا تو کرسکتی ہے۔ کہ وہ اس میں صحیح اور ثمر آور تفکر و تدبر کا مادہ پیدا کردے۔ مگر اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ بظاہر تعلیم کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق کسی ایک قوم سے ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے صفحات اور ہمارے ذاتی مشاہدات تعلیم کے حامیوں کے تمام وہموں کی تکذیب کردینگے۔ سائنس اور ادب کے تمام شعبوں کی ترقیوں کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ آپ لازماً اس نتیجے پر پہنچینگے۔ تعلیمی اثر کے نتائج عام حالتوں میں صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت یہ کہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کہ آیا ترقی تعلیم کی پیدا کردہ ہے۔ یا کسی اور محرک کی۔

یورپ کے زمانہ جہالت کے بعد پہلا شخص جس نے بجلی کے کاموں میں دلچسپی لی۔ ڈاکٹر گلبرٹ تھا۔ وہ ۱۵۴۰ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۰۳ میں فوت ہوگیا۔ اس شخص نے بجلی کے کرشموں کے متعلق بہت سی باتیں قلمبند کی ہیں۔ مگر اس کے مشاہدات کا عملی قاعدہ کوئی نہیں نکلا۔ پھر ۱۶۲۷ میں بایل کا دور آتا ہے اس نے بھی کچھ نہیں کیا۔ پھر ۱۷۴۰-۹۰ میں فرینکلن نے اپنی تحقیقات جاری رکھی۔ بے سود۔

آخرالامر گلبرٹ کے ۲۰۰ سال بعد بجلی کے متعلق کچھ کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔

اب آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔ کہ تعلیم نے کسی قوم کو کتنا اور کس قدر جلد نفع پہنچایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کی اشاعت اور ترویج اس بنا پر نہیں ہونی چاہئے۔ کہ اس سے پڑھنے والوں کو ان کی زندگی میں فائدہ ہوگا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ تعلیم سے کسی آدمی کی مسرت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ غیر ایماندارانہ پروپگنڈا ہے۔ کہ تعلیم سودمند ہے۔ جو لوگ سکول اور کالج قائم کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی محنتوں کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہتے۔ پروفیسری اور استادی دو ایسے پیشے ہیں۔ جن کی کوئی قدر نہیں۔ جن کے لئے کوئی میدانِ عمل نہیں۔

بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں اٹھا لیجئے۔ آپ کو بلا استثنا نظر آئیگا کہ جن لوگوں کے سوانح حیات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں۔ جس نے کوئی اثر و اقتدار یا دولت حاصل کی ہو۔ اور تعلیم سے بہرہ ور ہوچکا ہو۔ آپ دیکھینگے کہ یا تو اس کی تعلیم بہت معمولی تھی۔ اور یا وہ اپنے تعلیمی زمانے میں بہت کند ذہن تصور ہوتے تھے۔ جو لوگ اس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات میری اس یاس آشنا ذہنیت پر ضرور مجھے کوسینگے۔ لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہونگے۔ جو میرے ساتھ اس بات کا احساس کرینگے۔ کہ درحقیقت انسان اپنی محدود عمر میں ایک ایسی شے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو اس مختصر وقفے میں کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

ایسے لوگوں کی خواہش ہوگی کہ وہ میرے خیالات اس بارے میں بھی سن لیں۔ کہ تعلیم نسلِ انسانی کے ارتقا کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔

جہاں تک موجودہ شہادت کا تعلق ہے۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر تعلیم کا کوئی اثر ارتقائے نسلِ انسانی پر ہے۔ تو وہ اس قدر کم ہے۔ کہ اس کا

ذکر حذف کیا جاسکتا ہے۔

آج کل ایک ایسا گروہ موجود ہے۔ جس کی رائے ہیں خصایل کسبی توارث عمران کے طور پر ایک پشت سے دوسری پشت تک منتقل ہوتے ہیں۔ اور ان خصایل میں سے اکثر تعلیم کے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اس گروہ کی تعداد بہت کم ہے۔

لوگوں کا خیال ہے۔ کہ تعلیم کے عام ہو جانے کے بعد شادی بیاہ کے معاملے میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیا جائے گا۔ دولہا دلہن اپنے آپ کو نسلِ انسانی کے ارتقا کی ایک لڑی سمجھکر اپنے بچوں کی صحت کی خاطر ایک دوسرے کا انتخاب بہت سنجیدگی اور احتیاط سے کیا کرینگے

جواد حیدر

یہ لوگ مدعی ہیں۔ کہ اس طرح آہستہ آہستہ لقائے اصلح کا اصول اپنا کام کرتا رہے گا۔ اور بالآخر وہ لوگ جو زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے فنا ہو جائینگے۔

تاہم میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ جب تک فطرت کی طرف سے کسی قوم میں ترقی کی صلاحیت نہ رکھی گئی ہو۔ تعلیم ان کو کوئی فائدہ نہیں بخش سکتی۔

نہ تعلیم کے فقدان سے کوئی نقصان، اور نہ تعلیم کی تحصیل سے کوئی فائدہ۔

درسِ خودداری

(از حضرت آغا حشر کاشمیری)

یقین اُن کی عنایت کا زینہار نہ کر
بہشت بھی جو یہ بت دیں تو اعتبار نہ کر

ہر ایک اشک تماشائے صد گلستاں ہے
امیدِ عیش کو شرمندۂ بہار نہ کر

وہ مرگ عشق کی لذت سے آشنا ہی نہیں
دعائے خضر پہ آمین بار بار نہ کر

ترانہ جنگ کا شورِ شکست دل کو سمجھ
کبھی اطاعتِ تقدیرِ روزگار نہ کر

جہاں میں کشمکش جہد کا ہے نام حیات
یقین مسئلہ جبر و اختیار نہ کر

متاعِ عیش فتوحات سعی کا ہے صلہ
سپاس سنجئ ایام روزگار نہ کر

(منتخب)

ہنری برگساں

پیرس مئی ۱۹۱۲ء

مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں کی تصانیف "مادہ اور حافظہ" "تعمیری ارتقا" "خندہ" دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ دنیا کی تقریباً تمام زندہ زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور اکثر ملک میں برگسانی فلسفے کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اہل انگلستان ان تصانیف کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے۔ کہ برگسان نے جو عمیق مطالعہ انگریزی فلسفیوں کے شاہکاروں کا کیا ہے۔ وہی اس کے انداز فکر و استدلال کا ماخذ ہے۔

جرمن میں بھی اس کی تصانیف کا بہت گہرا اثر ہے۔ مشہور جرمن ہرمین گراف کیسرلنگ لکھتا ہے۔

"عمانیول کانٹ کے بعد برگسان کا فلسفہ جدت اختراع کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ دوسرے فلسفیوں کے خلاف برگسان ایک ایسا پیغمبر ہے جس کی عزت کرنے میں اس کا وطن بھی پیش پیش ہے۔ قصہ مختصر اس کا فلسفۂ حیات عام و خاص میں مقبول ہے۔

برگسان تعمق فکر کے ساتھ ایک امتیازی انداز تحریر رکھتا ہے۔ اور اپنے خیالات و آرا کا اظہار اس خوبصورتی سے کرتا ہے۔ کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ یہ عظیم الشان فلسفی زندگی کے دوامی و ازلی مسائل کو ایک نئے پہلو سے دیکھتا ہے۔ اور اگرچہ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ برگسان کے ذہنی ارتقا میں بہت سے خارجی عناصر مدد دیتے رہے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا فلسفہ حیات بالکل اس کا اپنا ہے۔

برگسان نے کوئی خاص نظام کار پیش نہیں کیا۔ مگر اس نے ہمارے سامنے مستقبل کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اور نئے مقاصد نئے امکانات نئے راستے دکھائے ہیں۔

مسٹر کار نے جو کچھ فلسفہ "تغیر" کے متعلق لکھا ہے۔ اس کے ضمن میں انھوں نے برگسان کے فلسفے کا لب لباب یوں پیش کیا ہے

"فلسفہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ جو ہمارے ذہن کے مطمع نظر کو مطمئن کر سکے۔ فلسفہ روح کی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ فلسفہ ہمیں خدا اور بقائے دوام تک نہ پہنچا سکے۔ وہ خدا اور وہ بقائے دوام جس کا ذکر مذہبی ادب میں بار بار آتا ہے۔ مگر وہ اس امر کی صراحت کر دیتا ہے۔ کہ انسانی زندگی اور انفرادی عمل دلچسپی کا بہت بڑا مرکز ہیں ہے۔ زندگی کی حقیقت آزادی ہے۔ فلسفہ ہمیں اس مجبوری کے احساس سے رہائی دلاتا ہے۔ جو موجودہ زندگی کے فکر و عمل پر حاوی ہے۔ اور جو اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ کہ سائنس کائنات کو ایک بند مشین کی طرح مصور کرتی ہے۔ زندگی وسیع کائنات میں آزاد ہو کر عمل کرنے کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس کل میں کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ انسان اور وہ ناچیز کرہ جس پر انسان نے زندگی کے مسائل کو سلجھایا ہے کائنات کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر انسانی زندگی بالآخر کائنات کی زندگی ہی کا ایک ضروری جزو ہے۔ جد و جہد محرک حیات ہے۔ ہماری روحانی زندگی کا مطلب صاف ہے۔

ماضی فنا نہیں ہوا مستقبل زیر تعمیر ہے"۔ . . .

میں پیرس میں پروفیسر موصوف سے ملا تھا۔ وہ امریکہ کے فلسفیوں کا بہت مداح تھا۔ اور خاصکر ولیم جیمز کی تعریف سے تو وہ تھکتا ہی نہ تھا۔

اس نے کہا۔ آپ لوگ فلسفے میں بڑا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی نفسیات کی کتابیں تو لاجواب ہیں۔ میری نظر میں ولیم جیمز امریکہ کے سب سے بڑے آدمیوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ دنیا کے بڑے آدمیوں میں سے۔ اور صرف اسی زمانہ کے نہیں۔ بلکہ تمام زمانے کے آدمیوں میں سے۔

میں نے پوچھا کیا آپ کسی اور تصنیف میں مشغول ہیں؟

برگساں نے کہا میرے کام کرنے کا طریقہ خاص ہے۔ میں اسے انارکسٹوں کا طریقہ کہا کرتا ہوں۔ جب میں کسی موضوع کا انتخاب کرلیتا ہوں تو اسکے لئے اپنے خاص طریقے سے کام شروع کر دیتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کسی موضوع کے متعلق سوچتے سوچتے مجھے کئی اور باتوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ مگر ان باتوں کے باوجود تصنیف مکمل نہیں ہوتی۔ اس لئے میں یہ نہیں کہ سکتا۔ کہ میری تصنیف کب مکمل ہوگی۔ میں عمارت کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ آیا اُسے تکمیل تک پہنچا بھی سکوں گا یا نہیں۔ میرے فلسفہ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ میرے لئے کوئی سادہ اصول نہیں ہے۔ جس سے کام لیکر میں اپنے خیالات کو ایک منظم صورت دے سکوں ۔ فلسفے میں بہت مشکل مسائل سامنے آتے ہیں۔ اور ہر مسئلہ خاص طریقے سے حل ہوتا ہے۔ جو طریقہ آپ نے ایک مسئلے کے حل کرنے میں صرف کیا تھا۔ وہ دوسرے مسئلے میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک کے سوال کا جواب نیا ہونا چاہیئے۔

ایک بار مجھے ایک شخص نے کہا تھا۔ میں چند سوالوں کا جواب دوں۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ اس کے سوالات کے جواب تیار کرنے کے لئے کم از کم دس پندرہ سال کی مہلت درکار ہے۔

میں نے کہا مگر بعض عام سوال ایسے بھی تو ہوں گے جنکے متعلق آپ کی رائے قائم ہو چکی ہو گی۔

"ہاں! مشروط جواب تو میرے پاس بہت سے ہیں۔ مگر میری نظر میں اس رائے کی کوئی وقعت نہیں جو سرسری طور پر ظاہر کی جائے۔ کسی مسئلے پر رائے دینے کے لئے لازمی ہے کہ رائے دینے والا اس مسئلے میں غرق ہو جائے۔ اس نے اس مسئلے کو ہر پہلو سے جانچا ہو۔ اس کی قوت مشاہدہ بہتر ہو۔ اسکا ادراک اور اس کی باطنی حالت ارتقا یافتہ ہو۔ اب حس باطنی اور ادراک محض اندازہ ہی نہیں۔ وہ لوگ جو حس باطنی اور ادراک کو اندازہ کہتے ہیں غلطی پر ہیں۔ میری نئی تصنیف اخلاقیات اور جمالیات سے متعلق ہوگی۔ ان چیزوں کے اصولوں سے۔ میں پروفیسر ڈلوں کی کتاب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ کتاب قوتہ اختراع و تفکر کا ایک بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔ امریکہ میں جو تحریکات اشاعت تمدن پارینہ کی قائم ہوئی ہیں مجھے اُن سے بہت دلچسپی ہے۔ امریکہ میں مذہب اور اخلاقیات کا سوال بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔ عملی طور پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں یورپ میں تو صرف نظریئے قائم ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے پوچھا امریکہ اور یورپ کی مذہبی تحریکات میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے؟

پہلے تو یہ امریکہ کے لوگ عملی لوگ ہیں۔ وہ اپنے اخلاق و تمدن کیلئے قواعد وضوابط کا ایک مجموعہ طلب کرتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ کہ موجودہ فلسفیوں نے اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لبنیٹز نے ایک مجموعہ مکارم اخلاق مرتب کیا ہے۔ مگر اس میں صرف کلیات سے بحث ہے۔ کانٹ نے اپنے شاہکار میں اخلاقیات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اسقدر مبہم اور غیر واضح ہے۔ کہ عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

کانٹ نے کہا ہے۔

"اس طرح عمل کرو۔ کہ تمہارا عمل کائنات کا اصول بنجائے"۔

عملی زندگی میں اس مقولے پر عمل کرنا دشوار رہے۔ آپ خود اس مقولے کو سرمایہ داری اور مزدوری کے حال پر منطبق کرکے دیکھئے ۔ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اس طرح عمل کرے گا۔ کہ اس کا عمل کائنات کا اصول بن جائے۔ مگر یہ کون فیصلہ کرے گا۔ کہ ان لوگوں میں سے کون راستی پر ہے دونوں میں سے ہر ایک یہی کہے گا۔ کہ اُس کا عمل کائنات کا اصول بنا لیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ فلسفی کے جواب جواب دال کے جوابات کی طرح صاف اور درست نہیں ہوسکتے۔

امریکہ نے محسوس کر لیا ہے کہ فلسفیوں نے ضروری سوالات کا واضح جواب نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ امریکہ میں مذہبی اور اخلاقی تحریکات زور پر ہیں مجھے مذہب اور اخلاق کے باہمی تعلق سے بہت دلچسپی ہے۔

میں نے پوچھا آپ نے اپنی اکثر کتابوں میں دوام روح کے متعلق لکھا ہے۔ کیا آپ نے اس معاملے میں کوئی مزید تحقیق کی ہے۔

"میں نے عقل اور حافظے کی بیماریوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ خاصکر ان صورتوں میں جب میں حافظے اور

عقل کا تعلق صاف صاف دکھ سکتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ عقل اور دماغ کے عمل ایک نہیں ہیں۔ عقل جو کچھ کرتی ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ دماغ کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا عقل ایک ملک ہے اور دماغ اُس کا ایک شہر ہے۔ ملک جو کام کرتا ہے وہ شہر کے کام سے بہت وسیع ہوتا ہے۔ دماغ کی موت کا امکان ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ دماغ کے فنا ہو جانے کے بعد عقل کام کرتی رہتی ہے۔ اس بات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ عقل جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ میں صاف صاف نہیں کہہ سکتا کہ عقل فانی نہیں۔ مگر ظن غالب ہے کہ عقل کو فنا نہیں۔ موجودہ فلسفہ اس معاملے میں مزید تحقیق کر سکتا ہے۔ فلسفہ بھی سائنس کی طرح ترقی کر سکتا ہے۔

میں نے پوچھا "آپ کو ادب و صنعت کی نئی تحریکات سے بھی کوئی دلچسپی ہے"

برگسان نے جواب دیا "مجھے ہر اس چیز سے دلچسپی ہے جس سے ذہانت کا اظہار ہوتا ہو۔ میں ادب کے مختلف نظریوں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ ادب و صنعت میں سکول کوئی شے نہیں۔ جوہر قابل سب کچھ ہے۔ کچھ دن ہوئے میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔ جو کیوبسٹ مصوروں کی کارفرمائیوں کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا جوہر قابل جو طریقہ اختیار کرے وہی کامیاب ثابت ہوگا"

" آپ کو مصنفین میں سے کون کون سے حضرات پسند ہیں "

"میں باریز کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس کے ہاں الفاظ کا جو ترنم ہے وہ اسے شاعر کا رتبہ بخش دیتا ہے مگر بدقسمتی سے اس کا انداز تحریر اسقدر انوکھا ہے۔ کہ ترجمے میں اس کی تمام دلچسپی جاتی رہتی ہے۔ روسی مصنفین میں مجھے دوسٹوئیوسکی بہت پسند ہے۔ وہ کبھی اشیاء کے تصویر کھینچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ آپ کو وہی اشیاء دکھا دیتا تھا۔ محسوس کروا دیتا تھا اُس نے انسانی روح کو عریاں دیکھا ہے۔ وہ انسان کے لطیف سے لطیف جذبے کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا تھا۔

میں نے پوچھا نسوانی تحریکات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

برگسان نے جواب دیا۔ میرا مشاہدہ بتاتا ہے۔ کہ مرد اور عورت کی عقل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ عورتوں کو اس بات کا موقع نہیں دیا گیا۔ کہ وہ فلسفیانہ تصانیف کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اکثر میں نے عورتوں اور مردوں کے مضمون ایک ہی موضوع پر لکھے دیکھے ہیں۔ آپ تمیز نہیں کریں گے کہ ان میں عورتوں کے کونسے مضامین ہیں اور مردوں کے

(ترجمہ) وفا

صبح

جمالِ مہر انجم سوزِ محوِ گرمجوشی ہے — گلوں میں ہر طرف ہنگامۂ شبنم فروشی ہے

چمن مطرب تجلّی نغمہ زن عالم نشاط افزا — اگر زاہد بھی پی لے مے تو وقتِ چشم پوشی ہے

شجر ہیں وجد میں سرشار ہے معمورۂ دنیا — نسیمِ صبحگاہی مستِ شغلِ مے فروشی ہے

افق سے پھیلتی جاتی ہیں کرنیں مست ہے ہر شے — چھلکتا جام ہے ٹوٹی ہوئی مہرِ خموشی ہے

شفق کا بادۂ گلرنگ اور یہ جام مینائی — طلوعِ صبح بھی تمہیدِ رسمِ بادہ نوشی ہے

عزیز آزاد طائر شاخِ گل پر چہچہاتے ہیں
حیات اپنی مگر وابستۂ حلقہ بگوشی ہے

(منتخب)

عزیز لکھنوی

"شراب"

"چاہ کندرا چاہ درپیش"

آدھی رات کی خاموش تنہائی میں، نفع اٹھانے والا، "مارلو" اپنی لائبریری (کتبخانہ) میں بیٹھا ہوا، نقصان اٹھانے والے۔ موڈین کا وہ خط پڑھ رہا تھا جو اب اسے حفظ ہو گیا تھا۔ کسی شریف آدمی کو اس قسم کا کوئی خط موصول ہونا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی۔ دوسرے لوگ مارلو کو ایک شریف آدمی تصور کرتے تھے اور شرافت کے اجزائے ترکیبی کے متعلق وہ خود بھی انتہا پسند نہ تھا۔ وہ آخری بار اس خط کو لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ اس امید پر پڑھ رہا تھا کہ شاید اس وقت تک جملوں سے جو مطلب پیدا ہو رہا تھا اس میں کچھ تغیر ہو گیا ہو۔

یہ ایک کارڈ تھا اور گو اس پر تاریخ تحریر ثبت تھی مگر مقام تحریر نہ تھا۔

"یہ بہانہ کر کر کے کہ تمہاری ذمہ داریاں اور مشکلات گوناگوں ہیں تم مجھے نہایت معمولی وظیفے دے دیکر ٹالتے رہے ہو۔ لیکن اب مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم کافی دولتمند اور خوشحال ہو اور تم پر سوائے اپنی ذاتی ذمہ داری کے اور کوئی فرض عائد نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں (اور نہ میں اس کی چنداں پرواہ کرتا ہوں) کہ تمہاری اس موجودہ خوشحالی کی تعمیر میں میرا کوئی حصہ تھا یا نہیں، لیکن ہاں، یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس دولت میں میں بھی نصف کا شریک ہوں۔ سات سال گذرے کہ میں نے اپنی زبان بند کر کے قید خانے جانا گوارا کر لیا تھا۔ لیکن میں گونگا نہیں۔ اور صرف تین لفظ پولیس کے سامنے کہدوں تو گڑے سے مردے اکھاڑنے کے لئے بالکل کافی ہونگے اگر تم نے مجھے دھوکہ میں مبتلا نہ رکھا ہوتا تو میں بھی تم سے سلامت روی سے پیش آتا لیکن خیر، اب شرط یہ ہے کہ نصف، نصف بانٹ لینا چاہئے یعنی حساب کے موافق دو ہزار پونڈ میرے حوالہ کر دو۔

میں اس خط کے ذریعے سے تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اتوار کی رات، یا یوں کہئے پیر کی صبح کو ڈیڑھ بجے تم سے ملنے کے لئے آؤنگا۔ اس وقت تمہارے پڑوسی اور نوکر چاکر بھی سو رہے ہونگے۔ اور میرے خیال میں تم بھی اس وقت کو ترجیح دوگے۔ سَو، سَو کے دو ہزار پونڈ کے نوٹ وقت پر تیار رکھنا۔ میں حسب سابق باغ کی جانب سے آؤنگا اور یہ توقع ہوگی کہ کھڑکی چوپٹ کھلی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سمجھ لو کہ صدر دروازہ پر کسی پولیس افسر کے ہمراہ ہونگا۔"

"ڈبلیو، ایچ، موڈین"

نہیں، یہ کوئی خوشگوار خط نہ تھا اور بالآخر مارلو کو یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کے معنی صاف ہیں اور اس میں تغیر ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہر حال اب اتنا وقت (آتشدان پر رکھی ہوئی گھڑی ایک بجکر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی) نہ تھا کہ الفاظ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ضائع کیا جاتا۔ اب کام کا وقت آپہنچا تھا۔ وہ لکھنے کی میز پر سے اٹھا اور آتشدان کے قریب پہنچکر اس خط کو کوئلوں پر رکھ کر اسے جلتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کا خوبصورت مگر کسی قدر بھدا، شائستہ چہرہ جاذب توجہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس کی لب بستگی اگر عزم کا اظہار کر رہی تھی تو [illegible] ہوں میں خوف کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ سپید [illegible] کی رگوں نے ارغوانی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکیگا اپنے فیصلہ کو جو اس نے آج سے تین دن پہلے خط موصول کرنے کے پانچ منٹ بعد کر لیا تھا پورا کر کے رہیگا [illegible] موڈین کو ایک حصہ بھی دیگا اور اپنے آپ کو اس کی مزید پریشانیوں سے نجات دلانے کی غرض سے اس کا قصہ ہی پاک کر د[illegible] لیکن قصہ پاک کرنے کی تجویز اس

نے ابھی ابھی سوچی تھی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

آگ کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیا کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔ مگر نہیں، اس نے ہر چیز کا بندوبست کر لینے کے علاوہ اس فیصلہ کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ مورٹن کے دوسرے خطوط کا کیا بندوبست ہونا چاہئے۔ انہیں محفوظ رکھنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ ان میں سوائے روپے کے مطالبے یا اظہار تشکر کے اور کچھ نہ تھا، علاوہ ازیں ممکن تھا کہ وہ کبھی کارآمد ثابت ہوں۔

اس نے آگ کی طرف نگاہیں پھیر کر اس وسیع قطعہ مکان کو دیکھا جس میں ہر قسم کا سامان عشرت مہیا تھا اور جس کا نصف حصہ لائبریری اور نصف بلیرڈ (کھیل) کھیلنے کے کمرے کا کام دیتا تھا۔ یہ کمرہ اس کی خوش آیند و غیر شادی شدہ زندگی کا ایک مکمل نمونہ تھا جس سے اس کی آرام طلب و خود غرضانہ فطرت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب اس کی آنکھوں کا خوف ایک پُرحسد غیظ کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر وقت سر پر آپہنچا تھا اور اسے کام کرنا تھا۔

ڈیسک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر ایک کشتی میں جام شراب، بسکٹوں کی رکابی اور خود کاشتہ انگوروں کی شراب کا صبو (صراحی) رکھا ہوا تھا۔ وہ میز کے پاس پہنچا پھر معلوم ہوا کہ وہ کچھ تذبذب کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک ننھا مختصر کاغذی پڑیہ نکالی اور اسے بہت احتیاط سے کھول کر اس میں بندھی ہوئی کوئی چیز (جو بلّور کے ریزوں کی مانند تھی) نکال کر جام شراب میں ڈال دی اور اس میں شراب کی ذرا سی مقدار ڈال کر اسے انگلی سے گھسنا شروع کیا۔ بالخصوص لبوں کے پاس سے۔ اب جام کی ایسی ہیئت ہو گئی کہ گویا حال ہی میں استعمال ہو چکا ہے۔ پھر پلیٹ میں بسکٹ اٹھایا، آدھا توڑ کر جام کے پاس رکھ دیا اور آدھا آگ کی نذر کر دیا۔

ایک دفعہ اس نے پھر سوچنا شروع کیا کہ آیا معاملہ کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور ہو چکا ہے یا نہیں،

منٹ برابر گزرتے چلے جا رہے تھے۔

گھنٹہ کی بڑی سوئی آدھا بجانے ہی کو تھی کہ اسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ اب عجلت سے کام لینا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ کھڑکی کے پاس پہنچے، موٹا پردہ باندھا اور لٹکی ہوئی چادر سرکا کر باہر جھانکنا شروع کیا، رات تاریک تھی۔ باغ میں کوئی چیز متحرک نظر نہ آتی تھی۔ دفعتاً سردی سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ چادر اوپر اٹھا کر پردے ملا دئے۔

اس نے شیشی پر ایک آخری نظر ڈالی تو ایک خیال دماغ میں آیا جلدی سے ایک کاغذ کا پرزہ لیا اور اس پر "میرا انتظار کرو" کے الفاظ لکھ کر جام سے لگا کر رکھ دیا۔ بیشک یہ پرزہ اسے شراب پینے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر نہیں جہاں تک شراب کا تعلق تھا اسے کسی ترغیب کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جیل جانے سے پہلے بھی وہ بڑا پکا شرابی تھا اور بالخصوص انگور کی شراب تو اسے بہت پسند تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس چھوٹے گلاس کی شراب پینے میں بھی تامل نہ کریگا۔ اگر وہ بچی ہوئی شراب پھینک بھی دیتا تب بھی اسے ....

نارٹو وہاں سے روانہ ہوا اور کمرہ کے باہر نکل کر کواڑ کھینچے۔ اور بند کر کے کنجی جیب میں ڈال لی وہ اب ہانپ رہا تھا وہ دیوار سے پشت لگا کر آواز سننے کی کوشش کرتا رہا چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد کھڑکی کے پردے کے سمٹنے کی آواز آئی اور وہ دبے پاؤں ہال کو طے کر کے زینہ پر چڑھ گیا، اس کی کنڈی لگا دی اور سیدھا اپنے خواب کے کمرہ میں چلا گیا جو عین لائبریری کے اوپر واقع تھا۔ اپنے کپڑے جلدی سے اتارے اور شبخوابی کا لباس پہنا۔ پلنگ کی چادر اور تکیہ ادھر اُدھر بے ترتیبی سے سرکا دیا۔ پھر خود فرش پر اوندھا لیٹ گیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

(۲)

مورٹن نے کھڑکی کو بہت احتیاط سے بند کیا اور پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ اسے کمرہ خالی پا کر کتنی تشویش ہوئی ہوگی۔ مگر وہ اپنے کندھوں کو حرکت دیتا ہوا لکھنے کی میز کے قریب آیا ٹھہر گیا اور اس پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھا۔

مورٹن کوئی کریہہ المنظر شخص نہ تھا۔ اس کی چمکدار آنکھیں بہت زیادہ مستعد تھیں، تنگ لب بہت پتلے پتلے تھے جن سے نزاکت اور ـــــــ شراب پینے کی عادت کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک ہوشیار قیافہ شناس اسے ایک معتبر آدمی سمجھ لینے میں کوئی پس و پیش نہ کرتا۔ اس کا لباس گو بہت سیدھا سادا اور سستا تھا مگر حقیر نہ تھا۔

اب اس کی نظر آگ سے منتقل ہو کر کشتی پر آجمی اور پھر فوراً ہی نارٹو کے پیغام پر پڑی۔ اسے ایک دفعہ پھر کچھ شبہ ہوا

اور اس نے اپنے کندھے کو ہلاتے ہوئے زیر لب کہا "اب مارلو کو دھوکہ دینے کی جرأت نہیں ہوسکتی" اس نے یہ کہا اور کاغذ کا پرزہ ایک طرف پھینکدیا۔

"خود مفرحات کا استعمال کر رہا تھا۔ اور دوست کے لئے یہ غیر مصفا جام چھوڑ کر چلدیا مگر مجھے اب پہلے کی مانند بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیئے اور ہر وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے"

اس نے یہ کہا اور صراحی اٹھائی۔ ڈھکنا علیحدہ کیا اور شراب کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اگر تم پرانے انگوروں کی ہو تو کیا کہنے ہیں، دنیا میں ایک تم ہی تو ایسی چیز ہو جس کی "قیمت" اس کی "قدر" کی برابر ہے"۔ اس نے بہت احتیاط سے جام بھرا اور لبالب بھرا ـــــ صراحی ایک طرف رکھدی اور جام ہاتھ میں اٹھایا اور زور سے ایک چھینک لی۔ اس نے مسکرا کر کہا "قسم ہے ـــــ تم تو "وہی" ہو!"

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ اس نے جام اوپر اٹھایا اور برقی قمقمہ کی روشنی میں لیجا کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ میں مطلق جنبش نہ تھی۔

اس نے باآواز بلند کہا "یہ ہے انجام!" (اس کی محبت بھری نگاہیں شفاف ارغوانی جام کو تک رہی تھیں)

(۳)

جونہی مارلو کو دھم سے گرنے کی آواز سنائی دی اس کا جسم سر سے پاؤں تک لرز اٹھا مگر اس نے فرش پر سے اٹھنے میں مطلق عجلت نہ کی۔ غالباً اسے یہ خوف تھا کہ اگر اس وقت نیچے گیا تو اس کے اعصاب جواب دیدینگے، ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ اسی طرح کئی منٹ تک لیٹے رہنے سے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

مگر پھر اسے یہ خیال آیا کہ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے اور اس فعل کی تکمیل کے لئے اسے ابھی ہمت سے کام لینا چاہیئے، علاوہ ازیں رات ختم ہونے سے پیشتر تو اسے لاش کے سوا اور کسی چیز سے واسطہ بھی نہ پڑنے والا تھا۔ پھر دل میں بار بار خیال آیا کہ وقت کا بدترین حصہ تو ختم ہوچکا ہے، اب نیچے چل کر شراب اڑاؤ۔ یہ سوچ کر وہ فرش پر سے اٹھا اور آئندہ کا پروگرام سوچنے لگا۔

اس سوانگ کا اہم جزو وہ لباس تھا جو مارلو پہنے ہوئے تھا۔ اسے پہنے ہی پہنے وہ نیچے آیا اور بہت احتیاط سے (حالانکہ کوئی ضرورت نہ تھی) لائبریری کا قفل کھولا، مگر اس میں بلاتوقف داخل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ ہر طرف بھونچکا ہو ہو کر دیکھا اور اسی حیرانی کی حالت میں اندر داخل ہوا۔

صرف ایک نظر نے بتا دیا کہ اب مورٹن اسے مزید پریشانیوں سے تکلیف دینے کے لئے زندہ نہیں ہے۔ اور اب سوائے اس کے کوئی مزا اڑانے والا نہ ہوگا۔

مورٹن آتشدان کے قریب بائیں کروٹ سے چہرہ کے بل ہاتھ پھیلائے ہوئے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ دونوں مٹھیاں بند تھیں۔ دائیں ہاتھ میں جام شراب کی ٹوٹی ہوئی پیندی تھی اور پیروں میں مارلو کے پیغام کا پرزہ پڑا ہوا تھا۔

مارلو کی یونہی نظر پرزہ پر پڑی اس نے دبے پاؤں آگے سرکنا شروع کیا اور اسے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا اور پھر واپس ہو کر وہ کاغذ کا پرزہ نکالا جس میں سفوف بندھا ہوا تھا۔ اس پرزہ کو عین کشتی کے نیچے فرش پر گرا دیا۔

کمرہ میں خاموشی طاری تھی

پردوں کو کسی قدر سرکایا، کھڑکی کو تھوڑا سا کھول دیا تاکہ مورٹن کے کمرے میں داخل ہونے کا طریقہ بالکل عیاں نظر آنے لگے۔

چادروں کو ٹھیک ٹھاک کر کے لائبریری سے نکلنے اور ہال طے کرنے کے بعد "دارالطعام" (ڈائننگ روم) میں پہنچا اور برانڈی کی اچھی معقول مقدار نوش کی۔ جس سے وہ اپنے آپ کو زیادہ ہوشیار، مستعد اور مسرور محسوس کرنے لگا۔

گو لائبریری میں ٹیلیفون موجود تھا مگر وہ اس آلہ کے پاس پہنچا جو ہال کی پشت پر لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچکر پولیس چوکی کو بلاتوقف مخاطب کیا۔ اپنا نام اور پتہ دینے کے بعد یہ کہا:۔

"جناب یہاں ایک حادثہ ہوگیا ہے۔ جب میں اوپر سے اتر کر اپنی لائبریری میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص فرش پر مردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا کہ یہ وہی شخص تھا جسے میں مفلوک الحال سمجھ کر مدد دیتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ سے بعض مجبوریوں کی بنا پر میں نے اس کو مدد دینی بند کر دی تھی"۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکایک مرگیا ہے۔ ایک جام شراب اور کاغذ کا ایک پرزہ بھی پڑا ہوا ہے۔ مگر میں نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں ہے اور ہر چیز اپنی اصلی ہیئت میں موجود

ہے۔ مہربانی فرما کر چند آدمیوں کو بھیج دیجئے نیز ایک ڈاکٹر کو بھی ہمراہ بھیجئے گا۔"

چند مختصر سوالات کے جوابات دیکر وہ لائبریری میں واپس آیا اور برانڈی دیکھ کر دل للچانے لگا کہ تھوڑی سی اور پیوں مگر پھر یہ خیال آیا کہ وہ پہلے ہی بہت پی چکا ہے نیز پولیس کو ضرورت سے زیادہ باتیں بتا گیا ہے اس وجہ سے مناسب یہی ہے کہ فی الحال احتراز کیا جائے۔

پولیس کی موٹر کا انتظار رشتہ امل کی طرح طویل ہو گیا مگر بارے خدا خدا کر کے موٹر آ پہنچی اور اس کے تیار ہونے سے پہلے افسر دروازہ پر آگیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا جس کے کھلتے ہی ایک افسر سارجنٹ اور ایک کانسٹبل داخل ہوا۔

چونکہ ڈاکٹر کو ایک ضروری کیس دیکھنا تھا اس وجہ سے وہ چلا گیا تھا مگر پولیس نے اسے واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ بھی عنقریب آنے ہی والا تھا۔

(۴)

ہارلو نے کہا "میں نے چوکیدار اور نوکروں کو مطلق نہیں جگایا ہے تاکہ کوئی خلل واقع نہ ہو۔"

سارجنٹ نے اس طرح گردن ہلائی گویا وہ اس رائے سے متفق تھا۔ لیکن اس کی متجسس نگاہیں ہارلو کے چہرہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"سارجنٹ صاحب مجھے جو کچھ معلوم ہے عرض کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ابھی ٹھہرو پہلے اس شخص کو دیکھ لینے دو۔"

ہارلو نے اپنی نارضامندی کو بڑی مشکل سے چھپایا اور انہیں لائبریری میں لے آیا۔ اور دھیمی آواز میں کہا:۔

"میں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ——— اسے چھوا تک نہیں۔ صرف یہ دیکھا تھا کہ آیا وہ مرگیا یا زندہ ہے۔"

"وہ مکان میں کیسے داخل ہوا؟"

"میں نے رات کو سب دروازوں میں قفل ڈال دیا تھا۔ سوائے اس کھڑکی کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا"

"مسٹر ہارلو آپ آگ جلتی چھوڑ دیتے ہیں؟"

"میں ——— میں ——— جی ہاں ذرا آج دیر سے سویا تھا!"

"اچھا، میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

ہارلو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "مجھے معلوم نہیں کہ آپ اسے خودکشی کہینگے یا نہیں ——— مگر یہ ضرور ہے کہ یہ شخص ہوشمند نہ تھا۔"

سارجنٹ نے اس کا جواب دئے بغیر دو زانو ہو کر مردہ کو دیکھنا شروع کر دیا اور کامل بیس سیکنڈ تک چہرہ پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور کہدیا کہ

"یہ شخص ہرگز نہیں مرا"۔

مورٹن یہ سن کر اچھل پڑا اور کہا "یہی تو بات ہے (اشارہ کر کے) اسے اوپر اٹھا لیجئے۔ یہ کیا مذاق کیا ہے آپ نے"۔

سارجنٹ نے کسی قدر ترشرو ہو کر کہا "مگر اس مذاق سے مطلب کیا ہے"؟

سارجنٹ فرش پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولا:۔

"میں اس کی تشریح کئے دیتا ہوں۔ سنئے میں یہاں آج رات کو طے شدہ وعدہ کے بموجب ڈیڑھ بجے کھڑکی کی راہ سے داخل ہوا کیونکہ مسٹر ہارلو سے ایک بات کے متعلق گفت و شنید کرنی تھی۔ مگر وہ رضامند نہ تھے۔ اور بات کو ٹال دینا چاہتے تھے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اسے روشنی سے جگمگاتا ہوا دیکھا مگر یہاں کوئی موجود نہ تھا، صرف ایک کاغذ کا پرزہ جام شراب سے لگا ہوا رکھا تھا جس پر تحریر تھا۔ "میرا انتظار کرو"۔

سر فیٹ نے پوچھا کہ "وہ پرزہ کہاں ہے"؟

"جب یہ شخص مجھے مردہ سمجھ کر اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے کمرے میں آیا تو سب سے پہلے اس کاغذ ہی کو آگ میں جلا دیا ——— خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں سخت پیاسا تھا اس وجہ سے میز پر شراب دیکھ کر ایک جام بھر لیا اور ———"

"میں نے بھی تو اسی صراحی سے تھوڑی دیر شراب پی تھی ———" (ہارلو نے بمشکل تمام یہ الفاظ کہے)۔

سارجنٹ نے قطع کلام کر کے کہا "ایک وقت صرف ایک شخص کلام کرے۔ ہاں تم کہو" (مورٹن کی طرف سر سے

اشارہ کیا)

مورٹن نے سلسلہ کلام جاری کیا۔ "جب میں نے جام بھر لیا اور اسے سونگھا تو بہت اچھی خوشبو آئی اس وجہ سے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کا رنگ بھی دیکھنا چاہیئے، میں نے جام کو روشنی میں لیجا کر دیکھنا شروع کیا مگر جونہی کہ میں اسے نیچا کر کے پی جانے کو تھا مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں نے جام کی تہہ میں کوئی چمکدار چیز آہستہ آہستہ بیٹھتی ہوئی دیکھی تھی۔ اس میز پر خوردبین رکھی ہوئی ہے میں نے اسے اٹھایا اور استعمال کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بلور کے سے ریزے تھے۔ میں سوچنے لگا اب کیا کرنا چاہیئے۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ اصلیت معلوم کرنی چاہیئے۔ میں ایک کرسی پر چڑھا اور بہت زور کے دھماکے کے ساتھ فرش پر دھم سے آ گرا اور لیٹا ہوا انتظار کرنے لگا۔ میں لیٹے ہوئے انتظار کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً خیال آیا کہ ہارلو کا ایک واقفکار ایک محقق کیمیاداں (ریسرچ کیمسٹ) ہے جس کا نام موکر ہے اور یہ کہ ہارلو اس کے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیمیاداں ہارلو کو یا کسی اور کو ایسا خوفناک زہر دیسکتا ہے مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ ہارلو جیسا شخص کے لئے جو اس کی لیبوریٹری (معمل) میں آیا جایا کرتا ہو آنکھ بچا کے زہر اڑا لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بہر حال آپ خود ہارلو سے دریافت فرما سکتے ہیں کہ وہ پچھلے تین دنوں میں اس کے معمل میں گیا تھا یا نہیں ———"

"یہ جھوٹا ہے!" ہارلو نے ہانپتے ہوئے کہا

سارجنٹ بولا "میں دونوں سے کہتا ہوں کہ آپ جو کچھ بھی کہیں بہت احتیاط سے کام لیں کہیں آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں ———"

"بس تقریباً ختم کر چکا ہوں" (مورٹن نے کہا) "صرف یہ کہنا اور باقی ہے کہ جب یہاں لیٹے لیٹے تھک گیا تو میں اکتا کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ یہ کمرہ میں داخل ہوا مگر میں نے اس وقت بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر یہ مجھے دیکھنے کی غرض سے قریب آیا تو پھر اسے مزا چکھادونگا مگر اسوقت خیر گذری کہ وہ میرے قریب تک نہ آیا بلکہ کاغذ کا پرزہ اٹھا کر آگ میں ڈالدیا اور اس کی بجائے ایک دوسرا پرزہ ڈال دیا دیکھئے وہ فرش پہ پڑا ہے اس کے نیچے ———"

"جھوٹ ہے! جھوٹ ہے! یہ بالکل جھوٹا ہے!" ہارلو نے قطع کلام کر کے کہا (اب وہ اپنے اوپر کسی قدر قابو پا چکا تھا) "اگر یہاں کہیں زہر ہے تو کہاں ہے ——— میری شراب میں ہرگز زہر نہ تھا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ دیکھئے وہ جام شراب رکھا ہوا ہے میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں اس گلاس کو اٹھا لایئے میں ابھی شراب پی کر بتا دیتا ہوں کہ یہ قطعی جھوٹا ہے، زہر کہیں نہیں ہے۔"

کانسٹبل نے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر آتشدان پر سے گلاس لانے کی اجازت دیدی۔

ہارلو گلاس ہاتھ میں لے کر کشتی کے پاس آیا۔

تینوں آدمی اس کی طرف متحیر و بیچین ہو ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مورٹن تو اس پر اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ گویا وہ مسحور کر دیا گیا ہے۔

ہارلو نے صراحی اٹھائی، جام بھرا اور اسے پھر اپنی جگہ پر رکھکر جام لئے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا، اور یونہی سر پیچھے جھکا کر اس نے جام پینا چاہا مورٹن جو اب اپنے خیالات کے سمندر سے باہر نکل آیا تھا ایک دم غل مچا کر ہارلو کی طرف بڑھا اور کہا "پکڑو پکڑو، ہرگز مت پینے دو ———"

ہارلو نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور آدھا جام حلق میں اونڈیل لیا۔ پھر ذرا دیر توقف کیا، اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

ہاتھ میں رعشہ ہوا۔ اور اس نے جام زور سے کھینچ کر دیوار پر پھینکدیا جو چکنا چور ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جن کا تلفظ صحیح نہ تھا۔ جسم میں تشنج (اینٹھن) شروع ہوا موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ غش کر کانسٹبل کے بازوں میں گر پڑا۔

سارجنٹ گھبرا کر آگے بڑھا اور گھگی بندھی ہوئی آواز میں بولا "یا خدا! یہ تو دم توڑ رہا ہے!"

اسی اثنا میں ڈاکٹر بھی آموجود ہوا۔ اس نے دیکھتے ہی بلا پس و پیش کہدیا کہ یہ زہر تھا اور کچھ نہیں۔ مگر کونسا یہ ابھی تک شناخت نہ ہوا تھا۔

* * * * *

اس کے بعد مورٹن کو اکثر رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اسے کیمیاداں

کی واقفیت والا واقعہ خوب وقت پر یاد آگیا ورنہ اس کے یہ کہنے کا کون یقین کر سکتا ہے کہ اس نے ایک ناگہانی خیال سے متاثر ہو کر بن چکھا ہوا جام دوبارہ صراحی میں الٹ دیا تھا! ؟

(ترجمہ)

ظفر قریشی دہلوی

رباعیات

اللہ رے ستم کہ دل دکھاتے بھی نہیں
ہو کوئی اداس تو رلاتے بھی نہیں
مایوس دلوں کو چھیڑ جاتے بھی نہیں
روتا ہو کوئی تو مسکراتے بھی نہیں

یہ درد کی دنیا ہے اِدھر دیکھ تو لے
کچھ اور نہیں کہتے مگر دیکھ تو لے
جس دل کا ہے یہ حال تغافل سے ترے
اُس دل کی طرف ایک نظر دیکھ تو لے

بیتاب ہیں تیرا نام لیتے بھی نہیں
ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیتے بھی نہیں
ایسا کب تھا ترا تغافل۔ لیکن
کچھ دل کی تڑپ سے کام لیتے بھی نہیں

گھر چھوڑے ہوؤں کی کوئی منزل نہ سہی
آساں نہیں ہوتی جو یہ مشکل نہ سہی
دن رات فراق اُداس رہنے کیلئے
ویرانہ سہی کسی کی محفل نہ سہی

اے دل تجھے حسن روئے تاباں کی قسم
اے دل تجھے گیسوئے پریشاں کی قسم
جینے سے ہے کس لئے تو اتنا بیزار
اے دل تجھ کو جمال جاناں کی قسم

(غیر مطبوعہ)

فراق

قومی تعصّبات

میں بھی اس قسم کے افراد میں سے ہوں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ شراب خانوں - قہوہ خانوں اور دیگر عام مجالس میں گزارتے ہیں اس لئے مجھے مختلف لوگوں کی عادات و خصائل کے مشاہدہ کا موقعہ ملتا ہے - میرے جیسے غور و فکر کرنے والوں کے لئے یہ شغلہ مناظر قدرت یا صنعت کے خوبصورت مظاہر کے نظاروں سے کہیں زیادہ دلفریب ہے - ایک روز مجھے حسن اتفاق سے چند ایسے اشخاص کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ایک قہوہ خانہ میں بیٹھے ہوئے کسی اہم سیاسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے - چونکہ ان کی رائیں بالکل مساوی تھیں اس لئے مجھے بطور ثالث طلب کیا گیا - چنانچہ مجبوراً مجھے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لینا پڑا -

مختلف مسائل پر بحث چھڑ رہی تھی آخر کار جب یورپ کے مختلف اقوام کی عادات و خصائل کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے، ایسے لب و لہجہ میں گویا تمام انگریزی قوم کی قابلیت صرف انہیں کی ذات میں سمائی ہوئی تھی' یوں گلفشانی شروع کی "اہل ہالینڈ بیحد لالچی ہیں - فرانسیسی خوشامدی کتے ہیں - اہل جرمنی مخمور بے وقوف اور حیوانوں کی طرح پیٹو ہیں - اہل سپین مغرور - غصیلے اور حد درجہ ظالم ہیں - نیکی - شجاعت سخاوت - رحمدلی اور دیگر تمام صفات محمودہ میں انگریز تمام دنیا کی قوموں سے بڑھ چڑھ کر ہیں -"

اس منصفانہ فیصلہ کو سنکر تمام لوگوں نے مسکرا کر پسندیدگی کا اظہار کیا مگر میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا سنجیدگی سے سنتا رہا - اور اپنے بازو پر سر کو جھکائے ہوئے ایک طرف کو نہایت انہماک کے ساتھ دیکھتا رہا گویا میں نے ان صاحب کے اس عاقلانہ فیصلہ کو سنا ہی نہیں بلکہ کسی اور خیال میں منہمک تھا - میرا خیال تھا کہ اس طریقہ سے میں اپنی رائے کے اظہار سے محترز رہ کر ان کی مسرت برباد کرنے کے غیر دل خوش کن مشغلہ سے بچ جاؤنگا مگر ہمارے یہ چھوٹے قوم پرست، مجھے اس آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے - چنانچہ اس غرض سے کہ اپنی اس بکواس کا پورا صلہ پائیں - آپ نے ہر ایک سے تحسین وصول کرنے کے لئے پوچھنا شروع کیا کہ آیا اُن کا خیال بالکل بجا اور حق بجانب تھا - مجھ سے بھی یہی سوال پوچھا گیا -

گو میری عادت ہے کہ میں اپنی رائے ہمیشہ محفوظ رکھتا ہوں بالخصوص ایسے مواقع پر جب مجھے یقین ہوتا ہے کہ میرے خیالات رائے عامہ کے خلاف ہیں - لیکن جب کبھی مجبوراً مجھے کچھ کہنا ہی پڑتا ہے تو میں بلا پس و پیش اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتا ہوں - چنانچہ میں نے صاف الفاظ میں ان سے کہہ دیا کہ "میں ایسے یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تاوقتیکہ تمام یورپ کا ایک دورہ نہ لگالوں اور ان تمام اقوام کی عادات و خصائل کا نہایت غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرلوں - شاید کوئی اور غیر جانبدار شخص یہ فیصلہ کرنے میں کوئی تامل نہ کرے کہ اہل ہالینڈ دستکاری اور کفایت شعاری میں فرانسیسی ملنساری اور خوش اطواری میں اہل جرمنی محنت میں - اہل اسپین سنجیدگی اور مستقل مزاجی میں انگریزوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں اور انگریز جلد باز - متکلف اور کم حوصلہ ہوتے ہیں۔"

میں نے دیکھ لیا کہ میرے جواب کے ختم ہونے سے پہلے ہی تمام لوگ میری طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے - اور جوں ہی میں نے اپنا جواب ختم کیا ان مستفسر صاحب نے زہرخند کر کے فرمایا کہ "مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ لوگ جو اپنے ملک سے کوئی الفت نہیں رکھتے اور اپنی قوم سے نفرت کرتے ہیں کیوں اسی ملک و قوم کی حکومت کے سایۂ عاطفت میں پل رہے ہیں"۔ یہ دیکھ کر کہ میں نے اظہار خیالات کر کے ان لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے اور ایسے جہلا سے بحث کرنا بے سود ہوگا - میں نے چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی راہ لی - راستہ بھر دل میں قومی تعصبات کی بیہودگی پر غور کرتا رہا -

قدیم اقوام میں کوئی قول ایسا نہیں جو کسی شخص کے لئے (بشرطیکہ وہ آزاد خیال اور منصف مزاج ہو) اس قول سے زیادہ مسرت بخش ہو سکتا ہو جو اس فیلسوف کی طرف منسوب ہے - جس سے اس کی قومیت کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا اس

نے کہا تھا "میں دنیا کا باشندہ ہوں"۔ آج اس دنیا میں کتنے ایسے افراد ہیں جو یہی جواب دے سکتے ہیں؟ یا جن کے افعال وکردار اس قول کے مطابق ہیں؟ ہم لوگ آجکل کچھ اس طور سے انگریز۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ یا ہسپانوی بنگئے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی 'دنیا' کا باشندہ نہیں رہا۔ ہم لوگ کسی خاص چھوٹے سے مقام یا چھوٹی سی قوم سے اس طرح وابستہ ہوگئے ہیں کہ اب ہم اپنے تئیں اس تمام کرۂ ارض کا باشندہ نہیں سمجھتے اور تمام بنی نوع انسان کی اس ایک عظیم الشان اور واحد قومیت سے اپنا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔

اگر یہ تعصبات محض وحشی قوموں میں پائے جاتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا اس لئے کہ ان کو تعلیم یافتہ ہوکر اور دوسرے ملکوں کی سیر وسیاحت کرکے اپنے خیالات کے سدھارنے کا کوئی موقعہ نہیں ملتا مگر بدنصیبی تو یہ ہے کہ یہ خیالات ہمارے شرفا میں پائے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے افعال تک سے ظاہر ہوتے ہیں شرفا سے میری مراد وہ اشخاص ہیں جن کے اس خطاب کے اہل ثابت ہونے میں سوائے قومی تعصبات کے اور کوئی شئے حائل نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں ہر شریف انسان میں شرافت کی سب سے بڑی نشانی بے تعصبی ہونی چاہیئے۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنے ہی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا ہی دولتمند ہو اگر وہ قومی یا دیگر تعصبات سے بری نہیں تو میں اس کے روبرو کہنے تک کے لئے تیار ہوں کہ وہ ایک کمینہ شخص ہے۔ اور کسی صورت میں بھی شریف کہلانیکا مستحق نہیں ہوسکتا۔ یہ بات آپ عام طور پر دیکھیں گے کہ وہی لوگ اپنی قوم کی تعریف میں زیادہ رطب اللسان ہیں جو خود کسی قابل نہیں — کیونکہ انگور کی بیل شاہ بلوط کے گرد اسی لئے لپٹتی ہے کہ وہ خود اپنا بار اٹھانے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتی۔

اگر قومی تعصبات کے حق میں یہ کہا جائے کہ "یہ حب الوطنی کے لئے قدرتی طور پر لازمی خیالات ہیں"، تو میں اس کے جواب میں یہ عرض کرونگا کہ یہ محض وہم اور غلط فہمی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ قومی تعصبات کی وجہ سے ہمیں اپنے ملک وقوم سے محبت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ ہرگز نہیں مانوں گا - کہ یہ خیالات قدرتاً ضروری اور لابدی ہیں۔ یوں تو ضعف اعتقاد بھی مذہب کے عروج میں بہت مدد دیتا ہے لیکن ہے کوئی ایسا جو کہدے کہ اس پاک اور طیب پودے کی نشو ونما کے لئے ضعف اعتقاد کا ہونا لازمی ہے؟ اگر تم چاہو تو ان خیالات کو اس جلتی پودہ کی چند بیکار اور کمزور شاخیں کہہ سکتے ہو۔ لہذا اگر یہ شاخیں اس پودہ سے توڑ دی جائیں تو اصلی درخت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اگر ان بیکار شاخوں کو علیحدہ نہ کیا گیا تو درخت اچھی طرح نشو ونما نہیں پاسکیگا۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے ملک کے ساتھ محبت رکھتے ہوئے دوسری قوموں سے بھی نفرت نہ کروں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں شجاعت، دلیری۔ اور حد درجہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے ملک وقوم کی خدمت کروں اور اس کے حقوق کی حفاظت کروں مگر دوسری اقوام کے افراد کو گدھا یا بزدل نہ بتاؤں؟ بیشک یہ ممکن ہے۔ اور اگر یہ ناممکن ہو (مگر میں کیوں ایسی بات فرض کروں جو بالکل غلط ہے؟) تو میں فخریہ اس خطاب سے ملقب ہونے کے لئے تیار ہوں جو زمانہ قدیم کے اس ادیب نے اپنے لئے اختیار کیا تھا۔ یعنی دنیا کا باشندہ۔ میں اس خطاب کو ہر ایک دوسرے خطاب کے مقابلہ میں ترجیح دونگا۔

(گولڈ اسمتھ)　　توفیق حسن مسقطی

دشواریوں کو عشق نے آسان بنا دیا　　غم کو سرور، درد کو درماں بنا دیا
موجِ شعاعِ حسن ہو یا اضطرابِ شوق　　دونوں کو کشمکش نے پریشان بنا دیا
کس کی بہارِ حسن ہے میری نگاہ میں　　جس سمت اُٹھ گئی چمنستان بنا دیا
بزمِ ازل سے جھاڑ کے دامن چلا جو میں　　ذرّوں نے اٹھ کے عالم امکان بنا دیا

(معارف)　　اقبال احمد سہیل

مینار کا سایہ

میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ کہ اپنے مشاہدات کسی دوسرے کو کسی شخص کے حوالے کر جاؤں۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا۔ کہ انہیں کسی سائنسداں کے سپرد کر دوں۔ مگر بعد میں اس ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ میں خود ایک سائنس داں ہوں۔ اور اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ سائنس داں ہر ایک بات کو شک کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ میرے افسانے کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔

پھر میں نے سوچا۔ کہ اپنے دوستوں میں سے کچھ حضرات کو اس عجیب و غریب واقعے کا مشاہدہ کرا دوں جو مجھے پیش آیا تھا لیکن افسوس میرے پاس وقت نہ تھا۔ خدائے قدوس نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ میری باقی ماندہ زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس کے بیان سے انسان کے خزینۂ علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ سائنس کو اس قسم کی باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ علم ایسے انکشافات سے ڈرتا ہے۔ یہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں! یہ واقعہ افسانوں اور داستانوں کی مملکت سے آیا ہے۔

...۔ میں .... راجپوتانے کے ایک مشہور شہر کے مضافات میں ٹھہرا ہوا تھا۔ (اس مشہور شہر کا نام ظاہر نہ کیا جائے گا) تفکر کے لئے .... سے زیادہ شاندار اور کوئی شہر موزوں نہ ہوگا۔ شام کا وقت تھا۔ اور وہ خموشی جو صبح اور شام کے ملتے وقت طاری ہوتی ہے چھائی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ایک بلند مینار آسمان سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے پر مخملی مبادے کی طرح آسمان کا حیرت انگیز گہرا نیلا رنگ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا۔ کہ اس مینار میں ایک راجپوت شہزادی زندہ چنوا دی گئی تھی۔

یہ حکایت اس طرح مشہور تھی۔ کہ مینار کے پاس ایک پرانا قلعہ ہوتا تھا۔ جو امتداد وقت کے ہاتھوں اب برباد ہو چکا تھا جو راجپوت سردار اس قلعے کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اُسے خواب میں حکم دیا گیا تھا۔ کہ قلعے کے ساتھ ایک مینار تعمیر کرائے جس کی دیوار میں ایک عورت زندہ چنوا دی جائے۔ سردار نے اس حکم کی پروا نہ کی اور قلعہ کی تعمیر میں مصروف رہا دن کو قلعہ کا جتنا حصہ تعمیر ہوتا تھا شب کو گر پڑتا تھا۔ آخرکار ایک دن سردار صبح قلعے کے کھنڈروں کے سامنے کھڑا ہوگیا اور جو عورت سب سے پہلے اس طرف سے گذری اُسے زندہ چنوا دیا گیا۔

وہ عورت اس کی اپنی بیوی تھی۔

میں اس مقام پر کئی ماہ رہا۔ مینار کے آس پاس پرانے باغ تھے۔ ہر روز دھوپ کی سنہری روشنی میں پھولوں کا ایک بحر بیکراں افق کے کناروں میں جذب ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ صبح کی صاف ٹھنڈی فضا میں پر اسرار مینار کا سایہ تمام چیزوں پر محیط معلوم ہوتا تھا۔

ہر روز میں خوشگوار دھوپ میں بے فکر خدائے قدوس کا شکر ادا کرتا تھا۔ کہ اس نے انسان کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور کیا۔ خوبصورت تیتریاں۔ مسکراتے ہوئے پھول۔ حتیٰ کہ مینار کے ارد گرد کی خالی جگہ بھی حسین معلوم ہوتی تھی۔ مینار کے پاس کے باغ میں میرے لئے مقناطیس کی سی کشش تھی میں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے ذہن کو اس طلسم کی بندشوں سے آزاد کر لوں۔ اور کسی اور تنہا مقام کا انتخاب کر لوں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا کوئی پراسرار قوت مجھے مینار کی طرف کھینچے ہوئے لئے جا رہی ہے۔ گھبرا کر میں اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھتا۔ اور پھر تھوڑے عرصہ کے بعد پھولوں کے حسن خموش کے پاس پہنچ جاتا۔ جہاں میں بیٹھا کرتا تھا وہاں سے تھوڑے فاصلے پر سورج مکھی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور ہوا کی موجوں سے جھک جھک جاتے تھے۔ گویا سورج کی زرنگار شعاعوں کو بوسے دے رہے ہیں۔ اس منظر میں

میں مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اور اُٹھنا دشوار ہو جاتا تھا۔

میرے سامنے مینار پر اسرار مینار کی بلندی رفعت آسمان کو شرماتی تھی۔ اور سورج کی خیرہ کن شعاعیں مینار کا جزو معلوم ہوتی تھیں۔ مینار دھوپ اور روشنی میں بہا بہا جاتا تھا۔ مگر مینار کا سایہ کسی ہیبت ناک اور عظیم الجثہ دیو کی سوئی کی طرح لرزاں پھولوں کے رنگ پر تاریکی کی ایک لکیر کھینچ دیتا تھا۔

عین دوپہر کے وقت منظر کا اثر اور زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ دوپہر کا وقت آدھی رات کے وقت کی طرح ایک پر اسرار وقت ہے۔ سکون مکمل سکون طاری ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ دنیا خاموش کسی چیز کے انتظار میں محو معلوم ہوتی ہے۔ خوف کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ فطرت سانس روک لیتی ہے۔ اور بے رحم دھوپ اس خوفناک منظر کے تاثر کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے۔

ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔ کوئی شے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی کوئی جائے پناہ۔ کوئی سایہ نہیں رہتا۔ کائنات عریاں ہو جاتی ہے۔ اور دم روکے ہوئے آنے والے خطرے کے انتظار میں محو ہو جاتی ہے۔ نور کی تابندگی خلاف فطرت معلوم ہوتی ہے۔ چودھویں کے چاند کی طرح درخشاں سفید روشنی خوفناک نظر آتی ہے۔ میں ایسے وقتوں میں سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہتا تھا۔ سر اُٹھاتے ہوئے مجھے ڈر آتا تھا۔ میں سمجھتا تھا شاید یہ خوف سورج کی کرنوں نے پیدا کیا ہے۔ سورج آہستہ آہستہ سر پر آ گیا ہے۔ اور اس کی سوزندہ کرنیں دنیا کی ہر شے کو لباس نور پہنا رہی ہیں۔ اس تمام روشنی میں صرف مینار کا سیاہ سایہ سنگ مزار کے سائے کی طرح ہیبت ناک اور مرعوب کن نظر آتا ہے۔

اسی طرح کا ایک دن تھا۔ دس بجے کا وقت ہو گا اس وقت سورج گرم دہکتا دیو تا معلوم ہوتا تھا۔ صبح کی ہوا فرحت انگیز تھی۔ اور پہاڑیوں پر لطیف اور سبک سائے رقص کر رہے تھے۔ میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک دہقانی عورت گود میں ایک بچہ اُٹھائے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ بچہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اس کی نحیف آواز گریہ سے درد و کرب کا اظہار ہوتا تھا۔

عورت نے بچے کو مجھ سے دس گز کے فاصلے پر کپڑا بچھا کر لٹا دیا اور خود پاس کے ایک کھیت میں چلی گئی

بچہ خاموش لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا درد و کرب مٹ گیا ہے۔

سورج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ بلند اور بھی بلند رنگ برنگ کے پھول عجب طرح چمک رہے تھے۔ زمین پر ان کے سائے نادر اور عجیب شکلیں اختیار کرتے تھے۔ میری نگاہ نور اور رنگ کے اس امتزاج سے خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ مجھے باغ لرزتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چیزیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی جا رہی تھیں۔ مینار آسمان کے سامنے کانپتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک تیتری ادہر اُدھر دھوپ کی لرزاں لہروں میں پرواز کر رہی تھی۔ . . . .

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

درخشاں تاریکی مخمل کی طرح نرم اور لطیف۔ میرے دماغ پر چھا گئی۔ نیلے اور سرخ نقطے جن کے گرد قوس قزح کے سے رنگوں کا حاشیہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے حرکت کرنے لگے ایک نشان بلند ہو کر غائب ہو گیا۔

دوپہر قریب تھی . . . .

یکایک ایک چیخ کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول لیں دوپہر ہو چکی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گویا میں کسی اور دنیا میں آ پہنچا ہوں۔ بے رحم سفید روشنی ہر شے پر منڈلا رہی تھی۔ ہیبتناک خاموشی اور باغ میں صرف مینار کا سایہ نظر آتا تھا اس سائے میں بچہ لیٹا ہوا تھا۔ اور گویا اس وقت کے خطرے کا احساس کر کے چیخ رہا تھا۔ کراہ رہا تھا۔

یکایک میرا دل ڈوب گیا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا مینار کا سایہ بچے پر چھایا ہوا ہے۔ پہلے بچہ مینار کے سائے میں نہیں لیٹا تھا۔ مینار کے سائے سے بہت دور تھا۔ میں نے سورج کی طرف دیکھا۔ اور پھر دوسرے سایوں کی طرف نظر دوڑائی۔ پھر میں نے مینار کے سائے کی طرف دیکھا۔

بے شبہ علم مناظر و مرایا کے اصولوں کی مطابقت

میں مینار کے سائے کو اس جگہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

سورج مینار کے اوپر تھا۔ ذرا بائیں طرف۔ اور اس صورت میں سورج کا سایہ مینار کے دائیں طرف ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ اس وقت سایہ بائیں طرف تھا۔ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ کہ میرے دل کی کیا کیفیت ہوگئی۔ میں سائنس کے تجارب سے آشنا تھا۔ مگر اس عجیب وغریب منظر کی کوئی تصریح اس مشکل کا کوئی حل میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی اور تمام سائے دائیں طرف تھے لیکن اندھیرا نہ تھا۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ ہر شے صاف اور واضح اور ایک ناقابل تردید حقیقت کی طرح روشن تھی۔ جوں جوں میں اس عظیم سائے کو نیچے پرچھایا ہوا دیکھتا تھا۔ توں توں میرا خوف بڑھتا جاتا تھا۔

دوپہر کی خاموشی میں بچہ رو رہا تھا۔ گویا وہ سمجھتا تھا۔ کہ جو سایہ اس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ خلاف فطرت ہے۔ خوفناک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایک سائے نے جو فطرت کے اصولوں کے خلاف عمل کر رہا تھا۔ دوپہر کی گرمی۔ طیور کی خاموشی اور بچہ کی آواز گریہ میں ایک نئے معنے پیدا کر دئے تھے۔

میں اس قدر متاثر ہو چکا تھا۔ کہ میرے ہاتھ پاؤں نے حرکت کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ اتنے میں بچے کے رونے کی آواز سن کر اس کی ماں دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی اور بچے کو اٹھا کر لے گئی۔

میں چاہتا تھا کہ اس واقعے کو ایک مرئی شعبدہ تصور کروں۔ مگر سایہ ابھی تک اپنی جگہ قائم تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تک سرخ اور سبز نشان میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ دوسرے اصحاب کو بھی اس واقعے کا مشاہدہ کرا دوں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد بادل چھا گئے۔ اور جب ایک پیلی سی مخفی شعاع ظاہر ہوئی تو میں نے دیکھا۔ کہ مینار کا سایہ اب اپنی اصلی جگہ واپس چلا گیا تھا۔

کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں میرا ذہنی سکون ضائع ہو گیا۔ اور اس اطمینان کی جگہ جو مجھے دیر سے حاصل تھا ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے میں نے پھر سائے کا تصور کرنا شروع کیا۔ اور اب مجھے محسوس ہوا کہ نہ صرف سایہ دائیں طرف کی بجائے بائیں طرف تھا۔ بلکہ اس کی لمبائی (اس نسبت کا خیال رکھتے ہوئے جو مینار اور باقی درختوں اور پودوں کے درمیان پائی جاتی تھی) باقی تمام سایوں کی لمبائی سے زیادہ تھی۔

اس سائے کی لمبائی کا بڑھ جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

اس کے بعد کچھ دن آسمان پر بادل چھائے رہے۔ ایک ہفتے کے بعد آخر دھوپ نکلی۔ میں ڈرتا تھا۔ کہ شاید سایہ آج پھر اپنی فطرتی جگہ پر نہ ہوگا۔ مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ یہ میرا خوف بیجا تھا۔ اسی دن مجھے اطلاع ملی۔ کہ اس دہقان عورت کا بچہ سایہ پڑنے کے دوسرے دن مر گیا تھا۔

میں نے اپنے ذہن سے اس احساس کو نکالنے کی بہتیری کوشش کی کہ سایہ اور بچے کی موت میں کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ احساس اسی طرح دل میں قائم رہا۔

اس واقعے کے پندرہ دن کے بعد میں حسب معمول ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ میرے قدموں کے پاس میرا وفادار کتا سنو دھوپ سینکتا تھا۔ سورج مکھی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ گھاس پر ایک کبوتر خراماں تھا۔ میں نے مسکرا کر مینار کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ اب تم مجھے دھوکا نہ دے سکو گے۔ وہ دھوپ جو اشیاء کو موڑ توڑ کے رکھ دیتی ہے زائل ہو گئی ہے۔ اور چیزیں اپنی اصلی حالت میں نظر آرہی ہیں

ابھی آخری لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ سائے نے حرکت کی اس نے دائیں طرف ایک نصف دائرہ بنایا۔ اور اس کے بعد گھڑی کے لٹکن کی طرح ہلنا شروع کیا۔

چاروں طرف خاموشی مسلط تھی۔ دوسرے سائے ساکن تھے مینار بھی اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مینار کا سایہ لٹکن کی طرح ہل رہا تھا۔ گویا آفتاب خود لرزاں ہو۔ میں نے غور سے دیکھا صاف ظاہر تھا۔ کہ باقی ہر ایک چیز ساکن تھی۔ میں نے دیکھا کہ سایہ باغ کی روش سے گذر کر سڑک پر آیا دائیں بائیں ہلتا ہوا۔ پھرتا ہوا لمبا ہو گیا۔

میں اس وقت کے احساس کا بیان نہیں کر سکتا۔

کبوتر گھبرا کر اڑ گیا۔ کتا ڈر کے مارے بھونکنے لگا۔ سورج مکھی

کے پھول کانپ اُٹھے۔

زمین اس سائے کے بوجھ سے دبی جاتی تھی سڑک کے پتھر گویا کوٹے جارہے تھے۔ سبزہ اس سائے کے سامنے جُھک گیا تھا۔ ایک نارنج کا درخت دوہرا ہوگیا۔ یکایک سائے نے اپنے آپ کو اس جگہ پھینک دیا جہاں کتا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ ہاتھ کی طرح سایہ کتے پر چھا گیا۔ اور وہاں ٹھہر گیا۔ کتا ہانپنے لگا۔ اور اس کے بعد درد سے کراہتا ہوا بھاگ گیا

میری روح میں اضطراب موجزن تھا۔ مجھے شروع سے معجزوں پر یقین رہا ہے۔ لیکن معجزوں کے مشاہدے اور معجزے پر اعتبار کرنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ فرق میرے لئے مٹ گیا تھا۔ میں نے اُسی جگہ بیٹھ کر اس راجپوت عورت کی روح کے لئے دعا مانگی جو مینار میں زندہ چنوا دی گئی تھی۔ پھر مجھے اس بچے کا خیال آیا جو سائے کے نیچے گویا دب گیا تھا۔

خدا کے کام انسانی عقل و فہم سے بالا ہیں۔ گناہ کا ثمرہ ملتا ہے۔ اور معصوم بچے بھی اپنے بزرگوں کی سزا سے مامون نہیں رہتے۔

دوسرے دن میں نے کتے کو سرِ راہ مرا ہوا دیکھا۔ اب مینار کی طرف دیکھ دیکھ کے میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ مجھے ڈاکٹروں کے لفظ یاد آگئے۔ اُنھوں نے کہا تھا۔ کہ میری زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔

میں چاہتا تھا۔ کہ اس شہر سے چلا جاؤں۔ مگر کوئی پُراسرار قوت دوسرے دن پھر مجھے اس مینار کے پاس کھینچ کر لے گئی میں خاموش بیٹھ گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب مینار کا سایہ مجھ پر بھی پڑے گا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد پھر سائے نے حرکت کی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ یکایک سایہ مجھ پر چھا گیا۔ اور سورج کی روشنی ایک لمحے کے لئے میرے لئے غائب ہوگئی۔

اس وقت بھی میرا دل دھڑک رہا ہے۔ عنقریب ایک دو دن تک میں وہاں جانے والا ہوں جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔

(شمس الہدے)

نوائے عشق

عروسِ حُسن میں رنگیں گلو میں لحنِ دلجو میں ترا جلوہ تری نکہت تری آواز پاتا ہوں
جمالِ صبح نور آگیں میں شامِ عنبریں بو میں تری نیرنگیوں کے نت نئے انداز پاتا ہوں
غرض ہر چیز میں مستور تیرا راز پاتا ہوں

بہارِ لالہ و گل سے چمن سے سبزہ زاروں سے ترے حُسنِ جہاں افروز کا اظہار ہوتا ہے
اُمنڈتے بادلوں سے بجلیوں سے آبشاروں سے جمالِ روح پرور کا ترے دیدار ہوتا ہے
فروغِ حسن تیرا کاشفِ اسرار ہوتا ہے

"تسکین"

محبّت موت سے زیادہ طاقتور ہے!

(از مشہور روسی افسانہ نگار ڈیمٹری میریجکوسکی)

فلورنس میں "البیری" نام ایک قدیم خاندان کے افراد، مدتوں سے دو مختلف تجارتوں میں مشغول چلے آتے تھے۔ بعض قصاب تھے، اور بعض اُون کا کاروبار کرتے تھے۔

"گوانی" اور "مانیٹو" دونوں بھائی بھی اپنے بزرگوں کی طرح یہی دو تجارتیں کرتے تھے۔ گوانی، پرانے بازار میں گوشت کی دوکان کا مالک تھا۔ اور مانیٹو نے شہر کے مضافات میں اُون کا کارخانہ کھول رکھا تھا۔

گوانی کی دوکان پر خریداروں کی ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ بازار میں وہی ایک اکیلی دوکان تھی۔ بلکہ اس لئے کہ دوکاندار نہایت ہنس مکھ، خوش مزاج، اور نیک دل آدمی تھا۔ دنیا میں کوئی مذاق، کوئی مسئلہ، کوئی فلسفہ الیسا نہ تھا جس پر وہ بے دھڑک تقریر شروع نہ کر سکتا ہو۔ بڑا ہی حاضر جواب تھا۔ راہ گیروں کی پھبتیوں اور پڑوسیوں کی چٹکیوں کے برجستہ فقرے اسکی نوک زبان پر حاضر رہتے تھے۔ فلورنس کی جمہوریت کی سیاسی غلطیوں، ترکی سلطان کے منصوبوں، شاہ فرانس کی سازشوں، غرضیکہ ہر موضوع پر زور شور کے ساتھ بحث کرنے کے لئے مستعد رہتا تھا۔ شاید ہی کبھی کسی شخص نے اس قصاب کے مذاق سے بُرا مانا ہو۔ اگر کبھی کوئی چین بجبین بھی ہوتا تو وہ اسے یہ پرانی کہاوت سنا کر خوش کر دیتا تھا کہ "مذاق سے کبھی کوئی بدنام نہیں ہوتا۔ مذاق سے زبان اُسی طرح تیز ہو جاتی ہے جس طرح سِل پر استرا تیز ہو جاتا ہے"۔

اس کا بھائی، مانیٹو، اون کا سوداگر اس سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ وہ ایک چالاک اور سازشی آدمی تھا۔ ہمیشہ خشک اور سنجیدہ رہتا تھا۔ اپنا کاروبار، اپنے لاابالی مسخرے بھائی سے کہیں زیادہ عمدہ طور پر چلاتا تھا۔ ہر سال اون سے بھر کر دو جہاز قسطنطنیہ کی منڈی میں بھیجا کرتا تھا۔ اس کے ارادے بہت بڑے تھے، اور اپنی تجارت کو کسی اونچے سرکاری منصب پر پہنچنے کا ایک ذریعہ خیال کرتا تھا۔ نوابوں اور امیروں سے راہ و رسم رکھتا تھا جو فلورنس میں "موٹے آدمی" کہلاتے تھے۔ اپنے خاندان کو عروج دینے اور اپنے نام کو لازوال شہرت کی لوح پر جلی حروف میں لکھا دیکھنے کی آرزوئیں پرورش کیا کرتا تھا۔ بارہا اپنے بھائی پر اُس نے زور ڈالا کہ قصابی کا پیشہ چھوڑ دے۔ کیونکہ یہ ایک ذلیل پیشہ ہے، اور اپنا تمام روپیہ خود اس کے سرمایہ میں شامل کر دے۔ مگر گوانی اس کا مشورہ قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی قابلیت کا معترف ضرور تھا لیکن دل میں اس سے خائف رہتا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنا یہ خوف ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اکثر تنہائی میں اس کے منہ سے یہ لفظ نکل جایا کرتے تھے "میٹھی زبان اور کینہ بھرا دل۔ یہ میرا بھائی ہے!"

ایک دن گرمی سخت تھی۔ گوانی، دوکان سے بہت خستہ اور پریشان گھر لوٹا۔ حسب عادت خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور دل کھول کر ٹھنڈی شراب پی۔ اچانک سکتہ کا دورہ ہوا اور قبل اس کے کچھ کہنا سننا یا وصیت کرتا اُسی غشی میں مر گیا۔

اس کی بیوہ، مونا ارسولا، نیک دل، رحیم۔ مگر بیوقوف عورت تھی۔ اس نے بے سوچے سمجھے اپنے متوفی شوہر کا کاروبار، اس کے بھائی مانیٹو کے سپرد کر دیا۔ مانیٹو خوب جانتا تھا کہ بیوہ کو چکنی چپڑی باتوں سے کیونکر فریب دیا جا سکتا ہے۔ اپنی چرب زبانی سے اس نے سادہ لوح بھاوج کو یقین دلایا کہ اس کے بے پروا شوہر اس حال میں مرا ہے کہ دیوالیہ ہونے کے بالکل قریب تھا۔ حساب کا بہی کھاتہ، نہایت نامکمل ہے اور یہ کہ اب بچاؤ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں گوشت کی دوکان اٹھا دی جائے۔

شہر میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ مانیٹو نے اپنی بھاوج کو بڑی بے رحمی سے دھوکہ دیا ہے اور اپنی قدیم تجویز کے مطابق مرحوم بھائی کا تمام سرمایہ اپنی تجارت میں لگا دیا ہے۔ اصلیت کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مانیٹو کی تجارت نے اس حادثہ کے بعد ہی جلد ترقی حاصل کر لی۔ اب وہ سالانہ دو جہازوں کے بجائے پانچ چھ جہاز قسطنطنیہ بھیجنے لگا۔ پہلے معمولی اُون جاتا تھا۔ اب اعلیٰ درجہ کا اُون جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے کسی اونچے منصب پر مقرر کر دئے جانیکا وعدہ ملگیا۔ اپنی بھاوج کو وہ اسقدر کم گزارہ دیتا تھا کہ سخت تنگ حال رہتی

تھی۔ کیونکہ وہ تنہا نہ تھی بلکہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کی ماں تھی۔ لڑکی کا نام جنیرا تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی فلورنس میں بے جہیز کی غریب لڑکیوں کو دولہا نہیں ملتا تھا۔ تاہم خوش عقیدہ مونا ارسولا، ناامید نہ تھی۔ اپنی اکلوتی کے لئے اچھے بَر کی امید کرتی رہتی تھی۔ بڑے اعتقاد سے گڑگڑا کر ولیوں اور شہیدوں، خصوصاً قصابوں کے پشت پناہ سنٹ انٹونی سے دعائیں کیا کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ خدا جو بیواؤں اور یتیموں کا والی ہے، ضرور کبھی نہ کبھی اس کی بے جہیز کی لڑکی کے لئے اچھا اور لائق شوہر بھیج دیگا۔

اس ایمان کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی تھی جو اس کی امیدیں بڑھایا کرتی تھی۔ جنیرا بہت ہی حسین دوشیزہ تھی۔ اسے دیکھ کر مشکل خیال کیا جا سکتا تھا کہ بدصورت گوانی کو خدا نے یہ چاند سی لڑکی دی ہوگی۔ جنیرا ہمیشہ سادہ سیاہ لباس پہنتی تھی۔ لمبی، نازک، خوبصورت گردن میں موتیوں کا کنٹھا پڑا رہتا تھا جس کے بیچ میں سیپ کی ایک سبک تختی پر کنواری مریم کی مورت کھدی تھی۔ سر پر ململ کا ایک ٹکڑا بندھا رہتا تھا جو اسقدر باریک تھا کہ اندر سے اس کے سنہرے گھنے بال صاف دکھائی دیتے تھے۔

جنیرا کے چہرے پر کنواری مریم کی سی لازوال معصومیت نظر آتی تھی۔ بچوں سے نازک، باریک، اچھوتے ہونٹھ، خاموش نگاہیں بھاری پلکیں، سنجیدہ ادائیں، اسے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرنے والی تھیں۔ اگرچہ رخساروں پر گلاب کی سی سرخی اور تازگی موجود تھی، مگر وہ خود اسقدر دبلی پتلی تھی گویا زندہ رہنے کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے۔ قصاب کی یہ لڑکی جب کلیسا کو جاتی تھی تو فلورنس کی سڑکوں پر اسے پُرسکون، خاموش، نیچی نظریں کئے۔ کتاب مقدس ہاتھ میں لئے جاتے دیکھ کر نوجوان کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہر قسم کی ہنسی مذاق موقوف ہو جاتا تھا اور دور تک نگاہیں اس حسنِ خداداد کے تماشے میں محو ساتھ چلی جاتی تھیں۔

مانیٹو نے اپنی بھتیجی کی صورت و سیرت کی ہر زبان سے تعریفیں سن کر، دل میں یہ کھچڑی پکانا شروع کر دی کہ اس کی شادی جمہوریت فلورنس کے ایک سکریٹری۔ فرانسسکو گولانٹی سے کر دے۔ فرانسسکو گولانٹی ایک سن رسیدہ آدمی تھا۔ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ اور شہر کے تمام حکام سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ لاطینی زبان کا عالم اور ادیب تھا۔ اپنی تحریریں بہت زوردار عبارت میں لکھا کرتا تھا۔ علمی انہماک نے اسے کسی قدر خشک، درشت، اور خلوت پسند بنا دیا تھا۔ مضبوط اخلاق رکھتا تھا۔ قدیم رومن شرفاء کی طرح نہایت بے لوث اور ایماندار تھا۔ اس کا چہرہ بھی ایک قدیم رومن سینیٹر سے مشابہ تھا، اور قدیم رومنوں کی طرح فلورنس کے حکام کا گہرے سُرخ رنگ کا لبادہ پہنا کرتا تھا۔ اسے قدیم زبانیں سیکھنے کا اسقدر شوق تھا کہ جب عانوئیل جیری زولورس نے یونانی زبان پر لیکچر دینا شروع کئے تو وہ اپنی اس عمر اور عہدے کا خیال نہ کرے اسکول کی تپائیوں پر چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے بہت جلد یونانی زبان سیکھ لی اور ارسطوطالیس اور افلاطون کی اصلی تصانیف کا مطالعہ کرنے لگا۔ غرضیکہ مجموعی طور پر وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ چالاک مانیٹو اس سے بہتر اور نفع بخش رشتہ دار حاصل کرنے کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اپنی بھتیجی کو عمدہ جہیز دیگا بشرطیکہ فرانسسکو اپنا نام اس کے خاندان کے نام سے متحد کر دے۔

اپنے منگیتر کی ان تمام خصوصیتوں کے باوجود جنیرا اپنے چچا کی تجویز کی مخالف اور اپنی شادی کو ایک سال کے بعد دوسرے سال پر برابر ٹالتی رہی۔ آخر کار ایک دن مانیٹو نے فوری اور قطعی جواب طلب کیا۔ جنیرا نے تنہائی میں اپنی ماں سے پوری جرأت کے ساتھ صاف کہہ دیا کہ اس کا ایک دوسرا منگیتر بھی موجود ہے جس سے وہ خود بھی بہت محبت رکھتی ہے۔ نیک دل خاتون یہ سُن کر خوفزدہ اور دم بخود رہ گئی کہ اس شخص کا نام "انٹونیو دی رونڈیلی" ہے۔ انٹونیو ایک نوجوان آدمی تھا۔ بت تراشی کا پیشہ کرتا تھا۔ مگر بہت غریب تھا۔ بازار کی ایک تنگ گلی میں چھوٹی سی دوکان کا مالک تھا۔

جنیرا سے اس کا تعارف چند مہینے پہلے خود جنیرا کی ماں کے گھر میں ہوا تھا۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ لڑکی کے سر کا ایک موی مجسمہ طیار کرے تاکہ اس کی خوبصورتی کو شہیدہ باربارا کی مورت طیار کرنے میں استعمال کر سکے۔ جس کی فرمائش ایک دولتمند نے اُسے دی تھی۔ مونا ارسولا ایک ایسے دینی معاملے میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ تصویر اتارتے ہوئے صناع اس حسین دوشیزہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اس کے بعد متعدد تہواروں اور سردی کی محفلوں میں دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اس طرح ان کی محبت نے عشق کا درجہ حاصل کر لیا۔

مونا ارسولا نے ڈرتے ڈرتے مانیٹو کو بتایا کہ جنیرا ایک دوسرے آدمی سے محبت کرتی ہے۔ مانیٹو، انٹونیو کا نام سن کر غصہ سے لال ہو گیا۔ مگر جب عادت ضبط کر کے بہت سنجیدہ مگر کڑی آواز میں بھاوج کہنے لگا:۔

"بھابی! اگر خود میں نے اپنے کانوں سے تمہاری زبان سے یہ بات سنی نہ ہوتی تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا کہ تمہاری جیسی نیک اور سمجھدار خاتون ایک ناتجربہ کار اکھڑ لڑکی کی بیہودگی کو اہمیت دے سکتی ہے! معلوم نہیں آج کل دستور کیا ہے؟ میرے زمانے میں تو کم سن لڑکیوں کو ہرگز جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنے منگیتر کے انتخاب میں ایک لفظ بھی زبان پر لا سکتیں - ہر معاملے میں والدین اور سرپرستوں کے حکم ہی کی بے چون وچرا اطاعت کیا کرتی تھیں - ذرا معاملے پر تو غور کرو ——— انٹونیو - جسے میری بھتیجی نے اپنی پسند سے سرفراز کیا ہے - کون ہے؟ ممکن ہے تم ان بت تراشوں - مصوروں، شاعروں، گویوں کی حقیقت سے واقف نہ ہو - یہ لوگ حد سے زیادہ ذلیل اور آوارہ ہوتے ہیں - ان پیشوں کے سوا کسی بھی معزز پیشے میں داخل ہی نہیں ہو سکتے - اس وسیع دنیا میں ان سے زیادہ بے وقوف اور ناقابل اعتماد آدمی مل نہیں سکتے - یہ لوگ شرابخور، بدچلن - بدمعاش، دہریے، لاابالی، فضول خرچ ہوتے ہیں - اپنا روپیہ بھی اڑاتے ہیں - اور دوسروں کی کمائی کا بھی خیال نہیں کرتے - خاص طور پر انٹونیو، سو ضرور ہے تم نے بھی وہ سب سنا ہوگا جو تمام فلورنس میں اس کی بابت مشہور ہے - میں اس کی صرف ایک حرکت کا اس وقت ذکر کرتا ہوں - اس کی دوکان میں ایک ٹوکری چھت ——— سے لٹکی ہوئی ہے - ٹوکری میں ایک رسی بندھی ہوئی ہے - رسی ڈھیلی کر کے ٹوکری نیچے اتاری جاتی ہے - انٹونیو جو کچھ بھی کماتا ہے - بغیر گنے ہوئے اسی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے - ہر شخص کو آزادی ہے، عام اس سے کہ اس کا شاگرد ہو یا ملاقاتی، کہ جب چاہے بے پوچھے گچھے رسی ڈھیلی کر کے ٹوکری نیچے اتارے اور جتنا بھی روپیہ چاہے نکال لے جائے - کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنا روپیہ، یعنی وہ جہیز جو تمہاری لڑکی کو میں نے دینے کا وعدہ کیا ہے ایک ایسے لچے اور دیوانے کے حوالے کر دوں گا؟

"یہی ایک بات نہیں - کیا تم نے یہ بھی سنا ہے کہ انٹونیو، ابی قوری فلسفہ کی مکروہ دہریت کا ماننے والا ہے کہ جس کی تخم ریزی شیطان نے کی ہے وہ کلیسا نہیں جاتا - مقدس عبادتوں کا مذاق اڑاتا ہے - خدا پر ایمان نہیں رکھتا - اچھے آدمیوں نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کرتا ہے - برگزیدہ اولیاء اللہ کی تو تعظیم نہیں کرتا - مگر ناپاک بت پرستوں کی مورتوں کے سامنے جھکتا ہے - مجھ سے بہت آدمیوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اور اس کے شاگرد رات کے وقت لاشیں لایا کرتے ہیں - یہ لاشیں بڑی قیمت پر شفاخانے کے آدمیوں سے خریدی جاتی ہیں - اور انہیں بے دردی سے چیر پھاڑ کر دیکھا جاتا ہے کہ انسانی جسم اور رگ پٹھے کیونکر بنے ہیں - اس کا دعویٰ ہے کہ یہ سب علمی تحقیقات کے لئے کرتا ہے - لیکن میرے خیال میں اصلیت کچھ اور ہی ہے - لاشوں سے اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اپنے گرو گھنٹال، ہماری نجات کے ازلی ابدی دشمن، ابلیس کو خوش کرے جس نے اسے جادو اور منتروں کا اثر ہے کہ اس بے دین نے تمہاری معصوم لڑکی کے دل پر بھی قبضہ حاصل کر لیا ہے"

اس طرح کی باتیں کر کے مانٹیو نے مونا ارسولا کو بالکل بدحواس کر ڈالا اور یقین دلا دیا کہ اس کا بیان حرف بحرف صحیح ہے تب سادہ لوح ماں نے اپنی لڑکی پر زور ڈالنا شروع کیا - منت سماجت کی - دھمکایا - بار بار کہا کہ اگر فرانسسکو سے شادی کرنے سے انکار کرتی رہو گی تو چچا وظیفہ بند کر دیگا اور ہم دونوں بھوکے مرجائیں گے - آخر کار معصوم لڑکی کو ماں کے آگے سر جھکا دینا پڑا - محبت پر فرض کو ترجیح دینا پڑی - بڑے ہی غم و غصہ کے ساتھ اس نے اپنے خود غرض چچا کی تجویز منظور کر لی -

اسی سال فلورنس پر ایک بہت بڑی مصیبت نازل ہوئی - نجومی اس کی پہلے سے پیشن گوئی کر رہے تھے، کیونکہ زحل اور مریخ، برج عقرب میں بہت قریب آگئے تھے - مصیبت طاعون کی شکل میں ظاہر ہوئی - وبا اس طرح پھیلی کہ مشرق سے آنے والے سوداگر بیش قیمت ہندوستانی کپڑے کے گٹھوں میں اس کے جراثیم ساتھ لائے تھے - فلورنس کی سڑکوں پر دعا مانگنے والوں کے بڑے بڑے جلوس نکلے - نئے قانون اس غرض سے بنائے گئے کہ شہر میں کہیں کوڑا کرکٹ نہ پھینکا جائے بیمار اندر آنے نہ پائیں - اگر کسی گھر میں موت ہو جائے تو سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اسے دفن کر دیا جائے - ورنہ سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں حتیٰ کہ بعض حالتوں میں قتل کی سزا بھی تجویز کی گئی تھی - خاص انسپکٹر شہر بھر کا دورہ کرتے تھے - دروازے پوچھتے پھرتے تھے کہ کوئی مردہ یا بیمار تو موجود نہیں ہے - اگر چاہتے تھے تو گھروں کی تلاشی بھی لے لیتے تھے - سیاہ وردی والے سپاہی لاشیں اٹھاتے پھرتے تھے - عام طور پر لوگ "کالے شیطان" کہلائے جانے لگے تھے - کیونکہ مشہور ہو گیا تھا وہ مرنے سے پہلے بھی بیماروں کو اٹھا لیجاتے ہیں

طاعون، گرمی میں پورے عروج پر تھا - موسم خزاں میں اس کی شدت کم نہ ہوئی - حتیٰ کہ جاڑے کی سردی بھی، جو اس سال قبل از وقت شروع ہو گئی تھی - اسے روک نہ سکی - شہر کے خوشحال باشندے -

جنہیں ٹھہرنے کی کوئی مجبوری نہ تھی، دیہات بھاگ گئے جہاں ہوا صاف اور بیماری سے پاک تھی۔

بدطینت مانٹیو کو ڈر تھا کہ اس کی بھانجی کہیں رلٹے بدل نہ دے اس لئے اس نے یہ مصیبت غنیمت جانی اور بھاوج پر زور ڈالنا شروع کیا کہ لڑکی کو لے کر فوراً شہر سے نکل جائے۔ فرانسسکو نے جنیرا اور اس کی ماں کے لئے کوہ البانو پر اپنا خوبصورت بنگلہ خالی کر دیا تھا۔

یہ تجویز مانٹیو کی تھی اور پوری طرح کامیاب ہوئی۔ شادی کی تاریخ بھی قرار پا گئی۔ چند دن بعد نہایت سادگی سے تقریب انجام پائی۔ کیونکہ ان کٹھن دنوں میں یہی دستور ہو گیا تھا کہ دھوم دھام سے پرہیز کرتے تھے۔ نکاح کے وقت جنیرا اس طرح چپ اور اداس تھی گویا زندہ نہیں، مردہ ہے۔ مانٹیو کو یقین تھا کہ شادی کے بعد ہی یہ طفلانہ خیالات بدل جائیں گے۔ فرانسسکو اپنی حسین بیوی کا دل ضرور فتح کر لیگا۔

لیکن اس کا یقین جلد ناامیدی سے بدل گیا۔ دلہن کلیسا سے چل کر جون ہی اپنے شوہر کے گھر میں داخل ہونے لگی۔ اسے چکر آ گیا زمین پر گر پڑی۔ شروع میں خیال کیا گیا کہ بیہوش ہو گئی ہے۔ سب ہی جتن کئے گئے۔ مگر ہوش نہ آنا تھا نہ آیا۔ سانس بتدریج کمزور ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے چہرے اور جسم پر زردی اور مردنی چھا گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر کا بلانا، بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا آنا، گھر میں طاعون کا ہونا یقین کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے جنیرا کے دودھ سے سفید ہونٹوں کے سامنے آئینہ رکھا، مگر آئینہ کی سطح پر سانس کی کوئی علامت بھی دیکھی نہ جا سکی۔

تب سب نے ناقابل بیان رنج والم کے ساتھ یقین کر لیا۔ کہ جنیرا واقعی مر گئی ہے۔ پڑوسیوں نے کہنا شروع کیا کہ خدا نے مانٹیو کو سزا دی ہے، کیونکہ اس نے ایسے نازک وقت میں بھتیجی کی شادی رچائی تھی۔ کلیسا سے پاؤں نکالتے ہی دلہن کو طاعون لگ گیا اور دم کے دم میں ختم ہو گئی! لڑکی کے رشتہ داروں نے اس کی غشی اور پھر موت چھپانے کی بہت کوشش کی، کیونکہ "کالے شیطانوں" سے ڈرتے تھے۔ مگر واقعہ ایسا جانگداز تھا کہ ذرا ہی دیر بعد شہر بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ شام کے وقت "کالے شیطان" دانسپکٹر) بھی آ دھمکے۔ انہیں پڑوسیوں سے فرانسسکو کے گھر کے حادثے کی رتی رتی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مردے کو رشتہ دار یا تو اُن کے حوالے کر دیں یا فوراً دفن کر دیں۔ لیکن ایک بڑی رشوت پر انہیں راضی کر لیا گیا کہ دوسرے دن شام تک لاش گھر ہی میں رہنے دیجائے۔

جنیرا کی موت میں اس کے کسی رشتہ دار کو بھی شک نہیں تھا۔ صرف اس کی ایک بوڑھی انّا برابر انکار کئے جاتی تھی۔ لیکن اُسے سب نیم مجنوں یقین کرتے تھے۔ اس نے دردناک آوازیں رو رو کر خوشامد شروع کی کہ جنیرا کو دفن نہ کریں۔ ڈاکٹر دیوانے ہیں۔ جنیرا ہرگز مری نہیں ہے۔ صرف سکتہ میں پڑی ہے۔ اس نے قسم کھا کر کہا میں نے جب اپنی چہیتی کے سینے پر ہاتھ رکھا تھا تو اس کا دل بہت ہی آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اتنا آہستہ کہ تتلی کا پر بھی اتنا آہستہ نہیں ہلتا۔

دن ختم ہو گیا، مگر جنیرا پر زندگی کی کوئی علامت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ آخر ناامیدی ہو گیا۔ رونے دھونے کے بعد اُسے کفنایا گیا۔ اور تابوت میں رکھ کر کلیسا کو لے چلے۔ فلورنس کے امیرانہ قبرستان میں شاندار قبر تیار کی گئی۔ مانٹیو نے یہ قبر ایک گراں قیمت پر حاصل کی تھی۔ لیکن روپیہ اسی جہیز سے دیا تھا جو اپنی بھتیجی کو دینے والا تھا۔

دفن کی تقریب بھی بہت سنجیدہ اور مذہبی تھی۔ بہت سی شمعیں روشن کی گئی تھیں۔ جنیرا کے نام پر غریبوں کو اناج اور زیتون کا تیل بانٹا گیا تھا۔ سخت جاڑا اور طاعون کی ہولناکیوں کے باوجود قبرستان میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ بہت سے اجنبی آدمی بھی اس دردناک موت کا حال سُن کر آ گئے تھے۔ ہر کوئی جوانا مرگ پر بے اختیار آنسو بہا رہا تھا۔ اور بار بار زبانوں سے یہ شاعرانہ لفظ نکل جاتے تھے:۔

"اس کے خوبصورت چہرے پر موت بھی خوبصورت نظر آتی ہے!"

فرانسسکو نے اپنی اچھوتی دلہن کی قبر پر ایک نہایت فصیح تقریر کی۔ لاطینی اور یونانی زبانوں کی مناسب حال بہت سی ضرب المثلیں بیان کیں۔ سقراط اور افلاطون وغیرہ فلسفیوں کے حکیمانہ مقولے نقل کئے۔ یہ اس زمانے میں ایک بالکل نئی بات ہے۔ سامعین نے تقریر بڑی دلچسپی سے سنی، حتیٰ کہ انہوں نے بھی جو یونانی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔

تقریب کے خاتمہ پر کچھ گڑبڑ سی پیدا ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب تابوت قبر میں رکھا گیا اور حاضرین کو مردے کے آخری دیدار کی دعوت دی گئی۔ تو ایک زرد رو آدمی نمودار ہوا۔ سیاہ ریشم کا ماتمی لباس پہنے تھا۔ بھیڑ کو چیرتا قبر تک چلا آیا۔ تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔ مردے کا منہ کھولا، اور اس کے پیلے چہرے پر ٹکٹکی باندھ کر دم بخود رہ گیا۔

ایک لمحہ تو سب حیرت زدہ رہے، پھر نووارد سے مطالبہ کیا گیا کہ فوراً ہٹ جائے۔ کیونکہ کسی اجنبی کے لئے مناسب نہیں کہ عزیزوں کی موجودگی میں جنیرا کے قریب آئے۔ زرد آدمی نے جب سنا کہ وہ "اجنبی" سمجھا گیا ہے اور مانٹیو اور فرانسسکو "عزیز" قرار دیئے گئے ہیں، تو ایک زہر آلود تبسم اس کے لبوں پر ظاہر ہوا۔ اس نے مردے کے ہونٹوں کو بوسہ دیا۔ اس کا منہ پھر بند کر دیا، اور کچھ کہے سنے بغیر چپ چاپ سیدھا چلا گیا۔

مجمع میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جانے والے کی طرف اشارے ہوئے۔ انٹونیو کا نام زبانوں پر بے ساختہ آگیا۔ کہا گیا "یہی وہ آدمی ہے جس سے جنیرا محبت کرتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ مری ہے!"

اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ غمناک تقریب بھی ختم ہو چکی تھی۔ مجمع برخواست ہو گیا۔ مونا ارسولا۔ لڑکی کی ماں ضد کر رہی تھی کہ رات بھر تابوت ہی کے پاس رہے گی۔ مگر مانٹیو نے روکا۔ وہ اسقدر غمزدہ تھی کہ ہر شخص اس کی ناگہانی موت کا اندیشہ کر رہا تھا۔ صرف پادری، مارتیو، دعائیں پڑھنے کے لئے تابوت کے پاس چھوڑا گیا۔ باقی سب لوگ چلے گئے۔

چند گھنٹے گزر گئے۔ پادری کی لگاتار گنگناہٹ، وقتاً فوقتاً گھڑیال بجنے کی دھیمی آواز، خاموش رات میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ آدھی رات بعد پادری کو پیاس لگی۔ اس نے شراب کے چند جام چڑھائے کئی بار سرور سے سر کو جنبش دی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کسی کے کراہنے کی آواز اس کے کان میں آئی ہے۔

وہ سنبھل بیٹھا اور کان لگا دیئے۔ کراہنے کی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ آواز تابوت ہی سے آرہی ہے۔ ڈرتے ڈرتے تابوت پر نظر ڈالی تو اس کا ہلکا ڈھکنا کچھ ہلتا معلوم ہوا۔

اس کا تمام بدن سنسنانے لگا۔ سخت خوف و دہشت نے اسے گھیر لیا، مگر وہ ان معاملات میں ناتجربہ کار نہ تھا۔ خوب جانتا تھا کہ رات کو مردے کے ساتھ اکیلے رہنے میں بڑے بڑے آزمودہ کار بھی طرح طرح کے ڈراونے خیالات کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر دل مضبوط کیا اور تہیہ کر لیا کہ اس وہم کی ذرا بھی پروا نہیں کریگا۔ پھر زور سے دانت بھینچ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور نہایت دلدوز آوازمیں دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔

اچانک پادری کی آواز دوبارہ رک گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور مردہ لڑکی کا منہ صاف سامنے دکھائی دے رہا تھا!

اب شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ واقعی مردے ہی کا منہ کفن سے باہر نکل آیا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا جو سرک گیا تھا۔ اب بھی ہل رہا تھا۔ کیونکہ لڑکی سانس لے رہی تھی۔ پادری فوراً کھڑا ہو گیا اور قبرستان کے دروازے کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ اسکا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ کھلی ہوا میں پہنچ کر پھر رکا۔ سانس لی۔ دعائیں پڑھیں خیال کرنے لگا جو کچھ دیکھا ہے، کہیں وہم نہ ہو۔ چنانچہ صلیب کے نشان بناتا۔ لوٹ پڑا۔ مگر قبر پر پہنچ کے اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ لڑکی اپنے تابوت پر آنکھیں کھولے بیٹھی تھی!

اب پادری کے لئے ٹھہرنا ناممکن تھا۔ سرپٹ بھاگ نکلا اور قبرستان کے باہر سڑک پر پہنچ کے دم لیا۔ دماغ بے کار ہو چکا تھا۔ کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا بھی نہیں۔ برابر بھاگتا ہی چلا گیا۔ سنسان رات میں برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر اس کی کھڑاؤں سے ایک ہیبت ناک شور برپا ہو گیا تھا۔

جنیرا اپنی لمبی نیند یا سکتے سے قبر میں بیدار ہوئی اور بڑی حیرت سے تابوت کو دیکھنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ قبر میں زندہ اتار دی گئی ہے۔ خوف زدہ ہو گئی۔ بڑی جدوجہد کے بعد تابوت سے باہر نکل سکی کفن اوڑھ لیا اور قبرستان کے دروازے کی طرف بڑھی جسے پادری کھلا چھوڑ گیا تھا۔

قبرستان سے نکل کر کلیسا کے احاطے میں پہنچی۔ چاندکی روشنی ابر کے بڑی تیزی سے اڑتے ہوئے ٹکڑوں میں سے چھن کر زمین پر پڑتی اور غائب ہو جاتی تھی۔ لیکن سامنے میدان میں گھنٹہ گھر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جنیرا کے خیالات پراگندہ تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹہ گھر کے ساتھ ابر پر اڑی چلی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جیتی ہے یا مر گئی ہے۔ خواب دیکھ رہی ہے یا حقیقت سے دوچار ہے۔

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟ بہت سی سنسان سڑکوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک ایسے گھر کے سامنے پہنچی جو اسے پہچانا ہوا معلوم ہوا۔ رک گئی۔ کچھ لیس و پیش کے بعد دروازے کی طرف بڑھی اور دستک دی۔ یہ اسکے چچا مانٹیو کا گھر تھا۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ مگر اُن کا سوداگر اب تک جاگ رہا تھا۔ قسطنطنیہ سے اس کے دو جہاز واپس آرہے تھے۔ شہر میں افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ کہ سمندر میں سخت طوفان آیا ہے اور بہت سے جہاز ڈوب گئے ہیں۔ مانٹیو، ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے جہاز بھی ڈوب نہ گئے ہو۔

اسی فکر نے سونے نہیں دیا۔ جہازوں کی خبر سننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

قاصد کا انتظار کرتے کرتے اسے بھوک معلوم ہوئی۔ اپنی خادمہ، ننسیا کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ ننسیا، سرخ بالوں اور سفید دانتوں کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ مانیٹو نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اور خادمہ کو بہت شوخ بنا دیا تھا۔ آج رات وہ باورچی خانہ ہی میں بیٹھا تھا کیونکہ باقی تمام کمرے بہت ٹھنڈے تھے۔

ننسیا نے آستینیں چڑھا کر مرغ بھوننا شروع کیا۔ روشنی میں رکھی ہوئی پلیٹیں جھل جھل چمک رہی تھیں۔

"ننسیا!" مانیٹو نے اچانک کہا "کیا ابھی تم نے بھی کوئی آواز سُنی ہے؟"

"ہوا کی آواز ہوگی" شوخ خادمہ نے جواب دیا "اب میں نہیں جاؤنگی۔ تم تین مرتبہ بے فائدہ دروازے پر دوڑا چکے ہو۔"

"ہوا نہیں ہے۔ کوئی دستک دے رہا ہے۔ قاصد آگیا ہے۔ جاؤ دروازہ کھول دو۔"

موٹی تازی ننسیا آہستہ آہستہ زینے پر سے اترنے لگی۔ مانیٹو، ہاتھ میں لالٹین لئے اوپر کھڑا راستہ دکھا رہا تھا۔

"کون؟" خادمہ چلائی۔

"میں!... میں!... جنیرا!..." ایک کمزور آواز بند دروازے کے اس پار سے سنائی دی۔

"مسیح! مسیح!" ننسیا کی چیخ بلند ہوئی "دروازے پر بھوت ہے!"

اس کے پاؤں ڈر سے کانپنے لگے۔ جلدی سے زینہ کی لکڑی نہ پکڑ لی ہوتی تو ضرور گر پڑتی۔ مانیٹو کا رنگ بھی فق ہوگیا۔ قریب تھا کہ لالٹین ہاتھ سے چھوٹ پڑتی۔

"ننسیا! ننسیا!" جنیرا خوشامد سے چلائی "دروازہ کھول۔ جلدی کر! میں سردی سے مری جاتی ہوں۔ دروازہ کھول۔ چچا سے کہہ کہ میں...."

ماما، بھدی ہونے پر بھی بڑی تیزی سے بھاگی۔ لکڑی کی سیڑھیاں اس کے بوجھ سے چرچرانے لگیں۔

"دیکھا قاصد آگیا" منہ چڑھی ننسیا، غصہ اور خوف سے چلائی "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اچھے عیسائیوں کی طرح خدا پر بھروسہ کرو اور سو جاؤ۔ اُہ! اُہ! پھر دستک ہو رہی ہے سنتے ہو؟ غریب جنیرا کی روح رو رہی ہے کیسی دردناکی سے رو رہی ہے! خدایا! ہمیں بچا۔ ہم گنہگاروں پر رحم کر! سنٹ لارنس! ہمارے لئے دعا کر!"

"سنو، ننسیا! سنو" مانیٹو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں کیا ہے؟ کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟ شاید..."

"ہاں ضرور! ضرور تم ضرور جاؤ گے!" ننسیا ہاتھ ملتی ہوئی چلائی "بڑے بہادر ہیں! واہ بڑے ہی بہادر ہیں! میں تمہیں ضرور جانے دونگی! موت کے منہ میں ضرور جانے دونگی! بیٹھو بھی۔ دیوانے ہوئے ہو! شکر کرو اگر خدا مصیبت سے بچالے!"

پھر ننسیا نے جھٹ پٹ الماری سے مقدس پانی کی بوتل نکالی۔ اور ہر طرف چھڑکنے لگی۔ زینے پر بھی اور اوپر سے کھڑے کھڑے دروازے پر بھی۔ خود مانیٹو پر بھی ایک چھینٹا ڈالا۔ جواب خاموشی اختیار کر چکا تھا۔ اپنی ماما کو پہلے ہی سے عقلمند سمجھتا تھا۔ اس موقعہ پر بھی خیال کرنے لگا کہ روحوں کے معاملات وہ زیادہ بہتر جانتی ہے۔

پھر ننسیا نے چلا کر یہ دعا پڑھی:۔

"روح! خدا تجھے برکت دے۔ خدا کے پاس لوٹ جا۔ مردوں میں واپس جا۔ خدا تجھے اچھوں کے ساتھ جگہ دے!"

اب جنیرا نے یقین کر لیا کہ اس گھر میں اس کی رسائی ممکن نہیں کیونکہ اسے مردہ سمجھا جا رہا ہے۔ ناامید ہو کر کسی دوسری جگہ پناہ لینے کے لئے روانہ ہوگئی۔

اپنے ٹھٹھرے ہوئے پیروں سے وہ بمشکل چلتی ہوئی ایک دوسری سڑک پر پہنچی۔ یہاں اس کے شوہر، فرانسسکو کا مکان تھا۔

جمہوریت فلورنس کا یہ سیکرٹری اس وقت لاطینی زبان میں اپنے ایک دوست کو طویل فلسفیانہ خط لکھ رہا تھا، جو خود بھی قدیم زبانوں کا بڑا مداح تھا۔ خط کیا، پورا ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا "اپنی پیاری بیوی جنیرا کی موت کی مناسبت سے روح کی ابدیت پر بحث"۔ فرانسسکو نے ارسطوطالیس کی تعلیم کا افلاطون کی تعلیم سے مقابلہ کرنے کے بعد نہایت مدلل طور پر ثابت کیا تھا کہ مس اگیونیز کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ ارسطو کا فلسفہ، رومن کیتھولک عقائد کا موید ہے۔ کیونکہ اس کے فلسفے کی بنیاد در اصل شک والحاد پر تھی۔ ہاں افلاطون کی تعلیم مسیحی تعلیمات کے مطابق ہے۔

لکھنے کی وسیع میز پر تانبے کا شمعدان رکھا جل رہا تھا۔ فرانسسکو

اب عقیدۂ تناسخ (اواگون) پر مذہبی نقطہ نظر سے بحث کر رہا تھا۔ اچانک اُسے دروازے سے دستک کی خفیف آواز سنائی دی۔ فوراً پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ لکھتے وقت وہ کسی آواز کا سننا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم کھڑکی کی طرف بڑھا اور سر نکال کر باہر سڑک پر دیکھنے لگا۔ چاندنی میں جنیرا کفن اوڑھے صاف کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

اب کہاں ارسطو اور کہاں افلاطون، فرانسسکو کے ہوش اُڑ گئے۔ جلدی سے کھڑکی بند کر لی۔ اتنی جلدی کہ جنیرا ایک لفظ بھی کہنے نہ پائی۔ کمرے میں لوٹ کر خوف سے اس کی بُری حالت تھی۔ وظیفے پڑھتا تھا۔ بار بار صلیب کے نشان بناتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مانیٹو کے گھر میں کیا گیا تھا۔

مگر جلد ہی اس نے اپنے حواس درست کر لئے۔ اس بزدلی پر شرما گیا۔ پھر روح کے متعلق مختلف فلسفیوں کے قول یاد آ گئے۔ اب اس کی ہمت بڑھ گئی۔ طبیعت قابو میں آ گئی۔ پھر کھڑکی کھولی اور مضبوط آواز میں چلا کر کہنے لگا:۔

"تو جو کوئی بھی ہو۔ آسمان کی روح ہو یا زمین کی روح، سیدھی چلی جا! اسی جگہ لوٹ جا جہاں سے آئی ہے۔ تیری یہ کوشش بیکار ہے کہ مجھے ڈرانا چاہتی ہے۔ جس آدمی کا دماغ، سچے فلسفے سے روشن ہوچکا ہے وہ کسی چیز سے بھی ڈر نہیں سکتا۔ ممکن ہے میری مادی آنکھیں دھوکا کھا جائیں۔ مگر میری روحانی آنکھوں کو تو دھوکا نہیں دے سکتی۔ لہٰذا اطمینان سے چلی جا۔ مردے، مُردوں ہی کے لئے ہیں!"

یہ کہہ کر اُس نے پھر کھڑکی بند کر لی اور عزم کر لیا کہ روحوں کے غول آ کر کتنا ہی چلائیں۔ اور دروازے کو کتنا ہی پیٹیں، ہرگز کھڑکی نہیں کھولے گا۔

جنیرا یہاں سے بھی نا امید لوٹی۔ اُس کی ماں کا گھر قریب تھا۔ سیدھی اُدھر چل پڑی۔

اسوقت مونا ارسولا جنیرا کی مغموم ماں، صلیب کے آگے جھکی ہوئی تھی۔ خاندان کا پادری اس کے قریب کھڑا تھا۔ پادری کا چہرہ خشک اور زرد تھا۔ جسم بھی بہت دبلا تھا۔ مونا ارسولا نے خوفزدہ نگاہیں پادری کی طرف اٹھا کر کہا:۔

"باپ! میں کیا کروں؟ میری مدد کرو۔ دل کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ تمام دعائیں ختم ہوچکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اور میری روح برباد ہوجانے والی ہے"۔

"خدا کی اطاعت کرو۔ ہر چیز میں آخر تک" پادری نے کہا "بکواس مت کرو۔ نفس امارہ پر قبضہ رکھو۔ اپنی لڑکی سے تمہاری اس درجہ محبت، محض مادے کی محبت ہے۔ روح کی نہیں ہے۔ اس لئے نہ کرنا ہوکہ وہ توبہ کئے بغیر مرگئی ہے اور اللہ کے انصاف کی کرسی کے آگے ایک بڑے گنہگار کی صورت میں پیش کی جائے گی"

عین اسی وقت دروازے پر دستک پڑی:۔

"ماں! ماں!" جنیرا کی آواز سنائی دی "میں ہوں، میں — دروازہ کھولو۔ جلدی کرو!"

"جنیرا!" ماں چلا اٹھی اور قریب تھا کہ اپنی بیٹی کے لئے دروازہ کھولنے کو دوڑ پڑے۔ مگر پادری نے روک دیا:۔

"کہاں جاتی ہو؟ تمہاری لڑکی تو قبر میں پڑی ہے۔ مرچکی ہے۔ وہ اسوقت تک نہیں اٹھیگی جبتک قیامت کا دن نہ آجائے۔ خبیث روح ہے جو تمہاری لڑکی کی آواز بنا کر تمہیں بہکانے آئی ہے۔ تمہارے گوشت اور خون کی آواز بنا کر تمہیں گمراہ کرنا چاہتی ہے۔ دعا کرو۔ دعا کرو قبل اس کے کہ وقت نکل جائے اپنے لئے دعا کرو اور اپنی گنہگار لڑکی کے لئے دعا کرو۔ کہ تم دونوں دوزخ کا ایندھن نہ بنجاؤ!"

"ماں! ماں! آہ میری آواز سنتی نہیں! اُف میری آواز پہچانتی نہیں! میں ہوں۔ میں جنیرا ہوں۔ زندہ ہوں۔ مری نہیں ہوں!"

"باپ! مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو" مونا ارسولا نے خوشامد کیلئے۔ یہ سن کر پادری، غصہ سے لال ہوگیا۔ فوراً دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا دئے اور بددعا شروع کی:۔

"جا، مگر سمجھ لے کہ تو صرف اپنی ہی نہیں، جنیرا کی روح کو بھی دوزخ میں جھونک رہی ہے۔ خدا تجھ پر اس دنیا میں بھی لعنت کرے اور اُس دنیا میں بھی!"

پادری کا چہرہ، غصہ سے اس طرح تمتما اٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایسے شعلے نکل رہے تھے کہ غریب مونا ارسولا خوف سے کانپنے لگی۔ اسکے گھٹنے زمین پر ٹک گئے اور ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے۔

پھر پادری دروازہ کی طرف مڑا۔ صلیب کا نشان بنایا اور کہنے لگا:۔

"باپ کے نام پر، بیٹے الیسوع کے نام پر، روح القدس کے نام پر! ہاں میں تجھے مسیح کے خون کی قسم دیتا ہوں، جو صلیب پر بہایا گیا تھا کہ چلی جا۔ غائب ہوجا۔ ملعون روح! چلی جا، کیونکہ یہ مقدس سرزمین ہے۔ خدایا ہمیں گمراہی میں جانے سے روک! ہمیں شیطان کے مکر سے بچا!"

"ماں! ماں! مجھ پر ترس کھاؤ۔ مری جاتی ہوں!"

ماں ایک دفعہ پھر دوڑی۔ اپنے ہاتھ لڑکی کی طرف پھیلا دئے۔ مگر موت سے بھی زیادہ بے رحم پادری بیچ میں آگیا۔

جنیرا زمین پر گر پڑی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ برف سے جمی جاتی ہے۔ جان نکلی جاتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے پکڑ لئے۔ سر جھکا لیا اور ارادہ کرلیا کہ اب نہیں اٹھیگی۔ یہیں پڑے پڑے مر جائیگی۔

"مردے، زندوں میں لوٹ کر نہیں آتے" وہ خیال کرنے لگی۔

فوراً ہی اُسے انٹونیو، اپنا عاشق یاد آگیا "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بھی مجھے پناہ نہ دیگا؟" انٹونیو کا خیال شروع سے اس کے دل میں تھا۔ مگر شرم اُدھر جانے سے روکتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ رات کو اکیلی اس کے گھر جائے۔ خصوصاً اب جبکہ ایک دوسرے شخص سے اس کی شادی ہوچکی ہے۔ لیکن اب اس نے دیکھ لیا کہ زندوں کی نظر میں وہ مرچکی ہے۔

چاند، بادل کے ایک کالے ٹکڑے میں چھپ گیا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ صبح صادق کے آسمان کے نیچے افق میں پیلے دکھائی دیتے تھے۔ جنیرا اپنی ماں کی چوکھٹ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسکے خود اپنے گھر میں پناہ ڈھونڈنے کو روانہ ہوگئی۔

انٹونیو، رات بھر جنیرا کا مومی بت بناتا رہا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وقت کس طرح گزر گیا۔ صبح صادق کا ٹھنڈا اُجالا اس کی کھڑکیوں پر آکے مچل گیا۔ بت تراش کو اسکا ایک مقبول شاگرد، برٹولینو مدد دے رہا تھا۔ یہ ایک سترہ برس کا خوشنما بالوں اور خوبصورت چہرے کا لڑکا تھا، ایسا خوبصورت کہ لڑکیاں بھی رشک کرتی تھیں

انٹونیو کام میں منہمک تھا۔ ایک عجیب خاموشی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ بت کے خط و خال میں قلم کی نوک سے کچھ اس طرح ترمیم کر رہا تھا کہ خود اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ مرحومہ، موت کی ابدیت سے نکل کر لازوال زندگی کے آغوش میں آرہی ہے۔ آنکھیں ہلنے اور کھلنے کے لئے بالکل تیار معلوم ہوتی تھیں۔ سینہ ابھرتا اور ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شبہ گزرتا تھا کہ خون، بدن اور رگوں میں بس دوڑ جانے والا ہے۔

اب صناع اپنا کام ختم کرچکا تھا۔ صرف اتنی کسر باقی تھی کہ جنیرا کے بت کے لبوں پر ایک معصوم تبسم نمودار کردے۔ عین اسوقت دروازے پر چوٹ پڑی۔

"برٹولینو!" انٹونیو نے بت پر سے نگاہ ہٹائے بغیر اپنے شاگرد سے کہا "دروازہ کھول دو"

لڑکا دروازے پر گیا اور پوچھنے لگا:۔ "کون؟"

"میں ـــ جنیرا!" ایک بہت ہی کمزور آواز سنائی دی جو شام کی ہوا کی طرح مرتعش تھی۔

برٹولینو بدحواس ہوکر بھاگا۔ بالکل پیلا اور سر سے پاؤں تک کانپتا ہوا۔

"مردہ!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور صلیب کا نشان بنایا۔ لیکن انٹونیو نے آواز پہچان لی تھی۔ ایک ہی جست میں کمرے کے باہر تھا۔ لڑکے کے ہاتھ سے شمع جھپٹا مار کر چھین لی۔ اور دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

"استاد! دیکھو کیا کرتے ہو؟" شاگرد نے آہستہ سے کہا جس کے دانت خوف سے کٹکٹا رہے تھے۔

انٹونیو نے کچھ نہیں سنا۔ اس وقت اس کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ دیوانہ وار دروازے پر پہنچا اور قفل کھول دیا۔ جنیرا چوکھٹ پر پڑی تھی۔ نیم مردہ ہوچکی تھی۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور ان پر برف جم گئی تھی۔

انٹونیو ذرا بھی نہیں ڈرا۔ اس کا دل، رحم کے طاقتور جذبے سے لبریز ہوچکا تھا۔ محبت کا ایک نعرہ اس کے منہ سے بلند ہوا۔ ٹھٹھرے ہوئے نیم جان جسم پر جھک پڑا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور اندر کمرے میں لے آیا۔

اس نے جنیرا کو اپنے بچھونے پر لٹا دیا۔ تھوڑی سی شراب گرم کی اور جنیرا کے حلق میں اتار دی۔ شراب کی گرمی پاکر جنیرا آسانی سے سانس لینے لگی۔

جنیرا نے انٹونیو کو پاس بلایا۔ وہ بستر کے سامنے گھٹنے ٹیک کے کھڑا ہوگیا۔ جنیرا نے اپنا واقعہ کہہ سنایا۔

"آہ پیارے!" اپنی الم کہانی ختم کرکے جنیرا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اکیلے اکیلے تم ہی مجھ بدنصیب سے نہیں ڈرے۔ صرف تم ہی نے مردے کو اپنے گھر میں جگہ دی ـــ تمہارے سوا کسی نے بھی مجھ سے محبت نہیں کی۔" اب میرا کوئی عزیز نہیں۔ نہ شوہر، نہ چچا، نہ ماں۔ سب غیر ہوچکے ہیں۔ کیونکہ ان سب کے نزدیک میں مرچکی ہوں۔ صرف تم ہی میرے عزیز ہو، کیونکہ صرف تم ہی نے مجھے زندہ سمجھا ـــ اب میں کسی کی نہیں۔ صرف تمہاری ہوں!"

"انٹونیو!" جنیرا نے بہت آہستہ سے کہا "مبارک ہے موت، کیونکہ اس نے ہمیں محبت کرنا سکھلایا! مبارک ہے محبت، جو موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے!

عبدالرزاق ملیح آبادی

تاج اور اس کے باغات

ارجمند بانو کا فردوس منظر باغ - روضہ تاج محل کے نام سے مشہور ہے - اس جمیل و دلکش عمارت کے متعلق سیاحوں اور صناعوں نے تعریف کے دفتر لکھدئے ہیں - اور تصاویر کے ذریعے اب عوام بھی اس عمارت کی دلکشی سے متعارف ہوچکے ہیں - اس لحاظ میں بظاہر میرا اپنے تاثرات کو قلمبند کرنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے - مگر میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ادیب محض روضہ کی خوب صورتی سے اسقدر متاثر ہوئے ہیں - کہ انھوں نے تمام عمارات کے باہمی تناسب کا احساس نہیں کیا - صرف یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی ان کی نظر سے پوشیدہ رہی ہے کہ باغ کا پہلا مجوزہ نقشہ ایک وسیع ترتیب و تکمیل کا ایک ضروری جزو تھا - میرے ذہن میں "تاج" کے پہلے نظارے کے تاثرات اب تک روشن ہیں - نومبر کی برفانی صبح کی سردی روح کو منجمد کئے دیتی تھی - وسیع شاہراہ پر کوئی بھولا بھٹکا گبد ڈھوت کی طرح مبہم اور خوفناک نظر آجاتا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی خبیث روح طلوع صبح کے خوف سے آشیانے کی پناہ لینے کے لئے بھاگی جارہی ہے - نہر سڑک کے کنارے خس و خاشاک جلاکر اپنے ٹھنڈے بدن کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے - اور دھوئیں کی ناخوش گوار بو - بڑھتی ہوئی کہر کی سردی میں مل گئی تھی - کارواں سرائے کے پاس کی دکانیں بند تھیں -

میرے مڑنے کے بعد دربان نے باغات کا دروازہ کھول دیا صاف معلوم ہورہا تھا - کہ وہ اسقدر جلد دروازہ کھولنے کا عادی نہیں - اور صبح خیز تماشائیوں کا شاکی ہے - جب میں شاندار محراب کے نیچے پہنچا - تو روشنی پھیل گئی تھی - اندرونی دروازے سے "تاج" دھند اور کہر کے پردوں میں لپٹا ہوا دور سے افسردہ سا نظر آتا تھا - تاج کی یہ افسردہ منظری یقیناً آسمان کے ہلکے خاکستری سے رنگ سے مناسبت رکھتی تھی - سرو کے درختوں پر بھی دھند چھائی ہوئی تھی اور پانی میں ان کا عکس صاف نظر نہ آتا تھا - جب میں پانی کے کنارے پہنچا - تو وسطی گنبد کا طلائی کلس یکایک سورج کی ایک زرنگار شعاع سے جگمگا اٹھا - گلابی شعاعیں گنبد کی حسین گولائی کو روشن کرنے لگیں - سنگ مرمر کی صاف مروارید سطح روشنی میں نہانے لگی - تا اینکہ شعاعیں عمارت کے اطراف کو عبور کرنے کے بعد سنگ مرمر کے مربع چبوترے پر پہنچ گئیں - اور "تاج" کے تمام محرابی طاق اور حصے رنگ و نور کا ایک طلسم بن گئے - سنہری سائے اور اودے سے عکس فردوس نظر بن گئے - پرستان کا سا جلوہ پیدا ہوگیا - ایک روحانی عمارت نظر آنے لگی جس کے دروازے مروارید خالص کے بنے ہوئے تھے - اور جو دنیا میں صرف ایک لمحے کیلئے جھلملا کر غائب ہو جانے کے لئے آئی تھی - سورج کی گرمی سے باغ پر چھائی ہوئی دھند غائب ہونی شروع ہوئی اور فیروزی لہروں کی صورت میں ان گہرے سبز سرو کے درختوں کے درمیان سے گذر گئی - عکس اب صاف خاموش پانی میں نظر آرہے تھے - اب ان گہرے سایوں کے درمیان تاج معجزے کی طرح جلوہ گر تھا -

کیا آئینہ خانے کا وہ عالم تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

یہ طلسمی منظر صرف ایک لمحے کے لئے قائم رہا - مگر اس ایک لمحے میں مجھے تاج کے صناعوں اور کاریگروں کی تخیلی تصویر صاف نظر آگئی - کسی نقاد نے کیا خوب لکھا ہے -

جو لوگ تاج کی صنعت تعمیر پر یہ اعتراض کرتے ہیں - کہ اس میں نسوانیت پائی جاتی ہے - وہ بغیر محسوس طور پر گویا عمارت کی انتہائی تعریف کرتے ہیں - نسوانیت تاج میں ارادتاً پیدا کی گئی ہے - بحیثیت مجموعی و جزوی تاج کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں نزاکت کی تصویر ہوں - یہ عمارت تاج نہیں بلکہ خود ارجمند بانو بیگم ممتاز محل اپنی بہار حسن و جمال کے ساتھ جمنا کے کنارے ضیا افروز ہے - درخشاں صبح ہو یا روشن دوپہر دھندلی شام ہو یا گہری تاریکی ہر وقت کسی مہ جبین کا رعنا شباب جلوہ گر معلوم ہوتا ہے -

چاندی جیسی چاندکی روشنی میں ممتاز محل کی رعنائی لرز رہی

ہے اور سونے کے چاند کے حسن و جمال میں اس کی شگفتگی پنہاں ہے۔

یوں کہنا چاہیئے۔ کہ ہندوستان نے یہ عمارت بنا کے عورت کے حسن و جمال کو خراجِ عشق ادا کیا ہے۔"

روشنی تمام باغ پر چھا گئی اور سرو کے درختوں کی سایۂ ارزش حسین تر ہوگئیں۔ مگر آم کے درخت ابھی تک دھندلے سے معلوم ہوتے تھے۔ اب مہتر۔ بہشتی اور مالی شور و غوغا کرتے ہوئے باغ میں داخل ہوتے۔ اور طوطوں نے ایک طوفانِ نغمہ برپا کر دیا۔

"تاج" ہندوستان کی صنعت کا وہ نمونہ ہے جس کو دیکھ کر تمام لوگ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ سکھ تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دوپہر کی چمکتی ہوئی دھوپ میں سفید گنبد گہرے نیلے آسمان کے سامنے کہنہ عمارتوں اور مبتذل جدید اختراعوں کے مقابلے میں صنعت و ایجاد کی تکمیل معلوم ہوتا ہے۔

تاج کے موجودہ نقشوں میں سب سے پرانا نقشہ کرنل ہاڈگس سرویر جنرل انڈیا نے ۱۸۲۸ء میں ترتیب دیا تھا۔ جس کے مطالعے سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اگرچہ ان باغات کی بہت کچھ نگہداشت کی جاتی ہے۔ مگر ان کی اب وہ صورت نہیں رہی۔ جو ان کے کاریگروں کے ذہن میں تھی۔ بہت حد تک کئی چیزوں کو مغربی انداز میں رنگ دیا گیا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے۔ کہ اب تاج کے یہ حصے صناع کے اصلی مقصد کے آئینہ دار نہیں ہیں۔

گنجان درخت اراضی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے عمارت کی خوبصورتی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔

"تاج کا خاکہ سادہ ہے۔

باغ چار حصوں میں منقسم ہے۔ اور ان چار حصوں سے ہندوؤں کی فردوس سکون کے چار حصے مراد ہیں۔ یہی ترتیب ہے جو باقی کل باغات میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ صرف ایک بات ایسی ہے جو تاج محل کو دوسرے باغات سے مشخص کرتی ہے۔ اور وہ یہ وسط میں ایک سنگ مرمر کا حوض واقع ہے۔ حالانکہ باقی تقریباً تمام باغات کے وسط میں ایک عمارت یا بارہ دری بنائی گئی ہے۔

تاج محل کا روضہ باغ کے اختتام پر جمنا کے چمکتے ہوئے پہنائے وسیع کے کنارے واقع ہے۔ کیا بات تھی کہ شاہجہاں نے اپنے اصول کو خاص اس باغ کے مقابلے میں ملحوظ خاطر نہیں رکھا؟

کیا اُسے جمنا کے فطرتی مناظر پسند تھے؟ کیا اُس نے یہ جگہ اس لئے انتخاب کی تھی کہ اپنے قلعہ کے برجوں سے وہ تاج محل کے مرمریں اطراف کو طلوع صبح اور شفق شام کے سرخ رنگوں میں غرق ہوتا دیکھ سکے؟ شاید وہ راجپوتی اثر جو اُسے اپنی ماں کی طرف سے ورثے میں ملا تھا اس بات کا محرک ہوا ہو۔ اور وہ چاہتا ہو کہ اصل عمارت کو دریا کے کنارے بنا کر وسط باغ میں دوشیزہ کے لئے کنول کے پھولوں کا حوض بنائے۔ شاید یہ روایت درست ہو کہ "تاج" شاہجہاں سے مکمل نہ ہو سکا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اس عمارت کے آگے دریا سے پار اپنے لئے بھی ایک روضہ بنوا لے۔ اور دریا پر سنگ سیاہ کا پل باندھ کر اس روضے کو اپنی قبر سے ملا دے۔ اور یوں مقدس جمنا مرکز اتصال رہے۔

برنیر نے سنہ ۱۶۶۰ء میں ان باغات کو دیکھا تھا - وہ لکھتا ہے -

"آخری بار جب میں تاج محل دیکھنے کے لئے گیا - تو میرے ہمراہ ایک فرانسیسی سوداگر بھی تھا جو سیر و سیاحت کے لئے ہندوستان آیا ہوا تھا - وہ بھی میری طرح سمجھتا تھا - کہ تاج کی تعریف نہیں ہو سکتی - پہلے تو میں نے اپنے تاثرات بیان کرنے سے انکار کیا - کیونکہ میں ڈرتا تھا - کہ شاید ہندوستان میں رہ کر میرا مذاق خراب ہو گیا ہے - مگر جب مجھے معلوم ہوا - کہ وہ نووارد فرانسیسی بھی جس پر تا حال ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا کوئی اثر نہیں ہے میرے ساتھ متفق ہے تو میں نے بڑے گرمجوشانہ الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاج کی مکمل نگہداشت ہوتی ہے - سرو کے درخت نئے نصب کئے گئے ہیں - مگر وہ مرکزی دلچسپی جو اکثر مغل بادشاہوں کے باغات میں پائی جاتی ہے نابود ہو گئی ہے - سرو کے درختوں اور ثمردار اشجار کا وہ طلسمی امتزاج جس نے معہود ذہنی کی صورت اختیار کر لی تھی - اب تاج میں پایا نہیں جاتا -

تھوڑا عرصہ ہوا ہے - کہ تاج کے باغ میں کھجور کے درخت بھی نصب کئے گئے ہیں - ابھی تک تو یہ پودے بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں - مگر اس میں شک نہیں - کہ جب نزدیک ہی مستقبل میں یہ پودے سرو کے بلند بالا درختوں سے بھی بڑھ جائیں گے - تو باغ کی خوبصورتی میں یقیناً معتدبہ اضافہ ہو گا - کیونکہ ان کی نازک میانی تاج کے چار میناروں کی نزاکت سے متناسب ہو گی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لیموں انار اور سنگترے کے درخت باغ کے چاروں حصوں میں پھر نصب کئے جائیں - اور یوں اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل کی طرف ایک قدم اُٹھایا جائے جس کو سامنے رکھ کر مغل بادشاہ اپنے باغوں کے نقشے تیار کیا کرتے تھے -

ایک ماہ تک صبح و شام میں اس باغ کے جلوؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا - اور روشن ایام میں ایک تاریک دن بھی مجھے بخوبی یاد ہے -

مینہ برس چکا تھا - کھلتی سردیوں کے دن تھے - سڑکوں پر پانی کھڑا ہوا تھا - پودوں پر اور سرو کے درختوں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے - دور - ارغوانی بادلوں کے سامنے تاج روضہ ہاتھی دانت سے بنا معلوم ہوتا تھا - صاف - نرم - ہاتھی دانت جس میں ہر ایک رنگ جلوہ گر تھا -

روضے کے چبوترے پر پانی کے قطرے درخشاں تھے - سنگ سیاہ و سفید کے خطوط توازن و تناسب کا ایک معجزہ نظر آتے تھے - دن کے وقت سورج کی روشنی میں ان پتھروں کی اس کاریگری پر کسی کی نظر نہیں جاتی - مگر اس وقت یہ چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں +

اس منظر کو دیکھ کر میرے دل پر جو تاثرات ہوئے - وہ غالباً عرصے تک میرے ذہن اور حافظے سے فراموش نہ ہوں گے -

(ماخوذ)

. . . .

بیخودی پہ مرتا ہوں میکشی سے ڈرتا ہوں — اخذِ کیف کرتا ہوں خوشہ ہائے پرویں سے

تاج کی نزاکت میں نعمتیں ہیں الفت کی — رنگِ عشق پیدا ہے نقش ہائے سنگیں سے

مسافر

(غیر مطبوعہ)

شبِ سیاہ تھی اور اک مسافرِ تنہا
کہیں سے جانبِ شہرِ حبیب جاتا تھا
ہوا تھا گامزنِ شاہراہِ اہلِ وفا

سکونِ خواب میں تھا ہر مسافرِ ہستی
مگر! وہ گرمِ سفر تھا بشانِ بیخبری

(۲)

اگرچہ رات کی تاریکیاں مزاحم تھیں!
اگرچہ دشت کی خاموشیاں مزاحم تھیں!
اگرچہ وقت کی تنہائیاں مزاحم تھیں!

مگر وہ عشق میں سرشار ہو کے بڑھتا تھا
خرامِ چشمۂ کہسار ہو کے بڑھتا تھا

(۳)

رہِ وفا میں جو ثابت قدم اُسے پایا
تو کائنات کے خالق کو اُس پہ رحم آیا
وہیں یہ ماہِ درخشاں کو حکم فرمایا

کہ اپنی منزلِ خلوت سے جلد باہر آ
اور اس مسافرِ بیکس کا ہمسفر بنجا

غرض! بلند ہوا آسمانپہ بدرِ منیر!
ہر اک شعاع ہوئی موجِ چشمۂ تنویر!
یہ دیکھ کر ہوا شاداں مسافرِ دلگیر!

اِدھر زمین پہ وہ اپنا قدم بڑھاتا تھا
اُدھر فلک پہ قمر ساتھ ساتھ جاتا تھا

(۵)

فصیلِ شہر کے آثار جب قریب آئے
قدم کو روک لیا عشق کے مسافر نے
اک آہ بھر کے کہا یہ، "سفیرِ گردوں" سے

کہ اے غریب مسافر کے آشنا! رخصت!
ترے کرم کی خدا دے تجھے جزا! رخصت!

(۶)

یہی مقام جدائی ہے، اے رفیقِ لبیب!
کہ ہے جلالِ محبت کی جلوہ گاہ قریب!
یہاں سے دور نہیں خوابگاہ نازِ حبیب!

کسی طرح نہ تجھے ساتھ لے سکونگا میں!
بس اس مقام سے تنہا سفر کرونگا میں!

روش صدیقی

خلفشارِ زندگی

(ایک معاشرتی افسانہ)

عام طور پر اُن آدمیوں کو متین نہیں سمجھا جاتا جو اپنے خانگی معاملات کے متعلق جو منہ میں آئے کھلم کھلا کہہ گزرتے ہیں۔ اور خصوصاً ایسے شخص کو تو بالکل ہی غیر مہذب سمجھا جاتا ہے جو اپنے اور اپنی بیوی کے تعلقات کو بھی عام لوگوں پر ظاہر کر دینے سے نہ چوکے۔ مگر جس بدقسمت کی بیوی اس کی طبیعت کے موافق نہیں ہے اور اس کی وجہ سے اس کی گھریلو زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ اُس کو اپنا دکھڑا سنانے کے ساتھ ہی راہ چلتوں کی لعن طعن برداشت کرنے کو بھی تیار رہنا چاہئیے۔ کیونکہ اس کی ذات میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ہو گی۔ ورنہ اُسے اپنی ذات پر اعتماد ہوتا اور اس کی قوت فیصلہ مضبوط ہوتی تو وہ اپنی خانگی بدنظمی کے باوجود اپنے کاروبار میں ترقی کرتا رہتا۔ اور اس کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہ ہوتی۔ ہزاروں آدمی بیمار عورتوں، نکمے لڑکوں اور اپاہج رشتہ داروں کا بار ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوئے اپنے کاروبار میں ترقی کرتے جاتے ہیں اور چوں تک نہیں کرتے۔

دنیا ایسے لوگوں کو بنظر استحسان دیکھتی ہے۔ لیکن اُس نامرد اور بزدل شخص سے کوئی ہمدردی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ہمیشہ دکھڑا روتا رہتا ہے کہ میرے بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوتا۔

میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس بزدل جماعت میں شمار کیا جائے۔ کیونکہ میں اُن سے یقیناً چند قدم آگے ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نوے فیصدی بیاہے ہوئے مرد بن بیاہے آدمیوں سے زیادہ اطمینان اور زیادہ فراغت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو صرف اپنی بیوی ہی کے طفیل میں آدمی بلکہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ مگر یہ اسی وقت ہوتا ہے جب میاں بیوی اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کریں۔

اپنی داستان شروع کرنے سے پہلے یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عورت میرے نزدیک زندگی کا نصف اہم ہے۔ اس لئے امیدوار ہوں کہ عورتوں کے متعلق میرے جو الفاظ ناقدانہ یا معاندانہ معلوم ہوں انہیں بھی عورتوں کے احترام اور انکی توقیر پر محمول کیا جائے۔

میں اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو آجکل کی دنیا سے بالکل مختلف نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آج عہدِ وکٹوریا کی باتوں پر ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر ہماری بسر اوقات آجکل کی طرح کا ہلانہ ہوتی تو آج مجھے اچھے بُرے کی تمیز نہ ہوتی۔ اور مجھے اپنی بگڑتی ہوئی حالت کے سدھارنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

میرا باپ جدید انگلستان کے ان باشندوں میں سے تھا جنہوں نے مغرب میں آباد ہونے کی ناعاقبت اندیشانہ جرأت کی تھی۔ وہ خود اعتمادی کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ وہ اپنے ضمیر کی ہدایت کے مطابق ہمیشہ اپنے اخلاق سنوارنے میں لگا رہتا تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ میرا خدا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اُس نے پرانی چیزوں کی ایک دکان کھول رکھی تھی جس میں ضروریات زندگی کی ہر چیز ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس پر اسے بڑا فخر تھا کہ شربت مفرح سے لیکر لوح مزار تک ساری چیزیں اس کے ہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ میں بچپن میں ایک منشی کی حیثیت سے اسی دکان میں کام کرتا تھا اور کم قیمت پر مال خرید کر گنے چوگنے دام پر بیچنے کا لپکا مجھے یہیں سے پڑ گیا تھا رسیدیں لکھنے اور بہی کھاتے کو صاف رکھنے کی عادت بھی یہیں پیدا ہو گئی تھی۔ روزانہ صبح کے ساڑھے سات بجے سے رات کے دس بجے تک اور ہفتہ کو گیارہ بجے دن تک میں اپنے باپ کے ساتھ اسی دوکان میں لگا رہتا۔ میرا باپ اس زندگی سے بہت خوش تھا۔ دوکانداری تو اُسے ایسی اچھی آتی تھی کہ خواہ کتنے ہی گاہک آجائیں سبکو خوش اسلوبی سے بھگتا دیتا۔ اور ہر ایک خوش ہو کر جاتا۔ جب گاہک اکا دکا آتے تو وہ اپنے گدام کے باہر منہ میں چرٹ دبائے ایک کرسی پر جا ڈٹتا۔ اور دنیا جہان کے معاملات طے کرنے لگتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب میں کالج میں پڑھنے گیا ہوا تھا۔ میرا باپ گدام میں کھڑے کھڑے گر کر مر گیا۔ اس کے بعد میں نے بہی کھاتوں کی پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اگر میرے باپ کے تمام قرضدار قرضہ ادا کر دیں تو میری ماں کے پاس ایک سو پچاس ہزار ڈالر جمع ہو

جائیں گے - لیکن مرحوم کا دل اور حوصلہ اس کے دماغ اور قوت فیصلہ سے بہت زیادہ فراخ تھا - اس نے زندگی بھر میں اپنے قرضداروں سے کبھی مطالبہ نہیں کیا - غریب اور نادار لوگ اس کی زندگی میں ہمیشہ اس کے دن پُن کا گُن گاتے رہتے - مگر اس کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے کے بعد اس کی ساری بخششوں کو طاق نسیاں پر رکھ کر بھول گئے - والدہ کی خوش قسمتی سے میرے دونوں بڑے بھائی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے - ایک تو کامیاب ڈاکٹر تھا - دوسرا معدنیات کا انجنیئر - اس لئے میری ماں کو دال روٹی کی تکلیف نہیں ہوئی -

میرے خیال میں اگر کوئی سوانح نگار ایک کامیاب امریکن خاتون اور ایک ماں کے واقعات زندگی قلمبند کرنا چاہے تو اس کو میری ماں کی زندگی سے زیادہ موزوں عورت ملنی مشکل ہے - جب میرے باپ نے دوکان کھولی تو میری ماں ایک چھوٹے سے گاؤں میں معلمہ تھی - وہ بڑی زندہ دل - کفایت شعار اور محنتی تھی اس کے دم سے ہمارا مکان جنت بنا رہتا - میرا باپ جب کبھی غمگین ہوتا - وہ ہمیشہ اس کی شریک غم ہوا کرتی - اور اسطرح میرے باپ کو مسرت کی تلاش میں گھر سے باہر جانا نہیں پڑتا تھا - وہ گھر کے کام بڑی سرگرمی سے انجام دیتی مگر میں نے اپنی یاد میں کبھی تھکتے یا بیمار پڑتے نہیں دیکھا - وہ جبتک زندہ رہی اپنی زندگی کو زندوں کی طرح گزارا - اور تراسی سال کی پختہ عمر میں انتقال کیا -

ہمارے باپ نے اکثر ہم سب بھائیوں کو سکول جاتے وقت کہا کرتا کہ بچو! میں تمہارے لئے کوئی بڑی دولت چھوڑ کر نہیں مروں گا - ہاں اگر میرے عادات و خصائل کی پیروی کرو گے اور اپنی نوجوانی ہی میں اپنی خوش قسمتی سے اپنی ماں جیسی عورت سے شادی کر لو گے تو یقیناً تمہاری زندگی بھی کامیاب ہو جائیگی - (بے شک یہ پیر دانا کی ایک دانشمندانہ پند تھی)

والد کے انتقال کے بعد میں سڑکوں کے کنارے خوانچہ بیچکر پیٹ پالا کرتا تھا - والد کی سی خوش خلقی - چرب زبانی - شیریں کلامی مجھ میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی - مگر اُن جیسی کوشش اور کاوش نہ تھی - چند سال میں نے یونہی کھیل کود میں گزار دئے - خوانچہ فروشی سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ہوٹل کے قیام و طعام کا خرچ پورا ہو جاتا کبھی کبھار ناچ کی سیر بھی کر آتا - نہ اُسوقت مجھے کوئی دُکھ درد تھا اور نہ آئندہ کی فکر -

ایک دن میں اوہیو کے گاؤں میں ایک بڑے دکاندار کو کچھ آرڈر دے رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی دوکان کے اندر گھس آئی - اور مالکانہ حیثیت سے ادِھر اُدھر نگاہ ڈالکر سیدھے دوکاندار کے پاس گئی اور اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دئے - اس کو بوسہ دیا - میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ اس کی بیٹی ہے - جب اس نے دوکاندار سے پچیس ڈالر کی فوری ضرورت ظاہر کی تو میرا شک یقین سے بدل گیا - پھر اس لڑکی سے میرا تعارف کرایا گیا اور پانچ منٹ کے اندر ہی میرے دل میں ایک عجیب کیفیت محسوس ہونے لگی - سچ ہے کہ جوانی دیوانی ہونے کے باوجود اپنا راستہ خود ہی ڈھونڈھ لیتی ہے -

میں نے خوانچہ فروشی چھوڑ دی اور سارا وقت اسی کی گلی میں چکر کاٹنے میں صرف ہونے لگا - شکر ہے کہ میری ہیرا پھیری رائگاں نہیں گئی - اور چھ ماہ کے بعد اس سے میری شادی ہو گئی -

ایتھل اپنے باپ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی - اس کے باپ نے ہماری خاطر ایک مکان بنوا دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ ہم اسی گاؤں میں رہیں - مجھے تجارت میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی - میں اس تجویز سے بہت خوش ہوا - کیونکہ میری سہل انگاری کے لئے تجارت سے بہتر اور کوئی مشغلہ نہ تھا - لیکن میری بیوی شہری زندگی پر لٹو ہو رہی تھی - اسے نہ تجارت کی پروا تھی نہ مکان کی وہ صرف شہر کی خواہشمند تھی خواہ کوئی شہر ہو لیکن جتنا بڑا ہو اتنا ہی بہتر ہے -

اس کے رشتہ داروں کی تمنا کے خلاف ہم کولمبس شہر کی طرف چلدئے اور شہر کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے سہنے لگے - وہاں میں ایک کمپنی میں چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں بنانے پر نوکر ہو گیا - اور اسی کی آمدنی سے مزے میں دن گزرنے لگے - اس وقت اگر تمنا تھی تو صرف یہ کہ قدرت ہمیں ایک کھلونا بچہ عطا کرے -

آدمی کے اخراجات جب بڑھ جاتے ہیں تو آمدنی کے لئے اس کی جد و جہد بھی بڑھ جاتی ہے - میں نے محنت سے کبھی اتنا کام نہیں کیا تھا جتنا اس عیالداری کے چند ابتدائی سال میں کرتا رہا - میں نے تمام علاقے میں آگ سی لگا دی - اور مانگ اتنی بڑھا دی کہ کمپنی کو میری تنخواہ میں لگاتار اضافہ کرنا پڑا کہ کوئی دوسری کمپنی کہیں مجھے اس سے بھی زیادہ مشاہرہ دیکر نہ پھانس لے -

میں کولمبس میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا ۔ اور کچھ روپیہ بھی جمع کر لیا تھا ۔ مگر میری بیوی ایتھل کے جی میں نیو یارک بسا ہوا تھا ۔ وہ مجھ سے برابر کہا کرتی کہ وہاں دوکانداری خوب چلتی ہے ۔ آمدنی بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ وہاں سوداگروں کی جماعت بہت بڑی ہے ۔ مجھے ترغیب دیتی کہ وہاں چلکر تجارت کرو تو جلد ہی تم بھی ان کی انجمن کے ممبر بنجاؤ گے ۔ اس کے خیال میں میں بیدار مغز اور بڑا چست و چالاک تھا ۔ اور وہ میری اسقدر تعریف کیا کرتی کہ میں اپنے کو واقعی "ہمچو من دیگرے نیست" سمجھنے لگا ۔ اور بہت سا قیمتی وقت اس سوچ بچار اور خیالی پلاؤ پکانے میں ضائع کرنے کے بعد آخر میں نے نیو یارک جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ۔

کولمبس میں رہتے ہوئے میں نے غیر محسوس طور پر کاروباری صداقت حاصل کر لی تھی ۔ جس چیز کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کو چند دنوں کے لئے بھول جاؤ تو تم یقیناً اُسے پا لو گے ۔ یہ اصول بظاہر احمقانہ معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن کاروباری دنیا کے جو لوگ میرے ناظرین میں شامل ہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں ۔

تم نے[1] اکثر اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کی ہوگی مگر پھر بھی تمہاری تمنا اُس وقت نہیں پوری ہوئی ہوگی لیکن غور کرو تو تم حیرت میں پڑ جاؤ گے ۔ کہ تمہارا وہی مدعا کسی دوسرے مقصد کے جدوجہد کے سلسلے میں ضمنی طور پر حاصل ہو گیا ۔ میرے ساتھ بھی ہو بہو ایسا ہی ہوا ۔

جو خطوط میں نے نیو یارک روانہ کئے تھے وہ سب بیکار گئے ہاں وہاں کے ایک تجارتی اخبار میں میں نے جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں پانچ چٹھیاں آئیں ۔ ان میں سے ایک چٹھی کلولینڈ کے ایک سوداگر کے چیرے بھائی کی تھی ۔ یہ سوداگر مجھ سے واقف تھا اور اسی نے اپنے بھائی کو مجھے تجارت میں شریک کرنے پر تیار کیا تھا ۔ میں نیویارک اس کے دفتر میں پہنچ گیا ۔ اور اس کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گیا ۔ میں نے دیانتداری سے بڑی محنت سے کام کیا اور چند ہی دنوں میں کافی دولت پیدا کر لی ۔ اور ایک کمپنی کے بہت سے حصے خرید لئے ۔

اُس وقت میری عمر چالیس سال کی تھی ۔ میرا قد چھ فٹ لمبا تھا ہاتھ پاؤں کا کسیلا اور گٹھیلا تھا ۔ صحت بظاہر بہت اچھی تھی ۔ تین شہری اور دو گاف کلبوں کا ممبر تھا ۔ ایتھل جیسی قبول صورت اور تندرست عورت میری شریک زندگی تھی ۔ دو بچوں —— ایک لڑکا ایک لڑکی —— کا باپ بھی ہو چکا تھا ۔ خدمت کے لئے اندر باہر نوکر چاکر ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے ۔ بچے پرائیویٹ سکول میں داخل تھے ۔ اس لئے ہم کو پارٹیوں میں شرکت اور سیر و تفریح کیلئے کافی وقت ملجایا کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ آدمی کو اور چاہئیے ہی کیا ۔ یقیناً خدا کسی کے ساتھ اس سے زیادہ مہربانی نہیں کرتا ۔

پانچ سال تک ہم نیو یارک کی دل آویز اور ولولہ انگیز زندگی بسر کرتے رہے ۔ اس دوران میں میں نے کئی تاجروں سے دوستی پیدا کر لی ۔ میری بیوی نے بہت اونچے گھرانے کی عورتوں کو سہیلی بنالیا ۔ میں تاجروں کی انجمن کا ممبر بھی بنا دیا گیا ۔ اگرچہ ذمہ دار اور کوئی ممتاز ممبر نہیں تھا مگر انجمن کے بڑے بڑے تاجروں کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں ۔ کیونکہ اب عنقریب نیو یارک کے معیار کے مطابق کامیاب تاجر بننے والا تھا ۔ ہمارا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہو چکا تھا ۔

اگر میں کبھی سست ہو جاتا اور کاروبار میں کاہلی برتنے لگتا تو میری بیوی فوراً مجھے خبردار کر دیتی کہ "ایسا بیوقوف کیا کرتے ہیں ۔ تم تو سمجھدار ہو اور روز بروز بام ترقی کے قریب ہوتے جا رہے ہو مگر ترقی تو بڑی چیز ہے بغیر کوشش کے دنیا کی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں حاصل کیجا سکتی ۔ تمہیں ہر چیز کی قیمت ادا کرنی چاہیئے ۔ کاروبار میں محنت کرنی چاہیئے ۔ حلقۂ احباب کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ جب تم دوسروں کو نہیں کھلاؤ پلاؤ گے تو دوسرے تمہیں کب پوچھیں گے ۔ امریکہ کے ان چوٹی کے لوگوں سے تمہارا میل جول انہی پارٹیوں اور صحبتہائے شبینہ کا رہین منت ہے ۔ جس سے تم گھبراتے ہو ۔"

بات سچی تھی اور کہنے والی کا منہ چوم لینے کے قابل ۔ ایتھل کی ایسی ہی باتوں نے مجھے ایک خوانچہ فروش سے کامیاب سوداگر بنا دیا تھا ۔ مگر اب اس کی ہمت افزائیوں کے باوجود میں ایک قسم کے اندرونی خلجان میں مبتلا رہتا تھا ۔

۴۰ سے ۴۵ سال کی عمر کے درمیان میرا کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور حالات بظاہر میرے موافق معلوم ہوتے تھے مگر

[1] ۱۵ اکتوبر کے "ادبی دنیا" کا مضمون "غور و فکر کا فن" ملاحظہ فرمایئے ۔ (صدیق طبیب)

میرا روحانی اطمینان مفقود تھا اور بجائے خوش خوش اور بے فکر رہنے کے میں ہمیشہ ادھیڑبُن میں لگا رہتا تھا - مجھے آبا جان کا زمانہ یاد آتا کہ میں اپنے چھوٹے سے کاروبار پر کتنا حاوی تھا اور میرے دن کیسی بے فکری سے کٹتے تھے -

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکبارگی میری طبیعت میں اپنی تجارت سے نفرت پیدا ہو گئی اور میں نے اس پیشے کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں - اپنی ٹوپی اٹھائی اور اپنے سیکرٹری کو ہدایت کر دی کہ آج کا سارا پروگرام منسوخ کر دو - وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا - اور ایک نہایت اہم کانفرنس کی شرکت کے متعلق یاد دلایا جو شام کو ہونیوالی تھی - میں نے کہا کہ کوئی پوچھے تو کہدینا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں - اور مجھے کوئی علم نہیں کہ کب آئینگے -

اس کے بعد میں چند گھنٹے ادھر اُدھر پھرتا رہا مگر مجھ پر کچھ ایسی بیخودی سی طاری تھی کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کہاں کہاں مارا پھرا - دو بجے کے قریب شہر کے مضافات میں ایک ہوٹل میں جانکلا اور وہاں دودھ بسکٹ سے پیٹ کی آگ بجھائی -

(بے شک اب میں دودھ بسکٹ کھانے والوں میں ہو گیا ہوں) -

ہوٹل کے پار سامنے ایک مختصر سا باغیچہ تھا - وہاں جاکر میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا - بنچ کے دوسرے سرے پر ایک ادھیڑ عمر گندم گوں خوش وضع انسان بیٹھا ہوا تھا - اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ کیا میں کبھی کسی رقص گاہ میں گیا ہوں ؟ میں نے جواب دیا "افسوس اتنا وقت کہاں"

اس پر اس اجنبی نے کہا "خوب وقت ! کیا وقت نہیں ملتا ہر معمولی بساط کا آدمی وقت نکال سکتا ہے - آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے - میری عمر پاکر آپ مر جائیں گے - کیا نہیں مرینگے ؟ اگر آپ رقص پسند کرتے ہیں تو کسی ناچ گھر میں کیوں نہیں جاتے ؟ مسرت کی خاطر جو دل میں آئے کیجئے"

اس کی تمام باتیں سن کر میں مبہوت ہو گیا - میں حیران تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں - وہ بیٹھا سگار پی رہا تھا - اور ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھتا جاتا تھا - میرا ہم عمر معلوم ہوتا تھا - اور اس کی آمدنی میری آمدنی سے کچھ بہت زیادہ نہ تھی - لیکن اس کے پاس دھوپ میں بیٹھنے کے لئے وقت تھا - اخبار خوانی کر سکتا تھا لیکن آہ ! یہ سب کچھ میرے نصیب میں کہاں ! -

دیر تک میں بحرِ تفکر میں غوطہ زن رہا - یہ کامیابی تھی جس کے تجسس میں میں نکلا تھا - یہی چیز تھی جسے میری بیوی نے میرے لئے حاصل کرنے کی سعی کی - اور جو ہمیں حاصل ہوئی - بھلا اس کا مجھے کیا فائدہ ؟ -

میں نے اپنی جیب سے چند کاغذ نکالے اور کچھ نوٹ کرنا شروع کیا - پھر ان اشاروں کو تفصیلاً لکھا تاکہ اچھی طرح پڑھے جاسکیں - وہ کچھ ایسے تھے :-

جب میری آمدنی دس ہزار ڈالر سالانہ تھی تو میں چھ ہزار بچاتا تھا جب پندرہ ہزار سالانہ ہوئی تو میں نو ہزار بچاتا تھا - اس طرح میں نے اپنی مالی آزادی حاصل کی - ہائے آزادی ! کیسا پیارا لفظ ہے - دیکھو تو میں کسقدر آزادی کا مدعی ہوں ؟ ہاں جب ہماری آمدنی کم تھی ہم زیادہ خوش تھے - ہم بہت مالدار تھے - ہم تندرست تھے - میری عورت بچوں کی پرورش کی خود ذمہ دار تھی - میرے پاس کافی وقت تھا کہ ان کے ساتھ ہفتہ اور اتوار کو کھیلوں اور دل بہلاؤں - ہمیں قلبی تسلی تھی کہ ہم دنیا میں اچھے کام کر رہے ہیں - اور جو لوگ غربت میں ہیں ان کی اعانت کر رہے ہیں -

اب میری موجودہ حالت کیا ہے ؟ اب میری آمدنی میرے خیال اور حصر سے بھی زیادہ ہے - میں نے بہت بھاری رقم کے عوض میں اپنی زندگی بیمہ کرائی ہوئی ہے - میں کچھ بھی نہیں بچاتا - برخلاف اس کے میں مقروض ہوں - ہم کو قصاب، نانبائی وغیرہ کا قرضہ دینا ہے میں ادارہ کا قرضہ ادا کر دیا کرتا ہوں - اگر میں ایسا نہ کروں تو میرا نام قرضہ دینے والوں کی فہرست میں مشتہر ہو جائیگا - اور تجارتی دنیا مجھے دیوالیہ تصور کریگی - اس طرح سے میرا وقار معرضِ خطر میں پڑ جائیگا - اور میں دو کوڑی کا نہ رہونگا - اب ہماری حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ہم گرجوں میں کچھ چندہ نہیں دیتے - زکوۃ نہیں دیتے غریب برادری کی امداد نہیں کرتے - پیسہ ابھی ہاتھ میں آتا نہیں تو اسے ٹھکانے لگانے کی کئی صورتیں پیش آجاتی ہیں - اس کا جواب کیا ہے ؟ کیا وجہ ہے کہ ہم دس ہزار ڈالر سے تو اسقدر امیر تھے اور اس سے کئی گنا رقم کے ہوتے ہوئے نادار ہیں ؟

ع　این فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

عمرانی زندگی

جب ہم گرینج میں مقیم تھے اور چند آدمیوں کو جانتے تھے تو ہم کبھی

باہر سیر کے لئے چلے جاتے تھے۔ شب شنبہ ہماری عیش و نشاط کی رات ہوا کرتی تھی۔ کبھی ہم نیا تردیکھنے چلے جاتے اور کبھی سرود خانہ میں جاکر چبوترے پر بیٹھ جاتے تھے اور کبھی بگھی میں بیٹھ کر گھر لوٹ آیا کرتے تھے۔ ہم خوش، تندرست اور خوش و خرم تھے۔

اب ہم بہت سے بڑے آدمیوں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاں کھانا تناول کرنے آتے ہیں۔ اور کبھی ہم ان کے ہاں جاتے ہیں۔ گذشتہ سرما میں ان ضیافتوں کی تقریب پر ہم ناولوں، طلاقوں، یورپ کی سیر، منڈی کی اشیاء وغیرہ پر بحث و تمحیص کیا کرتے تھے۔ ہم شراب نوشی کیا کرتے اور سگریٹ بھی پیا کرتے تھے۔ ہم نے ایک ایک ڈرامہ کو تین تین چار چار بار دیکھا۔ اور رات کو دیر کر کے سونے کے باعث بستر پر کروٹیں بدلا کرتے تھے۔

یہ ہے سوشیل زندگی۔ یہ ہے بڑے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنے کا نتیجہ۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو چین نصیب ہے۔

دیہاتی ادارے

ہم دو دیہاتی کلبوں کے رکن ہیں۔ دو ہزار ڈالر سے زائد چندہ ہمیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بچے گرجے میں نہیں جاتے۔ بجائے اس کے وہ ہمارے ساتھ کسی کلب میں جا نکلتے ہیں کیونکہ وہ اتوار کی صبح کو گاف کھیلنے کے مجاز نہیں ہوتے ہیں گاف صرف خستہ اور درماندہ تاجروں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے بچے صرف کلب کے چوک میں گھومتے رہتے ہیں۔

وہ ہم سے زیادہ مالدار اور مقتدر اصحاب کے بچوں سے شناسائی اور آشنائی پیدا کر لیتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے۔

مجھے اس قسم کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں اپنے باپ کے کارخانہ میں کام کیا کرتا تھا۔ میری عورت ان ایام کو بنظر استعجاب دیکھتی ہے۔ کہ میں کس صبر و استقلال سے اس ترغیب کا مقابلہ کیا کرتا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بہت بے مزہ زندگی ہوتی ہوگی۔ برخلاف اس کے وہ بہت ہی پُر لطف اور عجیب زندگی تھی۔

اس قسم کے اشارے میں نے تلملند کئے۔ کچھ دیر بعد اندھیرا ہونے لگا۔ اور میں نے بھی حرکت کی۔ ایک گاڑی بلائی اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ میرا کھانے کا کوٹ باہر پڑا ہوا تھا اور میری بیوی ابھی لوٹ کر گھر میں نہ آئی تھی۔ اس نے ٹیلیفون پر مجھے کہا کہ کھیل کی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ حاضری کے موقعہ پر آجاؤنگی۔ ہمیں ہلنگ سٹونسز جانا تھا۔

ہم ہلنگ سٹونسز کو چل دیئے۔ لیکن میں نے اپنے رفقا سے نہ تو یہ کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں اور نہ یہی کہا کہ میں بیمار ہوں۔ میں نے اپنی بیوی سے ذرا جلدی لوٹنے کو کہا۔ گھر پہنچ کر میں نے اس سے کہا کہ گاؤن پہن کر کتب خانہ میں چلی آئے۔ ہم وہاں تمام رات تبادلۂ خیالات میں محو رہے۔

میں وہ گفتگو تمام و کمال بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ بہت بے تکلفانہ اور چاؤ پیار کی باتیں تھیں۔ اکثر اوقات تکلم کے درمیان کامل خاموشی اور سکوت کے لمحے طاری ہو جایا کرتے تھے۔ اور میری محبوبہ ایتھل کبھی کبھی آنکھوں کے چشموں سے پانی برسانے لگتی تھی۔ ابتداً وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے کیوں اطمینان نہیں۔ دنیا کی بیش بہا نعمتیں ہم نے حاصل کر لی ہیں۔ مثلاً معاشرتی مرتبہ۔ امیر دوست، بہترین گھرانوں کی دعوتیں۔ اپنے بچوں کے لئے فوائد۔ بڑے تحمل اور صبر سے میں نے اس پر واضح کر دیا کہ یہ تمام باتیں حالی خولی اور نقش بر آب ہیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر روز زیادہ خستگی اور تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اور ہم پہلے سے کم پس انداز کر رہے ہیں۔ میں اپنے کاروبار میں کم ترقی دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میری تمام تر قوت بیہودہ تحریکات میں تلف ہوگئی ہے۔

لیکن میری بیوی نے کہا "یقیناً کام ہی ہمارا نصب العین نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ کام ہی زندگی ہے۔ آدمی دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ کوئی کام کرے۔ نہ اس لئے کہ کسی کا ہم نوالہ اور ہم کاسہ بنے۔ اب اس عمر میں مجھے بہت با اثر ہونا چاہیئے اور میں ہر روز کم اثر اور نا اہل ثابت ہو رہا ہوں۔ کیونکہ میں اس نکمے کام میں اپنی قوت کھو چکا ہوں جس میں ہم نے اپنے آپ کو مبتلا کر رکھا ہے

تو اپنے بچوں کے موہومی فائدے کا ذکر کر کے خوشیاں مناتی ہے۔ لیکن مجھے ان کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر رونا آتا ہے۔ میرے خیال میں بہترین فائدہ جو کسی بچے کے لئے ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر فائدہ بخش کام کرنے کی خواہش بلکہ قومی جذبہ پیدا ہو۔ ہمارا لڑکا شام کی حاضری کے وقت صرف چند منٹ کے لئے اپنے باپ کو دیکھتا ہے۔

وہ میری باتوں کو کچھ کچھ تسلیم کرنے لگی - اگرچہ اس کے خیال میں اس کی خوشی ملیامیٹ ہو رہی تھی - آخر کار میری باتوں سے تنگ آکر وہ چلا اٹھی اور کہنے لگی تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا میں دیہات میں کھیت لیکر کام کرونگا - اور تمہیں اور تمام بال بچوں کو وہاں رکھونگا تاکہ تم جتنی ممکن خوشی اور آرام ہو سکتا ہے حاصل کرو - یہاں کے مقابلہ میں وہاں ہم نصف خرچ پر گذارا کر سکتے ہیں - میں بال بچوں سمیت تمہارے ساتھ رہونگا - اور ہفتہ میں تین دن وہاں قیام کرونگا - اور باقی چار دن اپنے دفتر میں گزارا کرونگا - ہر ہفتہ کے روز تم شہر میں آسکتی ہو - اور اپنی سگھڑ سہیلیوں سے ملاقات کر سکتی ہو - کبھی کبھی ہم تھیٹر میں بھی جایا کریں گے - اور رقص خانہ میں بھی کبھی لیکچر بھی سن لیا کرینگے لیکن تمہارا اصلی سروکار بچوں کے ساتھ ہوگا - چند سال تم ان کی نگرانی اور نگہداشت میں لگی رہوگی - حتیٰ کہ وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں - میں بھی عملاً تمہارا شریک کار رہونگا - میں اپنی زندگی کا مخصوص حصہ اپنے لڑکے اور لڑکی کی دیکھ بھال میں صرف کرونگا - میں انہیں ابتدائی مدارس سے اٹھوا کر سرکاری سکول میں داخل کرونگا - میں اس بات کا بھی خیال رکھونگا کہ وہ کھیت پر باقاعدہ کام کرتے رہیں -

ہم کچھ نہ کچھ پڑھتے بھی رہا کرینگے - اور دن کے وقت چند گھنٹے کھلے میدان میں گذارا کرینگے - تاکہ ہماری رُوح مردہ نہ ہو جائے - اور اس میں تر و تازگی پیدا ہوتی رہے -

یہ تھا ہماری شب بھر کی طویل گفتگو کا آخری نتیجہ اور فیصلہ - دوسرے دن ہی ہم نے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا - ہمارے حلقۂ احباب میں بہت لوگ گپیں ہانک رہے تھے کہ ہم نے بہت روپیہ پیسہ ضائع کیا ہے - اور اب کفایت شعاری پر اُتر آئے ہیں - ہم نے کسی کی باتوں پر کان نہ دھرا - اور اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہے - گزشتہ پانچ برس سے ہم نئی تدابیر پر عمل پیرا ہیں -

بہتر ہے - ہم آرام سے رہتے ہیں - اور ہمارے پاس خیرات کرنے کے لئے بہت سا روپیہ جمع رہتا ہے - خیرات نے ہمیں ایک حیاتِ جدید عطا کی ہے - ہم نے اپنے خاندان کے نادار افراد کی مالی اعانت کی ہے - ہم نے اپنی قوم کے بیسیوں لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے میں مدد کی ہے - ہم نے گاؤں میں ہر نیک کام میں حصہ لیا ہے - ہمارے بچوں کا زاویۂ نگاہ بالکل بدل گیا ہے - وہ عقلمندوں کی دوستی اور مصاحبت کو پسند کرتے ہیں - میری تجارت جو زحمت اور فضول چیز تھی ایک دلچسپ اور پُر منفعت شے بن گئی ہے - کیونکہ میں خود تازہ ہو گیا ہوں اور ہر کام میں دلچسپی لیتا ہوں -

ہمارے مطلبی احباب اور ارباب غرض نے ہمیں چھوڑ دیا ہے - جیسا کہ وہ ہمیشہ اس دوست کو جو نمائش اور روپیہ وغیرہ خرچ کرنا ترک کر دے چھوڑ دیا کرتے ہیں - لیکن ہمارے جانی دوستوں نے ہماری عزت و توقیر بیش از بیش کرنا شروع کر دی ہے -

میرے تجارب نے مجھے مندرجہ ذیل چند اسباق سکھائے :-

(۱) اگر کسی شخص کی بیوی معاشرتی امنگوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ہو تو اس شخص کی زندگی اس پر وبال جان ہو جایا کرتی ہے - صحیح معنوں میں عورت، مرد کی اس وقت زیادہ معین و ممد خیال کی جا سکتی ہے جب وہ اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتے - گھر بار کا خیال رکھے، بچوں کو پالے پوسے، اور ان کو خوش و خرم رکھے - اپنے مرد کو مضبوط اور جوشیلا بنا دے - جب عورت خاوند کے دنیاوی جاہ و ترقی کے لئے تجاویز سوچنا شروع کر دے تو وہ اسے برباد کر دیگی - ایک اچھی عورت، اپنے خاوند کو بغیر جد و جہد کے کامیاب بنا سکتی ہے - جتنا وہ دانستہ اس کی بہبود و سود کے لئے کوشاں ہو اتنا ہی وہ اس کے راستہ میں زیادہ کانٹے بوتی ہے -

(۲) آجکل موجودہ زندگی میں اسقدر سرعت سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں کہ بہت سے آدمیوں نے اپنے آپ کو ان کے موافق نہیں بنایا - ہم کسانوں اور دہقانوں کے بال بچے ہیں جو کھیتوں میں رہتے تھے جو تازہ ہوا میں سانس لیتے تھے - پُرسکون راتوں میں آرام کرتے تھے - ان کے پاس پڑھنے لکھنے، آرام کرنے اور غور و خوض کرنے کے لئے کافی وقت ہوا کرتا تھا - اب ہم گنجان آبادی میں تنگ و تاریک مکانات میں رہتے ہیں جن میں نہ سورج کی کرنیں آتی ہیں اور نہ تازہ ہوا کا دخل ہے - نہ کچھ ہمارے پاس وقت ہے کہ ہم دریافت کریں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ کس لئے ہو رہا ہے -

(۳) میں اپنے وقت کا نصف حصہ شہر میں اور نصف دیہات میں

گذارتا ہوں۔ دفتر میں بجائے چھ دن کے چار دن کام کرتا ہوں۔ لیکن کام نسبتاً بہت زیادہ کرتا ہوں۔

(۴) جو بات آجکل لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ قابل فعت ہے وہ "بچوں کا مفاد" ہے۔ میں سادہ زندگی کو پسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچوں کو بھی اس کی تلقین کروں۔ یعنی ان پر محنت اور سادگی کے فوائد روشن کردوں۔ اور ان لوگوں سے محبت کرنا سکھاؤں جو دنیا میں محنت سے شہرت اور عزت حاصل کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

(۵) میرا ایمان ہے کہ ہمیں لڑکیوں کی موجودہ تربیت، نصاب تعلیم اور تعلیمی معیار کو بالکل بدل ڈالنا چاہئے۔ میری نظروں میں ان کی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے اور قابل رحم ہے۔ انہیں کیا ہوگیا ہے؟ ان کا اصلی کام ان سے چھین گیا ہے۔ انہیں بغیر کسی ذمہ داری کے پرورش کیا جاتا ہے۔ انہیں ایسی تعلیم دی جارہی ہے جیسے ان کے مستقبل سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اگر خوش قسمتی سے کوئی اچھی جگہ بیاہی جائے تو وہ خاوند کے مقبوضات میں ایک بے کار و بے مصرف سامان آرائش تصور ہوتی ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے بارے میں میں دقیانوسی خیال کا آدمی ہوں۔ میں پرانی تربیت کو جدید تربیت پر ترجیح دیتا ہوں۔ میرے خیال میں کالج کا نصاب ایسا ہونا چاہئے کہ جب لڑکیاں بی اے پاس کر لیں تو انہیں اس بات کا پورا پورا احساس ہو کہ عورت اور ماں کا اصلی مفہوم کیا ہے، مرد سے اتحاد و محبت قائم رکھنا کس قدر مشکل ہے۔ اور بچوں کو کامیاب انسان بنانا کتنا مشکل ہے۔

میں عورتوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انہیں مردوں کے معاملات میں کافی غور اور تدبر کے بعد دخل اور شرکت کرنی چاہئے۔ سب سے مقدم اور اہم بات جو ان کو احتیاط سے کرنی چاہئے وہ کتب، فنون اور خصوصاً دوسرے اشخاص میاں بیوی کو مناسب حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی ترقی کی رفتار کا خیال رکھنا چاہئے۔ اور دونوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ان کی حیات مشترکہ ایک ہی منزل مقصود کی طرف چلی جارہی ہے۔

فیروز حسن ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل

جلوہ آرائی نظر

جو ہر نگاہ کے ۔۔۔ ہیں تمام شعبدے

کوہسار، آبشار، جوئبار، لالہ زار ۔۔۔ کائنات حسن کے جلوہ ہائے سحر کار

ان میں دیکھتا ہوں حسن ۔۔۔ دیکھتا رہا ہوں حسن

میں نہ ہوں تو کچھ نہیں میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا ۔۔۔ میں ہوں حسن آفریں

ہیں تمام شعبدے ۔۔۔ جو ہر نگاہ کے

آفتاب، ماہتاب، اور نجوم بے حساب ۔۔۔ حسن کی کتاب کے پارہ ہائے برق تاب

ان میں دیکھتا ہوں حسن ۔۔۔ دیکھتا رہا ہوں حسن

میں ہوں حسن آفریں، میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا ۔۔۔ میں نہ ہوں تو کچھ نہیں

حامد علیخاں

(منتخب)

محبّت

(از ملکہ رومانیہ)

محبّت جیسے لطیف اور موثر جذبہ کو جو دُنیا پر چھایا ہوا ہے الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں صرف اس محبت کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گی جو مرد اور عورت میں پائی جاتی ہے جو بحرِ زندگی میں ملاطم غم و مُسترت پیدا کر دیتی ہے اور جس پر موجودہ زمانے کے ہر ایک افسانے کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔

مذکورۂ بالا "محبّت" سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر وہ محبّت ہے جس کا درس ہمیں مقدس کتاب دیتی ہے۔ "محبّت بے لوث۔ رشک و حسد سے بے نیاز۔ لاف و گزاف اور بُرائی سے مبرّا۔ اُمید افزا۔ صبر و تحمّل کا مخزن ہے"۔ ایسی محبّت کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔ لیکن بجائے اس کے میں ایسی ہنگامہ خیز اور محیر العقول محبّت کا ذکر کروں گی جس کی سحر کاری سے ہر فرد بشر خواہ وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہو مغلوب ہو جاتا ہے۔

ماں کے لئے وہ لمحۂ حیات نہایت المناک ہوتا ہے جب وہ اپنی اولاد کو آتشِ محبّت میں سوزاں دیکھتی ہے۔ اس ثمرِ ممنوع کی جاذبیت اور زندگی کے راز سربستہ کے انکشاف کی جستجو نوجوانوں کے رگ و پے میں موجزن ہوتی ہے۔

محبّت مرد اور عورت میں مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مرد صرف ہوس پرستی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے عورت اپنے محبوب کو اپنا سرتاج، اپنا معبود تصور کرتی ہے۔

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا عنصر محبت ہے اور قدرت نے اِس بارِگراں کے تحمل کے لئے عورت کو منتخب کیا ہے۔ قانون تہذیب، تمدن اس معمہ کو حل نہیں کر سکا۔ عورت کے لئے ازل سے سلاسلِ محبّت میں اسیر ہونا لکھا ہے۔ قُدرت نے اُسے ایک دل دیا ہے اور دل میں ایک تحریک جو اُس کو خود غرضی سے بچاتی ہے۔ وہ اپنے مونسِ حیات کے لئے ہمدردی اور ایثار کے خزانے دل میں پنہاں لئے ہوئے ہے۔ اور کوئی شئے تیرِ محبّت کی ڈھال بنکر اس کو بچا نہیں سکتی۔ وہ خود غرضی سے متنفر ہے۔

وہ مغرور و سرکش عورت جو اس بات کی مُدعی ہے کہ اس نے ہمدردی اور ایثار کو اپنے دل سے نکال دیا ہے۔ یا طوقِ محبّت کو اپنی گردن سے اُتار دیا ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنے آپ کو بے دست و پا پائیگی۔ کسی مرد کی آغوشِ محبت کی جستجو میں سرگرداں ہو گی۔ قدرت نے مردوں کا دل دُخترانِ حوا کے لئے اور صنفِ نازک کے افراد کا دل فرزندانِ آدم کے لئے بنایا ہے۔ اس قانون کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اگر توڑے تو دل بھی ساتھ ہی چکنا چور ہو جاتا ہے۔

ازمنۂ ماضیہ میں جب جہالت و بربریت کا دور دورہ تھا تو عورت کی ہستی ایک لونڈی بلکہ اس سے بھی بدتر تھی۔ موجودہ دورِ تمدن نے اس کی حالت میں تغیر پیدا کیا۔ بعض ممالک میں خصوصاً انگلستان اور امریکہ میں عورت کی قدر و قیمت بے انتہا ہے۔ وہ اب حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کے حقوق اور آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت محبّت کی جنگ میں ہمیشہ شکست خوردہ ہی رہیگی۔ وہ اپنے مونسِ حیات کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ قدرت نے زندگی کو دو حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ نصف حصّہ مرد کو دیا ہے اور نصف عورت کو۔ جب تک یہ دونوں حصے آپس میں نہ ملیں زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔

قدرت نے عورت کے دل میں مرد کی طرح بیوفائی کا مادہ پیدا نہیں کیا وہ بیوفائی کو ایک کمینہ فعل تصور کرتی ہے۔

اگرچہ قرونِ اولیٰ میں عورت پر بے جا اور ناقابلِ برداشت جور و ستم روا رکھے جاتے تھے لیکن اگر آج پھر اس کو اُسی تحت الثریٰ میں دھکیل دیں تو دُنیا کا تمام حُسن کُچلا جائیگا۔

محبت ہمارے حُسنِ انجام کا ذریعہ اور روح کی بالیدگی کا منبع ہے۔ لیکن اس کو ذلیل جذبات سے ملوّث نہ کرو۔

محبّت کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں پنہاں ہے۔ سکوتِ شب میں۔ نورِ سحر، بادِ صبا، پانی کی روانی میں، آبادی و ویرانی میں، دشت و کوہسار میں، طلوع و غروبِ آفتاب میں، رنگ و بو میں۔ غرضیکہ ہر کہ و مہ میں محبت ہی محبّت ہے۔

محبت خوف و ہراس کو دور کرتی ہے۔ بُزدل سے بُزدل انسان کو شیر صفت بنا دیتی ہے۔ محبّت کا ایک حرف گناہگار کو تائب بنانے کے لئے کافی ہے۔ حسرت و مایوسی کو دور کر کے اُمید و کامرانی کے دُرِ بے بہا سے مالا مال کرتی ہے +

علاؤالدین

مرزا کا خواب

خود اپنی زبانی

ترجمہ

آج چاند کی پانچویں ہے۔ میں اپنے آبا و اجداد کے قدیم طرز و طریق کے موافق نہا کر صاف ستھرے کپڑے زیب تن کر کے نماز فجر سے فارغ ہوا۔ اور بغداد کی اُس چھوٹی پہاڑی کی طرف جو شہر سے قریب ایک سنسان مقام پر واقع ہے جانے لگا۔ اور یہ ارادہ کیا کہ باقی دن اُس پہاڑی پر نماز و یاد خدا میں گزاروں۔ تھوڑی دیر میں تیز تیز چلنے کے بعد وہاں پہنچ گیا اور ذرا سی محنت نے مجھے اُس پہاڑی کے ایک پتھر کے سایہ میں بٹھا دیا۔

طلوع سحر کی معرفت خیز تنویر سطح زمین کا عارفانہ سکون اور سرسبز درختوں کی وجدانی کیفیت سے فضائے عالم ایک نورانی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی چڑیاں گانے لگی تھیں۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ اور دنیا خواب سحری کے مزے لے رہی تھی۔ اُس وقت میرے دماغ میں انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے ہوش رُبا تفکرات آنے لگے۔ میں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح بہار کو خزاں، نور کو ظلمت سے واسطہ ہے اسی طرح خوشی کو جانگسل غم سے واسطہ ہے جس طرح شبنم کی مہین بوندوں کو آفتاب کی بے رحم شعاعیں جذب کر لیتی ہیں اُسی طرح عنقا صفت خوشی تاراج غم ہو جاتی ہے۔ اگر ہماری زندگی ایک لمحہ عیش و مسرت میں بسر ہوتی ہے تو گھنٹوں سوز و گداز۔ درد و کرب۔ پریشانی اور مشکلات میں گذرتی ہے۔ دنیا عالمِ آفات ہے۔ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ داستانِ غم کا ایک طولانی دفتر ہے۔ زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے۔ انہیں اجزا کا پریشان ہونا۔ یہ زندگی کیا ہے۔ ایک خواب پریشان ہے ایک سایۂ موہوم ہے۔ ایک موج سراب ہے۔ ایک چشمک برق ہے ایک تبسم شرار ہے۔ غم اور مسرت محض اعتباری چیزیں ہیں۔ اور ان تمام کیفیات و حالات کے علاوہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اور اس کے بعد کیسی زندگی ہمیں ملے گی۔ آخر کار میں انسانی زندگی اور انجام ہستی پر غائر نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ "انسان ایک سایہ کی طرح ہے اور زندگی ایک خواب ہے"

جب میں ان خیالات میں مستغرق تھا تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اور قریب تھا کہ میں بیہوش ہو جاؤں، لیکن ایک بانسری کی آواز نے میری اس ناپائدار زندگی کے خیالات کی زنجیر کو توڑ دیا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میرے پاس اتنے الفاظ نہیں جو میں اُس سریلی آواز کی تعریف کر سکوں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں عجیب مقناطیسی قوت تھی جو میرے آہنی دل کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو گئی اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اس وقت جنت میں پہنچ گیا ہوں اور حوریں بانسری سے میرا استقبال کر رہی ہیں۔

اس آواز کے سنتے ہی میرے مضطرب دل نے بانسری بجانے والے کو ڈھونڈنا شروع کیا اور میری متجسس اور بیباک آنکھوں نے یہ دیکھا کہ ایک شخص مقابل پہاڑی پر بانسری بجانے میں مشغول ہے۔ اب یہ آرزو دل میں پیدا ہوئی کہ اس کے قریب جاؤں۔ چند منٹ کے بعد اُس شخص کے ہاتھ کی حرکت نے میرے اس خیالی پیرایہ کو عملی جامہ پہنا دیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب گیا۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر ادب سے جھک گیا۔ اُس شخص کی نازک انگلیوں نے کچھ اشارہ کیا اور میں بلا قصد اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں آئینہ تھا وہ تصویر۔ دونوں ساکت تھے۔

زبانیں بند تھیں۔ لبوں پر قفل تھے۔ میں اپنی ہستی کا ایک موہوم عکس تھا وہ جوہر حیات۔ ہم دونوں گوہر و آب گوہر کی طرح ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں چپکے چپکے اُس کے سراپا کی سیر کر رہی تھیں۔

آخر کار تھوڑی دیر بعد وہ مسکرایا اور میرے دل میں امید و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ خوف و ہراس جو میرے دل پر قبضہ کئے ہوئے تھا

جاتا رہتا۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے مجھ سے بغلگیر ہو کر کہا۔

شخص:۔ مرزا میں نے تمہیں اس پہاڑی پر اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور تمہارے چہرہ پر غم کے آثار پاتا ہوں۔ اچھا تم میرے پیچھے آؤ۔

پھر وہ مجھے اس پہاڑی کی چوٹی پر لے گیا۔ اور ہم دونوں میں حسب ذیل مکالمہ شروع ہوا۔

شخص:۔ "مرزا تم مشرقی جانب غور سے دیکھو اور جو کچھ دیکھو گے مجھ سے بیان کرو"

میں نے اس کے حکم کے موافق اپنی آنکھیں شرقی جانب پھیر لیں۔ اور دیکھا کہ ایک گہرا درہ میرے سامنے ہے۔ اس درہ میں زور و شور سے ایک خوفناک نہر بہہ رہی ہے۔ لیکن وہ نہر اپنے ابتدا و انتہا پر ایک گہرے اور سیاہ ابر میں چھپی ہوئی تھی اور یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ نہر کہاں سے نکلی ہے اور کہاں جاکر ختم ہوگی۔ علاوہ ازیں میں یہ دیکھکر متعجب ہوا کہ اس نہر پر درمیانی حصے میں ایک پل بھی بنا ہوا ہے اور بہت سے لوگ اس پل پر سے گذر رہے ہیں۔

جب میں یہ خلاف امید منظر اپنے روبرو دیکھا تو عالم سکوت میں بت بنکر رہ گیا لیکن جرأت سے کام لیکر اس شخص سے اس کے متعلق استفسار کیا۔

شخص:۔ "مرزا وہ درہ جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو آفات و مشکلات عالم کا درہ ہے۔ اور وہ نہر جو بہنے میں مصروف ہے ازل کے بڑے سمندر کی ایک شاخ ہے۔ اور ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ازل کہاں سے اور کب شروع ہوا اور ابد کب آئے گا۔ اسلئے وہ نہر اپنے ابتدا اور انتہا میں چھپی ہوئی ہے اور وہ پل جو تمہیں نظر آرہا ہے انسانی زندگی ہے"

میں نے بہ طریق سابق پھر دیکھنا شروع کیا اور یہ معلوم کیا کہ اس پل کے سو کمانیں تھیں اور آخیر کی تیس کمانیں ٹوٹی ہوئی اور ابتر حالت میں تھیں لیکن ابتدائی ستر کمانیں اچھی حالت میں مستحکم نظر آرہی تھیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے یہ دیکھا کہ بہت سے لوگ جو اس پل پر سے گذر رہے تھے دفعتاً خلاف امید اس نہر میں جو زیر پل بہہ رہی تھی گر رہے ہیں

میں نے اور غور سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم کیا کہ بہت سے دروازے اس پل پر ہیں جو چوہوں کے پنجروں کے دروازوں کی طرح (کسی کا پاؤں پڑنے سے کھل جاتے اور پھر بند) ہو جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جو ان دروازوں پر بلا علم پاؤں رکھنے کی وجہ سے گر جاتا ہے فوراً پانی کی خوفناک موجوں میں غائب ہو جاتا ہے وہ دروازے ابتدائے پل میں زیادہ مقدار میں اور انتہائے پل کی طرف کم تھے اس لئے لوگ پل کے ابتدائی حصہ میں زیادہ نذر نہر ہوتے تھے اور جو خوش قسمتی سے بچکر آگے نکل جاتے تو بہت جلد غرقاب نہر نہ ہوتے لیکن میں یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا کہ لوگ اچھی طرح نہیں چل سکتے تھے۔ اور ان بوسیدہ آخری تیس کمانوں پر نہایت تکلیف اور مصیبت سے اپنا سفر ختم کرتے ہوئے چند کمان طے کرنے کے بعد نہر میں گر جاتے اور غائب ہو جاتے۔

میں نے اس منظر کو دیکھنے کے لئے اپنا تھوڑا سا وقت صرف کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کی اوسط زندگی سو برس سے زائد نہیں ہے اور بھی مشکلات دنیا سے لبریز ہے اور ہر وقت موت کا ڈر لگا ہوا ہے خصوصاً انسان کے آخری تیس برس نہایت تکلیف سے بسر ہوتے ہیں۔ انسان ابتدائی عمر میں زیادہ موت کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ الحاصل میں انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے سین کو دیکھکر بہت غمگین ہوا اور چاہا کہ اپنی جان بھی ان لوگوں کے ساتھ دیدوں لیکن اس شخص نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا۔

شخص:۔ "مرزا تم متفکر نہ ہو اور بیان کرو کہ اور کیا دیکھ رہے ہو"

میں نے پھر دیکھنا شروع کیا اور حیران ہوا کہ چند لوگ بلبلوں اور چمکدار چیزوں کے پکڑنے میں مشغول ہیں جو ان کے سامنے چمکتے اور انہیں اپنا گرویدہ بنا رہے ہیں لیکن افسوس کہ وہ لوگ انکے پکڑنے میں ناکام رہتے۔ اور دفعتاً نہر میں گر کر غائب ہو جاتے تھے علاوہ ازیں میں نے دیکھا کہ قسم قسم کے پرندے اس پل پر اڑ رہے ہیں اور وہ پل کے درمیانی حصہ میں زیادہ ہیں۔ میں اس منظر کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور اپنے صبر کو شکستہ قوت کو مضمحل اور علم کو قاصر پاکر اس شخص سے دریافت کیا۔

شخص:۔ "مرزا یہ بلبلے اور چمکدار چیزیں دنیا کی دولت۔ عزت۔ نیکنامی اور اعلیٰ خیالات ہیں جس کو ہر شخص حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ چیزیں کسی سے وفا نہیں کرتیں اور ہر شخص انکو حاصل کرنے سے پہلے موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ پرندے محبت۔ حسد۔ ناامیدی اور بے وفائی بھی جو انسان کی زندگی تلخ بنانے میں کافی مہارت رکھتے ہیں اور یہ خیالات عموماً عالم شباب میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں"

میں نے یہ حالات دیکھکر اور ان کے نتائج دیدۂ تحقیق سے مشاہدہ کر کے ایک آہ سرد کھینچی اور خیال کیا انسان کی زندگی کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ غم و آفت کے ملک میں پیدا ہوا اور موت کے دریا

میں ڈوب مرے۔"

اس شخص نے مجھے متفکر اور غمگین دیکھکر کہا۔

شخص:۔ "مرزا تم اس جانب اب نہ دیکھو اور اپنا رخ بدل کر یہ دیکھو کہ وہ نہر اُن مردہ لوگوں کو کہاں لیجا رہی ہے۔" میں نے فوراً اپنا رخ بدل دیا اور دیکھا کہ وہ نہر اُن مردہ لوگوں کو ایک خوشنما ملک میں لیجا رہی ہے اور اسی نہر کی ایک شاخ چند لوگوں کو دوسرے ملک میں لیجا رہی ہے جو گہرے اور سیاہ ابر میں چھپا ہوا ہے۔ میں دوسری جگہ کی حالت بیان کرنے میں مجبور ہوں کیونکہ میں خود بادل کی سیاہی کی وجہ نہیں دیکھ سکا لیکن وہ ملک جو مجھے نظر آرہا تھا نہایت خوبصورت اور ہر طرح سے آراستہ تھا۔ غالباً ایسی آرام دہ اور خوشنما جگہ کسی انسانی تخیل میں بھی نہیں آئی ہوگی۔

میری آنکھیں اس جلوۂ بے حجاب کی طرف اٹھ کر پھر واپس نہ لوٹ سکیں اور نگاہیں حیرت اور استعجاب کے عالم میں یکبارگی اُس عالم فریب نظارہ میں پہنچ گئیں۔ اس مقام میں خوبصورت اور بڑی بڑی شاندار عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن پر ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھر جمائے گئے تھے۔ اور دودھ اور شہد کی نہریں چو طرف بہہ رہی تھیں وہ لوگ جو اس ملک میں داخل ہوئے تھے نہایت امن وچین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ الغرض میں ان خوش انسانوں کی ہر نقل وحرکت کو بیتابانہ دیکھنے لگا اور میری نگاہوں میں اُس وقت قدرت کی اُس دل لبھانے والی مخلوق کو حیرت اور قدر کے احساسات کے ساتھ دیکھنے کے سوا اور کوئی جذبہ مطلق نہ تھا میں اُس پرندے کی طرح مسحور ہو رہا تھا جو سانپ کی جلد کی رنگ آفرینیوں پر مست ہو کر خود بخود اُس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اور اُس کے دہنِ گرسنہ کا تر نوالہ بن جاتا ہے۔ الحاصل میں نے اس شخص سے کیفیت دلی کا اظہار کیا۔

شخص:۔ مرزا اگر تم اُس جگہ جانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ وہی پل کے دروازے ہیں جو تم پہلے دیکھ چکے ہو۔ خیر اس کی فکر چھوڑ دو۔ مرزا یہ مقام جو تمہارے سامنے اسقدر سرسبز اور شاداب اور فرحت افزا نظر آرہا ہے اُن لوگوں کا مسکن ہے جنہوں نے دنیا میں اپنی زندگی نیک بنائی اور پاکیزہ ومبارک زندگی اللہ کے سامنے پیش کی ہے دنیا والے اس کو جنت کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔ مرزا اگرچہ ہماری زندگی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت معلوم ہوتی ہے اور ہم طرح طرح کی مشکلات اپنی زندگی میں دیکھتے ہیں لیکن اس کا بہتر بدلہ اور اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی فانی کو رنگین اور نیک عمل سے منور بنا دے تو اس کا حاصل بھی نیک اور دلپسند ہوگا۔ زندگی ہستی اگر مفاد منفعت چاشنی اور لذت کے دلآویز جام سے عریاں ہوتی تو آج عالم کے اٹھتے ہوئے شباب میں ارتقاء تمدن کے دور میں اصحاب فکر کے دلوں میں گدگدی نہ پیدا کرتی۔ مرزا تم آئندہ یہ خیال نہ کرو کہ "انسان ایک سایہ کی طرح ہے اور زندگی ایک خواب ہے۔"

میں اس کی دلچسپ اور سبق آموز نصیحت سنکر بہت خوش ہوا۔ آخر ایک لمحہ کے بعد اس شخص سے دریافت کیا کہ کیا آپ مجھے یہ بتلائیں گے کہ اس دلفریب مقام کے نصف حصہ کا سین جو سیاہ ابر میں چھپا ہوا ہے کیا ہے اور وہاں لوگ کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن عین اس لمحہ میں جبکہ یہ مشاہداتِ عینی جوش مسرت سے میرے خون میں سیمابی کیفیت پیدا کر رہے تھے دفعتاً گردش تقدیر کا ایک سرد جھونکا آیا۔ کیونکہ جواب نہ ملنے پر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو اُس شخص کو وہاں سے غائب پایا جہاں پہلے انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے متعلق غور کر رہا تھا۔

میرا دل غیر معمولی طور پر بھرا ہوا تھا۔ اور آنسو تھے کہ بے قابو ہو کر آنکھوں میں بھرے چلے آتے تھے۔ سکوت اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنے کانوں سے دل کی حرکت معلوم کرنے والا ڈاکٹری آلہ لگائے خود اپنے دل کی جنبش پیہم کو جو معمول سے زیادہ تیز تھی سن رہا ہوں مگر دفعتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر اس کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن میں خود ہی اس کا جواب دے دیکر خاموش ہو گیا کہ یہ ایک خواب تھا جو مجھے اپنی زندگی بیکار نہ سمجھنے اور اس کو نیک عمل سے مزین کرنے کیلئے سبق دے گیا۔

(ترجمہ) از اڈیسن

احمد عبدالعزیز

کوئی شہر

بہارِ ناز کی محفل وہیں ہے فروغِ حسن کی منزل وہیں ہے
اگرچہ میں یہاں ہوں دل وہیں ہے

وہ دنیا ہے محبّت خیز دنیا وفا کے نور سے لبریز دنیا
ہوس افسانۂ باطل وہیں ہے

وہاں ایسے بھی ہیں کچھ ماہ پارے کہ شرما جائیں جن سے چاند تارے
زمیں میں آسماں شامل وہیں ہے

وہاں پھولوں میں لرزاں ہے تمنّا وہاں ذرّوں میں رقصاں ہے تمنّا
سکونِ جان و دل مشکل وہیں ہے

وہاں ہے اک نگارِ حور پیکر نگارِ حور پیکر نورِ پیکر
نیازِ عشق کا حاصل وہیں ہے

جنونِ عشق کو رسوا کرونگا ؎ جیا تو میں وہاں جا کر مرونگا ؎
کہ میری ناؤ کا ساحل وہیں ہے

(غیر مطبوعہ)

عابد

قرطبہ

بہارِ خلد سے رنگیں تھا گلستاں تیرا
غلام احمدِ مرسل تھا باغباں تیرا

جلالِ ملّتِ بیضا تھی بارگاہ تری!
سجودگاہِ ملائک تھا آستاں تیرا!

فرشتے وادیِ انوار تجھکو کہتے تھے!
ہر ایک ذرہ تھا خورشید آسماں تیرا

وہ صبحِ گلکدۂ وادیِ الکبیر کہاں؟
کہ جس کے عکس میں منظر تھا زرفشاں تیرا

شرابِ نور تری خاک سے اُبلتی تھی
بہارِ خلد تری گود میں مچلتی تھی

(۲)

وہ گلستانِ رصافہ حدیقۂ اُمَوی
کہ جس کو خُلد میں کہتے تھے جنّتِ ارضی

وہ جس کا جلوۂ محبوب زینتِ فردوس
وہ جس کا منظرِ معصوم خلدِ نگینی

وہ آبشار وہ فوّارۂ گُہر افشاں
وہ اُن کے عکس میں شمس و قمر کی جلوہ گری

وہ بلبلانِ خوش الحان وہ نغمہ ریز طیور
زباں پہ جن کی درودِ محمدِ عربی

نسیم قدس کے جھونکے جدھر کو بڑھتے تھے
چٹک کے غنچے دعائے خلیل پڑھتے تھے!

(۳)

وہ جلوہ گاہِ خلافت مدینۃ الزہرا
کہ جس میں شمعِ محبت تھی انجمن آرا!

وہ در کہ جس کی بھکاری تھی عظمتِ مغرب
وہ قصرِ مطلعِ انوارِ مشرقِ عظمےٰ!۔

حریفِ عرش ہے اس بارگاہ کی عظمت
غلامِ احمدِ مختار ہو مکیں جس کا!۔

فرشتے اُس کی زیارت کو مائلِ تنزیل
بہشت اس کے مناظر کے سامنے دھُندلا!

جلالِ ناصرِ اعظم کا جلوۂ رنگیں
ربابِ الفتِ زہرا کا نغمۂ رنگیں

(۴)

وہ بارگاہِ خداوند جامع اعظم — جبینِ عظمتِ کونین جس کے در پر خم

وہ جس کے ذرّوں میں نقشِ سجودِ لا داخل — خضوعِ قرأتِ منصور جس میں ہے مدغم

وہ درسگاہِ مقدس وہ چشمۂ عرفان — اٹھایا جس نے نقابِ رموزِ کیف و کم

الہیات کی تبلیغ جس نے دہر میں کی — علومِ قدس سے معمور کر دیا عالم

وہ جس کی خاک وقارِ جبینِ ابن رشد — وہ جس کا بوریۂ خشک تاجِ ابن حزم

فرانس اٹلی و جرمن تھے خوشہ چیں جس کے — سٹلوسٹر بھی ہوا جس کا گوشہ گیر کرم

رہی نہ ظلمتِ تثلیث شرک گاہوں میں
جلائی شمعِ حرم اس نے خانقاہوں میں

(۵)

اگرچہ آج وہ اقبال و احتشام نہیں — وہ نورِ صبح نہیں وہ سوادِ شام نہیں

تھی جس کے در پہ فتادہ سیاستِ مغرب — اگرچہ آج وہ اسلام کا نظام نہیں!

دیارِ قدس ہے اُن وحشیوں کے زیرِ قدم — کہ جن کے دل میں خدا کا بھی احترام نہیں

نہ کیوں ہو مادرِ تثلیث خندہ زن تجھ پر — کہ لا الٰہ کی شمشیر بے نیام نہیں!

مگر ملال نہ کر اے مدینۃ الاسلام — کہ ظلم کو کبھی حاصل ہوا قیام نہیں

بلند نعرۂ تکبیر ہونے والا ہے — بعید از کرمِ خالقِ انام نہیں

در خدا اسے ہیں بامراد ہونا ہے
بالآخر تجھے اُمّ البلاد ہونا ہے

(غیر مطبوعہ)

روش صدیقی

رباعی

ایسا نہ ہو عشق دل کو رنجور کرے — برباد مجھے شعلۂ مستور کرے!

دے جام شرابِ آتشیں اے ساقی — ممکن ہے کہ زہر زہر کو دور کرے!

انتقاد

دنیا کے بہترین افسانے

مؤلفہ و مترجم۔ منصور احمد ایڈیٹر ہمایوں

مقام اشاعت۔ اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۱ لاہور۔
طباعت و کتابت دیدہ زیب اور دلفریب۔
ضخامت ۳۲۰ صفحے قیمت بلا جلد ۲ روپیہ۔ مجلد دو روپے بارہ آنے

معزز معاصر اردو نے ادب اردو کے دور حاضرہ کو بالکل بجا طور پر دورِ تراجم کا لقب دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو اہل ذوق دوسری زبانوں کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں ان کی سعی رائیگاں نہ جائیگی۔

تراجم صحیح ذوق ادبی کے لئے مناسب فضا پیدا کرتے ہیں اور دوسری زبانوں کے مستند مصنفین کے انداز تحریر و رنگ تخیل کے امتزاج سے زبان میں جو وسعت اور لطافت پیدا ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے

مسٹر منصور احمد عرصے سے دوسری زبان کے افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اُنکی کوششیں بہت بڑی حد تک مشکور ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے بہترین افسانوں کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں۔ ادب میں انفرادی ذوق کو ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ اور عام طور پر انتخاب "بہترین" ہونے کے بجائے مصنف کے احساسات و خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور بس۔

تاہم فاضل مولف نے کوشش کی ہے کہ افسانوں کا معیاری مرتبہ قائم رہے، اور صرف انہیں افسانوں کا انتخاب کیا ہے جنمیں کوئی امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

ترجمہ شستہ اور صاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں وہی شان تخیل اور طرز بیان باقی رہے جو اصل افسانے میں موجود ہے۔ یوں تو اُنکی یہ کامیاب کوشش ہر افسانے کے الفاظ سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے مگر بعض افسانوں میں تو ان کی کامیابی اسقدر روشن اور نمایاں ہے کہ اسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔

"ذرات مضطرب"، میں طوفان کا جوش دیکھئے۔

تاریک جنگل اور ندی کا تاریک پانی ہولناک امید و بیم میں ساکن پڑا تھا۔ یکایک زمین، پانی اور آسمان کانپ گیا۔ اور ایک تیز و تند طوفانی جھونکا دور بے راہ جنگلوں میں سے شور مچاتا ہوا اور اپنے برق پاش دانت نکالتا ہوا لپکا۔ محل کے خالی دروازے درد و کرب میں کراہنے لگے"۔
نظامی گنجوی کی ہیبتناک اور شاندار تشبیہات یاد آجاتی ہیں"۔

تمام کتاب میں ۳۲ افسانے ہیں جنہیں ایران اور عرب کے افسانے شامل نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

یوں تو تمام افسانے اچھے ہیں۔ مگر "جھوٹ" "ذرات مضطرب" "بھول"، "ایک خط اور ایک پارہ" "چھلاوہ" "خزاں کی ایک رات" "دولت یا محبت"، مجھے بہت پسند آئے۔

جھوٹ ایک چنگاری تھی جس نے میرے جذبات و احساسات میں ایک آگ سی لگادی۔

دو نامراد روحوں نے عشق کے رشک اور حسن کی سرد مہری پر ایک قصر محبت تعمیر کرنا چاہا تھا مگر جھوٹ کے ناگ نے تمام فضا کو زہریلا کر دیا۔

عشق نے حقیقت کی تلاش میں حسن کے فریب کو بھی ہاتھ سے کھویا اور حسن اظہار محبت کے باوجود عشق کو رام کرنے میں ناکام رہا۔

اس افسانے پر وحشت و ہیبت کا ایک جانگزا اثر چھایا ہوا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا ہر لفظ ایک زہریلا بچھو ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ڈنک مار رہا ہے۔

مخزن کے دور جدید میں (حضرت بیدل کی ادارت میں) پطرس کے قلم سے ایک افسانہ "عشق کی خودکشی"، کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کا پلاٹ اور انداز تحریر "جھوٹ" سے ملتا جلتا تھا۔ مگر ایشیائی ماحول نے اس افسانے کو بہت دلفریب بنا دیا تھا۔ جن حضرات کو میری طرح اس قسم کے افسانے پڑھنے کا شوق ہے وہ "عشق کی خودکشی" ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

"ذرات مضطرب"، ایک خواب تخیل ہے جو ٹیگور نے شباب کی

بہار آفرین رات میں دیکھا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس افسانے میں مصنف خود اپنے تخیل کی فریب کاری پر ہنس رہا ہے یا پڑھنے والوں پر!

"خزاں کی ایک رات" اور "پھول" بیحد دلکش افسانے ہیں "پھول" تو اس قسم کی چیز ہے کہ انسان کئی بار پڑھنے کے بعد بھی سیر نہ ہو۔ طرز بیان میں حسن و جمال کے پہلو دیکھئے۔ محبوبہ نے کچھ گلابی اور کاسنی پھول بھیجے ہیں۔ ان کے متعلق مصنف لکھتا ہے۔

"مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری ذراسی بے احتیاطی بھی انہیں زخمی کردے گی۔ جیسے ابھی انکی روحیں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگینگی۔ بے حاصل آرزو کا ایک بادل سا درد بنکر ان پر سے اٹھتا ہے اور مجھ پر چھا جاتا ہے۔"

الفاظ اور تخیل کے درمیان کسقدر نغمہ آفرین رابطہ ہے۔ الفاظ صرف دردناک طور پر سریلے ہی نہیں۔ بلکہ ان میں باہم ایک خاص تناسب اور تطابق ہے۔

میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں کہ عرب اور ایران کے افسانے "خالد اور حمیدہ"، "موتیوں کا سوداگر"، ہرگز اس قابل نہ تھے کہ اس مجموعے میں جگہ پاتے۔ ان کے علاوہ "اوبیڈا" اور "ولیم لے کیو" کے افسانوں کو "دنیا کے بہترین افسانوں" میں شامل کرنا میری نظر میں ایک گناہ عظیم سے کم نہیں ہے۔ لے گیوان افسانوں کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے جن کو عرف میں "سنسنی خیز" کہا جاتا ہے اور وہ بھی بہت ادنیٰ درجے کے افسانے "لالۂ صحرا" میں بھی وہ میلوڈراما کا سا پہلو شامل ہے۔ جو اس کے ہر ایک ناول میں پایا جاتا ہے میلوڈراما کے عناصر افسانے کے اجزائے ترکیبی سے متضاد نہیں ہیں۔ لیکن لے گیوان سے وہ کام نہیں لے سکتا جو کانن ڈائل لے سکتا ہے۔

بہر نوع اس کتاب میں اتنی دلچسپیاں موجود ہیں کہ تمام اردو داں حضرات کو اس کا ایک نسخہ خریدنا چاہیئے۔

اگر دو روپے صرف کرکے کچھ عرصے کے لئے آدمی ہجوم افکار سے نجات پاسکے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اپنا روپیہ بیجا صرف نہیں کیا۔ اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کے بعض حصے ناظرین کو کچھ عرصے کے لئے دنیا کے تمام تفکرات سے رہائی دلادیں گے۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے
"حافظ"

عابد

دنیائے ادب

آرٹ اور ڈرامہ

آرٹ کی تعریف

قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کردی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ دو مختلف معانی پر حاوی ہے۔

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیاء اور ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں۔ یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن پیدا ہوجاتا ہے اور وہ مشاہدہ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس وقت قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ

دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا۔ بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کردے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب اخلاق یا علم وحکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجئے۔ اُس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈتے ہیں اور جن سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے۔ جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا مشاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موضوع انسان کی زندگی اُس کے جذبات، اُس کے خیالات، اُس کی آرزوئیں اور اس کے کام ہوتے ہیں۔ بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ نہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہوجاتا ہے

جیسے سمندر میں کنگری پھینکنے سے لہروں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آنا آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈراما میں ہوتا ہے۔

ڈراما بہ حیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے

ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مصدر　　　ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنعت کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کر کے دکھائے جا سکیں۔ ڈراما میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر ان کی گفتگو اور اُن کے کاموں کو دہرائیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنعت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیئلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگزشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کی جذبات، ان کے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض انکی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جا سکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو۔ ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دئے جائیں اس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے مگر ڈراما میں قصے کا زمانۂ وقوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا سکتے ہیں مگر ڈراما میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانا پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول کے ڈراما میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈراما لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے۔ اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلا کو آسانی سے پُر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کیلئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل انہیں دونوں چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، اُن کے جذبات و خیالات، اُن کے اغراض و مقاصد، اُنکے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش انکی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً متوجہ کر لیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو اُن کا ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اس کے عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کے لئے ابھی ایک شرط باقی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے

جامعہ

عربی

جرأت

پیٹھ دکھانے سے تو پا بہ زنجیر ہوجانا ہی بہتر ہے۔ مگر یہ قید و بند سے بھی بہتر ہے۔ کہ انسان جان دیدے۔ کیوں؟ ــــ اس لئے کہ میرے نزدیک وہ زندگی بہت ہی ڈراؤنی ہے جو ذلت، اور رسوائی تک پہنچادے۔

مَیں نے زمین سے پوچھا۔ "تو دنیا بھر کی مسجدہ گاہ، اور ناپاک کی ستھرائی کیوں کر بنی؟"

اس نے کہا ــــ "اس لئے کہ میرے سینے میں لوگوں کے جگر پارے برا ج رہے ہیں۔"

جس طرح تم ہر شخص کو اپنا دوست نہیں بنانا چاہتے۔ ہر شخص سے دشمنی بھی نہ برتو۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ کہ دوستوں کی طرح، دشمن بھی منتخب کئے جائیں۔ کیوں؟ ــــ اس لئے کہ دراصل دشمن بھی دوست ہے۔ صرف طریقہ، اور روش بدلی ہوئی ہے۔

اگر مجھ سے کہا جائے "زمانہ کے حوادث سے امن و امان تلاش کرلے" تو مَیں صرف عزیزوں سے کنارہ کرلونگا۔

بڑھاپے کے باعث رنجیدہ اور ملول ہونا کیسا؟ یہ راستی سے منہ موڑنا ہے۔ ــــ اگر دنیا میں وفاداری کا پاس ضروری ہے تو، نادان! بڑھاپا جوانی سے زائد وفادار ہے۔

مجھے اس سے محبت ہے۔ جسکو چودھویں رات کا چاند بھی سجدے کرتا ہے۔ آہ۔ اس کی روشن پیشانی پر، خاک کا نشان صاف نظر آرہا ہے۔

تم اور تمہارے اسلاف

دوست کی طبیعت میں نقصان اور قصور پاکر روٹھ جانا مناسب نہیں۔ عیب سے پاک، اور ہمہ تن مکمل تو چودھویں کا چاند بھی نہیں ہے۔

جب کسی کو ذلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے کو شرافت اور بزرگی نصیب ہوتی ہے۔ آفتاب کا ہبوط کیواں کا شرف ہے۔

جو شخص معاصرین کو تو ہیچ اور نا اہل سمجھتا ہو۔ مگر پچھلوں کا گیت گاتا ہو۔ اس سے کہدو کہ قدیم بھی، کبھی نیا شمار ہوتا تھا۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد، یہ جدید بھی، قدما کی صف میں جگہ پالے گا۔

(ابن رشیق)

خانزادہ امتیاز عرشی

سنسکرت

قدرت کی ستم ظریفیاں

انسان سے اس کی محبوب چیزیں چھین لی جاتی ہیں۔ غم کے بعد مسرت۔ مسرت کے بعد غم۔ دُنیا کا اٹل قانون ہے۔ طبیب بھی بیمار ہوتے ہیں۔ ان کی دانشمندی انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہے۔

غریبوں کے گھر اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔ اور امیر اس نعمت کو [illegible] سے [illegible] ترستے ہیں۔ قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔

امیر نوجوان [illegible] وفات پا جاتا ہے۔

غریب دُکھ اور درد برداشت کرنے کے باوجود بھی سو سال کی عمر تک زندہ رہتا ہے۔ فطرت کے بحرنا پیدا کنار میں انسان ایک دوسرے سے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح لکڑی کے شہتیر

بیوی بچے، دوست و احباب تمام راہ گیر ہیں۔ ہم ان سے صرف اس لئے ملتے ہیں کہ ان کی جُدائی کے دُکھ سہیں۔

گجراتی

ایک زمانہ تھا کہ گلستانِ حیات بارونق تھا۔ مملکتِ حیات پر خوشی و خرمی کا راج تھا۔ دوستوں کے قہقہے تھے۔ یاروں کی محفل آرائیاں تھیں۔ دن عید اور راتیں شب برات تھیں دوست کیا تھے بھائی تھے۔ ہر ایک دوسرے سے زیادہ جاں نثار تھا۔ ہر طرف میری شہرت تھی۔ دنیا میں میرا ہی طوطی بولتا تھا۔ میرے اردگرد کی گھڑیاں بھی سنہری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر آہ! وہ زمانہ محض ایک خواب و خیال ہو کر رہ گیا اب میں ہوں اور زمانے کے مصائب۔ کتاب ہستی کے زرنگار صفحے کا محض مدہم سا ایک نقش ہوں۔ تکالیف بڑی حد تک میرا ناس کر چکی ہیں۔ میری شان و شوکت محض ایک افسانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری عزت کا خون ہو چکا ہے۔ میری آرزوئیں برباد ہو چکی ہیں۔ اور اب میں بجز اس کے کچھ نہیں رہ گیا ہوں کہ بحر ہستی میں خس و خاشاک کی طرح بہا چلا جا رہا ہوں۔

لیکن کوئی میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

میری جیب خالی ہو چکی ہے۔ میرا سرمایۂ حیات دوستوں کی نذر ہو چکا ہے۔ اس بدحالی سے تنگ آ کر اُس پچھلے دور کو جب یاد کرتا ہوں۔ تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ حیف! وہ خلوص و محبت کے دعوے دار محض خون چوس کر الگ ہو جانے والے ثابت ہوئے۔ فلاکت نے دنیا ایسی تاریک کر دی ہے۔ کہ سورج کی کرنیں بھی ہمیں مدہم معلوم ہوتی ہیں۔ اب کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا صرف اور صرف خود غرضوں کی ایک جولاں گاہ ہے۔ اور بس۔

. . . .

. . . .

بنگالی

شامِ نشاط

مجھے وہ شام اب تک یاد ہے۔

نیلے نیلے آکاش پر تارے روشن تھے جس طرح مندر میں چراغ جل رہے ہوں۔

میرا دل بھی چراغ کی طرح فروزاں تھا۔ غم کی ہواؤں کے جھونکے اُس شمع کو کس طرح بجھاتے جو تیرے عشق نے روشن کی تھی۔

تیرے گلے میں موتیوں کا ایک ہار تاروں کی درخشانی سے چشمک زنی کر رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ موتی ہیں۔ کسی ستم رسیدہ کے آنسو جم کر رہ گئے ہیں۔ تو نے پیاری! ان موتیوں کو چھو کر ان میں آب و تاب پیدا کر دی تھی!

چینی

وطن کی طرف

میں وطن کی طرف جا رہا ہوں! میرے کھیت، میرے باغ برباد ہو گئے ہیں۔ کیا میں واپس ہو جاؤں وطن کا خیال بھلا دوں؟ نہیں! میں ماضی کو بھول جاؤں گا۔ اور اپنی نظر میں صرف مستقبل پر رکھوں گا۔

میری کشتی ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ رواں ہے۔ سبک باوقار میرے کپڑے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ کیوں سورج طلوع

نہیں ہوتا؟ کیوں روشنی دُنیا کو مُنوّر نہیں کرتی؟
اب مجھے اپنا گھر نظر آرہا ہے۔
میرا دل مسرّت کے وفور سے پھٹ جائیگا۔

ویون

ہندی

موت

کہتے ہیں نیند موت کی بہن ہے۔
مجھ سے دونوں بہنیں روٹھ گئی ہیں۔
جس دن سے میرا محبوب مجھ سے جُدا ہوا ہے اُس دن سے نیند نے آنے کی قسم کھالی ہے۔
نیند ہی نہیں مجھے موت بھی نہیں آتی۔
کبھی کبھی رات کو تاریکی میں مجھے کسی کی ہنسی کی آواز سُنائی دیتی ہے۔
میں جانتی ہوں یہ ہنسی کیسی ہے۔
نیند اور موت میری پریشانی پر میرے اضطراب پر ہنس رہی ہیں!

مرہٹی

اے بچّے!

اے بچّے! تیری معصومیت پر مجھے رشک آتا ہے۔ تو مُسکراتا ہے تو میرے دل میں ایک نشتر سا پیوست ہو جاتا ہے۔ میری نظر کے سامنے اپنی گناہ آلود زندگی کے تمام منظر آجاتے ہیں۔ اے بچّے!

جاپانی

خوبصورت اور بدصورت گھر

ایک وہ گھر ہے جس کی تعمیر پر بے انتہا روپیہ صرف ہوا ہے۔ جس میں قیمتی سامان آرائش موجود ہے۔ صنّاع اور معمار نے اپنی چابکدستی کا کمال دکھا دیا ہے۔ باغ کے درختوں کو چھانٹ چھانٹ کے ان میں مصنوعی حُسن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے گھر میں نہ حُسن ہے نہ دلفریبی۔ نہ سکون ہے نہ اطمینان!

ایک اور قسم کا گھر بھی ہے۔

اس گھر کی تعمیر میں فیشن کا کوئی حصّہ نہیں۔ سامان آرائش سادہ مگر نفیس ہے۔ ہر شے کی ترتیب سے ذوقِ سلیم کی لطافت کا اظہار ہوتا ہے۔ خودرو سبزہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ درخت اپنی فطرتی دلکشی سے مزیّن ہیں۔ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی نور فشاں ہے۔

یہاں سکون ہے اطمینان ہے۔ اس جگہ روح دُنیا کی کشاکشوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔

فرانسیسی

خدا کی قدرت

انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ارد گرد کی چیزوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دے۔ اگر وہ خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو ذرا فطرت کے مناظر کی طرف دیکھے۔ ذرا اس خیرہ کن ٹکیا پر غور کرے جو تمام دنیا کو روشن کر دیتی ہے۔ وہ چراغ فروزاں وہ آفتاب درخشاں جو نیلے رنگ کے آسمان سے لٹکا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ روح فطرت کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ ہم فطرت کی وہابت و عظمت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری زمین باقی کرّوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ کائنات ایک عظیم الشان دائرہ ہے جس کا مرکز ہر ایک جگہ پایا جاتا ہے اور جس کے محیط کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان چیزوں کا خیال کرتے ہوئے ہمارا تخیل کھو سا جاتا ہے۔

بلیز پاسکل

اطالوی

قسمت

میں جانتا ہوں کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کے کام انسان کی تدبیروں پر منحصر ہیں۔ ہر واقعہ اندھی قسمت کا نتیجہ ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال میں سعی لاحاصل ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بیکار بیٹھ رہیں۔ اور دنیا کے کاموں کو تقدیر پر چھوڑ دیں قسمت کی ہمہ گیری اور اس کے اٹل قوانین کی تائید ان انقلابات سے بھی ہوتی ہے جو اکثر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ قسمت ہماری نصف زندگی پر حاوی ہے۔ باقی نصف زندگی کے اعمال تمام تر ہمارے اختیار میں ہیں۔

قسمت ایک سیلاب پرور دریا کی طرح ہے۔ جب اس دریا میں طوفان برپا ہو جاتا ہے اس وقت کوئی چیز اس بے پناہ قوت کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ مگر سکون کی حالت میں اس دریا کے کنارے بند باندھے جا سکتے ہیں۔ تاکہ سیلاب کے وقت اس کا پانی کسی خاص سمت بہ جائے اور جان و مال کو نقصان نہ پہنچائے۔

نکولو

ہسپانوی

ذوق سلیم

ذہن کی طرح ذوق سلیم بھی ارتقا پاتا ہے۔ صحیح علم آرزو کو جلا دیتا ہے اور لطف میں اضافہ کرتا ہے۔ لوگ اپنے ذوق سلیم کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ جس کا ارتقا یافتہ ہوگا اس کی آرزوئیں بھی لطیف و نفیس ہونگیں۔ ایسے شخص کے سامنے دلیر سے دلیر آدمی کانپ جاتا ہے۔ اس کا فیصلہ ناطق ہے۔ وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ درحقیقت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔

آنا مونو

انگریزی

غیر مرئی معاون

جب مادر گیتی کے پیارے بچے ...... غم رسیدہ انسان ...... بے بسی کے عالم میں دنیائے غیر معلوم کی سرحد پر ......

عالم یاس میں کھڑے ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
تو غیر مرئی معاون۔ وہی غیر مرئی معاون ... وہی قدسی
جو خلد کی پاکیزہ فضاؤں میں
ذات باری کے قرب سے مشرف ہیں
آتے ہیں
اور کانپتے ہوئے دلوں کو تسکین اور حوصلہ عطا کرتے ہیں
ایک کرّہ سے دوسرے کرّہ تک فضائے بسیط میں تیرتے ہوئے،
جب ان ہستیوں ...... ان غیر مرئی معاونوں کو
کوئی بھٹکی ہوئی ...... حاجتمند۔ امداد کی مستحق روح نظر پڑتی ہے۔

تو وہ قریب تر ہو کر،
اُسے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ ا

یہ کسی دُنیائے تخیل میں اُڑنے والے بچوں کا خواب نہیں
گو ہم اُنھیں دیکھ نہیں سکتے۔
لیکن وہ ...... وہ غیر مرئی معاون .....
زندہ ہیں۔
اور فضا کے رنگا رنگ غیر مرئی پردوں میں ملفوف۔

یوگوسلیویا

صبح روشنی۔ امید اور محبت کا سرچشمہ ہے۔ صبح کے وقت فطرت خواب ناز سے بیدار ہو کر انگڑائی لیتی ہے۔ اور رات صبح کے راستے پر شبنم کے موتی برساتی ہے۔ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں۔ تاکہ سورج اپنی چشم جہاں بیں سے عروسِ فطرت کو ننگا رہا ہوا پائے۔ رات کی گونگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ کیف آفریں نغمے فضا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ پرندے چہچہانا شروع کرتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں درختوں سے سرگوشیاں کرتی ہیں۔ اور عشرت کی روح نشیب و فراز پر رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ صبا ساکن سمندر کے بوسے لیتی ہے سرویا کی ماؤں اپنے بچوں کو اُٹھاؤ۔ کہ عروسِ فطرت کے صبح نظارہ سے لطف اندوز ہوں۔

(الجربوٹ ولیسیوک)

جرمنی

دُنیائے دوں

"اے میرے بچو! دُنیا دروغ سے پُر ہے۔ اور بغض سے۔ ہر شخص محض اپنے آپ کو عزیز سمجھتا ہے۔ ناپائیدار خوشی کی مرتبہ تمام قیود خلوص غیر مستحکم ہیں .... جو وہم کے ذریعے ملی ہوئی ہیں۔ وہم ہی ان قیود کو توڑ دیگا۔ صرف قدرت راست بازو بے ریا ہے۔ وہ ایک مستقل لنگر کے ساتھ قائم ہے۔ باقی سب اشیا طوفانی موجوں کے تحت فرمان تیرتی ہیں... میلان طبع دوست پیدا کرتی ہے۔ اور غرض ساتھی۔ خوش قسمت وہ ہے۔ جسے پیدائش نے ایک بھائی دیا ہو .... جنگ اور دغا بازی کی دُنیا کے خلاف وہ مقابلے کے لئے دو اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ہشلر

رومانیہ

رافیل سے پہلے کے مصوّر

عورتوں میں روز ملی جمال کی تکمیل و تجسیم دیکھتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے عورتوں کو مختلف پہلوؤں اور شکلوں سے اپنے مو قلم کے ذریعے غیر فانی بنا دیا ہے۔ اس کی تمام تصویروں کا انداز ایک سا ہے۔ خوش نما راج ہنس کی گردن۔ بیضاوی چہرہ۔ دل فریب و دلربا منہ۔ ہونٹ ذرا خم دار۔ اور آنکھیں شاید دنیا کے کسی مصوّر نے روز ملی کی سی آنکھیں تخلیق نہیں کیں۔ گہری۔ دلربا۔ دور رس۔ اندوہ افزا غم انگیز آنکھیں ✦

"مارکو بیزا"

ڈنمارک

زندگی

کچھ لوگوں کے لئے زندگی میں کسب عشرت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ اقتدار۔ طاقت۔ قوت۔ دولت۔ یہ تمام بے حقیقت چیزیں انھیں دعوت عمل دیتی ہیں۔ یہ لوگ طاقت ور ہیں۔ مضبوط ارادے کے ہیں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ ان میں سے زندگی کی مسرت کسی کے لئے بھی نہیں

"جارج برنڈیز"

یُونانی

حسن

اس حسن کے علاوہ جو ان نوجوانوں کے متناسب اعضا میں لبستا ہے۔ ایک اور قسم کا حسن بھی ہے۔ حواس سے گھری ہوئی دنیا میں ہم اس حسن کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ مگر روح جو حواس خمسہ کی مرہون منت نہیں اس حسن کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ اس حسن کے کیف سے متاثر ہونا ہو تو جسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر دیکھو۔

جس طرح اندھے اس دنیا کے حسین و جمیل مناظر سے کوئی لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کی روح اندھی ہوتی ہے۔ اس حسن سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ جو جسمانی حسن سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔

جب دیکھنے والے اس حسن عالم آرا کو دیکھیں گے۔ تو وہ مسحور ہو جائیں گے۔ اور ان کے دلوں کو فتنہ اپنی مٹھی میں لے لے گا۔ وہ ایسی مصیبت سے دوچار ہوں گے جو دنیا کی تمام مصیبتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت راستی کے راستے پر چل رہے ہوں گے۔ یہ مصیبت بھی کس قدر شیریں ہے۔ شیریں اور لذیذ۔

حسن ہمیشہ اضطراب کا احساس پیدا کرتا ہے۔ میٹھا میٹھا سا اضطراب۔ کچھ تحیر۔ آرزو محبت اور ایک لرزش۔ ایک ایسی لرزش جو تمام تر مسرت اور عشرت ہے۔

پھر اس حسن کا اثر کیا ہوگا۔ جو تمام حسین اشیاء سے زیادہ دلکش ہے؟

عین اسی طرح جس طرح بعض لوگ جسمانی حسن پر مرتے ہیں۔ تو عاشق کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس روحانی حسن پر فدا ہو جائیں گے۔ عاشق کہلائیں گے۔

۸۶

رجسٹرڈ ...... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۲ — بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء — نمبر ۵

تصاویر: (۱) قیس عامری کا نعرۂ مستانہ (۲ و ۳) ورزش نسوانی (۴) مکۂ معظمہ میں ایک شاہی دعوت۔ (۵) محفل پرواز (۶) حسن اور موت (۷) زہرا خانم ترکی کی ایک مشہور مصنفہ (۸) حضرت فاخر ہریانوی۔ بی۔ اے۔

آئینۂ عالم

کاغذ کے مکان

موجودہ زمانہ میں انسان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ جب کسی حیرت انگیز اور عجیب چیز کے متعلق کچھ سنے تو بلاچوں وچرا اس کی تصدیق کردے۔ کیونکہ ترقی علم کی بدولت دنیا کا جو قدم آگے کی طرف اٹھ رہا ہے وہ نہایت وسیع ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگوں کا عقیدہ ہوگیا ہے کہ علماء اور مخترعین کے لئے اب کسی چیز کا حصول اور کسی مسئلہ میں کامیاب ہو جانا متعذر اور محال نہیں رہا ہے۔

آجکل امریکہ میں پرانے کاغذوں سے عمارتیں تیار کرنے کا عملی اور علمی طریقہ عمومیت کے ساتھ رائج ہوتا جا رہا ہے جس نے لوگوں کو عمارتی پتھروں کی طرف سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے۔

کاغذی مکانوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کو پرانے اخبارات جمع کرنے کا بہت شوق تھا وہ نہ صرف انہیں اخبارات کو جمع رکھتا تھا۔ جو اس نے خود خریدے ہوں بلکہ وہ اپنے دوستوں کے یہاں سے بھی پرانے اخبارات اٹھا لاتا تھا۔

ایک دن اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کاغذ کا جو انبار اس نے جمع کر رکھا ہے۔ اس سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ چنانچہ وہ ایک نجار کے پاس گیا اور اس سے ایک لکڑی کا چھوٹا سا مکان تیار کرایا۔ اور تمام کاغذ جو اس نے جمع کر رکھا تھا اس مکان پر تہ بر تہ چسپاں کر دیا۔ اس کے بعد کاغذ کے اوپر عمدہ روغن پھیر دیا۔ اس طرح ایک ایسا مختصر مکان تیار ہوگیا جو تمام کا تمام لکڑی اور کاغذ سے بنا تھا۔

انجنیروں نے جب اس مکان کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور کاغذ کے اس اتفاقی استعمال کو مزید غور و بحث کے بعد ایک کارآمد اور مفید چیز بنانے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد وہ ایسا طریقہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ماوا کئے ہوئے کاغذ کو جلنے سے محفوظ رکھ سکے اور کافی پائدار بنا سکے۔ چنانچہ اب امریکہ میں اس قسم کی عمارتیں کثرت کے ساتھ تیار ہو رہی ہیں جن میں از سرتاپا سیمنٹ کی بجائے کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔

مغرب میں چینی آرٹ کی قدر افزائی

یورپ میں مشرقی آرٹ کی کئی ایک نمائشیں ہو چکی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب پیکار حیات سے تھک گیا ہے اور مشرق کے انداز صنعت میں ایک پیغام سکون ڈھونڈ رہا ہے

۱۹۲۵ء میں جو نمائش برلن میں ہوئی تھی اس کی اشیائے نادرہ ونفیسہ کا اکثر حصہ چینی آرٹ کے نمونوں پر مشتمل تھا۔ اس کے چار ماہ بعد "انجمن بہی خواہان صنعت مشرقی" کی سرپرستی میں امسٹرڈم میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ چینی آرٹ کے شاہکاروں کو منظر عام پر لایا جائے۔

لیکن ان تمام نمائشوں سے بڑھ چڑھکر وہ نمائش تھی جو پچھلے دنوں برلن میں منعقد ہوئی تھی اور جو نوادرات کے تنوع اور شاہکاروں کی تکمیل کے اعتبار سے شاید بے مثال کہی جا سکتی ہے۔ اس نمائش میں بھی صرف چینی آرٹ کے نمونے رکھے گئے تھے۔

۱۴۰۰ سے زیادہ اشیا جمع کی گئی تھیں۔ اکاڈمی کی گیلریاں اتنی کشادہ تھیں کہ ہر شے جمالی اصولوں کے ماتحت قرینے سے رکھی جا سکتی تھی۔ ان تمام وسائل و مظاہر کے نمونے موجود تھے جن کے ذریعے ذہن انسانی آرٹ کی تخلیق کر سکتا ہے۔ البتہ صنعت تعمیر کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔

× × × × × × ×

لندن لینن گراڈ پیرس اور سویڈن کے مستشرقین کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ مشرقی آرٹ کے ان موضوعات پر تقریریں کریں جن میں انہوں نے مہارت خصوصی حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں تماشائیوں کی رہبری کے لئے پروفیسر آٹوکمل کو مقرر کیا گیا تھا جو یورپ کے مستشرقین میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں۔

نمائش میں بڑی رونق رہی۔ تماشائیوں کی تعداد سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ چکی تھی کہ برلن میں مشرقی صنعتوں کو سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے کا ذوق یوماً فیوماً ترقی کر رہا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے ایک "فہرست بھی شائع کر دی ہے جس میں ہر ایک شے کی عکسی تصویر دی گئی ہے۔ یوں تو اس نمائش میں سیکڑوں چیزیں ایسی

تھیں جن کو "عجائبات عالم" کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ گران میں بھی وہ اشیا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو ۱۹۲۴ - ۱۹۲۵ میں شمالی منگولیا کی قبروں سے برآمد ہوئی تھیں - ان اشیا میں سرمائیں - چینی - ایرانی - اور قدیم سائبیرین آرٹ کے نمونے شامل ہیں - ان اشیا سے ان تمدنی تعلقات کا سراغ ملتا ہے جو آج سے ۲۰۰۰ سال سے پہلے بیرونی ممالک اور چین میں قائم تھے - علاوہ ازیں انہیں اشیا سے ان تمام دریافتوں کی تکمیل ہوتی ہے جو سر آریل سٹین نے مشرقی ترکستان میں اور جاپانی ماہرین نے کوریا میں کی تھیں -

بدھ کے مجسموں سے ہندوستانی اثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ جو مجسمے مسٹر گبنرگ نے عطا فرمائے تھے وہ ریتیلے پتھروں کے بنے ہوئے تھے - قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجسمے ین کانگ کی غاروں سے برآمد ہوئے ہونگے - اگرچہ ان کی تجسیم و تشکیل سے ایسی لطافت و نزاکت کا اظہار ہوتا ہے جو غاروں کے نقوش و نگار میں نہیں پائی جاتی۔ مگر بعض خصوصیات کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے یہ ین کانگ کی غاروں میں ہی سے برآمد ہوئے ہونگے -

عام طور پر جو مجسمے نمائش میں رکھے گئے تھے ان کی تخلیق کا محرک مذہبی جوش تھا - اور یہ مناسب بھی ہے - کیونکہ آرٹ کا پہلا محرک مذہب ہی ہے - لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدھ کے ان مجسموں میں ایک ایسی لطافت اور نزاکت بھی پائی جاتی تھی جو ہندوستان کی سنگتراشی میں مفقود ہے -

معلوم ہوتا ہے کہ چین کے چابکدست صناعوں نے مذہب تو ہندوستان سے مستعار لیا مگر آرٹ میں اس ملک کے شرمندہ احسان نہیں ہوئے -

جاپانی ڈاکٹر نوگوچی کی حیرت انگیز ایجادات

علم حیات کا ایک جاپانی ماہر اس بات کا مدعی ہے کہ اس نے انسانی جم جلے کا رنگ تبدیل کرنے کا راز دریافت کر لیا ہے - آئندہ بچوں کے والدین اپنی اولاد کا رنگ حسب خواہش اس حد تک بدل سکیں گے کہ افریقہ کا سیاہ فام حبشی یا ہندوستان کا گندم گون آدمی انگریزوں اور دوسرے یورپینوں کی طرح سفید فام ہو سکیگا - ہر رنگ کا چمڑا اجلا اور صاف ہو سکے گا خواہ وہ سیاہ ہو یا سرخ، پیلا ہو یا بادامی -

جاپان کے مشہور ڈاکٹر نوگوچی کو یقین ہے کہ ان کے تمام دعوے تجربات پر مبنی ہیں جن میں کسی شک و ریب کو دخل نہیں - وہ بجلی کے اثر سے قوت بالیدگی کو ترقی دیتے ہے اور غدودوں پر حسب منشا اثر کرتے ہیں - بس یہی تغیر رنگ، افزائش حسن اور ترقی قامت کا راز ہے جاپانیوں کا قد چھوٹا ہے - اس لئے ڈاکٹر نوگوچی کو جاپانیوں کے قد بڑھانے میں خاص شغف و دلچسپی ہے - ڈاکٹر موصوف نے اپنے ۱۵ سالہ تجربوں کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ فطرت نے بچوں کے اندر نشو و نمو کی جو جبلی قوت اور ذاتی استعداد ودیعت کی ہے اس میں تغیر ہو سکتا ہے - اور ڈاکٹر ممدوح کو حق الیقین ہے کہ پستہ قامت آدمی طویل القامت ہو سکتے ہیں -

آپ نے نشو و نمو کا جو برقی طریقہ ایجاد کیا ہے وہ ان بچوں کو خولصورت بنانے پر بھی مشتمل ہے جن کے نشو و نمو کی رفتار بدصورتی کی طرف مائل ہو - ڈاکٹر موصوف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ غبی بچے ذہین بن سکتے ہیں - ان کا دماغی نشو و نما ایسے انداز پر ہو سکتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر نہایت عقیل و فہیدہ ثابت ہوں -

ٹمالو

ایک جدید پیوندی پودا

ورسسٹر - ماس کے ایک ذہین کاشتکار نے ٹماٹر اور آلو کو اس طرح پیوند دیا ہے کہ ایک ہی پودے پر زمین کے اندر آلو اور باہر ٹماٹر لگتے ہیں - اس تجربے کی تکمیل ۲۰ سال کی محنت کے بعد ہوئی ہے - مسٹر آسکر (جو اس پیوند کے بانی ہیں) کا خیال ہے کہ اصولاً اس پودے پر اچھے اور زیادہ ٹماٹر لگنے چاہئیں - اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آلو کے پودے کی جڑیں ٹماٹر کے پودوں کی نسبت زیادہ مضبوط ہوتی ہیں - اور ان میں زیادہ ٹماٹروں کا بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے -

پیوند اس طرح لگایا جاتا ہے کہ پہلے ایک آلو بو دیا جاتا ہے - اور ایک گملے میں ٹماٹر کا بیج ڈال دیا جاتا ہے - جب دونوں پودوں کی بیلوں کی گولائی ½ انچ کے برابر ہو جاتی ہے تو دونوں کو ایک باریک دھاگے سے بہت احتیاط سے باندھ دیا جاتا ہے -

تاجور

مجنوں کا نعرۂ مستانہ

محبت کی فسوں کاری سے کلیاں مسکراتی ہیں
فضائیں جگمگاتی ہیں ہوائیں گیت گاتی ہیں

بہار زندگی میں جب یہ شعلہ رنگ بھرتا ہے
تو ذرّہ ذرّہ فرطِ بیخودی سے رقص کرتا ہے

برستی ہے محبّت رنگ بن کر لالہ زاروں پر
لرزتی ہے محبت پھول بن کر شاخساروں پر

محبت نغمہ زارِ حسن کی رنگیں کہانی ہے
محبت سے فضائے دل طرب زارِ جوانی ہے

محبت دامنِ کہسار کو گلشن بناتی ہے
محبّت پتھروں سے دودھ کے دریا بہاتی ہے

محبّت ہاتھ میں شمشیرِ خوں آشام لیتی ہے
محبّت قہرمانی طاقتوں سے کام لیتی ہے

محبت اپنی رنگیں رفعتوں پر ناز کرتی ہے
جلالِ کبریا تک یہ پری پرواز کرتی ہے

فضائیں گونجتی ہیں شورِ اعجازِ محبّت سے
لرزتے ہیں دو عالم نغمۂ سازِ محبّت سے

یہ شعلہ موجزن ہے میرے دل میں آرزو بن کر
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ صہبا لہو بن کر

محبّت کی لطافت سے ہے فطرت ہم نوا میری
چٹانیں ریزہ ریزہ ہوگئیں سنکر صدا میری

مری فریاد سے پھول اور غنچے تھرتھراتے ہیں
مری فریاد سے پتھر لرز کر ٹوٹ جاتے ہیں

پہاڑوں کی رگوں میں شعلہ افشاں ہے لہو میرا
گل و نسریں کی رنگینی میں لرزاں ہے لہو میرا

مرے نعرے پیامِ زندگی دیتے ہیں دنیا کو
شرابِ لالہ فامِ زندگی دیتے ہیں دنیا کو

مرے نغمے دلوں میں شمع بن کر جگمگاتے ہیں
حرم سے وہ غزالانِ حرم کو کھینچ لاتے ہیں

چلے آتے ہیں وحشی جانور آرام گاہوں سے
عیاں ہے ایک رنگ بیخودی جنگلی نگاہوں سے

پلنگ و شیر و آہو جمع ہیں باغِ محبّت میں
محبّت کا تصرف دیکھ لو اسرارِ فطرت میں

جہاں میں ہوں وہاں قانونِ فطرت ٹوٹ جاتا ہے
یہاں وحشی درندہ آہوؤں سے خوف کھاتا ہے

یہاں ذرّوں میں روحِ زندگی بیدار ہوتی ہے
یہاں ہر چیز کیفِ عشق سے سرشار ہوتی ہے

عابد

ہندوستانی اور مغربی موسیقی

مسٹر لوپیلے اپنی کتاب میوزک آف انڈیا میں رقمطراز ہیں کہ ان کے ایک ہندوستانی دوست نے مغربی موسیقی پر اظہار رائے کرتے ہوئے نہایت آزادی کے ساتھ کہہ دیا کہ" مجھے تو انگریزی گانا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جنگل میں گیدڑ چلاّ رہا ہو۔ غیر ممالک کے باشندے ہمارے راگ کو بھی ایسا ہی ناقص اور بے مصرف تصور کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم میں سے بعض اصحاب انگریزی موسیقی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ حق وصداقت کے جویا اپنی رائے کے اظہار میں اسقدر تعجیل سے کام نہیں لیتے اور سمجھتے ہیں کہ رائے زنی سے پیشتر اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئیے۔ کہ جو گانا ہمارے کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے یا جسے ہم محض چیخ پکار سے تعبیر کرتے ہیں وہی ہمارے مغربی بھائیوں کے لئے باعث تفریح وراحت ہے۔ اسی طرح سے بعض اہل فرنگ اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی موسیقی کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ایک حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

کیپٹن ڈے ان چند اشخاص میں سے ہیں جنہوں نے ہندی راگ سے لطف اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اپنی کتاب موسومہ

میں لکھتے ہیں:۔

تقریباً ہر مغربی سیاح جو ہندوستان سے واپس جاتا ہے یہ غلط خیال اپنے ساتھ لے جاتا ہے کہ اس ملک کا راگ محض شور وغل ہے جس کے لئے نہایت وحشیانہ قسم کے اشارات اور حرکات مثلاً منہ چڑانا یا سر ہلانا بھی لازم ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں ان لوگوں کے تجربات رقص وموسیقی اناڑی پیشہ ور لوگوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور اس لئے یہ سیاح ایک ایسا غلط اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ جو تمام عمر ان کو ہندوستانی موسیقی سے لطف نہیں اٹھانے دیتا۔ یہ حد درجہ کی بے انصافی ہے کہ ایک ایسے فن لطیف کی نسبت جس کے سمجھنے والے خود ہندوستان میں بھی کم ہیں۔ ادنیٰ معیار کے گانے والوں کو سنکر ایسی رائے قائم کر لی جائے اور اسے ردّی یا ناقص کہکر مسترد کر دیا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستانی گانا نہ صرف ایک فن لطیف ہے بلکہ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل فن ہے۔ اس کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں مغربی میوزک کا خیال دل سے بالکل دور کر دینا چاہئیے۔ اور پھر اس کا مطالعہ ہندوستانی نقطۂ خیال سے کرنا چاہئیے۔ اور اس کی خوبیوں کا اندازہ گوّیئے کی لیاقت۔ گانے کے لے اور تال۔ گانے والے کی قوت حافظہ۔ سروں کے اتار چڑھاؤ اور مختلف قسم کی تانیں لگانے کی قابلیت سے کرنا چاہئیے۔ جب ہم ہندوستان کے قدیمی گیت اور بھجن (ایسے گیت جو سیکڑوں سال گزرے تصنیف ہوئے تھے) اسی طرز اور طریقہ سے۔ اسی مست کن شیرینی سے۔ اسی تال اور جھنکار سے۔ ادا ہوتے ہوئے سنتے ہیں۔ جس طرح کبھی قدیم زمانے میں گائے جاتے تھے۔ تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ گانا مشرقی کانوں کے لئے اتنا ہی خوش آئند ہوگا جتنا بلند اور گونجنے والی آوازوں کا گانا مغربی کانوں کے لئے۔ اس طرح سے ہماری حقارت تعجب اور محبت سے بدل جائیگی۔ کیونکہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مغربی موسیقی ہر روز جس قدر انسانوں کی تفریح کا موجب ہوتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ اشخاص کی فرحت اور مسرت کا باعث ہندی راگ ہوتا ہے۔"

یہی خیال مدِ نظر رکھکر مغربی موسیقی کی طاقت کا اندازہ لگانا چاہئیے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ان" راگ داری" کی چیزوں کو سمجھنا جو معمولی غزلوں اور ٹھمریوں سے زیادہ اعلیٰ پایہ کی موسیقی کا اظہار کرتی ہیں۔ اور ان سے لطف اٹھانا ان ہندوستانیوں کے لئے مشکل ہو جو راگ کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہوں لیکن اگر ان کے مذاق کو سدھارا جائے۔ اور ان کو باکمال راگیوں کے سننے کا موقعہ اگر ملتا رہے تو وہ ان راگوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح سے غیر ممالک کا گانا سننے اور اس سے لطف اٹھانے کی کوشش کرنے سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ غیر ملکی گانے سے بھی اسی قدر متاثر ہو سکے جتنا اپنے دیس کے گانے سے ہوتا ہے یہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں میں نے ہندوستانی اور مغربی موسیقی کا مطالعہ بہت مدت تک اور نہایت غور سے کیا

ہے اور اگرچہ مجھے انگریزی موسیقی سننے کا حسب دلخواہ موقع نہیں ملا۔ تاہم میں اس سے بہت کچھ لطف اندوز ہولیتا ہوں۔ خاص کر یورپ کا انسٹرومنٹل میوزک (ہمارے خیال میں اس کا ترجمہ سازکی موسیقی ہوسکتا ہے۔ ایڈیٹر) تو مجھے بیحد پسند ہے۔

سب سے بین فرق جو ہندوستانی اور انگریزی میوزک میں ہے۔ یہ ہے کہ مقدم الذکر میں صرف میلوڈی[1] ہوتی ہے اور موخرالذکر میں اس کے ساتھ ہارمنی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہارمنی کے متعلق مفصل بحث کی جاسکے۔ اس لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصر طور پر میلوڈی اور ہارمنی کی تعریف نہایت ضروری ہے ورنہ انگریزی میوزک کا اہم اصول سمجھ میں نہیں آسکیگا۔ مختصراً میلوڈی سے مراد ہے مفرد آوازوں کا سلسلہ اور ہارمنی سے مراد ہے۔ مختلف مرکب آوازوں کا ایک ہی وقت (مترنم صورت میں) پیدا ہونا۔ ہمارے تمام گانوں اور سازکی گتوں میں صرف میلوڈی ہی ہوتی ہے۔ یعنی ایک وقت میں صرف ایک سُر گا یا بجایا جاتا ہے۔ اور اگرچہ کورس میں بہت سے اشخاص مل کر گاتے ہیں۔ مگر ان کی آوازیں بھی ایک وقت میں صرف ایک سُر نکالتی ہیں۔ برخلاف اس کے مغربی میوزک میں ایک ہی وقت میں دو تین یا زاید سُر جن کو انگریزی اصطلاح میں گورڈ کہتے ہیں۔ بجائے جاتے ہیں۔ موسیقی میں سات ابتدائی سُر مانے گئے ہیں یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ ہمارے گانے بجانے میں ان سُروں میں سے ایک وقت میں صرف ایک سُر نکالا جاتا ہے۔ اور ان سات سُروں میں سے دو یا تین کو ملاکر کبھی نہیں بجایا جاتا۔ مغربی موسیقی میں باجہ بجانے والا ایک ہی وقت میں تین یا زیادہ سُر اکٹھے بجاتا ہے۔ مثلاً باجے پر سا۔ گا۔ پا کے پردوں کو ایک ہی وقت میں دباتا ہے۔ اسی طرح سے تمام گیت میں مرکب سُر استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ تشریح ہارمنی کا مطلب سمجھنے کے لئے کافی ہوگی۔ مگر دراصل یہ بالکل ادھوری ہے۔ کیونکہ ہارمنی کے اصول خاصے پیچیدہ ہیں۔

ہماری موسیقی کی تمام ترقی میلوڈی یا اصل گیت کی طرز کو خولصورت بنانے کی غرض سے ہوئی ہے اور مغربی موسیقی کی زیادہ تر ترقی ہارمنی کے متعلق ہوئی ہے اور تال۔ لے۔ راگوں کی ترتیب وغیرہ کی طرف اہل یورپ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہارمنی کی نسبت حکما کی مختلف رائیں ہیں۔ مثلاً روسو جو ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر گزرا ہے کہتا ہے کہ "ہارمنی سے میلوڈی کی خولصورتی نہیں بڑھتی۔ ڈاکٹر برنی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دیجائے۔ مارٹنی کہتا ہے کہ میوزک ہارمنی سے پیدا ہوتا سر الیس۔ ایم۔ ٹیگور نے بھی کہا ہے کہ "ہارمنی میلوڈی کو مزین کر دیتی ہے۔" میرا اپنا تجربہ اور رائے یہ ہے کہ ہارمنی واقعی میلوڈی کو زیادہ خولصورت بنا دیتی ہے مگر اس کے واسطے مذاق کو سدھارنا پڑتا ہے۔ بعینہ اس طرح جس طرح دو یا تین مختلف سالنوں کو ملاکر کھانے اور اس سے لطف حاصل کرنے کے لئے عادت ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے راگ کے لئے ہارمنی اس حد تک موزوں نہیں ہے جتنی کہ مغربی راگ کے لئے۔ اور ہمارے وہ گانے جن میں گلے بازی زیادہ کی جاتی ہے۔ ہارمنی کے لئے بالکل ناموزوں ہیں۔ مگر دھرپد۔ خیال۔ بھجن غرضیکہ جو گانے وزن دار ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہارمنی عمدہ طور سے شامل ہو سکتی ہے۔

یہاں اتنا جتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ہارمنی سے گانے والے کے لئے کوئی وقت پیدا نہیں ہوتی لیکن باجہ بجانے والے کو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بجانے کی رفتار بھی اسقدر تیز نہیں رہ سکتی۔ پیانو اور آرگن کے استادوں کو بدیں وجہ ہارمنی کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑی جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے ساری دماغی طاقت ہارمنی کو ترقی دینے میں صرف کردی اور اصل چیز یعنی میلوڈی کی آرائش و زیبائش کا خیال فراموش کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پیانو وغیرہ کا بجانا بہت پیچیدہ ہوگیا ہے لیکن گانا نسبتاً بالکل سادہ رہ گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہمارا گانا بجانا بالکل یکساں ہے اور ہارمنی کی پیچیدگیوں میں نہ پڑنے سے ہمارا راگ زمزمہ۔ تان پلٹہ اور گمک کے دیگر اقسام سے بہت مزین ہوگیا ہے۔ اہل مغرب کے لئے تان پلٹا نکالنا مشکل ہے۔ اور اگر وہ کوشش کریں بھی تو بے سود ہے کیونکہ باجہ والے ان کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ ہارمنی کے پھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں راگوں کی جو با اصول اور باقاعدہ تقسیم

---

[1] ہماری نظر میں میلوڈی کے لئے ترنم اور ہارمونی کے لئے "متطابق مترنم" کے الفاظ کا استعمال جائز ہے۔ ایڈیٹر

ہے خواہ وہ پرانے نظام کے مطابق ہو۔ خواہ نئے کے موافق۔ وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کے ماہرین موسیقی کو کوشش یہی رہی ہے کہ اس فن کو ایک سائنس کی طرح مرتب کردیں۔ برخلاف اس کے مغربی میوزک میں راگوں کی باقاعدہ تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ لفظ راگ کا مترادف کوئی لفظ اس میں ہے ہی نہیں۔ علیٰ ہذالقیاس ان کے تال نہایت سیدھے اور آسان ہوتے ہیں اور مغرب میں موسیقی کی یہ شاخ بالکل عالم طفلی میں ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ مغربی میوزک میں تاثیر نہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں گمک کو بہت جگہ دیجاتی ہے۔ مغرب میں اس کے صرف دو تین اقسام مروج ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر تار والے سازوں مثلاً وایولن میں۔ پیانو میں کہیں کہیں زمزمہ لگاتے ہیں مگر شاذ۔ اور مینڈ جو ہمارے گانے میں بہت عام ہے۔ اور جس سے سروں کی سرتیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مغربی موسیقی میں بہت کم ہے۔ مغربی موسیقی میں آواز کی نزاکت۔ لوچ۔ شیرینی کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں بھی اس کی قدر ضرور ہوتی ہے لیکن محض آواز کی خوبصورتی، گانے والے کی لیاقت کا سرٹیفکٹ نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ یورپ میں ہے۔ بلکہ اگر ایک باکمال گویا راگ۔ تال۔ سُر سے خوب واقف ہو۔ لے کاری جانتا ہو۔ تو۔ گو اس کی آواز چنداں رسیلی نہ بھی ہو اس کو استاد مانا جاتا ہے۔ یورپ میں ایسے شخص کی قدر نہیں ہوسکتی۔

سر رابندرا ناتھ ٹیگور نے انگریزی اور ہندی موسیقی کا مقابلہ اس طرح کیا ہے وہ کہتے ہیں :۔

جب مجھے اوّل اوّل انگریزی گانا سننے کا اتفاق ہوا تو یہ میرے کانوں کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ میڈم ایلبنی کا گانا تھا۔ جس میں وہ بلبل کی آواز کی نقل اتارنے کی یہ ایک طفلانہ کوشش تھی۔ اور میں اس سے محظوظ نہیں ہوا۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ بلبل کے ترانہ سے ایک ہندوستانی آرٹسٹ موسیقی کا کیا سبق حاصل کریگا۔ میں نے جواب دیا وہ ظاہریات سے گزر کر اس میں روح کا مشاہدہ کریگا۔ وہ اس سے متاثر ہوکر اسی طرح ترنم ریز ہوگا جس طرح کیٹس شاعر جس نے بلبل کو سن کر اپنی مشہور نظم (اوڈ) لکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی موسیقی زندگی کے روزانہ واقعات کی نسبت مذہب سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لئے موسیقی عالم بالا کا ایک نغمہ ہے۔ یہ فن انسان کی توجہ دنیاوی کاروبار سے ہٹا کر روحانیت کی طرف مائل کردیتا ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان ان تعلقات سے جو روح کو آئندہ زندگی کے ساتھ ہیں آشنا ہوجاتا ہے۔ مغربی موسیقی روز روشن کی طرح ہے جس میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بعض ایک دوسرے سے باہمی کے تعلق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ بعض شور و غل کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارا راگ رات کی طرح ہے۔ دونو ہم کو متاثر کرتے ہیں لیکن ان کی حقیقت ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ قدرت اصل میں دو حصوں میں منقسم ہے۔ دن اور رات۔ کثرت اور وحدت۔ محدود اور غیر محدود۔ ہم اہل ہند رات کے عالم میں رہتے ہیں۔ ہم پر وحدت کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہمارا راگ سامع کو فانی دنیاوی خوشیوں اور کاوشوں سے آزاد کرکے روحانی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ مغربی راگ انسانی رنج و راحت کے انتہائی نشیب و فراز کی طرف رہبری کرتا ہے۔

مسز بین لکھتی ہیں :۔ مغربی میوزک خدا کی مخلوقات کے عجائبات دکھاتا ہے۔ مشرقی میوزک بتاتا ہے کہ خدا انسان اور مخلوقات میں پوشیدہ ہے۔

ایک اور شخص بہت عمدہ مثال سے مشرقی اور مغربی میوزک کا فرق سمجھاتا ہے :۔

"ہندوستانی دسترخوان جس میں انواع اقسام کے کھانے مختلف رنگ اور مزہ کے چُنے ہوتے ہیں۔ یورپین مذاق کے لوگوں کو گھبراہٹ میں مبتلا کردیتا ہے جو ایک وقت میں صرف ایک چیز کو کھانا پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی میوزک میں مختلف سروں کا اکٹھا بجنا ہندوستانی کانوں کے لئے باعث پریشانی ہوتا ہے۔ جو گیت کے اصلی سروں (یعنی میلوڈی) کو سنتے اور انہیں کو مختلف طریقوں سے مزین کرنے کے عادی ہیں۔"

لیکن اس سوال سے قطع نظر کرکے ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔ کہ اپنے مذاق کی اس طرح تربیت کریں کہ مغربی راگ سے بھی لطف اٹھا سکیں اور اس کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ اس سے ہماری خوشی کے ذرائع بڑھ جائیں گے۔ ہم کو خوشی حاصل کرنے کے لئے صرف ہندوستانی راگ ہی تلاش نہیں کرنا پڑیگا بلکہ جہاں انگریزی گانا ہورہا ہوگا وہاں بھی ہماری فرحت کا سامان مہیا ہوگا۔ شاید اس کے لئے کچھ محنت درکار ہوگی۔ لیکن اس محنت اور کوشش کا جو نتیجہ فرحت و انبساط کی شکل میں ہمیں حاصل ہوگا وہ اس کا پورا معاوضہ ہوگا۔

ان مغربی نقادوں کے اعتراض کے جواب میں ہندوستانی

موسیقی سے واقفیت نہ رکھنے کے باعث یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی راگ نے ابھی ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھا کیونکہ (۱) اس میں محض میلوڈی ہی ہے اور ہارمنی بالکل مفقود ہے۔ (۲) اس میں ہر شخص کے گانے کا طریق جداگانہ ہے اور کسی گانے کی کوئی خاص طرز مقرر نہیں ہے۔ میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان باتوں سے ہندوستانی گانے کی خوبی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ یہ اس فن کی وسعت کا اعتراف ہے جو استاد اُنیس قسم کی گمک کا استعمال کر سکتے تھے حالانکہ مغربی میوزک میں اس کے مقابلے میں صرف دو یا تین قسمیں رائج ہیں۔ جو باکمال اہل فن سو سے زیادہ تانیں استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یورپ میں صرف پانچ چھ سادہ تانیں مستعمل ہیں۔ جو لوگ راگ کو ایسے سائنٹیفک اصولوں پر ترتیب دے سکتے تھے اور ایسا باقاعدہ نظام مقرر کر سکتے تھے۔ جس کی مثال مغربی میوزک میں نہیں ملتی۔ جو لوگ وادی۔ سموادی۔ انوادی سروں کی ماہیت کما حقہ پہچانتے تھے۔ کیا ان کے لئے یہ مشکل تھا کہ ہارمنی بھی اپنے گانے میں شامل کرتے ہرگز نہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے گانے کو ان قیود کی پابندی سے آزاد رکھنا مناسب سمجھا تا کہ گانے والا اپنی شخصیت کا اظہار بآسانی کر سکے۔ اور گانا بجائے محض ایک میکینیکل (مشین کی طرح کا) آرٹ ہونے کے جیسا کہ وہ یورپ میں ہے گانے والے کے جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یورپ میں پیانولا اور آٹو پیانو وغیرہ کے ذریعے سے کاغذ کے ایک رول کی مدد سے لائق سے لائق استادوں کا میوزک صحیح طور پر خود بخود بج سکتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک باکمال استاد کے بجانے اور ایک کاٹھ اور لوہے کی مشین کے ذریعے ادا کرنے میں کچھ فرق نہیں۔ دماغ کا وجود اور عدم وجود مغربی میوزک کو صحیح طور پر ادا کرنے میں برابر ہے کیا ہندوستانی راگ بھی اس مشین کے ذریعے سے ادا ہو سکتا ہے؟ ناممکن ہے۔

مگر جہاں ہمارا فن غنا ایک لحاظ سے معراج کمال پر پہنچ چکا ہے۔ بعض لحاظ سے اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کی اصلاح ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارے میوزک میں جس چیز کی کمی سب سے زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ انسٹرومنٹل میوزک (ساز کی موسیقی) ہے۔ ہم اس شے کے مبادیات سے ناواقف ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ اول تو سوائے نغمہ یا گت یا سرگم کے اور کوئی چیز غالباً ایسی ہی نہیں جس میں صرف باجہ بغیر گانے کے بجایا جاتا ہو۔ اور اگر کوئی شخص باجے وغیرہ میں گت یا نغمہ بجائے بھی تو عموماً سننے والوں کا مذاق اس قدر ناقص ہوتا ہے کہ انہیں اس میں لطف ہی نہیں آتا۔ یہ کہکر کہ "جناب اس کے ساتھ کچھ زبان سے بھی فرمائیے"۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ موسیقی سے انہیں چنداں انس نہیں ہے اور جس چیز سے وہ لطف حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صرف شاعری ہے۔ برعکس اس کے یورپ میں مارچ ڈانس۔ والز۔ وغیرہ بیشمار ایسی چیزیں ہیں جن میں محض ساز ہی بجائے جاتے ہیں۔ اور گانا نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے میوزک سے وہاں کے لوگ بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ انسٹرومنٹل میوزک میں ہم لوگ اہل یورپ سے بہت پیچھے ہیں۔ اور فخریہ خیالات کو ایک طرف رکھ کر ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ فن موسیقی کے اس شعبہ میں بھی ترقی کریں۔ جو لوگ موسیقی کا لطف اٹھانے کے لئے × × × الفاظ کے محتاج ہیں وہ گویا الفاظ کا لطف اٹھاتے ہیں موسیقی کا ہونا نہ ہونا ان کے لئے برابر ہے۔

بسا اوقات ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میرے بعض انگریز دوستوں نے ہندوستانی سازوں کے گراموفون ریکارڈ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھ سے دریافت کیا کہ کون کون سے ریکارڈ اچھے ہیں مجھے خوب معلوم تھا کہ اس لحاظ سے ہمارا ملک بہت غریب ہے اور اس بات کے احساس نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ گراموفون ریکارڈس کی فہرست دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند شہنائی کے دو چار ہارمونیم اور چند ایک ستار کے ریکارڈس کے اور کوئی انسٹرومنٹل میوزک کا ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی انسٹرومنٹل ریکارڈس کی فہرست ملاحظہ فرمائیے کسقدر شاندار ہے۔ یورپ پیڈریوسکی کو صرف چند گھنٹے خالی پیانو بجانے کے لئے پانچ پانچ سو پونڈ فی شب دے سکتا ہے۔ کرائسلر اور کبوبلک، کو وائولن پر ایک گت سنانے کے عوض ڈیڑھ ڈیڑھ سو پونڈ مل سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں کونسا ہارمونیم ماسٹر یا ستار نواز ہے جو خالی باجہ یا ستار سنا کر پچاس روپیہ فی شب بھی حاصل کر سکے۔

خیر انسٹرومنٹل میوزک کو جانے دیجئے۔ ذرا اپنے گیتوں کی طرف توجہ فرمائیے۔ ان کی نسبت تو ہم نہایت فخریہ انداز سے یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہمارے گیتوں کی دلکشی کی برابری دنیا کی کسی قسم کے گیت نہیں کر سکتے۔ یاد رہے کہ یہی الفاظ اہل چین اپنی "آسمانی موسیقی" کی نسبت اور اہل حبش اپنے گانوں کے متعلق استعمال کرتے ہیں مگر کہنے اور ثابت کرنے میں فرق ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ ہمارے گیت

کس لحاظ سے انگریزی گیتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ گیت کی طرز یا دھن سے قطع نظر کہ وہ ہر ملک میں جدا ہے اور ہر ایک کو اپنی طرز پسند ہے۔ گیتوں کے مضامین۔ بناوٹ۔ شعریت پر غور کیجئے۔ اردو میں سوائے عشقیہ غزلیات۔ حسن و عشق کی کیفیات۔ زلف و رخ کی تشبیہات کے اور کیا رکھا ہے۔ کھیٹر کی طرف جائے تو اکثر تھیٹریکل گانے ردلیف قافیہ سے معرا۔ وزن بحر سے خالی مضمون کی نفاست سے محروم۔ صرف چند طرزیں جو حشر یا احسن یا طالب بنارسی یا بیتاب کی تصنیف کردہ ہیں۔ ان عیوب سے پاک ہوں تو ہوں ورنہ باقی طرزیں محض خس و خاشاک اور دوسری قوموں کی نگاہوں سے چھپا دینے کے لائق ہیں۔

مانا کہ اردو شاعری ابھی عالم طفلی میں ہے۔ اچھا ہندی کو لیجئے۔ یہ تو نسبتاً پرانی زبان ہے اور گیتوں کے لئے موزوں بھی ہے۔ اس میں تو اعلیٰ مضامین۔ عمدہ خیالات ہونے چاہئیے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں حالت اور بھی بدتر ہے۔ اردو غزلیات میں کم از کم وزن یا بحر یا قافیہ ٹھیک ہوتا ہے۔ ٹھمریوں میں اکثر اوقات یہ باتیں بھی مفقود ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے مصنف عموماً علم ادب سے ناآشنا۔ قواعد عروض سے بے بہرہ۔ صرف راگ کے ماہر تھے۔ اپنے خیالات کو صحیح الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر تھے۔ بھونڈے الفاظ میں بلا وزن بحر دو چار تک ملا کر ان کو کھینچ تان کر تال میں پورا کر دیا۔ اور بس جب ہم اپنی ٹھمریوں کے پیش پا افتادہ مضامین۔ کاہن اور گوبیوں یا ساس نند کے پرانے قصوں اور اپنی غزلیات کے عشقیہ مضامین کو انگریزی نظموں کی دلچسپ رنگا رنگی ان کے خیالات کی جدت اور وسعت۔ ان کے قومی ترانوں اور گیتوں کے پر جوش مضامین۔ ان کی نیچرل شاعری۔ اور ان کے شستہ مذاق کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اس میدان میں بھی ہم لوگ بہت پیچھے ہیں۔

پس ہماری موسیقی میں بہت سی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ پہلی اصلاح جو ضروری ہے یہ ہے:۔

راگ کو تعلیم یافتہ سوسائٹی میں رواج دیا جائے تاکہ اچھے دماغ والے اصحاب اس کی ترقی میں حصہ لیں۔ اور اس کو اس گری ہوئی حالت سے جس میں وہ آجکل ہے نکال کر معراج کمال پر پہنچا دیں۔ ہمارا فخر محض لفظی نہ رہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اور غیر ممالک پر ثابت کیا جائے کہ ہندوستانی موسیقی غیر مہذب اور وحشیانہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو فضول بندشوں سے آزاد کیا جائے۔ دقیانوسی خیالات کو خیر باد کہا جائے اور اس میں جدت کی روح پھونکی جائے۔

دوسری اصلاح جو اس مقصد کے لئے ضروری ہے بلند پایہ نظموں کی آفرینش ہے۔ پرانے زمانے میں عموماً گانے والا خود ہی شاعر بھی بننے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک ہی شخص کے لئے دو فنوں میں صاحب کمال ہونا مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گانے شعریت کے لحاظ سے ناقص رہ گئے۔ ماہرین فن جانتے ہیں کہ گانے کے لحاظ سے غزل نہایت ناموزوں چیز ہے کیونکہ اس میں اہل فن کو اپنا کمال دکھانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شاعروں کو چاہئے کہ غزل گوئی چھوڑ کر دھرپدوں۔ ٹھمریوں کی طرز پر ایسے گیت بنائیں جو علم عروض اور مضامین دونو کے لحاظ سے قابلقدر ہوں۔ شاعروں اور راگیوں کو مل کر ہمارے فن موسیقی کو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہئیے۔

تیسری اصلاح جو نہایت ضروری ہے وہ نوٹیشن[1] کا رواج دینا ہے۔ نوٹیشن کے ذریعے سے گانا بجانا سکھانا اور تمام عمدہ گیتوں اور طرزوں کو نوٹیشن میں تحریر کر کے شائع کرنا۔ یہ بات ہمارے موسیقی کی بقا کے لئے اشد ضروری ہے۔ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں قابلقدر گیت معدوم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ کل جو طرزیں اور گانے زبان زد خاص و عام تھے۔ آج وہ کہاں ہیں آج جو طرزیں مشہور و مروج ہیں کل ان کا پتہ بھی نہیں رہیگا۔ یہی ایک بڑی وجہ ہمارے گیتوں کی قلت کی ہے۔ اور یہ ہمارے راگیوں کی تنگدلی اور بخل کا کرشمہ ہے۔ نوٹیشن کے نہ ہونے سے نہ صرف گانے زمانے سے مفقود ہو رہے ہیں بلکہ طالبان فن کو بہت مشکل ہوتی ہے اور بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ جو گانا نوٹیشن کے ذریعے سے ایک گھنٹے میں یاد ہو سکتا ہے وہ زبانی سکھانے سے ایک دن میں بھی درست طور پر نہیں آسکتا۔ بس ضرورت ہے ہر بڑے شہر میں ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کرنے کی جو مندرجہ بالا مقاصد کو مدنظر رکھ کر رفاہ عام کے لئے کام کرے۔ اور ذاتی اغراض سے اعراض کر کے قومی مفاد اور بہتری کے لئے کوشش کرے۔

چوتھی اصلاح طبلہ کے استعمال کے متعلق ہے۔ طبلہ بجانے والے عموماً اپنے ساز کو تمام دیگر سازوں حتیٰ کہ خود گانے والے

---

[1] گیت کے الفاظ کے نیچے سرگم کی سروں کے نام لکھنا

کی آواز سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگتے ہیں اور اس اندر سے ہاتھ مارتے ہیں کہ دوسرے سازوں کی اور گویّے کی آواز طبلہ کی آواز میں دب جاتی ہے ۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ طبلہ صرف تال اور لے کو قائم رکھنے کی غرض سے بنایا گیا ہے ۔ یہ آلہ موسیقی ہے ۔ آلہ حرب نہیں کہ جس سے سامعین پر گولہ باری شروع کر دیجائے ۔ اور ان کے کانوں کی دیواروں کو شکستہ کیا جائے ۔ اگر ہم موسیقی کو واقعی ترقی دینا چاہتے ہیں تو اس غلطی کو بہت جلد رفع کرنا چاہیئے ۔ نہ صرف اس لئے کہ یورپ اور امریکہ کی شائستہ اقوام جن کا مذاق تمام فنون لطیفہ کے متعلق نہایت سلجھا ہوا واقع ہوا ہے ۔ اسی غلطی کی وجہ سے ہمارے موسیقی کو سرے سے وحشیانہ خیال کرنے لگتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ خود ہمارے ملک میں ذوق سلیم رکھنے والے اصحاب اس بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ۔

کتاب پیپلز آف آل نیشنز کی جلد سوئم میں سر ویلنٹائن کائرل نے ہندوستانی موسیقی کی نسبت جو الفاظ لکھے ہیں وہ قابل ملاحظہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں :-

موسیقی کے متعلق ہندوستانی مذاق نہایت عجیب سا واقع ہوا ہے ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جو توجہ اس کو سمجھنے میں دیگر ممالک کے لوگوں نے دی ہے یہ اس سے زیادہ توجہ کے لائق ہے ۔ بڑے بڑے اور کھیا تک شکل کے ساز نہایت ناقص مصالحہ سے تیار کئے جاتے ہیں ۔ ان آلات میں زیادہ تر توبنے استعمال ہوتے ہیں سازندے نہایت متانت سے اپنے ساز شروع کرتے ہیں ۔ اور ان سے ابتر آواز نکالنے کی ان تھک کوشش کرتے ہیں ۔

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا ۔ کہ ہمارا ڈھول اور سخت لکڑی کے ڈنکے انگریزی ڈرم اور بانات سے منڈھے ہوئے ڈنکوں کے مقابلہ میں نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ آواز میں بھی ایک وحشیانہ نظارہ پیش کرتے ہیں ۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہاونے ۔ گویا ہم خود مانتے ہیں کہ ہمارے ڈھولوں کی آواز ناخوشگوار ہے ۔ اسی طرح سے ہمارے شوخ اور کرخت آواز والے صندوقچی نما ہارمونیم جو ہمارے میوزک میں موجودہ زمانے میں اہم حصہ لیتے ہیں ۔ اور جن کی آواز کہ اکثر تعلیم یافتہ اصحاب بھی ناواقفیت کی وجہ سے پسند کرتے ہیں ۔ یورپ اور امریکہ کے شیریں آواز آرگنوں کے سامنے محض ایک مضحکہ خیز کھلونا ہیں ۔ یہ تو خیر یورپین ساز کی نقل ہے ۔ ہمارے اپنے دیسی ساز ابھی تک اُسی ابتدائی شکل میں ہیں جس میں آج سے دو ہزار برس قبل موجد نے انہیں ڈھالا تھا ۔ مغربی سازوں میں ہر روز نئی نئی اختراعیں ہوتی رہتی ہیں ۔ اور دن بدن ان کو شیریں زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ غرض کہ موسیقی کے ہر شعبہ میں ہم اہل مغرب کی فوقیت کے معترف ہونے پر مجبور ہیں ۔ علاوہ ازیں پیچیدہ اور آڑی تالوں کا استعمال اور حد سے زیادہ لے کاری کا شوق کم کر دینا چاہیئے ۔ تال کا پیچیدہ ہونا راگ اور دھن کو کسی طرح سے بھی خوبصورت نہیں بناتا ۔ یہ طبلہ کی جمناسٹک ہے اور گو جمناسٹک ناظرین کے لئے ایک قسم کے لطف کا باعث ہو سکتی ہے ۔ لیکن جمناسٹک انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری نہیں ہے ۔ معمولی ورزش اس غرض کے لئے بہتر اور زیادہ مفید ہے ۔ اسی طرح سے موسیقی کی صحت اور خوبصورتی کے لئے معمولی سادہ تالوں کی ورزش پیچیدہ تالوں اور لے کاری کی جمناسٹک سے زیادہ مناسب اور ضروری ہے ۔

اور سب سے آخری اصلاح ہارمنی کے متعلق ہے ۔ ہمارے موجودہ گیتوں کو ہارمنی کی چنداں ضرورت نہیں ۔ لیکن جب ہمارے ذخیرہ میں قومی ترانے موجود ہو جائیں ۔ جب مارچ اور ڈانس ہمارے موسیقی میں حصہ لینے لگیں تو ہارمنی کی ضرورت ہم کو محسوس ہوگی ۔ ایک مجمع کے خیالات کو ۔ ایک فوج کے مارچ کو ۔ ایک بال روم کے ڈانس کو ۔ ایک بھجن منڈلی کی مناجات کو جس عمدگی کے ساتھ ہارمنی ظاہر کر سکتی ہے خالی میلوڈی میں اتنی طاقت نہیں ۔

پس ہمیں چاہیئے کہ تعصب اور بیجا فخر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نقائص پر غور کریں اور اوروں کی خوبیوں کو دیکھیں اور اگر کسی میں کوئی چیز قابل تقلید ہو تو باقی باتوں کو چھوڑ کر اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں ۔

محمد افضل خاں
بی ۔ سی ۔ ایس

قربانی

پتیرا کا ایک مندر

مہارانی گوناوتی داخل ہوتی ہے۔

گوناوتی - (دیوی سے مخاطب ہوکر) ماتا! تو کیوں مجھ سے خفا ہے - مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے - تو نے ان بھیک مانگنے والی عورتوں کو بچے بخشے ہیں - جوان کو بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہیں - تو نے ان گنہگار عورتوں پر رحم کیا ہے جو بدنامی کے خوف سے اپنے گوشت اور خون سے بنے ہوئے بچوں کا گلا گھونٹ دیتی ہیں - اور میں ہوں کہ ملک کی مہارانی ہونے کے باوجود - اولاد کے لئے تڑپ رہی ہوں - میں نے کیا گناہ کیا ہے ماتا! کہ مجھے اولاد کی بہار سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

رگھوپتی مندر کا پجاری داخل ہوتا ہے

گروجی! میں نے کیا کیا ہے کہ دیوی مجھ پر رحم نہیں کرتی؟ میں کیوں دیوی کی کرپا سے محروم ہوں؟ کیا میرے ہی دیوتاؤں کی طرح پاک و صاف نہیں ہیں؟

رگھوپتی - مہارانی - دیوی جی کسی اصول کی پابند نہیں - ہمارے دکھ اور سکھ - اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے - مگر صبر کرو - آج دیوی کے لئے خاص قربانی دی جا رہی ہے - شائد تمہاری آرزو پوری ہو۔

گوناوتی - گروجی - میں نے قربانی کی چیزیں محل سے روانہ کر دی ہیں - پہنچنے والی ہونگی -

دونوں چلے جاتے ہیں۔

مہاراج گوونداِ - مندر کا پجاری جے سنگھ اور اپارنا ایک نوجوان بھکارن داخل ہوتے ہیں۔

جے سنگھ - مہاراج آپ کی کیا اچھیا ہے۔

گووندا - کیا یہ سچ ہے کہ اس بھکارن کی پالتو بکری بھینٹ چڑھا دی گئی ہے؟ اور وہ بھی جبراً - کیا دیوی اس قسم کی قربانی سے خوش ہوگی -

جے سنگھ - مہاراج - ہمیں کسطرح معلوم ہو سکتا ہے کہ مندر کے ملازم قربانی کہاں سے لاتے ہیں - بچی - تو کیوں رو رہی ہے؟ ماتا نے تیری بکری کی قربانی کو منظور کر لیا ہے تو کیوں روتی ہے۔

اپارنا - ماتا! میں اس کی ماتا تھی - اگر کبھی مجھے اپنی جھونپڑی تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی - تو وہ گھاس کھانا چھوڑ دیتی تھی - اور چشم براہ - منتظر کھڑی ہو جاتی تھی - میں اسے اپنی گود میں لیکر گھاس کھلاتی تھی - اسے میرے سوا اور کسی ماتا کا علم نہیں ہے۔

جے سنگھ - مہاراج اگر میری موت اپارنا کی بکری کو زندہ کر سکے تو مجھے مرنے سے کوئی خوف نہیں - میری ہزار جانیں آپکی اچھیا پر قربان ہوں - مگر میں مردے کو زندہ نہیں کر سکتا جو چیز ماتا نے لے لی ہے وہ واپس نہیں آسکتی -

اپارنا - دیوی ماتا! ماتا! کیا تو ایک بھکارن کی محبت کو برباد کر کے خوش ہوتی ہے - تو میں تیری فریاد لے کر کہاں جاؤں - مہاراج مجھے بتلائیے میں اپنی فریاد لے کر کہاں جاؤں - مہاراج مجھے بتائیے میں اپنی فریاد لیکر کہاں جاؤں -

گووندا - بچی میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے -

اپارنا - یہ خون جو سیڑھیوں پر بہہ رہا ہے - کیا یہ اسی کا ہے - آہ! میری غریب بکری - جب تو موت کی تکلیف میں چلاتی ہوگی اس وقت دنیا کے بہرے لوگوں نے تیری آواز نہ سنی!

جے سنگھ - (دیوی کی مورتی سے) دیوی اکالی! میں نے بچپن سے تیری پوجا کی ہے مگر ابھی تک میں تیری باتوں کو سمجھ نہ سکا - کیا رحم صرف غریب کمزور انسانوں کا حصہ ہے - کیا دیوتا اس چیز سے ناواقف ہیں - آ - بچی میرے ساتھ آ - جب دیوتا مدد کرنے سے انکار کریں اس وقت انسانوں کی مدد لیتے ہیں - کوئی شرم نہیں ہونی چاہئے۔

جے سنگھ اور اپارنا چلے جاتے ہیں

رگھوپتی - مہاراج کا بھائی نکشارتا - اور درباری داخل ہوتے ہیں۔

(تمام ملکہ) مہاراج کی جے۔

گووندا۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں آج سے اس مندر میں خون بہانا منع کرتا ہوں۔

وزیر۔ آپ دیوی پر قربانی چڑھانے سے منع کرتے ہیں۔؟

نیان رائے۔ قربانی کو منع کرتے ہیں۔؟

نکشارتا۔ کسقدر خوفناک بات ہے۔ قربانی کی ممانعت؟

رگھوپتی۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

گووندا۔ نہیں گروجی۔ آپ خواب نہیں دیکھ رہے ہے۔ یہ بیداری ہے۔ دیوی نے میرے لئے کھ کارن کا روپ دھارا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں خون بہانے سے تمام لوگوں کو منع کر دوں۔

رگھوپتی۔ لیکن شروع سے دیوی خون پیتی رہی ہے۔

گووندا۔ نہیں۔ دیوی نے کبھی خون نہیں پیا۔ وہ ہمیشہ منہ موڑ لیا کرتی تھی۔

رگھوپتی۔ مہاراج۔ سوچئے۔ آپ کو کوئی اختیار نہیں کہ آپ قربانی کی ممانعت کر دیں۔

گووندا۔ خدا کے قانون انسان کے قانون سے بلند تر ہیں۔

رگھوپتی۔ اپنی بے وقوفی کے ساتھ اپنے غرور کو نہ ملاؤ۔ کیا آپ کو یہ بات کہنے کی جرأت ہوئی کہ صرف آپ نے دیوی کا حکم سنا ہے اور میں نے نہیں۔

نکشارتا۔ کیا عجیب بات ہے کہ مندر کے پجاری تو دیوی کے حکم سے ناآشنا ہیں اور مہاراج کو اس حکم کا پتہ چل جائے۔

گووندا۔ پرماتما کے احکام دنیا میں گونج رہے ہیں۔ جو لوگ نہیں سنتے وہ خود ان کا اپنا قصور ہے۔

رگھوپتی۔ ناستک۔

گووندا۔ جاؤ۔ گروجی! پجاریوں سے کہدو کہ آج سے جو کوئی مندر پر خون کی قربانی چڑھائیگا۔ اسے بن باس دیا جائیگا۔

رگھوپتی۔ یہ آپ کا آخری حکم ہے۔

گووندا۔ ہاں۔

رگھوپتی۔ تو میں تم پر لعنت کرتا ہوں۔ کیا تم اپنے غرور میں یہ خیال کرتے ہو کہ دیوی تمہارے قانون کی پابند ہے۔ کیا تم اسے اپنے احکام کے ذریعے گدی سے اتارنا چاہتے ہو۔ تم کبھی ایسا نہ کر سکو گے۔ میں کہتا ہوں۔ میں جو دیوی کا پجاری ہوں۔

نیان رائے۔ معاف کیجئے مہاراج۔ کیا آپ کو ایسا اختیار حاصل ہے۔

وزیر۔ مہاراج کیا آپ اپنا حکم بدل نہیں سکتے۔

گووندا۔ ہم گناہ کی جڑ اکھیڑنے میں تامل نہیں کر سکتے۔

وزیر۔ گناہ کبھی اتنے عرصے پنپ نہیں سکتا

مہاراج خاموش ہیں۔

نکشارتا۔ ہاں ٹھیک ہے۔

وزیر۔ ہمارے باپ دادا خون کی قربانی دیتے آتے ہیں۔

مہاراج خاموش ہیں

نیان رائے۔ کیا آپ ہمارے باپ دادا کی رسموں کو مٹا دینا چاہتے ہیں؟

گووندا۔ خاموش! جاؤ۔ میرے حکم کو مشتہر کر دو۔

وزیر۔ مگر مہاراج۔ ملکہ نے جو قربانی دیوی کے لئے بھیجی ہے وہ مندر کے قریب آ پہنچی ہے۔

گووندا۔ واپس کر دو۔

چلا جاتا ہے۔

وزیر۔ یہ کیا بات ہے۔

نکشارتا۔ کیا اب ہم بودھ مذہب کے پیروں کی طرح جانوروں سے ایسا سلوک کرینگے گویا وہ زندگی کے مستحق ہیں۔

تمام چلے جاتے ہیں۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔ جے سنگھ اس کے عقب میں پانی کا ایک برتن اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ۔ گروجی!

رگھوپتی۔ جاؤ۔

جے سنگھ۔ جل لیجئے۔

رگھوپتی۔ کوئی ضرورت نہیں۔

جے سنگھ۔ آپ کے کپڑے۔

رگھوپتی۔ لے جاؤ۔

جے سنگھ۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔

رگھوپتی۔ جاؤ۔ گناہ کے سایے گہرے ہو رہے ہیں۔ مہاراج کا تخت مندر سے بلند ہونا چاہتا ہے۔ جا۔ بیٹا۔ میرا دل اداس ہے۔ میرا دماغ پریشان ہے۔

جے سنگھ۔ کیا ہوا ہے گروجی!

رگھوپتی۔ میرے پاس لفظ نہیں کہ میں تجھے جواب دے سکوں

دیوی سے پوچھ - جس کی بے عزتی ہوئی ہے -

جے سنگھ - بے عزتی کس نے کی ہے -

رگھوپتی - گووندا نے کی ہے -

جے سنگھ - گووندا نے دیوی کی بے عزتی کی ہے -

رگھوپتی - ہاں - صرف دیوی ہی کی نہیں - بلکہ اس نے تمہاری، میری - مندر کی - ویدوں کی - تمام کی بے عزتی کی ہے -

جے سنگھ - مہاراج گووندا!

رگھوپتی - ہاں - مہاراج گووندا - ٹھیک ہے بیٹا - میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا کیا ہے - اور پھر بھی تو مہاراج گووندا کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے -

جے سنگھ - بچہ باپ کی گود میں بیٹھ کر چاند کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے - آپ میرے باپ ہیں - اور مہاراج گووندا چاند - تو یہ جو میں لوگوں سے سن رہا ہوں کہ مہاراج نے قربانی کی ممانعت کر دی ہے - سچ ہے -

رگھوپتی - ہاں - اور جو کوئی یہ حکم نہ مانے اسے بن باس دیا جائیگا -

جے سنگھ - جس ملک میں دیوی کی توہین ہو - وہاں سے نکل جانا کوئی مصیبت کی بات نہیں ہے - نہیں - جب تک میں جیتا ہوں مندر کے تمام رسوم و رواج پورے ہونگے -

دونوں چلے جاتے ہیں

گوناوتی اور ملازم داخل ہوتے ہیں -

گوناوتی - کیا کہہ رہے ہو تم - مہارانی کی قربانی واپس کر دی گئی - کیا اس ملک میں کوئی ہے جو ایسی بات کرنے کا ارادہ کرے - کون ہے وہ بدنصیب شخص -

ملازم - مجھے اس کا نام لیتے ہوئے خوف آتا ہے -

گوناوتی - خوف آتا ہے - کیسا خوف - کیا مجھ سے زیادہ خوفناک شخص بھی اس ملک میں موجود ہے -

ملازم - مہارانی مجھے معاف کیجئے -

گوناوتی - ابھی کل کی بات ہے کہ دربار کے شاعروں نے میری تعریف میں کبت پڑھے تھے - برہمنوں نے مجھے اشیرباد دی تھی - اور ملازموں نے بچوں و چرا میرے احکام کی تعمیل کی - کل سے لیکر آج تک کیا واقع ہوا ہے کہ ملک کا تمام انتظام بدل گیا ہے - دیوی پر قربانی چڑھانے کی اجازت نہیں رہی - اور مہارانی کے احکام بے معنی ہو گئے ہیں - جاؤ - مندر کے پجاری کو میرا سلام کہو - اور انہیں یہاں بلا لاؤ -

ملازم چلا جاتا ہے -

گووندا داخل ہوتا ہے -

گوناوتی - مہاراج آپ نے کچھ سنا - میں نے جو چیزیں دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے بھیجی تھیں وہ دیوی کے مندر سے واپس بھیج دی گئی ہیں -

گووندا - ہاں مجھے معلوم ہے -

گوناوتی - آپ کو معلوم ہے - اور آپ اس توہین کو خاموشی سے برداشت کر لینگے -

گووندا - میں گنہگار کی طرف سے تم سے معافی کا خواستگار ہوں -

گوناوتی - میں جانتی ہوں مہاراج کہ آپ بہت رحمدل ہیں - لیکن یہ رحم کا موقع نہیں - اس موقع پر رحم کا اظہار کمزوری کے برابر ہوگا - اگر آپ کا رحم مجرم اور اس کی سزا کے درمیان حائل ہوتا ہے - تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں مجرم کو سزا دیدوں - کم از کم مجھے یہ تو بتائیے کہ وہ کون ہے؟

گووندا - میں خود رانی! میرا گناہ صرف اسقدر ہے کہ میں نے تمہارے دل کو دکھ پہنچایا -

گوناوتی - میں کچھ نہیں سمجھی مہاراج -

گووندا - آج سے مندر میں خون بہانا ناجائز قرار دیا گیا ہے -

گوناوتی - کس نے یہ حکم دیا ہے؟

گووندا - دیوی - ماتا نے

گوناوتی - اس کے احکام کس نے سنے ہیں -

گووندا - میں نے -

گوناوتی - مجھے ہنسی آتی ہے مہاراج - تمام سنسار کی مہارانی اپنی درخواست لے کر بھکاری کے پاس آئی ہے - کتنی پر لطف بات ہے -

گووندا - اپنی درخواست لیکر نہیں - اپنا دکھڑا لیکر - اپنا غم لیکر -

گوناوتی - مہاراج آپ کا اختیار مندر کی حدود سے باہر ہے آپ اپنے احکام ایسی جگہ کے لئے جاری کیجئے جہاں اُن کی اطاعت گستاخی کہلائے

گووندا - میں نے حکم نہیں دیا - خود دیوی کا یہی فرمان ہے -

گوناوتی - اچھا اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا حکم ٹھیک ہے - تو

میرے راستے سے ہٹ جائیے مجھے اپنے دھرم کی رسوم کو پورا کرنے کی اجازت دیجئے۔

گوندا - میں نے دیوی سے وعدہ کیا تھا کہ میں مندر میں خون نہ بہنے دونگا - اور مجھ پر اس وعدے کی پابندی لازمی ہے -

گوناوتی - میں نے بھی منت مانی تھی کہ میں دیوی پر ۔ ۔ ۔ ایکسردوں کی بھینٹ چڑھاؤنگی - اور مجھ پر اس منت کا پورا کرنا فرض ہے آپ تشریف لیجائیں -

گوندا - بہت اچھا -

چلا جاتا ہے -

رگھوپتی داخل ہوتا ہے -

گوناوتی - گروجی - میری قربانی کی چیزیں واپس بھیج دی گئیں -

رگھوپتی - مہارانی! غریب کنگال اور پتیرا کی رانی دیوی کی نظر میں برابر ہیں - مگر بدقسمتی سے دیوی سے قربانیاں چھین لی گئی ہیں - بدقسمتی سے مہاراج کا غرور دیوتاؤں کو وحشی جانوروں کی طرح نگل جانا چاہتا ہے - مہاراج کے غرور نے بھوکے شیر کی طرح پجاریوں پر اپنی آگ برسانے والی آنکھیں گاڑ رکھی ہیں -

گوناوتی - اب کیا ہوگا گروجی!

رگھوپتی - بیٹی - اس بات کا علم صرف اسی کو ہے جو سپنوں میں سنسار کے کاروبار کا انتظام کرتی ہے - لیکن یہ ضرور ہے کہ عنقریب وہ تخت جو اپنا سایہ دیوی کے مقدس مندر پر ڈال رہا ہے - بلبلے کی طرح ٹوٹ جائیگا -

گوناوتی - رحم کیجئے - گروجی - ہمیں بچا لیجئے -

رگھوپتی - میں! میں کون ہوں - مہارانی - آپ مہاراج کی استری ہیں اور مہاراج تو دیوتاؤں سے بھی اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں - آپ کو کیا خوف ہوسکتا ہے - آہ! کیا زمانہ آگیا ہے کہ برہمن کا سراپ خود اسی کو زہریلے سانپ کی طرح ڈس لیتا ہے - اپنا جنیو توڑ دینا چاہتا ہے -

گوناوتی - (رو کتے ہوئے) رحم کیجئے - گروجی - رحم کیجئے -

رگھوپتی - تو برہمنوں کا حق واپس دلائیے -

گوناوتی - ایسا ہی ہوگا - جائیے گروجی - آپ اپنا کام کیجئے - کسی میں یہ طاقت نہیں کہ آپ کو روک سکے -

رگھوپتی - آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا - آپ کی ایک کرپا کی نظر سے دیوی کی عزت بچ گئی ہے -

چلا جاتا ہے -

مہاراجہ گوندا داخل ہوتا ہے -

گوندا - مہارانی! تمہاری قہر بھری نظروں کے اندھیرے نے میرے لئے دنیا کو تاریک کر دیا ہے -

گوناوتی - جاؤ - اس گھر پر برہمنوں کا سراپ نہ لاؤ -

گوندا - عورت کی مسکراہٹ تمام سزاؤں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے - محبت خدا کا رحم ہے -

گوناوتی - جاؤ - چلے جاؤ - میں تمہارا منہ نہیں دیکھنا چاہتی -

گوندا - مہارانی - اب میں اس وقت واپس آؤنگا جب تم مجھے یاد کرو گی -

گوناوتی راجہ کے قدموں سے لپٹ جاتی ہے -

گوناوتی - معاف کیجئے - مہاراج - معاف کیجئے - کیا آپ اسقدر جابر ہو گئے ہیں کہ عورت کے غرور کی کبھی کوئی عزت نہیں کرنا چاہتے - میری جان کے مالک - کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ دھتکاری ہوئی محبت غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے -

گوندا - جس دن میں نے تم پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا - اسدن میری میری موت یقینی ہے - پیاری میں جانتا ہوں کہ بادل چند لمحوں کے لئے ہیں - اور سورج کی روشنی ہمیشہ کے لئے -

گوناوتی - ہاں - بادل چھنٹ جائیں گے - دیوتاؤں کی بجلی واپس لوٹ جائیگی - میرے راجہ - حکم دو کہ لوگوں کو بھینٹ چڑھانے کی اجازت ہے -

گوندا - برہمنوں کو خدائی قانون توڑنے کا کوئی حق نہیں ہے جانداروں کا خون دیوی کے لئے کبھی قربانی نہیں بن سکتا - راجہ کو حق ہے کہ سچائی کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک لڑا دے -

گوناوتی - میں آپ کے چرنوں کو چھوتی ہوں - مہاراج - میں زمین پر گر کر آپ سے التجا کرتی ہوں - کہ اپنا حکم منسوخ کر دیجئے - رواج پر راجہ کو کوئی حق نہیں - ٹھنڈی ہوا کی طرح دھرم تمام لوگوں کے لئے عام ہے آہ! آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا!

اٹھ کھڑی ہوتی ہے

گوناوتی - جابر مہاراجہ! تجھ پر التجاؤں کا - میری درخواستوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا - تو محبت کو چھوڑ کر فرض کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے - دیکھ دیوی کے غصے سے ڈر!

دونوں چلے جاتے ہیں -

رگھوپتی - جے سنگھ اور نین رائے داخل ہوتے ہیں

رگھوپتی - بیٹا نین رائے - تو فوج کا سردار ہے - اور دیوی سے تیری عقیدت کہاوت کی طرح مشہور ہے -

نین رائے - ٹھیک ہے گروجی - میں نے دیوی کی محبت ورثے میں پائی ہے -

رگھوپتی - تو اپنے دل کو دیوی کی محبت سے مضبوط کر - اپنی تلوار کو دیوتاؤں کی قہری بجلی سے زیادہ خوفناک بنالے - میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی فوج لیکر دیوی کے دشمن کو خاک میں ملادے -

نین رائے - وہ دشمن کون ہے - گروجی!

رگھوپتی - گووندا -

نین رائے - مہاراج -

رگھوپتی - ہاں مہاراج - اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ کردو -

نین رائے - گروجی - کیا آپ میرا امتحان لے رہے ہیں؟

رگھوپتی - ہاں نین رائے - میں تیرا امتحان لے رہا ہوں - میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو دیوی کا بھگت ہے یا نہیں - تجھے معلوم ہونا چاہئیے کہ دیوی کی محبت کے آگے دنیا کے تمام رشتے ہیچ ہیں

نین رائے - میرے دل میں کوئی شک نہیں گروجی!

رگھوپتی - شاباش -

نین رائے - میں دیوی کے کس قسم کے بھگتوں میں سے ہوں کہ دیوی مجھے اپنے مالک سے دغا کرنے کا حکم دیتی ہے - دیوی پر لوگوں کا ایمان ہے - یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ میرے ایمان کو برباد کرنے کی خواہشمند ہو -

جے سنگھ - کتنے شاندار لفظ ہیں -

رگھوپتی - نین رائے - مہاراج نے دیوی سے منہ موڑ لیا ہے - اب اسے تم پر کوئی حق نہیں رہا -

نین رائے - میں بحث نہیں کرنا چاہتا مہاراج - میں دیوی کا غلام ہوں - اور میرے لئے صرف ایک راستہ ہے - سچائی اور ایمان کا راستہ - دیوی کا یہ بیوقوف غلام کبھی عزت کے راستے سے نہ ڈگمگائیگا -

چلا جاتا ہے -

جے سنگھ - گروجی - فوج کی مدد کی کیا ضرورت ہے - ہمیں دیوی نے بڑی انتہا طاقتیں بخشی ہیں - آئیے - مندر کے دروازے کھول دیں - اور لوگوں کو بلائیں -

نقارہ بجاتا ہے - لوگ جوق درجوق داخل ہوتے ہیں -

گووندا داخل ہوتا ہے -

گووندا - خاموش - رگھوپتی - تم میرے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہو -

رگھوپتی - ہاں -

گووندا - تو پھر تم میرے ملک میں نہیں رہ سکتے -

رگھوپتی - میرا وطن وہ ہے جہاں مہاراج کا تاج نہیں [illegible] لاؤ - جے سنگھ - دیوی کے لئے بھینٹ لاؤ -

گووندا - خاموش! میری فوج کے سردار کو بلاؤ - (رگھوپتی) - تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں خدا کے قانون کے لئے دنیا کی مدد طلب کروں - مجھے شرم آتی ہے - کیونکہ ہتھیار کی طاقت انسان کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے -

رگھوپتی - ناستک - کیا تجھے یقین ہے کہ برہمن کے سراپ کی آگ کے شعلے بجھ گئے ہیں - نہیں نہیں میرے سراپ کے شعلے میرے دل سے نکلکر تیرے تخت کو بھسم کردیں گے

فوج کا سردار نین رائے اور نائب سردار چندپال داخل ہوتے ہیں -

گووندا - اپنی فوج لیکر مندر میں کھڑے ہوجاؤ کہ یہاں جانداروں کی قربانی نہ ہونے پائے -

نین رائے - مہاراج - آپکا غلام مندر میں بے بس ہے -

گووندا - نین رائے - تمہیں میرے احکام پر نکتہ چینی کا کوئی حق نہیں - تم میرے احکام کو بجالاؤ - میں ذمہ دار ہوں -

نین رائے - مہاراج - میں آپ کا غلام ہوں - مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں انسان بھی نہیں - میرا دھرم ہے ایمان ہے -

گووندا - یہ بات ہے - تم چندپال کو اپنی تلوار دیدو -

نین رائے - کیوں؟ یہ تلوار میرے باپ دادا کو آپ کے بزرگوں نے دی تھی - اگر آپ یہ تلوار لینا چاہتے ہیں تو میں آپ ہی کو واپس دے سکتا ہوں -

تلوار دے دیتا ہے -

چلا جاتا ہے -

رگھوپتی - برہمن کے سراپ کے شعلے بھڑکنے لگے -

جے سنگھ داخل ہوتا ہے

جے سنگھ - جانور قربانی کے لئے تیار ہیں -

گوونا۔ قربانی؟

جے سنگھ۔ مہاراج۔ میں التجا کرتا ہوں آپ دیوی کو قربانی سے محروم نہ کیجئے۔

(مہاراج کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔)

رگھوپتی۔ اٹھو جے سنگھ۔ شرم کرو۔ میں تمہارا آقا ہوں۔ آؤ۔ چلیں۔

(چلے جاتے ہیں۔)

(اپارنا داخل ہوتی ہے۔)

اپارنا۔ جے سنگھ کہاں ہے؟ کہیں نہیں۔ (دیوی سے مخاطب ہوکر) تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ تو جسے غریبوں کی آہیں اور مظلوموں کی چیخ پکار ذرا بھی متاثر نہیں کرتی! ہم غریب تمام عمر محبت کے لئے ترس ترس کر جان دیدیتے ہیں۔ اور تیری محبت کیلئے لوگ جان تک دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو اس محبت کو کنجوس کی طرح قبر میں چھپا رکھتی ہے۔ آہ! جے سنگھ تجھے اس پتھر کے بت سے کیا ملتا ہے؟ کہ تو اس کو پیار کرتا ہے!

(رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔)

رگھوپتی۔ تو کون ہے!

اپارنا۔ میں بھکارنی ہوں۔ جے سنگھ کہاں ہے؟

رگھوپتی۔ چلی جا! یہاں سے۔ میں جانتا ہوں تو جے سنگھ کے دل کو دیوی سے چھیننا چاہتی ہے۔

اپارنا۔ کیا دیوی کو مجھ سے خوف آتا ہے؟

(چلی جاتی ہے۔)

(جے سنگھ اور نکشارتا داخل ہوتے ہیں۔)

نکشارتا۔ آپ نے مجھے بلایا تھا۔ گروجی!

رگھوپتی۔ ہاں بیٹا۔ کل دیوی نے مجھے خواب میں کہا کہ "نکشارتا سات دنوں میں مہاراجہ بن جائیگا۔"

نکشارتا۔ واہ! واہ!

رگھوپتی۔ ہاں۔ ہاں۔ تم تپیرا کے راجہ کہلاؤ گے۔

نکشارتا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔

رگھوپتی۔ تمہیں میرے الفاظ پر یقین نہیں آتا۔

نکشارتا۔ نہیں۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔

رگھوپتی۔ ایسا ضرور ہوگا!

نکشارتا۔ کیسے؟

رگھوپتی۔ دیوی مہاراج گوونداکے خون کی پیاسی ہے۔

نکشارتا۔ مہاراج کے خون کی؟

رگھوپتی۔ اگر تم مہاراج بننا چاہتے ہو تو دیوی کو گوونداکا خون پلاؤ۔

نکشارتا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خون کہاں سے آئیگا۔

رگھوپتی۔ مار دو۔ چپکے سے گوونداکو مار دو۔ خاموش رہو۔ جے سنگھ لیکن یہ ضرور ہے کہ ——— جے سنگھ اگر تم خاموش نہیں رہ سکتے تو چلے جاؤ۔

نکشارتا۔ لیکن گروجی۔ گووندا میرا بھائی ہے۔ میرا خون ہے۔

رگھوپتی۔ اسی لئے تو تمہاری قربانی اور بھی زیادہ قیمتی ہوگی۔

نکشارتا۔ گروجی! میں مہاراجہ بننا نہیں چاہتا۔

رگھوپتی۔ نکشارتا۔ دیوی کی اچھیا ہے کہ تم تپیرا کے راجہ بنو۔ دیوی شاہی خون کی پیاسی ہے۔ اگر گووندا بچ گیا تو تم مارے جاؤ گے۔

نکشارتا۔ رحم کیجئے۔ گروجی!

رگھوپتی۔ جب تک تم دیوی کی پیاس نہ بجھاؤ گے۔ اسوقت تک تمہیں چین نہیں آسکتا۔

نکشارتا۔ تو میں کیا کروں گروجی۔ مجھے مشورہ دیجئے۔

رگھوپتی۔ انتظار کرو۔ وقت آنے پر میں تمہیں بتاؤنگا۔

(نکشارتا چلا جاتا ہے۔)

جے سنگھ۔ یہ میں نے کیا سنا ہے گروجی! دیوی جی! ماتا! کیا یہ آپ کا حکم ہے۔

رگھوپتی۔ چپ رہ جے سنگھ!

جے سنگھ۔ دیوی جی! کیا آپ گناہ کے خنجر سے کٹے ہوئے گلے کا خون پی کر خوش ہونگی۔

رگھوپتی۔ تو کیا جانتا ہے۔ جے سنگھ۔ چپ رہ۔ تجھے گناہ کی کیا خبر۔

جے سنگھ۔ گروجی۔ میں نے آپ سے گناہ کے متعلق جو کچھ سیکھا اور پڑھا ہے کیا وہ سب غلط تھا؟

رگھوپتی۔ ادھر آ۔ میں تجھے پھر سبق دیتا ہوں۔ سن جے سنگھ۔ گناہ دراصل کوئی شے نہیں۔ کسی کو قتل کر دینا بس قتل کر دینا ہے۔ اس میں کوئی پاپ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ مٹی ہزاروں بے گناہوں کے خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔ وقت ہمیشہ خون کے حرفوں میں انسان کی تاریخ لکھتا رہتا ہے۔ صحراؤں میں۔ جنگل میں۔ آبادی میں۔ شہر میں۔ گاؤں میں۔

ہمیشہ خون کے دریا بہتے رہتے ہیں۔ دنیا ایک دوسرے کو قتل کردینے
کی فکر میں رہتی ہے۔ اور دیکھ۔ کالی دیبی۔ اپنی زبان باہر نکالے
ہوئے خون خون پکار رہی ہے۔ اور اس کے پیالے میں سے
دنیا کا خون اس طرح بہہ رہا ہے جس طرح پچڑے ہوئے انگوروں
سے رس بہہ رہا ہو۔

جے سنگھ۔ ٹھہریے گروجی! تو کیا محبت جھوٹ ہے۔ اور رحم
صرف مذاق کو کہتے ہیں۔ کیا شروع سے لیکر آجتک صرف قتل و
غارت ہی کا نام سچائی رہا ہے؟ گروجی۔ آپ میرے دل
سے کھیل رہے ہیں۔ دیکھئے۔ دیوی میری طرف دیکھکر طنز
سے مسکرا رہی ہے۔ ماتا! اگر تجھے خون ہی پینا ہے تو میرا
پی لے۔ میں اپنی چھاتی میں خنجر گھونپ کر تیری پیاس کو بجھا
دونگا۔ اگر میری رگوں میں بہنے والا خون تجھے پسند ہے تو اپنی
رگ رگ کو چیر کر پھینکدونگا۔ لیکن۔ گووندا کا خون! دیوی!
رحم کر۔

رگھوپتی۔ تو پھر مندر میں قربانی بند ہوجائے۔

جے سنگھ۔ ہاں ...... نہیں گروجی۔ آپ بہتر جانتے ہیں۔
دل کے قانون ویدوں کے قانون نہیں ہیں۔ معاف کیجئے گروجی!
کیا یہ سچ ہے کہ دیوی جی مہاراج کے خون کی پیاسی ہیں؟

رگھوپتی۔ بیٹا کیا تجھے مجھ پر یقین نہیں رہا؟

جے سنگھ۔ گروجی! اگر دیوی جی ضرور گووندا کا خون پینا چاہتی ہیں
تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا خون لے آؤں۔ یہ تو بہت
ناانصافی ہے کہ بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خون ہو۔ نکشاترا
کو معاف کیجئے اور یہ فرض میرے سپرد کیجئے۔

رگھوپتی۔ میں سوچونگا۔

چلا جاتا ہے۔

جے سنگھ۔ خیالات اور شبہات کے دوزخ میں پڑے رہنے سے کام کرنا اچھا
ہے۔ چاہے وہ برا ہی کیوں نہ ہو۔ آہ۔ دنیا کسقدر خوبصورت
ہے۔ یہ لوگ کسقدر اطمینان سے گزرتے جارہے ہیں۔ انکو
کوئی فکر نہیں ہے۔ میں بھی انہیں کے ساتھ ہولیتا ہوں۔

چلا جاتا ہے۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔

رگھوپتی۔ جے سنگھ

جے سنگھ! میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم کیوں مجھے روکتے ہو۔ اپنی
راہ لو۔

رگھوپتی۔ جے سنگھ!

جے سنگھ! میرے سامنے سیدھا راستہ ہے۔ ایک ہاتھ میں
بھیک کا پیالہ۔ اور دوسرے میں بھکارن اپارنا کو تھامے
ہوئے میں سفر کرتا رہونگا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا کے راستے
مشکل ہیں۔ آخر کار ہم منزل تک آ پہنچتے ہیں۔ وہ منزل جہاں
کوئی قانون نہیں۔ جہاں زندگی کی غلطیاں اور تکلیفیں فراموش
ہو جاتی ہیں۔ جہاں ابدی راحت اور سرور ہے۔ ویدوں
اور گرو کی کیا ضرورت ہے! آہ! گروجی۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟
وہ سامنے مندر ہے۔ اور دیوی کا قانون اٹل ہے۔ آپ نے
میرے ذمے کیا خدمت سپرد کی تھی گروجی!

خنجر نکال کر دکھاتا ہے۔

میں آپکے لفظ اپنے دل میں دہرا رہا ہوں تاکہ وہ بھی اس
خنجر کی دھار کی طرح تیز ہوجائیں۔ گروجی اور کیا حکم ہے۔

رگھوپتی۔ کچھ نہیں بیٹا۔ میں تجھے کس طرح بتاؤں کہ میرے دل میں
تیری کتنی عزت ہے۔ کتنی محبت ہے۔

جے سنگھ۔ میرے سامنے محبت کا نام نہ لیجئے۔ گروجی! صرف
فرض کا نام لیجئے۔ محبت سبز سبز گھاس کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔
اور فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن فرض بھاری پتھر کی طرح ہے جو اٹھائے
نہیں اٹھتا۔

گووندا اور چندپال داخل ہوتے ہیں۔

چندپال۔ مہاراج آپ ہوشیار رہئے۔

گووندا۔ کیا بات ہے چندپال۔ کس سے ہوشیار رہوں۔

چندپال۔ میں نے چند آدمیوں کو آپ کے تخت و تاج کے خلاف
سازش کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ لوگ آپ کے خون کے
پیاسے ہیں

گووندا۔ کون میرے خون کا پیاسا ہے۔

چندپال۔ میں ڈرتا ہوں کہ اس شخص کے نام کی اطلاع آپ کے
لئے خنجر کے زخم سے زیادہ دکھ دینے والی ہوگی۔ وہ شخص
نکشاترا تھا۔

گووندا۔ نکشاترا؟

چندپال۔ ہاں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ دیوی کو آپ کا خون پلائیگا

گووندا۔ دیوی کو؟ تو پھر مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جاؤ۔

مجھے تنہا چھوڑ دو۔

چندپال چلا جاتا ہے

گوونداویوی پر پھول نچھاور کرتا ہے۔

گوونڈا۔ دیوی پھولوں کا نذرانہ قبول کر۔ اہ! اگر تیری اچھیا ہے کہ میں اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جاؤں تو تیری اچھیا پوری ہو۔ میں جانتا ہوں کہ گناہ اسی وقت فنا ہوتا ہے جب پورے زور میں ہوتا ہے۔

جے سنگھ داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ۔ دیوی! کیا تو گوونڈا کا خون پینا چاہتی ہے۔

ایک آواز۔ ہاں۔ میں گوونڈا کا خون چاہتی ہوں۔

جے سنگھ۔ مہاراج۔ آپ کی موت کا وقت آگیا۔

مہاراج گوونڈا۔ کیوں جے سنگھ۔

جے سنگھ۔ کیا آپ نے دیوی کا حکم نہیں سنا۔

گوونڈا۔ نہیں۔ البتہ میں نے رگھوپتی کی آواز ضرور سنی ہے۔

جے سنگھ۔ رگھوپتی کی آواز! آہ! میں پاگل ہو جاؤنگا! ایک ہی بات ہے۔ آواز رگھوپتی کی ہو۔ یا دیوی کی۔

اپنا خنجر نکالتا ہے۔ پھر پھینک دیتا ہے۔

جے سنگھ۔ دیوی۔ اپنے بچوں کی آواز سن۔ صرف پھولوں کو۔ حسین وجمیل پھولوں کو اپنے بدن سے چھونے دے۔ اب خون نہ بہے۔ دیکھ۔ یہ پھول بھی خون کی طرح سرخ ہیں۔ گہرے سرخ۔ یہ پھول بھی دھرتی ماتا کے کلیجے سے آتے ہیں۔ اپنے ننھے ننھے بچوں کے مرجانے پر دکھ ہوتا ہوگا۔ ان پھولوں کو قبول کر۔ اب تجھے خون نہ ملیگا۔ میں کہتا ہوں۔ اگر تجھ میں کوئی طاقت ہے تو مجھے فنا کر دے۔ مہاراج آپ مندر سے چلے جائیں۔

گوونڈا چلا جاتا ہے۔

جے سنگھ۔ آہ! میں نے ایک لمحے میں دیوی اور مہاراج دونوں کو کھو دیا۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے

رگھوپتی۔ میں نے سب کچھ سنا ہے۔ دغا باز تو نے اپنے مالک سے دغا کی۔

جے سنگھ۔ مجھے سزا دیجئے گروجی!

رگھوپتی۔ کیا سزا ہو تیری۔

جے سنگھ۔ میری جان کو میرے گناہوں کا کفارہ خیال کیجئے۔

رگھوپتی۔ نہیں۔ کافی نہیں۔ دیوی کے چرنوں کو چھو کر قسم کھا جے سنگھ۔

جے سنگھ۔ میں دیوی کے چرنوں کو چھوتا ہوں۔

رگھوپتی۔ کہہ "میں آج آدھی رات سے پہلے دیوی کو شاہی خون پلاؤنگا۔"

جے سنگھ۔ "میں آج آدھی رات سے پہلے دیوی کو شاہی خون پلاؤنگا۔"

چلے جاتے ہیں۔

گوناوتی داخل ہوتی ہے۔

گوناوتی۔ میں ہار گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر کچھ دنوں میں اس سے کھنچی کھنچی رہوں۔ تو وہ خود بخود میرے قدموں میں آ گریگا۔ مگر میری سب امیدیں اکارت گئیں میں نے اپنے غصے کا اظہار کر کے اس کے دل کو نرم کرنا چاہا۔ مگر میرا غصہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ عورت کا غصہ ہیرے کی چمک کی طرح ہے۔ صرف چمکنے کے قابل ہے۔ جلانے کے قابل نہیں۔ کاش میرا غصہ دیوتاؤں کے قہر کی بجلی کی طرح ہوتا جو اسے میٹھی نیند سے جگا کر تازیانے کی طرح اس کے غرور کو مجروح کر دیتا۔

دردا ایک کم عمر لڑکا داخل ہوتا ہے۔

گوناوتی۔ کہاں جا رہا ہے تو۔

دردا۔ مجھے مہاراج نے یاد کیا ہے۔

گوناوتی۔ جا رہا ہے۔ مہاراج کا پیارا۔ ان کی آنکھوں کا تارا۔ اس نے میرے پیدا ہونے والے بچوں کی محبت کا حق چھین لیا ہے۔ دیوی! تیری کرپا چاہیئے۔ مجھے بھی اولاد دے۔ نرم گداز جسم والا بچہ جس سے میری تڑپتی ہوئی روح کو سکون حاصل ہو۔

نکشارتا داخل ہوتا ہے۔

کیوں نکشارتا۔ واپس کیوں جا رہے ہو۔

نکشارتا۔ مجھے نہ بلاؤ۔

گوناوتی۔ کیوں۔

نکشارتا۔ میں راجہ بننا نہیں چاہتا۔

گوناوتی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

نکشارتا۔ خدا مہاراج کو زندہ رکھے۔

گوناوتی۔ کچھ تمہیں خبر بھی ہے۔ ایک ننھا سا چور تمہارا تاج چرا کر لئے

جا رہا ہے۔

نکشارتا ۔ کون؟

گوناوتی ۔ درد ا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ مہاراج کو کتنا پیارا ہے۔ وہ بڑھ رہا ہے۔ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب وہ مہاراج کے تاج تک پہنچ جائیگا۔

نکشارتا ۔ ہاں۔ میں نے اکثر اپنے بھائی کو ہنسی ہنسی میں اُسکے سر پر تاج رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

گوناوتی ۔ تاج سے کھیلنا ایک خطرناک کھیل ہے۔

نکشارتا ۔ ٹھیک کہتی ہو۔

گوناوتی ۔ لڑکے کا خون دیوی کو پلا دو۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ دیوی خون کے لئے تڑپ رہی ہے۔

نکشارتا ۔ لیکن دیوی تو شاہی خون چاہتی ہے۔

گوناوتی ۔ یہ تم سے کس نے کہا۔

نکشارتا ۔ اس نے۔ جس کو دیوی خواب میں ملتی ہے۔

گوناوتی ۔ تو پھر اس لڑکے کی قربانی مہاراج کو بچانے کے لئے بہت ضروری ہے۔

نکشارتا ۔ میں سمجھتا ہوں۔

گوناوتی ۔ تو جاؤ۔ وہ ابھی

جے سنگھ داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ (دیوی سے مخاطب ہوکر) دیوی! اگر شام کے تاروں میں تیری روشنی کا ایک شرارہ بھی موجود ہے تو بول! اپنے خادم کے دل کو تسلی دے۔ ہلکی آواز میں کہہ دے "میں یہاں ہوں بیٹا"

کوئی نہیں ــــ دیوی کہیں نہیں۔ صرف فریب ہے۔ دہوکا ہے۔ کیا تو اسقدر بیجان ہے کہ میری محبت کا شعلہ بھی اس ٹھنڈے پتھر میں زندگی کی گرمی پیدا نہیں کرسکتا۔ بیوقوف جے سنگھ تو نے کس کے لئے اپنی زندگی کے ساغر کو اوندھا کر دیا ہے؟ اس پتھر کے بت کے لئے۔ حیف ہے تجھ پر۔ اس بت کے لئے جس میں نہ جان ہے۔ نہ محبت۔ نہ رحم۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا ۔ یہ لوگ تجھے مندر سے نکال دیتے ہیں۔ مگر تو پھر واپس لوٹ آتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تو سچائی ہے اور سچائی کو جلاوطن نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس مندر میں جھوٹ کی پوجا کرتے ہیں۔

پیاری۔ تو اسقدر اداس کیوں ہے۔ کیا تیرا بھی کوئی دیوتا کھویا گیا ہے۔ لیکن اس دنیا میں دیوتاؤں کی کیا ضرورت ہے۔

نہیں۔ میری پیاری۔ دنیا میں کوئی دیوی دیوتا نہیں ہے۔ تم سے زیادہ اس سزا کا صدمہ میرے دل کو ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ میں۔ تمہاری تکلیف میں شریک نہیں ہوسکتا۔ تمہاری جدائی میرے دلکو دکھاتی رہیگی۔

تمام چلے جاتے ہیں۔

رگھوپتی اور جے سنگھ داخل ہوتے ہیں۔

رگھوپتی ۔ میرا غرور کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے۔ میں نے اپنی ذات کو ذلیل کر دیا ہے۔ بیٹا اب میں تیرا گرو نہیں۔ کل تک مجھے اختیار تھا کہ تجھ پر حکم چلاؤں۔ آج میں صرف درخواست کرسکتا ہوں۔ وہ روشنی جس کی وجہ سے میں مہاراج کا مقابلہ کرسکتا تھا میرے سینے میں بجھ گئی ہے۔ مٹی کا دیا دوبارہ روشن ہوسکتا ہے۔ لیکن ستارہ ایکبار تاریک ہوکر پھر کبھی نہیں چمکتا۔ انسان کی عمر کے دن بے بقا ہیں۔ کم مایہ ہیں۔ مگر میں نے مہاراج سے ایک دن کی مہلت طلب کی۔ اب یہ دن ضائع نہ جائے۔ اس دن کے تاریک ماتھے پر مہاراج کے خون کا ٹیکہ لگے۔ کیوں خاموش ہو بیٹا۔ کیا مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں۔ آہ۔ کسقدر بدنصیب ہے وہ جسے محبت کی بھیک مانگنی پڑے۔ تم کیوں چپ ہو بیٹا۔ اچھا لو دیکھو میں تمہارے سامنے جھک جاتا ہوں۔

جے سنگھ ۔ پتاجی! اس دل کو اور نہ دکھائیے جو پہلے ہی مجروح ہو چکا ہے۔ اگر دیوی شاہی خون کی پیاسی ہے تو میں آج شام کو اس کی پیاس بجھا دونگا۔ میں اپنے تمام قرضے اتار دونگا۔ میری واپسی کے لئے تیار رہئے۔

چلا جاتا ہے

باہر شور اٹھتا ہے۔

رگھوپتی ۔ آخرکار دیوی۔ خوفناک دیوی نے آنکھیں کھول لیں۔ اور اس کا سراپ گلیوں میں چیختا ہوا پھر رہا ہے۔ بھوکی طاقتیں دنیا کے درخت کی شاخوں کو ہلا رہی ہیں۔ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا ۔ جے سنگھ کہاں ہے۔

رگھوپتی ۔ جا! کالے بھاگوں کی نشانی جا۔

اپارنا چلی جاتی ہے۔

رگھوپتی - اگر جے سنگھ نہ آیا تو کیا ہوگا۔ نہیں جے سنگھ اپنے وعدے کو پورا کریگا۔

جے سنگھ بھاگتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

رگھوپتی - جے سنگھ۔ کہاں ہے خون!

جے سنگھ - میرے پاس ہے۔ ہٹ جاؤ۔ گروجی۔ میں یہ خون خود اپنے ہاتھوں سے دیوی کی بھینٹ چڑھاؤنگا۔ (دیوی سے) دیوی! تجھے شاہی خون درکار ہے۔ ہے نا؟ میں خود کھتری ہوں۔ شاہی خاندان سے ہوں۔ میرے باپ دادا تخت وتاج کے مالک تھے۔ اور میری ماں کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑتا تھا۔ میری رگوں میں شاہی خون ہے۔ اسے قبول کر اور اپنی پیاس بجھالے۔

اپنے آپ کو خنجر مار کے گر پڑتا ہے۔

رگھوپتی - جے سنگھ۔ آہ۔ ظالم۔ تو نے کیا کر دیا۔ تو نے اپنے پتا کی چھاتی میں خنجر بھونک دیا۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا - میں پاگل ہو جاؤنگی۔ جے سنگھ کہاں ہے وہ؟

رگھوپتی - اپارنا۔ آ بیٹی۔ محبت بھرے الفاظ میں جے سنگھ کو بلا۔ اسے زندہ کر لے۔ اسے لیجا۔ میرے پاس سے لیجا۔ مگر اسے زندہ کر دے

اپارنا مندر میں داخل ہو کر غش کر جاتی ہے۔

رگھوپتی - مجھے دیدو۔ دیدو۔ جے سنگھ کو مجھے دیدو۔ (دیوی سے مخاطب ہو کر) دیکھنا اس اندھی دیوی کو۔ اس احمق پتھر کی مورت کو۔ بہری۔ اندھی۔ گونگی۔ دکھوں سے بھری ہوئی دنیا اس کے چرنوں میں رو رہی ہے۔ دل اس کے پتھر کے پاؤں پر نثار ہو رہے ہیں۔ میرا جے سنگھ مجھے دیدے۔ آہ! یہ سب بے سود ہے۔ ہماری چیخیں درد سے بھری ہوئی خلا میں آوارہ پھرتی ہیں۔ اس خلا میں جس کو ہم پتھر کے بتوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ نہیں۔ سب ہیچ ہے۔

دیوی کے بت کو پھینک دیتا ہے۔

اور صحن میں نکل آتا ہے۔

گوناوتی داخل ہوتی ہے۔

گوناوتی - دیوی کی جے۔ مگر دیوی کہاں ہے؟

رگھوپتی - دیوی کوئی نہیں۔

گوناوتی - اسے واپس لائیے۔ گروجی۔ میں قربانی لائی ہوں میں اپنے دل کے خون سے اس کی پیاس بجھاؤنگی۔

رگھوپتی - دیوی کہیں نہیں۔

گوناوتی - گروجی۔ کیا دیوی مندر میں نہیں تھی۔

رگھوپتی - بیٹی۔ اگر کوئی دیوی موجود ہوتی تو کیا وہ اس بات کی اجازت دیتی کہ یہ پتھر کا بت اس کی جگہ لیلے۔

گوناوتی - سچ بتائیے گروجی کیا دیوی کوئی نہیں۔

رگھوپتی - نہیں۔ دیوی کوئی نہیں۔

گوناوتی - پھر یہاں کیا ہوا کرتا تھا۔

رگھوپتی - کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

اپارنا مندر سے باہر آتی ہے۔

اپارنا - پتاجی!

رگھوپتی - بیٹی۔ کیا کہا تو نے! "پتاجی" کیا تو مجھے اس لفظ سے مخاطب کر کے شرمندہ کرنا چاہتی ہے۔ میرے مرحوم لڑکے نے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے مار ڈالا ہے۔ تیری میٹھی ادا ہی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

اپارنا - تو پھر مندر چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔

جے سنگھ - یہ مندر چھوڑ دوں۔ ہاں۔ ٹھیک کہتی ہے تو مندر چھوڑ دونگا میں۔ لیکن اپنا فرض ادا کر کے۔ مندر کا احسان اتار کے۔ ادھر آ۔ پیاری۔ مجھ سے اس قسم کی باتیں کر کہ دنیا تمام ایک میٹھی لوری کی طرح خوشگوار معلوم ہونے لگے۔ اور موت بھی ایک دفعہ اس موسیقی کے اثر سے مسحور ہو کر سو جائے۔

اپارنا - میرے دل میں اتنی محبت ہے کہ الفاظ میں سے نہیں نکلے۔

جے سنگھ - تو اپنا سر میری چھاتی پر رکھدے۔ دو ازلی چیزوں کی خاموشی کو ایک دوسرے سے ملنے دے۔ موت اور زندگی کو ہم آغوش ہونے دے . . . . . بس۔ اب مجھے جانا چاہئے۔

اپارنا - جے سنگھ میں مر جاؤنگی۔ اسقدر ظلم نہ کرو۔

جے سنگھ - میں ظالم ہوں؟ اسی بت کی طرح جو کونے میں کھڑا ہوا مسکرا رہا ہے۔ اپارنا۔ اگر تو دیوی ہوتی تو تجھے معلوم ہوتا کہ میرے دل میں کونسا شعلہ بھڑک رہا ہے۔

بھاگ کر نکل جاتا ہے۔

اپارنا - میرا دل ٹوٹ جائیگا -

چلی جاتی ہے

رگھوپتی اور نکشارتا داخل ہوتے ہیں۔

رگھوپتی - لڑکے کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے -

نکشارتا - جہاں قربانی کے برتن رکھے جاتے ہیں - وہ روتے روتے سوگیا ہے - میں جانتا ہوں کہ اس کا رونا مجھ سے برداشت نہ ہوگا -

رگھوپتی - جب جے سنگھ میرے پاس آیا ہے - اس کی بھی یہی عمر تھی - اور مجھے یاد ہے کہ وہ روتے روتے دیوی کے پاؤں کے پاس سوگیا تھا - مندر کا چراغ اس کے اشک آلود چہرے پر دھیمی دھیمی روشنی کی کرنیں ڈال رہا تھا - وہ رات بھی آج کی رات کی طرح ہوا کے جھکڑوں میں غرق تھی -

نکشارتا - گروجی! اب دیر نہ کیجئے - اس کے رونے کی آواز میرے دل کو تیز دھار والے خنجر کی طرح زخمی کردیتی ہے - میں اسے نیند - گہری نیند میں ....

رگھوپتی - اگر وہ جاگ پڑا تو میں اسے پھر بیہوش کردونگا -

نکشارتا - اگر آپ نے جلدی نہ کی تو مہاراج کو معلوم ہو جائیگا - کیونکہ آج شام وہ سلطنت کا کاروبار اس لڑکے کے حوالے کرنے والے ہیں -

رگھوپتی - دیوی پر ایمان رکھو - اب لڑکا دیوی کے پنجے میں ہے - وہ بچ کر نہیں جاسکتا -

نکشارتا - مگر چندپال بہت ہوشیار ہے -

رگھوپتی - دیوی سے زیادہ نہیں -

نکشارتا - ایسا معلوم ہوا ہے - گویا کوئی سایہ میرے پاس سے گذر گیا -

رگھوپتی - خوف کا سایہ -

نکشارتا - گروجی آپ کس کے چیخ کی آواز سن رہے ہیں -

رگھوپتی - تمہارے دل - ڈرے ہوئے دل کی دھڑکنے کی آواز ہے -

نکشارتا - گروجی - یہ کام کل پر نہ چھوڑ دیں -

رگھوپتی - نہیں - آج کی رات کل رات سے بہتر ہے -

نکشارتا - سنیئے - قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے -

رگھوپتی - مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا -

نکشارتا - وہ دیکھئے - روشنی نظر آتی ہے -

رگھوپتی - گووندا آرہا ہے - نکشارتا تو نے دیر کردی -

مہاراج ملازموں کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں

گووندا - گرفتار کرلو (رگھوپتی سے) تجھے کچھ کہنا ہے -

رگھوپتی - کچھ نہیں -

گووندا - تجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے -

رگھوپتی - جرم - میرا جرم یہی ہے کہ میں نے اپنی کمزوری کے باعث دیوی کی خدمت میں کوتاہی کی - یہ سزا دیوی کی طرف سے ہے - تم صرف اس کے آلہ کار ہو -

گووندا - رگھوپتی - تجھے میرے سپاہی جلاوطن کردینگے - اور تجھے آٹھ سال تک وطن سے دور رہنا ہوگا -

رگھوپتی - مہاراج میں نے آجتک کسی انسان کے آگے سر نہیں جھکایا - میں برہمن ہوں - میری ذات آپ سے اونچی ہے - میں آپ سے صرف ایکدن کی مہلت مانگتا ہوں -

گووندا - منظور ہے -

رگھوپتی - (طنز سے) آپ مہاراجوں کے مہاراج ہیں - آپ کی شوکت اور آپ کا رحم لاانتہا ہے -

چلا جاتا ہے -

گووندا - نکشارتا اپنے جرم کا اعتراف کرلو -

نکشارتا - میں گنہگار ہوں - مہاراج - اور معافی مانگنے کی جرأت نہیں کرسکتا -

گووندا - میں جانتا ہوں کہ تم دل کے نرم ہو - تمہیں کسنے بہکایا تھا نکشارتا؟

نکشارتا - میں کسی کا نام نہیں لونگا - مہاراج - میرا گناہ مجھی سے تعلق رکھتا ہے - آپ نے اس سے پہلے اپنے بھائی کو معاف کیا ہے - اور اسدفعہ بھی میں آپ سے اسی سلوک کی التجا کرتا ہوں -

گووندا - اٹھو نکشارتا - میرے قدم چھوڑ دو - مجرم سے زیادہ منصف قانون کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے -

ملازم - مہاراج - اپنے بھائی کو معاف کردیجئے -

گووندا - ٹھہرو - مجھے اس بات کو یاد رکھنے دو کہ میں راجہ ہوں - نکشارتا آٹھ سال تک اس مکان میں نظربند رہیگا جو تیرا کی

حدود کے باہر مقدس دریا کے کنارے واقع ہے۔

(نکشارنا کو اٹھا کر)

اپارنا۔ پتا جی۔ یہ مندر چھوڑ دیجئے۔ آئیے یہاں سے چلیں۔ مہاراج داخل ہوتے ہیں۔

گووندا۔ دیوی کہاں ہے۔

رگھوپتی۔ دیوی کہیں نہیں۔

گووندا۔ مگر یہ کس کا خون بہہ رہا ہے۔

رگھوپتی۔ مہاراج۔ جے سنگھ نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ اسے آپ سے بیحد محبت تھی۔

گووندا۔ کیوں؟

رگھوپتی۔ تاکہ اس جھوٹ کا پردہ فاش کر دے جو انسانوں کا خون چوس رہا ہے۔

گووندا۔ جے سنگھ کی جے۔ اس نے موت پر فتح پالی ہے۔ میرے پھول اسی کے لئے ہیں۔

گوناوتی۔ میرے راجہ۔

گووندا۔ میری پیاری!

گوناوتی۔ دیوی نہیں رہی۔

گووندا۔ ہاں اس نے پتھر کا قید خانہ توڑ کے اب عورت کے دل میں گھر کیا ہے۔

اپارنا۔ آئیے پتا جی!

رگھوپتی۔ چل بیٹی۔ میں نے دیوی کو پالیا ہے۔ یہی جے سنگھ کا آخری تحفہ تھا۔

عابدؔ

غزل

مقسوم دِل کروں خلش نیشتر کو میں
اب کے تری نظر سے لڑا دوں نظر کو میں

میرا مذاق عشق زمانے پہ کھل گیا
اب کیا کہوں چھپا نہ سکا چشم تر کو میں

خاموشئ جمود میں پھونکوں گا صورِ حشر
تیری خبر سنا کے دلِ بے خبر کو میں

یا آرزو نے عمرِ محبت سنوار دی
یا دستِ آرزو سے گیا عمر بھر کو میں

کتنی گداز بخش ہے صبحِ تجلیات
پاتا ہوں ہر نفس میں نسیمِ سحر کو میں

گریہ نشاطِ چشم ہے اے بیخودی مگر
کس دھوپ میں سکھاؤں گا دامانِ تر کو میں

ساغرؔ یہ ہے شباب میں معیارِ مے کشی
آنکھوں سے کھینچتا ہوں شرابِ نظر کو میں

ساغرؔ

خیالات واحساسات

(اناطول فرانس کی تصنیف لطیف اپیکورس کے باغ کے بعض حصوں کا ترجمہ)

مآل حیات

انسانی نسل ایک غیر معین وقت تک ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنے ارتقا کیلئے ہماری زمین کو چند خاص طبعی اور کیمیاوی حالتوں کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اور یہ خاصیتیں دائمی نہیں ہیں طبعی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب زمین رہنے کے ناقابل تھی۔ اس کی سطح بہت گرم اور تر تھی۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ زمین رہنے کے ناقابل ہو جائے گی۔ اس کی سطح بہت خشک اور سرد ہو جائے گی۔

جب سورج بجھیگا (ایک حادثہ جس کا وقوع یقینی ہے) اس وقت انسانی نسل فنا ہو چکی ہوگی۔ اس سرزمین کے آخری باشندے اولین باشندوں کی طرح بے وقوف احمق اور جاہل ہوں گے۔ وہ تمام فنون وصنائع فراموش کر چکے ہوں گے۔

یہ لوگ مصیبت اور پریشانی کے عالم میں غاروں میں جمع ہو کر بیٹھ رہیں گے ان غاروں میں جو کوہ ہائے یخ کے قریب واقع ہوں گے، برف کے شفاف تودے ان برباد شہروں پر حرکت کریں گے۔ جہاں آج انسان محنت کرتا ہے دکھ جھیلتا ہے۔ اُمیدیں باندھتا ہے۔

تمام درخت سردی کی کثرت سے فنا ہو جائیں گے۔ صرف صنوبر منجمد دنیا کے واحد مالک رہ جائیں گے۔ نسل انسانی کے آخری نمونے جان سے تنگ ہوں گے انھیں ہمارے متعلق کچھ علم نہ ہوگا۔ ہماری محبت۔ ہمارے دکھ۔ ہماری صلاحیت وقابلیت سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ حالانکہ ان کی رگوں میں بھی ہمارا ہی خون موجزن ہوگا۔

مہابت وعلمیت کے دنوں کی یادگار۔ ایک شعاع قابلیت ان کے فرسودہ دماغوں میں نورافگن ہوگی جس کا نام لیکر وہ اپنے آپ کو ان ریچھوں کے گروہ سے محفوظ رکھ سکیں گے جو ان کے اردگرد زیر زمین غاروں میں گھوم رہے ہوں گے۔ تمام قومیں۔ تمام نسلیں برف کے نیچے دب گئی ہوں گی۔ شہر۔ قصبے۔ موضعے۔ سڑکیں باغ غرض کہ پرانی دنیا کی ہر ایک چیز فنا ہو چکی ہوگی۔

عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ انھیں شورانگیز غاروں میں جمع ہو کر سوراخوں میں سے دھندلا اور مدھم سورج کو بلند ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ دھندلی پیلی سی شعاعیں سورج کی سطح پر نمودار ہوں گی۔ عین اسی طرح جس طرح شعلہ بجھ جانے والی انگیٹھی کے گرد رقص کرتے ہیں۔ ستاروں کی درخشاں برف تمام دن سرد ہوا میں تاریک آسمان پر چمکتی رہے گی۔ وہ لوگ یہ منظر دیکھیں گے۔ مگر اپنے دل کی اُداسی اور تاریکی کے باعث ان کو کسی بات کا احساس نہ ہوگا۔ آخر ایک دن نسل انسانی کی آخری یادگار ایک کمزور اور احمق انسان محبت اور نفرت سے بے پرواہ اپنا آخری سانس لیگا۔ اور یہ کرہ اسی طرح بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح۔ اپنے ساتھ مکان کی خاموش فضاؤں میں نسل انسانی کی راکھ۔ ہومر کی شاعری اور یونانی سنگتراشی کے شاہکار۔ برف کی طرح ساتھ لئے ہوئے گردش کرتا رہے گا۔

اس مردہ دنیا کے قلب سے اس کے بعد کوئی خیال ابد ولا انتہا کی طرف صعود نہ کرے گا۔ اس مردہ دنیا سے جہاں انسان نے اس قدر دلیری سے کام لیا ہے۔ اور یہ کچھ کر دکھایا ہے۔ کم از کم انسان کا کوئی خیال باقی نہ رہے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی اور خیال اپنے وجود کا احساس نہ کرنے لگ جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ نسل انسانی کی قبر کسی اور نسل کا گہوارہ نہ بنے گی۔ نئی روح کس کی ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتا شاید کیڑے کوڑوں کی۔ انسان کے ساتھ شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں نے معجزے کر کے دکھائے ہیں سچ ہے کہ یہ چیزیں ہماری طرح نور اور حرارت کی محتاج نہیں۔ مگر بعض ایسے جانور بھی ہیں جو سردی سے بے پرواہ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

ماضی کے صناع

ہم صحیح طور پر ماضی کے مناظر و مظاہر کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ جسے عام طور پر "مقامی رنگ" کہا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت خواب سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم بے انتہا کاوش سے کام لیکر پرانے زمانے کے رسم ورواج کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے کے صناع اس قسم کی لاحاصل کاوشوں میں کبھی وقت ضائع نہ کرتے تھے۔ ماضی کے صناع پرانے زمانے کے لوگوں کو اپنے زمانے کے لباس میں پیش کرتے تھے۔ وہ لوگ ہمارے لئے اپنے زمانے کی معاشرت کے تمام پہلوؤں کو واضح کر گئے ہیں۔ کیا کوئی صناع اس سے زیادہ کچھ کر سکتا ہے؟

ان کے تمام تخلیقات زندگی کے شعلوں سے لبریز ہیں اور ان کا اثر ابھی

تک کم نہیں ہوا۔

جہالت

میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جہالت نہ صرف مسرت بلکہ زندگی کا ایک جز لازمی ہے۔ اگر ہمیں ہر شئے کے متعلق علم ہو جائے تو ہم ایک لمحے کے لئے زندگی بسر نہ کر سکیں۔ جو جذبات زندگی کو شیریں بنا دیتے ہیں وہ جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور فریب و وہم پر پرورش پاتے ہیں۔ اگر کسی انسان کو خدا کی طرح ہر شئے کا علم ہو جائے اور وہ اس علم کو پھیلا دے تو کائنات اُسی وقت فنا ہو جائے گی۔ اور زندگی سایے کی طرح غائب ہو جائے گی۔ صداقت دنیا کو چیں کر اُڑا دے گی۔

صداقت آرٹ کا مقصد نہیں ہے۔ ادب کا مقصد صرف حسن اور آفرینش حسن ہے۔

پچھلے دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں شاعر اور فلسفی مصنف نے ایک ایسی دنیا کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے جس میں رہنے والے انسان غم و مسرت اور اشتیاق و تعجب کے جذبات سے بالکل مبرا ہیں۔ اس خیالی بہشت کی سیر کرنے کے بعد جب میں اپنی دنیا میں واپس آیا اور انسانوں کے دکھ سکھ دیکھے تو میرا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

اسی ہمدردی میں حقیقی مروت کا راز پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں نے اپنے جذبات کو مار دیا ہے اُنہوں نے ساتھ ہی مسرت اندوہ نیکی۔ بدی۔ اور حسن کو بھی فنا کر دیا ہے۔ یہ لوگ دانا ہیں۔ مگر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی قدر نہیں۔ ان کی زندگی طویل ہو تو اس کا کیا فائدہ ہے۔ ان کی زندگی ایک خلا سے عبارت ہے

اس کتاب کے مطالعے نے میرے دل میں گہری ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اور ثابت کر دیا کہ وہم اور تخیل کی بسائی ہوئی دنیا کسی طرح اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم لوگ کبھی اس تخیلی بہشت کے باشندے بننا پسند نہ کریں گے۔

مہتاب رائے

شب ماہتاب

زورق مہتاب ہے اور سطح بحر آسماں — چشم ظاہر بیں سے پوشیدہ ہے قعر آسماں

دور ہیں تارے فلک پر لرزہ بر اندام ہیں — ننھے ننھے دل گرفتار غم انجام ہیں

چرخ کا روشن لبادہ ہے مزین نور سے — منتشر جلوے اُٹھا لایا ہے کوئی طور سے

چاندنی کا سیل عالمگیر اور پچھلا پہر — بارش سرچشمۂ تنویر اور پچھلا پہر

نور میں بھیگی ہوئی خاموش اُجلی کائنات — دامن غفلت میں ہے روپوش اُجلی کائنات

محفل شب ہے کہ اک میخانۂ حسن و جمال — منظر شب ہے کہ اک افسانۂ حسن و جمال

رزمگاہ دہر پر طاری ہے افسون سکوت — شورش ہنگامۂ عالم ہے مرہون سکوت

اُف یہ گہری خامشی کتنی تاثر خیز ہے — توسن تخئیل کی رفتار کتنی تیز ہے

شیشۂ دل میں ضیا افگن ہیں انوار حیات

کھل رہے ہیں رفتہ رفتہ مجھ پہ اسرار حیات

قدم تلونڈوی

نفسیاتِ تفریح

عیدوں اور تہواروں پر بچوں کے کھلونوں سے دوکانیں پٹی پڑی رہتی ہیں اور غالباً کوئی ایسا بچوں والا گھر نہ ہوگا۔ جو مختلف قسم کے کھلونوں سے بالکل خالی پایا جائے۔ کوئی بچہ جھنجھنا بجا رہا ہے۔ کوئی گیند سے دل بہلا رہا ہے۔ کہیں آراستہ پیراستہ گڑیوں کی شادی رچی ہوئی ہے۔ کہیں لکڑی کے گھوڑے سے کھیلا جا رہا ہے۔

اسی طرح جب آپ کسی شہر میں داخل ہوں گے تو یقیناً وہاں متعدد ہوٹل کلب۔ اور شراب خانے، ایسے ملیں گے جہاں بے فکرے تفریحاً تاش شطرنج چوپڑ اور بلیرڈ وغیرہ کھیلنے میں مصروف پائے جائیں یا "دخت رز" سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

کوئی ایسا متمدن ملک پیش نہیں کیا جا سکتا جہاں سواحل دریا یا پہاڑوں کی چوٹیوں پر تفرج گاہیں مخصوص نہ ہوں جن میں ہر سال خوش باش اصحاب کی ایک کافی تعداد چند ہفتے کے لئے منتقل ہو کر سکونت پذیر نہ ہو جاتی ہو۔ بلکہ ایسی کوئی قوم نہیں پائی جاتی جو اپنے مذاق و پسند کے موافق مخصوص مشاغل تفریحی میں کافی حصہ نہ لے ــــ چینی افیون استعمال کرتے ہیں۔ "مغربی رسیلے" شراب کے شوقین ہیں۔ عرب قہوہ نوشی کے عادی ہیں۔ اور قریب قریب تمام اقوام مشترکہ طور پر تمبا کو اور چائے کی دلدادہ ہیں۔

ان سب کا مقصد کچھ دیر کے لئے ذہن کو افکار و مصائب کے ہجوم سے نجات دینا اور تفریح ہے ــ سیکش شراب صرف اس لئے پیتا ہے کہ اپنے تخیل کو چند لمحے کے لئے سکون اندوز کر سکے۔ اسی طرح شطرنج اور تاش کھیلنے والوں۔ حقہ اور سگریٹ پینے والوں یا سبزہ زاروں میں گلگشت کرنے والوں کا منشا بھی قریب قریب یہی ہوتا ہے۔

اکثر علماء نفسیات نے کمسن اور سن رسیدہ اشخاص کے مشاغل تفریحی کی علت موجبہ سے بحث کی ہے۔ **اسپنسر** نے کہا ہے کہ "بچے نشاط اور قوت نمو کی فراوانی کے سبب سے کھیلوں میں زیادہ مصروف پائے جاتے ہیں"۔ لیکن یہ نظریہ جوان اور سن رسیدہ اشخاص پر منطبق نہیں ہوتا۔ ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ جب کثرت مشاغل سے اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ تو وہ شطرنج اور تاش کھیل کر دل بہلاتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فراوانی قویٰ کی وجہ سے ان مشاغل میں مصروف ہوا۔ بلکہ اسپنسر کا نظریہ تو بچوں کے مشاغل تفریحی کی بھی پوری پوری تشریح نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کھیل کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ اور کام کو کیوں پسند نہیں کرتے؟ ہم اپنے نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ سائیکل پر سوار ہو کر بلا وجہ گھومتے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس محنت شاقہ کو نہ صرف بخوشی برداشت ہی کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کسی کام کے لئے کہیں جانے کو کہا جائے تو گو انہیں اپنی تفریح کے برابر مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ تاہم یقیناً یہ آمد و رفت ان پر سخت گراں گزرے گی۔ وہ اسے ایک مصیبت خیال کریں گے۔

جرمن ماہر نفسیات **جروس** نے کہا ہے کہ "تفریح مشاغل کی مشق ندریجی کو کہتے ہیں"۔ اس کے خیال میں فطرت ہمیں ــــ نیز دوسرے بلند طبقے کے حیوانات کو ــــ مختلف کھیلوں کے ذریعہ آئندہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔ ننھی بلی گیند سے کھیلتی ہے۔ تاکہ جب وہ بڑی ہو تو اس میں کشمکش حیات سے مقابلہ کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اور وہ چوہے وغیرہ شکار کر کے شکم پری کر سکے۔ شیر کے بچہ کا شیرنی کی دم سے کھیلنا بھی اسی مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کے بچوں کا ہے ــــ وہ گیند اس لئے کھیلتے ہیں کہ نشانہ بازی میں مہارت حاصل ہو۔ لکڑی کا گھوڑا بنا کر اس پر سوار ہونا مشق شہسواری کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں تاکہ امورِ خانہ داری سے واقفیت پیدا کریں۔

لیکن یہ نظریہ بعض ایسی تفریحات پر منطبق نہیں ہوتا جن کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز اس سے بھی سن رسیدہ اشخاص کی تفریحات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس نظریہ کا ظاہری پہلو بچوں کے مشاغل مخصوصہ پر ضرور صادق آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تفریحات آئندہ پیکار زندگی کے لئے استعداد مہیا کرنے پر مبنی نہیں ہوتیں۔ نہ ان سے مشاغل مستقبل کی مشق مقصود ہوتی ہے بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اشغال حیات میں مصروفیت انسان کی ان قوتوں میں داخل ہے۔ جو کافی عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور وہ انسان میں اس وقت ظاہر نہیں ہوتی جب تک وہ سن طفولیت کے مراحل طے نہ کرے۔ بچے کے قوائے عقلیہ ہمارے قدیم ترین "وحشی" اسلاف کے قویٰ سے متجاوز نہیں ہوتے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں اس عہد عتیق کی یاد تازہ کرتا ہے جو "انسان" پر انسان بننے کے دوران میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد عہد طفلی میں نشوونمائے عقلی کے اعتبار سے ہمارے "اسلاف اولین" کے خصائل و

عادات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لئے آج بچوں کا لہو و لعب حقیقتاً ہمارے اسلاف کی ایک قدیمی یادگار ہے۔

پس بچہ اس لئے نہیں کھیلتا کہ وہ کام کرنا نہیں چاہتا بلکہ دراصل وہ یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟ جو شخص بچوں کو کام نہ کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انہیں اس بات پر ملامت کرے کہ ان کے ریش و بروت نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کام کی کیا تعریف ہے؟ اور اس میں اور "کھیل" میں کیا فرق ہے؟ **کام** ایک موجودہ غیر دلچسپ مصروفیت ہے جس سے آئندہ کسی مفید نتیجہ کی توقع ہو۔ اور **"کھیل"** ایک موجودہ دلچسپ مصروفیت ہے۔ جو بنفسہٖ دلچسپ ہو لیکن اس سے مستقبل میں کوئی مفید نتیجہ مرتب ہونے کی اُمید نہ ہو۔

کام ایک جدید ترین انسانی قوت پر مبنی ہے جو ہمارے اسلاف متوحش کی قوتوں سے مختلف ہے۔ اور ہم اسے **قوت بصیرت** کہتے ہیں۔

ہمارے اسلاف اولین زراعت کرکے چھ مہینے تک غلہ کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ نہ کرایہ پر دینے کے لئے مکان بنا کر فوائد بعیدہ کے منتظر رہتے تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے مستقل وجہ معاش حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ روزانہ اتنی غذا مہیا کر لینا کافی سمجھتے تھے جو اس دن کے لئے سامان شکم پری فراہم کردے۔ یہ غذا کبھی زمین کھود کر نکالی جاتی کبھی درختوں کے تنوں سے حاصل کی جاتی کبھی پرندے مچھلیاں یا دوسرے حیوانات شکار کرکے مہیا کی جاتی۔ بعض مرتبہ جنگلی درختوں کے پھلوں اور پتوں سے گذارہ ہوتی۔ اس کی مثال میں امریکہ افریقہ اور ایشیا کے بعض وحشی قبائل کو پیش کرسکتے ہیں جن کی طرز معاشرت یہی ہے۔ یا بندروں کی بعض اقسام کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جو اسی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔

پس بصیرت انسان کی ایک جدید قوت ہے۔ اور اسی لئے وہ تمام قویٰ میں سب سے کم ثبات پذیر ہے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ انسان میں اس کا ظہور جملہ قوتوں کے بعد پایا جاتا ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ بچہ کے کام نہ کرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ صاحب بصیرت نہیں ہوتا۔ اور وہ کھیلتا اس لئے ہے کہ کھیل ہمارے قدیم اسلاف کا مشغلہ ہے۔

بچہ ایسی حالت میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدیمی قویٰ کا سرمایہ دار ہوتا ہے لیکن اس میں جدید قوت نہیں ہوتی ــــ یعنی "**قوت بصیرت**" یہ قوت اس کے اندر بعد میں نمودار ہوتی ہے جس طرح نوع انسانی کے درمیان سب کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ "بصیرت" جدید ترین قوت انسانیہ ہے۔ اور اسی لئے اُس کا ثبات و قرار بھی سب سے کم ہے۔ چنانچہ بوڑھے آدمیوں میں سب سے پہلے اسی قوت پر آثار پیری نمایاں ہوتے ہیں۔ انسان جب بہت زیادہ عمر رسیدہ ہوجاتا ہے تو اس کی قوت بصیرت مفقود ہوجاتی ہے۔ بوڑھا آدمی بدستور چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے۔ اپنے اعزا و احباب سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اپنی دولت اچھے مصرف میں صرف نہیں کرتا۔ مخمور آدمی سب سے پہلے اسی قوت کو کھوتا ہے۔ یہی حال مریض کا ہے۔ جب مخمور مریض یا بوڑھے پر علامات ضعف طاری ہوتی ہیں۔ تو وہ عموماً انھیں کام سے عاجز کردینے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اب ہم بچوں اور معمر آدمیوں کے کھیلنے کی علت غائی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بچہ گیند کھیلتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اسلاف اسی قسم کے مشاغل میں مصروف رہتے تھے؛ وہ اُچھل کود اور دوڑ دھوپ پسند کرتا ہے۔ وہ آنکھ مچولی اور شکاری کھیل کھیلتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے قدیم آباء و اجداد کے یہی انہماکات تھے!! لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ امور خانہ داری میں مشق و مہارت پیدا کریں۔ بلکہ اس لئے کہ عورت قدیم الایام سے تربیت اولاد میں مصروف ہے۔ لہٰذا جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس میں فطرتاً یہ قوت موجود ہوتی ہے۔

معمر لوگوں کے کھیل اور اُن کی ورزشیں بھی ہمارے اسلاف قدیم کے اشغال کا پرتو ہیں۔ ان میں اور بچوں کے کھیلوں میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ بچہ ہنوز کام کی قوت و استعداد پیدا نہ ہونے کی وجہ سے کھیلتا ہے لیکن معمر آدمی کام کی قوت کو خوابیدہ کرکے یا اس پر پردہ ڈال کر یا اسے کسی دوسری صورت سے ساکن کرکے اور قوائے قدیمہ کو بیدار و برانگیختہ کرکے کھیل میں مصروف ہوتے ہیں۔

ہم نے انسان میں قوت شغل کے تیزی سے معطل ہوجانے کا سبب واضح کردیا۔ اب ہمارے لئے یہ بہت آسان ہے۔ کہ ہم اکثر اقوام میں افیون و شراب وغیرہ مسکرات و منشیات کے رواج و انتشار کا راز دریافت کرسکیں۔

یہ ثابت ہوگیا ہے کہ انسان نے کام کرنا بہت بعد کے زمانے میں سیکھا ہے۔ اس لئے وہ بیداری۔ سرگرمی اور مستقبل کے لئے جد و جہد سے بہت جلد مضمحل و پژمردہ ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ قوت ایک جدید قوت ہے جس

کی بنیادیں ابھی تک اعصاب انسانی میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں۔ نہ اس کی شاخیں دماغ کے گوشوں میں پوری پوری نشو و نما حاصل کر سکی ہیں۔ اسی لئے یہ قوت اس پر گراں گزرتی ہے۔ اور وہ اس کے تعطل و تنویم کی غرض سے شراب وغیرہ مسکرات کا استعمال کرتا ہے۔

شراب سب سے پہلے انسانی قوت عمل کو معطل کرتی ہے۔ مخمور پر جب کیف طاری ہوتا ہے تو وہ نہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس میں کام کی استطاعت ہوتی ہے۔ اور جب قوت عمل پر پردہ پڑ جاتا ہے تو قدیم وحشیانہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ بدمست ہو جاتا ہے! حالت بدمستی میں وہ حقیقتاً "وحشی" ہوتا ہے۔ اور اسی لئے وہ اپنے نفس کو قولاً و عملاً قیود و تمدن سے آزاد کر لیتا ہے۔

گویا سکر بھی ایک قسم کا "کھیل" ہے۔ جس میں قوائے قدیمہ بیدار اور قوت جدیدہ یعنی قوت عمل معطل ہو جاتی ہے۔ بعینہ جس طرح آدمی ایک ہاتھ سے کوئی کام کر کے دوسرے ہاتھ کی تکلیف بھلا دینا چاہتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی بغیر سکر کے بھی انسان کھیل اور تفریح میں حصہ لیتا ہے اس وقت اس کے کھیل کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

جو شخص معمر لوگوں کے کھیلوں اور ان کی ورزشوں پر غور کرے گا۔ وہ انہیں فی الحقیقت بچوں کے کھیلوں کی طرح ہمارے اسلاف وحشیہ کے مشاغل سے حرف بحرف مطابق پائے گا۔ ہم تفریح کی غرض سے کھیتوں میں گھومتے ہیں۔ ندیوں کے کنارے شکار کھیلتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں پہاڑوں پر جا کر سیر کرتے ہیں۔ اور جنگلوں میں دن دن بھر مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ سب کچھ قدیم وحشیانہ قویٰ کی بیداری و برانگیختگی کے لئے نہیں ہوتا؟ تاکہ ہماری قوت جدیدہ ــــ سرگرمی جد و جہد اور بصیرت کی قوت ــــ یعنی کام کی قوت سکون پذیر و آسودہ ہو سکے۔ کیا تاش۔ شطرنج وغیرہ سن رسیدہ لوگوں کے کھیل بچوں کی "آنکھ مچولی" سے ماہیتاً مختلف ہیں؟ کیا ان کھیلوں میں ہر ایک کھلاڑی یہ نہیں چاہتا کہ اپنا مقصد پوشیدہ رکھے۔ اور حریف کا نقطۂ خیال معلوم کر کے اسے شکست دیدے؟

ہمارے اسلاف متوحش زمانہ قدیم میں یونہی زندگی بسر کرتے تھے انھیں اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ دشمن انھیں تاک لیتا اور وہ اس سے پوشیدہ ہو کر اس کی غرض معلوم کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔ ان کی فراست تیز اور ذکاوت صحیح تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ دشمنوں سے محفوظ رہتے تھے۔ چونکہ ہم بھی انہی کی نسل سے ہیں۔ اس لئے ان کے خصائل و عادات وقتاً فوقتاً ہمارے اندر ابھرتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم خود دانستہ انھیں بیدار کر لیتے ہیں۔ اور ہمیں اس میں لطف آتا ہے۔

ابتدائے تخلیق میں "انسان" ایک منجمد مادہ کی صورت میں زمین سے چپکا ہوا تھا۔ اس وقت اس میں "کشش ارض" کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی بعد ازیں اس مادۂ منجمد میں زندگی کی رو پیدا ہوئی۔ اور وہ ایک خلیہ[1] کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ جس میں کشش ارض سے مقاومت اور حرکت کی قوت موجود تھی۔ یہ خلیہ پانی میں تیرتا رہا۔ اور اس میں قوت حیات ترقی پذیر و زیادہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پانی سے نکل کر خشکی پر آ گیا۔ اور اس نے رینگنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنا سیکھا اور اب وہ بتدریج اس قابل ہو گیا کہ اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو سکے۔ لیکن چونکہ اس نے پیروں کے بل کھڑا ہونا بہت بعد میں سیکھا ہے اس لئے ہمیں کھڑے رہنے میں بہت زیادہ احساس تعب ہوتا ہے۔ بیٹھنے میں اس سے کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور واقعی راحت و آرام صرف اس وقت نصیب ہوتا ہے۔ جب ہم مخلی بالطبع ہو کر فرش پر "مچھلی" کی طرح دراز ہو جائیں۔

ابتداءً جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کئی مہینے تک وہ بیٹھنا نہیں جانتا اور لیٹا رہتا ہے۔ پھر بیٹھتا ہے۔ پھر گھٹنوں چلتا ہے۔ اور سب سے آخر میں بمشکل پاؤں چلتا ہے۔ یہی حال ہمارے قوائے عقلیہ کا ہے۔ پس ان میں جو قوت نشو و نوعی کے اعتبار سے جس قدر بعد میں رونما ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ تکلیف دہ اور حوادث برداشت کرنے کے ناقابل ہوتی ہے۔ نیز افراد میں اس کا ظہور سب کے بعد ہوتا ہے۔

کیا انسان کا پیٹ کے بل گھسٹنا یا چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنا جزن کی علامات ابتدائی سے نہیں ہے؟ لیکن کیوں؟ ــــ جدید قوائے عقلیہ کے تعطل اور قدیم قوتوں کے ابھر آنے کے سوا اس کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے؟!

نوع انسانی کے کسی فرد کی عمر اس مختصر زمانے میں محدود نہیں ہوتی جو اس کی ولادت سے شروع ہوتا ہے ــــ بلکہ ہم کرۂ زمین پر اس دن سے ابتک "زندہ" کہے جانے کے مستحق ہیں جب سے ابتداءً حیات خلیہ اولی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ہم پر کئی "ارتقائی دور" گزر چکے ہیں اس لئے ہمارے اندر جدید قویٰ پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہم قدیم خصائل و عادات کو رفتہ رفتہ ترک کرتے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری جدید قوتیں ہنوز غیر مستقل۔ ناپائیدار اور معلق ہیں۔ اور جسم انسانی کی بنا میں استحکام کے ساتھ جاگزیں ہو کر "فطرت ثانیہ" نہیں بن سکی ہیں!!!

منظور سرور شمس بدایونی

---

[1] علمائے تشریح الابدان کہتے ہیں کہ جاندار اجسام بہت سے چھوٹے چھوٹے خانوں پر مشتمل ہیں جن میں سے ہر ایک کو "خلیہ" (سل) کہتے ہیں۔ (سرور شمس)

انکارِ محبّت پر

(اپنے "پریتم" سے)

زندگی سے مجھے بیزار نہ کر دینا تھا! حسرت مرگ کو بیدار نہ کر دینا تھا!
یوں مرے عشق کا انکار نہ کر دینا تھا

رشتۂ ضبط الم چھوٹ چلا ہی پیارے! آنکھ سے چشمۂ غم پھوٹ چلا ہی پیارے!
دلِ مایوس بس اب ٹوٹ چلا ہی پیارے

یہی امید تھی اب تک تپش افروزِ حیات کہ اثر گیر محبّت ہیں مرے احساسات
کیا خبر تھی، کہ بجھے گی مری شمعِ جذبات

عشق بلبل سے، گُلِ تر کبھی منکر نہ ہوا! جذب پروانہ بھی، کب شمع سے ظاہر نہ ہوا؟
مذہبِ عشق میں ایسا کوئی "کافر" نہ ہوا

شاہدِ الفتِ شبنم ہے شعاعِ خورشید "کبک" کے عشق کی کرتا ہے قمر بھی تائید
"لیلیٰ شب" کے لئے منظرِ انجم ہے "عید"

مگر اِک تم نے کیا، عشق و وفا کا انکار یعنی خورشیدِ محبّت کی ضیا کا انکار
آہ! انکارِ محبّت ہے خدا کا انکار

مَیں نے مانا! کہ مرے دل کی حقیقت باطل! مری دنیا، مری ہستی، مری فطرت، باطل!
پر یہ کس طرح سے مانوں کہ محبّت "باطل"

تم نمک پاش بھی ہوتے، دلِ شوریدہ پر! برق گرتی، تو مری حسرتِ خوابیدہ پر!
رحم کھانا تھا مگر الفتِ غمدیدہ پر

تم مجھے قیدئی زنداں مصیبت کرتے! اور دل کو مرے آوارۂ ذلت کرتے!
کاش! اس طرح نہ انکار محبّت کرتے

تلخیٔ ہستیٔ ناشاد گوارا تھی مجھے
خلشِ حسرتِ برباد گوارا تھی مجھے
بیکسی میں بھی، ہر افتاد گوارا تھی مجھے

مگر اب یہ غمِ جانسوز نہ ہوگا برداشت
اور، یہ زخمِ جگر دوز نہ ہوگا برداشت
آہ! یہ داغِ غم افروز نہ ہوگا برداشت

تم بھلاتے تو ہو بدبخت تمنائی کو!
اپنی زلفوں سے تو پوچھو مری رسوائی کو
یہ بھی کیا بھول گئی ہیں؟ کسی سودائی کو

جسے وابستۂ زنجیرِ وفا کرتے ہیں!
اسے اس طرح فراموش کیا کرتے ہیں؟
کیا مسلنے کے لئے پھول چُنا کرتے ہیں!

دلِ مضطر سے نہ اب صبر کیا جائے گا!
مجھ سے اب چاک گریباں نہ سیا جائیگا!
نامرادوں کی طرح کس سے جیا جائیگا

رُوح، اب غمکدۂ دہر سے گھبرائیگی!
نامرادی مجھے اب قبر میں لیجائے گی!
دوست! بس اب وہیں آرام کی نیند آئیگی

(غیر مطبوعہ) روش صدیقی

غزل

ساغر چڑھائے پھول کے ہر شاخسار نے
دریا بہا دئے خم ابر بہار نے

روشن کئے چراغ لحد لالہ زار نے
اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

اودی گھٹائیں چھائی ہیں اے میکشو چلو
پریوں کے تخت روک لئے سبزہ زار نے

اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں ایک آہ کی
بے آس ہو کے اس دل امیدوار نے

سینہ تک آئے سوتے میں کب میری دست شوق
دھوکہ دیا تجھے ترے پھولوں کے ہار نے

صبح شب وصال مجھے منفعل کیا
تو نے تو کیا تری نگہ شرمسار نے

بے شغل جام و بادہ جواں ہو گئے ریاض
ڈالا اثر یہ آمد فصل بہار نے

افسانہ

(۱)

ڈاکٹر وحید ایک عرصہ تک افریقہ میں مقیم رہے تھے۔ اور وہاں کے حبشیوں کے عادات و اطوار۔ ان کے توہمات اور مقامی روایتوں سے بخوبی واقف تھے۔ چونکہ عرصہ تک حبشی قبائل میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اس وجہ سے جب ہندوستان واپس آئے تو وہاں کی بہت سی عجیب و غریب چیزیں اپنے ہمراہ لائے۔ وہم پرست حبشی عورتوں کے تعویذ۔ طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی لکڑی کی مورتیں اور گڑیاں۔ مردوں کے ہتھیار۔ اور کوڑیاں۔ قسم قسم کے زہر آلود تیر شتر مرغ کے پر اور بیسیوں ایسی ایسی عجیب اور انوکھی چیزیں جو بیش قیمت تو نہ تھیں مگر حد درجہ دلچسپ۔

ایک دن اتفاق سے میں بھی ان کے گھر گیا۔ اُنھوں نے اپنے قیام افریقہ کے بہت سے قصے سنائے۔ جنوں۔ بھوتوں اور مقامی توہم پرستی کی داستانیں۔ عجیب و غریب واقعات کا ذکر مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا اور میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر وحید کی سوغاتوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور باوقعت چیز ایک بہت بڑا عمدہ لعل تھا۔ جو انھیں افریقہ کے ایک حبشی قبیلہ کے سردار کی لڑکی کا علاج کرنے کے معاوضے میں حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر وحید نے اس قیمتی لعل کے متعلق بہت سی عجیب عجیب روایتیں سنائیں۔ منجملہ اس کے یہ بھی تھی کہ یہ لعل اس قبیلہ میں سینکڑوں برس سے چلا آتا تھا۔ اور ہر سردار اس کی جان و دل سے حفاظت کرتا تھا۔ یہ لعل ایک چرمی بٹوہ میں ایک سیاہ مرمریں مرتبان میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس مرتبان کو بھی دیکھا عجیب بے ڈھنگا کالے پتھر کا مرتبان تھا۔ جس پر عجیب و غریب تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

روایت مشہور تھی کہ لعل کسی دیوتا کا تھا۔ اس نے کسی بات پر خوش ہو کر اس قبیلہ کے کسی سردار کو عطا کر دیا تھا۔ اس میں یہ تاثیر تھی کہ چوری نہ جاتا تھا۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے چرانے کی متعدد بار کوشش کی گئی مگر یہ پھر اس مرتبان میں واپس آگیا۔ یہ بات مجھے کسی قدر انوکھی معلوم ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب سے اس کی مزید توضیح چاہی۔ اُنھوں نے اپنے چشم دید واقعات سنا کر مجھے اور بھی حیران کر دیا کہ گو کئی بار چوری گیا مگر کسی نہ کسی طرح چور کا پتہ لگ گیا اور پھر اس مرتبان میں واپس آگیا۔ اگر وہ اس قبیلہ کے سردار کی لڑکی کو تندرست نہ کر دیتے تو انھیں ایسی نایاب شے ہرگز دستیاب نہ ہوتی۔ یہ لڑکی طاعون میں مبتلا تھی۔ اور بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے فوری انجکشن سے مرض زائل ہو گیا۔ اور اس خدمت کے عوض انھیں یہ لعل دیدیا گیا۔ جو ان کا موروثی تبرک تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ انھیں قبیلہ کا محسن سمجھکر وہ منتر بھی بتا دیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ اس لعل کے چرانے والے کا پتہ چل جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب قیام افریقہ میں تھوڑا بہت جادو بھی سیکھ گئے تھے اور وہاں رہنے سہنے کی وجہ سے تھوڑا بہت دماغ میں وہم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لعل کی گمشدگی کے بعد دوبارہ واپس آجانے کی روایت پر پورا الیقین رکھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ بتایا ہوا منتر حرف بحرف صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا میں نے اس لعل کو دیکھا۔ کافی بڑا تھا۔ ایک اخروٹ کی طرح اور کافی چمکدار مقامی حبشی اسے اپنی زبان میں "جوشوچپیاں" کہتے تھے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب نے اُردو میں "چشم خونیں" ترجمہ کیا تھا۔ واقعی اس کی شکل آنکھ سے مشابہ تھی اور اس قدر سرخ تھا جیسے خون کبوتر یا انار کا دانہ۔

میں اس کی روایتیں سنکر اپنے گھر واپس آیا اور پھر دوستوں میں اس کا تذکرہ کیا۔

(۲)

تھوڑے ہی عرصہ میں اس عجیب و غریب اور ساتھ ہی ساتھ قیمتی لعل کی افواہیں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں۔ ڈاکٹر وحید کے دو دوست تھے مسٹر سلیم اور احمد علی اُنھوں نے بھی لعل کو دیکھا۔ اور اس کے متعلق روایتوں کو سنا تھا۔ مگر ایک دن دل میں بدی آگئی۔ اور اس لعل کو اُڑانے کے لئے سازش کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ لعل کے واپس آنے کے متعلق جتنی

روایتیں مشہور کر رکھی تھیں۔ وہ محض چوروں کو ڈرانے اور دھوکہ دینے کا ایک طریقہ تھا۔

ایک دن سلیم نے احمد علی سے کہا۔ "وحید کا لعل اڑاؤ"۔

"مگر اس کے متعلق تو سنا ہے کہ دوبارہ مرتبان میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم بھی بڑے توہم پرست ہو۔ عقل نہیں ہے بھلا ایسا ممکن ہو سکتا ہے!"

"پھر تو کیا اسکیم سوچی ہے؟"

"پرسوں ان کے گھر دعوت ہے۔ ہم دونوں کو بھی بلایا گیا ہے۔ دونوں رات کو ملیں گے۔ اور دعوت کے دوران میں لعل اڑا دیں گے۔"

"کیونکر؟"

سنو اس طرح۔ انھیں آج کل لعل اور افریقی عجائبات کے حالات سنانے کا شوق چرّا رہا ہے۔ پس اغلب ہے کہ پرسوں بھی دعوت میں اس کا ضمناً ذکر آجائے گا۔ تم تجویز کر دینا کہ اسے سب حاضرین محفل کے سامنے دکھایا جائے۔ وہ یقیناً مہمانوں کی خاطر سے مرتبان لے آئیں گے۔ اور لعل نکال کر دکھانا شروع کریں گے۔ جب لعل سب مہمانوں میں یکے بعد دیگرے دور کر رہا ہو تم چپکے سے میز پر سے اُٹھکر کمرہ کے اس حصہ میں پہونچ جانا جہاں بجلی کا سوئچ (بٹن) لگا ہوا ہو۔ جب میں مقررہ اشارہ کروں تم فوراً روشنی گل کر دینا۔ میں اس عرصہ میں لعل اڑا لوں گا۔ پھر دیکھوں افریقہ کا جادو اسے کیونکر مرتبان میں واپس لا سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ لعل میرے ہاتھ آگیا تو پھر اس کا ملنا محال ہے۔ اور اگر پھر بھی مرتبان میں واپس چلا گیا تو ہم پھر یقین کر لیں گے کہ ڈاکٹر کی وہم پرستی درست ہے۔ اور واقعی یہ لعل آسیب زدہ ہے۔ اور اس پر کچھ اسرار ہے۔ اور اس کے متعلق جتنی افواہیں مشہور ہیں وہ سب سچ ہیں۔"

"تم کیا اشارہ کرو گے؟"

"دیکھو! اچھی طرح سمجھ لو اس میں مطلق دیر نہ ہو۔ جب لعل دورہ کرتا ہوا میرے پاس بیٹھنے والے مہمان کے قریب پہنچ جائے گا تو میں میوہ کی تھالی میں سے ایک اخروٹ اُٹھا کر اپنے لبوں سے لگاؤں گا۔ اُس وقت تم روشنی گل کر دینا۔ میں اندھیرے میں چپکے سے لعل اڑا دوں گا۔ تم بھی اپنی جگہ آبیٹھنا۔ سمجھ گئے۔ کتنا عمدہ پلاٹ ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ خطا کر جائے۔ اگر لعل ہاتھ آگیا تو پانچ ساڑھے پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگا۔"

دونوں نے خوب اچھی طرح انتظامات کرلئے بلکہ ایک دفعہ فرضی لعل چرانے کی مشق بھی کر لی۔ اور دعوت کے دن کا انتظار کرنے لگے۔

(۳)

شام کو دعوت کا وقت آگیا۔ میں بھی مدعو تھا۔ وقت مقررہ پر ڈاکٹر کی مشہور کوٹھی پر پہونچ گیا۔

دعوت کا کمرہ خوب سجا ہوا تھا۔ بیچ میں قرینہ سے لمبی لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ جن کے گرد مہمان آآکر بیٹھے جاتے تھے۔ چہار طرف بجلی کے قمقمے روشن اور تمام کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ میں بھی ایک کونہ میں جا بیٹھا۔

مسٹر سلیم اور احمد علی صاحبان ممتاز مہمانوں میں سے تھے۔ لیکن تعجب تھا کہ دونوں دوست آج علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر وحید آئے۔ بہت خوش خلق اور ہنس مکھ میزبان تھے۔ آٹھ بجے نوکروں نے کھانا چننا شروع کیا۔ میزبان سمیت دعوت میں کل تیرہ آدمی تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ اور پیالوں کی دلنواز صدا کمرہ میں گونجنے لگی۔

دوران طعام میں مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی مہمان آئس کریم ختم کر کے مٹھائی کھا رہے تھے کہ کسی مہمان نے افریقہ کے متعلق سلسلۂ جنبانی شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے موقعہ غنیمت سمجھکر کچھ دینا شروع کر دیا جب تمام پرلطف واقعات یکے بعد دیگرے سنائے جاچکے تو مشہور لعل "چشم خونیں" کی باری آئی۔ دو ایک لوگوں نے جنھوں نے اس روایتی لعل کے متعلق بہت کچھ سنا۔ مگر کبھی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے بہت اصرار کر رہے تھے۔ میں نے بھی تجویز کر دی کہ میزبان صاحب اس لعل کو سب حاضرین محفل کو دکھائیں۔

ڈاکٹر وحید نے سب حاضرین کی طرف دیکھا اور میز پر سے اُٹھکر اپنے کمرہ میں گئے۔ اور ایک سیاہ مرتبان اُٹھا لائے۔ اسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

(۴)

مرتبان میز پر رکھا گیا۔ سب لوگوں کی پرشوق نظریں اس عجیب الہئیت افریقی نادر لعل کی زیارت کرنے کے لئے بیتاب نظر آتی تھیں۔

احمد علی کو شاید سخت گرمی لگ رہی تھی کہ کمرہ میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

ڈاکٹر وحید نے مرتبان میں سے ایک چرمی بٹوہ نکالا۔ اور اسے کھولا۔ اندر سے ایک جگمگاتا ہوا اخروٹ کے برابر لعل نکلا جس کی تراش بالکل آنکھ کی مانند تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اس لعل کا نام 'چشم خونیں' ہے۔ یہ مجھے افریقہ کی سیر و سیاحت کے زمانہ میں ایک خدمت کے عوض ہاتھ لگا تھا۔ اس میں قیمتی ہونے کے علاوہ ایک صفت یہ بھی ہے کہ اگر اسے چرا لیا

جائے تو یہ پھر اسی مرتبان میں واپس آجاتا ہے۔ شاید آپ اس پر یقین نہ کریں۔ مگر مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جتنا آپ لوگوں کی اس کمرہ میں موجودگی کا۔

حضرات! اسے چرانے کی کئی بار کوشش کی گئی مگر مجھے افریقہ کی جادوگرنیوں نے ایک ایسا لاجواب منتر بتادیا ہے کہ فوراً چور کا پتہ لگ جاتا ہے اور لعل پھر اس مرتبان میں آکر مقید ہوجاتا ہے۔ میں اس کا بارہا تجربہ کرچکا ہوں۔ آپ چاہیں اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔ لعل بہت قیمتی ہے کم از کم چھ لاکھ کا ہوگا۔ ۲۲۸ قیراط وزن ہے۔ اتنا فقید العصر لعل شاید دنیا کے کسی ذخیرہ میں نہ مل سکیگا۔ آپ اس تاریخی لعل کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہر شخص دیکھکر اپنے برابر والے مہمان کو دیتا جائے۔

یہ کہکر ڈاکٹر صاحب نے "چشم خونیں" اپنے برابر والے آدمی کو دیا۔ یہ ایک بوڑھے بیرسٹر صاحب تھے۔ اُنھوں نے اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے روشنی میں دیکھکر اپنے قریب کے مہمانوں کو دے دیا۔ حکیم امجد علی صاحب نے ہتیلی پر رکھکر وزن کا اندازہ کیا۔ اور مسکرا کر کہا "خدا مبارک کرے"۔

یکے بعد دیگرے لعل دور کرتا ہوا آٹھویں آدمی کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے دہلی کے مشہور جوہری لالہ ہیرا لال تھے۔ اُنھوں نے اسے فنی نگاہ سے جانچا۔ اور کہا "میں نے اتنا وزنی اتنا چمکدار اور صاف لعل کہیں نہیں دیکھا"۔

گیارہویں نمبر پر ایک کالج کے پروفیسر بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے بھی اس لعل کو ہاتھوں میں لیکر جانچا۔ خوب فلسفیانہ تعریف کی۔ اور چاہتے تھے کہ اپنے برابر کے مہمان مسٹر سلیم کو دیدیں کہ یکایک کمرہ میں تاریکی ہوگئی۔ جس کے ہوتے ہی لوگوں نے چیخیں مارنی شروع کیں۔ ہلڑ مچ گیا۔ اور اس تمام بدنظمی میں نہ معلوم کیا کیا ہوگیا۔

(سلیم نے اخروٹ لبوں سے لگا کر احمد علی کو خبردار کر دیا تھا)

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ مگر دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ اندھیرا گھپ اور مہمانوں کی بے ہنگم آوازیں ہر شخص پریشان تھا۔ کہ دفعتاً روشنی کیوں بجھ گئی۔

ڈاکٹر وحید بھی حیران کھڑے تھے کہ دن ہی کو تمام بجلی کے تار ٹھیک کرائے گئے تھے۔ دفعتاً برقی سلسلہ میں نقص پیدا ہو جانا کیا معنی رکھتا تھا۔

اس بے انتظامی میں سلیم نے پروفیسر کے ہاتھ سے لعل چھین کر اپنے اس بٹوہ میں رکھا۔ جو اس نے ابھی اپنی جیب سے نکالا تھا۔ اس بٹوہ کو فوراً کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر پائیں باغ میں پھینک دیا گیا۔

سلیم نے سوچا تھا کہ رات کو باغ میں کون جائے گا۔ جب وہ یہاں سے فارغ ہوکر نکلیگا تو چلتے وقت بٹوہ اُٹھا لیگا۔ اور گھر کا رستہ لیگا۔ کمرہ میں اس پر کوئی شبہ نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ لعل پروفیسر تک پہنچا تھا۔ اس نے تو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ نیز وہ خود موجود تھا۔ اس کی جامہ تلاشی لی جاسکتی تھی!

احمد علی اپنی کرسی پر آبیٹھا تھا۔

ڈاکٹر وحید نے فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا۔ اور جلدی سے بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہوئی تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔

پروفیسر نے گھبرا کر جلدی سے کہا "حضرات! ـــ غائب ہوگیا!"

"کیا غائب ہوگیا؟" ڈاکٹر وحید نے پوچھا۔

"چشم خو.......!"

"اچھا؟"

سب مہمان ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کس ذات شریف کا کام تھا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ لعل کس نے اُٹھالیا...

پروفیسر بچارا بہت کھسیانا ہو رہا تھا۔ کیونکہ لعل اس کے ہاتھوں میں پہنچکر غائب ہوا تھا۔ مگر اسے بھی معلوم نہ تھا۔ کہ روشنی گل ہوجانے پر جو بدنظمی پھیلی تھی۔ اس وقت کس نے اس کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر لعل چھینا تھا!

(۵)

ڈاکٹر وحید نے مسکراتے ہوئے حاضرین کو مخاطب کیا "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آج کی دعوت میں کوئی شاطر چور بھی تشریف لے آئے تھے۔ غالباً وہ لعل چرانے سے زیادہ اس روایت کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ مسروقہ لعل مرتبان میں دوبارہ واپس آتا ہے یا نہیں ـــ خیر! کیا مضائقہ ہے۔ مجھے بھی منتر یاد ہے۔ ابھی معلوم کئے لیتا ہوں کہ یہ کس کا کام ہے۔ کوئی صاحب اپنی جگہ سے نہ اٹھیں۔ اشرف (ملازم) تم کمرہ کے دروازے بند کردو۔ اس کھڑکی کو کیوں کھولا تھا۔ اسے بھی بند کردو"۔

"حضور! چند لوگوں کو گرمی لگ رہی تھی اس وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ تازہ ہوا آنے کے لئے کھڑکی کھول دوں"

"اچھا جاؤ"

حضرات آپ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں میں ابھی چور کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ ذرا منتر کے لئے ضروری انتظامات مکمل کرلوں"۔

یہ کہکر اُنھوں نے میز پر سے مرتبان اُٹھایا۔ اور کمرہ سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد عجیب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دوستوں نے ایک دوسرے

کو چوری کا ذمہ دار ٹھیرایا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب پھر واپس آ گئے۔ اس وقت ان کے پاس مرتبان نہ تھا۔

"حضرات آپ لوگ قطار باندھکر بلیرڈ روم میں چلیئے۔ دیکھو اشرف کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے"۔

سب لوگ قطار باندھکر بلیرڈ روم کی جانب روانہ ہوئے۔ سلیم اور احمد علی بھی برابر چل رہے تھے۔

بلیرڈ روم میں ایک لمبی میز بلیرڈ کھیلنے کی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے دوسری طرف ایک چھوٹی سی میز کمرہ کی دیوار سے لگی ہوئی رکھی تھی جس پر وہی سیاہ مرتبان رکھا ہوا تھا۔

آپ لوگ اس بلیرڈ ٹیبل کے اس جانب قطار باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور نمبروار ایک ایک کر کے میز کے اس طرف ہوتے ہوئے چکر کھا کر اس سامنے والی میز کے قریب سے گزریئے۔ جس پر وہ مرتبان رکھا ہوا نظر آ رہا ہے جب آپ اس کے سامنے سے گزریں تو اپنا سیدھا ہاتھ اس کے اوپر چھوتے ہوئے گزر جائیں۔ اور چکر کاٹ کر اس دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے چلے جائیں۔ یہ عمل ہر شخص کو کرنا ہوگا۔ جو چور ہوگا (جو یقیناً اس ہی مختصر مجمع میں ہے) جب اس مرتبان پر ہاتھ لگائیگا یہ فوراً جادو کے زور سے بتا دے گا کہ یہ چور ہے۔ جو لوگ معصوم و بے گناہ ہیں بے ضرر چھو کر گزر جائیں گے۔ مگر چور جونہی اسے ہاتھ لگائے گا یہ فوراً بتا دے گا کہ یہی شخص لعل کا چور ہے۔ اس مرتبان میں یہ خوبی لاکھ روپیہ کی ہے بلکہ لعل کو محفوظ رکھنے میں مرتبان معجزہ کا کام دیتا ہے"۔

" منطقی پروفیسر کی رگ استدلال پھڑک اٹھی اور وہ بیتاب ہو کر بولے کیا بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ حبشیوں میں رہکر تمھاری عقل بھی ماری گئی۔ بھلا یہ بیجان مرتبان بول سکتا ہے۔ ارے میاں! دیوانے کیوں ہو گئے ہو ابھی تو کچھ نہیں گیا۔ اپنے اس شعبدہ کو بس یہاں تک ہی محدود رکھو۔ جلد پولیس کو مطلع کرو۔ وہ تحقیقات شروع کر دے گی۔ اس جادو وادو سے کیا ہوگا۔ جلد کام کرو۔ عجیب لاپروا آدمی ہو!"

پروفیسر صاحب آپ ذرا صبر کیجئے۔ پولیس کو کیوں خبر کروں۔ جب یہ جادو کا مرتبان خود بتا دے گا کہ چور فلاں شخص ہے۔ مجھے اس قسم کے بیسیوں تجربے ہو چکے ہیں۔ اس مرتبان نے کبھی خطا نہیں کی۔ اس پر افریقی دیوتا کا سایہ ہے!"

ہر شخص نے دیکھا کہ ڈاکٹر وحید اس وقت بہت سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ اور چہرے کی ساخت سے متانت ٹپکتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کامل اطمینان تھا کہ لعل کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا واپس آنا بالکل یقینی تھا۔ اب ہر شخص کو پورا یقین نہیں تو کسی قدر تذبذب ضرور ہونے لگا تھا کہ یہ مرتبان اور لعل واقعی آسیب زدہ تھے۔ اور افریقہ کے جن اس کی حفاظت کر رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے سب لوگوں نے گزرنا شروع کیا۔ اور ہر ایک مرتبان کو ہاتھ لگا کر بلیرڈ روم کی دوسری دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑا ہونے لگا۔ سلیم اور احمد علی قطار کے آخر میں کھڑے ہوئے تھے۔ سلیم کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا۔ اور اضطراب کی وجہ سے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

جب آخری آدمی اور خود ڈاکٹر صاحب نے مرتبان کو ہاتھ لگا لیا تو دفعتاً اس کمرے کی روشنی بھی گل ہو گئی!

(۶)

سب لوگ اندھیرے میں دیوار کے قریب کھڑے تھے کہ ایک منٹ بعد پھر روشنی ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے آواز بلند حکم دیتے ہوئے کہا" اب ہر شخص اپنا اپنا سیدھا ہاتھ روشنی میں کر کے دیکھے۔ ہر شخص کے سیدھے ہاتھ کی ہتیلی اور انگلیاں سیاہ ہیں۔ سوائے مسٹر سلیم کے"!

ہر ایک ہکا بکا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بھی روشنی میں دیکھا تو سب لوگوں کی انگلیاں اور ہتیلیاں کالی تھیں۔ لیکن اس کی انگلی پر کوئی دھبہ نہ تھا۔ بالکل سفید پڑی تھی۔

ڈاکٹر وحید نے مسکراتے ہوئے کہا" میں آپ لوگوں کو زیادہ دیر تک حیران رکھنا نہیں چاہتا۔ حقیقتاً یہ مرتبان "پراسرار" نہیں ہے بلکہ چوروں کو دھوکہ دینے کی غرض سے میں نے یہ افواہ مشہور کر رکھی تھی۔ مجھے مسروقہ لعل کے واپس بلانے کا کوئی جادو وادو بھی نہیں آتا۔ یہ بھی ایک پرلطف چال تھی۔ لیکن اتنی مؤثر کہ ہر وقت چور کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ پروفیسر صاحب کے ہاتھ سے لعل چوری ہو گیا تو میں نے بظاہر ان پر شبہ کرنے کے ان کے قریبی مہمان پر شبہ کیا۔ کیونکہ مسٹر سلیم ایک عرصے سے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے مرتبان اٹھایا۔ اور باورچی خانہ میں پہنچا۔ وہاں اسے مٹی کے تیل کے لمپ پر رکھکر اس پر کاجل "پاڑ" لیا۔ جس سے اس کی بیرونی سطح پر کلونس جم گئی۔ لیکن سیاہ ہونے کی وجہ سے وہ ممیز نہ ہو سکی۔

پھر اس مرتبان کو بلیرڈ روم میں لیجا کر رکھا۔ اور اسے چھونے کے لئے آپ سے کہا۔ غالباً آپ نے مثل سنی ہوگی کہ "چور کی ڈاڑھی میں تنکا" ہوتا ہے۔ وہ مثل آج اصل ہو گئی۔ سب نے اس مرتبان کو چھوا۔ کیونکہ وہ معصوم تھے۔ لیکن جس شخص کا ضمیر گندا تھا۔ مجرم تھا۔ جس کا دل تذبذب کی حالت میں تھا اس چکر میں آ گیا۔ اور اس نے مرتبان کو ہاتھ نہیں لگایا کہ مبادا یہ مرتبان

جھٹلا دے اور اس کا نام طشت از بام ہو جائے۔ مسٹر سلیم کو اندیشہ تھا کہ فی الحقیقت اس میں کوئی پراسرار قوت پوشیدہ ہے۔ جو نام بتا دیتی ہے۔ یا کوئی علامت ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس سے میں سمجھ لیتا ہوں کہ فلاں شخص مجرم ہے۔ بہر حال واقعہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسٹر سلیم نے مرتبان کو نہ چھوا۔ اب ان کے ہاتھ برف کی طرح بالکل سفید ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ انھوں نے مرتبان کو نہیں چھوا۔ کیوں؟ مرتبان نہ چھونے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ ——— مجرم ضمیر!

ابھی یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہا "حضور لعل مل گیا؟"

"کہاں ہے؟"

نوکر نے لعل ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "یہ رہا!"

ڈاکٹر صاحب نے لعل ہاتھ میں لیکر سب حاضرین کو دکھایا۔ اور فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "کیوں حضرات یہی وہ لعل ہے جو چند منٹ پہلے چوری ہوا تھا۔ اور جواب مرتبان کی روایت کے بموجب واپس آتا ہے!" ڈاکٹر وحید نے سیاہ مرتبان میں لعل کو پھر مقید کر دیا۔

سلیم عجیب کشمکش دماغی میں مبتلا تھا۔ اسے یہ حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ لعل نوکر کو کہاں سے ملا۔ اگر اسے باغ میں سے ملا تو بٹوہ ضرور ملا ہوگا۔ کیونکہ اس نے بٹوہ مع اخروٹ کے اپنے کھڑکی کے باہر پھینکا تھا۔ پھر جب لعل ملا تھا تو نوکر نے بٹوے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کا بٹوہ کہاں چلا گیا۔

ڈاکٹر وحید نے نوکر سے پوچھا "یہ کہاں ملا تھا؟"

"حضور کھانے کے کمرہ میں میز کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ اگر تلاش کی جاتی تو وہیں مل جاتا۔"

سلیم حیران تھا کہ اس نے تو لعل کھڑکی میں سے باہر پھینکا تھا۔ پھر وہ میز کے نیچے کیونکر آ گیا۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک پریشان ہونا نہ پڑا۔ کیونکہ ایک دوسرا ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ اور ایک بٹوہ دیتے ہوئے کہا "حضور میں باغ میں سے گزر رہا تھا کہ قریب ہی اس بٹوہ کو پڑا پایا۔ میں فوراً اسے لیکر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اسے کھولکر دیکھئے۔ شاید کسی مہمان کا گر پڑا ہوگا۔"

یہ بٹوہ وہی تھا جو سلیم نے کھڑکی کے باہر پھینکا تھا۔ ڈاکٹر وحید نے اسے کھولا تو اندر سے ایک موٹا سا **اخروٹ** نکلا!

ڈاکٹر وحید مسکرائے۔ اور معاملہ کی تہ تک فوراً پہونچ گئے۔ اور مخاطب کر کے کہا۔

"حضرات! واقعہ یہ ہوا ہوگا کہ سلیم نے جلدی اور گھبراہٹ میں بجائے لعل کے اخروٹ اپنے بٹوہ میں رکھکر کھڑکی کے باہر پھینکدیا تھا۔ اندھیرے گھپ میں لعل جسے سلیم اخروٹ سمجھ چکا تھا۔ میز کے نیچے گر پڑا۔ جس کا اس نے مطلق دھیان نہیں کیا۔ لیکن لعل کے متعلق یہ افواہ مشہور ہے کہ وہ ضرور مرتبان میں واپس آ جاتا ہے۔ اس لئے وہ پھر اس "توہم پرستی" کی یاد کو قایم رکھنے کے لئے مرتبان کی چہار دیواری میں آ پہنچا۔ شاید اب سلیم صاحب کو بھی کسی مزید تصدیق کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیوں سلیم صاحب؟"

سلیم صاحب شرمگیں نگاہوں سے فرش کی طرف دیکھ رہے تھے!

ظفر قریشی دھلوی

پوچھونگا راہِ عشق میں کیوں راہ بر کو میں ۔۔۔ اتنا بھی کیا گراؤنگا ذوقِ نظر کو میں

ہر ایک نقشِ پا پہ جھکاؤں گا سر کو میں ۔۔۔ سجدے کیا کرونگا تری رہگذر کو میں

اُمید و یاس لاکھ دوراہے پہ مجھکو لائے ۔۔۔ میں جانتا ہوں خوب کہ جاؤں کدھر کو میں

دردِ جگر کی ختم ہوئیں آزمائشیں ۔۔۔ اب آزماؤں گا تری ترچھی نظر کو میں

ذوقِ طلب نے کر دیا آوارۂ جنوں ۔۔۔ منزل پہ آکے بھول گیا اپنے گھر کو میں

لوں جام ماہتاب سے ساقی پلا مجھے ۔۔۔ دیکھوں نہ آنکھ بھر کے طلسمِ سحر کو میں

(غیر مطبوعہ) وقار

میں اس مصیبت زدہ پر زیادہ رحم کھائے ایسی صورت میں اس کے ذہن سے رحم کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ اس بدنصیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔

حضرت انسان ہمیشہ الٹی حرکتیں کرتے ہیں۔ جس پر زیادہ رحم کھانا چاہیئے اس سے رحمدلی کے بجائے حقارت کا سلوک کیا جاتا ہے۔ جس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا ہے اس کی دولت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور حاجتمندوں کی طرف نظر تک نہیں اٹھائی جاتی۔ جسے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی لوگ اسے قرض دینے کے لئے دوڑے پھرتے ہیں اور جو حقیقتاً غرض مند ہوتے ہیں انہیں کوئی بھی نہیں پوچھتا.....

..... وقس علی ھذا

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کون ہے جو محققین صرف نحو کی رائے سے اختلاف نہ کرے گا۔ میری اپنے دوستوں کو یہی نصیحت ہے کہ عزیزو! اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو خدارا اپنی حرکات یا گفتار سے ظاہر نہ ہونے دو۔ ورنہ یقین رکھو کہ تمہاری حاجت روائی قیامت تک نہ ہو سکے گی۔ خواہشات کا چھپانا انکا حاصل کرنا ہے۔ اگر تم فلاکت زدہ ہو تو دنیا پر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں لفظ غربت کے معنی ہی نہیں آتے! اگر کوئی تمہیں چٹنی روٹی کھاتے ہوئے دیکھ پائے تو اُسے یہ ہرگز نہ کہو کہ آج تمہیں دال نصیب نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ کہو کہ چٹنی سے زیادہ کوئی شے تمہیں لذیذ نہیں معلوم ہوتی۔ یا یوں کہو کہ حکیم حریف الشفا صاحب نے اس چٹنی کو خاص طور پر میرے لئے تیار کیا ہے" یا یہ کہدو کہ ہمارا حضرت اکال الاکل سے دور کا بھی رشتہ نہیں اور "مسٹر پیٹو خاں" سے علیک سلیک تک نہیں ہوتی" اگر تمہارے لباس کی تراش آج جیسے پچاس سال پہلے کی ہے تو یہ ہرگز نہ ظاہر کرو کہ اپنے جدامجد علیہ الرحمہ کا کوٹ پہنے ہوئے ہو یا جس زمانے میں دولتمند تھے یہ کوٹ سلوایا تھا بلکہ فوراً موجودہ فیشن کی ہجو شروع کر دو

اگر تمہارا کپڑا اس طرح پھٹ گیا ہو کہ پیوند صاف نظر آتا ہو تو بلا تکلف سنت رسول کے عامل بنجاؤ۔ یا کہدو کہ حضور فرماں روائے... پیوندی کپڑا برکت حاصل کرنے کے لئے پہنتے ہیں۔ اگر تمہارے جسم پہ کپڑے ضرورت سے کم ہوں تو کبھی یہ نہ کہو کہ

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

بلکہ کہدو کہ میں گاندھی آشرم میں رہ آیا ہوں اور مہاتماجی کے فیض صحبت کا پرتو سب سے پہلے لباس پر پڑا ہے۔ اگر تمہارا خط ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہو تو یہ کبھی نہ کہو کہ شہر کے حجام نقد دام لے کر حجامت بناتے ہیں بلکہ اپنے آپکو فلاسفر مشہور کر دو۔ غرضیکہ کبھی اپنی اصلی حالت کو ظاہر نہ ہونے دو۔ غرور ایک ایسی شے ہے کہ اگر امرا میں پائی جائے تو صد درجہ قابل نفرت ہوتی ہے۔ عقلمندوں میں غرور کا ہونا ایک تعجب خیز امر ہے۔ اس صورت میں اسے حماقت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن غریبوں میں غرور ایک ایسی بری شے ہے جسے میں قابل معافی سمجھتا ہوں۔

دوستو یاد رکھو کہ زبان کا صحیح استعمال اپنی ضروریات کو اور باطنی حالات کو چھپانا ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں اس کا فائدہ (یعنی حاجت روائی) حاصل ہوتا ہے۔

(ترجمہ)

توفیق حسن مستعطی

رباعی

رنگینئ شامہائے عشرت فانی　　شادابئ تنویر مسرت فانی

دنیا میں حسین صورتیں لاکھوں ہیں　　آجاؤ کبھی کہ ہے محبت فانی

عابد

پنجور

شاہان مغلیہ کے وہ باغ جو میدانوں میں واقع ہیں پھولوں کی قلت سے افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈل کے حسین وجمیل باغ اپنی اصلی شان وشوکت کھو چکے ہیں کشمیر کے جنت منظر باغ اپنی پہلی لطافت ونزہت کا ایک سایہ ہیں مگر فدائی خاں کا بنایا ہوا پنجور جو پنچپورہ کے مقدس چشمے کے کنارے واقع ہے۔ ابتک اپنی پہلی لطافت و پاکیزگی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔

دوسرے متبرک چشموں کی طرح پنجور پر بہت سے مذاہب کے اثرات ہیں۔ یہاں قدیم سنسکرت کے کتبے پائے جاتے ہیں۔ اور ابوریحان البرونی (۱۰۳۰ء) اس کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا پرانا نام پنچپورہ پانڈو سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں کی زبان یہی ہے کہ مہابھارت کا آخری منظر اسی جگہ کے قریب واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وقت بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقی سکون کا ایک غائب ہوتا ہوا سایہ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ اسی جگہ عظیم الشان آبشاروں سے بلند پنجور کا محل واقع ہے جہاں کبھی کبھی دور سے آنے والی برق رفتار ریل گاڑی کی آواز کی صدائے بازگشت صدیاں گذر جانے کی شہادت دیتی ہے۔

مہابھارت میں وہ افسانۂ خون وآرز و درج ہے جس کا نتیجہ پانڈوں اور کوروں کی لڑائی میں ظاہر ہوا تھا۔ اور اس لئے اس جگہ اس واقعے کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جب پانڈو دولت دنیا کی بے ثباتی کا احساس کرنے کے بعد ہمالیہ کی طرف آئے ہیں تو سوائے پانڈو کے باقی تمام بھائی آگے جانے کی بجائے وہیں رہ گئے تھے۔

پنجور محل کا بانی فدائی خاں تھا۔ جس کے زیر اہتمام لاہور کی شاہی مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ قارئین کرام کو علم ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کا رضاعی بھائی تھا۔ اور اس کا منظور نظر۔

اورنگ زیب نے فدائی خاں کو اس ضلع کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جو ان دنوں بھی سیر وشکار کے لئے موزوں خیال کیا جاتا تھا۔ اس جگہ آکر حاکم نے چشمے کو دیکھکر سوچا ہوگا کہ یہ جگہ باغ کی تعمیر کے لئے کس قدر موزوں ہے۔

فدائی خاں نے انتہائے ذوق سے کام لیکر ایک ایسا باغ تعمیر کرایا جس کے برآمدے گنجان۔ پہاڑوں اور وسیع میدانوں کے مناظر پر حاوی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف میدانوں کی جانفزا تپش وخلش آب مصفا وشیریں کی خوشگواری کا احساس کرا سکتی ہے۔ ہندوستان میں تو پانی ہر فرقے اور گروہ کے لئے متبرک ہے۔

میاں فدائی خاں کی مملکت میں پانی موجود تھا۔ اور وہ میلا۔ گدلا پانی نہیں جو پنجاب کے وسیع دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کائی جمی ہوئی کثافت نہیں جو گاؤں کے تالابوں میں ملتی ہے۔ بلکہ صاف۔ شفاف۔ ٹھنڈا۔ چشموں میں سے ابلتا ہوا پانی۔ جس کے ساتھ بتدریج اترتی ہوئی گھاٹیاں اور معتدل آب وہوا۔ دل کو فرحت وسرور سے لبریز کر دیتی تھی۔

فدائی خاں نے بہت جلد اپنا کام شروع کر دیا۔ مگر ارد گرد کے راجہ اس کی حرکات سے خائف تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ عمارتوں کی بنا مغل بادشاہوں کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ اور علاوہ ازیں وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ بہت جلد اس چشمے پانی سے محروم ہو جائیں گے۔ جس سے قرب وجوار کے کھیت سیراب ہوتے تھے۔

اب تک یہ افسانہ مشہور ہے کہ جب پہلے پہل فدائی خاں باغ میں داخل ہوا۔ تو راجاؤں نے سازش کرکے باغ میں ایسے ملازم جمع کر دیئے تھے جن کو خنازیر کا مہلک اور مکروہ مرض تھا۔ قلی۔ مالی۔ مہتر۔ عورتیں۔ بچے بوڑھے تمام اس مرض میں مبتلا نظر آتے تھے۔ فدائی خاں کے دریافت کرنے پر اُسے بتایا گیا کہ پنجور کے پانی میں یہ تاثیر ہے کہ جو کوئی پی لے وہ لازماً خنازیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ فدائی خاں سے زیادہ اُس کے حرم محترم کی پردہ نشین عورتیں گھبرائیں اور اس نے اپنے رہنے کے لئے کسی اور جگہ کا انتخاب کر لیا۔

اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد گورکھوں نے پنجور کو تاخت وتاراج کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار راجاؤں نے برطانوی حکومت سے مدد طلب کی۔ مگر ازبسکہ راجہ فوج اور توپوں کے معاوضے میں کچھ دینے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ اور حکومت برطانیہ کو دوسرے اہم معاملات کی گتھیوں کو سلجھانا تھا۔ اس درخواست کا کچھ نتیجہ نہ ہوا۔

آخر کار ۱۷۶۹ء میں سکھوں نے پنجور کو فتح کر لیا۔ اور اس وقت یہ جگہ مہاراجہ پٹیالہ کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ فدائی خاں کا باغ اس سڑک کے کنارے واقع ہے۔ جو انبالے سے کسولے کی برفانی چوٹیوں کی طرف جاتی ہے ریلوں کے آنے سے پہلے وائسرائے عام طور پر یہاں کے خوشگوار ونظر فروز

مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں ٹھہر جایا کرتے تھے۔ لیکن اب وقت بدل چلے ہیں۔ اور گاڑی سیدھی کالکا پہنچکر دم لیتی ہے۔ تمام مسافر شملے کے خوابوں میں محو ہوتے ہیں۔ اور کوئی بھی اس قدیم تفرج گاہ کا خیال نہیں کرتا۔ جو قریب ہی آم کے درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی ہے۔

میرے لئے پنجور ہمیشہ تیتریوں کا باغ رہے گا۔ میں نے پہلے پہل اس باغ کو اکتوبر کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ رنگین و لطیف تیتریوں کا ایک گہرا بادل پھولوں کے جھنڈ پر چھایا ہوا تھا۔ مجھے قریب آتے ہوئے دیکھکر وہ ایک نشاط انگیز آواز کے ساتھ بکھریں۔ اور میرے پاس سے اس طرح اڑتی ہوئی گذریں گویا سنہری روشنی کی ایک موج تیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ عام طور پر ان کے رنگ سنہرے یا بھورے تھے۔ مگر کچھ ایسی بھی تھیں جن کے سفید بدن پر سیاہ دھاریاں تھیں۔ اور جن کے بازوؤں پر زرد اور سرخ نقطے چمک رہے تھے۔ کچھ آگ کے تیز شعلوں کی طرح اس قدر جلدی پرواز کر رہی تھیں کہ ان کے رنگ پہچاننا بہت مشکل تھا۔ لیکن مجھے جو سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوئیں ان کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ اور ان کے بازوں پر سیاہ دھاریاں تھیں۔

کالکا سے باغ کی طرف جاتے ہوئے پنجور گاؤں میں سے گذرنا پڑتا ہے اور وہاں کے عظیم کھنڈر بتاتے ہیں کہ کبھی یہ گاؤں شہر کا رتبہ رکھتا ہوگا۔ ان چشموں کے ارد گرد جو کثیر تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ تالاب بنائے گئے ہیں جن کی سیڑھیاں لاتعداد زائرین کے قدموں سے گھس گئی ہیں۔ کئی پرانے مندروں کے آثار اب تک باقی ہیں۔ اور نئی عمارتوں میں ایک سکھوں کا گرودوارہ اور ایک مسجد بھی پائی جاتی ہے۔ گاؤں سے سو گز کے فاصلے پر سڑک ایک چھوٹے سے پل پر سے گذرتی ہے۔ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پنجور کے باغات کا داخلہ کشمیر کے باغات کی طرح شاندار اور دلکش نہیں ہے۔

چار دیواری کے باہر بھی سبزہ اور پھول موجود ہیں۔ اور ان چیزوں سے حیرت کا وہ اثر کم ہو جاتا ہے جو باہر کی خالی زمین کو دیکھنے کے بعد اندر کے گلہائے معنبر و معطر کو دیکھکر پیدا ہونا چاہئے

میرا دل بیٹھ گیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو مایوسی اور افسردگی کے لئے تیار کر لیا مگر چار دیواری کی دھانی بیلوں کے اودے پھول دیکھکر کچھ تسلی سی ہوئی۔ اندر کی روش ایک سنگین چبوترے کی طرف جاتی ہے۔ جو باغ کی سطح سے پانچ قدم اونچا ہے۔ اور جس پر بیٹھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے۔ اس جگہ آم کے درختوں کے گنجان پتوں کا سایہ گرمی کی تپش کو بہت بڑی حد تک کم کرتا ہے۔ اور یہیں سے چاروں طرف کونوں کے میناروں کی طرف راستے جاتے ہیں۔ اس چبوترے کے نیچے سے چشمہ ابل کر نہر کو سیراب کرنے کے لئے بیتابانہ سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس جگہ بیٹھکر آم کے درختوں کے سایے کے نیچے یہ چشمہ طلسمی پانی کا آئینہ بن جاتا ہے۔ جس کی گہری سبز گہرائیوں میں دنیا کے مختلف واقعات و مناظر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

فدائی خاں خنازیر کے خوف سے پردہ نشین عورتیں چالاک راجہ گور کھے جو زر و دولت کی تمنا میں یہاں آکر ایک ویران باغ کو دیکھکر یقیناً ناخوش ہوتے ہوں گے۔ سکھ بہادر پھر انگریزوں کے سرخ و سپید چہرے۔ تھکے ہوئے پژمردہ مگر باغ کو دیکھ کر گل شاداب کی طرح کھل اٹھنے والے۔

یکایک پانی کی سطح مکدر ہو جاتی ہے۔ اور ایک سیاہ سبزی شے بلند ہو کر پھر پانی میں غایب ہو جاتی ہے۔

یہ کیا تھا؟ شاید گھاس۔ پھونس! نہیں یہ سانپ تھا۔ زندہ جاوید سانپ دیوتا۔

یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

وسط میں ایک بارہ دری نظر آتی ہے جس کے ارد گرد لوہے کے جنگلے سے تمام خوبصورتی ضائع ہو گئی ہے

پرانے سرو کے درختوں میں سے صرف کچھ درخت رہ گئے ہیں۔ مگر پانی کے قریب گلاب۔ یاسمن۔ نارنج۔ اور کھجور کے پودے فردوس نظارہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح محسوس ہوتا ہے گویا پانی کے کنارے مادر گیتی سے حسین ترین بچوں کی تصویریں کھینچدی گئی ہیں۔ شمس الہدیٰ

مختصر افسانے

(۱)

برائے فروخت

مکانوں کے ایجنٹ نے کہا گویا آپ ایک مکان لینا چاہتے ہیں؟

میں نے جواب دیا! شاید آپ جانتے ہیں۔ اس مکان (اگر اسے مکان کہا جا سکے) کا مالک جس میں میں اب ہوں۔ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اور میں اس مکان کے خریدار کو (بشرطیکہ وہ مکان میں رہنا پسند کرے) اس کے انتخاب پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

کیا وہ آپ کی مرضی کے موافق نہیں ہے؟ ایجنٹ نے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں"۔

غسلخانہ بہترین ہے۔ اگر آپ سر کو کھڑکی کے اور پاؤں کو دروازے کے باہر کرکے نہا سکیں۔ اور چھت۔ جسے بناتے وقت غالباً دھوپ اور بارش سے سایہ دینے کے خیال سے بنایا گیا ہوگا۔ اب چھلنی کا کام دے رہی ہے۔ خانہ باغ کی کیفیت یہ ہے کہ ان گھاس کی چند پتیوں کے سوا جو کیچڑ پر اگی ہوئی ہیں۔ کوئی اور چیز سبز رنگ کی نہیں۔ دو پرانے کھوکھلے درختوں کے تنے البتہ کھڑے ہیں جو شاید ایک ہزار سال قبل سرسبز و شاداب ہوں۔ اور شہر سے فاصلہ پورے دو میل۔

ایجنٹ مسکرایا۔

آپ غالباً یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ہمارے رجسٹر میں اس وضع کا کوئی مکان "برائے فروخت" درج نہیں کیا گیا۔ یہ اس نے ایک کاغذ کا ایک تختہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایک مکان قابل فروخت ہمارے پاس ہے۔ جو میری ناچیز رائے میں بالکل آپ کے لئے موزوں ہے"۔

اس نے عینک کو جو ڈھلک کر نوک پر آگئی تھی ٹھیک بٹھایا۔

یہ دل پسند جائے سکونت ایک ایسے باغ کے درمیان واقع ہے جو دو سال قبل اپنے میوؤں کے لئے نہایت مشہور تھا۔ مکان کے ساتھ باغ ٹینس کا میدان۔ سردخانہ۔ انگور کا منڈوا۔ سیب کے درخت وغیرہ اور ایک نظر فریب منظر بھی شامل ہے۔

"بہت خوب"

محل وقوع بہترین ہے۔ دو دکانیں۔ ڈاک خانہ۔ اسٹیشن قریب آب و ہوا پاک صاف۔ چار کمرے سونے کے۔ دو ملاقات کے۔ اور ایک چھوٹا سا خوشنما غسلخانہ۔ غرض ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ مکان کے بنانے میں، بہ نسبت ظاہری شان و شوکت کے آسائش و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ کمرے اتنے بڑے نہیں جن میں مرطوب ہوا رات دن ستاتی ہو۔ چھوٹے ہیں مگر خوبصورت اور آرام دہ۔ اور یہی مکان کی سب سے بڑی خوبی ہے"۔

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں"۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

میں صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ جناب! پھر پھسلکر نیچے آتی ہوئی عینک ٹھیک کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"موجودہ کرایہ دار اسے چھوڑنے کے لئے سخت ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنے کرایہ میں اس سے بہتر مکان ملنا ناممکن ہے"

مگر وہ معتبرانہ نظروں سے میری طرف دیکھکر مسکرایا۔ "آپ جب ارشاد فرمائیں میں ان سے تخلیہ کرانے کا ذمہ دار ہوں۔

میں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ شکریہ۔ ہزار بار شکریہ" میں چیخا۔ "مگر یہ تو فرمائیے کہ اس کا پتہ کیا ہے"؟

پتہ! ایجنٹ نے کہا۔ "عشرت منزل۔ انارکلی"

میں دفعتاً چونک پڑا۔

"شکریہ"۔ میں نے سنبھلکر کہا "مگر ـــ مگر میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ "عشرت منزل" فی الحال میری ہی "عشرت گاہ" بنی ہوئی ہے"۔

گھڑی

(۲)

لیاقت ان لوگوں میں سے تھا جو ہر چیز کی ماہیت سے بظاہر واقفیت کلی رکھتے ہیں۔ وہ بتا سکتا ہے کہ رات کے کھانے اور سونے کے

اور سونے کے درمیان ٹھیک کتنے گھنٹے۔ کتنے منٹ اور کتنے سکنڈ گزرنے چاہئیں اگر سردی سے سینہ میں درد ہو۔ اور ڈاکٹر نے تارپین تیل کی مالش کا مشورہ دیا ہو۔ تو وہ بتا سکتا ہے کہ آیوڈین پر تارپین تیل کو کیوں ترجیح دی گئی۔ اس کے خواص کیا ہیں؟ یہ کیسے بنتا ہے۔ کہاں بنتا ہے؟ وغیرہ۔ لیاقت جتنے اخبار و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خریدار رہے۔ مگر اس کی اخبار بینی۔ معلومات زندگی اور خانگی ضروریات کے مختصر کالموں تک محدود رہتی ہے

سال بھر میں ایک بار — کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر میری اس سے ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ اجلاس دو دن تک رہتا اور اس درمیانی رات کو جو وہاں گذارنی پڑتی۔ مجھے عموماً لیاقت کی بے پناہ مغز خراش بکواس کا شکار بننا پڑتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے گھڑیوں — گھڑیوں کو کوکنے۔ زیادہ صحیح ہوگا۔ کا عنوان پسند کیا تھا۔ رات کے دس بجے عین اُس وقت جب میں سونے جا رہا تھا۔ لیاقت نے اپنا لکچر شروع کر دیا۔ شام سے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی قدر افسردہ و خاموش ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ شاید آج مجھے چین کی نیند سونا نصیب ہو۔ مگر ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ فی الحقیقت یہ خود میری غلطی تھی۔ مجھے ہوٹل کے گھڑیال کے دس بجانے پر وقت کی صحت کا اطمینان اور ہوٹل کی گھڑیال پر بھروسہ کر لینا چاہئے تھا۔ مگر ایسے وقت جبکہ قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لیاقت کسی مناسب عنوان کا متلاشی ہے۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ وقت دیکھا اور پھر رکھ دی لیاقت نے بھی اپنی گھڑی نکالی۔ اور اس سے کھیلتے ہوئے چابی دینے لگا۔

"تم اپنی گھڑی کب کوکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بارہ بجے دن کے وقت"۔

"کیوں دن کو کیوں"؟

"میں نہیں جانتا غالباً عادتاً"

"یہ غلط طریقہ ہے۔ بالکل غلط"۔

اب چھٹکارا ملنا ناممکن تھا۔ میں اُٹھتے اُٹھتے پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یقیناً لیاقت کے پاس گھڑی کوکنے کے وقت پر لکچر دینے کا کچھ زیادہ مواد نہیں ہوسکتا۔

"اکثر لوگ" لیاقت نے لکچر دینے کے مقررہ اصولوں کی باقاعدگی سے پابندی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خیال کرتے ہیں کہ چابی دن کے وقت دینی چاہئے"

"مگر بعض رات کے آٹھ بجے بھی تو کوکتے ہیں"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"بالکل درست۔ حالانکہ وہ اسے اچھا سمجھ کر نہیں بلکہ محض سستی اور لاپروائی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مگر دراصل وہی صحیح راستہ پر لگے ہوئے ہیں"۔

اس نے گھڑی کا بند کیا۔ اور مطمئن انداز سے گھڑی جیب میں رکھ لی۔

"یہ لوگ" اس نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بزعم خود دن کے وقت چابی دینے پر زبردست دلائل رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رات کے وقت سردی کی وجہ سے کمانی سکڑ جاتی ہے۔ اور اگر اس وقت چابی دی جائے تو اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے"۔

"ان کا خیال تو صحیح معلوم ہوتا ہے"۔ میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں غلط ہے۔ بالکل غلط۔ وہ کمانی کے سکڑ جانے کی حد تک تو صحیح کہتے ہیں۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ بھلے آدمیو! کیا چابی کا پورا پورا بھر دینا ضروری ہے۔؟ اچھا۔ اور اگر . . . ."

یوں اسے لئے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے ٹیلیفون پر طلب کیا گیا ہے۔ لیاقت کی بحث کو ناتمام رکھ دیا۔ میں ایسے غیر متوقعہ موقعہ کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتا؟ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت مجھے ٹیلیفون پر بلانے والا کوئی نہیں ہوسکتا۔ صرف نمبر کی غلطی ہوگی۔ مگر — میں نے لیاقت کو شب بخیر کہا۔ اور ٹیلیفون پر یہ معلوم کرنے کے بعد کہ واقعی نمبر کی غلطی ہے۔ میں اپنے کمرہ میں گیا اور سو گیا۔

بدقسمتی سے مجھے صبح میں سگریٹ کی ضرورت ہوئی۔ دیاسلائی میرے پاس نہ تھی۔ میں لیاقت کے کمرہ میں گیا۔ "مجھے آنکھ کھلتے ہی سگریٹ پینے کی عادت ہے۔ اور میرے پاس دیاسلائی نہیں"۔ یہ اور اسی قسم کے چند معذرتانہ جملے کہتے ہوئے لیاقت کے خوابیدہ آواز میں اندر بلانے پر میں داخل ہوا۔

"ہائیں"۔ میں نے سگریٹ سلگانے کے بعد وقت دیکھ کر کہا۔ "تمہاری گھڑی تو رک گئی ہے"!

"کیا؟"

میں نے میز پر سے گھڑی اُٹھائی۔ اسے کھول کر ہلایا۔ کوئی چیز سرسراہٹ کے ساتھ تیزی سے اس میں سے اچھل کر نکلی۔ اور زمین پر گر پڑی۔

"تمہاری کمانی ٹوٹ گئی ہے"۔ میں نے کہا۔

محمد محی الدین

تنویر قریشی

ہمخیال احباب

مسٹر جان نے ایک نیم مجنوں کرنل کی مشین بکوا کر چھ ہزار پونڈ حاصل کر لئے۔ اب کیا تھا دن عید اور رات شب برات۔ لنڈن کے بہترین ہوٹل میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اس دریا دلی سے روپیہ صرف کرنے لگے کہ ہوٹل کے ملازموں کے دل میں چال چلن کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے۔ ایک نے تو صاف صاف کہدیا کہ "حلال کی کمائی کو کوئی شخص اس طرح فضول خرچی میں برباد نہیں کر سکتا"

ابھی مسٹر جان کو ہوٹل میں قیام کئے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز صبح ہی صبح ملازم نے کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ نوکر نے کوئی کارڈ پیش نہیں کیا تھا اس لئے مسٹر جان سمجھ گئے کہ نووارد کوئی غریب آدمی ہے۔ بادل ناخواستہ اسے اندر بلا لیا۔ ان کے شبہات کو ملاقاتی کے لباس نے یقین میں تبدیل کر دیا۔ مسٹر جان نے سرد مہری سے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے لباس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سوٹ کی تراش بہت بھدی تھی، کپڑا بھی بہت معمولی اور بوسیدہ تھا۔ چہرے سے نقاہت برستی تھی مسٹر جان غریب آدمیوں کی ملاقات سے ہمیشہ حذر کرتے رہے۔

مسٹر جان نے کہا "میرا نام جان ہے، جناب کا اسم شریف؟"

"مجھے فلپ کہتے ہیں"، اجنبی نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

"اس عزت افزائی کا باعث"؟ مسٹر جان نے اختصار کے ساتھ پوچھا۔

"مسٹر جان! فلپ نے کہنا شروع کیا۔ "آپ اس پاگل کی مشین بکوا کر بہت دولتمند ہو گئے ہیں۔ آپ نے دولت کے ساتھ شہرت بھی حاصل کی ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ لندن کی چند عظیم الشان ہستیاں آپ سے روشناس ہو گئی ہیں۔۔۔"

"جی ہاں"، مسٹر جان نے چیں بجبیں ہو کر کہا "مجھے سب معلوم ہے۔ مگر میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد معلوم کرنا چاہتا ہوں"

"کیا آپ آج شام کو میرے ہمراہ ایک مقام پر چل سکتے ہیں"؟ اجنبی نے لاپروائی سے پوچھا۔

مسٹر جان سمجھ گئے کہ یہ شخص یا تو کسی غریب انجمن کا سکرٹری ہے جو انہیں انجمن کا دفتر وغیرہ دکھلا کر چندہ طلب کرے گا یا بخود اپنے گھر کی خستہ حالت یا گھر میں کسی بیمار کو دکھا کر امداد کا طالب ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ذرا ترش روئی سے کہنا شروع کیا۔ "جناب میں ہر طرح آپ کی امداد کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ لیکن کوئی ایسا وعدہ کرنے سے مجبور ہوں جو۔۔۔"

اجنبی نے نہایت سخت لہجہ میں کہا۔ "کیا آپ مجھے بھک منگا سمجھتے ہیں" کیا دنیا میں لوگ ایک دوسرے سے محض روپیہ حاصل کرنے کے لئے ملتے ہیں۔؟ کیا تم مجھے روپوں کا بھوکا سمجھتے ہو۔؟ لو یہ اپنے پاس رکھو" یہ کہکر اجنبی نے اپنی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندا نکالکر ہوا میں اچھالا۔ تمام کمرے میں چھوٹے چھوٹے کاغذ بکھر گئے۔ اجنبی مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کے منہ میں کف بھر آیا تھا۔ مسٹر جان قدرے شرمندہ ہوئے اور کاغذوں کو جمع کرتے ہوئے کہنے لگے "جناب آپ تو خواہ مخواہ ۔۔۔۔۔۔" یکایک ان کی نظر ان بکھرے ہوئے پرچوں میں سے ایک پر جا پڑی۔

مسٹر جان بت بنے ہوئے رہ گئے۔ نوٹ کی اصلیت میں کوئی شک نہ تھا۔ تمام کمرہ بنک آف انگلینڈ کے سو سو روپے کے نوٹوں سے بھرا پڑا تھا! اجنبی کو روانہ ہوتے دیکھکر مسٹر جان نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے اپنے ان نوٹوں کو لیتے جاؤ مجھے ان کی ضرورت نہیں"

اجنبی مسکرایا اور کہنے لگا "نہیں پھر سوچ لو۔ شاید تمہیں اس کی ضرورت ہو۔ تم خوشی سے انہیں اپنی پونجی میں شامل کر سکتے ہو"

مسٹر جان نے نوٹ جمع کر کے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "لیجئے مجھے ان کی ضرورت نہیں"۔

اجنبی نے لاپروائی سے نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "گن لو"، مسٹر جان نے کہا، "شاید ایک آدھا نوٹ اِدھر اُدھر پڑا رہ گیا ہو"

"چلو اچھا ہی ہو گا"، فلپ نے بے پروائی سے کہا، "میرے سر سے کچھ بوجھ ہلکا ہی ہو گا۔ جسے وہ نوٹ ملجائے وہی اسے رکھ لے۔۔۔۔ تم روپوں کو بہت اہمیت دیتے ہو مگر میرے نزدیک روپیہ کوئی چیز نہیں۔ میرا دل روپے سے بھر گیا ہے۔ میں پھر تم سے کہتا ہوں کہ تم ان نوٹوں کو شوق سے لے سکتے ہو۔ اپنے دوستوں کو کہدینا کہ ہمخیال احباب

والے فلپ نے تحفہ دئے تھے...... تمہارے ہر پونڈ کے مقابلہ میں میرے پاس تین سو پونڈ ہیں۔ گویا میں لکھ پتیوں سے بھی کہیں زیادہ دولتمند ہوں لیکن یا ایں ہمہ ہمخیال احباب، میں ئیں سب سے زیادہ غریب ہوں....."

مسٹر جان کسی زمانہ میں ایک اخبار کے نامہ نگار رہ چکے تھے ہمخیال احباب، میرے ہر پونڈ کے مقابلے میں تین سو پونڈ یعنی کم از کم اٹھارہ لاکھ پونڈ! لاابالی کم قیمت، دولت سے نفرت، ان تمام باتوں کو سنکر ان کے دماغ میں ایک سچے نامہ نگار کی طرح ایک اچھا خاصہ افسانہ تیار ہو گیا۔

اب وہ اجنبی کی باتوں میں کچھ کچھ دلچسپی لینے لگے اور مزید معلومات بہم پہنچانے کے خیال سے فلپ سے کہا "اگر آپ صاف صاف مجھے اس ملاقات کا سبب بتلا دینگے تو میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جاؤنگا۔

"واقعی" اجنبی نے بڑی مسرت کے ساتھ کہا "مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں آپکو ہمخیال احباب سے ملاؤنگا۔ وہیں چلکر آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے گا..... مسٹر جان آپ شاید مجھے نیم مجنوں سمجھتے ہیں انکار کی ضرورت نہیں۔ میرا بھی دماغ جو آپ کی نظروں میں بیکار ہے لوگوں کے دلوں کے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں آج شب کی ملاقات کے بعد آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا، کھڑے ہوتے ہوتے۔ امید ہے کہ آپ ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری کی سیڑھیوں پر پہنچ جائینگے۔ اس وقت آپ کی نئی گھڑی میں ٹھیک نو بجکر تیئیس منٹ ہوئے ہیں....."

مسٹر جان یک لخت چونکتے ہوئے اور اپنی گھڑی نکال کر دیکھی، تو ٹھیک ۹ بج کر تیئیس منٹ ہوئے۔ انہیں سخت حیرت ہوئی کہ جب انہوں نے اجنبی سے گفتگو کرتے ہوئے گھڑی کو نکالا ہی نہ تھا تو اسے کیوں کر معلوم ہو گیا کہ ان کی گھڑی نئی ہے۔ کوئی زنجیر بھی نہیں کہ جسے دیکھکر وہ اندازہ لگا سکتا۔ اس امر پر بھی سخت حیرت تھی کہ اس نے بالکل ٹھیک وقت بتا دیا

فلپ نے مسٹر جان کے خیالات کو تاڑ لیا اور کہا "یہ تو بالکل سہل بات تھی۔ جن نوجوانوں کو یک لخت روپیہ مل جاتا ہے وہ سب سے پہلے نئی گھڑی ضرور خریدتے ہیں اور نئی گھڑیاں ٹھیک وقت دیتی ہیں۔ میں نے گھڑیاں کی آواز سنی تھی۔ اس وقت سوا آٹھ بجے تھے۔ اس وقت سے لیکر اب تک میں نے چار سو اسی دفعہ گنا گویا ۴۸۰ سیکنڈ یعنی آٹھ منٹ گزر گئے۔ اسی لئے میں نے کہدیا کہ اس وقت ۹ بجکر ۱۵+۸ یعنی ۲۳ منٹ ہو گئے ہیں۔ میں آپ سے باتیں بھی کرتا رہا اور سیکنڈ بھی گنتا رہا۔ میرا یہی بیکار دماغ دن بھر گنتی کرتا رہتا ہے لہذا مجھے کسی گھڑی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب آپ کی گھڑی میں نو بجکر ستائیس منٹ ہوئے ہیں۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری پر پہنچ جائے گا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اگر آپ اپنے ساتھ کوئی پستول لیتے آئے گا تو مجھے ہرگز برا نہ معلوم ہوگا۔"

مسٹر جان کو یہ دن پہاڑ کی طرح معلوم ہونے لگا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد گھڑی کی طرف دیکھتے تھے۔ کہ کب آٹھ بجتے ہیں۔ تمام دن ان کے پریشان دماغ میں ہمخیال احباب کا خیال رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے زبردست دولتمند آدمیوں کو ان سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اسی فکر و تردد میں ان سے کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا گیا اور وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ہی ہوٹل سے نکل پڑے۔ ادھر ادھر چہل قدمی کرنے کے بعد ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری کی سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے ابھی لائبریری کا گھنٹہ آٹھ بجا ہی رہا تھا کہ سامنے کی طرف سے ایک نہایت نفیس موٹر آکر سیڑھیوں کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا اور کار میں سے ایک شخص اترا جو لباس سے کوئی بہت بڑا رئیس معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر جان نے بمشکل فلپ کو پہچانا۔ اپنے لباس کی کم مائیگی کی وجہ سے انہیں سخت الجھن ہوئی۔

فلپ نے سلام کے بعد کہنا شروع کیا، "میں ایک منٹ دیر سے آیا ہوں، چلئے آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

مسٹر جان نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا "مجھے افسوس ہے کہ میں جلدی میں کپڑے بدل نہ سکا امید ہے کہ۔"

ارے میاں چلو بھی، فلپ نے مسکراتے ہوئے کہا "ولیم کو لباس کے بارے میں احتیاط برتتا ہے۔"

دونوں کار میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے اور موٹر نہایت خاموشی سے روانہ ہوئی۔ مسٹر جان نے محسوس کیا کہ اب فلپ کی باتوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ بلکہ وہ نہایت سنجیدگی اور متانت سے دنیا بھر کے اہم معاملات پر بحث کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ موجودہ حکومت کا رجحان سوشیلزم کی طرف ہے ایسی حکومت جائداد وغیرہ کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے۔ مگر مجھے چنداں پروا نہیں ہے۔ میری جائداد نقد روپیہ ہے میں تھوڑا تھوڑا روپیہ قرض دیتا ہوں کیونکہ تھوڑا روپیہ بہت جلد منافع دلاتا ہے۔ میں یہ بھی نہ کرتا اگر اکیولیس کے مجبور کرنے پر یہ بھی کرنا ہی پڑا... وہ بیکاری کا سخت دشمن ہے اور اس کا خیال ہے کہ بیکار پڑا ہوا روپیہ بیکار آدمی سے زیادہ خطرناک ہے عجیب دماغ ہے اس شخص کا...."

فلپ تو اکیولیس کے دماغ کی تعریف میں لگ گیا اور مسٹر جان اپنے

خیالات میں گم ہو گئے۔

کافی وقفے کے بعد فلپ نے یکایک مہرِ خاموشی توڑی اور کہا مسٹر جان آپ اُن دونوں کے سامنے ہر قسم کی گفتگو کر سکتے ہیں لیکن خدارا سیاسیاتِ ہند کا ذکر ہرگز نہ کیجئے۔ نہ معلوم کیوں ولیم کا عدیم المثال دماغ اس موقعہ پر بالکل بیکار ہو جاتا ہے" مسٹر جان نے اظہارِ تعجب کے بعد وعدہ کر لیا کہ وہ سیاسیاتِ ہند کا قطعاً ذکر نہ کریں گے۔

موٹر بہت بڑی مسافت طے کرنے کے بعد ایک عالیشان مگر تاریک مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ فلپ اور مسٹر جان اتر گئے اور فلپ نے دروازے کے قریب پہنچ کر ایک بٹن دبایا۔ دور سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی مسٹر جان سخت حیران تھے کہ اتنے بڑے مکان میں روشنی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، وہ ابھی سوال کرنے ہی کو تھے کہ دروازہ کھل گیا اور ایک ملازم ہاتھ میں موم بتی لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ یہ تھا تو ملازم لیکن اس کا شاندار لباس کسی شہنشاہ کے خاص الخاص ملازموں سے گھٹ کے نہ تھا۔ اس کے بھڑکیلے لباس پر جگہ جگہ سنہری کام کیا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دونوں کو سلام کیا اور کہا "مسٹر اکیٹولیس اور مسٹر ولیم، مسٹر فلپ اور مسٹر جان کا انتظار کر رہے ہیں"۔ یہ کہکر دونوں کو راستہ بتاتے ہوئے ملازم آگے آگے روانہ ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مسٹر جان اخبار نویس تھے اور اصلی اخبار نویس، ظاہری کروفر سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ مسٹر جان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے لیکن اس ملازم کی شان و شوکت اور اس عظیم الشان مکان کی ویرانی ان پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ گو سنہری دستے والی شمع کی روشنی بالکل مدہم تھی۔ لیکن مسٹر جان نے دیکھ لیا تھا کہ ہال میں کوئی فرنیچر یا آرائشی سامان نہ تھا یہ تینوں ہال میں سے گزر کر ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ملازم نے اس پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے ایک کرخت آواز آئی "آ جاؤ"۔ ملازم نے دروازہ کھول کر نہایت ادب سے کہا۔

"مسٹر جان اور مسٹر فلپ"۔ یہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

گو یہ کمرہ بھی آرائش سے بری تھا مگر اس میں کرسیاں۔ کوچ وغیرہ تھے جن پر سفید چٹیں ظاہر کر رہی تھیں کہ کرایہ کا سامان ہے۔ کمرے کے درمیان ایک بہت بڑی میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کے بیچوں بیچ سنہری شمع دان میں سات موم بتیاں جل رہی تھیں۔ میز کے دو سروں پر ایک دوسرے کے بالمقابل دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تنومند تھا دوسرا بید لاغر۔ اس کی آنکھوں سے فکر اور کثرتِ مطالعہ کے تاثرات نمایاں تھے لباس بھی بہت بھدا تھا۔ یہ شخص برابر موم بتیوں کو تک رہا تھا۔ تنومند شخص کا لباس بھی بالکل معمولی تھا لیکن بہت چست تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر مسٹر جان سے ہاتھ ملایا اور خندہ پیشانی سے کرخت آواز میں کہا۔

"مسٹر جان میں آپ کی تشریف آوری کا بیحد ممنون ہوں......

یہ میرے دوست مسٹر اکیٹولیس ہیں" اکیٹولیس نے بیٹھے ہی بیٹھے سر ہلا کر سلام کر لیا اور برابر شمعوں کو تکتا رہا۔

مسٹر جان ولیم کے قریب بیٹھ گئے۔ فلپ ان کے مقابل والی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی

آخر ولیم کی کرخت آواز نے مہرِ سکوت توڑی "مسٹر جان" اس نے کہا شاید آپ سوچتے ہیں کہ آپ کو یہاں تک تشریف لانیکی تکلیف کیوں دی گئی؟" مسٹر جان نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ ولیم نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ یہ کسی اخبار کا ایک کالم تھا۔ ولیم نے پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارے شہر کے تجارتی حلقوں میں یہ خبر خاص مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مشہور جرنلسٹ مسٹر جان نے ایک کرنل کی ایجاد کردہ مشین کو جو تقریباً بیکار ثابت ہو چلی تھی، بکوا کر اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ابتک مسٹر جان ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اس واقعے کے بعد انہوں نے ایک اعلیٰ تجارتی دل و دماغ کے مالک ہونے کا ثبوت دیا ہے....... اس کاروبار میں مسٹر جان کو بیس ہزار پونڈ منافع ہوا"

ولیم نے کاغذ کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور مسٹر جان نے سر ہلا کر اس خبر کی تصدیق کر دی۔

مسٹر ولیم نے کہا یہ دلچسپ خبر "ولسٹرن کلچر" میں شائع ہوئی تھی۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ نامہ نگار آپ خود ہی تھے"

مسٹر جان نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا "مجھے یہ بخوبی معلوم ہے" ولیم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آپ کو بیس ہزار پونڈ نہیں ملے۔ یہ مبالغہ ہے۔ آپ کو صرف چھ ہزار پونڈ منافع ہوا

مسٹر جان شرم کے مارے پانی پانی ہو رہے تھے۔ اور کوئی جواب سوچ ہی رہے تھے کہ اکیٹولیس بول اٹھا "کیا ہمیں سات موم بتیوں کی ضرورت ہے"؟

ولیم نے ملائمت سے کہا "ہاں میرے خیال میں ساتوں کی ضرورت ہے"

"سات بتیاں ایک ہی وقت میں جل رہی ہیں" اکیٹولیس نے کہا۔

"مگر یہ کمرہ بھی تو بہت بڑا ہے" فلپ نے نرمی سے جواب دیا۔

اکیٹولیس نے مسرت بھری آواز میں کہا "یہ بتیاں دو پنس کی ایک کے حساب سے ملتی ہیں... چودہ پنس فی شب... اگر میں ایک

بتی بجھا دوں تو کوئی ہرج ہے"۔؟ "جی نہیں"

ولیم نے ذرا سختی سے کہا: "جی نہیں ہمیں ساتوں بتیوں کی ضرورت ہے۔" اس پر اکیٹولیس منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گیا۔

اس اثناء میں مسٹر جان کو جواب سوچنے کا موقعہ مل گیا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کیا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبر کی صداقت سے مجھے کیا تعلق ہے؟" ولیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں کیا آپ یہی پوچھنا چاہتے تھے؟" پھر ذرا سنجیدگی سے کہا "جی ہاں مجھے بلکہ یوں کہئے کہ ہمخیال احباب کو اس خبر کے ساتھ بہت دلچسپی ہے۔ مسٹر جان! اگر ہم آپ کو ڈیڑھ لاکھ پونڈ دیں تو کیا آپ ہماری جانب سے ایک روزنامہ جاری کر سکیں گے"؟

اگر کہا جائے کہ اس بات کے سنتے ہی مسٹر جان بت بنکر رہ گئے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کون ایسا نامہ نگار ہے جو ہمیشہ ایک خود مختار ایڈیٹر نہ بننا چاہتا ہو؟ ایک لاکھ پونڈ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا روزنامہ جاری ہو سکتا ہے جو دیوتاؤں کو بھی متاثر کر دے۔ دنیا کے بہترین انشا پرداز اس کے نامہ نگار بنائے جا سکتے ہیں۔ دنیا کی مشہور ترین تجارتی فرمیں اپنے اشتہارات ایسے اخبار میں بڑی سے بڑی رقم صرف کر کے شائع کر سکتی ہیں۔

مسٹر جان بمشکل یہ کہنے کے قابل ہوئے: "ہاں میں اس کام کی ذمہ داری لے سکتا ہوں"۔

اکیٹولیس نے اپنی نظروں کو شمعدان پر جمائے ہوئے کہا "اور کھلا یہ اس مسئلے پر بھی پر زور مضامین بہم پہنچانیکی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟

فلپ یہ سنکر مسکرایا اور کہا "کہو تو میں مسٹر جان سے پوچھوں؟

اکیٹولیس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اجازت دیدی۔

فلپ مسٹر جان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "مسٹر جان! کیا آپ سیاسیات ہند کے بارے میں بھی کچھ......"

ولیم جو ابتک حیران بیٹھا تھا یہ سنکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور چلا کر کہا "ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے پرچے میں ان بیہودگیوں کا قطعاً ذکر نہ ہوگا" پھر ذرا ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا اور بمنت اکیٹولیس سے کہا: "اکیٹولس تمہیں معلوم ہے کہ میں اس تذکرہ سے گھبراتا ہوں"۔ اکیٹولیس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر معافی مانگ لی۔

پانچ منٹ تک کمرے میں خاموشی رہی۔ ولیم اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اکیٹولیس شمع دان کو تک رہا تھا۔ فلپ نیچی نگاہیں کئے بیٹھا رہا؟ اور مسٹر جان ان تینوں کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر فلپ نے مہر سکوت توڑی اور کہا: "مسٹر جان! ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ کے حوالے ڈیڑھ لاکھ پونڈ کی ایسی جائداد کر دی جائے جس کا روپیہ آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حاصل کر سکتے ہوں تو کیا آپ ایک روزنامہ جاری کر سکیں گے؟ اور یہ روزنامہ آج سے تین مہینے کے اندر اندر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا؟

مسٹر جان نے بلا پس و پیش اقرار کر لیا۔

اکیٹولیس نے جھنجلا کر کہا: "سات موم بتیاں ضرورت سے زیادہ ہیں خدا کے لئے مجھے ایک بتی بجھا لینے دو۔" یہ کہکر وہ موم بتی بجھانے کے لئے اٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گیا اور کہا: "اور ہاں کیا اس جائداد کو بلا ضمانت حوالے کر دیا جائے گا"؟

"اکیٹولیس!" ولیم نے بڑے افسوسناک اور حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

اکیٹولیس نے متاثر ہوئے بغیر کہا: "یہ تو ایک طرح کی احتیاط ہے جو بالکل ضروری اور لابدی ہے۔ شاید یہ ایک دولتمند آدمی ہیں اور یہ بھی بعید نہیں کہ بالکل غریب ہوں۔ ڈیڑھ لاکھ پونڈ ایک رقم ہے"۔

"جی نہیں"، ولیم نے سختی سے کہا، "میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں"

مسٹر جان جواب کچھ کچھ اس معاملے کو سمجھ چلے تھے کہنے لگے: "مسٹر اکیٹولیس کا خیال بالکل بجا ہے۔ میں چھ ہزار پونڈ بطور ضمانت پیش کر سکتا ہوں، اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں"۔

"یہ ضرورت سے زیادہ ہے"، ولیم نے کہا "غیر ضروری۔ بالکل غیر ضروری کیوں فلپ تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا" فلپ نے سخت نفرت سے کہا "کہ اکیٹولیس ایسی بات کہیں گے تو میں مسٹر جان کو ہرگز نہ بلاتا"۔

اکیٹولیس کو اس کے دونوں دوست نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اس پر ان تمام باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ برابر شمعدان کو تکتا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا۔ "انہیں کل چھ ہزار پونڈ لانے دو میں اسی وقت اپنا حصہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ تم لوگ اپنی اپنی مرضی کے مالک ہو"۔

اس کے بعد سب لوگ خاموش ہو گئے۔ مسٹر جان مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "کل شب کو میں چھ ہزار پونڈ لے کر حاضر ہو جاؤں گا"۔

فلپ نے چلا کر کہا: "اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اکیٹولیس

تم نے مجھے سخت شرمندہ کیا ہے،،

مسٹر جان دروازے کی طرف چلدئیے۔ فلپ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دروازے کے باہر وہی ملازم ہاتھ میں شمع لئے کھڑا ہوا تھا۔

ذرا سنئے گا، فلپ نے جان سے کہا۔ اگر آپ کو روپیہ حاصل کرنے میں کسی قسم کی دقت ہو تو اسے بھنا لیجئے۔" یہ کہکر اس نے بنک آف انگلینڈ کے نام ایک خالی چک مسٹر جان کی جیب میں ڈالدی۔

"آپ اس کے ذریعے پچاس ہزار پونڈ تک حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے اکیٹویس کو اس کی خبر نہونے دیجئے۔"

مسٹر جان نے مسکراکر چک واپس کر دیا اور کہا: آپ جانتے ہیں کہ میں چھ ہزار پونڈ آسانی سے حاصل کر سکتا ہوں۔" مگر فلپ نے اصرار کرکے مسٹر جان کو اس چک کے لینے پر مجبور کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مسٹر جان تنہا اسی کار میں جس میں وہ یہاں آئے تھے واپس جا رہے تھے۔

ان کے دماغ کی اس وقت عجیب حالت ہو رہی تھی۔ جس زمانے میں وہ "میگافون" کے نامہ نگار تھے اکثر ایک پرچہ جاری کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ لیکن سرمایہ کی کمی بلکہ غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتے تھے اب ان کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے گھر پہنچنے سے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ کہ اخبار کا نام "مانیٹر" ہوگا۔ اور لندن کے فلاں فلاں مشہور مضمون نگاروں کو ملازم رکھا جائے گا۔

رات کو تین بجے کے بعد انہیں نیند آئی۔ اور صبح دن چڑھے آنکھ کھلی بستر پر ہی صبح کا ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران میں ملازم نے انہیں کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ مسٹر جان سمجھے کہ فلپ ہوگا۔ انہوں نے فوراً اسے اندر بلوالیا۔ مگر نو آمد کوئی اجنبی تھا۔ اس نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ اس پر ٹی۔ بی اسمتھ لکھا ہوا تھا۔

کہئے مسٹر اسمتھ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ مسٹر جان نے سرد مہری سے کہا۔

اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا" مسٹر جان! میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑا انجینئرنگ کا کارخانہ کھولنے والے ہیں؟ مسٹر جان سخت حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

"یا شاید آپ کوئی پرچہ جاری کرنے والے ہیں،" اسمتھ نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

مسٹر جان نے گردن ہلاکر اثبات میں جواب دیا۔ پھر انہوں نے کہا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔۔۔۔ اور انجینئرنگ کی طرف آپ کا خیال کیسے گیا۔

اجنبی مسکرایا اور کہا" جناب آپ کا تعلق اخباروں اور مشینوں سے رہا ہے کہ نہیں؟۔ خیر میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو کسی منیجر کی ضرورت ہے؟

مسٹر جان نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا" مجھے افسوس ہے کہ ابھی میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا"

اسمتھ نے کہا۔ جناب میں نے بہت بڑی فرموں کا کام سنبھالا ہے پچاس پچاس ہزار پونڈ کی مالیت کی فرمیں میرے ہاتھ میں رہی ہیں۔

مسٹر جان نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا" عزیز من تم سمجھتے ہو کہ پچاس ہزار ایک بہت بڑی رقم ہے۔ یہ تو میں اس مہینے کے اندر اندر خرچ کرنے والا ہوں"

اسمتھ مغموم ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہا" مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے کام کا نہیں لیکن شاید آپ کو کسی اسسٹنٹ کی ضرورت پڑے کیوں کہ ابھی آپ نوجوان ہیں"

مسٹر جان کو اگر کسی بات سے چڑ تھی تو وہ یہی تھی کہ کوئی شخص ایک خاص لہجے میں اُن سے کہے کہ ابھی آپ نوجوان ہیں۔ وہ خاص لہجہ یہی تھا جس میں اسمتھ نے کہا تھا۔

انہوں نے غصے میں کہا" مجھے روپیہ خرچ کرنے کا کافی تجربہ ہے اور میں بچہ نہیں ہوں"

اسمتھ نے دروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا" افسوس ہے کہ میرے لئے کوئی موقعہ نہیں ... شاید جب معاملات ایک ہفتہ بھر کے بعد طے ہو جائیں ..."

جناب معاملات آج ہی سب طے ہو جائیں گے" مسٹر جان نے سختی سے کہا" اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے سمجھ لیجئے کہ اسی وقت طے ہو گئے۔

اس کے بعد اجنبی روانہ ہو گیا اور مسٹر جان حیران ہوئے کہ آخر یہ تھا کون۔؟ اور اسے یہ سب کچھ کہاں سے معلوم ہو گیا! لیکن انہیں بہت کچھ کام کرنا تھا اس لئے اس معاملے پر زیادہ غور نہ کر سکے۔

انہوں نے بنک سے اپنے حساب میں سے کافی رقم نکلوائی اور دن کا بیشتر حصہ ادھر ادھر پھر کر آفس وغیرہ قائم کرنے کے لئے جگہ ڈھونڈنے اور نقشہ وغیرہ بنانے میں گزرا۔

رات کو ۹ بجے موٹر آئی اور اس دفعہ فلپ کے بجائے ولیم مسٹر جان کو لینے کیلئے آیا۔ اس تبدیلی کی وجہ ولیم نے یہ بتائی کہ اسے مسٹر جان سے اکیٹویس کی حرکات کی معافی مانگنی تھی۔ فلپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے

آپ کو ایک چیک دیا ہے۔ ولیم نے موٹر میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ نے اسے سمجھ لیا ہوگا۔"

جی نہیں، مسٹر جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔"

او ہو! آپ نے اسے سمجھا یا نہیں، ولیم نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں واقعی میں الکیٹولیس کی بعض حرکتوں کی وجہ سے سخت نالاں ہوں، کوئی انجان اس کی یہ حرکتیں دیکھے تو اسے کمینہ سمجھے۔"

مسٹر جان نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف مسکرا کر خاموش بیٹھے رہے تھوڑی دیر کے بعد موٹر منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ اسی ملازم نے دروازہ کھولا۔ آج اس کا لباس کل سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ کمرے میں گھستے ہی ولیم نے مسٹر جان کے کان میں کہا۔ "آپ نے الکیٹولیس کی یہ حرکت دیکھی؟ چارلس (ملازم) کے ہر روز لباس تبدیل کرنے پر زور دیتا ہے گویا اس میں کچھ خرچ ہی نہیں ہوتا۔ اور سات موم بتیوں کے جلنے میں بہت صرف ہوتا ہے۔"

یہ دونوں اسی کمرے میں پہنچے جس میں گزشتہ شب باتیں ہوئی تھیں۔ فلپ نے مسٹر جان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن الکیٹولیس کل سے بھی زیادہ سرد مہری سے ملا۔ آج اسے خاص طور پر اس وجہ سے اور بھی غصہ آیا ہوا تھا کہ سات کی جگہ چودہ شمعیں جل رہی تھیں۔ آج شمعیں دو نہایت نفیس شمعدانوں میں کارنس پر رکھی ہوئی تھیں جو دروازے کے قریب ہی تھی۔

مسٹر جان نے بیٹھتے ہی معاملے کی گفتگو شروع کر دی اور اپنے نقشے اور پروگرام بتائے۔ فلپ نے اس بات پر بہت زور دیا کہ قسطنطنیہ میں ایک نامہ نگار رکھا جائے۔ ولیم کا خیال تھا کہ ایسا نامہ نگار بہت مہنگا ثابت ہوگا۔ مسٹر جان نے کہا۔ "ہاں مہنگا ضرور رہیگا۔ لیکن فائدہ بھی بہت ہوگا۔ ہمارے پاس ایسے نامہ نگاروں کے لئے کافی گنجائش ہے ڈیڑھ لاکھ روپیہ...."

"فضول!" الکیٹولیس نے نحیف مگر درشت آواز میں کہا۔

ولیم نے آہستہ سے کہا۔ "آپ اس کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے۔"

لیکن مسٹر جان نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندا نکال کر الکیٹولیس کی طرف پھینک دیا۔ اس نے کاغذوں کو کھولا اور نوٹ گننے شروع کئے۔

چھ ہزار.... خوب.... اس نے ایک نوٹ روشنی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اچھا میں ذرا ان کا امتحان کر لوں۔" یہ کہکر وہ تمام نوٹ اٹھائے اور کارنس کی طرف بڑھا۔

مسٹر جان، ولیم اور فلپ کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

الکیٹولیس دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا اور ایک شخص داخل ہوا۔

مسٹر جان نے پہچان لیا کہ نو آمدہ وہی اسمتھ تھا جس نے صبح انہیں غصہ دلایا تھا۔

آداب عرض ہے حضرات"! اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ الکیٹولیس چلتے چلتے رک گیا کسی نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔

اس نے پھر کہا۔ "آداب عرض ہے قبلہ! کیوں ٹامی! مجھے پہچانا نہیں"؟

الکیٹولیس نے مسکرا کر کہا۔ "جی مسٹر اسمتھ پہچان لیا۔ یہ تیسری ملاقات ہے۔" "ہاں تیسری ملاقات،

سکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور انسپکٹر مسٹر اسمتھ نے کہا۔ "اور بہت دل خوش کن ملاقات۔ میں تم تینوں کے لئے آیا ہوں تمہارے خوش پوش ساتھی کو میرے آدمیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ تمہارے پاس ان صاحب کا کچھ روپیہ ہے؟ — شکریہ..."

الکیٹولیس (جسکا اصلی نام ٹامی تھا) نے نوٹ انسپکٹر کے حوالے کر دیئے اور لائق جاسوس نے تینوں کو ہتھکڑی پہنا دی۔

کیوں ٹامی! انسپکٹر اسمتھ نے کہا۔ "یہ دونوں تمہارے شاگرد ہیں؟ تمام مجرموں میں تمہیں ایک رہ گئے تھے جس کی مجھے خاص فکر تھی۔ اب ذرا اپنی ہی موٹر میں بیٹھ کر سکاٹ لینڈ یارڈ کی سیر کو چلو۔"

انسپکٹر نے موٹر میں بیٹھکر کہا۔ "بات یہ ہے مسٹر جان کہ یہ لوگ مشہور جرائم پیشہ ہیں۔ میں صبح ہی آپ کو آگاہ کر دیتا لیکن ذرا لطف دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ چھ ہزار حاصل کرنیکے لئے ایک ہزار صرف بھی کر دیتے ہیں۔"

مسٹر جان نے نہایت مایوسی اور غصے سے کہا۔ "کوئی شک نہیں کہ میں اول درجہ کا احمق ہوں۔"

مسٹر اسمتھ نے کہا۔ "جناب آپ ابھی نوجوان ہیں۔" اور مسٹر جان دانت پیس کر خاموش ہو رہے۔

اس واقعہ کی ابتدا میں مسٹر جان کے دل میں ایک سچے نامہ نگار ہونیکی حیثیت سے قصے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن درمیان میں آکر معاملہ کچھ کا کچھ ہو گیا آخر میں پھر ایک ایسی بات ہوگئی کہ واقعی ایک خاصہ دلچسپ افسانہ بن گیا نہ معلوم مسٹر جان نے کیوں ابتک اس قصے کی اشاعت نہیں کی۔ لیکن (جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہو) مضمون نگار تو ایسے سنہری موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے مسٹر جان کے دماغ میں جب افسانے کا خیال آیا تو یہ باتیں مدنظر تھیں۔ م م

م م "ہمخیال احباب"، ہیرے ہر پونڈ کے مقابلے میں تین سو پونڈ، دولت سے نفرت، بوسیدہ لباس، ہم اس میں دو باتوں کا اضافہ کرتے ہیں یعنی، مانیٹر، اور "ابھی آپ نوجوان ہیں"!

رباعیات

صہبائے سرورِ سرمدی رکھتا ہوں
یعنی کہ محبتِ نبی رکھتا ہوں
ہرچند کہ بینوا ہوں لیکن اکبر
سامان نشاطِ زندگی رکھتا ہوں

ہرچند سمجھتا ہے اسے دل آساں
مشکل سے مگر ہوگی یہ مشکل آساں
منزل پہ پہنچتے ہی پہنچتا ہے بشر
منزل مشکل ہے فکرِ منزل آساں

غزل

سیماب بھر دیا ہے دلِ بیقرار میں
کیا سحر ہے تری نگہِ فتنہ کار میں
وہ رشکِ صد بہار ہے میرے کنار میں
اللہ کیا بہار ہے اب کی بہار میں
اللہ بچائے دل کو بلاؤں سے عشق کی
دامن اُلجھ گیا ہے مرا خارزار میں
دل بے نیاز گردشِ لیل و نہار ہو
یا فرق آئے گردشِ لیل و نہار میں
مانا کہ صبر چارۂ اندوہِ عشق ہے
لیکن نہیں ہے صبر مرے اختیار میں
اللہ رے شوق آئے نہ وعدہ پہ وہ کبھی
آیا مگر نہ فرق مرے اعتبار میں
دیوانہ کر دیا ہے ترے انتظار نے
دیوانہ ہو گیا ہوں ترے انتظار میں
ذرّے چمک اُٹھے ہیں تری رہگذار کے
جلوے ہیں بیقرار تری رہگذار میں
اکبرؔ دل آج تک ہے مرا وقفِ اضطراب
کیا جانے کیا تھا اُس نگہِ شرمسار میں

جلال الدین اکبر

ماں کی ممتا

(مشہور روسی افسانہ نگار چیکوف کے قلم سے)

موت کے فرشتہ نے ایک چھوٹے سے بچے کے گہوارے پر اپنے بازو پھیلا دیئے۔ یہ کوئی معمولی بچہ نہ تھا۔ اُس گھر کا اُجالا تھا۔ خاندان بھر کا دلارا تھا۔ سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بہار اور خزاں کے تین ہی زمانے دیکھنے پایا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔

اس قدر جلد عدم آباد کو لوٹ جانے والے معصوم مسافر کے کمرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک ماں تھی جو نیم جان لاشے سے گود بھرے بیٹھی تھی۔ ماتا کے آنسو بہا رہی تھی۔ سر۔ ہاتھ پر لٹکا ہوا تھا۔ نگاہیں۔ زمین پر گڑی تھیں۔

باپ۔ سویرے سے دوکان بند کر کے لوٹ آیا۔ ماں سے بولنے کی ہمت نہ پڑی کہ چڑچڑا نہ جائے۔ کمرے میں بھی آیا نہ گیا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے۔ دور کھڑے ہو کر اداس نظریں ڈالیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ موت کا فرشتہ کمرے میں سمایا ہوا ہے۔ اور بچے پر منڈلا رہا ہے۔

اُف۔ کیسا ہولناک منظر ہے! ملک الموت آیا ہے تاکہ آسمان والے کی امانت۔ زمین والوں سے چھین لے جائے!

"موت! رحم! رحم!!" باپ نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر کے اور دانت بھینچ کے مناجات شروع کی۔ "اس بچے پر رحم کر! اس ماں کے درد بھرے دل پر رحم کر! نیک فرشتے! اگر تو اکیلا واپس جانا نہیں چاہتا تو مجھے میرے چہیتے کے بدلے لے چل۔ خدارا! اسے اس کی دکھیاری ماں کے لئے چھوڑ دے۔ اگر تو بچے کی جان لے لے گا تو ماں بھی مر جائے گی۔ جئے گی بھی تو مردوں سے بدتر۔ مجھے بدلے میں قبول کر لے۔ میں تیری منت کرتا ہوں"۔

موت کے فرشتے نے آہستہ سے حرکت کی اور باپ کو اشارے سے کہا۔ "میرے پیچھے چل"!

"ہاں۔ ہاں۔ مہربان فرشتے! میں تیرے پیچھے چلتا ہوں"۔ باپ نے جوش سے کہا: "قسم خدا کی دنیا کے آخری سرے تک ساتھ چلوں گا موت کی بھیانک وادی میں بھی تو مجھے اپنے پیچھے پائیگا۔ میں خوش ہوں کیونکہ اپنی جان دے کر اپنے لخت جگر کو بچا رہا ہوں۔ ہاں۔ موت! جلدی کر۔ چل کہ میں تیرے ساتھ جانے کے لئے بےچین ہوں"!

فرشتہ بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہو گیا۔ غمگین باپ نے اُس کے پیچھے ہوا پر دوڑنا شروع کیا۔ دم کے دم میں شہر کے خوشنما باغ سے گذر ہوا۔ ہرے بھرے درخت۔ پھولوں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے۔ پھر خود شہر میں پہنچا۔ خاص اپنی دوکان نظر آئی۔ دوست احباب دکھائی دیئے۔ اُن کی آوازیں اور باتیں سنائی دیں۔ بازار میں گھسا۔ ہر طرف لین دین۔ ہر طرف کھنا کھن۔

انسانی جذبات باہم ملتے ہیں کہ یک رنگی پیدا کریں۔ مگر فوراً ہی تصادم بھی شروع ہو جاتا ہے۔ کشمکش ہونے لگتی ہے۔ حرص و طمع۔ انسانی عقل کا مذاق اڑاتی ہے۔ کچے دھاگے سے اُسے دنیا سے باندھ دیتی ہے۔ لیکن دنیا ہے کہ سرد ہے۔ خاموش ہے۔ بے مہر ہے۔ زندگی کے لمحوں کو برابر نگلتی جاتی ہے۔ اور پوری بے پروائی سے عدم کی ظلمت میں اُگلتی جاتی ہے۔

فرشتہ۔ باپ کو لئے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہونچ گیا۔ اور اب اُدھر کو جانے لگا جہاں موت رہتی ہے۔ اور جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ فصیل کے برجوں اور میناروں پر سورج کی گنگا جمنی شعاعیں ناچ رہی تھیں۔ اور انسان کے دل میں اس فانی دنیا کی محبت جگا رہی تھیں باپ کے گھٹنے ٹھنڈے ہو کر کانپنے لگے۔ اُس نے گردن موڑی کہ دنیا پر آخری نظریں ڈال لے۔ اور خدا حافظ کہکر رخصت ہو جائے۔ مگر اُس کے پاؤں۔ لڑکھڑا گئے۔ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

"موت! رحم" وہ بڑی بےکسی سے چلایا۔ "میں کسی طرح بھی مر نہیں سکتا۔ میرا دل زندگی چاہتا ہے۔ ابھی جوانی کا عالم ہے۔ دنیا کی رعنائیاں مسرتیں۔ عیش و نشاط۔ ہر چیز اشارے کر رہی ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ زندہ رہنے کی فرمائش کر رہا۔ اور خوشی دینے کے وعدے دے رہا ہے میں اپنی جان نہیں دوں گا۔ مجھے زندہ رہنا چاہئے۔ جا! اور جس کسی کی روح بھی جی چاہے۔ قبض کر لے۔ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا"!

فرشتہ اپنے پر پھیلائے بچے کے سر پر پھر لوٹ آیا۔

بیمار کا نوجوان بھائی آیا۔ اداسی کی ہٹی سیاہی اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ آتے ہی ماں کو آواز دی۔ مگر وہ بدستور غم کی تصویر بنی زمین پر نظریں جمائے آنسو بہاتی رہی۔ نوجوان نے منہ اُٹھایا تو ملک الموت کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ڈر گیا۔ پھر اپنے جان بلب بھائی کا منہ دیکھا تو مردے کی طرح پیلا پایا۔

"موت!" لڑکے نے فرشتے سے کہا۔ "شہر میں اور بہت بچے ہیں۔ تو اُنہیں شکار کیوں نہیں کرتی؟ آخر اس بچے نے کیا خطا کی ہے کہ اُسی کی جان لینے پر تل گئی ہے؟ اتنا بھی نہیں سوچتی کہ ہم سب اس سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ اس کا مرنا۔ ہم سب کا مرنا ہے۔ اگر ہمارے ہی گھر کو تو نے تاک لیا ہے تو میاں بھی کئی آدمی موجود ہیں۔ کسی اور کو لے دیکھ ایک میں ہی تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے بھائی کے بدلے مجھے لے جا!"

بھائی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ موت کے فرشتے کو جنبش ہوئی۔ اس نے اشارے سے چلنے کو کہا۔ دونوں روانہ ہو گئے۔

شہر کی سڑکوں پر چلتے رہے۔ نوجوان کے ساتھی مدرسے سے لوٹ رہے تھے۔ کھیلتے کودتے۔ ہنستے۔ بولتے چلے جا رہے تھے۔ پڑوسی کا لڑکا دکھائی دیا۔ اس جوان سے اُس کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ اس وقت وہ وہی گیت گا رہا تھا جو یہ اکثر گایا کرتا تھا۔ اب وہ گھر ملا جس میں اُس کی چھوٹی سی خوبصورت محبوبہ رہتی تھی۔ پھولوں کی وہ کیاریاں دکھائی دیں جو اُس نے اس لڑکی کے ساتھ مل کر لگائی تھیں۔ وہ خود بھی باغ میں فوارے کے کنارے پاؤں پھیلائے بیٹھی نظر آئی۔ پھر سینما کی طرف گزر ہوا۔ بھیڑ لگی تھی۔ کوئی اچھا تماشہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف سے اُس کا وہ پرانا دوست بھی آتا دکھائی دیا۔ جو ایک لمبے سفر سے برسوں کے بعد لوٹا تھا۔ نوجوان فوراً مصافحے کے لئے لپکا۔ مگر چشم زدن میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کیونکہ فرشتہ بجلی کی تیزی سے لاانتہا فضا میں اُسے اُڑائے لئے جا رہا تھا۔

آخر نوجوان ڈر کر اور تھک کر بےہوش ہو گیا۔ اور زمین پر آ گرا۔

"اُٹھو!" فرشتے نے اپنی کرخت آواز میں ڈانٹا۔

"نہیں! موت! رحم!" لڑکا ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا۔ "کسی اور کا گلا گھونٹ۔ مجھے چھوڑ دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے کے بدلے میں اپنی جان کیوں دوں؟"

فرشتہ لوٹ آیا۔ اور بچے کے بچھونے پر پھر منڈلانے لگا۔

بہن مدرسے سے لوٹی۔ موہنی صورت حسن کی ننھی سی دیوی۔ وہ آئی اور ماں کے پاس بیٹھنے لگی۔ اچانک موت کا فرشتہ بھائی پر منڈلاتا نظر آیا۔ ننھی سی جان ڈر سے لرز اُٹھی۔

"ڈراؤنی صورت کیا چاہتی ہے" وہ دل میں چلائی۔ "کس کی جان لینے آئی ہے؟ کیا میرے ننھے کے دشمنوں کی؟ موت! تجھے اس معصوم پر ترس کھانا چاہیئے۔ میرا بھائی! آہ میرا بھائی۔ یہ دان کے پھول کی طرح پاک اور صبح کی شبنم کی طرح صاف ہے! ہاں میرا بھائی! میری جان! موت! مجھے اُس کے بدلے میں لے لے!"

ملک الموت نے اپنی انگلی ہلا کر کہا "چلی آ!"

فرشتہ روانہ ہوا۔ لڑکی بھی پیچھے ہو لی۔

باغ پہونچے۔ چشمے پر سے گزرے جو اُسی طرح اُبل رہا تھا جس طرح تازگی خود لڑکی کے گالوں سے۔ بنفشہ کے وہ پودے بھی دکھائی دیئے۔ جو اُس نے آج ہی صبح بوئے تھے۔ سڑک پر آئے۔ سہیلیاں کھیلتی کودتی نظر آئیں۔ شہر کے اُن تمام حصوں سے گزرے جنہیں لڑکی پہچانتی تھی۔ آخر مدرسے کے دروازے پر رکے کہ لڑکی اُسے الوداع کہہ لے۔ لیکن وہیں اُس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اُس نے گردن گھمائی اور لوٹنے لگی۔

"نہیں اے فرشتے! میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی" لڑکی نے اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں مرنا نہیں چاہتی۔ جسے جی چاہے مار ڈال۔ مجھے جینا ہے۔ موت کڑوی اور ڈراؤنی ہے۔ زندگی میٹھی اور پیاری ہے۔"

فرشتہ لوٹ آیا۔ اور بدستور بیمار کے بچھونے پر منڈلانے لگا۔

اب بچے کی نبض رک رہی تھی۔ سانس اُکھڑ چکی تھی۔ ہچکی شروع ہو گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی اینٹھنے لگے تھے۔ غمزدہ ماں نے سر اُٹھایا کہ اپنے پیارے کا آخری دیدار کر لے۔ ایک دفعہ اور چھاتی سے لگا لے۔ اُس نے سر جھکایا کہ اپنے ہونٹ اُس کے سفید ہونٹوں پر رکھ دے۔ مگر ڈری کہ کہیں پیار۔ زندگی کا رہا سہا رس بھی نہ چوس لے۔

اُس نے منہ ہٹا لیا۔ آنکھ اٹھی تو ملک الموت کو سامنے پایا۔ وہ تنہا کھڑا تھا۔ اور دکھیاری ماں کی بیٹے سے رخصتی کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں فوراً بچے کی چارپائی کے سامنے دعا کے لئے جھک پڑی۔ کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور ٹوٹے ہوئے دل سے کہنا شروع کیا۔

"موت! رحم! اگر تو اس معصوم پر رحم کھا نہیں سکتا تو بدنصیب ماں

ماں ہی پرنزس کھا۔ موت! یہ بچہ۔ میرا خون ہے۔ گوشت ہے۔ دل کا ٹکڑا ہے زندگی کی بہار ہے۔ خدارا ایسا نہ کر کہ بدبخت ماں اپنے لختِ جگر کی تربت پر کھڑی ہو۔ مہربان بن۔ احسان کر اور بچے کو اس لئے چھوڑ دے کہ اپنی ماں کی قبر کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اچھے فرشتے! کیا تو ماں کی جان اُس کے بچے کے بدلے قبول کر سکتا ہے؟

موت نے اشارہ کیا اور ماں ساتھ ہولی کہ اپنے بچے پر قربان ہو جائے فرشتہ باغ میں لے گیا۔ اُس کی کیاریاں۔ اُس کے چمن۔ اُس کی نہریں جو خود اُس نے بنائی تھیں دکھائیں۔ پھر شہر بھر میں پھرایا۔ اور ایک ایک کر کے وہ سب دکھایا جو دل کو لبھانے والا اور زندگی کی چاہ آدمی میں پیدا کرنے والا ہے۔ زنانہ کلب میں لے گیا جس کی وہ سرگرم ممبر تھی۔ اُس محل کے پھاٹک پر کھڑا کیا۔ جہاں جشن منایا جا رہا تھا۔ اور جس میں وہ خود بھی مدعو تھی

یہاں ماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور آنکھ سے گرم آنسوؤں کی دو پتلی لکیریں اُس کے جوش سے بھڑکے ہوئے رخساروں پر دوڑتی نظر آئیں

فرشتہ رک گیا۔

"کیا ماں بھی اپنی محبت میں کچی اور جھوٹی ثابت ہوگی"؟

وہ سوچنے لگا "کیا ماں بھی اپنی جان کو بچے سے زیادہ عزیز رکھے گی؟ جب ماں کی محبت بھی جھوٹی ہو جائے تو پھر اس دنیا کو سلام! انسانیت پر ماتم!"

پھر فرشتہ عورت کو اُس کی چہیتی بہن کے گھر لے گیا۔ جو اپنے بچوں کو خوشی خوشی کھلا پلا رہی تھی۔ پھر اُس کی پیاری سہیلی کے کمرے میں گھسا جو بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ لیکن ماں مضبوط قدموں سے برابر ساتھ چلی آ رہی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

ملک الموت ٹھہر گیا۔ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

"موت! چل۔ بے تاب ماں چلائی "جلد چل کہ میرے بچے کی جان بچ جائے رُک کیوں گیا؟ آگے بڑھ اور ماں کو اُس کے بیٹے کے بدلے لے جا۔ جلدی کر ایسا نہ ہو کوئی دوسرا فرشتہ آ کر اُس کی روح قبض کر لے جائے"۔

موت مسکرائی۔ کیا موت کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آتی ہے؟

اس غیر فانی محبت کے سامنے آخر کار موت کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ بجلی کی طرح چمک کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ ماں ہکا بکا رہ گئی۔ پھر سمجھی فرشتے نے دغا دی کہیں بچے کو جا کر نہ مار ڈالا ہو۔ بے تحاشا دوڑ پڑی۔ گھر میں اُس نے کیا دیکھا؟ وہ دیکھا کہ قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جائے۔ بچہ بالکل اچھا ہو چکا تھا اور "اماں اماں" کر رہا تھا ماں کو دیکھ کر ہمک کے لپکا۔ اور اُس کی ماں بھری چھاتی سے چمٹ گیا۔

اس کے بعد پھر کبھی فرشتے نے اُس گھر میں منہ نہیں دکھایا جہاں ایسی لازوال محبت بستی تھی

غزل

کیسی بے ربط تری انجمن آرائی ہے
دل ہے مجروح نظر۔ روح تماشائی ہے

قلبِ انساں کو کہاں تابِ شکیبائی ہے
جادۂ عشق میں ہر گام پہ رسوائی ہے

آنکھ نیرنگیٔ فطرت کی تماشائی ہے
تو کسی پردہ سے جھانکے تری رسوائی ہے

خامشی غنچوں کی۔ حیرانی نرگس کیا خوب!!
ہر تماشے میں اِک اندازِ تماشائی ہے

محفلِ عرش میں خلوت نہیں ممکن نہ سہی
دل میں آ جاؤ کہ یہ گوشۂ تنہائی ہے

یا تو ہے آئینۂ دل ہی مکدر حامد
یا غلط حسن کا ہر دعویٔ یکتائی ہے

حامد شاہجہانپوری

فنا اور بقا کا دور

ہزاروں تارے فلک سے گر کر فضا میں معدوم ہو چکے ہیں
مگر نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ محفل آسماں وہی ہے

عروس شب کی جبیں مزیّن ہے اب بھی خوش آب موتیوں سے
وہی ثریّا کا آئینہ خانہ ہے جوئے کہکشاں وہی ہے

ہے سرزمین چمن ہزاروں گلوں کا مدفن مگر ابھی تک
چمن کی شاداب سرزمیں میں سرورِ آب رواں وہی ہے

حیات کے سرمدی نشے میں کلی کلی مسکرا رہی ہے
وہی ہے رنگینیٔ فضا دل فریبیٔ گلستاں وہی ہے

ہوئی ہیں جم جم کے اس خرابے میں سینکڑوں مجلسیں پریشاں
مگر وہی رنگ بزم ہستی ہے محفل دوستاں وہی ہے

جو پہلی نسلوں نے آکے دیکھے سمجھے میں وہی سین دیکھتا ہوں
مکیں اگرچہ بدل چکے ہیں مگر یہ کہنہ مکان وہی ہے

وہی ہے ساون وہی گھٹائیں وہی ہے موسم وہی ہوائیں
وہی حیات آفریں فضائیں ہر ایک دلکش سماں وہی ہے

ہوائیں بھر بھر کے لا رہی ہیں سیاہ مشکیزے بادلوں کے
تو دوش ترک فلک پہ قوس قزح کی رنگیں کماں وہی ہے

یہاں بہت انقلاب آئے مگر نہ دنیا کی شان بدلی
کہ سال ہا سال کے گزرنے پر اب بھی یہ خاکداں وہی ہے

وہی ہے شام و سحر کی حالت وہی ہر اک رہگزر کی حالت
وہی ہے اب تک بشر کی حالت طلسم سود و زیاں وہی ہے

فنا کا قانون ازل کے دن سے ہے کار فرما جہاں میں لیکن
نوائے مرغ حیات ہے آج بھی سر شاخسار پیدا

بہار کے عارض حسین پر خزاں کی زردی جھلک رہی ہے
خزاں کے چہرے سے ہو رہا ہے شباب حسن بہار پیدا

ہوئے ہیں دشت حیات کی وسعتوں میں گم قافلے ہزاروں
ہوئے ہیں گرد عدم کے پردے سے سیکڑوں شہسوار پیدا

ادھر فضا شب کی تیرگی میں حسین تاروں کو کھا رہی ہے
ادھر فلک کر رہا ہے انجم کے گوہر تابدار پیدا

وہ خاک ننگ وجود تھی جو غریب مزدور کے بدن پر
زمانہ کرتا ہے آج اسی خاک سے سر تاجدار پیدا

ہزاروں صدیاں گزر گئی ہیں مگر ہے جاری یہ کارخانہ
کہ جیب گردوں سے آج تک ہو رہے ہیں لیل و نہار پیدا

اسے بگاڑا اسے سنوارا اسے مٹا کر اسے ابھارا
ہر اس روش پر خزاں مسلط تو اس روش سے بہار پیدا

اسی سے قائم ہے رنگ دنیا جہان کی یہ قدیم خو ہے
کہ سیکڑوں بار مٹ چکا ہے ہوا ہے لاکھوں ہی بار پیدا

اگرچہ ظاہر میں رنگ دنیا کا اور سے اور ہو رہا ہے
فنا کا بھی دور ہو رہا ہے بقا کا بھی دور ہو رہا ہے

(بقیہ سلیم)

دُنیائے ادب

آسکر وائلڈ کی نگاہ میں ناقد کے صفات[۱]

آسکر وائلڈ کی ایک مشہور تصنیف " ارادے " کے ایک مضمون کے کچھ حصّے ناظرینِ النّاظر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون " ناقد بحیثیت آرٹسٹ " کے عنوان سے ہے اور ۱۲۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ پورا مضمون ایک مکالمہ کی صورت میں لکھا گیا ہے گفتگو کرنے والے دو شخص ہیں۔ ایک کا نام ارنسٹ ہے اور دوسرے کا گلبرٹ۔ ارنسٹ اوسط درجے کی ذہنیت کا ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ گلبرٹ خود آسکر وائلڈ ہے اس لئے وہ فلسفی بھی ہے ناقد بھی، آرٹسٹ بھی۔ پورا مضمون جدّت نگارش، فلسفۂ نقد، معیارِ نقد اور صفاتِ نقد سے مملو ہے۔ میں اس مضمون کا وہ حصّہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو صفاتِ ناقد سے متعلق ہے۔

علی عباس حسینی

گلبرٹ کے سوال پر ارنسٹ نے ناقد کے لئے تین صفتیں ضروری بتائی ہیں (۱) ناقد منصف و غیر جانبدار ہو (۲) معقولیت پسند ہو (۳) با خلوص ہو لیکن آسکر وائلڈ کی جدت آفرینی اس کی مقتضی نہیں کہ وہ عام طور سے مانے ہوئے اصول و نظریات تسلیم کرے۔ اس لئے گلبرٹ ان امور کی مخالفت کرتا ہے۔

(۱) ناقد غیر جانبدار ہو۔

گلبرٹ:۔ جی نہیں۔ ناقد انصاف کے عام معنوں میں منصف یا غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص صرف انھیں معاملات میں غیر جانبدارانہ رائے دے سکتا ہے جن میں اُسے دلچسپی نہ ہو۔ اور بلا شُبہ یہی وجہ ہے کہ غیر جانبدارانہ رائے بالکل بیکار ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو کسی مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر نظر کرتا ہے کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ آرٹ ایک جذبہ ہے اور آرٹ کے معاملات میں خیال ہمیشہ جذبہ سے رنگا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ مستقل ہونے کی جگہ سیّال ہوتا ہے۔ اور نفیس لمحات و لطیف انداز پر مبنی ہونے کی وجہ سے اُس میں سائنس کے قواعد اور مذہب کے ضوابط کی سی سختی نہیں آ سکتی۔ آرٹ کا براہ راست تخاطب روح سے ہوتا ہے اور روح دماغ کی اسی طرح مقید ہو سکتی ہے جس طرح کہ وہ جسم کی ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناقد کو کسی سے کد نہ ہونا چاہیئے لیکن جیسا کہ ایک جلیل القدر فرانسیسی آج سے سَو برس پہلے کہہ گیا ہے ایسے معاملات میں یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ترجیح ضرور دے۔ اور جہاں کہیں کسی نے ترجیح دی پھر انصاف کہاں؟ نیلام کرنے والا ہی بالکل غیر جانبداری کے ساتھ یکساں طور پر آرٹ کے ہر طرز کی تعریف کر سکتا ہے۔

نہیں صاحب حقیقی ناقد میں انصاف کی صفت لازمی نہیں بلکہ انصاف تو نقد کی بھی شرط نہیں۔ ہر اُس طرز کا آرٹ جو ہمارے پیش نظر ہوتا ہے ہمیں اپنا محکوم بنا لیتا ہے اور دوسروں کو بھلا دیتا ہے۔ ہمیں اگر پیش نظر شئے کا راز معلوم کرنا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اس میں بالکل محو ہو جائیں۔ اس وقت تو ہمیں کسی دوسرے امر کا خیال ہی نہ آنا چاہیئے اور نہ آ سکتا ہے۔

(۲) ناقد کو کم از کم معقولیت پسند ہونا چاہیئے یا یہ بھی نہیں؟

گلبرٹ:۔ معقولیت پسند؟ آرٹ سے نفرت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو اس سے نفرت کرنا ہے اور دوسرا اُسے عقلی حدود تک پسند کرنا ہے۔ اس لئے کہ آرٹ جیسا کہ افلاطون نے بڑی افسردگی کے ساتھ مانا ہے اپنے دیکھنے یا سُننے والوں میں ایک طرح کی مقدس مجذوبیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خود الہام کے ذریعے معرض وجود میں نہیں آتا لیکن وہ دوسروں کو الہامات کا القا کرتا ہے۔ عقل سے وہ تخاطب نہیں کرتا۔ اگر کسی کو آرٹ سے محبت ہے تو وہ اُسے دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز رکھے گا۔ اور اگر عقل کی اس معاملہ میں سُنی جائے تو وہ سخت مخالفت کرے۔ حُسن کی پرستش میں کہیں بھی صحیح الدماغی نہیں ہے۔ وہ اس سے کہیں بالاتر ہے۔ ایسے لوگ جن کی زندگی پر یہ پرستش غالب آ گئی ہے وہ دُنیا کی نگاہوں میں ہمیشہ محض خیال پرست معلوم ہوں گے۔

(۳) اچھا تو کم از کم وہ با خلوص تو ہوگا۔

گلبرٹ:۔ تھوڑا سا خلوص خطرناک ہوتا ہے، اور بہت سا خلوص تو مطلقاً مہلک ہے۔ حقیقی ناقد اصولِ حُسن کی پرستش میں یقینی طور پر ہمیشہ مخلص

۱ـ آسکر وائلڈ کا طرز لفظی ترجمہ کا متحمل نہیں اس لئے روانی و سلاست قائم رکھنے کیلئے کہیں کہیں اس کے مطالب اپنے الفاظ میں ادا کر دئے گئے ہیں پھر بھی ترجمہ ہونے کی حیثیت سے جُملوں کی ساخت اُردو کے لئے گراں ضرور رہی۔ حسینی

ہوگا۔ لیکن وہ ہر زمانے میں اور ہر طرز میں حُسن کی تلاش کرے گا اور اپنے کو کسی مقررہ طرزِ خیال یا معینہ مطمحِ نظر تک محدود نہ کردیگا۔ وہ اپنے جذبہ کا احساس بہت سی صورتوں میں اور ہزاروں مختلف طریقوں سے کریگا اور ہر وقت نئے احساسات اور نئے نظریوں کا جویا رہے گا۔ مسلسل تغیرات اور صرف مسلسل تغیرات ہی میں وہ اپنی حقیقی انفرادیت پائے گا۔ وہ اپنی رائے کا غلام بننے کے لئے راضی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ دماغ ذہنی دُنیا کی حرکتِ مسلسل کے علاوہ اور کیا ہے؟ زندگی کی طرح خیال کا بھی جوہر نمو ہی ہے۔ ارنسٹ تمھیں الفاظ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے جسے کہ لوگ عدمِ خلوص کہتے ہیں وہ صرف ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی شخصیتوں میں اضافہ کرسکتے ہیں........

تم نے جو تین صفتیں بیان کی ہیں اُن میں سے دو اگر بالکل اخلاقی نہیں ہیں تو کم از کم اخلاقیات کی سرحد پر ضرور ہیں اور نقد کی پہلی شرط یہ ہے کہ ناقد یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ آرٹ کی دُنیا اور علم الاخلاق کی دُنیا دو مختلف اور علیحدہ چیزیں ہیں۔ جب ان کو مدغم کردیا جاتا ہے تو انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ آج کل انگلستان میں اکثر و بیشتر یہی ہو رہا ہے۔ باوجودیکہ آج کل کے پیورٹن (تقدس مآب لوگ) کسی حسین چیز کو برباد نہیں کرسکتے لیکن پھر بھی اپنے جذبات کی غیر معمولی دنائت کی وجہ سے ایک لمحہ کے لئے حُسن کو بھی کچھ نہ کچھ گندہ کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کے لوگ اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ اخبارات کو بناتے ہیں۔ مجھے افسوس اسلئے ہے کہ موجودہ صحافت میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے ہم تک پہونچا کر صحافت ہمیں قوم کی جہالت سے باخبر رکھتی ہے۔ موجودہ زندگی کے روزمرہ واقعات کو احتیاط سے بیان کرکے وہ ہم پر یہ ظاہر کردیتی ہے کہ حقیقۃً یہ واقعات کتنے غیر اہم ہیں غیر ضروری اشیاء پر ہمیشہ مباحثہ کرکے وہ ہمیں یہ سمجھا دیتی ہے کہ شائستگی کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور کن چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ان کے مضامین سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ دُنیا جس پر علم الاخلاق اور اخلاقی قیود حکومت کے مدعی ہیں وہ کتنی محدود ہے۔ سائنس تک اخلاقیات کی رسائی نہیں ہوتی اس لئے کہ سائنس کی نگاہیں ابدی حقیقتوں پر جمی ہوئی ہیں۔ آرٹ بھی اخلاقیات کی حدود سے باہر ہے۔ اس لئے کہ اس کی نگاہیں اُن چیزوں پر جمی ہیں جو حسین ہیں، غیر فانی ہیں اور ہمیشہ تغیر پذیر ہیں۔ اخلاقیات کی دُنیا ان سے پست اور کم درجے کی دماغی دُنیا ہے۔ بہرحال ان ناک بھوں سکوڑنے والے پیورٹنوں (تقدس مآب گروہ) کو جانے ہی دو۔ اُن پر ہنسنے کے لئے کافی مصالحہ موجود ہے۔ بھلا اُس وقت کون شخص ہنسی ضبط کرسکتا ہے جبکہ ایک معمولی اخبار نویس بڑی متانت سے یہ تجویز کرتا ہے کہ اُن مضامین کو محدود کردیا جائے جنھیں آرٹسٹ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد ہمارے اخبارات اور اخبار نویسوں کی قدرے حدبندی کردی جائے گی۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے بے مزہ، روکھے پھیکے اور قابلِ نفرت واقعات کو بیان کرتے ہیں وہ نہایت ذلیل طور پر بڑے شوق سے درجۂ دوم کی خلقت کے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور جُہلا کی سی ضمیر پروری سے کام لے کر ہمیں خُشک اور صحیح صحیح تفصیلات ایسے لوگوں کے افعال کی سُناتے ہیں جو قطعی کسی دلچسپی کے مستحق نہیں ہیں لیکن اس آرٹسٹ کی کون حدبندی کرسکتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو مان کر اُنھیں حسین صورتوں میں منتقل کردیتا ہے اور انھیں ہمدردی و خوف کا ذریعہ بنا دیتا ہے! اور اُن کی آب و تاب ان کا اچھوتا پن، اور ان کا واقعی اخلاقی اثر ظاہر کردیتا ہے، اور پھر اُن سے ایک ایسی دُنیا تعمیر کردیتا ہے جو حقیقت سے زیادہ حقیقی ہے اور اُس سے کہیں زیادہ رفیع اور پاکیزہ ہے۔ یہ حدبندی اُس نئی صحافت کے علمبرداروں کا تو کام نہیں ہے جو کہ خود بُرائی غیر شائستگی کا ایک بیّن مظاہرہ ہے۔ اور نہ اس جدید تقدس مآبیت کا کام ہے جو کہ مکاروں کا تضرع ہے اور جس کی تقریر و تحریر دونوں میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسی تجویز ہی مہمل ہے۔ ان بدمعاشوں کو تو چھوڑ دو اور اس بحث کو جاری رکھو کہ وہ کون سی صفتیں ہیں جو حقیقی ناقد میں ہونی چاہئیں۔

ارنسٹ :- آخر وہ کیا ہیں تمھیں بیان کرو۔

گلبرٹ :- ناقد کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز اندازِ طبیعت ہے اور ایسا مزاج جو حُسن کے مختلف تاثرات کا لطیف احساس رکھتا ہو۔ ہم اس امر سے اس وقت بحث نہ کریں گے کہ یہ اندازِ طبیعت یا مزاج قوم و فرد میں کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ اس میں انداز کا وجود ہے، اور یہ کہ ہم میں دوسری حسیات سے علیحدہ اور بالاتر عقل سے جُدا اور پاکیزہ تر روح سے مختلف اور اُتنی ہی اہم ایک اور حس حُسن ہوتی ہے جو بعض کو تخلیق کی جانب اور میرے نقطۂ نظر سے زیادہ پاکیزہ نفوس کو مراقبہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس حسن کو پاکیزہ اور مکمل کرنے کے لئے نہایت ہی لطیف ماحول کی ضرورت ہے۔ بغیر ایسے ماحول کے وہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور سُست ہوجاتی ہے تمھیں وہ نفیس مقام یاد ہے جہاں افلاطون یہ بیان کرتا ہے کہ ایک نوجوان یونانی کو کیونکر تعلیم دینا چاہیئے؟ وہ اس امر پر کتنا زور دیتا ہے کہ اہم ترین شے ماحول ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ لڑکوں کی تربیت ایسی فضا میں ہونی چاہیئے جہاں اچھے مناظر ہوں اور سُریلے نغمے۔ تاکہ مادی چیزوں کا حُسن اُن کی روح کو اس حُسن کے حصول کے لئے تیار کردے جو روحانی ہے۔ لڑکے میں غیر محسوس طور پر بغیر اس کی وجہ جانے ہوئے وہ حقیقی محبتِ حُسن پیدا ہونا چاہیئے۔ جسے افلاطون بار بار واقعی غرض تعلیم بتاتا ہے۔ اس میں رفتہ رفتہ وہ کیفیت و انداز پیدا ہوجانا چاہیئے کہ بغیر کسی دقت کے اور بالکل جبلی طور پر اچھائی کو بُرائی کے مقابلے

میں ترجیح دے اور غیر شائستہ و غیر مہذب باتوں کو ترک کردے اور اُس لطیف جبلّی ذوق کی پیروی کرے جس میں نزاکت و نظافت و خوبصورتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد انجام کار اس ذوق میں احساس خودی اور نقد کا مادّہ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن ابتدا میں یہ ذوق محض ایک حاصل کردہ جبلّت کے طور پر ہو گا۔ ایسا شخص جس نے اس طرح کی روحانی تربیت پائی ہو اپنی جوانی ہی کے زمانے میں جبکہ وہ اپنے افعال کی توجیہ سے بھی واقف نہ ہو گا۔ آرٹ اور فطرت کے متروکات اور اغلاط کا بآسانی مشاہدہ کرلے گا اور اس طرح کے ذوق سے جو غلطی کرہی نہیں سکتا۔ اُن چیزوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ جو کہ اچھی ہیں (جن سے وہ مُسرّت حاصل کرے گا اور جنھیں وہ اپنی روح کا جزو بنا کر خود نیک کردار و شریف بن جائیگا) وہ بُری چیزوں سے پرہیز و نفرت بھی کرے گا۔ اور اس لئے جب بعد میں احساس خودی اور نقد کا مادّہ اُس میں پیدا ہو جائیگا تو وہ اس مادّہ کو پہچانے گا اور اس سے اُس دوست کی طرح پیش آئے گا جس سے کہ اس کی تعلیم نے بہت دنوں قبل سے اس کی شناسائی کرادی تھی؛

آرٹسٹ: مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم لوگ انگلستان میں اس نظریہ سے کتنے دُور ہیں۔ اگر کوئی ہمت کرکے کسی تقدس مآب سے یہ عرض کرے کہ تعلیم کی اصل غرض حُسن کی محبت ہے اور جس طرح یہ تعلیم ہو سکتی ہے وہ انداز طبیعت کی پرورش، ذوق کی تربیت اور قوت نقد کی تکوین ہے تو میں اس مُسکراہٹ کا تصور کرسکتا ہوں جو ان حضرت کے چمکتے ہوئے چہرے کو روشن کردے گی۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو یہ خیال ہوا ہو کہ آسکر وائلڈ ناقد کی صفت بیان کرتے کرتے آرٹسٹ کی صفت بیان کرنے لگا تو انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وائلڈ کے نزدیک آرٹسٹ اور ناقد دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے نزدیک بغیر قوت نقد کے فنونِ لطیفہ میں کسی ایسے شے کی تخلیق جو واقعی کسی قابل ہو ناممکن ہے۔ اس لئے وہی تعلیم جو ایک شخص کو آرٹسٹ بنا سکتی ہے تھوڑی سی اور جلا کے بعد ناقد بنا دیگی رہی غیر جانبداری و خلوص و معقولیت پسندی کی شرط تو یہ سب اُن لوگوں کی عائد کردہ ہیں جو آرٹ کی "مقدس مجذوبیت" سے بے بہرہ ہیں اس لئے نہ ان شرائط کے ماننے کی ضرورت اور نہ اس طرح کے لوگوں کی بات سماعت کے قابل؛

علی عباس حسینی

آج کریں مجھے نہ تنگ

موسم خوشگوار ہے، ابر ہے، سبزہ زار ہے
رونق نوبہار ہے، زمزمۂ ہزار ہے
دل میں ہے اک نئی اُمنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ
مذہب و عقل و نام و ننگ

جوش سحاب دیکھکر، بادۂ ناب دیکھکر
چنگ و رباب دیکھکر، حُسن شباب دیکھکر
نفس سے ہو رہی ہے جنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ
مذہب و عقل و نام و ننگ

دیکھ کے دل کے طور آج، عزم ہوا ہے اور آج
ہو گا نہ جبر و جور آج، تو بہ ہے زیر غور آج
دل کے بدل چلے ہیں رنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ
مذہب و عقل و نام و ننگ

خضر راہ

بنگالی

شب ماہ

چاندنی نے زمین کے ذروں کو چاندی کا پھول بنا دیا۔ ایک سفید سا غبار اٹھا اور سطح فلک پر چھا گیا۔ میرے دل نے

غبار دھوئے گئے۔ تیری تصویر آنکھوں کے آئینوں میں جلوہ گر ہو گئی۔ دور کہیں اُفق کے قریب کسی کٹیا میں چراغ کی روشنی نظر آ رہی ہے۔ اسی طرح میرے دل کی گہرائیوں میں تیری محبت کا چراغ روشن ہو رہا ہے۔

چاند مُسکرا رہا ہے۔ چاندنی مُسکرا رہی ہے۔ زمین مُسکرا رہی ہے۔ میری ہستی کا ذرہ ذرہ مُسکرا رہا ہے۔ ایک طوفانِ مسرّت میں غرق ہے۔

فراق میرے تصوّر کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم مجھ سے قریب ہو گویا میرے دل میں بیٹھے ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنی جو دُنیا کو منوّر کر رہی ہے۔ میرے دل ہی میں سے نکل رہی ہے کہ تم میرے دل میں بیٹھے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاند کی کرنیں میرے ہی سرور جذبات کی لہریں ہیں کیونکہ تم میرے دل میں بیٹھے ہو۔

ہندی

ہے پربھو!

ہے پربھو! سنسار کی ہر شے تیری بڑائی اور سچائی کے گیت گاتی ہے۔ انسان کے دل کی کمزوری ہے کہ بلند پہاڑوں اور گہرے دریاؤں میں تیری قدرت نہیں دیکھتا۔ تو دُنیا میں اس طرح رچ گیا ہے کہ دُنیا اور تو کوئی علیحدہ شے نہیں رہی۔ تو دُنیا ہے۔ دُنیا تو ہے۔

رشی کہتے ہیں کہ دُنیا ایک نقاب ہے جس نے تیرے چہرے کو چھپا رکھا ہے لیکن کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہونگا کہ دُنیا ایک آئینہ ہے جس میں تیرا حسن نظر آتا ہے۔

ہاں اس حُسن کے دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے بینا آنکھوں کی جو تیرے حُسن کو چمکتا ہوا دیکھ لیں۔

میری آنکھیں بینا نہیں لیکن میرا دل روشن ہے۔ اندھا ہوں مگر تجھے دیکھتا ہوں، لوگ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ میں دل سے دیکھتا ہوں۔

ہے پربھو! تو خود بتا دے لوگوں کا دیکھنا اچھا ہے کہ میرا؟

روسی

ادب

ادب زندگی کی روح ہے۔ کائنات کا دل ہے۔ غم اور مسرت کے پر پرواز پیدا کر کے یہ طائر آسمان پیما خدا جانے کن بلندیوں تک پہونچتا ہے۔ انسان کے تمام خواب، انسان کی تمام آرزوئیں اس آئینے میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ انسان فطرت کی عظمت و حسن کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے اور اس کے مہیب و عجیب اسرار کے سامنے خوف سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور یہ تمام جذبات ادب کے صفحات پر شعلہ ریز نظر آتے ہیں۔

انسان کا دل علم کے لئے دھڑکتا ہے۔ علم کے لئے بیتاب رہتا ہے، اور یہ اضطراب و احساس بھی ادب کی تخلیقات میں نمودار ہوتا ہے۔

ادب دُنیا کی چشمِ جہاں بیں ہے۔ ادب جامِ جمشید ہے۔ اس کی ایک نگاہ فطرت کی ازلی گہرائیوں تک پہونچ جاتی ہے۔

ادبی تصنیفات عجائباتِ عالم میں شمار ہونی چاہئیں۔ کسی شخص نے ہزاروں میل کے فاصلہ سے چند حروف کو جمع کر کے کچھ ایسی چیز پیدا کر دی ہے، جس کو صرف جادو سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ وہ لوگ جو مصنف سے بالکل ناواقف ہیں ان حروف کے مجموعے کے مطالعہ کے بعد اس کی شخصیت کے متعلق صحیح اندازہ قائم کر سکتے ہیں۔ کیا جادو ہے؟

جاپانی

جاپانی شاعری کے نمونے

میری دلہن نے صبح کے وقت گلاب کا ایک پھول توڑا جس سے خوشبوئے صبح آتی تھی۔ پھر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور پھول اپنے بالوں میں لگا لیا۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

پیارے۔ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا گلاب کا پھول" اور میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"گلاب کا پھول"

تو وہ خفا ہو گئی۔ اس نے پھول کی پتیاں نوچ ڈالیں۔ اور بولی "لو اپنا پھول۔ اب اسی کو اپنا محبوب بنا لو"

میں راستہ بھول گیا۔ کشادہ اور وسیع کھیتوں میں ایک نازنین بنفشہ کے پھول توڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے راستہ پوچھا۔ تو وہ سورج کی کرنوں کی طرح مسکرائی اور پھولوں میں سے ایک طرف اشارہ کیا جہاں دو رنگین اور شریر تیتریاں نیلے آسمان کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔

اے حسین جگنو!

تو نے بے سود چشموں اور آبشاروں کے ترنم میں سکون کی تلاش کی۔ پانی کے گیت تیرے بیقرار دل کو تسکین نہ دے سکتے تھے۔

اب تو لطیف اور نازک گھاس پر محو خواب ہے۔

اس سنسان تاریک گوشے میں۔ جہاں آسمان کے شبنمی آنسو جذبات کو سکون کا پیغام دیتے ہیں۔

آہ! شگفتہ کنول کے پھول کا دل افروز نظارہ!

ہم اس کے پاس سے خاموشی سے گذر جاتے تھے۔ اور پھر ایک دن کا یک اس پھول سے ایک طلسمی خوشبو کا سیل رواں ہو گیا اور کائنات کی روح معطر ہو گئی۔

یوگوسلیویا

وقت

میری ماں کہا کرتی تھی وقت "ازلیت" ہے۔ اور جو لوگ وقت ضائع کرتے ہیں وہ گویا "ازلیت" کو ضائع کر رہے ہیں۔ دنیا میں بھلائی نہیں ہے۔ نیکی نہیں ہے۔ وقت کا صحیح استعمال نیکی ہے"!

وقت! آخر اس لفظ کا کیا مطلب ہے۔

ہم پیدا ہوتے ہیں۔ مر جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ "وقت" ہی ہوتا ہے۔ وقت ایک بے کنار سمندر ہے۔ ایک وسیع فضا ہے جس میں کئی دنیائیں رقص کر رہی ہیں۔ جس میں موت اور زندگی کے راز پوشیدہ ہیں۔

جو کچھ ہم کر چکے ہیں اسکا نام ماضی ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے وہ "حال" کہلاتا ہے۔

جو کچھ ہم کرینگے یا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مستقبل سے موسوم ہے!

لیکن یہ سب کچھ خود ہماری ذات میں موجود ہے۔ ہم سے باہر نہیں۔ ماضی ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ "حال" ہماری توجہات کا مرکز ہے۔ مستقبل کے آئینے میں ہماری آرزوئیں اور تمنائیں منعکس ہیں ہماری زندگی "توقعات" کے تسلسل سے عبارت ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ زندگی "توقع" اور "امید" ہی کا دوسرا نام ہے۔

بعض اوقات آرزوؤں کی تکمیل وقت پر منحصر معلوم ہوتی ہے بعض وقت خود "وقت" ہماری آرزوؤں اور تمناؤں پر منحصر معلوم ہوتا ہے۔ ہم وقت کو دنوں مہینوں، سالوں، صدیوں، عہدوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور اس بے معنی ترتیب پر خوش ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے "وقت" کو ناپ لیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔

یہ وقت کچھ نہیں۔ دراصل کوئی شے نہیں۔ وقت ایک خیال ہے۔ ایک تصویر ہے۔

انگریزی

شریر دُمدار ستارہ

عرصہ گذرا الکشاں کی سفید وادی کے قریب ایک حسین خورد سال دُمدار ستارہ رہتا تھا جسے ہمیشہ رات کی رنگین خاموش فضاؤں میں سیر کی تمنا رہتی تھی۔

وہ اُچھلتا کودتا اور کھیلتا پھرتا۔ اس کی شریف ماں ایک خوبصورت بڑے ستارے میں رہتی تھی اور بچے کی نازیبا حرکات پر اُسے ہمیشہ تنبیہہ کرتی رہتی تھی۔

وہ اُسے ستارہ خوار خورشید سے ہمیشہ خوف دلاتی رہتی جس کی محبوب ترین غذا ستارے تھے اور جس کے لئے دُمدار ستاروں کو خاموشی سے نگل جانے سے بہتر کوئی مشغلہ نہ تھا۔

مگر مناسب ڈر کیوں؟ اور احتیاط کیسی؟ شریر ستارہ کھیلتا، کھیلتا اپنی روشن طویل دُم کی آخری لمبی کرن کو دیو خورشید کے نار آفریں مُنہ کے پاس لیجاتا، بالکل اُس کی خونخوار نگاہوں کے سامنے، اور نہایت بیباکی سے محترم مریخ کے دامن میں پھُدکتا اور تھرکتا پھرتا۔

وہ ہمیشہ مُسکرا مُسکرا کر خاموش ستاروں کی مُردہ دلی اور افسردگی پر آوازے کستا رہتا۔ اس کے نزدیک زندگی اس کی مانند نازیبا حرکات ہی پر مشتمل تھی۔

زمین کے فلک بینوں کی خاموش اور قہر آلود نگاہوں کا نشانہ بننے کی نسبت وہ آسمان کے ستاروں کی حسرت زدہ نظروں میں پھُدکتے پھرنے کو زیادہ سرور انگیز سمجھتا تھا۔

اُسے حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح شب و روز اتنے بے شمار حسین ستارے پژمُردہ ہوئے جاتے ہیں اور زرد رو ماہتاب تمام تعریف اور محبّت کی دولت سے مالامال ہوا جاتا ہے۔

اور جوں جوں یہ شوخ ستارہ اپنی طویل شریر دُم کو ادھر اُدھر ہلاتا باتیں بناتا اور سر ہلا ہلا کر نئی نئی وضعیں اختیار کرتا، اس کی سن رسیدہ ماں زیادہ غمگین ہوتی جاتی اور روز بروز افسردہ تر۔

وہ آسمانوں کی فضا میں ہزارہا سال سے رہتی تھی۔ اور کتنے ایسے دُمدار ستاروں کو، ان رنگین اور شوخ نورانی ذرّوں کو یونہی شرارتیں کرتا اور شوخیاں بگھارتا دیکھ چکی تھی۔

یونہی رفتہ رفتہ ایک دن اس ستارے کی شرارتوں کے خاتمہ کا وقت بھی آگیا۔ وہ اپنی حد سے ذرا تجاوز کر گیا۔ اور خورشید نے اُسے دُم پکڑ کر اپنی مُملکت میں گھسیٹ لیا۔

شریر ستارہ تو اب اپنی لمبی چمکدار اور شریر دُم کو ادھر اُدھر دُنیا کے سامنے ہلاتا نہیں پھرتا لیکن وہ خاموش ستارے جن کا مضحکہ اُڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا اب تک ہمیشہ کی طرح رات رات بھر دیکھتے رہتے ہیں۔

فطرت

فرانسیسی

سپینرا

بہار کا موسم تھا اور شام کی رنگینی قلوب کو مسخر کر رہی تھی۔ بٹوٹان وہ شہر سفید حیرت افروز نظارہ تھا۔ خاموشی، مکمل خاموشی کا طلسم طاری تھا۔ عمارتوں پر چونے کی سفید چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ برآمدے، چبوترے، تمام چیزیں ان سفید چادروں میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

لوگ گذر رہے تھے۔ ان کے لباس عجیب و غریب دلکش رنگوں کے تھے۔ ان کا انداز خواب آلود سا تھا۔ ان کی بیضوی سیاہ آنکھیں اس دُنیا

کو مشاہدہ کرنے سے قاصر معلوم ہوتی تھیں۔

سُنہری شفق ہر شئے کو گلابی رنگ میں رنگ رہی تھی اور تاریک و تار مکانوں کے انتہائی گوشوں میں بھی چونے کا رنگ کچھ نیلا سا ہو گیا تھا جس طرح برف سایہ دار مقامات پر کچھ کبود سا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ادھر اُدھر لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لباسوں کے رنگ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ سُنہرا زرد۔ ہلکا سبز۔ زردی مائل سبز گلابی۔ گہرا نیلا۔ پھر کچھ اور رنگ تھے جن کے لئے نام موجود نہیں ہیں۔

کہیں کہیں بہار کے مخصوص پھول اپنی پوری رعنائی میں جلوہ گر تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک سفید سی مار آسا لکیر۔ چونے کی سفید لکیر مُردہ خوفناک.. تمام مناظر پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس لکیر سے روشنی نکل رہی ہے۔ اس لکیر میں روشنی منعکس ہو رہی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا گویا نور کا ایک نرم سا سیلاب اس چونے کی لکیر سے نکل کر آسمان کی طرف سُنہرے آسمان کی طرف رواں تھا! اس سُنہرے آسمان کی طرح جو اب شفق کے تیز رنگ سے شعلوں کی طرح سُرخ معلوم ہوتا تھا۔

گہرے اور نمایاں سائے، صوفیانہ رنگ غائب ہو چکے تھے۔ چلنے پھرنے والے لوگوں کی حرکات سے صاف اور تیز رنگ پیدا ہوتے تھے ایسے ہی مقدس اور لطیف رنگ آسمانی نغموں اور روحانی جلووں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اِس عالمگیر سفیدی پر ایک ابر رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہر شئے گھُل کر شفق کے رنگ میں شامل ہو گئی تھی۔ صرف لوگوں کی پُر اسرار خواب آلود بڑی بڑی آنکھیں سیاہ تھیں۔ باقی ہر شئے اپنا رنگ کھو بیٹھی تھی۔

دُور سے بانسری کی نازک اور غم افزا صدا سُنائی دیئے۔ ادھر سپیروں کے دفوں کی مدھم آواز آئی۔ یکایک وہ تمام لوگ جو بیکار ادھر اُدھر پھر رہے تھے موسیقی کے کیف سے متاثر ہو کر بانسری بجانے والے کی طرف چل پڑے سپیرے چوک میں جمع تھے۔

نیلے نیلے سانپوں میں سفید سفید لکیروں کا ایک سلسلہ نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا برف کے گالے اُڑتے پھر رہے ہیں۔

لمبی لمبی عبائیں پہنے ہوئے لوگ جوق در جوق سپیروں کے گرد جمع ہو گئے۔ سانولے رنگ کے سپیرے گا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ اپنے سانپوں کی طرح لطافت اور نزاکت سے ناچ رہے تھے۔ بانسری کے سروں کے ساتھ ساتھ ان کے جسم مناسب طور پر حرکت کرتے تھے۔ رقص میں ان کے گھنگریالے بال متحرک ہو کر عجیب لطف پیدا کرتے تھے۔

یہ منظر تمام تر حسین و جمیل تھا۔ آسمان کی بلندیوں سے یکایک اس ساربان لڑکے تک جو آنکھیں پھاڑے ہوئے بانسری بجانے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا ہر شئے حسن و جمال سے لبریز تھی۔

اور ایک طرف میں تھا جس کے لئے زمان و مکان کی ہر قید بے معنی ہو گئی تھی۔

مجھ پر بھی موسیقی کا نشہ چھا گیا تھا۔ میں بھی اُن خاموش سننے والوں کے درمیان کھڑا ہوا۔ ایک معمولی تماشائی کی طرح سے۔ گذرتے ہوئے وقت سے بے پرواہ اپنی روح کو کیف و تاثر کے سمندر میں غوطے دے رہا تھا۔ بانسری کے اندوہ افزا اثر نے میرے دل کو مسحور کر لیا۔ اور قدیم زمانوں کے وحشی انسانوں کی طرح میں اپنے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

یہ زمین میرے لئے عالمگیر موسیقی کے سروں میں موت کے نغمے گاتی ہے۔

جرمنی
لندن

دیکھی ہے۔ فطرت انسان کے
نئے مشاہدہ کی ہے۔ اب
...کے بکھریلے
محبت،

نفرت، حقارت اور بھوک کے جذبات کے نیچے دبے ہوئے
کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔

میری مُراد لندن سے ہے۔

کسی فلسفی کو لندن میں جانے دو لیکن شاعر کو وہاں نہ جانے دو۔ فلسفی

شہر کے ایک کونے پر کھڑا ہوا بہت کچھ لکھ جائے گا۔ اُسے وہ باتیں معلوم ہونگی جو سنبرگ کی کتابوں میں نہیں۔ اور جوں جوں انسانیت کی لہریں اس کے اردگرد زیادہ متلاطم ہوتی جائیں گی اس کے سامنے نئے خیالات واحساسات کا ایک بحرِ بیکراں پیدا ہوجائے گا۔ وہ قدیم ازلی روح جو انسانوں میں قائم ہے اس کے قریب سائنس لیگی معاشرتی نظام کے پیچیدہ ترین اسرار حل ہوجائیں گے۔ وہ دنیا کی نبض کو حرکت کرتا ہوا محسوس کرے گا۔

اگر لندن دُنیا کا دایاں ہاتھ ہے۔ مضبوط، کام کرنے والا دایاں ہاتھ تو یقیناً وہ بازار جو ایکسچینج کی طرف سے ڈوننگ سٹریٹ کی طرف جاتا ہے، اِس ہاتھ کی سب سے بڑی انگلی ہے۔

شاعر کو لندن میں نہ جانا چاہئیے۔ ہر شے کی حیرت انگیز سنجیدگی۔ ایک عظیم تسلسل مشین نما حرکتیں مسرت وعشرت کا ابتذال۔ اور مبالغہ متخیلہ کو ایک ایک بوجھ کے نیچے دبا دیتی ہے۔ اور دل کو پھاڑے دیتی ہے۔

جرمن شاعر کو لندن نہیں جانا چاہئیے۔

وہ تو ہر شے کے سامنے کھڑا ہوجائے گا۔ بھیک مانگنے والی عورت ہو یا چمکتے ہوئے جواہر کی دوکان اُسے ہر شے میں عبرت اور زندگی کے لئے اختر پوشیدہ نظر آئیں گے ✣

عربی

مرثیہ بغداد

عربی اشعار کا ترجمہ

(۱)

میں نے چاہا تھا کہ اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکوں۔ مگر جب ان کی طغیانی ہوئی تو بہ ہی پڑے اور نہ رُکے

(۲)

کاش بغداد کی تباہی کے بعد اس کی نسیم کا جھونکا — میری قبر پر گذرتا۔ اور میں اس سانحہ عظیمہ کو نہ دیکھتا

(۳)

طبیب نے میرے علاج کے لئے جب میری نبض پر ہاتھ رکھا — تو میں نے ہنسکر اُس کو جھڑک دیا کہ جا مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جس کا علاج ہو سکے

(۴)

میں نے احباب کی جُدائی میں ہمیشہ صبر سے کام لیا — مگر یہ ایسی جُدائی ہے جس کا علاج صبر سے نہیں ہو سکتا

(۵)

میں عبادان شہر میں ٹھہرا اور میں نے دجلہ کے پانی کو دیکھا۔ کہ صاف اور سُتھرے خون کی طرح سمندر کی طرف بہتا جاتا تھا

(۶)

شہر واسط کی مصیبت میں جو میرے آنسو جاری ہوئے۔ تو اُنھوں نے خلیج فارس کے مد و جزر کو اور بڑھا دیا

(۷)

فرض کر لیا جائے کہ دار الخلافہ پھر آباد ہو گا — ذلّت کے غبار سے علماء کے چہرے

(۸)

لیکن بنی عبّاس! جن پر ایک عالم کو فخر تھا اور جن کے اخلاقِ پسندیدہ سے پیشانیاں نورانی تھیں

(۹)

ان کا ذکر اب دُنیا میں فسانہ ہوگیا اور یہ ایسا فسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک
کیا منبروں پر پھر خطبے پڑھے جائیں گے اور ان میں معتصم باللہ کا ذکر

رجسٹرڈ ......

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۶

تصاویر :- (۱) کیکئی اور منتقلا معدنگی ۔ یک رنگی ۔ (۲) معصوموں کی دنیا (۳) دنیا کا حسین ترین منظر (۴) خواب ناز (۵) شعاعِ جوالہ (۶) موت اور سرمایہ دار ۔ (۷) ندامت

حال وقال

ادبی دنیا کی پہلی جلد کا پہلا نمبر ہمارے سفر کی پہلی کٹھن منزل تھی اور یہ نمبر اُس کی دوسری جلد کا آخری نمبر ہے - چودہ منزلیں طے کرنے کے بعد اب ہم اُس مقام پر آ پہونچے ہیں جہاں آغاز کار میں ہماری امیدیں بھی نہ پہنچ سکی تھیں - خدائے برتر نے مشکلات سفر کو آسان کر کے ہمیں آج اُن بلندیوں پر سرفراز کر دیا ہے جہاں سے ہماری نگاہیں مستقبل کی دامن دراز وسعتوں میں کامیابیوں کا ایک جلوہ زار دیکھ رہی ہیں -

داغ مرحوم نے راہ محبت کے خطرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راہرو کو متنبہ کیا تھا کہ دیکھنا!

"اِس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"

لیکن ادبی دنیا نے ہمیں جس راستے پر ڈال دیا وہ راستہ داغ کی "راہ محبت" سے بہت زیادہ پُر خطر تھا اُس کے نشیب و فراز قدم قدم پر ہمارے لئے زنجیر پا بن رہے تھے، ناممکن تھا، قطعاً ناممکن کہ ہم اس سفر کی ناقابل تسخیر مشکلات کو فتح کر سکتے مگر خدائے تعالےٰ کا فضل ہر ہر قدم پر ہماری دستگیری کرتا رہا اور صرف اُسی کے سہارے ہم اس ہفتخوان کو طے کر سکے -

آغاز سفر میں حریفوں کا اک ہجوم اپنے ضروری کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو لیا تھا کہ کسی کٹھن منزل پر ہمارے دم توڑنے کا تماشا دیکھے - خطرناک سازشیں گمراہ کن پیشگوئیاں، اور غلط افواہیں ایک طویل و عریض خارزار کی صورت میں سد سکندری کے فرائض انجام دے رہی تھیں حال مستقبل کو نگاہوں سے اوجھل کر کے اپنے ساتھ ہمیں بھی ماضی میں تبدیل کرنے پر مصر نظر آتا تھا - مگر تقدیر الٰہی ہمیں دنیا کے سامنے سرخرو کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لئے پیغمبر اسلام علیہ السلام کے زریں ارشاد کے مطابق

"فکلٌ مُیَسّرٌ لما خُلِقَ لہٗ"

جسے جس منزل پر پہنچنا ہے اُس کے لئے راستے کی مشکلات آسان کر دیجاتی ہیں - منزل مراد کے جلووں نے ہماری نگاہوں کو دعوت نظارہ دی اور پھر تو ؎

آبلہ پا کل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ کوچۂ یار دیکھ کر "

آج چودہ ماہ کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ماضی کی ویران وسعتوں میں خاک اڑتی نظر آتی ہے - وہ ناکام تماشائی جو ہماری مرگ غربت کا جشن منانے کیلئے اِس سفر میں ہمارے ساتھ ہوئے تھے - ہماری بجائے آپ ہی عذاب سفر کی بھینٹ چڑھ گئے - اور اب اُن کی بے گور و کفن لاشوں پر عبرت بہ آواز ے کس رہی ہے کہ

" آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے"

جن کے کانوں نے اپنے ضمیر کی آوازوں کو کبھی نہیں سنا تھا اُنہیں موت ناکامی و مرگ نامرادی کا پیغام سننا پڑا -

---

ادبی دنیا کی دوسری جلد کے ان چھ نمبروں میں حسب ذیل مضامین شائع ہوئے ہیں -

(۱) دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں کے منتخب مترجمہ افسانے ۴۲

(۲) ڈرامے	۷	(۷) تنقیدی مضامین	۱۳
(۳) علمی مضامین	۱۶	(۸) دنیا کے مشہور آدمیوں پر	۱۵
(۴) تعلیمی مضامین	۲۶	(۹) ادبی مضامین	۱۷
(۵) تاریخی مضامین	۱۲	(۱۰) نظمیں	۳۹
(۶) اخلاقی مضامین	۲۳	(۱۱) غزلیات	۱۸

(۱۲) ہندوستان اور دنیا کی مشہور ۲۳ زبانوں کی ادبیات کے اقتباسات

(۱۳) آئینہ عالم کے زیر عنوان - دنیا کی مشہور تحریکات، علمی ترقیوں ایجادات اور سیاسیات پر اظہار رائے -

(۱۴) اس جلد کے نمبروں کی ۵۳ تصاویر ہیں جن میں آٹھ سہ رنگی اور چار رنگی بھی ہیں -

مندرجہ بالا مضامین ادبی دنیا کے ۸۰۰ جہازی صفحات پر حاوی ہیں - ادبی دنیا کا ایک صفحہ عام رسالوں کے کم سے کم ڈھائی اور زیادہ سے زیادہ چار صفحات کے برابر ہوتا ہے اس اندازے کے مطابق ادبی دنیا کی ایک ششماہی جلد بعض معاصرین کے پندرہ اور

اکرمنٹ کے چوبیس نمبروں کے لگ بھگ بنجاتی ہے۔

رہیں اس کی تصاویر۔ تو اُن کے شش ماہی اخراجات کا تخمینہ تین ہزار روپے کی مقدار کو پہنچتا ہے۔ اور یہ ایسی رقم ہے جو کسی عام اردو رسالے کو دو سال تک جاری رکھنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

اس حسابی گذارش سے یہ عرض کر دینا مقصود ہے۔ کہ ادبی دنیا کے نام کے ساتھ کسی دوسرے رسالے کا نام ایک سانس میں لینا جائز نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر لکشمن سروپ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی

"اس آن بان اور ان خصوصیات کا اسقدر سستا رسالہ دنیا کے کسی حصے سے شائع نہیں ہوتا۔

پچھلے نمبر میں حضرت فاخر ہریانوی بی۔ اے کی تصویر ادبی دنیا کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔ حضرت فاخر ملک کے اُن چند در چند شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری "شاعری جزویست از پیغمبری" کے مقولے کی تصدیق کرتی ہے۔

عام طور پر آج کل کے نئے اور نوجوان شعراء بدنام "ادب لطیف" کو نظم کر دینا معیارِ کمال سمجھتے ہیں۔ خدا خدا کر کے اردو نثر سے "ادب لطیف" کی لعنت کم ہوئی تھی کہ وہی پستی اب اوزان و بحور پر مسلط کی جا رہی ہے۔

حضرت فاخر ایک نوجوان شاعر ہونے کے باوجود مرگِ انبوہ کے اس جشن میں شریک نہیں ہیں۔ اُن کا کلام استادانہ پختگی متانت۔ بلندی اور ندرتِ بیان کی خصوصیات کے ساتھ پاکیزہ خیالات سے لبریز ہے سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں فاخر مزدور صفوں کے آتش بیان خطیب کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور دیہاتی مناظر کی تصویر کشی تو اُن کا حصّہ ہے۔ ہم نے حضرت فاخر سے اُن کی بیس تازہ اور بے حد دل آویز بلند نظمیں حاصل کی ہیں۔ ان نظموں کی اشاعت کا سلسلہ گذشتہ نمبر سے شروع کر دیا گیا ہے۔ جب ادبی دنیا میں یہ نظمیں چھپ چکینگی تو فاخر کی اُن تمام نظموں کا ایک مجموعہ ادبی دنیا کے دفتر سے بہت سی سہ رنگی تصاویر کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ اُن کی تمام نظموں کا حق اشاعت ادبی دنیا کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

تذکرۂ "خمخانۂ جاوید" کے مرتب لالہ سری رام ایم۔ اے دہلوی مرحوم کی موت اردو دنیا کے لئے "مرگ بے ہنگام" کی طرح مصیبت ناک ہے۔ اردو زبان کی جو گرانمایہ خدمت انہوں نے انجام دی اُسے اہلِ ملک ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ "خمخانۂ جاوید" جو زندگی میں اُن کا عزیز ترین مشغلہ تھا اُن کے مرنے کے بعد ایک قابل عزت یادگار کی صورت میں۔ بقائے دوام حاصل کریگا۔

ہمیں امید ہے کہ اُن کے ہموطن۔ ہم فن اور ہم مشق دوست پنڈت برجموہن کیفی دہلوی "خمخانۂ جاوید" کو تکمیل تک پہنچا کر اردو دنیا کو شکر گذاری کا موقعہ دیں گے۔

تاجور

دفتری اطلاعات

(۱) صدیق طبیب صاحب بہاری کو بعض وجوہات کے سبب دفتر ادبی دنیا سے الگ کر دیا گیا ہے۔

(۲) ادبی دنیا کے تین ملازموں نے باہم سازش کر کے ادبی دنیا کے خریداروں کے پتے چرا لیئے ہیں اور اب وہ ایک خط کے ذریعہ خریداران ادبی دنیا کو ایک نئے رسالے کی اشاعت کا فریب دیکر اُن سے کچھ پیشگی روپیہ یا خریداری کے آرڈر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن میں سے ایک صاحب اُن پتوں پر سِل اور دِق کے تیر بہدف علاج اور شرمناک امراض کی دواؤں کے اشتہارات بانٹنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اُن پتوں کو ادبی دنیا کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے بھی استعمال کیا جائے۔ محترم خریداروں کو ان جرائم پیشہ حضرات کے فریب آمیز خطوط اور اشتہارات اور پروپیگنڈے سے چوکنا رہنا ضروری ہے۔

(۳) ہمیں اپریل ۱۹۳۰ء کے ۷۵ پرچوں کی ضرورت ہے۔ ادبی دنیا کے جو ناظرین اپنا فائل نہیں رکھتے اگر ہمیں اپنا اپریل کا پرچہ عنایت فرما کر بھیجدیں تو ہم اس کی قیمت (آٹھ آنہ) ادا کرنے کے ساتھ ہی اس توجہ کو امداد سمجھکر اُن کے شکر گزار ہونگے۔

(۴) جن ایجنٹوں نے دفتر کا روپیہ ادا نہیں کیا اُنہیں اُس وقت تک پرچہ بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ جب تک وہ کل روپیہ ادا نہ کر دیں آئندہ جو ایجنٹ ایجنسی کو جاری رکھنا یا نئی ایجنسی قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک پرچوں کی مطلوبہ تعداد سے مطلع کر دیا کریں اور پرچے وصول ہونے کے پندرہ دن بعد تک اس ماہ کا کل حساب بے باق کر دیا کریں۔

مینجر ادبی دنیا لاہور

آئینۂ عالم

ادبیات کے پردے میں ایک شرمناک تجارت

تہذیب مغرب کا بے پناہ سیلاب مشرق کے معتقدات کو بہائے لئے جاتا ہے۔ اور وہ رنگین و دلفریب عمارت جو خالص مشرقی تہذیب کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ برباد کی جارہی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو لوگ اس عمارت کی بنیادیں اکھاڑنے میں مصروف ہیں وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس کی جگہ وہ کونسا قصر دلفروز تعمیر کریں گے جو پہلی عمارت سے زیادہ پائیدار اور روشن ہوگا۔

تہذیب مغرب کی آندھی جس خس و خاشاک کو اپنے دوش پر لئے آرہی ہے ان میں ایک کانٹا "صنفی معلومات کی سائنٹفک تعلیم" بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوانوں کے لئے صنفی معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک شرط ہے کہ جو لوگ صنفی معلومات پر قلم اٹھانے کے اہل ہیں۔ صرف وہ اس قسم کی کتابیں تصنیف کریں اور اپنے انداز تحریر میں اس سنجیدگی متانت اور وقار کو قائم رکھیں جو خالص سائنٹفک تصانیف کا خاصہ ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایسی ایسی فحش اور عریاں تصانیف شائع ہورہی ہیں جن کو "موجودہ زمانے کے کوک شاستر" کہنا بیجا نہیں ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ بظاہر تو ان کتابوں کی تصنیف کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بیاہ کی ذمہ داریوں سے واقف کیا جائے اور انہیں مناسب صنفی معلومات کی تعلیم دی جائے۔ لیکن درحقیقت یہ کتابیں "صحائف عشرت" ہیں جن کے ذریعے نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے۔ اور ان کو ایسی کتابوں کے خریدنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ وہ متانت۔ اور سنجیدگی جو ہر اہم تصنیف کا ایک جزو لازمی ہے یہاں قطعاً مفقود نظر آتی ہے۔ استعارات اور تشبیہات کے پردے میں ایسی ایسی باتیں ادا کی جاتی ہیں کہ تہذیب آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ بعض جگہ تو تشبیہ اور استعارے کا پردہ بھی اٹھا دیا جاتا ہے۔ اور تفصیلی طور پر ان تمام لذتوں کی تشریح کیجاتی ہے جو تعلقات زناشوئی سے خاص ہیں۔

ہم نے ان تمام کتابوں کو غور سے پڑھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی اشاعت کا مقصد نوجوان عورتوں اور نوجوان مردوں کو خلاف فطرت افعال سے روشناس کرانا اور ممنوع مسرتوں سے باخبر کرنا ہے اور بس۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کتابوں میں ایسی ایسی "حقیقتیں" درج ہیں۔ کہ پاکباز سے پاکباز مرد اور عورت بھی ان کو پڑھنے کے بعد گناہ کے تصور سے مبرّا نہیں رہ سکتے۔ شاید ہندوستان کی آبادی کا ہزاروں حصہ بھی ان خلاف فطرت مسرتوں سے ناآشنا نہ ہوگا۔ جن کے تفصیلی تذکروں پر اس قسم کی اکثر کتابیں مشتمل ہیں۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ مغرب میں جو کچھ ہورہا ہے اس سے مشرق کو آشنا کیا جائے تاکہ پڑھنے والے اس مہیب اور شرمناک موضوع کی دلچسپی سے متاثر ہوکر اس سلسلے کی دوسری کتابیں خریدنے پر مجبور ہوجائیں۔

کئی کتابوں میں خود عورتوں کی زبانی ایسے ایسے شرمناک واقعات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ اور اگر وہ وقت آ گیا ہے۔ جب ہندوستان کی عورتیں فطرتی طور پر ایسے ایسے انکشافات کرسکتی ہیں تو ظاہر ہے کہ اب ان کو صنفی معلومات کی ضرورت نہیں رہی۔ اور اگر یہ کہانیاں محض مصنف کے دماغ کی اختراع ہیں تو ان واقعات سے ہندوستان کی عورتوں کا بے خبر رہنا ہی بہتر ہوتا۔

اگر اس قسم کی کتابیں طبّی سلسلے میں شائع ہوتیں اور اس کا مطمح نظر محض طبی تحقیقات کا نشر ہوتا تو اتنی قابل اعتراض بات نہ تھی ظلم تو یہ ہے کہ ادب کو بدنام کیا جارہا ہے۔ اور ادب کے پردے میں ایسی ایسی باتیں بیان کی جارہی ہیں جن کو ادب سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو ادیب اور "معلم اخلاق" کہتے ہیں۔ اخلاق و تہذیب کے منافی کتابیں تصنیف کریں اور پھر ان کو ادبی جامہ پہنائیں۔ ان کتابوں کی تصنیف و اشاعت کے ذمہ دار ادبی ادارے ہیں۔ اور ان کے

پروپاگنڈے کی وسعت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچا دینا چاہتے ہیں۔

دل گیتی انا المسموم انا المسموم فریادش

ہم سمجھتے تھے کہ دہلی اس قسم کی کتابوں کا خاص مرکز ہے لیکن بعض رسالوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب بھی کسی طرح پیچھے نہیں اور دہلی کے نقش قدم پر چل کر ادبی عیاشی کی طرف جا رہا ہے۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابوں کے خلاف مجالس واضع قوانین میں سوال اٹھایا جائے کہ حکومت سے دریافت کیا جائے کہ وہ اس قسم کی فحش اور شرمناک کتابوں کے خلاف کیا کارروائی کرنا چاہتی ہے۔ ان کتابوں کا انداز تحریر اس قسم کا ہے اور موضوع اسقدر شرمناک ہے کہ صریحاً قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اور ہم بہت زوردار الفاظ میں حکومت کی توجہ اس قسم کی کتابوں کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

سونا اور فولاد

پروفیسر برمفیلر اس امر کے مدعی ہیں کہ محنت سے خالص سونے کے مرکبات کو فولاد سے زیادہ مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مضبوط اور پائیدار سونے کی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ دانتوں کے لئے سونا درکار ہوتا ہے وہ خصوصیت سے اچھا اور پائیدار سونا چاہئے۔ آجکل جو سونا استعمال کیا جا رہا ہے وہ ایک خاص وقت کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو رفع کرنے کے لئے پروفیسر صاحب موصوف نے سالہا سال کی محنت کے بعد سونے کے تقریباً ۱۰۰ ایسے مرکبات تیار کئے ہیں جو فولاد سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہیں

ایک نیا تجربہ

سمتھ سانین "ادارۂ عمل" کے ایک کامیاب عامل مسٹر فریڈرک پریکٹ کچھ عرصے سے ایسے پودوں کی کاشت میں مصروف ہیں جو زمین اور سورج کی مدد کے بغیر محض رنگوں کی تابش سے نشوونما پاتے ہیں۔ ایسے پودوں کو ایک خاص طور پر تیار کئے ہوئے کمرے میں رکھدیا جاتا ہے۔ اور فضا کو مصنوعی وسایل سے گرم کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھت میں لیمپ آویزاں کردئے جاتے ہیں جن سے تیز رنگوں کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اب تک اس تجربے کے مفید اور آخری نتائج برآمد نہیں ہوئے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ انسان آخر کار پودوں کو بھی سورج اور زمین کی مدد کے بغیر کاشت کرسکیگا۔

پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن کا قیام

اُستاد۔ جو ہر قوم کے افراد کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اور ان تمام علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ جس سے کوئی قوم پھلتی پھولتی ہے۔ اس سے ہمارے ملک میں ایسی غفلت برتی جا رہی ہے۔ کہ الامان پرائمری اور مڈل سکولوں کے مدرسوں کی حالت ادنیٰ مزدوروں سے بھی گری ہوئی ہے۔ ان کی مشکلات و مصائب بے اندازہ ہیں۔ ان کی کوئی جماعتی تنظیم نہیں۔ کوئی متفقہ آواز نہیں۔ اور وہ کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن مسرت کا مقام ہے۔ کہ لاہور کے چند ہمدرد استادوں نے پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی ہے۔ اس کے مقاصد نہایت مبارک اور عزائم قابل عمل ہیں۔ اس نے مدرسوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور دن بدن اس کے اراکین کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ رکنیت کا چندہ صرف دو آنے ماہوار ہے۔ ہم ملک کے تمام ان حضرات سے جو اس سلسلے میں کام کرتے ہیں۔ سفارش کرتے ہیں کہ جو اس کے رکن نہیں وہ رکن بنیں اور اپنے اثر سے دوسرے لوگوں کو بھی رکن بنائیں اور اس وقت جبکہ انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیں۔ ہر صوبہ میں ٹیچرز ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ ہم ایسوسی ایشن کی مجلس منتظمہ کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اپنی مخلصانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔

لاہور میں لٹریری لیگ کا قیام

پچھلے دنوں لاہور میں ایک لٹریری لیگ قائم ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب وملت کے تعصبات سے قطع نظر ہر زبان کے ادب کی اشاعت کی جائے۔ اور اس طرح مختلف قوموں کو ایک رشتے میں منسلک کردیا جائے۔ مسٹر چودھری اس انجمن کے سکرٹری ہیں۔ اور ایک محنتی نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ انجمن ہر طرح کامیاب ہوگی۔

تاجور

شیطان

(اپنے آپ سے مخاطب ہو کر)

مری دنیا میں تنویرِ مسرت کا نشاں کیوں ہے؟	فروغِ کہکشاں کیوں ہے بہارِ گلستاں کیوں ہے؟
پرِ ندِ نیلگوں پر گوہرِ انجم درخشاں کیوں ہیں	بنی سنوری ہوئی آخر عروسِ آسماں کیوں ہے؟
چراغِ مہرِ طوفانِ فنا میں کیوں نہیں بجھتا	نشاطِ زندگی سے اسکا چہرہ ارغواں کیوں ہے؟
گلستاں میں رواں ہیں کاروانِ رنگ و بو کیسے؟	ربابِ دلبری میں نغمۂ عشرت رواں کیوں ہے؟
زمانے بھر میں رسوا ہو گئیں کیوں میری تدبیریں	کہولت کیوں بدی پر چھا گئی نیکی جواں کیوں ہے؟
زمینِ ہندوستان کی شعلہ پرور کیوں نہیں ہوتی؟	یہاں کا ذرّہ ذرّہ گلطراز و گلفشاں کیوں ہے؟
یہاں باغوں میں کیسے پھول کھلتے ہیں تمنّا کے؟	یہاں کی سرزمینِ دلکشا جنّت نشاں کیوں ہے؟
اُسے دنیا میں دنیا کی طرح رہنا نہیں آتا!	تعجّب ہے مجھے دسرتھ پہ قدرت مہرباں کیوں ہے؟
بہارِ زندگی کیوں ہے محبّت رام و سیتا کی	میرے فتنوں کا رنگیں باغ پامالِ خزاں کیوں ہے؟

گرونگا خرمنِ امید پر برقِ بلا بنکر
ذرا ہشیار رہنا جا رہا ہوں منتقلا بنکر

عابد

شمع یقین

اگرچہ خنجرِ غم بے نیام ہو جائے
اگرچہ بادِ الم، تیز گام ہو جائے
اگرچہ، صبحِ تمنّا کی شام ہو جائے
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۲)

بہار میرے گلستاں میں گلفشار نہ ہو!
سحاب میرے نشیمن پہ سایہ بار نہ ہو!
انہیں بھی میری محبّت کا اعتبار نہ ہو!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۳)

سیاہیِ شبِ فرقت کو ہو غرورِ نمود!
وسیع ہوں مری غمناک ساعتوں کی حدود!
طلوعِ صبحِ مسرت کی راہ ہو مسدود!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

غمِ قفس بھی رہے رنجِ آشیاں بھی رہے
عدو زمین بھی رہے دشمن آسماں بھی رہے
وہ "بیوفا" مری الفت سے بدگماں بھی رہے
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۵)

ہر آرزو مری، صرفِ تحسّرات بھی ہو!
ہر التجا مری، محرومِ التفات بھی ہو!
تباہ، میری محبّت کی کائنات بھی ہو!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۶)

ہلاکِ زہرِ خموشی ہمصفیر رہوں
گروں تو صرفِ غمِ طعنِ دستگیر رہوں
غرض "طلسمِ محالات" میں اسیر رہوں
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(غیر مطبوعہ)

ناچیز ذرّہ

(فرینک ہیویرا)

ہیڈ ماسٹر اپنے دفتر کی چکدار کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنیاں میز پر ٹیک دیں۔ اور سونی بنچوں کی مسلسل قطار کو دیکھتے ہوئے کسی خیال میں محو ہو گیا۔ ٹرم ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ موسلا دھار بارش کے باوجود گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ابتک سنائی دے رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے یہ آواز بند ہو گئی۔ اور اب کسی لڑکے کی خالی ڈیسک کے اندر سے ایک چوہے کے کترنے کی دبی ہوئی آواز کے علاوہ مینہ کا لگاتار شور ہر آواز پر حاوی تھا۔

تاریکی بڑھ رہی تھی۔ تیز ہونے والی ہوا کی سرسراہٹ بارش کی ہیبت آواز میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر بے چین ہو کر اُٹھا۔ اور اُس کھڑکی کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔ جہاں سے کھیل کے سنسان میدان نظر آ رہے تھے کل ٹرم کے آخری میچ میں سو لڑکوں کے ہنگامے سے۔ اس ہنگامے سے جو کہ صرف پُرجوش۔ کم عمر۔ اور شوخ لڑکوں کا ہی حصہ۔ یہ روندا ہوا میدان تھرا اُٹھا تھا۔ سماعت اور بینائی پر زور ڈالنے سے غالباً کل کا یہ منظر ہیڈ ماسٹر کے پیش نظر ہو گیا۔ ثابت قدم اور تیز رفتار ہاف بیک کا آگے بڑھنا۔ فل بیک کا مین گول کے اندر چھینا جھپٹی میں پھرتی اور چالاکی کا اظہار اور پھر مسکراتی ہوئی آنکھوں اور کشادہ سینہ والے ایڈسنڈس کی فتح۔ سب باتیں یکے بعد دیگرے اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ مگر ایڈمنڈس سینڈ ہرسٹ کے داخلہ کا خیال دل میں لئے ہوئے روانہ ہو چکا تھا۔ اور لڑکے بھی رخصت ہو چکے تھے۔ کھیل کے میدانوں میں سناٹا تھا۔ جیت کی خوشی میں لڑکوں کی تالیوں کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔

اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ہیڈ ماسٹر اپنی جگہ واپس آیا۔ کرسی اس کے بوجھ سے چرچرانے لگی۔

"ایک اور ٹرم ختم ہو گیا" اس نے پرچھائیوں کو مخاطب کر کے دبے الفاظ میں کہا سب کے سب چلدیئے۔ اور اپنے مدرسہ کو بھلا دیں گے۔ زندگی کی جنگ میں حصہ لیکر وہ دنیا سے انعام حاصل کریں گے۔ مگر کبھی ان کو اس ضعیف انسان کا بھی خیال آئیگا۔ جو ان سے محبت کرتا ہے"؟

وہ لوگ جو آج نگاہوں سے اوجھل تھے اور اس کی ذرا سی بات پر کانپ اُٹھا کرتے تھے بڈھے ریٹی کے چہرہ کے تغیرات کو دیکھکر متعجب ہوتے۔

"یہاں رہنے سے کیا حاصل"؟ اس نے نہایت تاسف کے ساتھ اپنے دل سے سوال کیا۔ "کیا آئندہ آنے والی نسلوں کے واسطے اپنے کو وقف کر دینا کچھ فائدہ مند ہے؟ اسکولی دنیا سے کنارہ کش ہو جانا اور اس اکھاڑے کو چھوڑ کر زندگی کے باقی ایام آرام سے بسر کرنا کیا زیادہ بہتر نہیں ہے؟ ان نو عمر لڑکوں کو بھلا میری کیا پرواہ۔ میں ان کا ہیڈ ماسٹر ہوں اور ان کے نزدیک ان کا دشمن۔ ایسا دشمن کہ جس کی تیوری پر بل پڑنے سے تمام مدرسہ میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ زیادہ وقت یہاں پر صرف کرنا بیکار ہے

میں نے ان کے ذہن نشین کر دیا کہ وہ میرے اپنے بچوں کے مثل ہیں امکان بھر ان کو بلند حوصلگی اور اخلاق کی ترغیب دی۔ میں نے ان کو اس مقام پر لا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی کہ جس جگہ سے وہ دنیا میں شہرت کی گھوڑ دوڑ میں ہر ممکن طریقہ سے کامیاب رہیں۔ مگر ان کو میری کیا پڑی ہے؟ ان کے والدین اپنا روپیہ اسی واسطے صرف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بھی "بڈھے ریٹی" کے نصاب کا ایک جزو ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ میری اُلفت روپیہ کی وجہ سے ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ میں اس سے قطعی بَرّا ہوں۔ کیا میرے واسطے یہ کافی نہیں کہ میرے سیکڑوں طلباء ایسے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں کہ دنیا ان پر رشک کرتی ہے"

تاریکی کے باوجود ایک گوشہ میں اس کو ایک ڈیسک نظر پڑی۔ وہ بیقرار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اور اپنی لاغر لانبی اونگلیاں اس پر پھیرنے لگا۔ کچھ کھدے ہوئے الفاظ کو محسوس کر کے اس کے چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلتی ہوئی نظر آئی۔

"اے۔ ایچ" اس نے آہستہ سے کہا۔ آرتھر ہارٹن۔ میرا بہترین شاگرد وہ آج ہی مجلسِ شوریٰ کا رکن بنایا گیا ہے۔ میں نے اس لڑکے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ میرا درس اس کے نزدیک وہی اثر رکھتا ہے جس طرح سے سمندِ تیز رفتار کے لئے ہنٹر کا اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس کی رگ رگ سے علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب بھی میں اس کو سرگرمی اور جانفشانی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ آرتھر ہارٹن میرا بہترین شاگرد تھا۔ اور وہ بھی مجھے بھول گیا"

ہارٹن غالباً اس کو فراموش کر چکا تھا۔ ڈاکٹر ریٹی کلف ٹرم ختم ہونے

سے ایک ہفتہ قبل لندن گیا تھا۔ اور ویسٹ منسٹر کے مقابل ٹہلتے ہوئے اس نے ایسے نامدار و شناسا چہروں کو دیکھا تھا۔ یہ سب اس کے شاگرد رہ چکے تھے۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ مگر سب کے سب سامنے سے بغیر اسکو پہچانے ہوئے گذرتے چلے جاتے تھے۔ اور جبکہ ہارٹن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی جسکی نسبت سنا جاتا ہے کہ آئندہ سالگرہ کے موقع پر لارڈ بنا دیا جائیگا۔ ۔ ۔ ۔ اس کے مقابل سے ایک نہایت معزز شخص سے گفتگو کرتا ہوا گذرا تو ہیڈ ماسٹر بے اختیارانہ اسکی تقریر پر جو ہنوز تمام ملک میں گونج رہی تھی مبارکباد دینے کے واسطے بڑھا۔

مگر ہارٹن اس کی جانب دوبارہ نگاہ ڈالے ہوئے بغیر سامنے سے گذر گیا یہ مدبر آج اس شخص کو فراموش کر چکا تھا جو اگر باپ کی طرح درشت مزاج واقع ہوا تھا تو بڑے بھائی کی طرح دل میں محبت بھی کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن کے باطن کو قابل رشک، اور تندرستی اور اخلاق میں ان کو فرد بنا دے، تاکہ زندگی کی بازیگاہ میں وہ ہر طرح سے کامیاب ثابت ہو سکیں۔

اس کا ہر ایک شاگرد۔ ۔ ۔ نہیں۔ ایک کے علاوہ اور سب کامیاب تھے۔ ہنس مکھ مگر کند ذہن ڈمی گرانٹ اپنی شرارتوں پر ہر ہفتہ مار کھاتا تھا۔

اس کا نام آتے ہی ہیڈ ماسٹر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے پاک اور صاف اعمالنامے پر ڈمی گرانٹ ہی ایک بدنما دھبہ تھا۔ وہ داخلۂ سینڈہرسٹ کے امتحان میں بری طرح فیل ہوا۔ کوئی بات نہ تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو۔

اس چمن زار علمیت کے نگراں نے اس مرجھائے ہوئے پودہ کی رکھوالی غالباً دوسرے پھل لانے والے درختوں سے زیادہ کی تھی۔ مگر بے سود۔ آرتھر ہارٹن اور ڈمی گرانٹ اس کے بہترین اور بدترین شاگرد تھے۔

ان دونوں کے درمیان ہزاروں ہی اور طلبا ہوں گے۔ بڑے بڑے مدبر قابل سے قابل وکیل بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مصنف۔ صناع۔ بہادر سپاہی اور مشہور سیاح۔ غرضیکہ ہر قسم کے لوگ تھے۔ مارکہم نے ایک ناول تصنیف کیا اور اپنی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ مگر وہ بھی اُس چشمہ لگانے والے ضعیف اُستاد کو اپنے دل سے بھلا چکا تھا جس نے پہلی مرتبہ اس کو انگریزی ادب کی گوناگوں باریکیوں سے آشنا کیا۔

کاش مارکہم نے مجھکو اپنی تصنیف کی ایک کاپی۔ ۔ ۔ ایک دستخط شدہ کاپی ہی بھیجدی ہوتی۔ معلوم تو ہو جاتا کہ اس کے دل میں میری یاد ابتک باقی ہے۔ مگر نہیں وہ بھی دوسروں کی طرح مجھکو بھول چکا تھا"۔

ڈاکٹر ڈیٹی کلف سرنگوں بیٹھا تھا۔ ٹیس پر ٹیس اُٹھتی تھی۔ ارد گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی کمزور آنکھوں کے سامنے سے مسکراتے ہوئے لڑکے قطار در قطار، بنچوں سے اُٹھ اُٹھ کر (جو سیاہی کے بدنما دھبوں سے آلودہ تھیں) دنیوی کامیابی کی محراب کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ ہر ایک مشکل اور ہر ایک مصیبت ان کی ہمت اور عزم کے سامنے ماند ہو جاتی تھی۔

سامنے کی سڑک پر پیتل کی تختی کے نیچے جو ایک اولڈ بائے کی بہادرموت کی یادگار تھی۔ پرسیول بیٹھا کرتا تھا۔ اور اُس کی نگاہوں سے یہ الفاظ "کہ اس نے انگلستان کے لئے اپنی جان دی" ایک لمحہ کے واسطے بھی اوجھل نہیں ہوتے تھے۔ پرسیول نے کولینزو کے مقام پر توپوں کو غنیم کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے غضبناک حملہ میں وکٹوریہ کراس حاصل کیا تھا۔ غریب اس اعزاز کو پانے سے قبل ہی موت سے ہم آغوش ہو چکا تھا۔ مگر اس نے اپنے ہیرو کی طرح برطانیہ کی حمایت میں جان دی۔

اس کی بہادری کے بیج اسی وقت بوئے گئے ہوں گے جبکہ میں سیمر کے کارنامے اس کو سنایا کرتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے آہستہ سے کہا "میں نے اس سے کہا تھا کہ برطانیہ کے واسطے اپنی جان دینا ہر شخص کا نصب العین ہونا چاہئے"۔ ۔ ۔ ۔ مگر کیا اس وقت جبکہ دنیا اس کی بہادری کے کارناموں سے گونج رہی تھی کسی کو اس کا بھی خیال آیا؟

مجھے خوش ہونا چاہئے۔ ۔ ۔ ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ یہ سب یوں کامیاب ہوئے۔ کاش اُنھوں نے ایک لفظ اپنی زبان سے نکال دیا ہوتا کہ وہ اپنے محبت کرنے والے ضعیف اُستاد کو نہیں بھولے ہیں۔ مگر کسی نے بھی تو ایسا نہ کیا۔ غالباً اُن کو فرصت نہ ہوگی، یا شاید ان میں لڑکپن کی لاپروائی ابتک موجود ہے۔ ان کو اگر معلوم ہو جائے کہ میں کس دل سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تو وہ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں۔

"یہ ضعیفی کا غلبہ ہے کہ اس طرح کے خیالات میرے دماغ میں ہجوم کر رہے ہیں۔ مگر اس سے بچکر بھی نہیں جا سکتا۔ اور یہ میرے دل پر ٹیس لگاتے ہیں۔ میرے بچو! کاش تم کو معلوم ہوتا کہ تمھاری بہبودی اور خود تم میرے واسطے کیا معنی رکھتے ہو"!

جھریاں پڑے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔

"میں اب تھک گیا ہوں"۔ اس نے اپنے دل کو تسکین دیتے ہوئے کہا اب عنان حکومت کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیدینی چاہئے۔ ہاں میں اب دست بردار ہو جاؤں گا۔ سیمز ٹسکلم میں اپنے مکان کو جا کر آباد کریگا۔ اور دوسرے شمشیر بکف نوجوانوں کو میدان کارزار میں لڑتا ہوا چھوڑ دے گا۔ ایکدن آخر یہی ہونا ہے۔

"میں نے اس جدوجہد میں اپنے جگر کو پانی کر دیا۔ اور میں کامیاب رہا۔ دنیا اس کو معلوم کر سکتی ہے۔ مگر فہرست اب تقریباً پُر ہو چکی ہے سپاہی رخصت ہو گئے اور یہ آخری سردار بھی اسی طرح ایک روز اس معرکہ سے اوجھل ہو جائیگا"۔ اس کے

الفاظ زمانۂ وسطیٰ کے استعارات سے ہم آہنگ تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

میں اب بڈھا ہوگیا۔ اور میرے خیالات بھی دقیانوسی ہو گئے۔ یہ اب فیشن سے خارج ہیں۔ ان باتوں کا اتنا اثر قبول کرنا حماقت ہے۔ میری محنت ہی میرا انعام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیس برس قبل میرا یہی خیال تھا۔ مگر اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش ان میں سے کوئی بھی اس قرضہ کے بار کو محسوس کر سکتا؟

وہ یقیناً روز بروز ضعیف ہوتا جا رہا تھا۔ اسکول کے اس کمرہ میں خاموشی طاری تھی۔ اب تنہائی نے اس کے دل و دماغ پر غلبہ کرنا شروع کیا وہ اس تنہائی کو اسی وقت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ اس کی پیاری بیوی اس کی شریک زندگی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی۔ مگر جو خیالات کہ آج اس کے دماغ میں جاگزیں تھے۔ اور جس طرح وہ اپنی تنہائی کو آج محسوس کر رہا تھا۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

کمرہ میں سردی پڑ رہی تھی۔ اور وہ کانپ رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں روشنی اور گرمی تھی۔ کچھ دیر بعد تمام اُستاد اپنے بڈھے جنرل سے رخصت ہونے سے قبل ڈنر پر جمع ہوں گے۔

میں خود اُن کے پاس جاتا ہوں۔ موقع اچھا ہے کہ اپنے سبکدوش ہونے کے متعلق ان سے گفتگو کروں۔ اُن کو تعجب ضرور ہوگا۔ "بڈھے رٹی" کے اس قدر جلد مستعفی ہونے کی ان کو اُمید نہیں تھی۔ وہ خوش ہوں گے۔ مگر چہرہ سے اس کا اظہار نہ ہوگا۔ کارن فورتھ میری جگہ مقرر ہوگا۔ اور وہ کامیاب رہے گا۔ مگر اس میں ہمدردی کی کمی ہے۔ کند ذہن لڑکے اس کے ہر وقت جھڑکنے سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ میری ضعیف آنکھوں کی بینائی کم ہو گئی ہے۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ اس کے اس طرزِ عمل کو نہ دیکھ سکوں۔

اگر میں استقلال سے کام نہ لیتا تو خدا معلوم گھر سے، فورتس، اور ہنگر اسمتھ کا آج کیا حشر ہوتا۔ تینوں کند ذہن تھے۔ ایک بھیڑ کے بچہ کے مانند کہ جس کے ارد گرد بھیڑیوں کا مجمع ہو۔ مگر اب ان کو دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں سے ہر ایک کامیاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بجز ایک گرانٹ کے مجھکو اسے گھر کتے ہوئے بھی رحم آتا تھا۔ اس کی روح تادیب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوسروں کی طرح سلیم الطبع نہیں واقع نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے اگر میں نے اس پر زیادہ وقت صرف کیا ہوتا۔ اگر کچھ اور صبر سے کام لیا ہوتا ؟ ۔ ۔ ۔ مگر کیا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ سب ہیچ! ۔ ۔ ۔ وہ بھی آخر کامیابی کے زینے پر چڑھکر مجھے بھول جاتا!!"

اس نے اپنے سفید گلے کے درمیان سے اس سیاہ بھیڑ کا خیال دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔

غالباً یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے گرانٹ کے ساتھ استقلال سے کام نہیں لیا۔ غریب لڑکا خدا معلوم اب کہاں ہوگا۔ اور کیا آوارگی کرتا ہوگا۔ جہاز پر جاتے وقت اس کے باپ نے اس کو ناخلف کر دیا تھا۔ بڈھا گرانٹ، اگرچہ میں اس کے دل کو نرم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حد درجہ سخت گیر تھا۔ اور اسی طرح اس کا لڑکا بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ غریب گرانٹ!!"

بڈھے ہیڈ ماسٹر کی انگلیاں اُٹھتے وقت پھر انھیں کندہ الفاظ پر پڑیں۔ اور اس کا دل اپنے بہترین شاگرد کے خیالات سے پر ہو گیا۔

"کاش! صرف ہارٹن ہی نے مجھکو یاد کر لیا ہوتا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہ بھولیگا۔"

اسکی انگلیاں ان بھونڈی طرح سے کھدے ہوئے الفاظ پر چکر لگا رہی تھیں اور اسکی آنکھیں تاریکی میں اس طرح دیکھ رہی تھیں گویا خوب دن چڑھا ہوا۔ "گرانٹ کی ڈسک اُس جگہ پر تھی۔ اچھا ہوا میں نے اس کو برباد نہ ہونے دیا۔"

اس نے جیب میں دیا سلائی کی ڈبیہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ دیا سلائی سلگنے اس کے جلنے سے کمرہ کے تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر نہایت اطمینان سے اس طرف بڑھا۔ جہاں ایک ٹوٹی پھوٹی تین پایہ کی میز رکھی ہوئی تھی۔ لکڑی پر ہر طرف سیاہی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ اور آدھے سے زائد ڈھکنا "جی" سے بھرا ہوا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر ریٹی کلف کی تصویر کارٹون کی شکل میں ناک پر انگلی رکھے ہوئے کھدی ہوئی تھی۔

اسے جلا دینا مناسب ہے۔ یہ دوسرے لڑکوں کے ادب اور اخلاق کے منافی ہے"۔

دیا سلائی سے اس کا ہاتھ جل رہا تھا۔ اس نے ایک آہ کے ساتھ اسکو گرا دیا۔

میں اپنے کمرہ میں خاموشی کے ساتھ اوروں کا انتظار کروں گا۔ تاکہ اپنے خیالات کو اس اعلان کے واسطے مجتمع کر سکوں، ۴۵ برس کے بعد آج اس کام کو ترک کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ کاش ان تمام کامیاب طلبا میں سے ایک صرف ہارٹن ہی اپنی زبان سے شکریہ کا ایک حرف ادا کر دیتا! مگر یہ کیوں ہونے لگا تھا۔" اس نے ایک اور دیا سلائی جلائی۔ اور اپنی کمزور آنکھوں سے کمرہ کے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ پریشانی کی تصویر تھا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ ایک شانِ استغنا کے ساتھ اوپر اُٹھا کر کہا۔ "اچھا خدا حافظ!" اور سر کو بلند کئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

آسیب آلود اسکول کے کمرہ سے اپنے گرم اور آرام دہ حجرہ میں آن کر اس نے ایک عجیب تغیر محسوس کیا۔ ایک گدے دار کرسی پر بیٹھتے ہی اس پر تکان کا غلبہ ہوا۔ آتشدان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے خیالات

کو بے عنان چھوڑ دیا۔ مگر وہ صرف ایک مرکز کی جانب رجوع ہوتے تھے۔ اور وہ یہ کہ اس کے مستعفی ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اب اس کو مدرسہ کی دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے اور ایسے مقام پر رہنا چاہئے جہاں کسی لڑکے کی آواز بھی ان تلخ تجربوں کی یاد نہ دلا سکے۔ اب سے کچھ ہی قبل وہ اسکا متمنی تھا کہ زمانہ ملازمت ہی میں اسکی موت واقع ہو۔ مگر آج ہر چیز میں تغیر تھا۔ اسکی تسکین کو ایک حرف کی ضرورت تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنی الوداعی تقریر کی تیاری شروع کردی۔

دوسرے مرحلہ ہی پر پہنچا تھا کہ گھنٹی کی آواز نے طیار ہوجانیکی اطلاع دی وہ اُٹھا مگر پھر بیٹھ گیا

"اُف! یہ سخت دشوار ہے۔ اس نے باواز بلند کہا۔ مگر میں رہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں ہے ایک ٹرم بھی یہاں رہا تو ہر لڑکے کو ناشکر گذار سمجھکر اس سے لاپروائی اور سختی کا برتاؤ شروع کردوں گا۔ اور یہ لڑکوں ہی کے واسطے نہیں میرے حق میں بھی برا ہوگا۔ سب کچھ ختم ہوچکا۔ اب عزت کے ساتھ رخصت ہونا بہتر ہے"

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مدرسہ کا پرانا چوکیدار پیل اندر داخل ہوا۔ اور ٹوپی اُتار کر کھڑا ہوگیا۔ "میں لڑکوں کو رخصت کرکے آرہا ہوں۔ شہر سے گذر رہا تھا اور آج رات ڈاک تقسیم نہ ہوگی۔ اس لئے ڈاکخانہ سے ڈاک بھی لیتا آیا ہوں"۔ یہ کہکر اس نے ایک معمولی سا لفافہ آگے بڑھایا اور ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں دیدیا۔

اس نے لفافہ چوکیدار کے ہاتھ سے لیکر میز پر ڈالدیا۔ مگر ایک لمحہ بعد وہ پھر اس کے ہاتھ میں تھا۔ "میں بھی کس قدر وہمی ہوں جو یہ خیال کررہا ہوں کہ اس خط میں وہی ہوگا۔ جسکی میرے قلب کو ضرورت ہے۔ ممکن ہے کچھ ہو۔ بہرحال دیکھنا چاہئے"۔

اس نے شروع کے الفاظ لاپروائی سے پڑھے اور پھر اپنے چشمہ کو تلاش کرنے لگا۔ ان پر کہر جما ہوا تھا اطمینان سے شیشوں کو صاف کیا مگر پھر بھی حروف صاف نظر نہیں آرہے تھے

" جناب عالی آپ مجھکو بھول چکے ہوں گے۔ مگر میرے دل میں آپکی یاد ابتک باقی ہے ایک عرصہ ہوا جبکہ میں اور آپ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر خوش ہوئے تھے۔ میں اسکول چھوڑنے پر مسرور تھا۔ اور آپ مجھکو اپنی نگاہوں سے دور کرکے خوش ہوئے ہوں گے۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا مجھے آپ کے اُمید بندھا دینے والے الفاظ اور آپ کا گھنٹوں بیٹھکر مجھکو نصیحت کرنا یاد آتا تھا۔ اور مجھکو محسوس ہوتا تھا کہ میں نے کیا کچھ نہیں کھو دیا۔

جس وقت یہ خیالات میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے میں قریب قریب تباہ ہوچکا تھا۔ والد مجھکو گھر سے نکال چکے تھے۔ میرے بہترین دوستوں کو میرا نام تک یاد نہ رہا تھا۔ دنیا میں میرے یار و مددگار باقی نہ رہے تھے۔ مگر آخرکار آپ کی باتیں مجھکو یاد آئیں۔ اور مجھکو ہوش آیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ مجھ کو شہرت حاصل ہے۔ ایک نامعلوم حصۂ ملک کے اندرونی حالات دریافت کرنے کے واسطے ایک پارٹی روانہ ہونے والی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام دیدیا۔ شروع شروع میں ہر شخص نے مجھکو بھیجنے سے انکار کیا۔ مگر سینٹ بورولین کا نام ظاہر کرنا ایک طلسم تھا کہ ہر ایک میری جانب دیکھنے لگا۔ اور آپ کے متعلق سوال کرنے شروع کئے۔

یہ سینٹ بورولین کے طالب علم ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ میں اس پارٹی کا سرگروہ بنایا گیا۔ تین برس تک ہم قدیمی جنگلوں اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں خاک چھانتے رہے۔ میرے ہمراہی میری آنکھوں کے سامنے جان دے رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ کام مجھسے ہونے کا نہیں۔ مگر ایسے وقت میں آپکا خیال تقویت پہنچاتا تھا کہ آپ کس طرح ہر مصیبت اور ہر مشکل کا اولوالعزمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ ہم کو غصہ سے بھرے ہوئے حبشیوں سے سابقہ پڑا۔ آپکی نرم مزاجی کا خیال کرتے ہوئے میں نے ان سے محبت سے کام لیا اور اُن کو رام کرلیا جب میرے ساتھی ہمت توڑ دیتے تھے تو میں اُن کو آپ کے الفاظ میں ہمت کی تلقین دیتا تھا۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر کوشش کرکے چل کھڑے ہوتے تھے۔ وہ میری تعریف کرتے ہیں اور مجھکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ میری تعریف نہیں آپکی ہے۔ عزت میری نہیں آپ کی ہونی چاہئے۔ جو کچھ بھی میں نے کیا اور اس زندگی میں جس قدر کامیابی کی وہ سب انھیں نصائح کی بدولت ہے جنکو آپ صدق دل سے میرے قلب میں پیوست کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میں اپنے نزدیک حد درجہ ناکارہ طالب علم تھا۔ مگر آپکی نگاہوں میں نہیں۔

صنفِ نازک میں سے ایک پیاری شخصیت نے مجھ جیسے شخص کے ساتھ رشتہ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ وہ بھی میری اس درخواست میں میرے ساتھ ہیں کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے ہمکو اپنی مہمانی کا شرف عطا کریں ہم میں اپنے قرضہ کا بار اُتارنے کی طاقت نہیں، مگر ہاں یہ آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کس قدر آپ کے احسان مند ہیں"۔

نام پر نظر ڈالنے کی حاجت نہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ اس کو پڑھنے سے مجبور تھا۔

نہایت پختہ خط میں لکھا ہوا تھا "ٹامس گرانٹ"۔

اسکول کا بدترین طالب علم . . . . . اور اس کے دل میں میری یاد ہنوز باقی ہے"۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "میں اب سبکدوش نہیں ہوں گا۔ میں کام کروں گا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے"۔

جس وقت وہ کھانے کی میز پر بیٹھا تھا اس کا چہرہ مسرت سے لبریز تھا آنکھوں سے چشمہ لگانے کے باوجود دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کوئی الوداعی تقریر نہیں کی . . . . اس کو اپنی محنت کا ثمرہ مل چکا تھا۔

حفیظ الرحمٰن

اسرارِ حیات

ہر چیز دھندلکے میں ہے نہاں، پُرہول گرج ہے طوفاں کی
ہر سمت دھواں سا چھایا ہے تاریک ہے دنیا انساں کی

خوابیدہ ہے روحِ دشت و جبل خاک اڑتی ہے گلزاروں میں
دم توڑ رہا ہے، اوجِ بشر پستی کے اندھیرے غاروں میں

دھندلا ہے جمالِ شادابی، مجروح جبینِ شادی ہے
ہستی کی فضا آباد نہیں ہے، محرومِ آبادی ہے

ہر زاویۂ انوار میں ہے، سو رنگ کی زحمت ناداں کو
ملتی ہے بدی کی، گہری تاریکی میں راحت انساں کو

ہر کام میں لغزش ہوتی ہے، ہر گام پہ ٹھوکر کھاتا ہے
یہ خاک کا پتلا! فطرت کی امید کو یوں بر لاتا ہے

یہ سلسلۂ آغازِ مصائب، مرحلۂ انجام نہیں
انساں کی بہشتِ آسائش! کچھ اور بجز اوہام نہیں۔

ہر چند کہ یہ اجزا ہیں سحر کی روح شکن عبرت کے لئے
نادان نہ جانے، کیا کیا غم سہتا ہے، شبِ عشرت کیلئے

سائے میں اسی کے، بیخبری کی نیند میں دنیا سوتی ہے
جس تلخ و گریزاں ہستی کی بنیاد فنا پر ہوتی ہے

اربابِ زمانہ، جنگ و جدل میں روح کی تسکیں پاتے ہیں
دنیا میں نہالستانِ مسرت خون سے سینچے جاتے ہیں۔

وہ امن کا حامل ہے!! جسکی محفل ہے، فضا بیکار و نحی
نغموں کی لطافت پاتا ہے۔ جھنکار میں جو تلوار و نحی

سینے کے نہفتہ گوشوں میں الحاد کا شعلہ لرزاں ہے
دنیا میں خدا کی عظمت کا اقرار، ثبوتِ عصیاں ہے

بیتاب ہے، موجِ خندۂ گل اجزائے خزاں چمکانے کو
بیدار ہے روحِ علم و عمل، دنیا پہ تباہی لانے کو

انسان ہے یا فطرت کی ظرافت، دنیا ہے یا دھوکا ہے
اِک گونج ہے یہ خاموشی کی، یا عکسِ حبابِ دریا ہے

(۲)

لرزش سی ہے پیدا، رقص میں ہیں امواج جحیمِ عصیاں کی
ہر سمت فضا میں گونج رہی ہیں تلخ صدائیں شیطاں کی۔

ماتھے پہ شکن پڑ جاتی ہے۔ غم کھاتا ہے، سر دھنتا ہے
دعووں کو جب اُس کے نیکی کا "معصوم فرشتہ" سنتا ہے

دنیا کی طرف ہوتی ہے نظر، اسرارِ حقیقت پائے ہوئے
بر روئے ہوا تھراتا ہے، اس طرح سے پر پھیلائے ہوئے

دیتا ہے صدا، دعوے ہیں جو تیرے آپ تجھی شرمائینگے
آ، دیکھ! جو پنہاں جلوے ہیں، وہ تجھکو نظر اب آئینگے

شیطاں کے تخیّل میں لیکن، یہ امر خلافِ امکاں ہے
آنکھوں میں حقارت کی لہریں، ہونٹوں پہ تبسّم عریاں ہے

وہ اس کو نظر آتا ہے مگر، جب محوِ تماشا ہوتا ہے
خود اپنی نگاہوں پر جس سے تلبیس کا دھوکا ہوتا ہے

(۳)

اِک سمت بدی کی طاقت ہے، آتشکدہ اِک سُلگائی ہوئے
اِک جانب نیکی کی دیوی، بازوئے حسیں پھیلائی ہوئے

پہلے تو فضا میں ہر جانب، تاریکی سی چھا جاتی ہے
چھٹتا ہے دھواں، جیسے جیسے، اِک سطح ابھرتی آتی ہے

ہنگامۂ نفرت گرم کئے اشرار کی فوجیں بڑھتی ہیں
ظلمت کا تموج ساتھ لئے، الحاد کی نہریں چڑھتی ہیں

امواج یہ لیکن آپس میں ٹکرا کے فنا ہو جاتی ہیں
تھمتی ہے جب آندھی، تند ہوائیں موجِ صبا ہو جاتی ہیں

شیطان! زمیں کا ہر گوشہ فردوس مسرّت پاتا ہے
اجزائے خس و خاشاک میں بھی، انوارِ لطافت پاتا ہے

اب اس کو نظر آتا ہے کہ ہر اِک چیزِ حیاتِ دوراں بھی
کچھ سطح میں پائے جاتے ہیں کچھ راز ہیں تہ میں پنہاں بھی

ظاہر میں زمین کھودی جاتی ہے نخل گرائے جاتے ہیں
در پردہ، مگر ترتیبِ چمن کے ساز ملائے جاتے ہیں

ظلمت کی شب آرا باطن میں اِک نور کی لو تھرّاتی ہے
مرجھاتا ہے کوئی پھول اگر، اِک تازہ کلی کھل جاتی ہے

بربادیاں ماتم کرتی ہیں جن اُجڑے ہوئے ایوانوں میں
ملتا ہے، حیاتِ نو کا سبق، انسان کو اُن ویرانوں میں

خاموش بھی ہے، ہستی کی فضا، محشر کدۂ پیغام بھی ہے
آغاز یہاں آغاز نہیں آغاز میں خود انجام بھی ہے

جھنکار ہے، اذنِ بیداری، دنیا کے لئے تلواروں کی
فردوسِ طرب بنجاتی ہے خون ریز فضا پیکاروں کی

ایثار و عطا کے انساں کو اطوار سکھائے جاتے ہیں
اِک درسِ کرم ملتا ہے یہاں جب خون بہائے جاتے ہیں

اسرارِ طرب کی حامل ہے، لبریزِ الم، جانکاہی بھی
منزل کا پتہ دینے کے لئے ہوتی ہے یہاں گمراہی بھی

عالم کی فضا، کچھ عقل و بصیرت ہی کی تجلّی زار نہیں
سرشارِ گدائے، میکدہ بھی دنیا کے لئے بیکار نہیں

(۴)

شیطان جب اپنی آنکھوں سے یہ منظرِ عالم دیکھ چکا
اِک عمر کی گہری تدبیریں، یوں درہم و برہم دیکھ چکا

سینے سے دُھواں سا اُٹھنے لگا، اِس صبر شکن ناکامی پر
دی اُس نے یہ ہیبتناک صدا جھنجھلا کے پھر اپنی خامی پر

کچھ بھید ہے، اس میں، مجھکو ابھی نظارے کی مہلت اور ملے
تحقیق کی خواہش رکھتا ہوں تحقیق کی فرصت اور ملے

معصوم فرشتہ ہنس کے پکارا تجھکو ابد تک مہلت ہے
جا دیکھ، کہ تیری ہستی بھی اِک پنہاں رازِ فطرت ہے

(غیر مطبوعہ)

اختر

دنیا کا باشندہ

ہوٹل روشنی سے جگمگا رہا تھا!

میرے پاس کی ایک کرسی خالی تھی۔ ایک بھاری بھرکم۔ بارعب صاحب تشریف لائے اور گویا دھم سے کرسی پر گر پڑے۔ آپ "دنیا کے باشندے" تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد صحیح معنی میں کوئی شخص "دنیا کا باشندہ" کہلانے کا مستحق بن رہا تھا۔ یہ سب لوگ دنیا کے کسی خاص حصّے کے باشندے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اکثر "دنیا کے باشندوں" کا حال سنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ دنیا کے مسافر ہوتے ہیں متوطن نہیں!

ازراہ کرم اپنے تخیل سے کام لیجئے!

رات کا وقت ہے۔ بہار کا موسم ہے۔ سنگ مرمر کی میزوں پر لذیذ کھانوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ ایک طرف "شاعروں" اور "ادیبوں" کا ایک گروہ "آرٹ" "سائینس" "خدا" کے متعلق بحث میں مصروف ہے۔ دوسری طرف کامیاب سرمایہ دار "شرح تبادلہ" "نرخ طلا" کے مسائل میں غرق ہیں!

تیز رو۔ خاموش پا۔ خادم ادھر سے اُدھر۔ اُدھر سے ادھر پھر رہے ہیں۔

ایک گوشے میں تاڑ کے بلند پودے لطیف و تاباں روشنی کے لیمپوں کو نیم نہاں کئے ہوئے ہیں۔

یہ حضرت اپنے آپ کو "ہادی حسن" کہتے تھے۔ اور ان کی گفتگو طول بلد اور عرض بلد کے خطوط کو احاطہ کئے ہوئی تھی۔ انہوں نے دنیا کو ایک گیند کی طرح ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ حقارت سے۔ طنز سے! اور یہ گیند بادام کی گری سے بھی مختصر معلوم ہوتا تھا! وہ بے پروائی سے خط استوا کا ذکر کرتے تھے۔ ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تک ایک فقرے میں سفر کر جاتے تھے۔ منطقیں ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ وہ اپنے دامن میں ہفت اقلیم کو سمیٹے ہوئے تھے۔ سمندر بحر ذخار ان کے پاؤں کو چھو رہا تھا۔

اپنے ہاتھ کی ایک لاابالیانہ فیشن کے ساتھ وہ حیدرآباد کے ایک بازار کا ذکر کر رہے ہیں۔ پھر اسوئٹزرلینڈ کے پہاڑی مقامات کی سیر میں مصروف ہیں۔ اُف! اس وقت آپ امریکہ کے مشہور آبشاروں کے شور میں غرق ہیں! آہا! اور اب آپ ان کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے دارالسلطنت لندن میں موجود ہیں!

ان کی باتیں ایسی تھیں کہ آپ کو یقین ہو جاتا کہ اگر آپ ان کو مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیں تو انہیں ضرور ملجائے۔

مکرمی "ہادی حسن" صاحب

دنیا

نظام شمسی

کائنات

میں آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج مجھے واقعی ایک دنیا کے باشندے سے سابقہ پڑا ہے۔ اس سے پہلے جن آدمیوں سے میں ملا تھا وہ "مسافر" تھے۔ مجھے عبد الغفور مصنف "قعر دریا" کے اس فقرے پر ہنسی آرہی تھی۔ "کوئی شخص دنیا کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ انسان ایک شہر کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ کہیں چلا جائے اس شہر کی محبت اس کے دل میں موجزن رہیگی۔ وہ ہمیشہ اپنے شہر کی چیزوں کو دوسرے شہر کی چیزوں پر فوقیت دیگا۔"

میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ کا وطن کہاں . . . ."

مسٹر ہادی حسن نے قطع کلام کرتے ہوئے زوردار آواز میں کہا "معاف کیجئے گا" "مجھے یہ سوال بہت ناپسند ہے۔ اس بات سے کیا ہو جاتا ہے کہ کوئی انسان امریکہ کا نہیں بلکہ ہندوستان کا رہنے والا ہے۔ کیا کسی شخص کے متعلق کوئی اندازہ قائم کرنے کے لئے اس کے ڈاکخانے کے پتے سے واقف ہونا ضروری ہے؟ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ ان جبلی امتیازات کا زمانہ گزر گیا ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس مختصر سی دنیا میں لوگ اپنی زندگی کو اور بھی مختصر اور بے مصرف بنا لیتے ہیں۔ کیا حماقت ہے!" "میں لاہور میں پیدا ہوا تھا اس لئے لاہور اچھا شہر ہے۔ سب شہروں سے اچھا

ہے۔" میں لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے لکھنؤ کو تمام دنیا پر فوقیت حاصل ہے۔ کیا حماقت ہے!" میں نے تعریفی لہجے میں کہا "آپ دراصل دنیا کے باشندے" معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ حب الوطنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

ہادی حسن صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "حب الوطنی" عہد حجر کی ایک نشانی ہے۔ ہم تمام بھائی بھائی ہیں۔ ایکدن ایسا طلوع ہوگا جب یہ تمام امتیازات منا کر رہ جائینگے اور دنیا کے تمام باشندے "دنیا کے باشندے" کہلائیں گے۔ ان کا وطن "دنیا" ہوگا"۔

میں نے پوچھا "یہ تو ارشاد فرمائیے کہ دوسرے ممالک کی سیر کرتے ہوئے کیا آپ کے دل میں کبھی کسی شہر کی یاد نہیں آتی۔ کیا آپ کو کسی محبوب، مسرت افروز، شہر۔۔۔۔"

انہوں نے میرا قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ہرگز نہیں۔ دنیا میرا وطن ہے۔"

مکرمی ہادی حسن اٹھکر چلے گئے۔

میں مبہوت سا بیٹھا رہا۔

میں تفکرات میں غرق تھا۔

یکایک شور و غل ہونے لگا۔ میرے تفکر و تدبر کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے اٹھکر دیکھا۔ مکرمی ہادی حسن اور ایک دبلا پتلا شخص گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میزیں الٹ رہی تھیں۔ گلاس ٹوٹ رہے تھے۔ آدمی چلا رہے تھے۔ مکرمی ہادی حسن اپنے وطن "دنیا" کی عزت کے لئے مصروف کار زار تھے۔ ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کو بلا کر پوچھا۔ "یہ کیا بات ہے؟ ان دونوں کو کیا ہو گیا؟"

ہوٹل کے مالک نے ہنستے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں۔ اس دبلے پتلے آدمی نے لاہور کے بازاروں کی تنگی کے متعلق طنزیہ فقرے بر تے تھے۔ دوسرے سے (دوسرے سے مراد مکرمی ہادی حسن صاحب "دنیا کا باشندہ" تھی) برداشت نہ ہو سکا۔ اٹھ کر گتھم گتھا ہو گئے؟

میں نے پوچھا "یہ کیوں"؟

جواب ملا۔" ان کا وطن لاہور تھا اور وہ اپنے وطن کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔"

دنیا کا باشندہ! کیا بات ہے!

عابد

رباعیات فرخ

دنیا سرمستیوں کا میخانہ ہے
ہر چیز میں کیفِ دورِ پیمانہ ہے
لبریز نشاط ہے فضائے عالم
ذرہ ذرہ میں رقصِ مستانہ ہے

ذوقِ مستی کا کچھ اثر رہنے دے
مینا و سبو پیشِ نظر رہنے دے
غرقِ مئے ناب کر کے مجھ کو ساقی
کفر و ایماں سے بیخبر رہنے دے

فرخ

کیا ساری دُنیا کی زبان ایک ہوجائیگی؟

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دنیا کچھ اوپر تین صدی سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ کوئی سہل زبان ایجاد کیجائے جو بین الاقوامی زبان بن سکے اور دنیا کی مختلف قوموں اور فرقوں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو۔ بڑے بڑے علماء اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ کامیابی نے ان کے قدم چومے اور یہ عقیدۂ لاینحل بہترین طور پر حل ہو گیا۔

اس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دنیا میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں اور پھر ہر زبان مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جا رہی ہے۔ زبانوں کی یہ بہتات مختلف قوموں کے درمیان اگر غلط فہمیاں پھیلانے کا باعث نہیں بنی رہی تو بیگانگی اور اجنبیت کا پردہ ضرور ڈال رہی ہے اور وہ بھی ہمارے اس سنہری زمانہ میں جسے بجا طور پر دورِ علم و ارتقاء کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً آج اگر مصنف اپنے خیالات انگریزی الفاظ کے ڈھانچے میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس سے سوائے ان لوگوں کی محدود تعداد کے جن کی مادری زبان انگریزی ہے یا جنہوں نے اس میں کمال حاصل کر لیا ہے دوسرے لوگ متمتع نہیں ہو سکتے اور اس طرح مصنف کا مقصودِ اصلی یعنی نشرِ علم فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترجمہ سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر ترجمہ کیا جائے تو اول تو اس میں مصنف کے خیالات کے اصلی خد و خال ظاہر ہونے مشکل ہیں اور پھر روپیہ اور وقت کافی خرچ ہو جاتا ہے اور پھر ترجمہ کس کس زبان میں کیا جائے؟ اس لئے کہ اس وقت دنیا کی علمی زبانوں کی تعداد بھی بیس سے کم نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی تاجر یہ ارادہ کرتا ہے کہ اس کی تجارت کی شہرت دنیا کے ہر ہر گوشہ میں پھیل جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے لکھنے والوں سے مدد لے جو کم از کم چار پانچ اہم زبانیں جانتے ہوں۔ لیکن پھر بھی اس کا مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتا باوجودیکہ اسے روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا اور اگر ایسا نہ کرے تو اس کی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر کوئی بین الاقوامی زبان ہو تو پھر یہ دقتیں پیش نہیں آتیں۔ زیادہ سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہوگی کہ ہر شخص وہ بین الاقوامی زبان سیکھ لے۔ اس زبان سے واقف ہو جانے کے بعد دنیا کے تمام ملکوں کے دروازے اس کے لئے کھلے ہونگے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی ایک بین الاقوامی زبان کا وجود ضروری ہے زبانوں کی یہ کثرت بسا اوقات مختلف حکومتوں کی مجالسِ صلح کی کامیابی کی شاہراہ کا روڑا بنجاتی ہے۔ اکثر یہ منظر دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کبھی کوئی مقرر اسٹیج پر کھڑا ہوا اور اس کی ملکی زبان کی گونج ہال میں سنائی دی تو بہت سے نمائندے ہوا کھانے کے لئے برآمدوں میں چلے جاتے ہیں۔

بعض اوقات زبانوں کی یہ کثرت مختلف حکومتوں میں سیاسی معاملات کے متعلق غلط فہمیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اور دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان سلسلۂ نامہ و پیام میں تاخیر اور تعلقات میں تعویق تو اس کا ادنیٰ نتیجہ ہے۔

جب کہ حالات یہ ہوں تو کیا دنیا کو ایک ایسی زبانوں کی ضرورت نہ تھی جو مختلف قوموں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ ہو، مختلف حکومتوں کے درمیان امن و صلح کی پیغامبر ہو اور عمرانی دنیا میں تجارتی و ادبی تعلقات کے کمال کی راز دار ہو؟

ایک اعتراض اور اسکا جواب

ایک اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ کیوں صاحب ہمیں ایک نئی زبان ہی ایجاد کرنے کی کیا ضرورت ہے! ہم موجودہ زندہ زبانوں میں سے ہی کسی ایک زبان کو انتخاب کر کے اسے بین الاقوامی زبان کا درجہ کیوں نہ دیدیں؟ لیکن دو اہم وجوہ سے یہ اعتراض غلط ہوگا۔

اول یہ کہ اگر ہم کسی ایک حکومت کی زبان کو یہ درجہ دیدیں تو یہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی زبانوں کی کھلی ہوئی توہین ہو گی اور ان کی قبولیتِ عامہ کی صلاحیت پر زبردست حملہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس طرح اس زبان کو جسے ہم نے بین الاقوامی زبان بنایا ہے۔ دوسری زبانوں کے دائرہ حکومت میں اقتدار حاصل ہو جائیگا اور کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی

زبان والی حکومت اس اقتدار سے کیسے کیسے بہترین سیاسی و ادبی نتائج حاصل کریگی؟

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ہم نے فرانسیسی زبان کو بین الاقوامی زبان کا درجہ دیدیا تو کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ انگلستان یا کوئی اور حکومت اسے منظور کریگی کہ وہ فرانس کے اس ادبی استعمار کی زنجیروں میں اپنی گردن کو جکڑ والے جس کے سیاسی نتائج نہایت مہلک ہونگے؟ اور یہ کہ فرانسیسی زبان تو دنیا بھر میں اپنے جھنڈے گاڑ دے۔ اور اس کی اپنی زبان اپنے ملک میں بھی اپنا اقتدار کھو بیٹھے؟ نہیں، فطری طور پر یہ بات ناممکن ہے اسی طرح بالعکس سمجھ لیجئے۔

دوم یہ کہ دنیا میں آج کوئی ایسی زبان نہیں پائی جاتی جس کے قواعد آسان ہوں اور جس کا حاصل کرنا سہل ہو۔ بلکہ تمام زبانیں مشکل ہیں، ان کے قواعد کئی کئی جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی کلیہ نہیں۔ ان کے تعلیل کلمات کانوں پر گراں گزرتے ہیں اور ان کی گردانیں طویل اور غیر لازمی ہیں۔

ان وجوہات کو دیکھتے ہوئے دنیا کو سخت ضرورت تھی ایک ایسی زبان کی جو کسی مخصوص حکومت کی طرف منسوب نہ ہوتا کہ دنیا کے ہر ہر گوشے میں اسے قبولیت عامہ حاصل ہو سکے۔ اس کے قواعد آسان ہوں، اس کا حاصل کرنا لوہے کے چنوں کا چبانا نہ ہوتا کہ ایک شخص تھوڑی ہی مدت میں اس میں مہارت تامہ حاصل کرلے۔

دنیا کی بڑی بڑی قومیں اس بات کو تسلیم کر چکی ہیں کہ یہ دونوں شرطیں "اسپرانٹو" میں پائی جاتی ہیں۔ یہ زبان تعجب انگیز سرعت کے ساتھ دنیا کے ہر ہر گوشہ میں پھیلتی جا رہی ہے۔ بلکہ آج کل تو اس زبان میں متعدد اخبارات اور ہفتہ وار و ماہوار رسائل بھی نکل رہے ہیں اور علم و ادب کا ایک معقول ذخیرہ ترجمے کی صورت میں منتقل ہو کر اس زبان کا سرمایہ بن چکا ہے۔

اسپرانٹو

اسپرانٹو ایک بین الاقوامی زبان ہے جسے پولینڈ کے ایک نوجوان عالم ڈاکٹر لوئیس زامنہوف نے ۱۸۸۷ء میں ایجاد کیا۔ اسی نے سب سے پہلے اس زبان کی قواعد مرتب کی، اور اس کا نام ڈاکٹر اسپرانٹو رکھا۔ ڈاکٹر اسپرانٹو کے معنی اس کی اپنی زبان میں امیدوار فاضل ہیں۔ اس نے اس زبان کو اتنا آسان بنایا کہ ایک شخص اس کے تمام قواعد پر ذرا سی دیر میں عبور حاصل کر سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے میں اس زبان کا ماہر ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی وسیع زبان ہے کہ ایک شخص جسقدر آسانی اور جسقدر بے تکلفی کے ساتھ اس کے ذریعے سے اپنے خیالات کی ترجمانی کر سکتا ہے وہ دوسری زبانوں کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس زبان کے اکثر کلمات کا ماخذ لاطینی زبان ہے اور بعض وہ کلمات ہیں جو دنیا کی اکثر زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اسپرانٹو کی خصوصیات یہ ہیں:-

(۱) تمام قاعدے کلیہ ہیں ان میں مستثنیات نہیں۔

(۲) کلمات کی کتابت ان کے تلفظ کے مطابق ہوتی ہے۔ کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔

(۳) کلمات کا تلفظ ان کی کتابت کے مطابق ہوتا ہے۔

(۴) ہر حرف کا تلفظ اس کی اس آواز کے مطابق ہوتا ہے جو اس زبان کے ۲۸ حروف تہجی میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ مقرر ہے۔

(۵) ایک حرف ہمیشہ ایک ہی قسم کی آواز دیتا ہے۔ اس کا وقوع کہیں کیوں نہ ہو۔

(۶) اصل کلمے پر ایک یا دو حروف کی زیادتی سے مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس زبان کی ڈکشنری میں آپ محض اصل کلمہ سے مخصوص حرفوں کی زیادتی سے اسم، فعل، صفت وغیرہ بنا سکتے ہیں۔

مثلاً آپ کو اسپرانٹو میں اردو زبان کے لفظ 'جلدی' کا مرادف ڈھونڈنا ہے، تو آپ کو ڈکشنری میں لفظ Rahid ملیگا۔ یہ اصل کلمہ ہے۔ اب اصل کلمہ پر:-

(ا) حرف o کی زیادتی سے اسم بن جائیگا مثلاً جلدی Rahido

(ب) حرف a کی زیادتی سے صفت بن جائیگی مثلاً جلدی کرنے والا Rahida

(ج) حرف e کی زیادتی سے ظرف بن جائیگا مثلاً جلدی سے Rahide

(د) حروف is کی زیادتی سے فعل ماضی بن جائیگا مثلاً جلدی کی Rahidis

(ہ) حروف as کی زیادتی سے فعل مضارع بن جائیگا مثلاً جلدی کرے گا Rahidas

(ذ) حرف u کی زیادتی سے فعل امر بن جائیگا مثلاً جلدی کر Rahidu

یہ قواعد بلا استثناء اسپرانٹو کے تمام کلمات میں جاری ہوتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے قواعد ہیں۔ ان قواعد کی سہولت اور جامعیت زبان اسپرانٹو کے آسان ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ اس زبان کی موجودہ مقبولیت کے آئینے میں اس کی کامیابی کا درخشاں مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عنقریب تمام دنیا کی بین الاقوامی زبان بن جائے گی۔

اسپرانٹو کی ترقی کے سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر امید افزا ہے کہ یورپ کی اکثر حکومتوں نے اپنے ہاں کے اسکولوں میں، اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے۔ یوگوسلافیا، زیکوسلافیک، روم اور ہنگری کی حکومتوں نے، اپنے ہاں کے تمام ابتدائی مدرسوں میں اس کی تعلیم جاری کر دی ہے۔ انگلینڈ میں، مانچسٹر یونیورسٹی نے گذشتہ سال اس کی تعلیم کا انتظام کر دیا تھا اور اس سال بھی اس کے جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ سویڈن کی حکومت نے اپنی پارلیمنٹ کے تمام ممبروں کے لئے اس زبان کا سیکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب وہ اس کے ابتدائی سبق ازبر کر رہے ہیں۔

علاوہ بریں بہت سی دکانوں، تجارتی کمپنیوں اور کارخانوں نے، اپنے تجارتی اشتہارات اسپرانٹو میں شائع کرنے شروع کر دئے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھکر یہ کہ پیرس کے بعض رسالوں نے مثلاً رسالہ "باریز" اور رسالہ "باکس الی السلام" اپنے بعض صفحات زبان اسپرانٹو میں خبریں شائع کرنے کے لئے مخصوص کر دئے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا اس زبان کی بیسویں کانفرنس بلجیم کے شہر انتورپ میں، ہز مجسٹی شاہ بلجیم کی زیر سرپرستی منعقد ہوئی تھی۔ اس عظیم الشان کانفرنس میں دنیا کے ۴۳ ممالک سے پندرہ ہزار نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں وہاں ایک اسپرانٹو کالج کا بھی افتتاح کیا گیا۔ ترقی کے میدان میں، اسپرانٹو کا یہ ایک نیا قدم ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ سینما والے بھی اسپرانٹو کی اشاعت میں سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ اسے عالم سینما کی جدید زبان بنا دیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بہت جلد دنیا بھر کے میدانوں کو جیت لیگی۔

(فہیم حرفوس المصری)

زین العابدین سجاد میرٹھی

بین الاقوامی - مختلف قوموں کی مشترک International

استعمار - ظالمانہ اقتدار۔ ناجائز تسلط۔

قواعد کلیہ - وہ قاعدے جو تمام جزئیات پر حاوی ہوں۔

مستثنیات - وہ جزئیات جو کلیہ قاعدوں کے تحت میں نہ آتے ہوں۔ Exceptions

حروف ہجا - وہ حروف جن سے کسی زبان کی ترکیب عمل میں آئے۔ Alphabet

مرادف - ہم معنی۔

غزل

بھرے جا بادۂ سرجوش سے ساقی سبو میرا
شرابِ آتشیں دے دے کے گرمائے لہو میرا

ترے جلوؤں سے رنگیں لالہ زارِ آرزو میرا
شگفتہ ہے تیرے دم سے مذاقِ رنگ و بو میرا

مری خاموشیاں ہیں تاک میں مرگِ معیّن کی
حیات افزائے سرمستاں ہے شورِ ہاؤ ہو میرا

نہیں گر ناخدا۔ آسودۂ ساحل رہوں کب تک
مجھے ساحل پہ لے جائیگا ذوقِ جستجو میرا

جوانی کی یہ رنگیں رات شاید ختم ہوتی ہے
وقار اب جھلملاتا ہے چراغِ آرزو میرا

(غیر مطبوعہ)

وقار (انبالوی)

جُرعہ

گناہ لذّت آشنا، ترانہ زا رباب ہے — ابھی فضا میں کیف ہے، ابھی نزا شباب ہے

نہ داغِ قلب دردزا ہے نہ آفتاب ہے — کسی کے بحرِ حسن کا یہ مشتعل حباب ہے

تجلّیوں کی شوخیاں سمٹ کے حسن بن گئیں — ہزار سادگی سہی شباب پھر شباب ہے

وہی حیاتِ مضطرب وہی وفورِ بیخودی! — مجھے نشاطِ جلوہ کی نہ تاب تھی نہ تاب ہے

لبوں کے شوخ رنگ سی نظر کے دورِ حسن میں — شراب میں سرور ہے، سرور میں شراب ہے

سکون و ہوش نام ہے فریبِ اصطلاح کا — جسے جنوں سے عار ہو وہ "کافرِ شباب" ہے

نہیں نہیں! یہ توبہ کیا؟ فضا تو دیکھ ناصحا! — کہ ساغرِ بہار میں شراب ہی شراب ہے

سکون سے ضد نہیں مگر دلِ حزیں کو کیا کروں — جسے نگاہِ لطف بھی پیامِ اضطراب ہے

کمالِ ہوش ہے یہی کہ ہو نثارِ بیخودی — نہیں ضرورتِ حجاب، جلوہ خود حجاب ہے

سروش کی تباہیاں لطافتوں میں کھو گئیں
شباب پر بہار ہے بہار پر شباب ہے

(غیر مطبوعہ)

سروش
(بھوپال)

وہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز — اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز

اُس نازنین پہ ختم ہیں سب شیوہ ہائے ناز — جس کو بنا کے خود بھی ہے نازاں خدائے ناز

کیا کیا نہ آرزو کے بڑھیں دل میں حوصلے — رکھ دیں کبھی جو فرقِ ہوس پر وہ پائے ناز

اربابِ اشتیاق ہیں اور انتہائے شوق — حالانکہ حُسنِ یار ہے اور ابتدائے ناز

کچھ یونہیں اپنے حُسن پر مغرور تھا وہ شوخ — کچھ لے اڑی ہے اور بھی اسکو ہوائے ناز

حسرت موہانی

صداقتِ قلب

رات تاریک تھی اور سرد — تاریک سرد اور بھیانک۔ دو انسانی شکلیں چوک پر مڑیں۔ برف کے ذرے — سوئی جیسے باریک اور تیز تیروں کے گچھے کی طرح ان کے جسم میں چبھنے لگے۔

بغیر زخم کھائے مگر ہراساں۔ انتہائی ہمت سے کام لیکر اُنھوں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ عورت — نزاکت کا مجسمہ کوٹ کے کالر کو معمولی سے زیادہ مضبوطی سے اپنے گلے کے گرد لپیٹے ہوئے دیوقامت مرد کے بازو کا سہارا لیکر چل رہی تھی۔

اسی گلی میں ان کا گھر تھا۔ اپنے قدیم آرام دہ مکان کو پھر ایک مرتبہ دیکھنے کی خواہش انھیں بیتاب کرنے لگی۔ وہی پرانے دل پسند کمرے جن میں وہ شب و روز رہا کرتے تھے۔ وہی در و دیوار۔ وہی ساز و سامان ان کی آنکھیں مختلف مناظر کی سیر سے اُکتا چکی تھیں۔ مصر ہندچین۔ جاپان۔ ایران۔ عرب غرض ایک گردش پیہم۔ دست بدست۔ محبت زندگی اور . . . موت میں بھی دونوں کے ہاتھ ملے رہے۔ اب گھر — پیارے قدیم گھر کو دیکھنے دیکھنے کی تمنا ان کے دلوں میں ہیجان برپا کر رہی تھی۔

مرد نے پتلون کی جیب سے کنجی نکالی۔ قفل کھولا۔ پھر دروازہ کھولا اور تعظیماً پیچھے ہٹا — تاکہ عورت پہلے داخل ہو۔

وہ کمرۂ طعام میں آئے۔ مرد نے بڑا لیمپ روشن کیا۔ اس کے زبردست ہاتھ میں دیا سلائی — ایک حقیر بے حقیقت سی شئے۔ چمکی۔ بغیر ایک لفظ کہے دونوں نے کوٹ اور ٹوپیاں اُتاریں۔ مرد نے ان پر جمی ہوئی برف جھٹکی ہر چیز اسی ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ جیسے کہ وہ چھوڑ گئے تھے۔ عورت نے کوکو کا ٹن اُٹھایا۔ اس کی سوالیہ نظر کا جواب مرد کے اثبات میں سر ہلانے سے مل گیا۔ اس نے اسٹوو پر پانی چڑھا دیا۔ مرد کھڑا رہا۔

وہ بھاپ نکلتی ہوئی پیالی ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ عورت نے بھی اپنی پیالی اُٹھائی۔

مرد نے ایک شمع اُٹھائی۔ اسے روشن کیا اور بڑا لیمپ بجھا دیا۔

اُنھوں نے بالاخانہ کی سیڑھیاں دست بدست طے کیں۔ ہال میں سے گذر کر وہ سونے کے کمرہ کے دروازہ پر پہونچے۔ دروازہ کھولا۔ مرد پھر تعظیماً پیچھے ہٹا۔ عورت پہلے داخل ہوئی۔ پھر مرد۔ اور عورت دونوں سو گئے۔ اس دوران میں کسی کی زبان سے بھی ایک لفظ تک نہ نکلا کیسی عجیب بات ؟

تاہم ہر ہفتہ میں ایک بار ضرور ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب یہ میاں بیوی سینما دیکھ کر گھر واپس آتے ہیں۔

محمد محی الدین تنویر قریشی
متعلم جامعۂ عثمانیہ

تمہاری یاد کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے ضیائے حسن سے یہ گھر ہوں جگمگائے ہوئے

فسانہ ہائے غمِ عشق باغ میں نہ کہو یہ نغمے بلبل شوریدہ کے ہیں گائے ہوئے

گلوں کے ذوقِ نمو کا نہ پوچھیے احوال ہیں فرطِ جوش سے چہرے بھی تمتمائے ہوئے

جہانِ حسن میں دیوانہ وار پھرتا ہوں متاعِ ہوش و خرد ہاتھ میں اٹھائے ہوئے

سجی ہوئی ہے بساطِ فلک تمام و کمال ہر ایک سمت ستارے ہیں جگمگائے ہوئے

کسی کی یاد سے بہلا رہا ہوں دل فطرت نگاہ روئے قمر پہ ہوں میں جمائے ہوئے

"نعش کا چہرہ"

میں ایک روز صبح کے وقت کلب میں بیٹھا تھا۔ ایک سمے کا مل پیش نظر تھا۔ اتنے میں میرا پرانا رفیق پیگیٹ بن مانس کی طرح اچھلتا کودتا میرے پاس آپہونچا۔

پیگیٹ: "مسٹر فش تم کو دوسروں کے معاملات سے بہت دلچسپی ہے نا"۔

"جب کوئی معاملہ زیادہ دلچسپ ہو تو میں ضرور دلچسپی لیتا ہوں"۔

بہت اچھا تمہاری طبیعت کے مطابق ایک راز کا سراغ لگایا ہے۔ کل میں نے اپنے مختار سے اپنے مکان کے خریدار کا تذکرہ کیا تھا سالیسٹر نے تحقیقات کے بعد ٹیلیفون پر جواب دینے کا وعدہ کیا تھا گھر پہونچتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فوراً کان لگایا۔ آواز آئی میں نے تحقیقات کرلی۔ میں سمجھا سالیسٹر صاحب بات کر رہے ہیں میں نے جواب دیا۔ بہت بہت شکریہ۔ کیا معلوم ہوا۔ مسٹر فش میں کیا عرض کروں۔ اس کے بعد جو قطعاً غیر مانوس آواز آئی۔ اور جواب بالکل ہی خلاف توقع تھا۔ جواب یہ تھا۔ نعش کا چہرہ کچھ سرخی مائل ہوگیا ہے۔ سرخی ایسی ہے جیسی زندہ آدمی کے چہرہ پر ہوتی ہے۔

میں نے کہا "معاملہ تو بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ تم نے بات کو نبھا کر مزید حالات معلوم کئے ہوں گے"۔

نہیں میں ایسا نہیں کرسکا۔ اسی کا تو افسوس ہے۔ میں بالکل بوکھلا گیا۔ میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسری جانب سے ٹیلیفون پر بولنے والے نے دریافت کیا آپ کون صاحب ہیں۔ جب میں نے اپنا پتہ بتایا تو اُن سے کہا معاف کیجئے۔ نمبر غلط ہو گیا۔ بس ٹیلیفون بند کردیا۔

"خیر۔ پھر تم نے مرکز سے دریافت کیا کہ تم سے کس نے بات کی تھی"۔

پیگیٹ صاحب بہت تجربہ کار بنتے تھے۔ مگر اُس وقت میرے سوال سے گھبرا گئے اور بولے۔ "اس کا تو مجھ کو خیال نہیں رہا"۔ پھر یوں بات بنائی۔ شاید مرکز سے بھی پتہ نہ چلتا۔ ممکن ہے بولنے والے نے پبلک ٹیلیفون سے بات کی ہو۔ بہرحال میرے سالیسٹر کا یہ نام ہرگز نہ تھا۔

"کوئی اور ذریعہ تمہارے علم میں ہے جس سے کچھ سراغ چلے"۔

"کوئی نہیں۔ میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔ تم غور کرو۔ آخر تم بھی پریشان ہوکر رہ جاؤگے۔ اور حاصل کچھ نہ ہوگا۔ مسٹر فش سیکڑوں باتیں روز ہوا کرتی ہیں تم ایک کا بھی اصل حال نہیں بتاسکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ کسی جگہ کوئی واقعہ ہوگیا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

یہ کہا اور پیگیٹ صاحب نہایت متانت کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے تشریف لے گئے۔

میں واقعات کو گھڑنے والا سراغ رساں نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے میری کارروائی قریب قریب بچوں کی سی آسان اور عام فہم ہوتی ہے۔ جب میں کسی بات کے متعلق نہیں جانتا ہوں۔ دوسروں سے دریافت کرلیتا ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کوئی سراغ رساں کبھی نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی میں نے اپنے کسی اُستاد کی طرف متوجہ ہونا چاہا۔ ڈاکٹر بوڈن کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے "ٹائمس" اخبار پڑھ رہے تھے۔

ان کا قد چھوٹا ہے۔ عینک لگاتے ہیں۔ میرے مذاق کے مطابق وہ اس کام کے لئے بہترین شخص معلوم ہوئے۔ میں ان کے پاس گیا اور اپنے سوال کے عجیب اور بے محل ہونے کی معافی مانگتے ہوئے دریافت کیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تعجب کی بات ہے نعش کا چہرہ سرخی مائل کیسے ہوگیا۔

"ہرگز نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔ ڈاکٹری اصول سے قطعی ناممکن ہے۔ چہرہ کا رنگ جسم کے مختلف حصوں میں خون تقسیم ہوجانے سے کچھ متغیر ضرور ہوسکتا ہے۔ لیکن سرخی مائل کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ مسٹر فش کسی نے آپ کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔

مجھے پیگیٹ کی فطرت سے خوب واقفیت تھی۔ وہ بالکل خشک مزاج شخص ہے۔ معمولی ریلوے ٹائم ٹیبل بھی پیگیٹ کی رفاقت سے زیادہ دلچسپ ہوسکتا ہے۔ اس کو ایسا مذاق خواب میں بھی نہ سوجھتا

البتہ یہ ممکن تھا کسی دوسرے نے اُس کو بنانے کے لئے ایسا کیا ہو۔ یہ خیال بھی بے بنیاد نظر آیا۔ اب کوئی حل عقل میں نہ آنے سے خفقانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ طبیعت کو دوسری طرف رجوع کرنے کی غرض سے اخبار میں جو سب سے پہلا اشتہاری معمہ نظر آیا اُسکو حل کرنے لگا۔ اور پیگٹ والا معاملہ طاقِ نسیاں پر رکھدیا۔

اخبارات کے اشتہاری کالم میں جو مضامین معموں کی شکل میں شائع ہوتے ہیں ذراسی مشق والا بھی اُن کو آسانی سے حل کر سکتا ہے کوئی دقیق چیستاں عموماً نہیں ہوا کرتی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ کوئی کامل ماہر فن تو اس مشورہ میں شریک ہوتا نہیں ہے۔ ہر اشتہار دینے والا حسب ضرورت بغیر کسی اصول کے طبع آزمائی کر لیتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کوئی غیر آشنا نہ سمجھے گا۔ مگر سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں۔ بیشتر اس قسم کے اشتہارات عشقیہ مضامین اور مقاصد کے ہوا کرتے ہیں سنجیدہ مزاج اس خرافات سے کچھ محظوظ نہیں ہوتے۔ دس منٹ میں اشتہاری معمہ میں نے حل کر لیا۔ وَھُوَ ھٰذَا

ایچ۔ ایل سے ایک ہزار مل گئے۔ اب گلچھرے ہیں۔ ایک ہفتہ کا نوٹس دے کر غیر مستحق کے پاس پہونچو۔ بمقام مارڈیل بوائز دلڑکے، ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعلان کرنے والے کو ایک ہزار پونڈ ملے ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اپنی نوکری چھوڑ دے۔ نوٹس کی مدت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کی ادنیٰ ملازمت ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ نوکری چھوڑ کر مارڈیل کے غیر مستحق کے پاس آجائے۔ جو غالباً اعلان کنندہ ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ "بوائز (لڑکے) ایسے ہی بائیسکل پر چڑھیں"۔ اس سے کیا مراد ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور میں نے نکرا اپنے دوست پیگٹ کی داستان پر غور کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں مجھے اُمید کی کچھ موہوم جھلک نظر آئی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ پیگٹ سے ٹیلیفون پر کس نے بات کی تھی۔ لیکن اتنی اُمید ضرور نظر آتی کہ میں اس آدمی کو دریافت کر سکوں گا۔ جس نے دھوکے میں پیگٹ سے ٹیلیفون ملایا گیا تھا۔

پیگٹ کے ٹیلیفون کا نمبر ۹۰۴۰۱ ہے۔ انگریزی میں نو اور پانچ قریب المخرج میں ممکن ہے اسیخ (مرکز) کی غلطی سے ۵۰۴۰۱ کے بجائے ۹۰۴۰۱ کو ملا دیا گیا ہو میں نے اس انکشاف سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور ۵۰۴۰۱ نمبر کو ٹیلیفون کیا اور ایک کاروباری آدمی بنکر باتیں شروع کیں۔

آپ نے جو چیزیں طلب فرمائی تھیں آج صبح سب روانہ کر دی گئیں پہونچی ہوں گی۔

ایک سست آواز نے دریافت کیا۔ "کون بول رہا ہے"۔

میں نے جلدی سے پہلی دکان جو ذہن میں آئی اُس کا نام لیکر کہا "لیسنگ کمپنی وکٹوریا اسٹریٹ"

جواب ملا۔ "ہمیں تو کوئی ایسا آرڈر دینا یاد نہیں"۔

"درست مجھے کس سے کلام کرنے کا فخر حاصل ہوا"۔

"مسٹر ہومز لاریوال مرحوم کا میں سکرٹری ہوں"۔

ہاں ؟ معاف کیجئے غالباً نمبر غلط ہو گیا۔ آپ کو بیکار تکلیف ہوتی"۔

ٹیلیفون کو میں نے رکھدیا۔ ٹیلیفون کی کتاب سے پتہ چلا کہ یہ نمبر ہومز لاریوال کے مکان مسکونہ کا ہے۔ دفتر کا نمبر یہ نہیں ہے۔

مجھ کو اس شخص کا حال معلوم تھا۔ تین دن قبل اس کا انتقال ہوا تھا۔ اخبار میں وفات شائع ہوئی تھی۔ ایک کروڑپتی آدمی تھا۔ آسٹریلیا کا باشندہ تھا۔ اس ملک میں تقریباً بیس سال سے مقیم تھا۔ اعلان وفات میں یہ فقرہ بھی تھا۔ "خانگی معاملات میں بہت نرم دل تھا۔ مگر کاروباری زندگی میں بہت سخت" یہ فقرہ خاص طور پر قابل توجہ تھا۔ ہومز لاریوال اپنے گھر پر مرا تھا۔ چہرہ کے رنگ کا پیام اس کے گھر سے دیا جا سکتا تھا۔ نہ کہ برعکس اس کے گھر کو یہ خبر پہونچائی گئی۔ اس گتھی نے مجھے سخت پریشان کیا۔ گویا ایک مشکل سے نکل کر دوسری مشکل میں جا پھنسا۔ جب ہومز لاریوال کے نام پر غور کیا تو خیال ہوا کہ اشتہاری معمہ بھی اسی سے متعلق نہ ہو۔ کیونکہ اشتہار میں ایچ۔ ایل۔ دو حرف موجود تھے۔ جو ہومز لاریوال کے انی شیل (ابتدائی حروف) ہو سکتے تھے۔ ہزار اشرفی (پونڈ) کی وصیت ہوگی۔ لیکن وصیت کرنے والے کی موت کے بعد معاً دوسرے ہی روز کوئی وصیت شائع نہیں کی جاتی۔ غیر مستحق ز ( ) کا ترجمہ ہے اور یہ انگریزی لفظ آسٹریلیا میں مخصوص طور پر مستعمل ہے۔ شاید وصیت پانے والا اعلان کنندہ آسٹریلیا کا باشندہ ہو۔ اور مرحوم کا دوست۔ میں نے نقشہ اُٹھا کر دیکھا۔ "مارڈیل" کسی شہر کا نام نہ تھا۔ البتہ لندن سے بیس میل پر "مارڈیل بوائز" ایک قصبہ ملا۔ اب تو سراغ چل نکلا۔ معمہ میں نے صحیح حل نہیں کیا تھا۔ "بمقام مارڈیل" نہیں بلکہ "بمقام مارڈیل بوائز" بلا یا تھا۔ اب دوسرا فقرہ "ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔ لڑکوں سے متعلق نہ رہا بلکہ بجائے خود حل طلب ہو گیا۔

میں نے مارڈیل بوائز جانے کا تہیہ کر لیا۔ تاکہ مزید تحقیقات

کرسکوں۔ فوراً کھانا کھا کر روانہ ہوگیا۔ اور سہ پہر کو تین بجے کے قریب مارڈیل بوائز پہونچ گیا۔ میں وہاں کے مکانوں کے دلال سے ملا۔ کیونکہ ان لوگوں کے پاس طرح طرح کی خبریں ہمیشہ رہا کرتی ہیں اور وہ ان خبروں کی اشاعت کو بھی پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی گاہک ملجائے تو پھر بہت خوشی سے وہ ہر بات بتلانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میں نے دلال کو اپنا نام سی۔ این۔ ایم بکلے بتلایا۔ اور یہ کہا کہ مجھے مکان خریدنے کی خواہش ہے۔ ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ مع پائیں باغ کے ہونا چاہیئے۔ جس کے دام بارہ ہزار سے زیادہ نہ ہوں۔ یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اور اس میں اگر کچھ بھی سچ بات تھی تو وہ یہ تھی کہ میں بارہ ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا تھا۔

اس معاملہ کے متعلق میں نے بہت مفصل گفتگو کی۔ مجھے دوسرے معاملات کے بارہ میں بھی دریافت کرنا تھا۔

میں نے کہا "کہئے گرجے میں عبادت بہت زیادہ مذہبی دستورالعمل کے موافق تو نہیں ہوتی ؟ یہاں کے لوگ سوشل نقطۂ نظر سے کیسے ہیں میں نے ایک آسٹریلین کا ذکر سنا ہے۔ جو حال ہی میں یہاں آکر قیام پزیر ہوا ہے۔ کیا نام ہے اُس کا۔ اس وقت ذہن میں نہیں آتا۔۔"

دلال نے بہت غور کرنے کے بعد کہا "کسی آسٹریلین کے درود کا تو مجھے علم نہیں ہے"۔ گرچہ یہ جواب یاس آمیز تھا مگر اُس نے فوراً ہی کہا "یہاں کئی شخص مالدار ہیں۔ جن کے پاس موٹریں وغیرہ بھی ہیں"۔

میں نے ذرا سنبھلکر پھر پوچھا "یہاں کا ڈاکٹر تو قابل اطمینان ہے"۔ ایجنٹ نے کہا "جی ہاں ڈاکٹر کاج ڈیل کی لیاقت میں کوئی شک نہیں اُنھوں نے عرصہ تک میرا اور میرے خاندان کا علاج کیا ہے"۔

میں نے کہا "اگر کوئی دوسرا ڈاکٹر یہاں پریکٹس کرے تو اس کا کام کچھ چلتا ہوا رہے گا یا نہیں"۔

ایجنٹ "میں کہنا بھول گیا تھا۔ یہاں ایک اور ڈاکٹر بھی ہیں جو غیر مستحق کے طور پر کام کرتے ہیں۔ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ مگر کام کچھ اچھا نہیں چلتا"۔

"غیر مستحق" کے لفظ پر میں چونک پڑا (میرے کان کھڑے ہوئے) میں نے کہا "غیر مستحق کے کیا معنی!"

جناب یہ لفظ میں نے ڈاکٹر کاج ڈیل سے سنا ہے۔ یہ ایک ڈاکٹری اصطلاح ہے۔ غیر مستحق اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے ڈاکٹر کی پریکٹس کا جائز وارث نہ ہو۔ اور بغیر استحقاق کے کسی ڈاکٹر کے پریکٹس خریدے ہوئے بغیر کسی مقام پر کام شروع کر دے۔

میں نے کہا "اچھا یہ بات ہے"

اب دلال سے زیادہ بات چیت بیکار تھی۔ مجھکو سیدھا راستہ مل گیا تھا۔ مارڈیل بوائز کے غیر مستحق ڈاکٹر آربرٹ تھے۔ لہذا مجھکو اُن سے ملنا چاہیئے۔

وہ ایک چھوٹے سے نئے بنے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ مکان خوب صاف ستھرا تھا۔ لیکن سامان آرائش کچھ بہت امیرانہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش اخلاق معلوم ہوتے تھے۔ عمر تخمیناً ۲۶ سال ہوگی۔ ان کے اپنے پیشے کا کوئی خاص وقار چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اپنا نام اُن کو بھی سی۔ این۔ ایم۔ بکلے تبلایا۔ اور اپنے آنے کی غایت یہ ظاہر کی کہ چونکہ وہ اس قرب وجوار میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے لہذا اُن سے وہاں کی سنیٹری حالت دریافت کرنا منظور تھا۔ جس کے متعلق ایک ڈاکٹر کا بیان بہ نسبت دلال کے زیادہ معتبر ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں نہایت خوشی سے کل حالات عرض کروں گا"۔ پانی اور نالیوں کی صفائی کا حال بہت تفصیل وار بیان کرتے رہے۔ میں بھی بغور تمام سنتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ اصرار کے بعد فیس قبول فرمائی جو میں نے نذر کی تھی۔ یہ بھی فرمایا کہ کسی معاوضے کے لالچ سے وہ متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب اگر آپ ایسا ہی کریں گے تو کبھی اپنے مرحوم دوست ہومز لاریوال کے مثل کروڑپتی نہ ہو سکیں گے"!

نوجوان ڈاکٹر نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ اور کہا "ہومز لاریوال اور میرا دوست ؟ میں تو اس کو اپنا دشمن خیال کرتا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے اس کا علاج ضرور کیا ہے"۔

"ہاں بیشک ڈاکٹری حیثیت سے میں ایک بار اس کے پاس ضرور گیا۔ مگر اس وقت جبکہ وہ مرچکا تھا"۔

اس مرتبہ میں نے تعجب سے دیکھا اور کہا "جناب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔

"جی ہاں۔ یہ بات ذرا تعجب انگیز ضرور ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے۔ کل میں نے بحیثیت ڈاکٹر ہومز لاریوال کو دیکھا۔ اور وہ ایک روز قبل مرچکا تھا"۔

جب ڈاکٹر نے مزید روشنی اس معاملہ پر ڈالنے سے گریز کیا تو میں نے سلسلۂ کلام کو بڑھا کر کہا "اگرچہ میں اجنبی ہوں۔ تاہم میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اپنے مردہ مریض سے آپ کو ایک ہزار کی رقم وصیتاً خوب ملی"۔

ڈاکٹر نے کہا: "آپ کا شکریہ" مگر چہرہ سے کچھ تکدر کے آثار نمودار ہوئے اور اپنے کلام کو اس طور پر ختم کیا: "غالباً آپ نے میرے اور ہومز لاریوال کے تعلقات کا بازار کی گپ سے اندازہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو مرکز کا حال کس طرح معلوم ہوا۔ ہومز لاریوال کے وکیل نے ضرور مجھکو باضابطہ اطلاع دی۔ لیکن میں نے کسی سے اس کا اب تک تذکرہ نہیں کیا۔"

میں نے کہا: "معاف کیجئے۔ صبح کے اخبار میں آپ کا اشتہار شائع ہوا ہے۔"

"لیکن وہ اعلان معمہ کی صورت میں ہے۔ اور واقف کار کے علاوہ میرا خیال تھا کوئی اُس کو نہیں سمجھ سکتا۔"

میں نے کہا: "جس کسی نے اعلانی معموں کو حل کرنے کی ذرا سی بھی مہارت پیدا کی ہوگی اس کے سامنے آپ کا اعلان بچوں کے معموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

ڈاکٹر نے کہا: "خیر کچھ بھی ہو۔ آپ کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے میں نے اپنی بیوی کو پرائیویٹ پیغام بھیجا ہے۔"

میں نے کہا: "حضرت یہ سچ ہے۔ مجھکو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اور دراصل میرا کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی بیوی کو پرائیویٹ پیغام ہی بھیجنا منظور تھا تو ڈاک کے ذریعہ سے آسان، ارزاں ہوتا اور راز کا اعلان بھی نہ ہوتا۔"

ڈاکٹر: "ارے صاحب میری کوئی مصلحت ہوگی۔ آپ کو اس تفتیش سے کیا غرض۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ اب تکرار کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔ مثلاً ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا: "اور میں آپ کو بتاؤں گا بھی نہیں"۔

میں نے کہا: "مجھکو یہ بھی نہیں معلوم کہ نعش کا چہرہ سرخی مائل کیوں ہوگیا۔"

ڈاکٹر: "یہ تو میرے اعلان میں نہیں تھا۔ آپ کو ہر بات کس طرح معلوم ہوگئی۔ خیر اس کا یقین رکھئے۔ مجھ سے آپ مزید حالات معلوم نہیں کرسکتے۔ کیا میں عرض کرسکتا ہوں کہ آپ کو ریل سے واپس جانا ہے۔ اور وقت قریب ہے۔"

یہ ڈاکٹر کی انتہائی بداخلاقی تھی۔ میں نے ایک اور تدبیر سوچی۔ اور کہا: "خیر ڈاکٹر صاحب خدا حافظ۔ میں آپ کے پاس اپنی چھوٹی کتاب ضرور بھیجوں گا۔ جو میں نے اخبارات کے معموں پر لکھی ہے۔ ابھی وہ زیر طبع ہے۔ اس کو آپ اپنے معمہ کے صلہ میں نذر سمجھئے گا۔"

یہ فقرہ کارگر ہوا۔ واپسی سے قبل مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ڈاکٹر کا معمہ میری کتاب میں شائع نہ ہوگا۔ اگرچہ ایسی کتاب کے لکھنے کا میرا قطعی قصد نہ تھا اور ڈاکٹر ازبرائے نے مجھ کو ہر بات مفصل طور پر بتلادی۔ تمام حال معلوم ہونے پر میں اپنے آپ کو اس وجہ سے نفریں کرنے لگا کہ معاملہ نہایت صاف تھا۔ اور اس کا حل بالکل آسان ہونے کے باوجود مجھے اِدھر اُدھر پوچھتے پھرنا پڑا۔

چھ بجے میں لندن پہنچا۔ کپڑے بدلکر کھانے کے وقت کلب جا پہنچا۔ تجربہ کار پیگیٹ ڈاکٹر بوڈن سے سلطنت کی آئندہ حالت پر بحث کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں حالات کچھ زیادہ اُمید افزا نہ تھے۔

مجھے دیکھکر پیگیٹ نے کہا: "ہم دونوں یہاں کھائیں گے۔ تم بھی شریک ہوجاؤ۔" میں نے کہا: "ضرور اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا۔"

کھانے کے درمیان پیگیٹ نے صبح کے واقعہ کا تذکرہ کیا۔ اور بوڈن کو مخاطب کرکے کہا "فش کو دنیا بھر کے معاملات میں خواہ مخواہ دلچسپی لینے کا مرض ہے لیکن آج صبح میں نے ان کی ساری شیخی کرکری کردی۔ واقعہ بھی عجیب تھا۔ فش کو بھی ماننا پڑا کہ تحقیقات ناممکن ہے۔"

اس کے بعد پیگیٹ نے بوڈن کو سارا حال سنا دیا۔ میں نے کہا: "ارے میاں وہ تو ذرا سا ہی غور کرنے پر بالکل کھل گیا۔ میں نے پوری تحقیقات کرلی ہے۔ مگر بوڈن نے غلط راستہ پر لگانا چاہا تھا۔"

بوڈن نے جلدی سے عینک لگائی اور بولے

"یہ کیسے؟"

"آپ نے کہا تھا نعش کا چہرہ سرخی مائل نہیں کیا جاسکتا۔"

بوڈن: "میں نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا نعش کا چہرہ خودبخود سرخی مائل نہیں ہوسکتا۔ اور یہی تم نے اس وقت دریافت کیا تھا۔ اب تم بالکل دوسری بات کہتے ہو۔ اُس وقت قدرتی اصول کا تذکرہ تھا اور اب مصنوعی ترکیب کا بیان کر رہے ہو۔ میں اب بھی کہتا ہوں چہرہ خودبخود ہرگز سرخی مائل نہیں ہوسکتا۔ لیکن رنگا کیوں نہیں جاسکتا۔ اس سے انکار کیسے ہوسکتا ہے۔ خود مجھ سے نعش کا چہرہ رنگنے کی فرمائش ہوچکی ہے۔ میں نے یہ کام منظور نہیں کیا۔"

پیگیٹ نے کہا: "بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ برہم ہونے کی کیا بات ہے۔ پہلے سب حال تو سن لو۔ ہاں فش تو پھر کیا معلوم ہوا۔"

میں نے کہا: "کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادہ واقعہ ہے۔ ممکن ہے سننے کے بعد سب دلچسپی ختم ہوجائے۔ سنئے۔

ڈیڑھ سال ہوا ڈاکٹر آر برایٹ جو مارڈیل بوائز میں ایک سنئے ڈاکٹر کی حیثیت سے آکر بسے ہیں وہ صبح کے وقت سائیکل پر جا رہے تھے۔ ایک موٹر پر ایک دوسرا سائیکل سوار جو غلط ہاتھ پر سائیکل چلا رہا تھا ڈاکٹر سے بھڑ گیا۔ ڈاکٹر کا ہاتھ زخمی ہوا۔ اور سائیکل بری طرح ٹوٹ گئی۔ دوسرا سائیکل سوار جو اتفاق سے آسٹریلیا کا کروڑپتی ہومزلاریوال تھا وہ بچ گیا۔

"ڈاکٹر نے ہرجہ طلب کیا۔ ہومزلاریوال نے صاف جواب دیدیا کہ میں کچھ نہیں دوں گا۔ میں غلط ہاتھ پر ضرور تھا۔ لیکن ڈاکٹر کا بھی قصور ہے۔ ڈاکٹر نے گھنٹی نہیں بجائی۔ اگر مقدمہ چلاؤ گے تو میں بھی جوابدہی کروں گا۔ اور تم بیکار زیر بار ہوگے۔ ملیگا کچھ نہیں"۔

ڈاکٹر غریب آدمی ہے۔ ابھی چند روز سے مارڈیل بوائز میں مطب کرتا ہے۔ چند روز ہوئے شادی بھی کر لی ہے۔ کروڑپتی کے مقابلہ میں مقدمہ بازی کی ہمت نہ ہوئی۔ بائیسکل کو رو بیٹھا۔ دعویٰ نہیں کیا۔ درحقیقت بیچارہ مجبور تھا۔ دوسری سائیکل خریدنے کی مقدرت بھی نہ تھی۔ حالت یہ ہے کہ اس کی بیوی تک کو نوکری کی وجہ سے ادھر اُدھر مارا مارا پھرنا پڑتا ہے تین دن ہوئے ہومزلاریوال کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد ہومز کا وکیل فوراً مارڈیل بوائز گیا۔ ڈاکٹر آر برایٹ سے ملا اور کہا "ہومزلاریوال اپنے وطن (آسٹریلیا) میں دفن کیا جائے گا۔ لہٰذا اس کی نعش کو مصالحہ لگا کر محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور مرحوم نے وصیت کی ہے کہ ڈاکٹر آر برایٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ یہ کام کر دیں۔ اور وصیت نامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وصیت کنندہ کو توقع ہے کہ ڈاکٹر آر برایٹ اس کے جسم کو اب محفوظ کر دینے میں اتنی ہی محنت کریں گے جس قدر ایک بار اس کو بدنما کر دینے کی کر چکے ہیں۔

پہلے تو ڈاکٹر کا ارادہ ہوا کہ انکار کر دے۔ پھر خیال کیا کہ ڈاکٹری ویسے ہی نہیں چلتی۔ اگر ہر کام سے انکار کیا جائے گا تو کام کیسے چلے گا۔ اور معقول معاوضے کی اُمید بھی تھی۔ لہٰذا منظور کر لیا۔ اب سنئے معقول معاوضے کا حال۔ ہومزلاریوال ایک ہزار اشرفی کا ترکہ ڈاکٹر آر برایٹ کے نام وصیت میں بمعاوضہ تحفظ نعشی لکھ گیا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ ترکے کا مال ڈاکٹر کو قبل اس کے جواب کے نہ بتایا جائے۔ جب کام کرنا منظور یا نامنظور کر چکے۔ اس کے بعد بتایا جائے۔ ڈاکٹر نے خوش نصیبی سے منظور کر لیا اور ترکہ پایا ورنہ محروم رہ جاتا۔

دوسرے روز علی الصباح ڈاکٹر آر برایٹ لندن پہونچ گیا۔ نعش کو ایمبام د   ) یعنی مصالحہ لگا کر محفوظ کرنے کی غرض سے ایک تجہیز و تکفین کرنے والے کارخانہ میں پہونچا دیا گیا۔ وہاں سب کام سرانجام ہو گیا۔ کیوں بوڈن اب آج کل تو اس کا عام رواج ہو گیا ہے"۔

بوڈن ۔ ہاں۔ ہاں۔ جسم کی کسی رگ میں پچکاری سے ایک عرق بھر دیتے ہیں۔ عرق رنگین ہوتا ہے۔ جس کا چہرہ پر وہی اثر ہوتا ہے جو تم دریافت کر رہے تھے۔

پیگٹ: "میرے خیال میں ابھی عام طور پر رواج نہیں ہوا ہے"۔

بوڈن: "ہو گیا ہے۔ کفن دفن کا انتظام کرنے والے بڑے بڑے کارخانہ دار ایک ایمبام کرنے والا بھی رکھتے ہیں"۔

میں نے کہا: "واقعہ کا بقیہ حصہ زیادہ تشریح کا محتاج نہیں ہے۔

ہومزلاری وال کی بیوہ کو تردد تھا کہ نعش کا چہرہ زیادہ متغیر نہ ہو جائے۔ وہ سکریٹری سے استفسار کر رہی تھی۔ سکریٹری سالیسٹر دو کلاء کے دفتر سے دریافت کر رہا تھا۔ دفتر والے ڈاکٹر سے باتیں کر رہے تھے۔ محض اتفاق تھا کہ پیگٹ کا ٹیلیفون ڈاکٹر کے ٹیلیفون سے ملا دیا گیا۔ جس کا نمبر ۱۴۰۹ ہے اور وہ جواب جو ڈاکٹر نے ۴۰۵ ا نمبر پر سکریٹری کو دینا چاہا تھا۔ پیگٹ نے سنا"۔

میں نے اپنے دوستوں سے ڈاکٹر آر برایٹ کے اشتہاری معمہ کا کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ جس کو سنکر وہ میری تفتیش کی تہ کو پہونچتے۔ اور معاملہ کی پیچیدگی بالکل کالعدم ہو جاتی اور اُسی کے ساتھ میری محققانہ قابلیت بھی ڈاکٹر بوڈن بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ میں اس معمہ کی جڑ تک کیونکر پہونچا۔ اور یہی میری مزید مسرت کا باعث ہے۔

اب اشتہاری معمہ کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہے۔ ڈاکٹر آر برایٹ کی بیوی ایک لیڈی کی بطور خواص کے ملازمہ تھی۔ وہ لیڈی کچھ عجیب مزاج کی تھی۔ اس کا محل ایک پہاڑی پر تھا۔ جس کے قریب کوئی آبادی چھ میل سے کم فاصلہ پر نہ تھی۔ لیڈی نے ریلوے کے محکمہ اور ایک سائیکل والے لڑکے سے یہ انتظام کر لیا تھا کہ صبح ناشتے سے قبل لندن کی اخباری ڈاک اُن کو روزانہ ملجاتی تھی۔ اور معمولی ڈاک اس کے تین گھنٹے بعد پہونچتی اور وہ بھی دن میں صرف ایک مرتبہ۔ لہٰذا اخبار کے ذریعے سے آر برایٹ کی بیوی کو خوشخبری جلد سے جلد مل سکتی تھی یہ وجہ تھی اخباری اشتہاری معمہ کی۔ تار کی خبر بھی پہونچ سکتی تھی۔ لیکن اول تو راز فاش ہو جاتا۔ لیڈی صاحبہ کی عادت تھی تار ضرور پڑھ لیتیں۔ خواہ کسی کے نام ہو اس کی اُجرت بھی جو تار گھر سے محل تک بوجہ فاصلے کے لازم تھی وہ خود ہی دیا کرتی تھیں۔ لیکن بعد کو یہ بار ضرور ناگوار ہوتا۔ اور ڈاکٹر کی بیوی پر غبار جھاڑتیں۔ یہ سب مصلحتیں آر برایٹ کے ذہن میں تھیں کہ بیوی کو جلد سے جلد علم ہو جائے۔ کوئی غیر نہ سمجھ سکے۔ اور لیڈی کی لاعلمی میں وہ نوٹس دیکر مستعفی ہو اور شوہر سے آملے۔ "ہاں ایسے ہی سائیکل پر پھر چڑھ ہیں" اس فقرہ کا لطف ظاہر ہے۔ یعنی پھر خدا کرے کوئی کروڑپتی ٹکر کھائے اور وصیت میں ایک ہزار اشرفی لکھے۔ (شمشیر صمدی)

نفسِ انسانی کی حقیقت

اور

توجّہ کی ماہیت

نفس انسانی کی حقیقت نہ کوئی آج تک بتا سکا نہ آئندہ اُمید ہے کہ کوئی اس سوال کا یقینی جواب دیسکے۔ البتہ نفس کے افعال کا مطالعہ کرکے کچھ نہ کچھ ہم کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی چیز کا تصور کرتے وقت ان قوتوں سے کام لے سکتے ہیں۔ اِدراک۔ احساس۔ ارادہ۔ یہی چیزیں نفس انسانی کی بمنزلہ اجزاء کے ہیں۔ اور انھیں کا ہر امر میں وجود ہوتا ہے۔ کوئی کام کرتے وقت یہ ضروری نہیں کہ ان اجزاء میں تناسب بھی پایا جائے۔ بلکہ یہ اجزاء مختلف اوقات میں کم وزیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

مثلاً
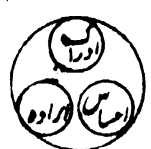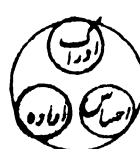
مگر ان تینوں کا وجود ضرور ہوتا ہے۔ اور آپس میں تعلق بھی ضرور رکھتے ہیں۔

کسی علمی تحقیق یا دقیق کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اِدراک زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور ارادہ و احساس کم۔ طرب افزا یا راحت انگیز واقعہ دیکھکر احساس زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ دونوں کم۔ یہ دائرے متناسب ہوں تو بیکاری ہوتی ہے۔ یعنی بیکاری و فراغت کے وقت یہ تینوں برابر ہوتے ہیں۔ ورنہ مختلف۔

ایک انگریز عالم نے نفس کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ وجوہ تشبیہ یہ ہیں۔

۱ روانی۔ ۲ کمی وزیادتی۔ ۳ تسلسل یعنی جزر و مد۔ یعنی جس طرح کسی پل پر چڑھکر دریا کے منبع سے مدخل تک کی تمام کیفیت مسلسل اور برابر معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک صحیح الدماغ انسان کی ایک مسلسل کیفیت اور لگاتار حالت دکھائی دیتی ہے۔

۴ دریا کا پانی ایک جگہ سے چڑھکر پھر وہاں نہیں آتا۔ اسی طرح ایک وقت کی دماغی کیفیت یا رابطہ دوسرے وقت پیدا نہیں ہوتا۔

۵ دریا پہاڑوں میں پیدا ہوتے وقت ابتداءً بہت کمزور ہوتا ہے اسی طرح نفس انسانی پیدائش کے وقت بہت کمزور ہوتا ہے۔ آئندہ وسعت بڑھ جاتی ہے۔

۶ دریا کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی طرح نفس انسانی کے جذبات و خیالات کو بھی روکنے والا نہیں۔

۷ دریا کی طرح سُرعت و بطوء دماغ میں بھی پایا جاتا ہے۔

۸ پانی ہمیں سطحی طور پر ایک جیسا نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقۃً اس کے اجزاء ترکیبی بدلتے رہتے ہیں۔ دماغی کیفیات بھی اگرچہ بظاہر اُنھیں تینوں اجزاء کا مجموعہ رہتی ہیں۔ لیکن لحظہ بلحظہ بدلتی رہتی ہیں۔

الغرض ہماری شعوری رو کی سطح ہموار نہیں رہتی بلکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی موج (خیال) اس کو مضطرب رکھتی ہے۔ اگر کوئی فکر نہ ہو بلکہ سوتے وقت ہر قسم کے خیالات کو دل سے نکال دیا جائے۔ تب بھی اس کی سطح ہموار نہ ہوگی۔ بلکہ بمنزلہ ہموار ہوگی۔ اسی طرح [سست دماغ] پر اگر کوئی پرتاثیر جذبہ کام کررہا ہو تو اُس کی یہ حالت ہوجاتی [چست دماغ] ہے

توجہ۔ کسی ایک چیز پر ذہنی قوت کا جمع ہوجانا توجہ کہلاتا ہے۔ اگر خیال ہو کہ توجہ کے وقت ایک ہی چیز کا تصور رکھتے ہیں اور دیر تک اُس پر ذہن جمائے رکھتے ہیں تو یہ درست نہیں اُس کے متعلقات کا ضرور خیال آتا ہے۔ مثلاً ایک بادل پر توجہ کرتے ہوئے اُس کا رنگ۔ سائز۔ برسا ہوا یا بے برسا ہوا ضرور ذہن میں ہوتا ہے۔ جب تک ذہن اُس کے متعلقات کو سوچ رہا ہے۔ اُس وقت تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ متوجہ ہے۔

مثلاً [متوجہ۔ منتشر] اس طرح

توجہ کا اثر۔ جس چیز پر اپنی توجہ کو مرتکز کردیں وہ چیز اچھی طرح ذہن نشین اور واضح ہوجاتی۔ مثلاً دوران جنگ میں اگر کوئی سپاہی گم ہوجائے تو سرچ لائٹ سے اُسے دیکھ لیتے ہیں۔ غنیم کا کیمپ کہاں ہے۔ یہ چیزیں اس آلہ کی مدد سے صاف دکھلائی دے جاتی ہیں اسکو بھی ایک قسم کا سرچ لائٹ سمجھئے جس سے کسی خاص امر کی پوری تفصیل معلوم ہوجاتی ہے۔ جس شخص میں توجہ کی قوت زیادہ ہوگی اُسکا ذہن دماغ بھی زیادہ مضبوط ہوگا۔ دنیا کے غیر معمولی دماغ مسلسل محنت کا نتیجہ ہیں ایسی بہت سی مثالیں صفحۂ عالم میں ملتی ہیں۔ جو پیہم محنت کے طفیل ادنیٰ سے اعلیٰ بن گئے۔

"وکٹر ہیوگو"

از سید تمکین الکاظمی

۱۸۰۲ء

"وکٹر ہیوگو" ۲۶ فروری ۱۹۰۲ء کو شہر بزانسون میں پیدا ہوا، اسکے باپ کا نام کونٹ جوزف ہیگو اور ماں کا سوفتی تره بوشہ تھا، وکٹر کے دو بھائی تھے۔ بڑے کا نام آبل۔ اور چھوٹے کا اوژن تھا۔ بڑا ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوا تھا اور چھوٹا ۱۸۰۰ء میں۔ مگر وکٹر ہیوگو نے اسقدر شہرت حاصل کی کہ لوگوں نے اس کے ان دونوں بھائیوں کو بھلا دیا۔

ہیوگو کا مختصر خاندان ۱۸۱۱ء میں اطالیہ کی مختصر سیاحت اور پارس کے قیام کے بعد اسپین میں منتقل ہوگیا۔ انہیں دنوں جوزف بوناپارٹ حکومت اسپین پر قابض ہوگیا تو کونٹ جوزف ہیوگو بھی جنرل ہوگیا۔
۱۸۱۲ء میں میڈم ہیوگو نے اوژن اور ہیوگو کو ساتھ لیکر پیرس کو مراجعت کی اور دونوں لڑکوں کو دار الاقامہ کردیہ میں داخل کرا دیا۔ تاکہ وہاں تعلیم پاکر دار الفنون (یونیورسٹی) کی شرکت کے قابل ہو جائیں، چونکہ وکٹر ہیوگو کو ادبیات سے بہت دلچسپی تھی اس لئے اس نے ۱۸۱۸ء میں غزلیات قصائد اور ڈراموں کا ایک دفتر سنبھال کر دار الاقامہ کو خیرباد کہدیا۔
۱۸۲۲ء میں اُس نے اپنے بعض قصائد و ترجیع بند جو بوربونی بادشاہوں کی مدح میں تھے شائع کئے، اور اسی کے صلے میں لوئی ہیجدہم نے سالانہ ایک ہزار فرانک کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اسی طرح وکٹر ہیوگو اس قابل ہوگیا کہ اپنی منسوبہ مادموازیل "آدل" سے شادی کرسکے۔

۱۸۲۱ء کو ۲۷ فروری کی رات میں میڈم ہیوگو نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ اور ہیوگو کو آتش فرقت میں جلنے کے لئے چھوڑ گئی۔
۱۸۲۳ء میں لوئی ہیجدہم نے سابق وظیفے میں ایک ہزار فرانک سالانہ اضافہ منظور کیا۔ اسی سال وکٹر ہیوگو نے اپنا سب سے پہلا ناول "ہان دیسلاند" شائع کیا اور ۱۸۲۴ء میں "قصائد اور ترجیعات" کا بقیہ حصہ بھی شائع کر دیا۔

ہان دیسلاند بالکل جدید اصول پر لکھا گیا تھا اور اس میں رائجہ اصول و قواعد ادب کی پابندی نہیں کی گئی تھی اس لئے ادیبوں اور انشاپردازوں کے حلقے میں ایک طوفان پیدا ہوگیا۔ اور وہ لوگ برافروختہ ہوگئے۔ ۱۸۲۶ء میں قصائد و ترجیعات کا اور ایک حصہ شائع ہوا اور اس کے دیباچے میں وکٹر ہیوگو نے مروجہ نظم و نثر کے اصول و قواعد پر سخت تنقید بھی کی۔

ہیوگو کا عقیدہ یہ تھا کہ ادبیات کو آزاد ہونا چاہئے۔ قدماء کی تقلید مطلق نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے مخالفین چاہتے تھے کہ قدماء کے قدم بقدم چلیں اور ہر چیز میں ان کی تتبع اور تقلید کرتے جائیں۔
اس عقیدے کے لوگ "کلاسیک" کے نام سے مشہور ہوگئے اور اپنے مخالفین کو دیوانے جاہل وغیرہ کہنے لگے۔ اور ان کی امکانی مخالفت شروع کر دی۔ ہیوگو کے خیال کو "رومانٹیسم" اور اس کے پیرووں کو "رومانٹیک" کہنے لگے۔ اور آخر الذکر طبقہ قابل رحم جاہل سمجھا جانے لگا۔ وکٹر ہیوگو سے پہلے بھی رومانٹیسم موجود تھا جرمنی میں گوتھے، شیلر، و لی نیک اور انگلستان میں شکسپیر اور بائرن اور فرانس میں خود لامارتین اور شاتوبریان اسی قبیل کے تھے۔ مگر انہوں نے اس کو ترویج دینے کی فکر نہیں کی اور ہیوگو نے کھلے بندوں اسے رائج کرنا چاہا، اور بلا کسی خوف کے اشاعت شروع کر دی اسی لئے مخالفین نے اُسے "رومانٹیسم" کا موجد قرار دیدیا۔
۱۸۲۷ء میں وکٹر ہیوگو نے "کرامول" لکھی اور اس کے مقدمے میں اپنی نگارش کی خوب تعریف کی، ۱۸۲۸ء کے آخر میں "قصائد اور ترجیعات" کا آخری حصہ شائع کیا اور ایک سال کے بعد دیوان "شرقیات" اور "آخرین روز یک محکوم" لکھا۔ آخر الذکر کتاب میں اس نے قانون اور قواعد پر جی کھول کر تنقید کی ہے اور خوب برائیاں بھی کیں ہیں۔
۱۸۳۰ء میں ڈرامہ "ارنانی" اور اس کے ایک سال بعد "ماریوں دولرم" لکھکر اسٹیج کرا دیا۔ اسی سال مشہور تصنیف "نتر ڈم ڈ و پارس" شروع کیا اور ۱۸۳۳ء میں خونریز "لوکرس بورڈیا"، جو بہترین تصنیف تھی شائع کی۔ اور "ماری ٹودر" بھی شائع کیا۔ ۱۸۳۵ء میں "آنزلو" اور ۱۸۳۸ء میں "روئی بلاس"، اور ۱۸۴۳ء میں "بورگرادس" جیسے شاہکار لکھے۔
۱۸۴۱ء میں مخالف آرا کے باوجود "اکاڈیمی فرانس" کی رکنیت کے لئے منتخب کیا گیا اور ۱۸۴۸ء میں ساٹھ ہزار آراء کی موافقت سے ممبر پارلیمنٹ مقرر ہوا اور اپنے سیاسی عقائد کی تشہیر

کے لئے روزنامہ "حوادث" جاری کیا۔

۱۸۴۲ء میں داستان سفر "لورن" تصنیف کی مگر اسی سال اس کی لڑکی "لیوپولدین" اپنے شوہر کے ساتھ غرق دریا ہوکر مزار اور جنازے کی فکر سے آزاد ہوگئی اس صدمے نے اس کی سیاسی اور ادبی زندگی کو ایک سخت صدمہ پہنچایا۔

۱۸۴۸ء میں لوئی نپولین جمہوریت فرانس کے لئے صدر منتخب ہوا، چونکہ ہیوگو اس کا مخالف تھا اس لئے اس کے خلاف تقریریں کیں۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا اور نپولین نے ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو وکٹر ہیوگو کو فرانس سے نکالدیا۔ جسکی تفصیل ہیوگو نے اپنی "ایک جرم کی تاریخ" میں بتفصیل لکھی ہے۔

اگرچہ دیس نکالے سے ہیوگو کا مالی نقصان ہوا۔ لیکن اس کے لئے یہ واقعہ ایک محرک ثابت ہوا۔ وہ چندروز "برسلز" میں ٹھیرا رہا مگر دولت فرانس کے اشارے سے وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اور وہ جزیرہ "زرسی" جا پہنچا جہاں "لی شاتیمان" لکھی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے روزنامہ "انسانیت" جاری کیا۔ مگر ۳۱ دسمبر ۱۸۵۵ء کو اس جزیرے سے بھی نکلنا پڑا۔ اور جزیرہ "گرنزی" میں قیام کیا۔

۱۸۶۲ء میں مشہور شاہکار "بدنصیب" لکھکر ادبی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اس کے بعد "ولیم شکسپیر" اور ۱۸۶۲ء میں "ترانۂ کوہ و بیابان" اور ۱۸۶۵ء میں "کارگران دریا" اور "منسوڑ" لکھا۔ اور ۱۸۶۹ء میں بہ ترتیب یہ جواہر پارے شائع ہوگئے۔

ہیوگو ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کو فرانس واپس آیا۔ افسانۂ قرون کا دوسرا حصہ "باپ"، "شفقت عالیہ" اور "مذاہب و مذہب" وغیرہ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۸۸۲ء میں اس کی اسی سالہ جوبلی منائی گئی اور ہزاروں آدمیوں نے اسے مبارکباد دی۔ ہیوگو اپنے خاندان کے ساتھ برآمد ہوا تو سبھوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ بوڑھا شاعر خوشی سے رونے لگا اور لوگوں نے اسے "نجات دہندہ" اور "فرشتۂ انسانیت" کہکر پکارنا شروع کیا۔

بالآخر ۲۲ ماہ مئی ۱۸۸۵ء کو وکٹر ہیوگو نے اپنے مکان میں جو "ایلو" میں واقع تھا (اور اب یہ مقام "کوچۂ وکٹر ہیوگو" کے نام سے مشہور ہے) طبعی موت سے انتقال کیا جنازہ اس شان سے اٹھایا گیا کہ اس کی نظیر اب تک نہیں ملتی بارہ مشاہیر شعرا نے اس کے تابوت کو اٹھایا۔

انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وکٹر ہیوگو مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس کی تصانیف یکے بعد دیگرے طبع ہوتی رہیں۔ "ڈرامہ آزاد" "عاقبت شیطان" "میرے مشاہدات" "خدا" "فرانس اور بلزیک" اور مکاتیب بہ محبوبہ خود اور دوسری تصانیف اس طرح طبع ہوئیں گویا وکٹر ہیوگو بیٹھا ہوا اشاعت کر رہا ہے۔ گویا موت نے اسے سرد نہیں کیا تھا بلکہ اس کی علمی ادبی حرارت اور بھڑکا دی تھی۔

ہیوگو کی تصانیف میں سے "بدنصیب" کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور کسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی مشہور اور دردانگیز نظم کا اردو ترجمہ "بیچارے" کے نام سے ہم نے کیا ہے جو انشاء اللہ آئندہ کسی نمبر میں طبع ہوگا۔

(تمکین الکاظمی)

رباعی

بیتابیٔ عاشقی ہے باقی ساقی　　شعلے سے بھڑک رہے ہیں ساقی ساقی

پہلو میں نگار ہے نہ ساغر میں شراب　　جیتا ہوں تو ہے یہ اتفاقی ساقی

"شرط"

باب اوّل

خزاں کی ایک تاریک رات کا ذکر ہے کہ ایک بینکر اپنے کتب خانہ میں ٹہل رہا تھا اس کونہ سے اس کونہ تک جاتا تھا اور سوچتا ہوا پھر واپس آتا تھا۔ اس وقت اس کے خیال میں اس خزاں کی یاد تازہ ہو رہی تھی جب آج سے پندرہ سال قبل اس نے چند دوستوں کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا اور اس میں کئی قابل آدمی شریک ہوئے تھے جن کی وجہ سے بہت سے دلچسپ مباحث پر تبادلۂ خیالات ہوا تھا۔

منجملہ دیگر مباحث کے "سزائے موت" پر بھی ایک بحث چھڑی تھی۔ بہت سے مہمان جن میں سے بیشتر اخبار نویس تھے سزائے موت کے بہت مخالف تھے۔ اور یہ استدلال کرتے تھے کہ چونکہ سزائے قتل ایک قدیم رسم ہے اسے بہت سی پرانی چیزوں کی مانند بند کر دینا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ان کے خیال میں موت کی سزا عیسوی اخلاق کے بھی منافی تھی بہرحال کم و بیش ہر شخص اس بات کا حامی تھا کہ قتل کی سزا کی بجائے حبس دوام (عمر قید) زیادہ بہتر ہے۔

اس پر میزبان نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا "حضرت! میں آپ کے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا گو میں نے دونوں میں سے کسی سزا کا بھی ذاتی تجربہ نہیں اٹھایا ہے لیکن یہ خوب جانتا ہوں کہ حبس دوام کے مقابلہ پر سزائے موت زیادہ قرین انسانیت ہے۔ موت کی سزا میں مجرم ایک لمحہ میں مرجاتا ہے مگر دوسری صورت میں وہ عمر بھر ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے۔ اس کا اندازہ انہی کو ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے کبھی قید و بند کی مصیبتیں اٹھائی ہوں۔ آپ ہی انصاف کیجیئے پہلا طریق سزا زیادہ انسانی اخلاق پر مبنی ہے یا دوسرا؟"

اس پر مہمانوں میں سے ایک نے کہا تھا "دونوں طریقے برے ہیں کیونکہ مقصد کے لحاظ سے ہر دو یکساں ہیں یعنی دونوں ایک مجرم کی جان لینا چاہتے ہیں۔ کوئی حکومت خدا نہیں ہوتی پس جب وہ کسی کو زندگی بخش نہیں سکتی تو زندگی ختم کرنے کا بھی اسے کیا حق ہے؟"

مہمانوں میں ایک ۲۵ سال کا نوجوان وکیل بھی تھا۔ جب اس سے اس کے متعلق رائے دریافت کی گئی تو اس نے جواب دیا "میرے خیال میں دونوں طریقے خلاف انسانیت ہیں۔ لیکن اگر دونوں میں سے ایک کے انتخاب کرنے کا حق دیدیا جائے تو میں خیر البلیتین کے اصول پر حبس دوام قبول کر لونگا۔"

مہاجن جو اس وقت نوجوان اور بہت جوشیلا تھا اس پر بہت تیز ہوا اور میز پر گھونسہ مارتے ہوئے وکیل سے چلا کر کہا۔

"بکواس!۔۔۔۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم پانچ سال بھی ایک کوٹھڑی میں محبوس نہیں رہ سکتے۔۔۔۔ دو لاکھ روبل (روسی سکہ) کی شرط لگاتا ہوں!"

وکیل نے اس کا جواب دیا تھا "اگر تم واقعی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہو تو میں تمہاری شرط قبول کرتا ہوں اور پانچ سال کی جگہ پندرہ سال محبوس ہونے کے لئے تیار ہوں؟"

مہاجن نے جوش میں آکر کہا "پندرہ برس!۔۔۔ پندرہ! حضرات اگر یہ پندرہ برس مقید رہ سکیں تو میں دو لاکھ روبل ہارنے کے لئے تیار ہوں!"

"اگر تم دو لاکھ روبل ہارتے ہو تو میں اپنی جان ہارتا ہوں"

چنانچہ یہ انوکھی اور مجنونانہ شرط بندھ گئی۔ مہاجن جو حد درجہ بے پرواہ اور کافی متمول تھا دو لاکھ کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس شرط پر بہت مسرور تھا۔

کھانے پر اس نے وکیل کو سمجھایا "میرے مہربان بہتر ہے کہ اس احمقانہ کام میں ہاتھ نہ ڈالو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑیگا۔ سمجھ لو میرے لئے دو لاکھ روبل کوئی حقیقت نہیں رکھتے مگر تم اپنی زندگی کے تین چار بیش قیمت سال ضائع کر دوگے۔ تین چار سال اس وجہ سے کہتا ہوں کہ تم زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکوگے اور شرط توڑ دوگے۔ نیز میرے عزیز یہ بھی یاد رکھو کہ جبریہ حبس کے مقابلہ پر خود اختیاری حبس بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوگا۔ زندگی دق ہو جائیگی اور یہ خیال کہ تم جس وقت چاہو گے قید خانہ سے رہا ہو سکو گے اس

زندگی کو اور بھی سوہان روح بنا دیگی اور تم اس کی برداشت نہ کر سکو گے، اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"

باب دوم

آج پورے پندرہ سال کے بعد مہاجن کو یہ واقعہ یاد آیا اور اس نے اپنے دل میں کہا "آخر اس احمقانہ شرط کا منشا کیا تھا؟ اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا ہے کہ وکیل کے بیش قیمت پندرہ سال ضائع ہو گئے اور میں عنقریب دو لاکھ روبل ہارنے والا ہوں لیکن کیا اس سے یہ قضیہ فیصل ہو جاتا ہے کہ سزائے موت کے مقابلہ پر حبس دوام کی سزا زیادہ بہتر ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ معاملہ ویسا ہی پیچیدہ ہے۔ میں نے یہ شرط غالباً اس وجہ سے لگائی ہو گی کہ اس دن کھانا زیادہ کھا گیا ہونگا۔ اور وکیل نے اسے اس وجہ سے قبول کر لیا ہو گا کہ دو لاکھ روبل ایک واقعی اچھی رقم ہے۔"

اس وقت اس کے دماغ میں وہ تمام واقعات سینما کی تصویروں کی سرعت کے ساتھ گزر رہے تھے۔ جو اس سے پندرہ سال قبل دعوت کی شام کو پیش آئے تھے یا اس کے بعد ہوتے رہے۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ مہاجن کے پائیں باغ میں ایک قید خانہ تعمیر کیا جائے جس میں وکیل پندرہ سال تک سخت نگرانی میں مقید رکھا جائے۔ شرائط یہ تھیں کہ وکیل کو اس طویل قید کے دوران میں قید خانہ سے باہر قدم رکھنے، کسی انسانی شکل کے دیکھنے یا آواز سننے اور اخبارات پڑھنے کی سخت ممانعت ہو گی۔ ہاں یہ اجازت ہو گی کہ کتابیں پڑھ سکے، خطوط لکھ سکے۔ شراب پیئے اور موسیقی کی مشق کرتا رہے۔ جس کے لئے آلات مہیا کر دئے جائیں گے۔ یہ تجویز کی گئی تھی کہ بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لئے صرف ایک کھڑکی ہو گی جو اس کے زنداں میں لگا دی جائیگی اور وہ اس سے کھانا یا کتابیں وغیرہ لے لیا کریگا۔ مگر کسی سے بات کرنے کی سخت ممانعت ہو گی۔ اگر اسے کسی کتاب، شراب یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو گی تو وہ ایک کاغذ کے پرزہ پر لکھ کر دیدیا کریگا۔ مگر وہ بھی صرف کھڑکی کی راہ سے۔

بہرحال شرائط نامہ کا مسودہ تیار ہوا اور اس میں ہر ممکن تفصیل درج کر دی گئی۔ یہ شرط طے پا گئی تھی کہ یہ قید کامل پندرہ برس کے لئے ہو گی جس میں ایک سیکنڈ کی کمی بھی مہاجن کو روپیہ ادا کرنے کے فرض سے بری الذمہ کر دیگی۔ قید ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کی دوپہر سے شروع ہو کر ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کو بارہ بجے دوپہر کو ختم ہو گی۔ اگر وکیل اس سے ایک منٹ قبل بھی زنداں سے نکل آیا تو مہاجن روپیہ دینے کا ذمہ وار نہ ہو گا۔

بہرحال وکیل نئے تیار شدہ قید خانہ میں بند کر دیا گیا اور شرط کا کام جاری ہو گیا۔ سب سے پہلے سال اُسے بہت سخت تکلیف ہوئی جیسا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے پیغامات سے ظاہر ہوتا تھا اسے تنہائی بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی اور کسی عنوان چین نہ آتا تھا۔ مگر قید خانہ کی درودیوار سے دن رات پیانو کی آوازیں نکلتی ہوئی سنائی دیتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

وکیل نے تمباکو اور شراب کا استعمال قطعی ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ یہ چیزیں چونکہ محرک جذبات ہوتی ہیں اور ہیجان جذبات ایک قیدی کے لئے حد درجہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا استعمال قطعی غیر ضروری تھا۔

سب سے پہلے سال اس نے اس قسم کی کتابیں طلب کیں جن کے پڑھنے میں زیادہ دماغ سوزی سے کام لینا نہیں پڑتا یعنی ناول افسانے، سراغرسانی کہانیاں، پیچ در پیچ پلاٹ کے ناول اور خیالی ڈرامے وغیرہ۔

قید کے دوسرے سال موسیقی کی دلکش آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ اب قیدی سوائے مطالعہ کے کچھ نہ کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر شہرہ آفاق مصنفین کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا جو اسے فوراً مہیا کر دی جاتی تھیں مگر پانچویں سال موسیقی پھر شروع ہو گئی اور ایک قیدی نے شراب کا بھی مطالبہ کیا۔ جن لوگوں نے اسے کھڑکی میں سے دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ اس نے اس سال سوائے گانے، کھانے اور سونے کے کچھ کام نہیں کیا۔ چارپائی پر پڑا پڑا جمائیاں لیتا رہتا تھا یا غصہ میں اپنے آپ کو سختی سے مخاطب کرتا تھا یا میز پر لکھنے کے لئے بیٹھ جاتا، رات رات بھر صفحہ پر صفحہ لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیتا اور صبح انہیں پرزہ پرزہ کر دیتا وہ اکثر روتا ہوا بھی سنا گیا تھا۔

چھٹے سال کے آخری نصف حصہ میں اس نے زبانوں، تاریخ اور فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ وہ اس قدر جلد مطالعہ کر چکتا تھا

کہ مہاجن اتنے جلدی کتابیں مہیا کرنے سے قاصر تھا۔ پچھلے چار سال کے عرصہ میں اس نے کم وبیش چھ سو کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مطالعہ کے جنون ہی کے دوران میں اس نے مہاجن کو یہ خط تحریر کیا تھا:۔

"عزیز جیلر!

یہ خط چھ مختلف زبانوں میں تحریر کر رہا ہوں جو جو انہیں جانتا ہو اس سے پڑھواؤ اگر وہ اس میں کوئی غلطی نہ نکالیں تو خوشی میں ایک بندوق چھوڑو تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میں نے ان زبانوں پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ دنیا کے ہر حصّہ کے فاضل عالم کئی کئی زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں مجھے بھی کئی زبانیں آگئی ہیں اور میں نہیں ظاہر کر سکتا کہ انہیں سیکھ کر مجھے کسقدر مسرت ہوئی ہے!"

قیدی کی خواہش پوری کر دی گئی یعنی ان زبانوں کے جاننے والوں سے خط پڑھوایا گیا اور جب وہ حرف بحرف صحیح نکلا تو باغ میں ایک بندوق داغی گئی جس سے قیدی بہت خوش ہوا۔

دسویں سال کے بعد وہ میز پر سے نہیں ہلا اور سوائے اناجیل مقدس کے کچھ نہ پڑھا۔

مہاجن متعجب تھا کہ جس شخص نے چار سال میں چھ سو کتابوں پر عبور حاصل کر لیا ہو وہ پورا سال ایک ایسی کتاب پر صرف کرے جو نہ تو زیادہ لمبی ہے نہ زیادہ مشکل۔ انجیل کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس نے مذاہب عالم اور تاریخ مذہب کا بھی مطالعہ جاری رکھا۔

زمانہ قید کے آخری دو سالوں میں اس نے بیحد کتابیں پڑھیں۔ مگر غیر مربوط طریقہ پر یعنی اگر کبھی علوم طبعی کا مطالعہ کرتا تھا تو کبھی شیکسپیئر اور بائرن کی تصانیف طلب کرتا تھا۔ وہ لکھ لکھ کر کیمیا ادویات فلسفہ اور دینیات پر درسی کتابیں طلب کرتا اور کبھی ناول ہی پڑھنے پر اکتفا کرتا۔ اس کی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی شخص ایک سمندر میں جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو جو کبھی ایک تختہ کو پکڑتا ہو اور اسے چھوڑ کر دوسرے کو پکڑ لیتا ہو اور پھر تیسرے کا سہارا لیتا ہو۔

باب سوم

واقعات اور ایام ماضی کہ بہ یاد تھی جو وقت مہاجن کے دل میں پیدا ہو رہی تھی اور وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"کل بارہ بجے پندرہ سال پورے ہو جائیں گے۔ اور وکیل آزاد ہو جائیگا اور شرط کے مطابق مجھے ۲ لاکھ روبل ادا کرنے ہونگے —— مگر اس کے بعد میں تباہ ہو جاؤنگا —— دیوالیہ!"

آج سے پندرہ سال قبل بیشک اس کے پاس کئی لاکھ روبل تھے مگر اب تو شاید اتنے بھی نہ تھے کہ شرط بھی پوری کر سکتا۔ تجارت کی تباہی اور ایک غیر دانشمندانہ تخمینہ پہ روپیہ لگا کر اسے سخت مالی نقصان پہنچا تھا۔ اور وہ اب ایک لکھپتی سوداگر کی بجائے ایک معمولی مہاجن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا مگر وہ با وضع اور وعدہ کا پورا تھا۔ گو دل میں کہتا تھا "کیا ہی منحوس گھڑی تھی۔ جب یہ احمقانہ شرط اس وکیل کے ساتھ سے لگائی تھی! کمبخت مرا بھی تو نہیں کیسا سخت جان تھا میں تو سمجھا تھا کہ دو ایک ہی سال میں اس کا کام تمام ہو جائیگا۔ اب وہ آزاد ہوگا اور دو لاکھ رُوبل لیکر سٹاک ایکس چینج میں لگا کر ولوں سے کھیلیگا۔ شادی کریگا اور مزے اڑائیگا۔ مجھے دیوالیہ ہونا پڑیگا۔ اور اس زبوں حالت میں وہ مجھے چڑا کر کہیگا "میری تمام مسرتوں اور فارغ البالیوں کا اصل سبب آپ ہی ہیں۔ آپ نے میری بہت مدد کی ہے!" نہیں نہیں! —— میں یہ سننا نہیں چاہتا میں بے غیرت نہیں ہوں، مجھے تباہ نہیں ہونا میں ان دو لاکھ روبل کو بچانے کے لئے انتہائی کوشش کرونگا۔ جس کی صرف ایک ہی سبیل ہے یعنی اس کی —— موت!"

ایک گھنٹہ نے تین بجائے۔ مکان میں ہر شخص خواب خرگوش میں سو رہا تھا۔ کہیں کسی قسم کی آواز سنائی نہ دیتی تھی صرف وہ پتے شور مچاتے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے ہلنے لگتے تھے۔

اس نے آتشدان پر سے چپکے سے وہ کنجی اٹھائی جسے استعمال ہوئے پندرہ برس کا عرصہ گزر چکا۔ کپڑے پہنے اور مکان سے باہر نکلا۔

باب چہارم

باہر سخت اندھیرا تھا۔ سردی پڑ رہی تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ باغ میں ایک نم آلود ہوا چل رہی تھی جس سے درختوں کے پتے مسلسل جنبش میں تھے۔ مہاجن نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنا شروع کیا مگر نہ تو قید خانہ کی عمارت دکھائی دی نہ درخت اور زمین۔ اندازہ سے وہ قید خانہ کی جانب بڑھا چلا گیا اور دو دفعہ چوکیدار کو زور سے پکارا مگر اس نے جواب نہیں دیا معلوم ہوتا تھا

کہ اس خراب موسم سے بچکر وہ بھی باورچیخانہ یا کسی اور جگہ جا دبکا ہوگا۔

بوڑھا مہاجن سوچ رہا تھا کہ "اگر میرا مقصد پورا ہوگیا تو شبہ چوکیدار پر ہی ہوگا" وہ عمارت کے قریب پہنچ گیا اور سیڑھیوں پر سے چڑھتا ہوا ایک پچھلے کمرہ میں پہنچا جس میں سے ایک راستہ عین اس کمرہ کی طرف جاتا تھا جہاں وکیل قید تھا۔ سخت اندھیرے کے باعث مہاجن نے ایک موم بتی جلا لی۔ اور آگے بڑھا۔ مگر وہاں کوئی متنفس نظر نہ آیا۔

وہ اس کمرہ پر پہنچ گیا جہاں وکیل پندرہ سال سے مقید تھا۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔

کال کوٹھری کے قفل کی مہریں ثابت تھیں اور قیدی میز کے ایک کونہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت سوائے اس کی کمر، بال اور بازوؤں کے کوئی حصہ جسم نظر نہ آتا تھا۔ دو کرسیوں اور میز پر کھلی ہوئی کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے اور وہ اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پندرہ سال کی قید نے اسے بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کا عادی بنادیا تھا مہاجن نے کھڑکی کے جنگلہ پر کھٹکھٹایا مگر قیدی نے مطلق جنبش نہ کی اور یونہی بیٹھا رہا۔

مہاجن نے دروازہ پر پہنچکر احتیاط سے قفل کی مہریں توڑیں اور کنجی قفل میں لگا ہوا چھوڑ کر زنگ آلود دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوا۔ قیدی اب ایک مشت استخواں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ سوائے ڈھانچے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سر کے بال عورتوں کی مانند لمبے لمبے تھے گھنی ڈاڑھی پورے ایک فٹ کی تھی۔

بالوں کا رنگ بھورا پڑگیا تھا اور جب مہاجن نے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے مطلق یقین نہ ہوسکا کہ وہ چالیس سال کا تھا۔

وکیل بے خبر سو رہا تھا . . . . اس کے سر کے سامنے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر کچھ تحریر تھا۔

مہاجن سوچ رہا تھا کہ "یہ نیند میں دو لاکھ روپے کے متعلق خواب دیکھ رہا ہوگا اور شیخ چلی کی مانند طرح طرح کے منصوبے گانٹھ رہا ہوگا۔ بدمعاش! ——— مجھے اس کے مارنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ یہ تو پہلے ہی سے نیم مردہ ہے۔ اب مجھے سوائے اس کے اور کیا کرنا ہے کہ پلنگ پر لٹا کر حلقوم پر زور سے تکیہ رکھ دوں ——— بڑے بڑے سراغرساں بھی پتہ نہیں چلا سکیں گے کہ موت کیونکر واقع ہوئی ——— مگر مجھے سب سے پہلے یہ پڑھ لینا چاہیئے۔ کہ کیا لکھا ہے؟"

باب پنجم

یہ کہکر مہاجن نے میز پر سے کاغذ اٹھایا اور اُسے پڑھنا شروع کیا۔ اس نے مندرجہ ذیل عبارت پڑھی تھی:۔

"کل بارہ بجے مجھے آزادی نصیب ہوجائیگی اور میں دوسری انسانی شکلوں کو دیکھ سکونگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں دوبارہ سورج کی کرنوں کو دیکھوں میں یہ چند الفاظ آپ کے لئے لکھ دیتا ہوں۔ میں خدائے حاضر و ناظر کے سامنے صفائی قلب کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے آزادی زندگی، صحت اور ان تمام چیزوں سے جنہیں آپ کی کتابیں "زندگی کی نعمتیں" کہتے ہیں سخت نفرت کرتا ہوں۔"

"میں پندرہ سال تک اس سرزمین پر زندگی کا مطالعہ کرتا رہا۔ گو میں نے بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کے سفر نہیں کئے لیکن ان کتابوں کے ذریعہ سے اچھی سے اچھی شراب کا مزا اٹھایا، عمدہ عمدہ گانے گائے، جنگلی ہرن اور درندوں کا شکار کیا، عورتوں سے محبّت کی. . . . خوبصورت اور حسین عورتیں۔ ایسی شفاف جیسے فضا! ایسی پریاں جیسے بادل۔ میں ان سے ملاقات کرچکا ہوں خواب میں بڑے بڑے عقلا اور فضلا سے ہمکلام ہوچکا ہوں میں نے ان کتابوں کی بدولت ہمالہ اور البرز کی بلند سے بلند چوٹیوں پر پرواز کی ہے جہاں طلوع آفتاب اور غروب کے مناظر دیکھے ہیں جب تھکا ہوا سورج اپنی کرنوں سے چوٹیوں اور سمندر کی سطح پر سنہری شعاعیں ڈال کر ایک طلائی رنگ پیدا کردیتا ہے میں نے سر پر بجلیاں چمکتی ہوئی دیکھی ہیں۔ سبز جنگل۔ رواں دریا، ٹھہری ہوئی جھیلیں، غار اور وادیاں غرض ہر قسم کے مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے گڈریے اور کرشن کی بانسریاں بھی سنی ہیں۔ میں نے فرشتوں کے مقدس پروں کو بھی چھوا ہے۔ میں نے تمہاری کتابوں میں بڑے

گہرے سمندروں کی تہ میں غوطہ زنی کی ہے۔ کراماتیں دکھائی ہیں۔ قتل و غارتگری کی ہے۔ مکانات اور شہروں کو آگ لگائی ہے بڑی بڑی سلطنتیں برباد کی ہیں ......

میں تمہاری کتابوں کی بدولت بہت عقلمند ہو چکا ہوں۔ کیونکہ ہزارہا سال سے عقل نے جو جو تجربات آزمائے تھے۔ وہ کتابوں میں منتقل ہو کر اب میرے دماغ میں آچکے ہیں۔ اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ دیگر لوگوں کی نسبت اب میں بہت عقلمند ہوں۔

مگر میں ان تمام کتابوں کو کیا تمام زندگی کی نعمتوں سے متنفر ہو چکا ہوں مجھے عقل و خرد نہیں چاہیئے یہ بالکل سطحی اور غیر مربوط ہے۔ یہ ایک دھوکا ہے محض سراب! تم بیوقوف اور غلط راستہ پر بھٹک رہے ہو اگر سیب یا نارنگی کے درخت میں پھلوں کی بجائے مینڈک اور چھپکلیاں لگنے لگیں تو تم کسقدر متعجب ہو گے بالکل بالکل اسی طرح میں تمہاری عقلوں پر متحیر ہوں کہ تم نے آسمانی انعام کے مقابلہ پر ارضی مصایب و آلام کو کیوں قبول کر رکھا ہے؟"

عملی طور پر زندگی کی نعمتوں سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے میں دو لاکھ روبل پر پانی پھیرتا ہوں۔ انہیں میں ابتدا میں بہشت کی مانند شیریں سمجھتا تھا مگر اب ریلوے کی مانند کڑوا سمجھکر نفرت کرتا ہوں دو لاکھ روبل کے دعوے کو معطل کرنے کی غرض سے میں مقررہ وقت سے پانچ گھنٹے اس جگہ سے رخصت ہونگا اور شرط ہار جاؤنگا۔"

جب مہاجن یہ کاغذ پڑھ چکا تو اس کا دل بھر آیا اس نے اس غیور اور فراخ حوصلہ عجیب و غریب انسانی پیکر کی بلند پیشانی پر بوسہ دیا اور آنسو بہاتا ہوا زنداں سے باہر نکل گیا۔

بڑے بڑے مالی نقصانات اٹھانے پر بھی اس کا ضمیر اس پر اتنی ملامت اور تنفر نہ کرتا تھا جتنا اسوقت کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر پہنچا اور پلنگ پر جا پڑا۔ مگر دلی اضطراب نے اسے سونے نہ دیا۔

دوسرے دن چوکیدار حیران و پریشان دوڑتا ہوا آیا اور بیان کیا کہ قیدی کھڑکی توڑ کر نیچے کودا اور باغ میں سے فرار ہو کر کسی جگہ جا چھپا۔

نوکروں کے ہمراہ مہاجن قید خانہ میں پہنچا اور چوکیدار کی بات کی تصدیق کی، باغ میں تلاش کی گئی مگر قیدی نہ ملا کہاں غایب ہو گیا۔

بیجا گفت و شنید سے بچنے کے لئے اس نے میز کی دراز میں سے مذکورہ بالا کاغذ نکالا اور اسے لیجا کر اپنے آہنی صندوق میں چوم کر بند کر دیا۔

(چیخوف)

ظفر قریشی دہلوی

بلبل باغ حسن ہوں نغمے کو ناز کیوں نہ ہو　　میری نوائے عیش میں ساز ہی ساز کیوں نہ ہو

دل ہے جہان عاشقی درد ہی کائنات حسن　　دل کا ہر ایک اضطراب درد نواز کیوں نہ ہو

(آپ جہان حسن میں حسن کے بادشاہ بھی ہیں　　ناز بجا ہے آپ کا، آپ کو ناز کیوں نہ ہو)

سجدۂ مے پرست پر ہوتی ہے بارش کرم　　ساغر میکدہ نشیں۔ محو نماز کیوں نہ ہو

چند دکنی مرثیہ گو

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی یا شمالی ہند سے؟ مگر بقول نصیر حسین خاں خیال شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس ہند آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج تھا۔ ابتداً تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے مگر اس کے بعد بہت جلد دکنی مرثیوں کا آغاز ہو گیا۔

شجاع الدین نوری کا نام پہلے مرثیہ گو کی حیثیت سے پیش ہوگا جن کے کلام کا نمونہ ہم نے اپنی تالیف "دکن میں اردو" میں درج کیا ہے۔ دکنی مرثیہ گوئی پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائیگی۔ یہاں چند مرثیہ گو شعرا کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

دکنی مرثیوں کا ایک مجموعہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا گیا ہے ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج میں ہے۔ ہمارے خاندانی کتب خانوں میں بھی متعدد بیاضیں ہیں جن میں سے ایک ہمارے پیش نظر ہے۔

ان بیاضوں میں مرثیے۔ نوحے۔ سلام سب کچھ موجود ہیں ان کے مرثیوں کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

(۱) بیاض مملوکہ اڈنبرہ یونیورسٹی دیوان حسینی سے موسوم ہے اس میں ہاشم علی برہان پوری کے تقریباً (۲۵۰) مرثیے۔ نوحے اور سلام کے علاوہ قادر کا ایک نامکمل مرثیہ ہے۔

(۲) بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی گویا اول الذکر کا تکملہ ہے کیونکہ قادر کا مرثیہ اس میں مکمل × × × ہوا ہے۔ اس میں (۸۰) شعراء کے (۳۰۰) مرثیے، نوحے وغیرہ ہیں۔ ان دونو بیاضوں کے اوراق کی تعداد (۲۴۷) ہے ان کے متعلق مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

"مراثی حضرت علیؓ۔ آنحضرتؐ۔ اور حسینؓ۔ مصنف ہاشم علی جو اردو کا ایک ابتدائی شاعر تھا۔ یہ ہاشم ولی اور قاسم کے پہلے گزرا ہے یہ جہانگیر کے زمانہ میں بیجاپور میں رہتا تھا۔ ۱۰۳۰ء اور ۱۰۵۶ء میں بھی زندہ تھا۔ ایک اور سنہ (۱۰۴۶ء) جو صفحہ (۳۵) پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے یہ تصنیف اسی سنہ میں ہوئی ہے۔ ہاشم شیخ احمد فاروقی کا مرید تھا جن کا انتقال ۱۰۳۲ء میں ہوا ہے۔ ہاشم علی چند دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ ایک فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ چند اشعار کاظم اور قادر کے بھی ان جلدوں میں شامل ہیں۔"

مصنف کی یہ صراحت صحیح نہیں ہے اس کا زمانہ گیارہویں صدی نہیں بلکہ بارہویں صدی ہجری ہے۔ آگے چل کر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائیگی۔

(۳) بیاض کنگ کالج۔ اس میں (۳۲) شعرا کے تقریباً (۵۰) مرثیے ہیں درمیانی ایک ورق پر تاریخ کتابت حسب ذیل درج ہے:۔

"تمت تمام شد بدستا فقیر العباد غلام نبی ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۵۷ھ"

(۴) بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم اس میں (۲۴) شعرا کے (۱۱۴) مرثیے ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ مگر یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کو ان کے والد کے ترکہ میں ملی ہے۔ مولوی صاحب کے والد نواب سالار الملک کا انتقال ۱۲۷۵ھ میں ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی کتابت ۱۲۷۵ء سے پہلے ہوئی ہے۔

اگرچہ ان بیاضوں میں اکثر مشترک اصحاب کے مرثیے ہیں مگر کئی ایک ایسے ہیں جن کے مرثیے دوسری بیاضوں میں نہیں ہیں علی ہذا کسی میں ایک شخص کے مرثیے زیادہ ہیں تو دوسری میں دوسرے شخص کے۔ مثلاً اڈنبرہ والی بیاض میں مرزا کے صرف (۱۶) مرثیے ہیں مگر مولوی صفی الدین مرحوم والی میں اس کے (۴۴) مرثیے ہیں۔ ان میں سب سے نایاب یہی آخر الذکر قرار دیجا سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں قطب شاہی عہد کے قدیم ترین شعرا مثلاً وجہی۔ غواصی۔ عبداللہ قطب شاہ لطیف وغیرہ کے مراثی موجود ہیں۔

دکنی مرثیے شمالی ہند کے مرثیوں سے چند امور میں فوقیت رکھتے ہیں۔

(الف) ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے ان کا اصلی

مقصد امام حسینؓ اور اہل بیت کا غم کرنا اور آنسو بہانا ہے۔ کوئی مرثیہ اس خصوصیت سے خالی نہیں ہے۔

(ب) فرضی روایات اور افسانوں کو مرثیوں کا جزو اعظم قرار نہیں دیا گیا ہے۔

(ج) مبالغہ اور تصنع نہیں ہے۔

(د) اکثر مرثیوں سے مصنفین کے متعلق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں شاعروں کے نام اور ان کے وطن اور ان کے ہمعصروں کی صراحت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) دکنی مرثیوں کا ذکر تین دور میں کیا جا سکتا ہے یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی مرثیہ گو۔ دور مغلیہ کے مرثیہ نویس اور عہد آصفیہ کے مرثیہ گو قطب شاہی عہد کے جن شعرا کے مراثی دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) سلطان قلی۔ (۲) وجہی (۳) غواصی (۴) عبداللہ قطب شاہ (۵) لطیف (۶) شاہی (۷) کاظم۔ (۸) مرزا

ان کے علاوہ نہیں معلوم اور کتنے مرثیہ گو تھے بہت ممکن ہے کہ خود ان بیاضوں میں ان کا کلام شامل ہو جن کے زمانہ سے ہم واقف نہیں۔

اسی طرح بیجاپوری شعرا سے علی عادل شاہ۔ ہاشمی۔ مرزا۔ قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱) وجہی وہ خوش نصیب شخص ہے جس کی تصنیف سے نظم ونثر دونوں کے نمونے موجود ہیں مثنوی قطب مشتری جس کی تصنیف ۱۰۱۸ھ میں ہوئی ہے انڈیا آفس لنڈن میں موجود ہے۔ ہم کو اس کا ایک مرثیہ ملا ہے جس پر ہم نے علیحدہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(۲) غواصی۔ اس کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی۔ دکنی ادب کی جو کچھ اس نے خدمت کی ہے وہ فراموش نہیں ہو سکتی۔ افسوس اس کی پوری لائف سے ہم اب بھی واقف نہیں کسی کو نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا اور کہاں پیدا ہوا؟ کس خاندان سے تھا؟ ہم کو اس کی نسبت جو کچھ معلومات ہیں ان کا ماحصل یہ ہے:-

غواصی سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا عمر میں وجہی سے چھوٹا تھا سلطان محمد کے زمانہ میں اس کی شاعری چمکی مگر سلطان کے دربار تک رسائی نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس نے اپنی تصنیف "سیف الملک وبدیع الجمال" مکمل کر دی۔ اس زمانہ میں وہ اگرچہ شاہی ملازم تھا مگر دربار تک باریابی نہیں ہوئی تھی اس کو تمنا تھی کہ سلطان تک رسائی ہو جائے آخر اس کی امیدوں کے موافق وہ حضور سلطانی میں پیش ہوا اور عزت وشوکت حاصل ہوئی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں اس کا خاص رسوخ تھا۔ سلطان کی توجہات اور عنایات سے ہمیشہ سرفراز ہوا کرتا۔ سفیر شاہی کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا گیا جہاں خوب آؤ بھگت ہوئی واپسی کے وقت قیمتی تحائف حاصل ہوئے۔

مذہب کے لحاظ سے وہ سنی تھا۔ بلوم ھارٹ نے یہ بالکل غلط لکھا ہے۔ کہ غواصی شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ وہ اپنی تصنیف میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح نہایت خلوص اور عقیدت سے کرتا ہے اس نے خود اپنے شیعہ نہ ہونے کی صراحت سیف الملک میں کر دی ہے۔ چنانچہ برٹش میوزیم کے ایک ناقص نسخہ میں لکھتا ہے:-

فدا ہوں　　ولیوں کے اوپر　:　سنوں رافضی خارجی کاٹ کر

آخر زمانہ میں اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی وہ دنیا کو ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اپنے دنیا دار ہونے پر لعنت ملامت کرتا ہے۔

اس کا انتقال کب ہوا یہ بھی معلوم نہیں۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ء تا ۱۰۸۳ء) کے زمانہ میں فوت ہوا۔

فی الوقت اس کی دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو مثنوی سیف الملک وبدیع الجمال جس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں مرتب کیا۔ اس کی اور دو تصانیف کا قیاس ہوتا ہے۔

(۱) مثنوی یوسف۔ زلیخا۔

(۲) مثنوی لیلیٰ مجنوں۔ مگر سر دست یقین کے ساتھ اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ غواصی مرثیہ نویس بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے اکثر قطب شاہی شعرا مثنویوں وغیرہ کے ساتھ مرثیہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہمیں غواصی کے دو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں اگرچہ یہ کوئی طویل مرثیے نہیں ہیں بلکہ (۱۰) اور (۹) شعر کے ہیں۔ ان کے متعلق کسی مزید صراحت کے پہلے ان کو درج کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

دستا نہیں کروں کیا تو بیان کربلا کا　　بھرتا ہوں نیر نین میں حیران کربلا کا

* [illegible]

آسمان ستے خدایا جبرئیل اوتر کو آیا روتا او پرستے لایا فرمان کربلا کا
کہربا ند کربلا میں کرشکر ہر بلا ہیں؟ کیوں ہے کہ کربلا ہیں کہ سلطان کربلا کا؟
ہے دکہ بڑا یوسب تے ہیں کس قرابت تے
پکڑیا حسین جب تے میدان کربلا کا
دکہ سر ملک لئے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں۔
رو رو دریا کئے ہیں آسمان کربلا کا
چندا ہ سک سون سوتا اس دک سوں عمر کھوتا
تاریاں سون روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سورجوتی دنیا کری ہے روتی
کان تے سیوا یو کوئی مہمان کربلا کا
منجہ سک نہیں ہے دوکربن جھن ہیں ندہال چھن چھن
لاگیا ہے رات ہور دن منجہ دہیان کربلا کا
کورود و کربسار امنجہ شاد کرنے ہارا
سو ہے حسین پیارا سہ جان کربلا کا
غواصیا معطر عالم کون سب کیا ہے
گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

دیگر

ماہ محرم سوز سوں آیا اہل دل منبر سوں
روتا عالم یک ریز سوں کیا کام کیتا ہائے ہائے
کیوں حیف نہیں آیا تجے کن بند سکلایا تجے
یو کام کیوں بھایا تجے کیا کام کیتا ہائے ہائے
کربادشاہی پر ستم شاہاں کون دتیا غم پو غم
مظلوم پر کرنے ستم جینی نہ کھایا ہائے ہائے
دکہ شاہ زادے کون دیا بدنامی اپنے سر لیا
آخر او کافر کیوں کیا اپناج بتایا ہائے ہائے
مدا کف کفنی بہلے جوگی جنگھم پرنے چلے
از ادسوں دیتا تک تے سب تن جلایا ہائے ہائے
روتے ملک سب عرش لگ سورج ستارا اپنا جہلک
مشرق تے تامغرب تلک اندکار بار یا ہائے ہائے
غم سوں پکڑ بیت الحزن یعقوب نے کہویا نین
شیریں سکے بہانے کوہ کن آپ جوکنویا ہائے ہائے
بولے غواصی مرثیہ سن رد یئے دکن کے اولیا ۔ ہر سال کا یو مرثیہ کیا کام کیتا ہائے ہائے

ان کے ملاحظہ سے واضح ہو سکتا ہے مرثیہ صرف اظہار غم کے لئے مخصوص تھا ان کا مقصود یہ تھا غم حسین پر صف ماتم قائم کی جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ کوئی فرضی اور جھوٹے روایات بیان کر کے مرثیہ کو طویل نہیں دیا۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ مبالغہ اور تصنع حد اعتدال سے زیادہ نہیں۔ اپنے وطن کا اظہار اور اپنے ہر سال مرثیہ کہنے کا ذکر بھی کر دیا گیا۔

(۳) سلطان عبداللہ قطب شاہ۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) کے قطب شاہی سلسلہ کا ساتواں تاجدار ہے ۱۰۳۵ھ میں سر بر آرائے سلطنت ہوا اور ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کر کے فوت ہوا۔ اپنے باپ دادا کی طرح علم دوست اور علم پرور تھا بڑے بڑے نامی گرامی علماء اور اہل کمال سلطان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ جن کے منجملہ چند یہ ہیں:۔

علامہ فہامی۔ میر مجدالدین جو علامہ میر محمد مومن کے فرزند اور فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ سیادت پناہ میر سید محمد اسفرائی۔ عمدۃ الفضلاء۔ قاضی احسن۔ قاضی ظہیر الدین محمد الحسنی۔ حکیم عبدالجبار گیلانی۔ مرزا محمد جوہر تبریزی۔ مرزا حمزہ استرآبادی۔ مرزا فضل اللہ شیرازی۔ مرزا محمد مشہدی۔ قاضی عطاء اللہ گیلانی۔

سلطان کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی فارسی کے بلند پایہ شاعر مثلاً مولانا رونقی۔ ملا خلقی۔ نور اللہ۔ قیصری وغیرہ ہم سلطان کے دربار میں تھے اسی طرح دکنی شعراء کا جمگھٹا تھا ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

وجہی۔ غواصی۔ ابن نشاطی۔ جنیدی۔ طبعی۔ امین۔ لطیف وغیرہ۔ سلطان کی علمی قدردانی اور علم پروری کی طویل داستان ہے۔

سلطان کو شعر و سخن کی دلچسپی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی خاصہ ملکہ تھا۔ ضخیم دیوان کا مصنف ہے جس کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔ چونکہ ہم نے دیوان دیکھا نہیں ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی تشریح سے قاصر ہیں۔

اس زمانہ کے رواج کے بموجب سلطان مثنوی غزل رباعی وغیرہ کے ساتھ مرثیہ بھی کہا کرتا تھا۔ یقین ہے اس کے دیوان میں متعدد مرثیے ہونگے مگر چونکہ ہماری بیاض میں صرف ایک مرثیہ ہے اس لئے اسی کو پیش کر دیا جاتا ہے۔

یہ مرثیہ۔ مرثیہ حضرت امام حسینؑ سے موسوم کیا گیا کل مبیں

شعر ہیں۔

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونو آج زاری بھی
حسن کا ہور حسین کا دوکہ لے آیا جگ لیخواری بھی
حسین جب چلے لڑنے سراں نہیں پر لگے پرنے
شہیداں ہر طرف چرنے لگیا یو دوکہ بہ سیاری بھی
وصیت یوں کئے جاتے تکو روتم آپ بہاتے
نہیں تو پھر کونین انی اجل آئی ہماری بھی
بتیماں کو سنبھالو ہو عزلبی بیں سکھالو ہو
بہوت مہراں سوں پالو ہو رہیں گے یادگاری بھی
پریگا غم تمن پر جب میرا غم یاد کرنا تب
یو دوکہ یاد آویگا ہر کب کرونین اشکباری بھی
سوتے یو غم حرم سارا مسلم ہو نرا د نارا
سو ماری کل گلا نعرا ایکر کر بیقراری بھی
شہر بانو کہی اگر کہ اے سینسار کے سرور
منجے غربت منے بہاکر سجاد چھور باری بھی
منجے سکے جادتے یوں حال تمن لبد از میرا کیا حال
کرو مت غم منے پایمال دیو دریں نماری بھی
علی اکبر کہنے میں جاؤن سو پیاسان ہیں جو پالے لاؤن
زخم کہاکر آئے پھر اب تھانوں بھی ہو مشک ساری بھی
دیکھو طفلاں منگے پانی نکر ذرہ مہربانی
ستم سوں تیر مارا نے کئے اونا بکاری، بھی
حسین پانی پنی اے یزیداں تیر برسائے
سو پانی پینے نہیں پائے لگے مکہ لہو کی ناری بھی
بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر باری بھی
سو دیدباں نبوت یو دندکر جو خوشیاں سات پیوندکر
حرم کون سے چلے بندکر پر یا جگ سب اندھاری بھی
عروس آکر پکر دامن چلے تو شوہو جب جھو جن
نشانی کچھ دیو منجکن سو پیارا ستین تماری بھی
حسین کا وقت جب داتیا شمر نے آگلا کاتیا
حرم کا دیک سینا پیا تبادینا اودا ایکاری بھی
ننگے پاواں چلے آئے سو پاواں کون چھلے آئے
اگن دیکھن چلے آئے نکتے دوستداری بھی
کپت کنی سینے پیش آقیامت کچھ نہ اندیشہ
اپن مارا یا اپنے تیشہ تو پایا گرفتاری بھی
یزید دیکھا حسین کا سر پھرایا بہت سوں پھیرپھر
سو دیکھو لعنتی کافر کیا کفر اختیاری بھی
کرو اے دوستاں ماتم ثواب ہے بہت کرنا غم
مدد ہونیگے امام ہر دم کی ہے المیدداری بھی
حسین کا دوکہ دل میں آن لگا ایک چٹ سوں دائم دھاں
کرے قطب عبداللہ سلطان دوکنو سوں شہریاری بھی

(ایضاً)

(۴) علی عادل شاہ بیجاپور۔ سلاطین قطب شاہی کی طرح بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین علم و ہنر ہی کے سرپرست تھے۔ علی عادل شاہ ثانی اس سلسلہ کا آٹھواں تاجدار ہے جس نے سنہ ۱۰۶۷ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کی۔

اس کا دور حکومت ترقی علم و فن خاصکر اردو کی ترقی کے لئے مشہور ہے اس کا دربار باکمالوں کا مجمع تھا۔ دور دور سے اہلِ علم و فضل آکر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے اس کے زمانہ میں بیجاپور علم و ہنر کی قدردانی کے لحاظ سے رشک بغداد اور قرطبہ بنا ہوا تھا ہر ایک مورخ نے سلطان کی تعریف کی ہے اس زمانہ کے مشاہیر علماء کی طویل فہرست ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

قاضی نوراللہ جنہوں نے اس کے دور حکومت کی بہترین تاریخ لکھی۔ شاہ کمال الدین۔ علامہ فتح اللہ شیرازی۔ میر ابراہیم ابن علامہ حسین الواحسن مکونہ۔ ارسطو زمان۔ ملا احمد۔ میر نعمت اللہ۔ شاہ میراں جی۔ مصطفی خاں کیانی وغیرہ۔

سلطان کو شعر و سخن سے خاص ذوق تھا۔ اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ بیجاپور میں گھر گھر شعر و شاعری کے تذکرے ہوتے اور شاعری کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔ اس زمانہ کے کئی ایک شعراء مشہور ہیں۔ مثلاً ملک الشعراء نصرتی۔ حکیم آتشی۔ عبدالقادر نواسی۔ مقیمی دولت۔ امین۔ شاہ ملک۔ ایاغی۔ مرزا۔ ہاشمی وغیرہ۔ ان میں سے کچھ تو صرف فارسی گو تھے اور مابقی اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے ان کے کارنامے آج تک محفوظ ہیں۔

سلطان علی خود بھی اچھا شاعر تھا۔ نصرتی جو ملک الشعرائی کے درجہ پر فائض تھا خود سلطان کا شاگرد تھا۔ افسوس ہے سلطان کا

دیوان یا مثنویاں دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس لئے جو کچھ کلام دستیاب ہوتا ہے وہ گویا ایک نایاب خزانہ ہے۔

ہم کو سلطان کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے جس کے (۱۴) شعر ہیں۔ زبان کے لحاظ سے اس کو بہت صاف کیا جا سکتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے
جگ برستی جون ابھالاں ہائے ہائے
جگ کے سرور دل کے لہو سوں بھر چلے
ہور کر پلکھاں کے بالاں ہائے ہائے
یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا
ہر خزاں میں تو نہالاں ہائے ہائے
دم تیرے کی دل میں دکھ سوں لیو جمیا
تو پہنچتے کہن میں لعلاں ہائے ہائے
اس شدیاں کوں کھول انکیاں دیک توں
ہے بردشہ کے او دہلاں ہائے ہائے
کربلا کی سب زمیں رنگیں ہوئی
لہو بری دلدل کے ماندن ہائے ہائے
تن گگن کا ہیو کر مجمر کیا
آہ کے تیران کے بہالاں ہائے ہائے
نین شفق جگ پو نچھ کرستے ملک
ہو بھری سوا ورزو مالان ہائے ہائے
آج نہیں دستے زمین کے پیٹ پر
حیف او صاحب جمالان ہائے ہائے
کر خوشی ہور خرمی کے گر پڑے
آہ کے چھینے میں نالان ہائے ہائے
اسد کہون بھر کے انی سب تن منے
نت جلیں انکیاں ہلالان ہائے ہائے
نت کر عادل علی یکدل ستے
شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

(ایضاً)

(۵) لطیف (گولکنڈہ) غلام علی خاں لطیف قطب شاہی عہد کا قزلباش امیر تھا۔ وہ امامیہ مذہب کا پیرو۔ شاعری یا مرثیہ گوئی اس کا پیشہ نہیں تھا۔ بلکہ بطور تفنن الطبع شاعری کرتا انکو اپنی امارت اور شرافت کا بڑا فخر تھا اس کے متعلق اپنی مثنوی میں جا بجا صراحت کی ہے۔ ان کو اپنے حیدرآبادی ہونے پر بھی ناز ہے۔

لطیف بڑا پر گو شاعر تھا۔ پانچ ہزار پانچ سو شعر کی مثنوی صرف ایک سال کی قلیل مدت میں لکھدی۔ جو ظفرنامہ کے نام سے موسوم ہے اس میں محمد حنفیہ کا ایک فرضی قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کی تصنیف ۱۰۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ غالباً یہ ان کے آخر زمانہ کی تصنیف ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ موجود تھے۔ اپنے مرثیہ میں انہوں نے صراحت کردی ہے۔ وہ غواصی کے زمانہ میں موجود تھے۔ غالباً غواصی کے عہد میں یہ نوجوان ہونگے۔

لطیف کا کوئی مرثیہ یورپ میں نہیں ہے ہمارے خاندانی بیاض میں ان کا ایک مرثیہ ہے۔ جس کے (۲۵) شعر ہیں۔ طرز عبارت کے لحاظ سے اس کو بھی صاف کہنا چاہیئے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

اے اہل درد اشک سوں انکھیاں کوں تر کرو
نکلیا ہے پھر یو ماہ ہے محرم نظر کرو۔
نازل زمین پو سر تے ہوا غم حسین کا
ماتم زدیاں کو ایک طرفتے خبر کرو
پھر تن کے عود سوز میں غم کی انگار آج
جیواں کوں عود ہور دلاں کوں اگر کرو
سلطان کربلا کی غریبی کوں یاد کر
ٹکڑے ہی جگر کوں ہور دلاں کوں خنجر کرو
ہے درد اگر تمن کوں قیامت کے دہوپ کا
سایہ کوں اہل بیت کے سر کا چھتر کرو
جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے۔
ھور اس ناخوشی تے بات میری سن حذر کرو
شیر خدا کی بات میں یکرنگ خاک ہو
آسمان ہور زمیں کے اوپر فخر کرو
سینسار کے گہراں کوں بقا نہیں فنا ہے یو
تکیہ تم اس گہراں پو نکو بن بسر کرو

خلقت میں یو وجود ہے تپلا جو خاک کا
چندا نہ اعتبار تم اس کے اوپر کرو
گرد بندار ہے تو دیو دین کوں رواج
یعنی بشر ہو خدمت خیر البشر کرو
منگنے ہے سرخ روتمیں دوجہاں میں تو
امرت کنکون ہور زبان کون شکر کرو
امت کی نیگی ہو نہ پلو باند لیو پاپ
دوزخ میں ست ستم نہ آپس پر عذر کرو
خلق محمدؐ کرم مرتضیٰ سے علے
انساں ہور علین یو اپنا سپر کرو
دل میں بقا کے گھر کا اگر ہے ہوشمن
نیکی کے دام خرچ کر جنت میں گھر کرو
بیدرد ہے جکوئی خوش اس تے خدا نہیں
مرد ہو کلمیں درد کے یکدم گذر کرو
ایمان جون چراغ ہے عاقبت کے دار کا
بارا لگے نہ بیتون جتن اس دل بہتر کرو
منگینے ہے چو کے سار جو سب کون عزیز اچھے
امرت کنکوں ہور زبان کون شکر کرو
بے دین ہو یز بد کیا دین میں خلل
لعنت مدام اس کے اوپر سر لبسر کرو
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم متین
آیات ہور حدیث ہور سبمیں اثر کرو
جکوئی تمنکون جیو دی پیدا کیا ادل
دکر چلو ہنت نہ اپسکون نذر کرو
دولت اوپر ابد کی نظر ہے تو دل کون آج
گنجینۂ محبت اثنا عشر کرو
سینے اوپر تے کار ستو لغض کا کلنگ
دن دن کون صاف دل کون نیم کا چندر کرو
اوڑنے فلک کے بام پو اشتیاق تو
پیدا ہی کے سار سعادت کے پر کرو
آل عبا کے غم سوں جنم آج صرف کر
محشر کے دلیں ذوق خوشیا من اثر کرو
غواص کے زمانکے اچھہ ہے لطیف تو
اے عارفان ہو یاد تمیں یو اچیر کرو

(ایضاً)

(۶) ہاشمی - بیجاپور - علی عادل شاہ ثانی کا ہمعصر ہے - سید میران نام سید شاہ ہاشم کا مرید تھا - کہا جاتا ہے کہ مادر زاد اندھا تھا - مثنوی - دیوان - مرثیے اس کی یادگار ہیں - مثنوی یوسف زلیخا ۱۰۹۹ھ میں مرتب کی ۱۱۰۹ھ میں اس کا انتقال ہوا - ریختی کا بھی یہی موجد ہے اس کے پہلے اس قسم کی غزلیں کسی نے موزوں نہیں کیں - مگر یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے - اس قسم کی نظم کا کوئی خاص نام اس وقت تھا یا نہیں ؟ میرا خیال ہے چونکہ اس قسم کی یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے اس کا کوئی خاص نام نہیں تھا زمانہ مابعد میں اس کو ریختی سے موسوم کیا گیا ہے۔

مصنف بساتین السلاطین نے تعریف کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے - چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

" ونیز از جملہ ہندی گویان ان زمانہ میاں ہاشمی است کہ بفیض لعاب دھن مبارک حضرت پیر دستگیر شاہ ہاشم قدس سرہ زبان شیریں بیان کشادہ درمیان سخنوران گوی سبقت بودہ - ترجمہ یوسف زلیخا را بمحاورۂ آن وقت نظم آوردہ و دیوان غزل مشتمل بر مضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم دادکہ مقبول طبائع افتادہ در اشعار طرازی نادر روش غریب در زبدہ است کہ ہیچکس بر آورد ران سیافت نزادہ - باوجودے کہ بصیر مادر زاد بود "

(صفحہ ۹۲ ب انڈیا آفس)

غرض کہ ہاشمی کی قابلیت مسلمہ تھی دیگر شعراء کی طرح وہ حسب رواج مرثیہ بھی کہا کرتا - مگر افسوس اب سب ناپید ہیں - ہم کو اس کا ایک مرثیہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا - افسوس ہم نے پورا نقل نہیں کیا - جو کچھ نوٹ کیا گیا یہاں پیش کیا جاتا ہے -

دلبند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں۔
فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں -
سلطان دوجہاں کا سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین حسن کا شاہ زمین زمن کا
حضرت بنی سنگا تابوت لے چلے ہیں

. . . .

حضرت کے تھے نوا سے حیدر کے تھے خلاصے
ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں
اے ہاشمی شہان کا سلطان دوجہاں کا
مقبول اوس جوان کا تابوت لے چلے ہیں

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

یہ مرثیے زبان کی صفائی کے لحاظ سے ممکن ہے ہاشمی بیجاپوری کا شمار نہ کیا جائے مگر ہاشمی کے دوسرے کلام کی صفائی کو دیکھا جائے تو پھر اس مرثیہ کو ہاشمی بیجاپوری کا تصور کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہوسکتا۔

گولکنڈے اور بیجاپور کے یہ چند شعراء ہیں۔ جن کے دوسرے کلام کے ساتھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ یعنی ان شاعروں کا دوسرا کلام مثنوی قصائد غزل وغیرہ بھی موجود ہے۔ یہ شعراء مرثیہ گوئی کا پیشہ نہیں رکھتے۔ آئندہ نمبر میں ان شعراء کو پیش کیا جائیگا جن کا پیشہ ہی مرثیہ گوئی تھی جن کے متعدد مرثیے یورپ میں اور یہاں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مغلیہ عہد کے دکنی مرثیہ گو پیش کئے جائیں گے۔ امید ہے کہ ناظرین کی ضیافت طبع کا باعث ہوں۔

نصیر الدین ہاشمی

(ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لنڈن)

افکار آزاد

چمن ہے، بہاریں ہیں گلباریاں ہیں — گھٹا ہے، پھواریں ہیں، میخواریاں ہیں
ستم کوشیاں ہیں جفا کاریاں ہیں — یہ کس کے مٹانے کی تیاریاں ہیں
بتو! تم خدا جانے کیسے خدا ہو — کہ ستاریاں ہیں نہ غفاریاں ہیں
جواب کوئی پرساں نہیں ہے تو کیا غم — غمِ دوست ہے اور غمخواریاں ہیں
اگر تم خداوند عالم نہیں ہو — تو عالم میں کس کی پرستاریاں ہیں
اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں
کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

محبّت

محبّت کیا ہے؟ لطفِ زندگانی
سرور و سوز و عیشِ جاودانی
محبت کا گزیں سرمایہ کیا ہے
غمِ جان کاہ و مرگِ ناگہانی

(۲)

محبّت سے ہے حاصل کامِ ہستی
محبّت ہی سے ہے آرامِ ہستی
محبّت ہی کی خاطر آدمی کو
گوارا ہیں غمِ و آلامِ ہستی

(۳)

محبّت سے ہوا جب ریش سینا
ٹھکانے لگ گیا انساں کا جینا
زہے قسمت! محبّت کے شرر کو
گئی پہچان میری چشمِ بینا

(۴)

غمِ الفت ہے عیشِ قہر آگیں
غمِ الفت ہے وجہِ اشکِ خونیں
غمِ الفت کے آگے ہیچ ہیں سب
غمِ دنیا، غمِ عقبےٰ، غمِ دیں

(۵)

محبّت باعثِ سوزِ دروں ہے
محبّت زندگانی کا جنوں ہے
رگِ سنگ آشنائے شعلۂ غم
محبّت موجۂ دریائے خوں ہے

(۶)

کہا وقتِ سحر شبنم نے گل سے
مبارک تجھکو سوز و سازِ ہستی
ترے گوشِ حقیقت آشنا کو
نوائے عندلیب آوازِ ہستی

مشتاق

(غیر مطبوعہ)

رومانیا کی شاعرہ ملکہ "میری"

رومانیا کی اس ادیبہ اور شاعرہ ملکہ کی اس جمہوری حکومت کے متعلق کچھ تحریر کرنے کی بجائے جس کے باشندے اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے نام کی قسم اسی طرح کھاتے ہیں جس طرح خدا کے نام کی قسم کھاتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معمولات زندگی کا ایک خاص حصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ملکہ میری کا ایک مختصر اور سادہ مکان ساحل بحر پر واقع ہے۔ ملکہ ہر نئے سال کا کچھ حصہ اس مکان میں گذارنے کی عادی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ اس کی محررۂ خصوصی اور چند خدام کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

جب طیور درختوں کی شاخوں پر نغمہ سرائی میں مصروف ہوتے ہیں اور نسیم سحری کی اٹکھیلیوں سے ایک کیف آگیں صدائے ترنم پیدا ہونے لگتی ہے تو ملکۂ شاعرہ اپنے دارالمطالعے میں اس دریچے کے سامنے آبیٹھتی ہے۔ جو سمندر کی طرف کھلا ہوا ہے اور دریائے تخیل میں غرق ہو جاتی ہے اور ادب کے ان درخشاں موتیوں کی جھڑی لگ جاتی ہے جس سے وہ بیش بہا ہار تیار ہوتے ہیں جنھوں نے ملکہ میری کو ارباب ادب کی صف میں نہایت ممتاز حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھی ہوئی اپنے افکار وخیالات کی تشکیل و تدوین میں منہمک ہوتی ہے اور کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ بطیب خاطر سر اٹھاتی ہے اور لطیف و شیریں آواز سے کہتی ہے "اندر آجائیے" ملاقاتی جو رومانیا کا کوئی کسان ہوتا ہے۔ ملکہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ تاکہ اپنے دکھ اور درد کو اپنی محبوب ملکہ کے گوش گذار کرے۔ غریب کسان بلا تکلف اس چھوٹے موٹے مکان میں پہونچ جاتا ہے اور اسے ملکہ کے سامنے پیش ہونے کے لئے نہ کوئی خاص جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور نہ کسی سے اجازت لینی ہوتی ہے۔

ملکہ لطف و کرم کے ساتھ مسکراتی ہوئی اس کا استقبال کرتی ہے۔ اور اُس کی درخواست کو کامل توجہ کے ساتھ سنکر اسے رخصت کر دیتی ہے اور اپنے محررۂ خصوصی کو طلب کر کے حکم دیتی ہے کہ غریب کسان کی حاجت روائی کا فوراً انتظام کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ ملکہ جمہوریہ جس کا ذکر ہم آج کر رہے ہیں۔ ملکہ کا مقولہ ہے اور کتنا پیارا مقولہ ہے کہ

"بچوں اور کم رتبہ لوگوں کے ساتھ محبت کرو"۔

اس جملہ کی قدر و قیمت کا اندازہ دشوار ہو جاتا ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اس شخص کی زبان سے ادا ہوا ہے جو دنیا میں ارفع اور اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔

ملکہ میری کی مؤلفات انگریزی زبان میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس کا نسلی تعلق انگلستان کے ساتھ ہے۔ لیکن ان کا ترجمہ فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، ہسپانوی، یونانی، جاپانی اور اکثر دوسری زبانوں میں شائع ہو جاتا ہے۔

مصر کے مشہور صاحب قلم اُستاذ حبیب جاماتی ملکۂ موصوفہ کی آخری تالیف کا عربی ترجمہ جریدۂ "البلاغ" قاہرہ میں شائع کرنے والے ہیں۔ یہ آخری تالیف خیالی افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں ملکہ نے اپنے بہترین افکار کی تدوین کی ہے۔ اس کی دوسری مؤلفات میرا دلمن۔ صاعقہ۔ مزار حیات اور صدائے کوہ ہیں۔

ملکہ کو مقابر کے ساتھ خاص اُنس ہے۔ چنانچہ رومانیا کے قبرستانوں کے متعلق اس نے ایک حد درجہ دلکش نظم لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں نذر قارئین کیا جاتا ہے۔

انسانی نفس میں دیہاتی قبرستانوں کے منظر سے زیادہ اثر انداز کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

ایک کمتر اور حقیر انسان کا مدفن جو کوہستانی راستوں میں واقع ہے دوسرے مقابر سے زیادہ ہیجان انگیز ہوتا ہے۔

مجھے وہ حزن بہت محبوب ہے جو مقابر کو دیکھکر پیدا ہوتا ہے خواہ وہ معبدوں کے پاس ہو یا ان سے دور۔

ہمارے مقابر دوسرے ملکوں کے مقبروں کی طرح منظم اور قطار در قطار نہیں ہیں۔ وہ ادھر اُدھر گھنی گھاس اور جھاڑیوں میں منتشر ہیں اور ان سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ لیکن موسم بہار میں اس سوکھی گھاس اور خشک جھاڑیوں کی جگہ خوشنما پھول اور کلیاں نمودار ہو جاتی

ہیں۔ اور قبریں گوناگوں رنگوں کا حلہ زیب بدن کرلیتی ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کرلیا تھا کہ انھیں اپنے ہی ہاتھوں سے آراستہ کرے۔

رومانی کسان ایسے اعمال کو بہت مکروہ خیال کرتا ہے جو بے نتیجہ ہوں۔ اس کے عقیدے میں یہ بات داخل ہے کہ جس امر کا ہونا ضروری ہے وہ عنقریب ہو جائے گی۔ اور جس چیز کا ساقط ہو جانا ضروری ہے وہ بہت جلد ساقط ہو جائے گی۔ جس قبر کو منہدم ہو جانا چاہیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ منہدم ہو جائے اور یہ بڑی حماقت ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خوشنما کلیوں والی بیلوں کو اس پر پھیلنے دیتے ہیں کہ وہ اس کا لباس بنجائیں۔

میں ایک دن شہر میں سیر و تفریح کے لئے نکلی۔ جب میں چاروں طرف گھوم چکی تو میرا گذر ایک قبرستان کی طرف ہوا۔ میں چہار دیواری سے گذر کر اندر داخل ہو گئی۔۔۔۔

قبروں کے درمیان چلی۔۔۔۔

گھاس گھنی تھی اور کلیاں بہت تھیں۔۔۔۔۔

ایک بڑھیا سوکھی گھاس کے درمیان مصروف عبادت تھی۔۔۔

میں نے اسے بامعان نظر دیکھا۔ اور اس قبر کے نشان کا تجسس کرنے لگی جس کی زیارت کے لئے ضعیفہ آئی تھی۔۔۔۔۔

لیکن میں نے وہاں قبر کی کوئی علامت نہ پائی!

میں ضعیفہ کے قریب چلی گئی اور اس سے سوال کیا!

— یہاں کون مدفون ہے؟

اس نے نظریں اُٹھائیں مجھے غور سے دیکھا اور مختصر سکوت کے بعد جواب دیا!

— میری بیٹی۔ وہ یہاں آخری اور ابدی نیند سو رہی ہے۔

— لیکن۔۔۔ قبر کہاں ہے؟ مجھے اس کا کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا!

ضعیفہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی کو پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی۔

— قبر منہدم ہو گئی اور اس کے پتھر منتشر ہو گئے۔ میں نے اس سے پھر پوچھا۔

— تو تم نے اسے پھر کیوں نہ بنا لیا؟

— مجھے اس کی کیا ضرورت تھی؟ اور اسے پھر یہاں تعمیر کرنے سے کیا فائدہ تھا؟ مویشی احاطہ سے گذر کر اندر آجاتے ہیں اور یہاں کی سبزی اور گھاس چرتے ہیں۔۔۔ — تو کیا ہے ہم اس جگہ کو مطلق العنان اور آزاد چھوڑ دیں کہ وہ قبروں پر کی سبزی اور گھاس چرتے پھریں؟

— ہاں اے بیگم۔ مویشیوں کا بھی تو حق ہے کہ ہماری ہی طرح آرام و راحت حاصل کریں ہمارے لئے حرام ہے کہ ہم انھیں ان کے چارے سے محروم رکھیں۔ کیا یہی زیبا ہے کہ ہم اپنے مویشیوں کو مساکن اموات سے اسباب حیات نہ حاصل کرنے دیں؟ میں نے ضعیفہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور لوٹ آئی اسکی گفتگو کا اثر اب بھی میرے نفس میں باقی ہے! ضعیفہ نے سچ کہا! کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ حیوان قبرستانوں میں جائیں اور وہاں سے قوت لایموت حاصل کریں؟ کیا مُردوں کیلئے یہی کافی نہیں ہے کہ زمین پر ایسے لوگ موجود ہوں جو اُن کے بارے میں غور و فکر کرتے رہیں؟ کیا مویشیوں کے ساتھ یہ ہماری سخاوت نہیں کہ ہم مردوں کی طرف سے بطور صدقہ انھیں قبروں کی گھاس چرنے دیں؟ یہ ہے وہ جو ملکۂ رومانیا نے مساکن اموات کے متعلق کہا ہے۔

عبدالوحید صدیقی

رباعیات

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے
کیا لطف سفر سہی جو منزل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا اچھا
اس سے کہ قریب آکے ساحل نہ ملے

رواں

پامالِ کشاکش فنا ہوتی ہیں
یا داخلِ مرکزِ بقا ہوتی ہیں
جو بات معما تھی معما ہے رواں
آخر روحیں تمام کیا ہوتی ہیں

رواں

جُرم قانون دان اور انصاف

ایک طنز

افراد ڈراما

صفدر حسین .... ایک کامیاب وکیل جو ہائی کورٹ کی ججی کا امیدوار ہے۔

ظفر حسین .... اس کا بھائی۔

پہلا منظر ...... صفدر حسین کا ڈرائنگ روم۔

رات کا وقت ہے۔ سردیوں کی بھیانک تاریک۔ خوفناک رات۔ صفدر اپنے کمرے میں اکیلا ہے۔ آتشدان میں آگ جل رہی ہے۔ صفدر کرسی پر بیٹھا آگ تاپ رہا ہے۔

دبے پاؤں ظفر داخل ہوتا ہے۔

صفدر۔ (چونک کر) کون ہے؟

ظفر۔ (مضمحل آواز میں) میں ہوں!

صفدر کا منہ آگ کی طرف ہے اس نے ابھی تک ظفر کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی طرف غور سے دیکھ لیں۔ خوش قسمتی سے آرٹ کے نقطۂ نظر سے بھی ہم مرقعے کو اس کام کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔ قارئین کرام نے دیکھ لیا ہوگا کہ ظفر ایک دبلا پتلا نوجوان ہے۔ جس کے چہرے سے پریشانی اور وحشت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بیٹھی ہوئی سی ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں (خدا جانے کیا بات ہے۔ میں جب کبھی "بال بکھرے ہوئے ہیں" کا فقرہ لکھتا ہوں تو مجھے اس بیہودہ مصرع کا خیال آ جاتا ہے۔

"یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی"؟)

صفدر مڑ کے ظفر کی طرف دیکھتا ہے۔

صفدر۔ (حیران ہو کر) کیا ہے ظفر! کیا بات ہے! (وکیلانہ بے رحمی سے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تم نے کسی کو قتل کر دیا ہے!

ظفر۔ (آہستہ چپکے سے) ہاں صفدر! یہی بات ہے!

صفدر۔ آج پھر شراب پی لی ہے تم نے ظفر!

ظفر ایک کرسی پر گر پڑتا ہے۔

صفدر اٹھ کر اپنے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔ وہاں اسے ایک تحیر کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

صفدر (غصے سے) کیا کہہ رہے ہو تم! سچ کہو! معاملہ کیا ہے!

کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

ہوش میں آؤ۔ ظفر۔ کیا بات ہے!

ظفر (چیختے ہوئے) سچ ہے سچ ہے۔ میں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔

صفدر۔ حواس برقرار رکھ کر۔ خاموش!

اپنے ہاتھ ملتا ہے۔

لیکن میرے پاس کیوں آئے تم۔

ظفر۔ اور کس کے پاس جاتا؟ میں پوچھنے آیا ہوں کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں یا کیا.......

اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے گم پڑتی ہے۔

صفدر۔ (چائے کی ایک پیالی بناتے ہوئے) یہ لو چائے پیو۔ اور شروع سے قصہ سناؤ!

ظفر۔ قصہ لمبا چوڑا نہیں! میں ....

رُک جاتا ہے۔

صفدر - کیا! جوا کھیل رہے تھے تم

ظفر - (جھجکتے ہوئے) ہاں!

صفدر - خاموش!

ظفر - مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ لمبا تڑنگا جوان تھا وہ احمد حسین! مشہور جواری! قمار خانے سے باہر نکل کر میں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ میری طرف دیکھکر مسکرایا۔ حقارت سے نفرت سے! میں نے کہا میرا روپیہ واپس دیدو! اس نے میرے منہ پر گھونسہ مارا اور کہا " یہ لو روپیہ " میں نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اور . . . .

صفدر - ہاں پھر کیا ہوا!

ظفر - تاریک رات تھی! باہر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قمار خانے کے اندر شور برپا تھا۔ میں نے لاش اٹھائی اور راوی کے پل تک لے گیا۔ وہاں چھوڑ آیا ہوں۔

صفدر - راہ میں کوئی ملا۔

ظفر - کوئی نہیں!

صفدر - قمار خانہ سے پل کتنی دور تھا۔

ظفر - چار پانچ میل۔

صفدر (برافروختہ ہوکر) میرے پاس کیوں آئے تم؟ تمہیں معلوم نہیں مجھے ہائیکورٹ کی ججی ملنے والی ہے! لوگ کیا کہیں گے۔

ظفر - تم جانتے ہو صفدر! میری طبیعت کیسی ہے۔ لیکن اس وقت کچھ ایسا ہو گیا کہ اب تک . . . .

اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔

صفدر - خاموش! تم کہتے ہو کہ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

ظفر - کوئی نہیں۔

صفدر - پھر تم کہاں گئے۔

ظفر - گھر۔

صفدر - کیا کرتے رہے۔

ظفر - کپڑے اتار کر ادھر آ گیا۔

صفدر - کسی نے تم کو احمد حسین کے ساتھ قمار خانے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا!

ظفر - نہیں۔ میں اس کے بعد اٹھکر آیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ پہلے اٹھ گیا تھا۔ مجھے اس کا گھر معلوم تھا میں اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا!

صفدر - لوگوں کو معلوم ہے کہ تم اس روز ہار رہے تھے!

ظفر - بالکل نہیں! میں اور وہ بالکل علیحدہ بیٹھے تھے۔

صفدر - مقتول کا چہرہ قابل شناخت ہے!

ظفر - (کانپ کر) بس کرو!

صفدر (بے رحمی سے) مقتول کا چہرہ قابل شناخت ہے!

ظفر - (دانت کچکچا کر) ہاں!

صفدر - ہوں!

ظفر - اب کیا ہوگا۔

صفدر - کیا ہوگا! اگر تم میرے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری مدد کرونگا!

ظفر - میں وعدہ کرتا ہوں!

صفدر - گھر جاؤ! اور جب تک میں تم سے نہ ملوں وہاں سے باہر نہ نکلو۔

ظفر - اچھا! تم نے سب مجھ سے مہربانی کا سلوک کیا ہے صفدر میں . . . .

صفدر - خاموش! مجھے تمہارے جذبات کی پرواہ نہیں ہے۔ مجھے اپنا اور اپنے خاندان کا خیال ہے۔ قتل کے بعد تباہی لازمی ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں مدد دیکر میں بھی قانون کی رو سے مجرم ہو جاؤنگا! میں۔ سرکاری وکیل! ججی کا امیدوار!

(دیکایک برافروختہ ہو جاتا ہے) یہ کیا کیا تم نے! بیوقوف!

ظفر - (ایک چھوٹا سا بکس نکالتا ہے) میرا خیال ہے کہ میری موت اس مشکل کا بہترین علاج ہے۔

اس کے لہجے سے عزم مترشح ہے۔ لیکن قارئین کرام مطمئن رہیں۔ موت ابھی دور ہے۔

صفدر - (ڈانٹ کر) ادھر لاؤ۔ کیا ہے۔!

ظفر بکس جیب میں ڈال لیتا ہے۔

ظفر - اچھا ابھی نہیں۔ جب کوئی راستہ نہ رہیگا اسوقت . . . . . .

صفدر - (متاثر ہوکر) حوصلہ نہ ہارو۔ ظفر۔ راستہ نکلیگا۔ قانوناً۔ شہادت کی رو سے تمہارے خلاف جرم ثابت نہیں۔ کوئی گواہ نہیں۔ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے تمہارے مجرم ہونے کا

اظہار ہوتا ہو۔ حوصلہ نہ ہارو۔

دوسری شام

ظفر کے مکان کا برآمدہ

ظفر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھیں صفحات سے اٹھ جاتی ہیں۔

صفدر داخل ہوتا ہے۔

ظفر - (اپنی جگہ سے اٹھ کر) کیا ہوا؟

صفدر - کچھ نہیں! پولیس غلط راستے پر چل رہی ہے۔ لاش کی شناخت ہو گئی ہے۔ پولیس نے ایک آوارہ گرد کو پکڑ لیا ہے۔ جس نے مقتول کی جیب سے نقدی کا بٹوہ نکال لیا تھا۔ اس پر قتل کا شبہ بھی کیا جا رہا ہے!

ظفر - (گھبرا کر) خدایا!

صفدر - چپ رہو۔ کیا کہتے ہو! میں تم سے کہتا ہوں کہ کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں۔ تم آج ہی کہیں چلے جاؤ۔ اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر افریقہ پہنچ جاؤ۔ دارالسلام میں نور احمد اینڈ کمپنی کا مالک میرا دوست ہے۔ اس کے پاس تمہیں ملازمت مل جائیگی۔

نوٹوں کا ایک بنڈل نکالتا ہے اور ظفر کو دیدیتا ہے۔

ظفر - نہیں نہیں۔ صفدر۔ اسوقت میں نہیں جا سکتا۔ میرا فرض ہے کہ اس مقدمے کا انجام دیکھ کر جاؤں! خدا جانے اس قیدی کا کیا ہوگا۔

صفدر - میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں۔ اسے کبھی پھانسی نہیں ہو سکتی۔ کوئی جج اسے سزا نہ دیگا۔ کوئی اسیسر اسے قصوروار نہ قرار دیگا۔

ظفر - (مستقل مزاجی سے) نہیں۔ صفدر! یہ نوٹ واپس لے لو ورنہ میں ان کو جلا دونگا!

صفدر - (نوٹ لے لیتا ہے) اچھا۔ تو میں یہ سمجھوں کہ تمہیں اپنے خاندان کی اپنے بھائی کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہے!

ظفر - (سر جھکا لیتا ہے) مجھے افسوس ہے صفدر!

صفدر - اچھا تو کم از کم یہ وعدہ کرو کہ جبتک میں تم سے نہ ملوں اس وقت تک تم کوئی بیجا حرکت نہ کرو گے۔

ظفر - اچھا!

صفدر - میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔

ظفر - (صفدر کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتا ہے) پھر مسکراتا ہے۔

ظفر - تمہارا اعتبار جائز ہے صفدر!

تیسرا منظر

چھ ماہ کے بعد

ظفر کے مکان کا برآمدہ

(باہر سے آواز آتی ہے۔)

"احمد حسین کا قتل۔ فیصلہ ہو گیا۔ مقدمے کے تازہ حالات پڑھو۔"

صفدر داخل ہوتا ہے۔ مکان خالی پاکر واپس آتا ہے۔ ظفر سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔

صفدر - جھنجھلا کر۔ کہاں تھے تم!

ظفر - (اطمینان سے) مقدمے کا فیصلہ سننے گیا تھا!

صفدر - (غصے میں) گدھے تھے وہ اسیسر اور جج ان سے بھی زیادہ گدھا تھا۔ جس نے اس بیگناہ کو پھانسی کی سزا دیدی

ظفر - اب کیا باقی رہ گیا ہے۔

صفدر - دیکھو ظفر۔ بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اس بیگناہ کو پھانسی سے بچالونگا۔ وقت۔ وقت کی ضرورت..........."

ظفر - (بات کاٹکر) وقت۔ ابھی تک وقت! شاید ابھی تک تم اپنی عزت اور اپنی ججی کے خیال میں غرق ہو!

صفدر - ظفر!!

ظفر منہ پھیر لیتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد

ظفر - اے کاش صفدر۔ تم بھی میری طرح اس غریب کی حالت دیکھتے جس پر ایک شخص کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھڑک رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ درد کی لرزشوں سے سکڑ کر رہ گیا تھا! آہ۔ غریب بیچارہ۔ مجھے دنیا سے نفرت ہو گئی ہے۔ کیا دیتا ہے یہ! صفدر! میں تمہاری عزت آبرو! تمہاری ججی کو ہیچ سمجھتا ہوں!

صفدر کچھ کہے بغیر باہر نکل جاتا ہے۔

ظفر بیٹھ جاتا ہے۔ کاغذ نکال کر کچھ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

پھر کاغذ میز پر رکھ دیتا ہے۔

اگر قارئین کرام ذرا سی تکلیف کریں تو وہ بہ آسانی اس کاغذ کو پڑھ سکتے ہیں۔ کاغذ پر صرف یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

احمد حسین کا قاتل میں ہوں۔ اور اس گناہ کے کفارے میں خود اپنی جان دے رہا ہوں۔

ظفر حسین

کچھ عرصہ ظفر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے ہیں۔ ایک اداسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کمرہ بالکل تاریک ہے۔ ظفر جیب سے ایک چھوٹا سا بکس نکالتا ہے۔ اور اس میں سے کچھ نکال کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔

تھوڑے عرصے کے لئے پردہ گرتا ہے۔ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ قارئین کرام کو بتایا جاتا ہے کہ اس کے بعد کے واقعات تین گھنٹے کے بعد ہونگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پردہ ایک منٹ کے بعد پھر اٹھتا ہے۔

صفدر داخل ہوتا ہے۔

ظفر ایک کرسی پر دراز ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔

صفدر۔ (ظفر کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے) ظفر! ظفر!

یکایک اس کی نظر ظفر کی بے نوا اشکوں کی طرف جا پڑتی ہے۔ اور وہ چلا اٹھتا ہے۔ خدایا!

پھر اپنے حواس درست کر کے میز پر رکھے ہوئے کاغذ کو اٹھاتا ہے۔ اور پڑھنا شروع کرتا ہے۔

احمد حسین قاتل ۔۔۔۔۔۔

کاغذ ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔

(اپنے آپ سے) اگر یہ کاغذ شایع ہو گیا۔ تو میری عزت میری آبرو۔ میرے خاندان کی ۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ توبہ! یہ تو تباہی ہوگی!

یکایک اسے کوئی اور خیال آتا ہے:

(اپنے آپ سے) اور اس کا کیا ہوگا! پھانسی ہو جائیگی۔ نہیں! عدالت اپیل یقیناً زیادہ دانشمندی سے کام لیگی۔ اس کاغذ کی اشاعت بہت خطرناک ہے۔

کاغذ اٹھا کر آتشدان میں پھینک دیتا ہے۔

باہر سے مبہم کی آواز آرہی ہیں۔ صفدر کا چہرہ پھیکا سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ غور سے کاغذ کے ٹکڑے کو خاک سیاہ ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔

پردہ گرتا ہے۔

عابد

غزل

بنائے دشمنی معلوم، فیض تنگدستی سے ہے
زبردستوں کے غصے کی گھٹا ہم پر برستی ہے

بساط قطرۂ خون شہیداں لوٹ جینے والے
ہے ارزاں موت جس سے یہ وہ آتش زار ہستی ہے

محبت کی شرر انگیزیاں جلنے کا ساماں ہیں
ہے دل زندہ وہی جو آتشیں جذبوں کی بستی ہے

بہار حسن سے لبریز ہے ہر گوشۂ عالم
حریم محفل آفاق جنت زار ہستی ہے

تبسم آفریں ہیں شوخیاں اُن کی نگاہوں میں
مری بزم تمنا میں عدم جنت برستی ہے

صحرائے عرب

فسونِ شب ہوا باطل، سحر کی روشنی پھیلی ہوا جنبش میں آئی اور فضا میں زندگی پھیلی

فلک پر مہرِ عالمتاب کا ساغر چھلک اُٹھا شرابِ نور سے پیمانۂ عالم چمک اُٹھا

عرب کے خشک صحراؤں کا دہشت خیز منظر ہے بیابانوں کی خاموشی کا وحشت خیز منظر ہے

یہاں کے ذرّے ذرّے سے جہنم تھرتھراتا ہے وہ گرمی ہے وہ سوزش ہے کہ سورج کانپ جاتا ہے

ذرا اِن پر سکوں فتنوں کو آتش جذب کرنے دو ذرا خورشید کو ذرّوں کے سینے میں اُترنے دو

بساطِ خاک سے شعلوں کے چشمے پھوٹ نکلینگے زمیں سے آتشی موجوں کے چشمے پھوٹ نکلینگے

یہ وہ آتشکدہ ہے جس سے دوزخ لاگ رکھتا ہے یہ وہ دوزخ ہے جو سو دوزخوں کی آگ رکھتا ہے

یہاں دنیا کے دریا بہہ کے فوراً گرد ہو جائیں جہنم کے قیامت خیز شعلے سرد ہو جائیں

غضب ہے کارواں پھر بھی یہاں پر آتے جاتے ہیں مسافر ہیں کہ اپنی ہمتوں کو آزماتے ہیں

یہ انساں کون ہیں جو آگ میں خود کود پڑتے ہیں یہ ناداں کون ہیں جو دیوہائے غم سے لڑتے ہیں

مجھے بھی لے چلو اے قافلے والو اسی بن میں مجھے بھی لے چلو الفت کے متوالو اسی بن میں

مجھے بھی آتشیں دریا کی موجوں میں نہانا ہے
مرے عنصر کو بھی بھٹی میں جل کر رنگ لانا ہے

(غیر مطبوعہ)

سید عبدالحمید عدم

تبصرے

جدید مطبوعات

مَن کی بانسری مصنف مولوی محمد امیر صاحب بی اے بی ٹی۔ اورنگ آبادی۔

مصنف کی طبعزاد اور مترجم نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس پر ڈاکٹر عبداللطیف ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے ایک پیش نامہ لکھا ہے۔ فاضل "پیش نامہ نگار" رقمطراز ہیں:۔

"من کی بانسری نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ جو جذبات و تخیلات کے میدان میں ایک نوجوان شاعر کی جولانیوں کا پتا دیتا ہے"

میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے متفق ہونے کی جرأت کرتا ہوں۔ واقعی ان نظموں سے مصنف کی جولانی طبع اور بلندی تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

خلوت تاک سے اک بار نکلنا ہے مجھے
بادۂ تند کی مانند اچھلنا ہے مجھے
مست ہو جائے جسے پیتے ہی ساری محفل
جام ہستی میں کچھ اس رنگ سے ڈھلنا ہو مجھ

مندرجہ بالا اشعار میں جو ترنم اور خیال آفرینی پائی جاتی ہے وہ مصنف کی تمام نظموں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اسلام اور غلامی مصنف محمد حفیظ اللہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو پھلواری شریف۔ قیمت ۳/

کردار اور افسانہ مصنف عبدالقادر سروری۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

فاضل مصنف ہندوستان کے طول و عرض میں ایک نقاد کی حیثیت سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس جگہ ان کی پہلی تصنیفات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی مشہور و معروف کتاب "دنیائے افسانہ" کا دوسرا حصہ ہے جو کردار نگاری کے اہم موضوع سے بحث کرتا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں مشہور افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور میری نظر میں یہی حصہ کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ اسی جگہ سے "تعمیری اور تفسیری تنقید" اور محض تنقید کا فرق نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اس وقت تک اردو زبان میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور ضرورت ہے کہ اہل قلم حضرات "ادب لطیف" کی بجائے ایسی مفید کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہوں۔

تاریخ الامت حصہ ہفتم۔ آل عثمان مصنفہ مولٰنا حافظ محمد اسلم جیراج پوری استاد تاریخ الاسلام جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت ۸/

سلسلہ اشاعت: اردو اکاڈمی ۱۶
مطبوعہ محبوب المطابع دہلی۔

مولٰنا اسلم جیراج پوری نے جو سلسلہ تاریخ اسلام کا شروع کیا تھا۔ اس کی آخری کڑی ہے جس میں آل عثمان کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اخیر میں ترکوں کے اسباب تنزل پر چند صفحات ہیں۔ جو میری نظر میں کتاب کی جان ہیں۔ مولٰنا کا انداز تحریر پُر زور اور بلیغ ہے۔

جو اصحاب ان کی تحریر سے واقف ہیں۔ ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مولٰنا تاریخ کے خشک واقعات کو بھی دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ اس وقت اس کتاب پر تاریخی حیثیت سے مفصل ریویو

نہیں ہوسکتا کیونکہ اس سلسلہ کی تمام کتابیں زیر نظر نہیں۔ انشا اللہ کسی اور اشاعت میں پوری کتاب پر تفصیلی تنقید کی جائیگی۔

قاعدہ فارسی — باسلوب نو وطرق راست

مولف۔ ابوالمحاسن متین۔ قیمت چھ آنے

تذکرہ ریختی — مصنف تمکین کاظمی مطبوعہ شمس اسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ

اشاعت وکتابت مرغوب وگوارا۔

فاضل مولف نے اردو کی ایک بھولی بسری داستان کو دہرایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعریت کے اعتبار سے "ریختی" ایک بیکار اور مہمل شے ہے۔ شعریت صداقت احساس وصداقت اظہار کا نام ہے اور ریختی یقیناً "تصنع وتکلف" کی تخلیق ہے۔ لیکن اس اعتبار سے ریختی کی چیزیں بہت وقیع ہیں کہ اردو کے مستند شعرا نے اس صنف ادب میں اردو کے ہزارہا محاورات کا سرمایہ محفوظ کر دیا ہے اور زبان اردو کی لسانی تحقیقات میں جس طرح یہ تصنیفات ممد ومعاون ہوسکتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

مولف نے یہ کتاب بہت کاوش اور محنت سے مرتب کی ہے۔ اور یقیناً اس قابل ہے کہ مولف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ہمارے رسول — مصنف خواجہ محمد عبدالحی فاروقی۔ قیمت ۶ر ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۶ر

رسول خدا کی مختصر سوانح عمری ہے جو آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔

اسلام اور غیر مسلم — مصنف محمد حفیظ اللہ۔ قیمت ۷ر ناشر مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔

اسلامی مساوات — مصنف محمد حفیظ اللہ صاحب۔ ناشر مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ قیمت ۸ر

مندرجہ بالا کتابیں اپنی حقیقت کا اظہار اپنے نام کے ذریعے ہی کر رہی ہیں۔ دونوں کتابیں ۱۵۰ کے قریب صفحات پر محیط ہیں۔ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔

بقائے دوام — مصنف ایم۔ اسلم۔ مقام اشاعت نسیم بک ڈپو۔ بارودخانہ۔ لاہور۔

بڑی بی — مصنف ایم۔ اسلم۔ نسیم بک ڈپو بارودخانہ لاہور

فاضل مصنف مدت سے اس قسم کی کتابیں تصنیف وتالیف کرنے میں مشغول ہیں جن سے بچوں اور بچیوں کی اصلاح ہو۔ یہ مقصد بہت وقیع ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے۔ بڑی بی اور دیگر کہانیاں "اصلاحی کہانیوں" کا مجموعہ ہے۔ عام اصلاحی کہانیوں کی طرح روکھی پھیکی نہیں۔ بلکہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں۔ فاضل مصنف کی نظر میں تہذیب مغرب کا سیلاب موجودہ نسل کو تباہی کے غار کی طرف لے جارہا ہے۔ اور اسی اساسی خیال کے ماتحت انہوں نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔

بقائے دوام بھی فاضل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے ایک پہلو کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے "روح" کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ اور اس ضمن میں علمائے مغرب کے اکثر انکشافات اور کئی حیرت انگیز حقائق کا ذکر کیا ہے۔

ثریا — مصنفہ۔ نذر سجاد حیدر۔ مقام اشاعت۔ اخبار دور جدید قیمت ۱۲ر

مجھے یہ ناول پڑھکر غالب کا ایک شعر یاد آگیا

چیست بلب خندہ از عتاب شکستن
رونق پروین نہ آفتاب شکستن

حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں "آفتاب" نے "رونق پرویں" کے لطافت وضیاباری کو کسی طرح بھی کم نہیں کیا۔ یعنی سید سجاد حیدر صاحب کی لطافت تحریر اور رنگینی انداز کے مقابلے میں نذر سجاد حیدر صاحب کے انداز کی دلکشی کسی طرح بھی کم نہیں معلوم ہوتی۔ ثریا ایک معاشرتی افسانہ ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ ان تمام غیر فطری عناصر سے پاک ہے جو عام طور پر ایسے افسانوں میں نظر آتے ہیں "کردار" ہماری طرح چلتے جاگتے چلتے پھرتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ موم کی گڑیاں نہیں پلاٹ دلچسپ ہے اور انجام متوقع۔ غرضیکہ ہر طرح یہ افسانہ مطالعہ کے قابل ہے۔

نئے رسالے

"ادب" سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اب تک جتنے نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر صاحب موصوف رسالے کو بہت محنت اور لیاقت سے ترتیب دیتے ہیں۔ علمی تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا عنصر غالب ہے۔ اور فاضل مدیر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ رسالے کو اس مہلک عنصر ادب سے پاک و صاف رکھتے ہیں۔ جس کو "ادب لطیف" کا لقب دیا جاتا ہے۔

مضمون نگاروں میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "ادب" "ادب کے تمام مظاہر کا نہایت اچھا آئینہ دار ثابت ہوگا۔

ساقی:۔ شاہد احمد بی۔ اے (آنرز) کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ مقاصد سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مدیر اردو میں "نثر شاعری" کے نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں میں ذاتی طور پر اس صنف ادب کا مداح نہیں۔ لیکن میں پبلک کے ذوق کی نمایندگی کا دعویدار بھی نہیں۔ غالباً کیا یقیناً بہت سے اصحاب "نثر شاعری" کو پسند کرتے ہونگے۔ اب تک جسقدر مضامین ساقی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اکثر حصہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ مضمون نگاروں میں ناصر نذیر فراق۔ اثر صہبائی۔ قاری سرفراز حسین صاحب کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ رسالے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرائی جاسکے۔

مغل میگزین:۔

مقام اشاعت مراد آباد!

ایک مختصر سا رسالہ ہے جس کا مقصد مغلوں کی تہذیب ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل میں مفید اور نتیجہ خیز مضمون شائع کرتا ہے۔ مغل اصحاب کو چاہیئے کہ اپنے ملی رسالے کی سرپرستی فرمائیں۔

رسالہ آواز:۔

ایڈیٹر مبارک حسین۔ مقام اشاعت ملانہ ضلع انبالہ۔ سالانہ چندہ ۲/

یہ رسالہ دو سال سے قصبہ ملانہ ضلع انبالہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد اشاعت ملکی معاشرات کی اصلاح۔ زراعت کی ترقی، اور کوآپریشن کی حمایت ہے۔ اور ان موضوعات پر اچھے مضامین شائع کرتا ہے۔ کتابت و طباعت گوارا ہے۔ سرورق سہ رنگا ہے۔ ایک آدھ تصویر بھی ہوتی ہے۔

جواہر اللغات:۔ مقام اشاعت۔ رام نرائن پبلشر الہ آباد

یہ مختصر سی لغت پاکٹ اڈیشن پر شائع ہوئی ہے اور ۵۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ عام طور پر الفاظ کے صحیح معنی دئے گئے ہیں اور وہ تمام لفظ جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ درج کر دئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف بارہ آنے ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ان داموں کسی طرح بھی مہنگی نہیں۔ کتابت و طباعت بھی گوارا ہے۔

ع

اب دورِ نو کشیدہ اک انجمن میں ہے — میری شرابِ کہنہ سبوئے کہن میں ہے

یارب نصیب ہو مری طبعِ حزیں کو بھی — جو انبساط خندۂ صبحِ وطن میں ہے

ہونا ہے جسکو خاک وہ دنیا کی کائنات — دو گز کفن ہی یا اسی دو گز کفن میں ہے

مانے نہ مانے کوئی مگر یہ کہیں گے ہم — جانِ سخن ریاضؔ جہانِ سخن میں ہے

انجم

معصوموں کی دُنیا

(از قلم جناب فاخر ہریانوی: بی۔ اے)

حُسن کی معصوم تصویریں ہیں یہ کم سن ابھی
بچپنے کی نیند میں کٹتے ہیں اِن کے دن ابھی

کِسقدر بشاش ہیں آزاد ہیں دل شاد ہیں
کچھ فرشتے ہیں کہ باغِ خلد میں آباد ہیں

اِن کے چہرے ہیں منوّر برقِ شمعِ طور سے
صبح کی مانند روشن ہیں جبینیں نور سے

آہ کیا جانیں یہ کیا ہوتے ہیں غم انسان کو؟
دیکھتے ہیں آج کن نظروں سے ہم انسان کو؟

آہ کیا جانیں یہ کرتی ہے ستم تقدیر کیا؟
ہے ہماری زندگی کے خواب کی تعبیر کیا؟

پل رہے ہیں فطرتِ معصوم کی آغوش میں
جلد لے آئیگی لیکن اِن کو دنیا ہوش میں

میرے بس میں ہو تو میں اِنکو جواں ہونے نہ دوں
پائمالِ انقلابِ آسماں ہونے نہ دوں

(غیر مطبوعہ)

فاخر

دنیائے ادب

بہائی مذہب

اور

اتحادِ مذاہب

مذہبی بے اطمینانی نے اہل یورپ کو مشرقی مذاہب کی طرف شدت سے متوجہ کر دیا ہے۔ اور اب وہ ان کے اندر اپنی روحانی طمانیت کا سامان ڈھونڈ رہے ہیں۔ بالخصوص جدید مشرقی مذاہب کے ساتھ اُن کو اور بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہائی مذہب کے ساتھ جو مشرقی مذاہب میں ایک جدید مذہب ہے۔ ان کو بہت زیادہ شغف پیدا ہو گیا ہے۔ مصر کے ایک صاحب نظر نے اہل یورپ کی اسی دلچسپی کے سلسلہ میں اپنا ایک نہایت دلچسپ ذاتی واقعہ بیان کیا ہے۔ جس سے بہائی مذہب کے بعض نظریات و معتقدات کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ کا زمانہ گذرا کہ میں نے مذہبی تحقیقات و مطالعہ کی ابتداء کی اور رفتہ رفتہ یہ ذوق اس قدر بڑھا کہ دوست و احباب کی ملاقات کا کوئی موقع اس دلچسپ بحث سے خالی نہ جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک بار میں نے اسکندریہ کا سفر کیا۔ اور وہاں ایک شخص سے میرے دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے۔ جو میرا ہم مذاق تھا اور اس حیثیت سے عباس عبد البہا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور قریب انھیں کا ہم عقیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھکو بھی ان کی ملاقات کی ترغیب دی اور کہا کہ "تم جس قسم کے مذہبی مباحث کی جستجو کتابوں میں کرنا چاہتے ہو ان کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کر لوگے۔ میں اس وقت تک ایران کے جدید پیغمبر عبد البہا سے واقف نہ تھا۔ لیکن جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھکو ایک نہایت باوقار بزرگ معلوم ہوئے جن کے چہرہ سے زہد و تقشف سے زیادہ علم و تجربہ کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے کمرے میں ایک منشی ایک کرسی پہ الگ بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ایک خط لکھوا رہے تھے۔ اور اس کی نسبت بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ترکی وزیر جنگ شوکت پاشا کے نام کا تھا۔ اُنھوں نے پہلے ہم کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ اور جب خط لکھوا کر فارغ ہوئے تو ہمارے لئے ایک نہایت دولتمند ایرانی رئیس چائے لایا اور جب تک ہم چائے پیتے رہے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے چائے کی پیالیاں اُٹھائیں اور ادب سے اُلٹے پاؤں واپس گیا۔ تاکہ عبد البہا کی طرف پشت نہ ہونے پائے۔ اس وقت کسی قدر ترشح ہو رہا تھا۔ اس کے بعد نصف گھنٹے تک خوب بارش ہوئی۔ پھر آسمان صاف ہو گیا۔ اس حالت میں ہم لوگ ایک بند کمرے میں بیٹھے ہوئے شیشے کی کھڑکیوں سے گھر کے باغ کا جس کے درختوں کے ساتھ ہوائیں چہل کر رہی تھیں۔ نظارہ کر رہے تھے۔ اور ان کی شادابی و تر و تازگی کو دیکھ رہے تھے۔ عبد البہا نے بھی ان درختوں کو دیر تک دیکھا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ اور ہم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اور ہم کو ایک گہری نیند سے بیدار کر رہے ہیں۔ پھر اُنھوں نے فرمایا۔

سبحان اللہ! ہر چیز کو اس کی روزی مل ہی جاتی ہے۔ جہاں درخت ہوتے ہیں وہاں پانی برس ہی جاتا ہے۔ لیکن میں نے کہا "یا یہ کہ جہاں بارش ہوتی ہے وہاں درخت اُگ ہی جاتے ہیں"

آپ اُنھوں نے میری طرف بغور دیکھ کر فرمایا

"ایسا بھی ہو سکتا ہے"

میں نے کہا تو ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

اُنھوں نے ایک نہایت باوقار ترنم ریز لہجے میں فرمایا۔

دونوں باتیں قریب قریب ایک ہی ہیں اور دونوں یکساں طور پر صحیح ہیں۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا۔

ہم صرف اُس نقطۂ اتحاد کو دیکھتے ہیں جہاں دو باتوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ اُس نقطہ کو نہیں دیکھتے۔ جہاں سے ان کے اختلافات کی

یہ ممکن ہے کہ سرخ "کو اس وقت تک زندگی کا رنگ کہا جائے
جبتک یہ رنگ پوشیدہ رہے۔ ظہور کے بعد یہ رنگ دغا، فریب اور اسراف
ناجائز کا نشان بن جاتا ہے۔

یہ رنگ زندگی کا راز ہے۔ زندگی کا مظہر ہے۔

یہ ان چیزوں میں سے ایک چیز ہے جس کی قیمت ان کی پوشیدگی
میں مضمر ہے۔

زندگی کا اصل رنگ جسم کا رنگ ہے۔ چھپا ہوا ڈھکا ہوا۔ سرخ رنگ
دھڑکتے ہوئے دل اور بے قرار لوگوں کے خون کا چھپا ہوا رنگ۔ اپنی تابانی
لطافت۔ نرمی۔ امتزاج کے اعتبار سے یہ رنگ باقی تمام رنگوں پر فوقیت
رکھتا ہے۔

اس کا حسن یہ ہے کہ سفید رنگ ہے۔ مگر دودھ سے کم سفید۔ سرخ
مگر شفق سے کم۔ سرخ۔ صاف ولطیف مگر سونے سے کم۔ صاف ولطیف۔
اس رنگ میں سونے کے سے رنگ کی جھلک ہے۔ اور سونے کا سا رنگ
جو ہر اچھے رنگ میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس رنگ میں تو یہ عنصر ایسا نازک
ہے کہ دام نظارہ میں آتا ہے۔ اور نکل جاتا ہے۔ آتا ہے اور نکل جاتا ہے
سسلی کے آسمانوں کے یہ رنگ ہاتھی دانت کے رنگ سے زیادہ گہرا ہے
لیکن لندن کے دھندلکے میں یہ رنگ ایسا لطیف اور نفیس ہے گویا گلاب
سے گلاب کے پھول تاروں کی چھاؤں میں کھل رہے ہوں۔

بیتے گذر جاتے ہیں اور لندن کے لئے اس رنگ کی تابانی سے لطف
اندوز نہیں ہوسکتے۔

انسان چہرے پر گہرے درد وغم اپنی مہریں ثبت کر دیتے ہیں۔ اور گلاب
کی شگفتگی سے تازگی کی روح کھینچ لی جاتی ہے۔ لندن کے لوگوں کے
چہرے اپنی اصلی حالت پر نہیں رہتے۔ ہاں جب کبھی سورج نمودار ہوتا
ہے اور دنیا کو نور کے ایک سیلاب میں غرق کر دیتا ہے تو زندگی کا رنگ
پھر شگفتہ ہوجاتا ہے۔

سمندر کے کنارے یہ رنگ اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

مجھے ایک اس قسم کا منظر یاد ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور لمحہ لمحہ دم بدم رنگ کی گہرائی اور سرخی بڑھ
رہی تھی۔ سمندر کا رنگ نیلا۔ گہرا نیلا۔ بہت گہرا۔ نیلم کی طرح نہیں بلکہ اس
طرح کہ اسکو کسی شے سے تشبیہ دی جاسکتی۔ سمندر خود بھی گہرا تھا۔
ہر شے سادہ اور صاف معلوم ہوتی تھی۔ اسرار و رموز سے خالی۔ اس
منظر میں سب سے زیادہ روشنی سے چمکنے والی سفید سفید جھاگ
تھی جس میں تین تین سونے اور گلاب کے رنگین نقطے اور درخشاں
شعاعیں پائی جاتی تھیں۔

جاپانی شاعری کے چند نمونے

بانس اور طوفان

بانس زمیں کے ساتھ لگ گیا ہے! نازک ولطیف بانس۔ برف کے
ظالم بوجھ کے نیچے یہ آسمانی پرواز زمیں کے ساتھ لگ گیا ہے۔

آہ! ظالم۔ سرد مہر۔ برف!

طوفان فرو ہو چکا۔ اور دیکھو بانس کس طرح بلند تنا ہوا۔ مغرور قائم ہے
فطرت پھر مسکرا رہی ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ کہاں ہے وہ برف جو
بانس کو پیغام موت دینا چاہتی ہے۔

بلبل

میں چاہتی ہوں کہ پردے ہٹا کر بلبل کو دیکھ لوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ
وہ ڈر جائے گی۔ ڈر جائے گی اور اڑ جائے گی۔ اور اس لئے میں خود ڈرتی
ہوں۔ کانپتی ہوئی پردے کے پیچھے کھڑی ہوں جذبات کے اس سیل کے
ساتھ بہی جارہی ہوں جو اس کے نغموں سے پیدا ہے۔

بہار

آہ! لطیف وسبک بہار! ہر زندہ شے۔ ناقابل بیان حسن کے سانس نکل
رہے ہیں۔ پھول محو پرواز ہیں۔ اور تیتریاں پھولوں کی طرح ہوا کو معطر کر رہی
ہیں۔ ان میں سے پھول کون سا ہے۔ اور تیتری کونسی۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا

ٹوکیگبر کے کنارے دو میل تک بیر کے درختوں کی برف شال پنکھڑیاں
وادی کو روشن کر رہی ہیں۔ چینی باغوں کی خوشبو آ! اس رنگ و بو کی مجلس
کے سامنے ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔ یہ رنگ و بو کا سمندر!
کئی دن ہوگئے کہ میں اس باغ سے واپس آگیا ہوں۔ لیکن میری
آستینیں ابتک اس خوشبوئے لطیف سے معطر ہیں۔

تیتری

اے نو پرواز تیتری! تو پھولوں میں ایک پھول کی طرح محو پرواز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی پھول کوئی غنچہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو اس کو عشق کے رموز سے آشنا کریگی۔ یا اس کو ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا چھوڑ کر کہیں اور چلی جائیگی۔
اے محو پرواز تیتری

پشتو

تینوں یکساں ہیں

اس کا چہرہ۔ چاند اور سورج تینوں یکساں ہیں۔ قد معشوق۔ سرو اور صنوبر تینوں یکساں ہیں۔

مجھے شہد اور شکر کی حاجت نہیں۔ اس کے لب۔ شہد اور شکر تینوں یکساں ہیں۔

اگر اس کے بغیر بستر پر لیٹتا ہوں تو میرے لئے آگ کانٹے۔ اور وہ بستر تینوں یکساں ہیں۔

جب میں اس کے در و دیوار پر نظر کرتا ہوں (تو معلوم ہوتا ہے) کہ باغ بوستان۔ اس کا گھر تینوں یکساں ہیں۔

خدا کرے! کوئی ہجر یار کی خبر نہ سنے۔ سُننا۔ مرنا اور یہ خبر تینوں یکساں ہیں۔

اس کے کوچے سے غبار اُٹھتا ہے (اور) مشک اور عنبر اور یہ غبار تینوں یکساں ہیں۔

انسان جب دنیا سے اُٹھے (تو اس کے لئے) راکھ چاندی اور سونا تینوں یکساں ہیں۔

فقیر اگر درحقیقت فقیر ہے (تو) وہ امیر اور بادشاہ تینوں یکساں ہیں
اس سرزمین پر کوئی پھل پھول نہیں سکتا (یہاں) اندھا۔ بہرا۔ بینا تینوں یکساں ہیں۔

(دیوان رحمان) (قادر انبالوی)

جرمنی

شعر

شاعر آئینہ خانۂ حیات میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسے ہر طرف عالم قدس کے جلوے نظر آتے ہیں۔ وہ حسن کائنات کو بے حجاب دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ظاہری پردوں سے گذر کر اشیا کی حقیقت تک آتی جاتی ہے۔ اسے ذرہ میں آفتاب دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر شئے میں شانِ جمالی کے کرشموں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سورج کا مشرق سے نمودار ہونا۔ تمام دن کشتِ جہاں کی نور سے آبیاری کرنا۔ پھر غروب ہو جانا۔ ستاروں کا جگمگانا۔ چاند کا نور برسانا۔ کہکشاں کی ندی کا بہنا۔ بادلوں کا آسمان پر چھانا۔ بجلی کا چمکنا۔ مینہ کا برسنا۔ آبشاروں کا شور۔ پانیوں کا زور۔ سبزے کی شادابی۔ پھولوں کی رعنائی۔ درختوں کا جھومنا۔ پرندوں کا چہچہانا۔ قوس وقزح کی رنگینیاں شفق کی دلفریبیاں یہ اور عالم موجودات کے ہزاروں ایسے خوشنما مناظر کس مشاہدے میں آتے ہیں۔ جن کا عکس اسکے آئینۂ دل میں اُتر کر نقش ہو جاتے ہیں آخر یہی نقوش موسیقی بنکر اُس کے لفظوں کے ذریعے باہر نکلے آتے ہیں۔ اسکا نام شعر ہے

سر محمد اقبال

یونانی

میں کون ہوں؟

دنیا کی تاریک اور بھیانک رات میں میں تمھارے لئے مشعل راہ بنا۔ تمھاری خوشی میں شریک ہوا۔ تمھارے رنج کو محسوس کیا اور جب تم کو

میری جان کی ضرورت تھی تو مرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ بتاؤ کہ میں کون ہوں؟

تمھارے آرام کی خاطر میں نے اپنے آرام کو چھوڑا۔ تمھارے لئے سردی کی شدت اور گرمی کی تپش کو برداشت کیا۔ تمھاری خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو پھاندا۔ گنجان وادیاں کو روندا۔ دریاؤں کو عبور کیا۔ ڈراؤنے جنگلوں سے گذرا۔ مصیبتوں کو دیکھا۔ تکالیف کو برداشت کیا۔ یہی نہیں بلکہ صرف تمھارے لئے گھمسان کی لڑائی میں سب سے اگلی صف میں سینہ سپر ہوکر لڑا۔ بتاؤ اے یونان کے باشندو! میں کون ہوں؟

لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ دشمن بھاگ چکے ہیں۔ ان کے بھاگنے کی آوازیں ابھی آرہی ہیں۔ چاروں طرف میرے ہموطنوں کی لاشیں پڑی میری قربانی کی یاد رہ رہ کر دلا رہی ہیں۔

آہ! میں نے بھی انھیں مجبور کیا تھا اور ان کی موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ مگر نہیں! یہ زندہ ہیں۔ یونانیوں یہ تمھارے شہید ہیں۔ انھوں نے تمھاری خاطر اپنی آرزوؤں۔ اپنی تمناؤں۔ اپنی امید دل۔ اپنے جذبات اور حسیات کو قربان کر دیا۔ تم بھی ان کی قدر کیجیو۔ ہاں! ہم فاتح ہیں نہیں یہ زمین پر لیٹنے والے، یہ خاک و خون میں تڑپنے والے فتح کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان میں کوئی میرا دوست ہے۔ کوئی عزیز ہے۔ ادھر میرے بچپن کے دوست ہیں۔ اُدھر رشتہ دار ہیں۔ میں نے ان سب کو تمھاری خاطر قربان کر دیا۔ بتلاؤ کہ میں کون ہوں؟

میں نے تمھاری خاطر دن کے آرام۔ رات کے چین کو قربان کیا۔ میں کون ہوں؟ ہم سب جیت چکے ہیں۔ آدھے مر چکے ہیں۔ کچھ زخمی ہیں نڈھال ہیں۔ تھکان سے چور ہیں اور باقی خوشی کے نقارے بجا رہے مجھے نہ فتح کی خوشی۔ نہ دوستوں۔ رشتہ داروں کی موت کا غم۔ میرا دل بڑھ چکا ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ مگر اس کے دوسری طرف کی مسرت دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ کبھی آنسو نکلتے ہیں کبھی آتی ہے۔ مگر میں خاموش ہوں۔ مستقبل کی تاریکیاں میری آنکھوں سامنے آرہی ہیں۔ نہ ہنسنے کا مقام ہے۔ نہ رنج و غم کا وقت۔ کیونکہ رات ہونے کو ہے۔ ستارے جھلملا رہے ہیں۔ جسم کی روشنی وسعت پر نمودار ہونے کو ہے۔ لو! کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر گھمسان کی لڑائی ہو گی۔ تمام دن کی تگ و دو ہو گی۔ اور ہم ہوں گے پھر وہی سروں کی بازی ہو گی۔ جان کے کھیل ہوں گے۔ نہ ہنسنے ملے گا۔ نہ رنج و غم کا وقت۔ آج بچ گیا ہوں۔ خدا جانے شام بھی نصیب ہو گی۔ میں نے تمھاری خاطر سب کچھ کیا۔ بتلاؤ کہ میں کون ہوں

بنگالی

بہار گذر چکی ہے۔ اور خزاں کا دور دورہ ہے۔ پھول مرجھا مرجھا کر گر رہے ہیں۔ پتیاں سوکھ سوکھ کر ٹہنیوں کو عریاں کر رہی ہیں۔ گل کی شادابی کلیوں کی مسکراہٹ۔ پتیوں کی دلفریبی اور سبزے کی لہلاہٹ میں ایک انقلاب رونما ہو چکا ہے۔

سورج ہر صبح لاکھوں کے خون تمنا میں نہا کر افق مشرق پر جلوہ فگن ہوتا ہے۔ اور اسی شام ہزاروں کی امیدوں۔ آرزوؤں کو ساتھ لیکر افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ دن گذر جاتا ہے۔ کسی کو یتیم بنا دیتا ہے۔ کسی کو لاوارث چھوڑ دیتا ہے۔ کسی کو بے دست و پا اس بحر ذخار میں تکالیف و مصائب کی موجوں کے بس میں چھوڑ کر خود دور ابد کی تاریکیوں میں پناہ لیتا ہے۔

آج میرے دل کا آرام۔ میری جان کا سکھ۔ میرا پیارا دوست اس دار فانی سے کوچ کر گیا ہے۔ میں اُداس ہوں۔ حیران ہوں۔ مجبور ہوں اور یاس و حسرت کا پتلا ہوں۔ میری دل کی دنیا میں ایک طوفان برپا ہے۔ ایک کشمکش ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ مگر دنیا سرد ہے۔ باہر کسی کو بھی نہیں۔

کسی کی امید دل کا خاتمہ ہو چکا ہے کسی کی آرزوؤں کا خون ہو مگر دنیا کو خبر تک نہیں۔ وہی رنگینیاں ہیں۔ وہی دلفریبیاں ہیں۔ سورج اسی طرح اپنی ضیا پاش کرنوں سے کشتِ ہستی کو سیراب کر رہا ہے چاند بھی دنیا کو اسی طرح منور کرے گا۔ تاروں کی ٹمٹماہٹ اور سبزے لہلاہٹ میں بھی کوئی فرق نہ آئیگا۔ ایک کا دل ٹوٹ چکا ہے اور کسی تک نہیں۔

صبح کا بیٹھا ہوں۔ اور رات ہو چکی ہے۔ ستارے جھلملا رہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں۔ اور میں ہو محبوب کی قبر پہ بیٹھا محو حیرت ہوں۔

دل یہی چاہتا ہے کہ دنیا آج ہی ختم ہو جا۔ آسمان پھٹ جائے۔ زمین کے پرخچے اُڑ جائیں۔ مگر ایک امید موہوم۔ اور خیال خام ہے۔

تعداد اشاعت ۵ ہزار — ادبی دنیا کے ہر مضمون نظم و نثر کا حق تصنیف بحق ادبی دنیا محفوظ ہے — ادبی دنیا۔ لاہور

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۲) بابت ماہ جولائی ۱۹۳۰ء نمبر (۷)

تصاویر:- سہ رنگی:- (۱) حسن کی فتح - ایک رنگی: (۲) حکیم افلاطون - (۳) ارسطو (۴) چمن زاد (۵) محو خیال (۶) نورانی خواب (۷) ہنجو محبت

(مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال و قال

ادبی دنیا کی تصاویر

یہ عرض کرنا خودستائی نہیں بلکہ اظہار بہ حقیقت ہوگا کہ "ادبی دنیا" نے تصاویر کا جو معیار قایم کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ اس کی تصاویر کے معیار کی رفعتوں تک نہ پہلے کسی حریف کار کا گزر ہوا تھا اور نہ اب تک باوجود ہزاروں کوششوں کے وہاں تک کسی کی رسائی ہوئی ہے ۔

جن حضرات کو آرٹ اور صنعت تصاویر سے دلچسپی ہے اور جو اس کے حسن و قبح کو سمجھنے کے اہل ہیں اُنہوں نے "ادبی دنیا" کی تصویروں کے بلند معیار کے نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے ۔ اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی زبان کے کسی رسالے کی تصویروں کو آجتک وہ بات نصیب نہیں ہوئی ہے جو ادبی دنیا کو روزِ اول سے حاصل ہے۔ ادبی دنیا کے لئے تصاویر کے انتخاب میں ہمیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُنہیں ہمیں خوب جانتے ہیں ۔ اگر ہمارے پیشِ نظر صرف اتنی ہی بات ہوتی کہ ہر مہینہ چند تصاویر شایع کردیجایا کریں اور بس ۔ تو یہ کچھ بھی مشکل کام نہ تھا ۔ تصاویر کی آجکل کوئی کمی نہیں ہے ۔ آسانی سے تصویریں ملسکتی ہیں ۔ اور انہیں ایک چھوڑ پانچ پانچ اور چھ چھ رنگوں میں چھپوایا بھی جاسکتا ہے لیکن ہمارا مطمعِ نظر صرف یہی نہیں ہے کہ چند یک رنگی ، دو رنگی اور سہ رنگی تصویریں شایع کردی جایا کریں ۔ خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں ۔ بلکہ ہم تو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادبی دنیا کے لئے ایسی تصویریں منتخب کی جائیں جن میں باعتبار فن کوئی نقص نہ ہو ۔ تصاویر میں عریانی اور سوقیت نہ ہو ۔ ایسی تصویریں نہ ہوں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزریں ۔ وہ جاذبیت اور کشش سے بھی عاری نہ ہوں ۔ اور ان سب کو مستزاد یہ کہ ہر تصویر میں آرٹ کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضروری موجود ہو ۔ اگر ان تمام امور پر ناظرین بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو انہیں بھی ان دشواریوں اور دقتوں کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے جو ہمیں انتخاب تصاویر کے معاملہ میں پیش آتی ہیں ۔

ان تمام مشکلات کے باوجود ہم نے ادبی دنیا کے معیار تصاویر کو آجتک قائم رکھا ہے ۔ اور آئندہ بھی اسے بدستور قایم رکھیں گے ۔ بلکہ اس میں مزید ترقی کی کوشش کرتے رہیں گے کیونکہ ہمارے ذہن میں ادبی دنیا کی تصاویر کا جو معیار موجود ہے وہ اس سے کہیں ارفع اور بلند ہے ۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ ہمیں توی امید ہے کہ اگر خدائے قدیر کا فضل ہمارے شامل حال رہا اور ادبی دنیا کے قدرشناسوں کی توجہات خصوصی بدستور باقی رہیں تو وہ دن دُور نہیں ہے جب ہم ادبی دنیا میں اُسی معیار کے مطابق تصاویر شایع کرسکیں گے ۔ جو ہمارے پیشِ نظر ہے ۔

اِس سلسلے میں ہمیں قارئین ادبی دنیا سے بھی چند درخواستیں کرنی ہیں اول یہ کہ جو حضرات آرٹ سے واقفیت رکھتے ہیں اور صنعت تصاویر میں اُنہیں کچھ درک حاصل ہے وہ ازراہِ کرم ادبی دنیا کی تصویروں کے متعلق اپنی رائے اور مشورے سے ہمیں آگاہ فرماتے رہیں ۔ تاکہ ہم اُن کے قیمتی مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کریں ۔ دوسرے جن صاحب ذوق حضرات کے پاس تصاویر کے البم ہوں وہ اپنے البم سے ہمیں تاریخی تصاویر، مناظر کی تصاویر اور آرٹ سے متعلق تصویریں مستعار عنایت فرماکر ممنون فرمادیں ۔ ہم نہایت احتیاط کے ساتھ ان تصویروں کے بلاک بنواکر واپس کردینگے ۔ اور ایسے کرمفرماؤں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں گے ۔ جن حضرات کے پاس خود تصاویر کا ذخیرہ نہ ہو وہ ہمیں ایسے اصحاب کے پتے عنایت فرمائیں جن کے پاس اُنہوں نے بہتر قسم کی تصویریں دیکھی ہوں یا اُنہیں کے پاس اس قسم کی تصویروں کا علم ہو ۔

اگر قارئین ادبی دنیا نے ہماری اس درخواست کی طرف توجہ فرمائی تو وہ دیکھیں گے کہ ہم ادبی دنیا کی تصویروں کا معیار کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں

ادبی دنیا کے مضامین

ادبی دنیا میں ہمیشہ اِس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع اور دلچسپی پیدا کیجائے ۔ اور انکی ترتیب بھی پسندیدہ ہو تاہم ہم قارئین ادبی دنیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مضامین کی نوعیت اور ان کی ترتیب کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرمائیں کہ کس قسم کے مضامین زیادہ ہوں کس قسم کے مضامین کم ہوں ۔ اور کس قسم کے مضامین نہ ہوں ۔ یا اگر وہ مضامین کی موجودہ نوعیت اور ترتیب ہی کو پسند کرتے ہوں تو اس کا بھی اظہار فرمائیں ۔ ہم ان آراء کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اپنے خیالات بھی پیش کرتے رہیں گے ۔ اور اخیر میں کثرت رائے کا جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کرنے کی انتہائی کوشش کرینگے ۔ اور ادبی دنیا کو معاونین ادبی دنیا کی خواہش کے مطابق مرتب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرینگے ۔ کیونکہ ادبی دنیا اسی لئے جاری ہے کہ اس سے اسکے قارئین کے

آئینۂ عالم

پروفیسر آرنلڈ آنجہانی

۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو مشہور مستشرق سر ٹامس واکر آرنلڈ نے عالم فانی سے خیرباد کہا۔

پروفیسر صاحب موصوف ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے آپ نے سٹی آف لنڈن اور میگڈالین کالج کمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر رہے۔ دس برس تک محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے سٹاف میں شامل رہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند کے مشیر تعلیم مقرر ہوئے اور ۱۹۲۰ء تک اپنے فرائض کو غیر معمولی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

آپ کو مشرق و اہل مشرق سے بہت دلچسپی تھی۔ اور جس ہمدردی بیدار مغزی اور استقلال سے اپنے عہدوں کے فرائض کو انجام دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں دلچسپی ہی نہ تھی بلکہ اس میں گہری ہمدردی کا رنگ تھا۔ تعلیمی اداروں کی ترقی اور طریق تعلیم کے ارتقا کے متعلق ان کی کوششیں ہمیشہ یادگار رہینگی۔

یوں تو یورپ میں مستشرقین کی کمی نہیں ہے لیکن ایسے فاضل بیدار مغز حضرات بہت کم ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف کی طرح کسی غیر ملک کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کیلئے اپنی عمر وقف کر دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کو نور علم سے مستفید کرنے میں ان کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آخر عمر تک وہ لنڈن میں بیٹھے ہوئے بھی ان ہندوستانی طلبا کی رہنمائی کرتے رہے جو تعلیمی سلسلوں میں انگلستان جاتے تھے۔

ایک روشن خیال اور بیدار مغز حکمران خاتون

بھوپال کی علم پرور و علم نواز حکمران ہز ہائی نس سلطان جہان بیگم صاحبہ کی وفات سے دنیائے علم و ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کبھی نہ ہوسکیگی۔ مرحومہ کی علمی فیاضیوں سے سینکڑوں علمی ادارے مستفید ہو رہے ہیں۔ جامعہ اسلامیہ دیوبند مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ دارالعلوم ندوہ اور اس قسم کی ملکی اور بیرونی درسگاہیں چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے بھوپال کی فیاضانہ امداد سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔

علامہ شبلی کی گراں مایہ تصنیف (جسے بلاخوف تردید دور حاضر کی سب سے زیادہ اہم تصنیف کہا جاسکتا ہے) سیرۃ النبی اس علم دوست بیگم کی مسلسل و بیش بہا امداد سے اردو ادب کو نصیب ہوئی۔ اور شبلی کو یہ کہنے کا موقع ملا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستاں غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مرحومہ خود بھی ایک مقتدر مصنفہ تھیں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ان کی جو گراں قدر تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ وہ یقیناً بہت جلدی فنا ہو جانے والی نہیں۔

ذوق علم کے ساتھ مرحومہ کو فطرت نے حقیقی معنوں میں حکمرانی کا اہل بنایا تھا۔ چنانچہ ان کے طویل اور خوشگوار دور حکومت کے واقعات شاہد ہیں کہ سلطانہ رضیہ کو پیدا کرنے کے بعد فطرت ہندوستان کی طرف سے بے پروا نہیں ہوگئی۔

سائمن کمشن کی رپورٹ

سائمن کمشن کی رپورٹ کا پہلا حصہ شایع ہو چکا ہے۔ اس حصے کو سفارشات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس مرحلے پر کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرے حصے کے شایع ہونے کے بعد ادارت کی طرف سے اس پر ایک جامع تبصرہ شایع ہوگا۔

تاجور

ادبی دنیا ہر ماہ باقاعدہ خریداروں کی خدمت میں بھیجدیا جاتا ہے۔ جن کے پاس رسالہ ۱۰ تاریخ تک نہ پہنچے وہ مقامی ڈاک خانے کی شکایت صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل کو کریں۔ - مینجر

بادشاہ اور بھکارنی

(حسن کی فتح)

مصور:- سر اڈورڈ برن جونز

بعض نقاد اس تصویر کو مصور کا شاہکار تصور کرتے ہیں مصور کی چابکدست انگلیوں نے کینوس پر ایک غیر فانی افسانۂ محبت کے رنگین و روشن تاثرات منتقل کر دئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ برن جونز کو فطرت کی طرف سے ایسی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں کہ وہ اس کہانی کو تصویری جامہ پہنانے کا بوجہ احسن اہل تھا۔ اس نے تخیل کی ایک دنیا آباد کی تھی۔ اور اس دنیا میں ایسے ایسے افراد تخلیق کئے تھے جو انسان کی پرواز ذہن کا منتہائے مقصود کہلا سکتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کو روشن اور دلفریب بنا سکتا تھا۔ اس کی قوت تخیل واقعتاً یہ محسوس کر سکتی تھی سنے ہوئے نغمے شیریں ہیں لیکن ان سنے گیت شیریں تر ہیں۔ اس اعتبار سے اپنی صدی کے مصوروں میں اسے ایک امتیازی رتبہ حاصل ہے۔ لارڈ ٹینس نے جن الفاظ میں "بھکارنی" کی تعریف کی ہے۔ وہ اس تصویر میں "رنگ" کا جامہ پہن کر روشن ہیں۔

اس کے کہنہ پیرہن میں اسکا جسم زرنگار
اسطرح روشن تھا جیسے بدلیوں میں ماہتاب
کوئی کہتا پاؤں اس کے یاسمن کے پھول ہیں
کوئی کہتا تھا ستم ہے اسکی چشم نیمخواب
بال اُسکے عنبر افشاں۔ رشک شبہائے بہار
حسن اسکا۔ لالہ زار دلبری جان شباب

مصور نے بھکارنی کے چہرے پر مختلف جذبات کو منعکس دکھایا ہے۔ تحیر۔ اندوہ۔ فرشتہ مثال معصومیت (۔ سادگی وہ ایک ناقابل بیان انداز میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ اس کے حسن کے شیریں جلوے کسی اور دنیا کے جلوے معلوم ہوتے ہیں۔ اسقدر نازک اور لطیف گویا ابھی فضا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ فردوس کی طرف پرواز کر جائیں گے۔ وہ ننگے پاؤں ہے۔ اور حسن و جمال کی اس تصویر کے قدموں پر ایک شہنشاہ کی مہابت و عظمت جھکی ہوئی ہے۔

مصور نے صرف موضوع کی رومانیت ہی کو اچھی طرح ادا نہیں کیا بلکہ اس کے کمال فن نے جزئیات کی تکمیل اور رنگوں کے امتزاج میں بھی ایک حیرت انگیز اثر حسن پیدا کر دیا ہے۔ وہ حسن جو صنعت کی جان ہے۔ اس تصویر میں تخیلی قوت اور صناعانہ چابکدستی کو اس طرح ملایا گیا ہے۔ کہ بے مثال شاہکار ہمیشہ کے لئے دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک طوفان مسرت پیدا کر دیگا۔

شوخ اور گہرے رنگوں کا استعمال تصویر کے اجزا کا باہمی تناسب اور پھر کلی اثر سے ان اجزا کی مناسبت ایسی چیزیں ہیں جو ذہن کو مرعوب بھی کرتی ہیں اور متحیر بھی۔

بادشاہ کے ہاتھ میں تاج شاہی ہے۔ یہ تاج شاہی گویا شہنشاہیت کی تمام عظمت و قوت کا مظہر ہے جو بھکارنی کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

آجکل یہ تصویر ٹیٹ گیلری میں آویزاں ہے۔ اس سے پہلے حسن و رنگ کا یہ شاہکار ارل آف وارنکلف کی ملکیت تھا۔ ان کی وفات کے بعد چند شخصوں نے مل کر یہ تصویر ۶۵۰۰ پونڈ میں خرید لی۔ اور ایثار سے کام لیتے ہوئے عوام الناس کے لئے وقف کر دی۔

اس سے پیشتر بھی "ادبی دنیا" میں برن جونز کی تصاویر شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس تصویر کا پایہ ان تمام تصاویر سے بہت بلند ہے۔

عابد

ثبوت

مسٹر لطیف احمد اڈیٹر "کلیم" خوش تھے۔ بہت خوش! کلیم کا اپریل نمبر ایک ہفتے میں بک گیا تھا۔ خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مالک نے ان کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک مقامی اخبار نے ان کی تقریر کی تعریف کی تھی۔ اور "انہیں مجلس واضع قوانین" کی رکنیت کے لئے پیش کیا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے کانوں میں شیریں نغمے گونج رہے تھے۔ آج صبح ان کی بیوی مریم نے ہارمونیم اس طرح بجایا تھا کہ ان کے دل کے تار لرز اٹھے تھے۔

تو مسٹر لطیف احمد خوش تھے!

یکایک کسی نے ان کے کوٹ کی آستین پکڑ کر انہیں اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ منیر ان کی طرف اپنے مخصوص انداز میں گھور رہا تھا۔

شکستہ حال لیکن باہمت منیر!

مسٹر لطیف احمد کو تعجب اور حیرت کی گہرائیوں میں غرق رہنے دیجئے اور ذرا منیر کے حالات پر ایک "طائرانہ" نظر ڈالئے۔

منیر ایک افسانہ نگار تھا۔ اور اڈیٹر کلیم کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ لطیف احمد کی بیوی مریم اور منیر کی بیوی اختر سہیلیاں تھیں۔ منیر کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں بھی "افسانہ نگاری" ذریعہ معاش بن سکتی ہے۔ کبھی اس کا افسانہ خرید لیا جاتا تھا۔ اس نے اپنی کئی کہانیاں "کلیم" میں اشاعت کی غرض سے بھیجیں۔ ایک دو شایع ہوگئیں۔ باقی لطیف احمد نے "رسمی افسوس" کا اظہار کرتے ہوئے واپس کر دیں۔ ایک افسانے کے مسودے کے ساتھ لطیف احمد نے ایک مفصل خط بھی لکھا۔ جس میں افسانے کو مسترد کرنے کی وجوہات درج تھیں۔ مسٹر لطیف احمد فن افسانہ نگاری کے متعلق ایک قطعی رائے رکھتے تھے۔ منیر کی بھی ایک قطعی رائے تھی۔ منیر کی بیوی "افسانہ نگاری" کی ناقدری سے نالاں رہتی تھی۔ شاید اس پر ایک آدھ فاقہ بھی گزرتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لطیف احمد آج کئی ماہ کے بعد منیر سے ملاقی ہوا تھا۔

"تم ہو منیر! کہو کیا حال ہے؟"

منیر نے کہا۔ "ذرا بیٹھ جاؤ۔ لطیف!"

لطیف ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سگرٹ کیس نکالا۔

"پیو گے منیر!"

منیر نے سگرٹ گویا چھین لیا۔

لطیف نے کہنا شروع کیا۔ "میرے پاس صرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

منیر نے بات کاٹ کر کہا "ہاں ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارا وقت قیمتی ہے اور تم صرف پانچ منٹ دے سکتے ہو"

لطیف نے بات ٹال کر پوچھا "افسانوں کا کیا حال ہے"

"میرے کپڑوں سے نمایاں ہے اور از راہ کرم اپنے چہرے سے یہ نہ ظاہر ہونے دیجئے گویا آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں تانگہ کیوں نہیں چلاتا۔ ایس کریم کیوں نہیں بیچتا"

اس نے اپنے لہجے کو زوردار کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں اچھا افسانہ لکھتا ہوں اور میں تم لوگوں سے منوا کے چھوڑونگا۔ دیکھ لینا ایکدن تم "افسوس ہے" کہ رد کرنے کے بجائے "چک" لکھ رہے ہو گے۔"

لطیف نے منیر کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھا۔ وہ ہمدردانہ انداز جس میں کچھ غم کچھ شک کچھ حیرت ملی ہوئی تھی۔

منیر نے پوچھا "تم نے میرا افسانہ "روح کی بیداری" پڑھا؟"

"نہایت غور سے۔ سچ تو یہ ہے منیر کہ افسانے کے متعلق میں دیر تک سوچتا رہا۔ اس میں خوبیاں موجود تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

منیر نے کہا۔ "افسوس کا اظہار رہنے دو۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ اس میں خوبیاں کیا تھیں۔"

لطیف نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "کہانی کا پلاٹ بالکل نیا ہے۔ کردار نگاری انتہا سے کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ واقعات کی ترتیب وارتقا و تکمیل بہت نفیس ہے۔ افسانہ اچھا ہے۔ صرف ۔ ۔ ۔ ۔"

منیر نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا "میں اردو لکھ سکتا ہوں یا نہیں؟"

"کوئی شک نہیں۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ کہ تم صاحب طرز ہو۔"

"تو پھر"

"پھر" اڈیٹر نے کہا "مشکل یہ ہے کہ تم اپنے افسانے کو ایک اچھے صناع کی طرح اختتام تک لیجاتے ہو۔ اور پھر تم ایک فوٹوگرافر بن جاتے ہو۔ نہیں نہیں۔ یہ تشبیہ درست نہیں۔ کیمرا بھی بعض اوقات "صداقت" کی ایک جھلک دکھا سکتا ہے۔ لیکن تم تو افسانے کے انجام کو اپنے قلم کی چند بے معنی جنبشوں سے بالکل غیر صناعانہ بنا دیتے ہو۔ اگر تم صحیح معنی میں فطرت سے ذرا بلند ہو جاؤ اور اپنی تصویر کو ان شوخ رنگوں سے مزین کرو جو آرٹ کی جان ہیں تو یقیناً ڈاکیہ تمہارے لئے مسودوں کی بجائے چکیں لائے"

منیر نے حقارت سے کہا "ابھی تک تم بچے ہو لطیف"۔

جب "ڈرامے کا ڈاکو" سنہرے بالوں والی۔ نیلے نینوں والی ہیروین کو بھگا کے لیجاتا ہے۔ تو تمہارے خیال میں اس کی ماں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہتی ہے۔

"اے آسمان۔ اے تارو۔ گواہ رہنا جبتک میں اس بدمعاش کو کیفر کردار تک نہ پہنچالونگی۔ اس وقت تک دم نہ لونگی"۔

لطیف مسکرایا۔

اس نے کہا "یقیناً زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں انہیں الفاظ میں یا تقریباً انہیں الفاظ میں اپنے رنج اور غصے کا اظہار کریگی"۔

منیر نے چلاتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ماں کہیگی۔ "انجمن آرا کو ڈاکو بھگا کرلے گیا۔ توبہ ہے! جان عذاب میں آگئی ہے۔ مصیبتوں سے چھٹکارا ہی نہیں ہوتا۔ ادھر آؤ احمد کیا کر رہے ہو تم۔ میرے کپڑے نکالو۔ آخر کیا ہوگا۔ پولیس میں اطلاع دیجائیگی یا نہیں؟ میں حیران ہوں کہ ان کے ابا کو کیا ہوگیا تھا۔ لڑکی کا خیال ہی نہیں رکھتے"۔

منیر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

تو انجمن آرا کی ماں کی باتیں کچھ اس طرح کی ہونگیں۔ مسٹر لطیف احمد میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جذبات کی شدت کے وقت لوگ شعر نہیں پڑھتے۔ شاعرانہ زبان نہیں برتتے۔ سیدھی سادھی زبان میں گھریلو زبان میں اپنے رنج والم کا اظہار کرتے ہیں"۔

"منیر" لطیف نے متانت سے کہا "کبھی تم نے موٹر کار کے نیچے سے کسی بچے کی کچلی ہوئی لاش نکال کر غمزدہ ماں کے سامنے رکھی ہے۔ کیا تم نے غمزدہ ماں کے منہ سے بے ساختہ غم والم کے شعریت بھرے گیت سنے ہیں؟"

منیر نے کہا "نہیں۔ اور تم؟"

لطیف نے کہا۔ "مجھے بھی یہ موقع کبھی پیش نہیں آیا لیکن میں تصور کرسکتا ہوں کہ وہ کیا کہیگی۔"

منیر نے کہا "میں بھی تصور کرسکتا ہوں"۔

لطیف نے گویا سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"منیر! میں خوب سمجھتا ہوں کہ ہر ایک گہرا فوری اور درد انگیز جذبہ روح انسانی کے تاروں سے خود بخود بے ساختہ ایک دکھ بھرا نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس اظہار جذبات میں فطرت کا کتنا حصہ ہے اور آرٹ کو کتنا دخل ہے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک طوفان ہے جو شدید جذبات کے زیر اثر متموج ہو جاتا ہے"۔

منیر نے سلسلہ کلام کو بدل دیا اور کہا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ "روح کی بیداری" میں وہ خاص نقص کیا تھا جس کی وجہ سے تم نے اسے مسترد کردیا"۔

لطیف نے جواب دیا "جب نکہت اپنے منگیتر کا خط کھولتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کمینہ لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا ہے تو وہ کہتی ہے "لو اور سنو! دیکھا تماشا!" اور یہ لفظ ہرگز مناسب حال نہیں ہیں۔ ان الفاظ کی وجہ سے کہانی صنعتی نقطۂ نظر سے برباد ہو کر رہ گئی ہے۔

علاوہ ازیں یہ الفاظ غیر فطرتی ہیں۔ زندگی کی صحیح تصویر نہیں پیش کرتے۔ کون شخص جذبات درد کے زیر اثر اس قسم کے الفاظ کا استعمال نہیں کرتا"۔

"اور میں کہتا ہوں"۔ منیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

جب انسان پر کوئی شدید جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ سیدھے سادھے معمولی الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ شاعرانہ تراکیب سے محترز رہتا ہے۔ خیر! اچھا تو یہ بتاؤ لطیف اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ نکہت کے الفاظ صحیح زندگی کی تصویر ہیں تو کیا تم میری کہانی کو اشاعت کی غرض سے قبول کرلوگے۔"

"یقیناً"۔

"اگر میں ثابت کرسکوں کہ میرا نقطۂ نظر درست ہے تو....."

لطیف نے کہا۔ "بس اب میرے پاس کوئی وقت نہیں"۔

منیر نے لطیف کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اور کہا۔
سنو لطیف۔ دو سال سے میں اڈیٹروں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ میں اپنے نقطۂ نظر کی صحت کا ثبوت دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی جائے کہ جب انسان تیز و تند و درد انگیز جذبات کے زیر اثر ہوتا ہے تو اس کے الفاظ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ پر شکوہ اور متین تراکیب سے خالی ہوتے ہیں۔ شعریت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ بہر نوع میں اپنی بیوی کے ذریعے تم پر ثابت کرونگا کہ میرا نظریہ درست ہے۔

اس وقت میری بیوی اپنی ایک سہیلی کے گھر ہے۔ پورے تین بجے آجائیگی۔ اب تین بجنے میں ۲۰ منٹ ہیں۔ ہم گھر چلتے ہیں۔ میں ایک خط لکھکر میز پر رکھدونگا جس میں یہ درج ہوگا کہ میں ایک عورت کے ساتھ جا رہا ہوں اور واپس نہیں آؤنگا۔ ہم دونوں ساتھ کے کمرے میں چھپ رہیں گے۔ جب میری بیوی خط پڑھ چکیگی تو تمہیں یہ موقع مل جائیگا کہ اس کی حرکات کا مشاہدہ کر سکو اور ان الفاظ کو سن سکو جو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلینگے۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ میرا نظریہ درست ہے۔ دیکھ لینا اختر کے منہ سے بے ساختہ فطری طریق پر سیدھے سادے الفاظ نکلیں گے۔"

"ہرگز نہیں" لطیف نے جوابدیا۔ میں اختر کے جذبات کو مجروح کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔"

منیر نے کہا۔ حوصلہ کرو۔ لطیف! تم سے زیادہ مجھے اختر کے جذبات کا خیال ہے۔ لیکن یہ بات اب ضروری ہو گئی ہے۔"

بالآخر لطیف کو منیر کا کہنا ماننا پڑا۔

دونوں منیر کے مکان پر پہنچے۔ میز پر ایک خط پڑا تھا۔ منیر نے اٹھا لیا اور پڑھنا شروع کیا۔

پیارے شوہر۔ پیارے منیر!

میں جا رہی ہوں۔ فاقے کر کے میں تنگ آگئی ہوں۔ میں ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گئی ہوں۔ لطیف اڈیٹر "کلیم" کی بیوی مریم بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے تنگ آگئی ہے جو غیاث اللغات کے الفاظ میں باتیں کرتا ہے۔

خدا حافظ

اختر

منیر کے ہاتھوں سے خط گر پڑا۔ اس نے اپنا منہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور گہری لرزتی ہوئی آواز میں کہا ""

"" خدایا! یہ کیا ہوا! اس زہر ہلاہل کی تلخی سے لذت اندوز ہونا میری قسمت میں لکھا تھا۔ اگر اختر بھی وفادار نہیں تو پھر اب چاہے ستارے محو خرام ہوں یا رک جائیں چاند روشن ہو تاریک۔ دنیا فنا کے سیلاب میں غرق ہو جائے یا باقی رہے مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

دوسری طرف لطیف کہہ رہا تھا۔
"سنا تم نے منیر۔ یہ خط پڑھا۔ توبہ ہے۔ منیر۔ دیکھا تم نے!"

عابد

شاعر

خاک پر کھینچا گیا نقشِ طلسمِ رنگ و بو • بند تھا سینے کی خلوت میں جمالِ آرزو
کیف کے نغموں سے تھا، محرومِ سازِ گفتگو بزم کو تھی اک دلِ رمز آشنا کی جستجو

حسن نے اسرار کے پردوں کو جنبش دی نہ تھی
جلوۂ خوابیدۂ ہستی نے کروٹ لی نہ تھی

پھول کے اوراق تھے نا آشنائے آب و رنگ خندۂ اصنام سے تھی بیخبر ترکیبِ سنگ
رہنِ ترکش تھے جگر کو چھیدنے والے خدنگ گم دلوں کی وسعتِ خاموش میں تھی ہر اُمنگ

انگلیاں مطرب کی پیہم دوڑتی تھیں ساز پر
کچھ، مگر، خود رفتگی سی تھی نوائے راز پر

ناگہاں! امواجِ ناپیدا میں اک جنبش ہوئی کان میں فطرت کے نغموں کی صدا آنے لگی
مسکرا کر، رازِ دل کہنے لگی نورس کلی پھول کے چہرے کی آب و تاب دونی ہوگئی

برق گزری خرمنِ غفلت سے لہراتی ہوئی
روح کو بیداریوں کا راز سمجھاتی ہوئی

خود بخود اٹھنے لگا روئے حقیقت سے نقاب ہوگئے خلوت سرائے حسن کے باطل حجاب
چھڑ گئے ہر سمت اٹھلاتی ہواؤں کے رباب دل میں گھر کرنے لگا سلمائے گیتی کا شباب

جلوۂ نو سے ہوئی ترتیبِ رنگِ صبح و شام
کر دیا آخر ادا، شاعر نے فطرت کا پیام

کون شاعر! جس نے پہچانا طلسمِ ہست و بود کون شاعر! جسکے منت کش ہیں اسبابِ نمود
کون شاعر! جس نے کھولے عقدۂ رازِ وجود کون شاعر! شمعِ بزمِ جلوہ آرائے شہود

جس کا سینہ مشتعل، سوزِ محبت کے لئے
جسکی نظریں مضطرب، اسرارِ فطرت کیلئے

جسکے ہر ذرّے میں ہے خورشیدِ عرفاں کی جھلک جسکی ارضِ محترم سے جھک کے ملتا ہی فلک
دردِ عالم کا مداوا، جس کے سینے کی کھٹک انجمن افروز، جس کے شعلۂ غم کی لپک

قصرِ باطن کو تجلّی زار کرنے کے لئے
داغِ دل شاعر کے بڑھتے ہیں ابھرنے کیلئے

(غیر مطبوعہ)

تقدیسِ عزائم

میری تجویزِ وفا رکھیگی مجھ کو سُرخ رو اس کی ترکیبِ جفا کا حوصلہ شرمائیگا
یوں سراپا مدّعائے حسن بنجاؤنگا میں بارگاہِ عشق میں ہر مُدّعا شرمائیگا
توڑ دیگی میری فطرت رہنمائی کا غرور میرے ذوقِ جستجو سے رہنما شرمائیگا

زندگی میری ہم آہنگِ بقا ہو جائے گی
یُوں جیُونگا! مجھ سے قانونِ فنا شرمائیگا

(غیر مطبوعہ) وقار (انبالوی)

رباعیات

(۱)

ذی رُوح کا ہر نفس ہی تائیدِ حیات
فطرت کرتی ہے سبکو تاکیدِ حیات
ہے فکرِ حیات رونقِ بزمِ جہاں
عالم ہے حیات امیدِ خورشیدِ حیات

رواں

(۲)

مایُوس ہوا غمِ نہانی ہم سے
اُٹھتا نہیں بارِ زندگانی ہم سے
کچھ ایسی ہی بات ہے کہ بیزار ہیں اب
ہم اپنی جوانی سے جوانی ہم سے

رواں

انعکاسِ حسّیات

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سے تنہائی میں بلا قصد ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جو اس کے تخیلات کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایک خوش باش آدمی ہے۔ تو آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا ہے یا اگر وہ کوئی قومی آدمی ہے تو اپنی نشست، اپنے اشارات اور اپنی نگاہوں میں ایسی کیفیات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خیال میں زیادہ دلنشیں ہوں، جن سے خاص اثر پڑنے کی امید ہو اور جو جمہور کی نظروں میں اس کی محبت۔ منزلت اور احترام کو بڑھا سکیں۔ اگر اسے کسی بزم نشاط میں موسیقی کے اتار چڑھاؤ یا کسی پیکر حسن کا رقص یاد آ گیا تو اپنے پاؤں سے خیالی نغموں کے زیر و بم کے ساتھ زمین پر تال دینا شروع کر دیتا ہے۔ ہاتھوں کو خاص انداز سے ملاتا ہے اور کبھی کبھی وفور جذبات سے بیتاب ہو کر چٹکیاں بجانے لگتا ہے۔ یا زمین پر چھڑی سے خطوط کھینچنے شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر بے ساختہ کرتا ہے اور اس کے عزم و شعور کو مطلق اس میں دخل نہیں ہوتا۔

مجھے ایک آسٹروی مصنف "اسٹرائیکر" کا موقعہ یاد آیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "جب آدمی کسی حرف تہجی کا تصوّر کرتا ہے۔ مثلاً وہ " لام " کی شکل پر غور کرتا ہے تو اس کا تصور ہونٹوں اور منہ کے عضلات کو متحرک کر دیتا ہے جس سے لازمی طور پر آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے حرف "ل" اس وقت ہونٹوں کی حرکت کی ایک تصویر ہے جو آواز بن کر ظاہر ہوئی۔ یہ حرکت ایک حد تک آدمی کے ارادہ کے بغیر ہونٹوں پر رونما ہو جاتی ہے.........." ہم اس پر قیاس کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جب آدمی کے دل میں "دوڑنے" کا خیال گزرتا ہے تو وہ پاؤں کے عضلات کو ایک خفیف سی حرکت دیتا ہے۔ اور جب وہ "خطابت" کا تصور کرتا ہے تو ہاتھ، چہرے، گردن اور آنکھوں کو خاص انداز سے جنبش دیتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ایک حرکت کا تصور، خواہ وہ کسی حد تک کیوں نہ ہو۔ لازمی طور پر اس قسم کی حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کا دارومدار قوت تصور کی کمی بیشی ہے، یا زیادہ صاف لفظوں میں عضلات پر تخیلات کے انعکاس کی قوت پر! کیونکہ ان دونوں میں باہم گہرا علاقہ ہے۔ دوسرے درجہ میں " بالفعل حصول حرکت " کے ارادہ سے مقابلہ کی قوت پر انحصار ہے۔ اس لئے اگر تخیل ضعیف ہو، یا انعکاس مفقود ہو یا قوت مقابلہ غیر معمولی ہو تو عضلات پر تخیل کا کوئی نمایاں اثر محسوس نہیں ہوگا۔ لیکن جب تخیل کا انعکاس قوت کے ساتھ ہو اور وہ نفس پر چھا جائے ساتھ ہی قوت ارادی میں مقابلہ کی طاقت کافی نہ ہو تو عضلات میں نمایاں طور پر حرکت محسوس ہوگی۔

ہر شخص کو بلند آواز سے —— یا کم از کم ایسی آواز سے جو سنی جا سکے —— "سوچنے" کا تجربہ ہوا ہوگا۔ ہر ایک آدمی نے بارہا اپنے دل سے باتیں کی ہونگی۔ کبھی انسان کے چہرے پر اس قسم کی حرکات نمایاں ہو جاتی ہیں جو اس کے تخیلات کی حقیقی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو با آواز پڑھتے ہیں لیکن خیال یہی کرتے ہیں کہ وہ "دل میں" پڑھ رہے ہیں۔ دل میں پڑھنے کے ذکر سے میرا ذہن ایک نئے خیال کی جانب منتقل ہو گیا جب ہم "بغیر آواز" کے مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں سے ایک "آواز" پیدا ہو رہی ہے۔ ہم صاف طور پر اسے سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہی آواز ہے۔ اور ہماری قوت سامعہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس میں ہماری آواز کی تمام خصوصیات موجود ہیں —— بلکہ اس وقت جبکہ میں لکھ رہا ہوں جو لفظ میرے قلم سے نکلتا ہے میں اسے اپنی زبان سے —— یا کم از کم اپنے نفس کی آواز سے —— بولتا جاتا ہوں۔ اور اپنی اس "خاموش آواز" کے اتار چڑھاؤ کو صاف طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں لکھتے وقت آئینہ دیکھ سکتا تو بلاشبہ میں اپنے آپ کو دیکھتا کہ گفتگو کرتے وقت آدمی جن جن حرکات و سکنات کا عادی ہے وہ سب ادا کر رہا ہوں۔ پیش نظر مفہوم کے مطابق نگاہیں بدل جاتی ہیں، پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ سر کو جنبش ہوتی ہے اور

ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہر شخص اپنے اوپر بآسانی اس کا تجربہ کرسکتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم اپنے دوست کے ساتھ بیٹھے ہو۔ دونوں خاموش اپنے اپنے خیالات میں مستغرق ہیں۔ یکایک تمہارا دوست تم سے مخاطب ہوکر پوچھتا ہے "جی! کیا فرمایا؟"، تم چونک پڑتے ہو۔ اور ہم نشین کو یقین دلاتے ہو۔ کہ تم نے اس سے کچھ نہیں کہا، شاید اسے شبہ ہوگیا ہے۔ غالباً اس نے کوئی دوسری آواز سنی ہوگی جسے وہ بے خبری میں تمہاری آواز سمجھا "حالانکہ تمہارے دوست کو حقیقۃً کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی بلکہ اس کا دعوی بالکل واقعیت پر مبنی ہوتا ہے۔ دراصل تم ہی خطا کار ہوتے ہو اور تمہیں کو مغالطہ ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ تم جس معاملہ کے متعلق سوچ رہے تھے یا جو تمہارے تخیل پر چھایا ہوا تھا اس نے تمہاری حسیات کو اپنے اندر جذب کرلیا اور اس کی قوت اس حد تک پہنچ گئی کہ بلا قصد تمہارے منہ سے چند لفظ نکل گئے جن کا تمہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ اس حالت میں اگر تم سے حلف لیا جائے تو تم اپنے یقین واثق کی بنیاد پر قسم کھانے کے لئے بھی تیار ہوجاؤ گے حالانکہ درحقیقت تمہارے منہ سے وہ الفاظ ضرور نکلے ہونگے۔

اکثر وہی لوگ بآواز بلند اپنے دل سے باتیں کرتے ہیں اور گفتگو کے وقت اشاروں سے زیادہ کام لیتے ہیں جو دنیا اور اہل دنیا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کی ستائش اور نکتہ چینی کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے مطمئن ہیں، زندگی، اس کی مسرت اور محبت اور روحانیت کے ماحصل سے مستفید ہوسکتے ہیں، یا وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رجحانات کو ضبط کرنے، اپنے جذبات پر قابو پانے، اور اپنے نفوس کا توازن قائم رکھنے کے عادی نہیں ہوتے یا ایسی قوم کے افراد ہوتے ہیں جو فطرتاً، یا ماحول سے متاثر ہوکر، یا دوسرے اسباب سے "شبابیت" میں ڈوبی ہوئی ہو۔ مثلاً ایک مسرور اور آزاد منش آدمی کی آواز میں کسی قدر جوش اور ہنگامہ، اور اس کی گفتگو میں اشارات و حرکات کی زیادتی پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ اس کے برخلاف متین اور سنجیدہ آدمی میں یہ بات نہیں پائی جائیگی بعض لوگ معلم یا سیاسی یا کاروباری ہوتے ہیں اور ان کی مخصوص ضروریات مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اپنی خواہشات کو ضبط کریں، اپنے اعصاب کو کمزوری کے اظہار سے محفوظ رکھیں، اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کی ظاہری حالت ان کے خلاف چغلی نہ کھائے۔ ناظرین کو مشاہدہ اور تجربہ سے محسوس ہوا ہوگا کہ لاطینی اقوام میں صرف "انگریز" کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا تو اس میں انتہا درجہ کا توازن اور وقار پایا جائیگا۔ اور وہ بہت کم اشارات و حرکات سے کام لے گا۔ اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ انگریزوں میں احساس کی کمی ہوتی ہے یا دوسری اقوام ان کی بہ نسبت زیادہ آزاد خیال اور ذکی الحس ہیں۔ بلکہ درحقیقت وہ ابتدا ہی سے ضبط نفس کے عادی بنائے جاتے ہیں اور ان کی تربیت ——— وسیع ترین مفہوم اور اعلیٰ ترین معنی کے ساتھ ——— "آزادانہ" ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں آدمی کا اپنے دل سے باتیں کرنا یا اشارات و کنایات کی کثرت اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ وہ ہر ایک تصور کے ساتھ بولتا بھی ضرور ہے اگرچہ اس کو محسوس نہ کیا جائے اور ذہن وہاں تک نہ پہنچے۔ ہمارے دل میں کوئی ایسا لفظ نہیں گزرتا جسے ہم ہونٹوں سے بولتے نہ ہوں اگرچہ ہمیں ان کی جنبش کا احساس نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح کوئی حرکت ایسی نہیں ہے جس کا ہم تصور کرتے ہوں اور اس کے مخصوص عضلات اسے عملی جامہ نہ پہناتے ہوں۔ ہم صرف الفاظ اور ان کے ساتھ حرکت کی تصاویر کی مدد سے سوچتے ہیں۔ ہمارا ہر ایک خیال لفظ یا حرکت کی ایک تصویر بنا لیتا ہے۔ ہمارا اس کو محسوس نہ کرنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔ ہم زندگی کی گزرگاہ میں لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے بھی ہیں۔ لیکن ہم اس کا ادراک نہیں کرتے۔ کیونکہ جس طرح وہ الفاظ جو دل میں گزرتے ہیں اپنی حرکت کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح سنے ہوئے الفاظ سننے والے کے ذہن میں اپنی حرکت منتقل کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ کا واضح ترین مظہر "بچے" کہے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ تکوین کی حالت میں ہوتے ہیں اور ان کے مربی یا معلم گفتگو، اشارات، اور برتاؤ سے ان کی طبیعتوں کو جس سانچے میں ڈھالتے ہیں وہ فوراً اسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "قومی خصوصیات" اور "روح عامہ"* بچوں اور صرف بچوں کی بہترین تربیت پر منحصر ہیں۔

---

* "قومی خصوصیات" اور "روح عامہ" ایسے الفاظ ہیں جن کے مفہوم و معنی کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ بہر صورت ان میں کچھ اس قسم کا ابہام اور پوشیدگی ضرور ہے جس کی وجہ سے ان کے معنوں

کا انضباط اور ان کے مفاہیم کی حد بندی دشوار ہوگئی ہے۔ قومی خصوصیات زمانہ اور سماج کے نفسی تاثرات کی تبدیلی کے ساتھ بدل جایا کرتی ہیں۔ روحِ عامہ کسی وقت ایک حالت پر قائم نہیں رہتی اور اس کے حلقہ اقتدار میں حقیقتہً کبھی عمومیت اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ دراصل جو قوتیں اسے متاثر کرسکتی ہیں وہ انہی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس کا دارومدار رہنماؤں کے میلانِ طبع پر ہے اور ہر قوم کے رجحانات فی الحقیقت اس کے رہنماؤں کے رجحانات کا چربہ ہوتے ہیں۔ وہ جس طرف چاہتے ہیں رائے عامہ کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ اور پوری قوم کو اپنی ذہنیت کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ اگر وہ بلند نظری اور ایثار میں ممتاز ہیں تو پوری قوم کی یہی حالت ہوجائیگی اور اگر وہ جنگجو اور تیز مزاج ہیں تو قوم کی ذہنیت بھی رفتہ رفتہ اسی مرکز پر آجائیگی۔ کیونکہ قوم رجحانات، جذبات، اور تخیلات اپنے قائدین سے مستعار لیتی ہے جو اسے متاثر کرتے اور اس کی آراء و افکار میں انقلاب پیدا کردیتے ہیں۔ دو قوموں میں صرف اسقدر فرق ہوتا ہے کہ ایک زیادہ ذکی الحس اور ذہین ہوتی ہے۔ اس لئے وہ جو اثر قبول کرتی ہے اس میں شدت اور قوت پائی جاتی ہے، اور دوسری ان اثرات سے خالی ہوتی ہے۔ یہ فرق کیفیت میں نہیں ہوتا بلکہ صرف کمیت و مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو موٹر اور تانگہ یا دخانی جہاز اور بادبانی کشتی کے فرق کی ہوتی ہے۔ سکندر مقدونی اگر وسط افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں پیدا ہوتا تو ان کی بھی اسی طرح رہنمائی کرتا جس طرح اس نے اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ لیکن وہ قدرتی طور پر ان کے ذریعہ سے ایسی فتوحات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جیسی اس نے رومیوں کے ذریعہ سے حاصل کیں کیونکہ اہلِ افریقہ کے نفوس میں جو قوت پنہاں ہے اور جس کا ابھارنا ممکن ہے وہ اتنی مقدار میں نہیں ہے جو اس مقصدِ عظیم کے لئے کافی ہو رہنما کی ایسی مثال ہے جیسے "مقناطیس" جو لوہے کے برادہ کو کھینچ کر اکٹھا کرلیتا ہے۔ برادہ بھی "لوہا" ہے اور مقناطیس بھی "لوہا" ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں قوتِ کشش پائی جاتی ہے اور وہ اس سے محروم ہے سونے کے برادے کا ڈھیر لگادو اور مقناطیس کو اس سے متصل کردو تو ایک ذرہ بھی اس کی جانب کھنچ کر نہیں جائیگا۔ اسی طرح رہنما کے لئے یہ امر قابلِ تعریف نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں کی عام سطح سے بالاتر ہے۔ ان کی وضع کے خلاف کسی دوسری قماش کا انسان ہے، یا ان کی فطرت سے جداگانہ کسی فطرت کا مالک ہے خواہ وہ بلند ترین فطرت ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان سے نزدیک تر ہو، ان سے کامل مشابہت رکھتا ہو، اور ان کی سطح سے بالکل قریب ہو۔ ان سے باہمی سمجھوتہ کرسکے اور انہیں یہ سمجھا سکے کہ اس میں اور ان میں کوئی غیریت نہیں ہے۔ ان سے اتنا بلند تر نہ ہو کہ وہ اس تک رسائی ناممکن سمجھیں اور فیضان کا سلسلہ ضعیف ہوکر فنا ہوجائے۔

حسیات و تخیلات کے اظہار کے لئے "الفاظ" سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کثرتِ استعمال سے لوگوں کے ذہنوں میں ہر لفظ کے معنے منقوش ہوگئے ہیں۔ اور ان سے مخصوص معنے مراد لینے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اس لئے آدمی اظہار رائے کی غرض سے جو الفاظ چاہتا ہے اگر وہ اپنے مقررہ معانی کو بتاتے ہیں اور مانوس اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مفہوم کو عام لوگوں کے ذہن فوراً قبول کرلیں گے۔ کیونکہ لفظوں کے سمجھنے کی عادت ہر قسم کی مغائرت اور مشکلات پر غالب آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے "روزانہ" اخبارات حسبِ منشاء رائے عامہ پیدا کرنے کے لئے بہترین ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی روزانہ اشاعت کی وجہ سے اربابِ تحریر کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دقیق مباحث، موشگافی، اور جدتِ معانی کے درپے ہوں۔ لہٰذا ان کے ناظرین بآسانی ان کے خیالات سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ بغیر دشواری کے مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ اور بلاتکلف ان سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا سہولت سے ذہن نشین ہوجانا اور عقل کی گہرائیوں تک پہنچ جانا دماغ پر کوئی بار نہیں پڑنے دیتا اور وہ خیالات میں گھل مل کر اپنا کام کرجاتے ہیں۔ چونکہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور ذہن میں پہلے سے جو معلومات موجود ہیں ان سے تصادم نہیں ہوتا اس لئے پڑھنے والا غور و فکر کی جانب مائل نہیں ہوتا اور اس کا شعور مقابلہ اور مناقشہ کے جذبات کو متحرک نہیں کرتا جس طرح ہر جدت پر ان میں برانگیختگی اور شورش پیدا ہوجاتی ہے۔

جمہور عام طور پر سطحی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اور طبیعت جیسا کہ معلوم ہے آسان ترین راستہ اختیار کرتی ہے۔ بارش کا پانی جب پہاڑ سے چلتا ہے تو سیدھا میدانی نرم زمینوں اور وادیوں کا رخ کرتا ہے۔ جب تک اسے نرم زمین اور ایسی مٹی میں راستہ مل سکتا ہے جس میں وہ بآسانی اپنی گزرگاہ بنالے، وہ کبھی بلند چٹانوں اور

اونچے ٹیلوں پر چڑھنا نہیں چاہتا - جب اس کے راستہ میں کوئی پتھر حائل ہوجاتا ہے تو وہ بجائے اس کے اوپر ادھر سے نکل جاتا ہے اور نرم زمین راستہ پیدا کرنے کو چٹانوں کے چیرنے یا ان کے اوپر سے گزرنے پر ترجیح دیتا ہے ---- اسی طرح انسان تھکا دینے والے امور سے روگردانی کرکے ایسے امور کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے جو تھکا دینے والے نہ ہوں - یا زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہئے کہ ان باتوں کو اختیار کرتا ہے جس میں اسے کم کوشش کرنی پڑے - جس لکھنے والے کو کافی وقت اور غور وفکر کی فرصت میسر ہوگی وہ زیادہ باریک نکات کی تشریح کریگا، بہت گہرے معنوں سے بحث کرے گا، کبھی کبھی الفاظ کو بالکل نئے معنے پہنا دیگا، ان کے مشہور معنوں میں تحدید یا توسیع کردیگا - یا ان میں نئے انداز سے اس طرح امتزاج پیدا کردیگا جس سے غور کرنے والا ایک "اچھوتے تخیل" تک پہنچ جائے - لیکن "غور" تھکا دینا ہے - سوچ بچار مشقت کا دوسرا نام ہے، اور ایسے مباحث سے دوچار ہونا جن کی طرف ذہن فوراً منتقل نہ ہوسکے بہت دشوار کام ہے - اس لئے زیادہ سہل طریقہ یہ ہے کہ ناظرین ---- سب ناظرین نہیں بلکہ عام ناظرین ---- ایسے مصنفین کی جانب متوجہ ہوں جو اپنے الفاظ کو بلا ضرورت نئے نئے معانی سے گرانبار نہ کرتے ہوں، انہیں اسقدر نہ پھیلاتے ہوں کہ طبیعت پر گراں گزریں، اور ذہن کو تدبر و استنباط کی تکلیف نہ دیتے ہوں یہی سبب ہے کہ وقفہ سے شائع ہونیوالی صحافت ---- مثلاً ماہوار رسائل ---- کی اشاعت زیادہ نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے روزانہ اخبارات کے مقابلہ میں اس کی تاثیر کم ہوتی ہے - البتہ وہ صحافت اس سے مستثنیٰ ہے جس کے ارباب تحریر مانوس زبان اور عام فہم مفید مباحث کا التزام رکھتے ہیں -

جمہور سے بعیدتر، ان پر سب سے کم اثر ڈالنے والا، اور ان کو سب سے تھوڑا فائدہ پہنچانے والا "ارباب فکر" کا طبقہ ہے - کیونکہ وہ عوام کے نفوس اور خیالات سے بہت دور ہوتے ہیں - اور اس لئے ان کی سطح سے بلند تر ہوجاتے ہیں -

پس، عام لوگوں سے ان کی دوری عام لوگوں میں ان کے اثرات کو فنا کردیتی ہے - مقناطیس لوہے کے برادے کو کھینچتا ہے - لیکن ایک خاص مسافت تک! جسقدر مسافت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوت جاذبہ کمزور ہوتی جاتی ہے - یہانتک کہ اس کا حلقہ کشش ختم ہونے پر برادہ منتشر اور بکھرا ہوا پڑا رہتا ہے - اس کا ایک ذرہ بھی مقناطیس کی طرف جنبش نہیں کرتا، نہ متوجہ ہوتا، نہ جمع ہوتا - ہمیشہ سے سمجھنے سمجھانے کا بہترین ذریعہ "الفاظ" قرار دئے جاتے ہیں - بعض لوگوں میں قدرتاً یہ مادہ ہوتا ہے کہ الفاظ کو عوام کی "مالوسیت" سے زیادہ وزنی کردیتے ہیں، اور یہی مادہ ان میں اور عوام میں باہمی دوری کو بڑھا دیتا ہے - دوسری طرف چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کی توقعات سے زیادہ وزنی الفاظ استعمال نہیں کرتے، اور ان کی یہ عادت نزدیکی سمجھنے، اور تاثیر و تاثر کو آسان بنادیتی ہے -

---

یہ معروضات سب سے زیادہ ان حضرات کی توجہ کی محتاج ہیں جو غیر ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے مؤید ہیں - کم از کم عملاً وہ اس طریقہ تعلیم کی حمایت کرتے ہیں - کیونکہ اصولاً تو ہر شخص تقریباً یہی کہیگا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ہونی چاہئے - لیکن کیا میں سوال کرسکتا ہوں کہ ان میں کتنے ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے عملاً ہندوستان کے اس مہلک طریقہ تعلیم کی مضرتیں کم کرنے میں کوئی حصہ لیا؟

جن بزرگوں نے ابتدا میں اس طریقہ تعلیم کو رواج دیا بلاشک وشبہ ان کی نیت نیک اور ان کا مطمح نظر پاکیزہ، مقدس، اور بلند تھا - ان کے پیش نظر دو عظیم الشان مقاصد تھے :-

(۱) ہندوستان کی حکمران طاقت کی زبان سے واقفیت، تاکہ اس کے اصول، اس کے قوانین، اس کے آئین حکمرانی، اور سیاسی و اقتصادی تغیرات سے قوم باخبر رہے - نیز سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی داخل ہوسکیں -

(۲) مغرب نے علمی اور مادی حیثیت سے جو نمایاں ترقی کی ہے اس سے واقفیت اور فائدہ حاصل کرنا نیز مغربی زبانوں سے علوم وفنون کے ذخیرے ترجمہ اور اقتباس کے ذریعہ سے بتدریج دیسی زبانوں میں منتقل کرنا -

یہ دو مقصد ہیں جو بجائے خود نہایت اہم اور قابل قدر ہیں، اور آج بھی اتنا طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود ان پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوسکا - مغربی زبانوں کو مستقل طور سے ذریعہ تعلیم قرار دیدینا نہ جب مقصود تھا نہ اب ہوسکتا - اور اگر جب بعض ناگزیر

وجوہ اور دیسی زبانوں کی ناداری کی بنا پر بدیشی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیدیا گیا تھا تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب بھی، جبکہ خدا کے فضل سے ہماری اپنی زبانیں اس تشنگی کو بجھا سکتی ہیں - اس قدیم طریقہ کو زیادہ دیر تک قائم رکھا جانا جائز قرار دیا جائے -

بچوں کی حالت پگھلی ہوئی چاندی جیسی ہوتی ہے - انہیں جس سانچے میں ڈھال دیا جائیگا وہ اسی کی صورت قبول کرلیں گے - اور ایک مرتبہ استحکام کے ساتھ کسی صورت کو قبول کر لینے کے بعد آئندہ کے لئے اس میں تغیر تبدل کا بہت کم امکان باقی رہتا ہے - اس لئے جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوکر ہمارے نوجوان ایک بالکل "نرالی مخلوق" بن جاتے ہیں جو عموماً اپنے ماحول سے نامانوس اور عوام کی نفسیات سے ایک حد تک بیخبر ہوتے ہیں اور اگر باخبر بھی ہوں تو ان کو جو تعلیم دی گئی ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ ایک "مافوق الفطرت" ہستی بن کر رہ جائیں اور عوام کے جذبات کی حقیقی رہنمائی نہ کرسکیں -

بدیشی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم نوجوانوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہے جسکی لعنتوں سے جتنی جلد ہوسکے ملک کو پاک کردینا چاہئے - دیسی زبانوں میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہ ہونے کا عذر میری نظر میں اب کوئی معقول اور وقیع عذر نہیں ہے - "جامعہ عثمانیہ" کی زندہ اور کامیاب مثال ہمارے سامنے موجود ہے - اور ان لوگوں کے لئے سرمایہ بصیرت بن سکتی ہے جو اس قسم کے بیہودہ عذرات کی آڑ میں نوجوان نسل کی دماغی اور عملی قالون کو دانستہ یا نادانستہ پامال کر رہے ہیں - البتہ کوشش اور مستقل مزاجی شرط ہے جس کے بعد کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی -

تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ قوم کا افلاس کم ہو - لیکن تعلیمی اوسط کی افسوسناک کمی کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہرجگہ "تعلیمیافتہ بیکاروں" کی ایک فوج موجود ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ موجودہ طرز تعلیم میں کتنا عظیم الشان نقص موجود ہے جو بجائے ذہنی و عملی بیداری پیدا کرنے کے صرف "کلرک" پیدا کرسکتی ہے - اس ذہنی و عملی پژمردگی کا سبب صرف یہ ہے کہ طالب علم اپنی تمام قوتیں نامانوس زبان کے رٹنے میں صرف کردیتا ہے اور جب وہ فارغ التحصیل ہوکر نکلتا ہے تو بجائے نشاط، جذبہ عمل، اور بلند نظری کے اس پر افسردگی، اضمحلال، بے عملی، مایوسی، اور جمود کے عناصر غالب آچکے ہوتے ہیں -

منظور سروش (بھوپالی)

دامنِ کہسار سے رقصاں چلی اک جوئے آب　　جستجوئے منزلِ مقصود میں پا در رکاب
عزمِ راسخ جسکی سیرت سعیٔ پیہم جس کی خو　　بیقراری جسکی طینت جسکی فطرت پیچ و تاب
دید کے قابل جنونِ شوق کی وارفتگی　　چند قطروں کی جماعت اور جہانِ اضطراب
جھوم کر منبع سے نکلی ایسی لہرائی ہوئی　　پی کے میخانہ سے نکلے جسطرح رندِ خراب
اک دلکش زمزمہ پیدا خرامِ شوق سے　　جسکی موسیقی پہ صدقے نغمۂ چنگ و رباب

جیسے پائے شوق میں چھالے پڑیں اور پھوٹجائیں
ٹوٹتے رہتے ہیں یوں بھی راہ میں کتنے حباب

اقبال احمد سہیل

(معارف)

لعنتِ جنگ

آفتاب غروب ہو رہا تھا، پرندے قطار در قطار آبادی سے اپنے آشیانوں کی طرف اڑے جا رہے تھے اور دن بھر کے تھکے ماندے کاشتکار اپنے بیلوں کو ہنکاتے ہوئے کھیتوں سے گاؤں کی طرف واپس آ رہے تھے۔

موسیو جان مورو، اس کی حسین و جمیل و سنہری بالوں والی بیٹی مونا، اس کا جوان رعنا بیٹا اندور بھی دن بھر کی مسلسل محنت کے بعد چور چور ہو گئے تھے اور میٹھی نیند سے اپنی جان توڑ محنت کی تلخی دور کرنے کے لئے اپنی جھونپڑی کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے

خاموش فضا گرجا کے گھنٹوں سے گونجنے لگی۔ مونا نے حیرت کے ساتھ کہا:۔

"گاؤں کے گرجا میں یہ بے وقت گھنٹے کیسے بج رہے ہیں۔ یہ تو نماز کا وقت بھی نہیں ہے!"

ایک غیر معلوم کشش تینوں کو اس بڑی سڑک پر کھینچ کر لے گئی جو گاؤں کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھکڑے پر جس پر دودھ کے پیپے لادے جاتے ہیں ایک بڑا سا نقارہ رکھا ہوا ہے۔ اور گاڑیبان اس پر چوب مار رہا ہے۔

موسیو جان کے سوا ان تینوں میں سے کوئی بھی نقارہ کے پیغام کو نہ سمجھ سکا۔ ہاں موسیو جان فوراً سمجھ گیا کہ یہ اعلان جنگ ہے۔ آج سے چالیس برس پہلے موسیو جان کی یاد میں ایک دفعہ اور بھی زبانِ طبل یہ پیغام سنا چکی تھی۔ لیکن ان بہن بھائیوں نے بھی نقارہ کا راز جلد ہی معلوم کر لیا۔ گاڑی کے پیچھے لڑکوں کی فوج چیختی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ "لڑائی! لڑائی!!"

ایک بڑا لڑکا غول میں سے نکل کر اندور کے پاس آیا اور کہا:۔

"اندور، ہم میدانِ جنگ میں پہلی صف میں لڑیں گے۔ اس مرتبہ ہم سور کے بچوں کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ ہاں ہاں اس مرتبہ ہم اپنے باپ داداؤں کے خون کا بدلہ لیں گے۔"

مونا نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:۔

"افسوس اگر آج کو میں بھی مرد ہوتی تو ان وحشیوں کو قتل کر کے ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی!"

موسیو جان نے گنگنا کر کہا:۔

"مونا تو بڑے سخت دل کی ہے۔"

"ابا جان کیوں! کیا آپ کو ان وحشی جرمنوں سے، نفرت نہیں ہے؟"

"ہے۔ لیکن ان سے زیادہ مجھے لڑائی سے نفرت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص لڑائی کے میدان میں جا چکا ہے۔ کچھ وہی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ لڑائی میں کیسے کیسے افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ ہری بھری کھیتیوں کو اجاڑ کر غریب کاشتکاروں کی آرزوؤں کو پامال کیا جاتا ہے۔ نوجوان بچوں کے گلوں پر چھری پھیر کر ان کے ضعیف والدین کی حسرتوں کا خون کیا جاتا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی باتیں ہیں؟"

مونا نے چیخ کر کہا:۔ "کچھ ہی سہی مجھے تو ان جرمنوں سے عداوت ہے۔ بلکہ نفرت ہے!"

اندور نے بھی مونا کی تائید کی۔

(۲)

چند روز بعد گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جہاں کبھی انسانوں کی چہل پہل تھی وہاں آج الّو بول رہا تھا۔ نوجوان سب لڑائی پر چلے گئے تھے۔ اور گاؤں میں سوائے عورتوں اور ضعیف العمر مردوں کے اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ لڑائی شروع ہوئے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ گاؤں میں روزانہ میدان جنگ سے خبریں آتی تھیں لیکن یہ خبریں جنگ کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچانے والی نہ تھیں۔ اگر ایک دن فرانسیسی جرمنوں کو شکست دیدیتے تھے تو دوسرے دن جرمن فرانسیسوں سے پورا پورا انتقام لے لیتے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا لیکن کچھ عرصہ بعد گاؤں کے ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب جرمنی کا پلہ بھاری ہے اور وہ آہستہ آہستہ فرانس کی حدود میں بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اور اگر اس کی پیش قدمی کی یہی رفتار رہی تو ایک مہینہ کے اندر اندر جنگ کا فیصلہ جرمنی کے حق میں ہو جائے گا۔ اس روح فرسا حقیقت کے انکشاف سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ان کے دل

بیٹھ گئے اور صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اندور نے میدان جنگ سے دو خط اپنے گھر بھیجے لیکن وہ زیادہ تر خانگی امور سے متعلق تھے اور ان میں میدانِ جنگ کا تذکرہ محض اجمالی تھا۔

اسی دوران میں ایک روز موسیو جان کے پاس ایک فوجی سپاہی آیا اس نے کہا کہ حکومت کو جرمن قیدیوں کے واسطے قید خانہ بنانے کے لئے اس کے چند کھیت درکار ہیں چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عنقریب اس کی کھیتی کا ایک حصّہ کاٹ ڈالا جائیگا۔

مونا کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اس نے چیخ کر کہا :۔ ہرگز نہیں ہم ان ظالموں کو اپنی زمین میں پناہ نہیں دے سکتے۔ جو ہمارے عزیزوں کے گلوں پر چھری پھیر رہے ہیں۔

بوڑھے موسیو نے آہستہ سے کہا :۔ "بیٹی تو ابھی ناسمجھ ہے۔ دیکھ یہ لڑائی کا معاملہ ہے، ہمیں چاروناچار اس حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔"

دوسرے ہی دن کھیت کاٹ کر قید خانہ بنا دیا گیا اور اسے چاروں طرف خاردار تار لگا کر محفوظ کر دیا گیا۔ موسیو جان مورو کے اس ایثار کے صلہ میں چار قیدی اس کے سپرد کر دئے گئے تاکہ وہ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ قیدیوں کو سپرد کرتے وقت انسپکٹر نے مونا کو ان کے نام بتانے چاہے۔ لیکن مونا نے یہ کہکر اسے خاموش کر دیا کہ ہمیں ان کے نام معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم انہیں سب کو سور کے نام سے پکارا کریں گے۔

ایک نوعمر حسین قیدی نے جس کے چہرہ سے رعب و جلال ٹپک رہا تھا مونا سے فصیح فرانسیسی زبان میں کہا :۔ "مس صاحبہ ہم سور نہیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ بھی انسان ہیں۔"

انسپکٹر نے بات کاٹ کر کہا :۔ "اس قیدی کا نام اوسکا ر جانس ہے۔ یہ بہت اچھی فرانسیسی بولتا ہے۔ اس کی وساطت سے آپ دوسرے قیدیوں تک اپنے احکام پہنچا سکتی ہیں۔"

(۳)

ایک دن شام کے وقت مونا اپنے کھیت میں لکڑیاں چگ رہی تھی کہ قید خانہ کا ایک نوجوان سپاہی اس کے پاس آیا۔ یہ سپاہی اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کھیت کا چکر لگاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ وہ کئی بار ارادہ کر چکا تھا۔ کہ مونا سے اظہار محبت کی طرح ڈالے جو اس سے طبعاً متنفر تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ آج اس نے ہمت کر کے مونا سے کہا :۔ حسین لڑکی، تجھے اتنی محنت کرتے دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند اور قیدی تیرے سپرد کر دوں تاکہ تو اس مصیبت سے نجات پائے۔"

"جناب، اس مصیبت میں اور بھی بہت سی عورتیں گرفتار ہیں۔ بعض ان میں سے مجھ سے بھی زیادہ محنت کرتی ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ آپ کی توجہ کی مستحق ہیں۔ براہ عنایت پہلے ان کی خبر لیجئے مجھے تو یہی چار قیدی کافی ہیں۔"

"حسین لڑکی، فرانس میں تجھ جیسی خوبصورت اور نازک بدن تو نہیں ہے۔ میری پیاری کیا میں تیری تکلیفوں کو کچھ کم کر سکتا ہوں؟ خدا کی قسم مجھے اس کا معاوضہ بھی نہیں چاہیے۔ ہاں ایک چیز تیری نظرِ عنایت۔"

مونا نے کڑک کر جواب دیا۔ جناب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کہ میں آپ کی فضول تعریفیں سنوں اور اگر وقت ہو بھی تو میں سننا نہیں چاہتی۔ آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً میرے سامنے سے دفع ہو جائیں۔"

"اوہو ایسی تنک مزاجی! آپ کی تعریف جو کر دی تو آپ سر پر ہی چڑھ گئیں۔ میں بھی تو آپ کہیں کی نواب زادی کہ سوائے نوابوں کے کسی سے گفتگو کرنا بھی پسند نہیں فرماتیں۔"

یہ کہہ کر سپاہی اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اور بداخلاقی سے کام لینا چاہا۔ مونا چیخنے لگی۔ اوسکار قریب ہی کھیت میں کام کر رہا تھا۔ چیخنے کی آواز سن کر وہ فوراً دوڑا ہوا آیا۔ اسے مدد کے لئے آتے دیکھکر سپاہی نے اپنی تلوار کو بے نیام کرنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرے اوسکار نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اسے زمین پر دے مارا۔ مغلوب ہو کر سپاہی نے مدد کے لئے شور مچانا شروع کیا۔ دو سپاہی اس کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے آئے۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ اس قیدی کو قبضہ میں کر لو۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

دونوں سپاہی اوسکار کو گرفتار کر کے لے گئے۔ مونا خاموش کھڑی ہوئی سب کچھ دیکھتی رہی مگر اس نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ اس لئے کہ اصل حقیقت کو بے نقاب کرنے میں اس کی اپنی بدنامی ہے۔

(۴)

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، ماہتاب مسکرا رہا تھا۔ لیکن محبین مونا

پیکرِ غم بنی ہوئی بستر پر مضطربانہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اوسکار کی وفا شعاری کا جادو اس پر چل گیا تھا۔ بغض و عداوت کے شرارے اب بجھ چکے تھے۔ اور دریائے محبت اس کے دل میں لہریں مار رہا تھا۔ اوسکار کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی اور وہ تصور ہی تصور میں اسے سجدے کر رہی تھی۔ جب مونا اس امر کا تصور کرتی تھی کہ اگر اوسکار اس کی مدد کے لئے موقعہ پر نہ پہنچ جاتا تو کیا ہوتا تو وہ خوف سے کانپ اٹھتی تھی۔ اس کے دل پر اس بات کا بڑا اثر تھا کہ اوسکار نے تین مہینے کی قید سخت منظور کی۔ لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ صفائی پیش کرے اور بھری عدالت میں مونا کی رسوائی ہو۔ لیکن اب اسے بڑا فکر اس بات کا تھا کہ کہیں اس تین مہینے کی جدائی میں وہ اسے بھول نہ جائے۔ اللہ اللہ انسان بھی محبت کے آگے کسقدر عاجز ہو جاتا ہے۔ جب سے اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ دل و جان سے محبت کرتی ہے۔ بلکہ اسے پوجتی ہے۔ اسے اسی قسم کے توہمات ہر وقت پریشان کئے رکھتے تھے۔

تین مہینے گزر گئے۔ اوسکار کھیت میں کام کرنے کے لئے پھر آیا۔ دن بھر کام کاج میں مصروف رہنے کے بعد وہ شام کو مونا کے پاس جھونپڑی میں گیا۔ اس کے چاند سے مکھڑے پر رنج و غم کے بادل چھا رہے تھے۔ مونا نے پوچھا "کیوں اوسکار، کیا بات ہے؟"

"میرے پیچھے ایک سپاہی نے میری چھوٹی بہن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مونا مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ یہاں تمہارے سوا اور میرا ہے ہی کون؟"

تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ آخر کار اس طلسم سکوت کو مونا کی ایک چیخ نے توڑا۔ "آہ اوسکار!"

مونا نے یہ کہا اور اوسکار کی طرف بڑھی۔ اوسکار نے اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ دروازہ کھلا اور موسیو جان لاٹھی ٹیکتا ہوا اندر داخل ہوا مگر یہ ایسے مدہوش تھے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ اس نے کڑک کر کہا "مونا!"

اوسکار کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ مفلوج ہو گیا ہے۔ وہ علیحدہ ہو کر مبہوت کھڑا ہو گیا۔ مونا نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو اپنے باپ کو سامنے کھڑا پایا۔ وہ غصہ سے کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ مونا! خونخوار جرمنوں کی گولیاں تیرے حقیقی بھائی کے جگر میں پیوست ہوں اور وہ تڑپ تڑپ کر دامنِ لحد کی زینت بن جائے اور تو، ملعون شقی تو، ایک جرمن کے ساتھ یوں باتیں کرے۔ آہ میری بدبختی! اے میرے خدا میں آج کے دن کو کیوں زندہ رہا۔" یہ کہتے کہتے موسیو جان غش کھا کر گر پڑا۔ مونا اچھل کر اپنے باپ سے لپٹ گئی مگر وہ سرد ہو چکا تھا۔

(۵)

موسیو جان مر گیا اور مونا کو تمام تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تنہا چھوڑ گیا۔ اگرچہ اوسکار کی ہم آغوشی کا راز اس کے ساتھ ہی اس کی قبر میں دفن ہو گیا تھا مگر پھر بھی گاؤں والے مونا کے طرزِ عمل کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں جرمن سپاہی سے اس کا یہ اختلاط ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

ایک دن گاؤں کا زمیندار مونا کے پاس آیا اور اسے شادی کا پیغام دیا۔ یہ شخص بدصورت اور بخیل تھا۔ مونا نے اسے کورا جواب دیدیا۔ زمیندار اس ذلت آمیز سلوک سے جل کر خاک ہو گیا۔ اور اس نے سارے گاؤں میں مونا کے خلاف نفرت کی آگ سلگا دی۔

عرصہ دراز تک کشت و خون کا بازار گرم رہنے کے بعد لڑائی ختم ہو گئی۔ قیدی رہا کر دئے گئے۔ اوسکار کا جسم بھی آزاد کر دیا گیا مگر اس کا دل بدستور قید تھا۔ چنانچہ وہ اب بھی بطور مہمان کے مونا کے ہاں مقیم تھا۔

ایک دن اس نے مونا سے کہا "مونا، میں نے دفتر کمشنری پیرس میں نوکری کے لئے درخواست دیدی ہے۔"

مونا نے جواب دیا "تم نے اچھا کیا اوسکار، اگر تمہارا تقرر ہو گیا تو میں تمہارے ساتھ شادی کر لونگی اور تمہارے ساتھ تمہاری نوکری پر چلی جاؤنگی۔ ان آئے دن کے جھگڑوں سے تو پیچھا چھوٹے گا۔"

تین روز کے بعد درخواست کا جواب آگیا جواب یہ تھا کہ فرانسیسی حدود سلطنت میں کسی جرمن کا ملازم رکھنا غیر ممکن ہے۔

اوسکار نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ جرمنوں اور فرانسیسوں کی لڑائی ختم ہو گئی ہے۔"

مونا نے کہا "افسوس! اب تک لڑائیوں سے پیٹ نہیں بھرا۔ اگر آپس کی نفرت و عداوت کا یہی حال ہے تو یہ جذبات نفرت ایک دن پھر کشت و خون کا بازار گرم کر کے رہیں گے۔"

"مگر مونا جرمن ایسے کینہ ور نہیں ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ جرمنی

چلی چلو تو تمہیں میرے دعوے کی صحت میں شبہ نہ رہے ۔ میری بوڑھی ماں تمہارے ساتھ اپنی بیٹیوں کی طرح محبت کریگی ۔ مگر تم جانے کیوں لگی ہو؟"

جانے کو تو میں تیار ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کبھی مجھ سے کچھ اچھی طرح پیش نہ آسکے گی ۔ اوسکار نے کہا "نہیں تم اس کی عادت سے واقف نہیں ہو ۔ وہ بہت خوش اخلاق اور سنجیدہ عورت ہے ۔ لو میں آج اسے ایک خط ہی جوڑائے دیتا ہوں ۔"

اوسکار نے اپنی ماں کو خط لکھا جس میں اس نے مفصل واقعات تحریر کئے اور اپنے ساتھ مونا کو لانے کی اجازت طلب کی ۔ چند روز بعد جواب آگیا جس نے ان کی امیدوں کی دنیا کو برباد کر دیا ۔ ماں نے لکھا تھا کہ اگر تو کسی فرانسیسی عورت کو اپنے ساتھ لایا تو میرا بیٹا نہیں ہے ۔ اور میں زندگی بھر تیری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہ ہونگی ۔

اوسکار نے چیخ کر کہا: "اے میرے خدا، کیا میری ماں یہ لکھ رہی ہے؟ افسوس!"

(۶)

ایک نشاط انگیز شام تھی ۔ روح پرور ہوائیں چل رہی تھیں اور اوسکار اور مونا کے سوا سارا عالم بادۂ عشرت سے سرشار نظر آتا تھا ۔ یہ دونوں نہایت غمگین تھے ۔ بالاخانہ پر آمنے سامنے کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور اپنے تاریک مستقبل کے متعلق گفتگو کر رہے تھے ۔

مونا نے کہا "بڑی مشکل ہے اوسکار! ادھر سارے گاؤں میں میرے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے ۔ اُدھر تمہاری ماں میری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی ۔ اس عام نفرت پر قابو پانا ہماری قوت سے باہر ہے ۔ اوسکار، ہماری محبت کی قربانگاہ پر میرا باپ تو بھینٹ چڑھ چکا اب یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ تمہاری بوڑھی ماں بھی اس صدمہ میں تڑپ تڑپ کر جان دے ۔ اب تم اللہ کا نام لیکر اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہو جاؤ اور مجھے میری قسمت کے حوالہ کر دو۔"

اوسکار کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ یکایک مشرق کی طرف سے شور و غل کی آواز سنائی دی ۔ مونا نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان مجمع زمیندار کی قیادت میں، سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے ۔ مجمع بالاخانہ کے نیچے آکر رک گیا اور زمیندار نے چیخ کر کہا "مونا! او وطن فروش اور غدار عورت! تیری بدمعاشیوں پر اب زیادہ صبر نہیں کیا جاسکتا ۔ یا تو تو اس سور جرمن کو اپنے گھر سے نکال دے ورنہ تو بھی اس گاؤں کو اپنے ناپاک وجود سے پاک کر دے ۔"

اوسکار نے حسرت بھری نظروں سے مونا کو دیکھا اور دلدوز لہجے میں کہا "افسوس مونا!" حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی ہے ۔ تیرے اہل وطن میرے دشمن ہیں اور میرے اہل وطن تجھ سے متنفر ہیں ۔ یہ ہے لڑائی کا نتیجہ ۔ اب میں نہیں چاہتا کہ تو میری وجہ سے مزید تکالیف برداشت کرے ۔ لے خدا حافظ ۔ اب میں جاتا ہوں ۔"

اوسکار مونا کو سلام کر کے تیزی کے ساتھ زینہ سے اُتر گیا مگر مونا بھی جھپٹ کر اس کے ساتھ ہولی ۔ اس نے کہا اوسکار میں تمہیں تنہا نہ جانے دونگی ۔ جس گاؤں کے رہنے والے تمہارے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کریں میں اسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام اس میں گذاروں ۔ جہاں تم جاؤ گے وہیں میں بھی جاؤنگی"

دونوں مجمع کو چیرتے ہوئے شہر کو جانے والی پختہ سڑک کی طرف چلدئے ۔

دونوں تھوڑی دور گئے ہونگے کہ مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا "اندور آگیا ۔" یہ آواز سنتے ہی مجمع میں ایک شور مچ گیا ۔ آناً فاناً ہر شخص کی زبان پر اندور کا نام تھا ۔ ایک عورت نے چیخ کر کہا "یہ رہا اندور ـــــ اندور مورو ۔"

دوسری عورت نے جب اسے دیکھا تو چیخ کر بولی "اندور! دیکھا! یہ تیری بہن ہے جس نے تیرے خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیا ۔ یہ نامراد ایک کمینہ جرمن پر مرتی ہے ۔"

تیسری نے کہا "دیکھئے غریب وہ تو اندھا ہو گیا ہے ۔"

اندھے بھائی نے اپنی بہن کو سینے سے لگا لیا ۔ ایک عورت مجمع کو چیرتی ہوئی وہاں آئی جہاں بچھڑے ہوئے بہن بھائی گلے مل رہے تھے ۔ اور اس نے چیخ کر کہا "مونا دیکھ، تیرے محبوب کی

قوم نے تیرے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے ۔ انہوں نے اس کی آنکھوں کو لوہے کی سلاخوں سے داغدیا ہے ۔"

اندور نے اس طرف رخ کر کے جس طرف سے آواز آرہی تھی کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک جرمن نے میری آنکھ اپنی گولی کا نشانہ بنادیا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک جرمن ہی نے مجھے دوبارہ زندگی بخشی ہے ۔ جب میں لڑائی کے میدان میں، عالم بیکسی میں زخمی پڑا ہوا تڑپ رہا تھا تو وہ مجھے اپنے خیمہ میں لے گیا اور نہایت دلسوزی

کے ساتھ میرا علاج معالجہ کیا اور مجھے موت کے پنجہ سے نکالا"۔
پھر اندور نے اپنی بہن کی طرف متوجہ ہو کر کہا" مونا اپنے دوست سے میری ملاقات کراؤ"۔
جب اندور اوسکار کے پاس پہنچا تو نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔
زمیندار نے چیخ کر کہا" اندور تجھے اس جرمن سور سے نفرت نہیں ہے؟"
اندور نے کہا" نہیں، بلکہ مجھے لڑائی سے نفرت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص لڑائی کے میدان میں جا چکا ہے کچھ وہی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ لڑائی میں کیسے کیسے افعال شنیعہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ ہری بھری کھیتوں کو اجاڑ کر غریب کاشتکاروں کی آرزوؤں کو پامال کیا جاتا ہے۔ نوجوان بچوں کے گلوں پر چھری پھیر کر ان کے ضعیف والدین کی حسرتوں کا خون کیا جاتا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی باتیں ہیں؟"
اندور کے کلمات کچھ ایسے تاثیر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ہر شخص کے دل میں اتر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا مجمع متفرق ہو گیا۔
اندور نے دائیں ہاتھ میں اوسکار کا ہاتھ لیا اور بائیں ہاتھ میں مونا کا اور یہ تینوں نئے سرے سے اپنے گھر میں داخل ہوئے۔

(محمود عبد الحافظ المصری)

زین العابدین سجاد
(رہبر علی)

"نوائے قفس"

(مسٹر تھامس کیمپبل کی مشہور انگریزی نظم کا ترجمہ)

سینہ کی انتہائی محبت جو زندوں کے لئے فطرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے، صرف قلب انسانی کے لئے مخصوص نہیں۔
ایک نوعمر طوطا جس نے ابھی ابھی شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا جس کے بازو چمکدار تھے۔ ملک اسپین سے جلد ہی پنجرے میں بند کر کے ہمارے سرد ملک ساحل ملا پر لایا گیا۔
اپنے وطن کی ان خوشبودار جھاڑیوں کو جس میں اس نے اپنے رنگین چمکدار بازو حاصل کئے تھے۔ جہاں کو پھلوں سے اس کی نشوونما ہوئی تھی۔ جس آسمان اور جس روشنی میں وہ رہا۔ ایک پر حسرت نگاہ سے اُس نے ان تمام چیزوں کو "الوداع" کہا۔
پیارے وطن کی ان تمام چیزوں کی بجائے اسے تارکول کا دھواں، اجنبی ملک، کہر آلود آسمان ملا اور اب اُس نے اپنی سنہری آنکھیں چٹان اور تیز رو دریا پر ڈالیں،
وہ ہمارے سرد ملک میں آیا۔ لیکن وطن کی یاد میں وہ دن کے اکثر حصوں میں چیختا ہی رہا، یہاں تک کہ عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے سبز اور سنہرے پر زرد پڑ گئے۔
غم سے وہ تقریباً اندھا اور گونگا ہو گیا۔ اور اب وہ نہ چیختا، نہ ہنستا، نہ بولا۔ اتفاقاً ایک اسپینی مسافر وہاں آنکلا۔
طوطے کو دیکھ کر اُس نے اپنی اسپینی زبان میں اُسے سلام کیا۔ چڑے نے بھی اپنی اسپینی زبان میں اُس کا جواب دیا۔ ایک مدت کے بعد اپنے ایک ہموطن کو دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا، اور فرط مسرت سے بند پنجرے میں وہ پھڑپھڑایا، تڑپا، گرا اور مر گیا۔

ابراہیم عمادی
(ندوی ذفاضل ادب)

---

۱ تھامس کیمپبل دنیائے ادب کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔
۲ جنوبی امریکہ میں ایک ملک ہے۔ ۳ اسکاٹلینڈ میں ایک مقام ہے۔

جوانی کا ملّاح

غمِ الفت کے طوفانی سمندر کا کنارا ہے
کہ جس کی موجِ تنہا موت کا خونریز آرا ہے

یہ وہ اُلفت کدہ ہے جسمیں لاکھوں حشر اٹھتے ہیں
یہ وہ مقتل ہے جسمیں موت کے چشمے اُبلتے ہیں

اندھیری رات اور طوفانِ ابر و باد کا منظر
کوئی دیکھے ذرا یہ فطرتِ آزاد کا منظر

گرج ہیں بادلوں کی یا دہاڑیں ہیں یہ شیروں کی
فنا ہو جائیں جس کے خوف سے روحیں دلیروں کی

یہ خونیں ابتدا کیا انتہا کا پیش خیمہ ہے
یہ کالی رات کیا روزِ جزا کا پیش خیمہ ہے

یہ نمرودوں کی بستی پر چڑھائی ہونیوالی ہے
کہ آپس میں خداؤں کی لڑائی ہونیوالی ہے

یہ بیٹھے بیٹھے کیا جوش آگیا ہے دیوتاؤں کو
دگرگوں کر دیا ہے سب سمندر کی فضاؤں کو

سمندر اتنا طوفانی ہے ساحل ٹوٹ بہ جائینگے
سمندر میں وہ طغیانی ہے ساحل ٹوٹ جائینگے

ارے یہ کون عورت زاد اُٹھی فرشِ ساحل سے
یہ کیسی حُور پیدا ہو گئی ہے عرشِ ساحل سے

یہ ہیبتناک تاریکی یہ ہیبت زا پریشانی
سفینہ لے چلی آغوشِ طوفاں میں یہ دیوانی

اری ناداں ٹھہر جانا! یہ کشتی ڈوب جائے گی
یہ کشتی ٹوٹ کر پھر اس کنارے تک نہ آئے گی

عدمؔ

(غیر مطبوعہ)

ارسطو

ابتدائی حالات

عقل وحکمت کا یہ حیرت انگیز مجسمہ ۳۸۴ ق م میں بمقام اسٹاگرا واقع صوبۂ تھریس پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ نکومیکس، ایک مشہور طبیب تھا جس نے تاریخ طبیعی اور طب میں بہت سی مفید کتابیں تصنیف کی تھیں اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کو اِن فنون سے خاندانی دلچسپی تھی۔ علاوہ بریں، اسٹاگرا جہاں، ارسطو کا بچپن اور شباب کا زمانہ بسر ہوا، سمندر کے کنارے واقع تھا، اس لئے قدرتی مناظر، اور باغات وغیرہ وہاں بافراط موجود تھے۔ اور یقیناً اُس نے اِن تمام چیزوں سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔

نکومیکس نے چھوٹی سی عمر ہی سے ارسطو کو تعلیم دینی شروع کر دی تھی اور وہ اپنے ہونہار فرزند کو دیکھکر دل ہی دل خوش ہوتا ہوگا۔ لیکن ابھی ارسطو نے اپنی عمر کی دس بارہ منزلیں بمشکل ہی طے کی ہونگی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مرتے وقت نکومیکس نے، ارسطو کا ہاتھ اپنے دوست پراکسینس کے ہاتھ میں دیا اور پلک مارتے دنیا کے سارے بکھیڑوں سے آزاد ہوگیا۔

ارسطو کے کانوں میں، ایتھنز اور اس کی علمی دلچسپیوں کا شہرہ کافی پڑچکا تھا، اور اس کی خواہش یہی تھی کہ میں اس شہر میں جا کر رہوں، جہاں کے درو دیوار سے فلسفہ وحکمت کی آوازیں نکل رہی تھیں جس طرح محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ البیلے کے زمانہ میں دِلّی اور لکھنؤ کے درو دیوار سے خیال اور ٹھمری کی صدا آتی تھی۔ لیکن، ارسطو کا مربی اس بات کو کب روا رکھ سکتا تھا کہ مرے ہوئے دوست کی نشانی کو، ایک منٹ کے لئے بھی آنکھ سے اوجھل ہوجانے دے؟ قہر درویش بجان درویش۔ سترہ سال کی عمر تک ارسطو وہیں، تعلیم حاصل کرتا رہا، اور جب ۳۶۷ ق م میں پراکسینس کا انتقال ہوگیا تو ارسطو نے سیدھی ایتھنز کی راہ لی۔

سُوءِ اتفاق سے ایتھنز پہنچکر، علم وحکمت کے اس متوالے کو یہ معلوم ہوا کہ چند ہی روز ہوئے ہیں کہ افلاطون جس کا نام سنکر، اس کے دل میں محبت و احترام کا طوفانِ عظیم موجزن ہو جایا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی کام سے صقلیہ چلا گیا، اور تین سال کے بعد واپس آئیگا۔ بہرکیف اُس نے تین سال برابر مطالعہ ومشاہدہ میں صرف کیئے۔ غالباً اسی خیال سے کہ جب افلاطون آئے تو مجھے شاگردی میں لینے سے انکار نکر سکے۔ علاوہ باپ کے دولت کے، موہنہ بولے چچا کا سرمایہ بھی ارسطو کو ملا۔ اور فلسفہ کے اس شیدائی نے، اس ترکہ کو دل کھولکر، کتابوں کی خریداری پر صرف کیا۔ واضح ہو کہ اُس زمانہ میں، کتابیں بمشکل دستیاب ہوتی تھیں اور صرف دولتمند آدمی ہی اُن سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ارسطو کا یہ غیر معمولی شوق دیکھکر، سقراط اور افلاطون کے احباب اور قابل شاگردوں نے مذاکرۂ علمیہ[1] اور مکالمہ عقلیہ کا دروازہ اس کیلئے کھولدیا۔ ایتھنز میں بعض لوگ ایسے بھی موجود تھے جنہوں نے سقراط کی تقریریں سُنی تھیں۔ ارسطو تو خدا سے چاہتا تھا کہ ایسے لوگوں سے رسم و راہ پیدا ہو جائے یا اُسے ایسے لوگ ملجائیں جو فلسفہ کے ان باوا آدموں کے حالات سنائیں اور اس کے روز افزوں شوق کو بھڑکائیں۔ اس نے ان لوگوں کی صحبت سے قرار واقعی فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو اس تین سال کے عرصہ میں اس قابل بنالیا کہ جب افلاطون نے صیقلیہ سے واپس آکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور جب استاد، شاگرد کے باہمی تعلقات کو چند ماہ گزر گئے تو افلاطون نے اس کے متعلق صاف کہدیا۔ کہ "ارسطو میرے مدرسہ کی روحِ رواں ہے"۔ اس جگہ یہ بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ اس زمانہ میں افلاطون کے شاگردوں کی تعداد پانچ سو سے بھی اوپر تھی۔ پس اس انبوہ کثیر میں، چند ہی ماہ کے بعد، ارسطو کا ایسا چمک جانا کہ استاد کی نگاہ انتخاب اس پر پڑگئی اس کی جودتِ[2] طبع کی ایک روشن دلیل ہے۔

بیس سال تک، ارسطو، اپنے غیر فانی استاد کی خدمت میں شبانہ روز حاضر رہا، اور ایک انسان، دوسرے انسان سے جس حد تک استفادہ[3] کرسکتا ہے۔ ارسطو نے اس میں کوئی

[1] علمی گفتگو۔
[2] دماغی لیاقت۔
[3] فائدہ حاصل کرنا۔

دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن اس کی طبیعت، میں کورانہ تقلید پرستی نہ تھی، وہ تو "صداقت" کا عاشق تھا، اس لئے شخصیت سے مرعوب نہوا یعنی اُس نے اپنے آپ کو "فلسفۂ افلاطونی" کا غلام نہیں بنایا بلکہ "حکمت" کو بنی نوع آدم کی "دولتِ گمشدہ سمجھا" اور "جہاں سے ملی، حاصل کر لی"۔

ارسطو نے زمانۂ طالب العلمی ہی میں خاصہ کتب خانہ جمع کر لیا تھا، جس میں افلاطون کی تصانیف کے علاوہ، تمام یونانی فلاسفروں کی تصانیف قرینہ سے سجی ہوئی تھیں۔ اسی شغف[1] علمی کو دیکھ کر افلاطون نے ارسطو کو "قاری" (The reader) کا خطاب دیدیا تھا۔ کیونکہ وہ ہر وقت پڑھتا ہی رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس کو کسی وقت سوائے مطالعہ کے اور کسی دنیاوی کام میں مصروف نہ پایا یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفہ کے مختلف مذاہب (Schools) سے، شاگردی ہی کے زمانہ میں واقف ہو گیا تھا اور خود افلاطون اس کی وسعتِ معلومات پر رشک کیا کرتا تھا۔

الغرض جب ۳۴۷ء میں افلاطون نے وفات پائی تو ارسطو اپنے وطن اسٹاگرا کو واپس آیا، شہرت کی لینڈوری اُس سے کئی منزل آگے چل رہی تھی۔ لہذا اسٹاگرا پہنچتے ہی، فلپ شاہ مقدونیہ نے اس کو سکندر (اعظم) کا اتالیق بنانا چاہا لیکن ارسطو نے بادشاہ سے عرض کی کہ پہلے مجھ کو چند علمی مصروفیات سے فارغ ہو جانے دیجیے یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی دولت اور مرتبت سے میری مدد کریں تاکہ میں سائینس ہیئت، فلکیات۔ علم الحیوٰۃ، طبیعیات، تشریح الاعضاء اور ان کے متعلقات پر عبور حاصل کرنے کے ایک لیبارٹری قائم کر لوں اور ان علوم کے متعلق ضروری تجربات سے اپنے معلومات کو پرکھ لوں۔ بادشاہ نے حتی الوسع اس کی امداد کی اور چند ماہ قیام کرنے کے بعد پھر ایتھنز واپس آیا اور عارضی طور پر علم فصاحت و بلاغت کا درس دینا شروع کر دیا۔ اور چار سال تک باطمینان کلی، مختلف علمی مشاہدات اور تجربات میں مشغول رہا۔

ارسطو کی علمی شہرت تو اس کے زمانۂ طالب العلمی ہی میں ہو گئی تھی اب جو اس نے درس دینا شروع کیا تو بہت سے بڑے بڑے آدمی، بصد خوشی اس کی تقریر سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شریک درس ہونے لگے۔ انہی میں ایک شخص حرمیاس نامی بھی تھا جو علاوہ بیحد دولتمند ہونے کے، بارسوخ بھی تھا، نہایت علم دوست اور علماء کا بڑا قدردان۔ جب سنہ ۳۴۴ ق م، اٹارنیس کے باشندوں نے اُسے اپنے شہر کا حاکم اعلیٰ منتخب کیا تو، اس جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اس نے ارسطو کو مال و دولت سے غنی کر دیا اور بطور اثباتِ قدردانی، اپنی بہن کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔ یہہ خاتون بہت شایستہ اور مزاج داں تھی چنانچہ تمام عمر میاں بی بی کے باہمی تعلقات نہایت، اچھے رہے۔

بہرکیف سنہ ۳۴۳ ق م میں فلپ شاہ مقدونیہ نے بصد احترام، ارسطو کو بلا بھیجا اور اپنے ہونہار، جوان بخت، لیکن جوان مرگ بیٹے سکندر کو اُس کی اتالیقی میں دیدیا۔ میں اس بات کو نوادر روزگار سے سمجھتا ہوں، سکندر کو ارسطو سا استاد ملا۔ حیران ہوں کہ کسے زیادہ خوش قسمت قرار دوں؟ فلپ کو، جس نے اپنے بیٹے کے لئے ایسا لایق استاد منتخب کیا یا سکندر کو جسے ارسطو اتالیق ملا یا ارسطو کو جسے سکندر سا شاگرد نصیب ہوا؟ دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا، جسے ارسطو سا استاد ملا ہو اور نہ کوئی فلاسفر ایسا پیدا ہوا، جسے سکندر سا شاگرد نصیب ہوا ہو۔ یہ دونوں نام، تاریخ عالم میں سونے کے نہیں بلکہ جواہرات کے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ اگر لفظ "سکندر" اردو زبان میں خوش قسمت، بلند اقبال۔ فتحمند، نام آور وغیرہ کا مترادف ہے، تو لفظ "ارسطو" دانشمند، حکیم، فلاسفر، عاقل دانا اور مدبر کا ہم معنیٰ ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، جب ارسطو، سکندر کا اتالیق مقرر ہوا تو وہ اک تیرہ سالہ، خودسر اور تند مزاج طفل نوخیز تھا، نہایت مغلوب الغضب عیش پسند۔ مرگی کے مرض کا شکار اور کسی قدر میراتی۔ اگر دنیا میں کسی چیز سے شوق تھا تو جنگلی گھوڑوں کے سدھانے سے۔ اگرچہ ارسطو کو اس تند خو نوجوان کی خصایل و عادات کے تبدیل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تاہم بقول بلوٹارک[2] اس کو ارسطو نے اپنے سے اس درجہ مانوس کر لیا کہ وہ اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھنے لگا۔ چنانچہ سکندر بعض اوقات کہا کرتا تھا کہ "اگرچہ میرے باپ نے مجھے زندگی عطا کی، لیکن زندگی بسر کرنے کا طریقہ ارسطو ہی نے مجھے سکھایا" اور ایک موقعہ پر اس نے ارسطو کو یہ الفاظ کہے تھے۔ "کیا اچھا ہوتا اگر میں طاقت اور حکومت کی توسیع کے عوض

---

[1] دلچسپی۔

[2] ایک یونانی مصنف جس نے ۴۶ مشہور یونانی اور ۴۶ مشہور آدمی افراد سوانحعمریاں لکھی ہیں۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔

علم وحکمت میں ترقی کرتا۔"

الغرض تین چار سال تک یعنی ۳۴۰ق م تک سکندر، ارسطو کی اتالیقی میں رہا۔ اس کے بعد فلپ نے اُسے اصول حکمرانی اور طریق کامرانی حاصل کرنے کے لئے مختلف صوبوں کی گورنری اور مختلف مہمات کی سپہ سالاری پر مامور کرنا شروع کیا اور ارسطو اپنے علمی تجربات میں مشغول ہوگیا ۳۳۶ق م میں فلپ نے وفات پائی۔ سکندر تخت نشین ہوا اور جب وہ مشرقی ممالک کی فتوحات کے متعلق تجاویز سوچنے میں مصروف ہوا تو ارسطو اُس سے اجازت لیکر ایتھنز چلا آیا اور ۳۳۵ق م میں سلسلہ درس وتدریس شروع کردیا تھوڑے ہی دنوں میں تمام مدارس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور ہزار ہا شائقین علم اس کے گرد پروانہ وار جمع ہوگئے۔ ارسطو کا مدرسہ، ایتھنز سے باہر ایک خوبصورت باغ میں واقع تھا۔ اور وہ عموماً چہل قدمی کرتے ہوئے طلبا کو درس دیا کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے شاگردوں کا لقب "المشائین" یعنی "چلنے والے" پڑ گیا اور اس کے نظام فلسفہ کو آج بھی "فلسفہ مشائیں" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرز عمل کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ چل پھر کر درس دینا اس کی چلبلی اور بےچین طبیعت کا خاصہ تھا، اور بعض لوگ اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ اس کی صحت بہت کمزور ہوگئی تھی اس لئے وہ چہل قدمی کرتے ہوئے لوگوں کو پڑھایا کرتا تھا۔

اس کے لکچر دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک سلسلہ صبح کے وقت جاری ہوتا تھا جس میں کم سمجھ اور معمولی لیاقت کے لوگ شریک ہوتے تھے اور صبح کی تقریریں میں عام فہم مسائل پر گفتگو ہوتی تھی لیکن شام کے درس میں خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے اور حکمت کے دریا اسی مخصوص جماعت کے سامنے بہائے جاتے تھے۔

الغرض علم وفن کا یہ چشمہ ۳۲۳ق م تک اسی طرح شبانہ روز اُبلتا رہا لیکن جب سکندر اعظم کا اُسی سال انتقال ہوگیا تو ارسطو کو اپنی جان کی فکر پڑی۔ وجہ یہ ہوئی کہ ارسطو ایک بے باک اور راستگو بلکہ صاف گو انسان تھا۔ طرز حکومت اور حکام وقت میں جو کچھ عیوب اُسے نظر آتے تھے بے کم وکاست بیان کردیتا تھا۔ حد ہے کہ سکندر کے چال چلن پر بھی بعض اوقات علانیہ اعتراضات کردیتا تھا پس اس کی وفات پر ارسطو فوراً ایتھنز کو خیرباد کہکر چالکس چلا گیا اور ایک سال کے بعد یعنی ۳۲۲ق م میں وفات پاگیا۔

کیریکٹر

ارسطو، فی الحقیقت علم وحکمت میں اس درجہ غرق تھا کہ اس کے کیریکٹر کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ یعنی "طالب العلم" یا "طالب حکمت"۔ رڈر نے اپنی مشہور تالیف تاریخ فلسفہ جلد سوم میں، اس کا کیریکٹر بحیثیت فلاسفر بدیں الفاظ بیان کیا ہے:-

"اس کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک متین اور سنجیدہ مزاج طالب حق تھا۔ افلاطون کی طرح خیال آرائیوں سے اس کو مطلق سروکار نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ عملی نصب العین اپنے سامنے رکھتا تھا۔ وہ "صداقت" کو ہر پہلو سے جانچتا تھا۔ جو کچھ لکھتا تھا نہایت ناپ تول کر، اور بہت سوچ سمجھکر۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو، مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی کرے سائینٹفک مشاغل میں انہماک تام، اس کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا چونکہ شاعری عروض، ادب اور تصوف سے اُسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اس لئے اس کی تحریریں، وہ دلکشی اور تاثیر نہیں ہے جو افلاطون کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی تصانیف میں بعض مقامات پر تکرار مضامین بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ سائینس کے سنجیدہ نتائج کو، اپنے تخیل سے مربوط نہیں کرسکتا تھا اور اسی لئے اس کی طرز تحریر عموماً بے ڈھنگی اور غیر مربوط ہوتی ہے۔ بعض اوقات خیالات میں تسلسل بھی مفقود ہوجاتا ہے۔ عموماً اختصار سے کام لیتا ہے اور کسی تصنیف میں ادبی خوبی نمایاں نہیں ہے گویا ارسطو کے نزدیک "فلسفیانہ" "ادبیات" کالعم البدل ہے۔"

خصائص ذاتی

ارسطو، افلاطون کے برابر تخیلی قوت کا مالک نہ تھا لیکن اس کی قوت ملکہ، جودت طبع اور خواہش تحقیق، بیشک افلاطون سے بڑھی ہوئی تھی۔ افلاطون کے مداح آج بھی پائے جاتے ہیں اور ہمیشہ پائے جائیں گے لیکن ارسطو کے سامنے، لوگ ابھی تک زانوئے شاگردی تہ کر رہے ہیں اور آج بھی اس کی تصانیف سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ارسطو سے بڑھکر کسی شخص واحد نے بنی نوع آدم کے خیالات کو اسدرجہ متاثر نہیں کیا۔ اس کے علمی کارناموں اور عقلی موشگافیوں کا رنگ آج بھی تمام فلسفہ کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی نظیر ڈھونڈے نہیں ملسکتی۔ پروفیسر ایگسینیر نے ایک لکچر میں بیان کیا تھا کہ ارسطو کی وسعت معلومات کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ آج سے تیئیس ۲۳ سو سال

پہلے، علم الحیوان سے اس درجہ واقف تھا کہ ہم لوگ، باایں ہمہ افزونی وفراوانیٔ ذرائع معلومات اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے" دنیا میں اگر کسی کو علم کی چاٹ ہوگی تو اسی قدر جتنی ارسطو کو تھی۔ شبانہ روز مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُسے ان تمام علوم وفنون میں دستگاہ کامل حاصل تھی جو اس کے زمانہ میں متداول تھے اگرچہ اس نے طبابت کو ذریعہ معاش یا شغل زندگی نہیں بنایا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اس فن کا بھی امام گزرا ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں افلاطون اور ارسطو یہ دو نام حکمت اور دانش کے ہم معنیٰ ہو کر رہ گئے ہیں جب ہم کسی شخص کی انتہائی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ تو اپنے وقت کا ارسطو ہے۔

افلاطون سے اختلاف

ہم لکھ چکے ہیں کہ اگرچہ ارسطو، بیس سال تک افلاطون کی شاگردی کرتا رہا لیکن اُس نے اپنے آپ کو افلاطونی فلسفہ کا مقلد نہیں بنایا اور نہ بنا سکتا تھا بلکہ وہ بعض امور میں اپنے لائق استاد سے اختلاف بھی رکھتا تھا جس طرح امام محمدؒ اور ابو یوسف نے امام ابو حنیفہؒ[1] سے بعض شرعی مسایل میں اختلاف کیا ہے۔

بہرکیف اس اختلاف کی بنا پر عام طور سے یہ مشہور ہے کہ استاد اور شاگرد کے تعلقات چند سال کے بعد خراب ہو گئے اور استاد کے مقابلہ میں ارسطو نے بھی درس دینا شروع کیا وغیرہ وغیرہ جہاں تک تحقیق کی گئی اس قصہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ قابل شاگرد اپنے استاد سے اختلاف کیا ہی کرتے ہیں۔ اختلاف معقول تو دلیل ہے۔ لیاقت ذاتی کی لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ افلاطون اور ارسطو میں ایسی ناچاقی اور ذاتی دشمنی پیدا ہو گئی تھی جیسی کہ آج کل مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علماء میں نظر آتی ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا کہ ارسطو نے کبھی اور کسی طرح، اپنے استاد کی توہین یا برائی کی ہو۔ اپنی تصانیف میں اس نے متعدد مقامات پر افلاطون سے اختلاف رائے کیا ہے بلکہ اس کے فلسفہ کی بعض مشہور تعلیمات کی تردید بھی کی ہے لیکن وہ افلاطون کا نام ہمیشہ نہایت عزت کے ساتھ لیتا ہے۔ لیکن اگر عقلی زاویۂ خیال سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرنا، کفرانِ نعمت (ناشکر گزاری) یا گستاخی ہے تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق کیا کہا جائیگا۔ جنہوں نے عموماً اپنے بزرگوں کے معتقدات کی تردید ہی میں اپنی عمریں صرف کر دیں؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اس غلامانہ ذہنیت نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ مختلف ایشیائی اقوام کو "نیم جامد" بنا کر رکھدیا اسی کورانہ تقلید اور شخصیت پرستی نے ان میں "روح تحقیق" پیدا نہیں ہونے دی اور اگر ہوئی تو اس کا گلا گھونٹ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز تک مسلمان ارسطو کی گاڑی میں بطور بیلوں کے جُتے رہے اور اس کے فلسفہ کو "الہام آسمانی" کا مرتبہ دیتے رہے۔ اور آج اگر مسلمان جملہ علوم وفنون علی الخصوص مذہبی تحقیقات میں پیچھے ہیں۔ تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی رائے سے کام لینا یا بزرگان سلف سے اختلاف و انحراف کرنا کفران نعمت نہیں بلکہ "کفر" سمجھتے ہیں۔ اگر یورپین اقوام خصوصاً جرمن لکیر کے فقیر ہوتے یا اختلاف رائے کو "رحمت" نہ سمجھتے تو آج یہ لوگ تمام دنیا میں علم وفضل حکمت اور فلسفہ کے علمبردار نہ ہوتے۔ اگر نیک نیتی کے ساتھ کبھی سے اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فی الحقیقت "رحمت" ہوتا ہے۔ موجب برکات ہوتا ہے۔ کاش مشرق کے لوگ اس رمز سے آگاہ ہو جائیں!

ارسطو کی تحقیق وتلاش

ارسطو فی الواقع ایک خوش قسمت انسان تھا اگر خدا تعالیٰ نے اس کو بہترین دل و دماغ عطا کیا تھا تو قدرداں بھی ایسا دیا جس نے علاوہ مختلف نوازشات کے، جن کے شمار نہیں، بیک وقت آٹھ سو ٹیلنٹس کی رقم اپنے استاد کی نذر کر دی کہ وہ اپنا شوق جستجو حد کمال کو پہنچا سکے آٹھ سو ٹیلنٹ کے قریباً تیس لاکھ روپے ہوئے۔ اور چونکہ اب روپیہ بہ رکارہ گیا ہے لہذا ایک کروڑ بیس لاکھ روپے ہوئے آج بیشک یہ رقم اکثر نگاہوں کو گراں قدر معلوم نہ ہوگی، لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے، بہت سے بادشاہوں کے خزانہ میں بھی یہ رقم نہیں نکل سکتی تھی۔ چنانچہ ارسطو نے اگر دنیا کو "تاریخ الحیوان" جیسی بیش بہا اور پُر از معلومات کتاب دی تو وہ سکندر ہی کی فیاضی کی بدولت

ارسطو کی تصانیف

ارسطو نے اپنی عمر کے ترپنویں سال میں مستقل طور پر درس وتدریس کا سلسلہ قائم کیا تھا جسے لائی سی ام کہتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ قلعۂ

---

[1] امام ابو حنیفہؒ فقہ حنفی کے بانی گزرے ہیں ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی کے فقہ پر چلتے ہیں۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسف دونوں ان کے لائق ترین شاگرد تھے۔ ۱۲

زمین، جہاں مدرسہ واقع تھا، لائی سی اس دیوتا کے مندر سے ملحق تھا۔ ایک دو نہیں ہزارہا طلبا اس دارالعلوم میں رہا کرتے تھے، اور طلبا و استاد میں شبانہ روز علمی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ افلاطون کے مدرسہ کا نام اکیڈیمی تھا اور اس میں فلسفہ، سیاسیات۔ اور ریاضی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، ارسطو کے مدرسہ میں سائنس، علم الحیوٰۃ اور طبیعات کا زیادہ چرچا تھا۔ اگر پلینی کی روایت مندرجہ "تاریخ علوم طبیعیٗ" باب ہشتم فصل شانزدہم کو لائق اعتماد سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نے اپنی قلمرو کے تمام شکاریوں، سیاحوں، صیادوں، باغبانوں، ماہی گیروں اور سرکاروں کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ ارسطو، اپنی لیبارٹری کے متعلق جس چیز کی طلب کرے حتی الوسع بہم پہنچائی جائے۔ بعض قدیم مورخوں نے لکھا ہے کہ عرصہ دراز تک، ایک ہزار نفوس، ارسطو کی خدمت میں حاضر رہے اور وہ ان کو یورپ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں ہر ملک کی مخصوص پیداوار اور حیوانات و نباتات کے نمونے فراہم کرنے پر تعینات کرتا رہا انہی ذرائع کی بدولت، اُس نے دنیا میں سب سے پہلے "باغ وحوش وطیور" قائم کیا۔ اور علم الحیوٰۃ علم الحیوان اور علم الطبیعیات میں ایسی قابل قدر تصانیف دنیا کے لئے چھوڑیں

اس کے ساتھ ہی اُن مشکلات اور دشواریوں کا علم بھی اپنے ناظرین اوراق کو دینا نہایت ضروری ہے جو ارسطو کی راہ میں حائل تھیں۔ اس زمانہ میں نہ گھڑی تھی نہ تھرمامیٹر، نہ خوردبین نہ دوربین نہ مقیاس الحرارت نہ مقیاس الہوا، نہ آلات نہ ذرائع اوزان و پیمایش۔ تجزیۂ کیمیاوی، درست پیمایش، صحیح اوزان، اور طبیعات میں ریاضی کا عمل، یہ سب باتیں، ارسطو کے خواب خیال میں بھی نہیں تھیں۔ اسی طرح مادہ کی قوت کشش، قانون جرِ ثقیل، برق اور برقی تموجات، امتزاج کیمیاوی، ہوا کا دباؤ اور اس کے نتائج، روشنی، اور حرارت کے خواص وغیرہ وغیرہ جملہ جدید انکشافات جیسا کہ سب جانتے ہیں، زمانہ ماضی میں مثل عنقا، ناپید تھے۔

اندریں حالات، اگر کوئی شخص آج ارسطو کی تصانیف متعلقہ طبیعات کا مطالعہ کرے تو اُسے اکثر خامیاں نظر آئینگی، لیکن اُس نے اپنی کتابوں میں، معلومات کا اسقدر عظیم الشان ذخیرہ آئندہ نسلوں کے لئے جمع کر دیا ہے۔ کہ اس کی تصانیف، جملہ تحقیقات مابعد کا سنگ بنیاد بنگئیں اور دو ہزار سال سے درجۂ "علم" کی کتب درسیہ یا نصاب تعلیم بنی ہوئی ہیں، اور صرف یہی بات، انسان کی حیرانی کے لئے کافی ہے۔

ارسطو کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک بتائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس نے چار سو سے اوپر تصانیف، اپنی یادگار چھوڑی تھیں لیکن آجکل مفصلہ ذیل کتب دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اولاً منطقی تصانیف جنکو مجموعی طور پر آرگینان کہا جاتا ہے۔ ثانیاً سائینٹفیک تصانیف یعنی طبیعیات، فلکیات، الکون والفساد کتاب الدثار سماوی، تاریخ موالید، کتاب الروح، کتاب الحیوانات ثالثاً جمالیاتی تصانیف یعنی علم بلاغت وفصاحت، فنون لطیفہ، اور علم المعانی والبیان اور علم عروض۔ رابعاً فلسفیانہ تصانیف یعنی علم الاخلاق، علم سیاست اور مابعد الطبیعیات۔ ان کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اب بھی جو کچھ کتابیں حوادث روزگار سے بچ رہی ہیں وہ "یونان کی سائکلوپیڈیا" سے کم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقلائے روزگار نے ارسطو کو "معلم اول" اور "الفیلسوف" کا لقب دیا ہے۔

ارسطو ایک خشک فلسفی تھا، اس کی تصانیف میں ادبی شان نہیں پائی جاتی بلکہ نری اصطلاحات بھری پڑی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مشکل ہی سے ہم کسی سائینس (فن) کے متعلق، ارسطو کی ایجاد کردہ اصطلاحات کو استعمال کئے بغیر گفتگو کر سکتے ہیں مثلاً خاصہ۔ حدِ اوسط، کبریٰ، مقولہ۔ تاثر۔ فعلیت۔ نیئت۔ غایت مبادیات۔ ہیولیٰ یہ تمام مصطلحات، ارسطو ہی کے معنی آفرین دماغ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہیں۔ حکما ہی پر نہیں بلکہ حکمت پر بھی ارسطو کے بیشمار احسانات ہیں۔

(۱) مبادیات منطق

پہلی بات جس کی وجہ سے ارسطو کو جملہ حکمائے عالم پر فوقیت حاصل ہے یہ ہے کہ اس نے، بغیر امدادِ غیرے، محض اپنی قوت غور و فکر سے، ایک مستقل فن یعنی "علم منطق" ایجاد کر کے مدون کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ارنسٹ رینان، تاریخ بنی اسرائیل جلد پنجم صفحہ ۳۳۸ پر لکھتا ہے "جس شخص نے فلاسفۂ یونان اور علی الخصوص

لہ اٹلی کا ایک مصنف مورخ اور ایپکورس کے فلسفہ کا حامی اس کی کتاب مندرجہ متن آج بھی بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

ایک مشہور فرانسیسی مصنف اور فلاسفر جس نے ابن رشد کی لائف لکھی ہے اور اس کی حیات مسیح نے تو مذہبی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ ۱۲

افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا - وہ فلسفہ میں نہ کامل ہوسکتا ہے نہ ماہر" اگرچہ ارسطو کی وفات کے بعد یونان میں پھر کوئی شخص ارسطو کا ہم پایہ پیدا نہ ہوا اور چند صدیوں کے بعد یونان میں حکمت و فلسفہ کا چراغ بھی گل ہوگیا لیکن جب یورپ جہالت اور بربریت کی تاریکی باہر نکلا، اور لوگوں نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی تو ارسطو کی منطق ہی پر یورپین علوم کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور اسی کی بدولت ان کے دماغوں میں وہ قابلیت پیدا ہوئی۔ جس کا منظر آج ہمارے سامنے ہے۔

منطق سے مراد ہے، صحیح طریق پر غور و فکر کرنا - اگرچہ دنیا میں نہ کوئی فن اس کی برابر حوصلہ فرسا ہے نہ غیر دلچسپ، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ بغیر منطق سے واقفیت پیدا کئے، کوئی شخص "عالم" یا "فاضل" ہونے کا مدعی نہیں ہوسکتا۔

منطق میں پہلی بات "تعریف"[1] ہے - سقراط کو ابوالفلاسفر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے دنیا میں سب سے پہلے منطق کی داغ بیل ڈالی اور وہ یہی تھی کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ جو کچھ منہ سے کہتے ہو یا جن امور کے متعلق بحث مباحثہ کرتے ہو - ان کی تعریف کرو - مثلاً زید نے کہا "نیکی کرو" سقراط نے جرح کی کہ نیکی کیا ہے؟ کسی نے کہا "صداقت کی پیروی کرو" سقراط نے سوال کیا کہ صداقت کسے کہتے ہیں؟ غرضیکہ نیکی بدی جھوٹ سچ اچھائی برائی، جسقدر بحث طلب باتیں ہیں ان سب کی صحیح تعریف مقدم ہے - اور جب تک کسی شے کی حدو بست نہ ہو اس وقت تک قایل کا مفہوم مخاطب کے ذہن میں قائم نہیں ہوسکتا - دنیا میں زیادہ تر بحثیں محض نزاعات لفظی[2] ہوتی ہیں اور اسی لئے والٹیر[3] نے کہا تھا کہ "اگر تم مجھ سے گفتگو اور مکالمت پسند کرتے ہو تو اپنی اصطلاحات کی تعریف کرنا سیکھو" اسی لئے ارسطو نے تعریف پر بڑا زور دیا۔

چنانچہ وہ کہتا ہے کہ تعریف میں دو باتیں ضروری ہیں، جنس اور فصل یعنی ایک تو یہ کہ چیز کی تعریف مدِ نظر ہے وہ کس جنس سے تعلق رکھتی ہے دوسرے یہ کہ اس میں امتیازی بات کون سی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے جدا کرتی ہے مثلاً "انسان" کی تعریف منطقی طور پر یوں ہوگی کہ انسان، حیوان ناطق ہے - حیوانیت وہ شے ہے جو امر مشترک ہے گھوڑا، بیل، مرغ، بلی، گائے وغیرہ سب حیوان ہیں، انسان بھی حیوان ہے لیکن "نطق" وہ صفت ہے جو سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں نہیں پائی جاتی - پس اگر ہم انسان کو حیوان ناطق کہیں تو بالکل بجا ہے۔

اس کے بعد "کلیات" کا نمبر آتا ہے جو افلاطون اور ارسطو کے درمیان پہلی بنائے مخاصمت قرار پاسکتی ہیں اور انہی کی بدولت یورپ میں مدتوں تک خارجیت اور اسمیت کے مابین معرکہ آرائیاں رہیں۔ ارسطو کے نزدیک ہر اسم نکرہ ایک کلی ہے مثلاً حیوان، انسان، کتاب، درخت وغیرہ - لیکن یہ کلیات محض امور ذہنی ہیں - خارج میں ان کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا - زید - بکر - خالد وغیرہ کا وجود خارج میں موجود ہے - لیکن "انسان کلی" کا وجود سوائے ذہن کے، دنیا میں کہیں موجود نہیں۔

اس کے برخلاف افلاطون کی تعلیم یہ تھی کہ حقیقی وجود صرف کلیات ہی کا ہے یعنی زید فانی ہے مگر انسان باقی ہے - یہی وجہ ہے کہ ارسطو اور افلاطون کے درمیان اس مسئلہ پر بدیہی اختلاف رونما ہوگیا - گویا ایک دوسرے کے بالکل برعکس تعلیم دنیا ہے افلاطون کہتا ہے کہ کلی کا وجود حقیقی ہے، جزئی کا وجود اعتباری ارسطو کہتا ہے کہ کلی کا وجود اعتباری ہے - جزئی کا وجود حقیقی، اور اسی سلسلہ میں اس کا یہ قول بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ "اگرچہ میں افلاطون کو بہت عزیز رکھتا ہوں لیکن "صداقت" کو اس سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں"

ارسطو ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے منطق میں قیاس یعنی (Syllogism) کو داخل کیا - قیاس تین قضایا، صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ سے مرکب ہوتا ہے مثلاً ہر انسان حیوان ناطق ہے - اور سقراط، انسان ہے لہذا سقراط، حیوان ناطق ہے - گویا قیاس منطقی، دراصل علم ہندسہ کے اصول کے موافق ہے کہ اگر دو چیزیں تیسری چیز کے برابر ہوں تو وہ آپس میں بھی برابر ہونگی یعنی اگر الف برابر ہے ب کے اور ج برابر ہے الف کے تو ج برابر ہے ب کے وعلیٰ ہذا القیاس۔

(۲) مبادیات سائنس

رینان نے حیات المسیح میں کیا خوب لکھا ہے کہ "دنیا میں

---

[1] تعریف۔ [2] لفظی جھگڑا۔
[3] والٹیر (۱۶۹۴ - ۱۷۷۸) Voltaire فرانس کا مشہور ادیب، نقاد، فلسفی اور سیاست دان۔

فلسفہ کی بنیاد سقراط نے ڈالی اور سائینس کی بنیاد ارسطو کی بدولت پڑی اور فلسفہ و سائینس کا جو عظیم الشان قصر آج طیار ہوا ہے وہ فی الحقیقت انہی بنیادوں پر ہوا ہے جو سقراط اور ارسطو نے ڈالی تھیں۔"

دنیا میں سقراط سے پہلے بھی فلسفہ کا وجود تھا اور ارسطو سے پہلے بھی سائینس کا چرچا تھا لیکن ان دونوں سے پہلے فلسفہ اور سائینس تمامتر دینیات کے رنگ میں رنگیں تھے۔ لوگ جملہ مظاہر فطرت کی تشریح میں اپنے مقامی دیوی دیوتاؤں کا نام لینا کافی سمجھتے تھے۔ گویا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب انہی کی کارفرمائی ہے سب سے پہلے یونانی فیلسوف طالیس (۵۵ - ۶۴۰ ق م) نے لوگوں کو یہ بتایا کہ جس سورج کو تم اپنا خدا سمجھتے ہو وہ آگ کا ایک بڑا بھاری گولہ ہے۔ اس کے بعد اینگزیمینڈر۔ اینگزیمنز۔ انگساغورث اور ھر تلسطوس نے ہیئت، نجوم، فلکیات اور طبیعیات میں حتی المقدور انکشافات کئے۔ ایمپیڈاکلیز نے سب سے پہلے یہ حقیقت آشکار کی کہ دنیا میں ہر شے تدریجی ترقی کر رہی ہے گویا مسئلہ ارتقاء کی بنیاد اسی شخص کی ڈالی ہوئی ہے۔ اس کا قول ہے کہ فطرت راتدن، مادہ کے مختلف ذرات میں عمل کرتی رہتی ہے۔ اور حسب ضرورت اشیاء تیار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد لیسی پس اور دیمقراطیس دونوں نے، یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کائنات سراسر سالمات[۲] مادی کے مظاہر مختلفہ کا نتیجہ ہے اور ازلی ابدی ہے۔ جب ایک شے فنا ہو جاتی ہے۔ تو دوسری شے اس کی جگہ آجاتی ہے مادہ فنا نہیں ہو سکتا صرف صورت تبدیل ہو جاتی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ روح اور خدا دونوں کا کوئی وجود نہیں۔

یہ ہے خاکہ اس سائینس کا جو ارسطو سے پہلے دنیا میں مروج تھا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم الایام میں یونانیوں نے سائینس میں کوئی قابل تعریف کام نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یونانی لوگ آرام طلب تھے اور ان کی توجہ زیادہ تر سیاسیات، اخلاقیات اور اقتصادیات و معاشیات وغیرہ کی طرف مبذول رہتی تھی۔

ارسطو پہلا شخص ہے جس نے سیاسیات کے ساتھ ساتھ سائینس کی طرف بھی کافی توجہ مبذول کی۔ اور اپنے استاد کے اصولوں سے ایک قدم آگے بڑھا کر اپنا وقت تجربہ و مشاہدہ میں صرف کیا۔

ارسطو اور طبیعیات

ارسطو نے اپنی طبیعیات کو مابعد الطبیعیات کے رنگ میں لکھا ہے یعنی اسکی طبیعیات دراصل مادہ، حرکت، مکان، زمان، فضا، علت، معلول، لامتناہیت اور دیگر تصورات پر مبسوط مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد دیمقراطیسی خلاء پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ جن میں سے قابل تذکرہ یہ ہے کہ کائنات میں "خلاء" محال ہے کیونکہ "خلاء" میں تمام اجسام یکساں سرعت کے ساتھ ساقط ہونگے اور یہ ناممکن ہے۔ ارسطو نے دیمقراطیس ہی پر اعتراضات نہیں کئے ہیں بلکہ کوئی فلاسفر اس کے ناوک اعتراض سے محفوظ نہیں رہا۔ بقول بیکن۔ "ترکان عثمانی کی طرح، ارسطو بھی یہی سمجھتا تھا کہ جب تک میں اپنے بھائیوں کو تہ تیغ نہیں کرونگا۔ اس وقت تک، تخت حکومت پر قرار نصیب نہ ہوگا (ترقی علوم، باب سوم فصل چہارم)

ارسطو نے علم ہیئت میں، کوئی معتدبہ اضافہ نہیں کیا۔ فیثاغورثی نظام کے خلاف، ارسطو نے زمین کو، بجائے آفتاب کے، مرکز کائنات قرار دیا ہے۔ لیکن فلکیات اور علم الکائنات والجو میں اس نے نہایت صحیح مشاہدات اور دلچسپ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی کرنیں پانی کو بخار کی شکل میں تبدیل کرتی ہیں اور بخارات کرۂ ہوائی میں جا کر بادلوں کی صورت میں بدل جاتے ہیں اور جب ان کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ زمین پر، بوندوں کی شکل میں ٹپک پڑتے ہیں۔

ارسطو اور علم الحیوٰۃ

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دنیا میں پہلا شخص ارسطو ہے۔ جس نے "باغ وحوش" کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ سالہا سال تک مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ حیات کی مختلف شکلیں (انسان، حیوان، گھوڑا، پرندہ، کیڑا وغیرہ) اس ترتیب کے ساتھ ایک سلک میں منسلک کیجا سکتی ہیں کہ باہم امتیاز کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح حیات کے ہر پہلو میں بھی بتدریجی منازل پائے جاتے ہیں، اور فطرت، عالم حیوانات اور نباتات میں ایسا باریک خط امتیازی قائم کرتی ہے جسکا شناخت کرنا بھی دشوار ہے بعض انواع ایسی ہیں جن کا شمار نہ نباتات میں ہو نہ حیوانات میں۔ ادراک اور احساسات، آہستہ آہستہ انہی اجسام میں پیدا ہوتے ہیں جن میں عضوی پیچیدگیاں زیادہ ہو جاتی

---

[۱] Theology [۲] atoms

ہیں۔ اور اسی طرح، رفتہ رفتہ اجسام میں نظام عصبی اور دماغ پیدا ہوا، جس پر نفس ناطقہ حکمرانی کرنے لگا۔ بایں ہمہ تعجب اس بات کا ہے کہ ارسطو نے ان مشاہدات کی بنا پر "نظریۂ ارتقاء" کی بنیاد کیوں نہیں ڈالی۔ ایمپڈ اقلیس کا خیال تھا کہ اعضائے جسمانی، بقائے اصلح کا نتیجہ ہیں اور انکساغورث کا مقولہ ہے کہ انسان میں، اعضائے جسمانی سے کام لینے کی بدولت عقل وشعور پیدا ہوا لیکن ارسطو کہتا ہے کہ نہ اعضائے جسمانی بقائے اصلح کا نتیجہ ہیں اور نہ ان سے کام لینے کی بدولت شعور پیدا ہوا بلکہ شعور کی بدولت، انسان نے اپنے اعضائے جسمانی سے کام لینا سیکھا۔

چونکہ ارسطو کے وقت میں نعش پر عمل جرّاحی کرنے کا رواج نہ تھا اس لئے تشریح الاعضا میں، اس نے اکثر مقامات پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ جسم انسانی میں "عضلات" بھی ہوتے ہیں۔ شرائین اور معمولی رگوں میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دماغ، خون کو ٹھنڈا کرنے کا آلہ ہے اور آدمی کی کھوپڑی میں، عورت کی کھوپڑی سے زیادہ جوڑ ہوتے ہیں، جسم انسانی میں دونوں طرف آٹھ آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں، اور آدمی کے دانت عورت کے دانتوں سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کو کبھی عورت کے دانتوں کے شمار کرنے کا موقعہ نہیں ملا!!! لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ اس کے تعلقات، اپنی بی بی کے ساتھ نہایت خوشگوار تھے!!!

تاہم اس نے علم الحیوٰۃ کو سابقین کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی دی۔ وہ لکھتا ہے کہ پرندے اور رینگنے والے جانور بناوٹ کے لحاظ قریب قریب ہوتے ہیں اور بندر انسان اور حیوانات کی، درمیانی کڑی ہے۔ انسانی بچہ کی روح، بلحاظ خواص حیوانات سے مشابہ ہوتی ہے۔ خوراک، انسان کے خیالات اور طرز حیات کو بڑی حد تک متاثر کرتی ہے۔ اور ایک حیوان جس قدر زیادہ نشوونما یافتہ ہوگا اُسی قدر کم اس کی اولاد ہوگی۔

علاوہ بریں علم الجنین میں بھی ارسطو ہی نے ابتدائی اصول قائم کئے۔ ہپوقراطیس نے، جو یونانی اطباء میں سب سے زیادہ نامآور اور قابل گزرا ہے۔ مرغی کے انڈوں کو، ایک مرغی کے نیچے رکھا اور روزانہ ایک انڈا توڑ کر یہ تجربہ کیا کہ بچہ کس طرح بنتا ہے۔ ارسطو نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور اس میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ آج بھی اس فن کے ماہرین اس کی جودت طبع کا اعتراف کرتے ہیں۔ قانون توارث[1] کے سلسلہ میں بھی ارسطو نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ایک یونانی عورت نے ایک حبشی کے ساتھ شادی کی۔ بچے بالکل گورے چٹے پیدا ہوئے لیکن جب ان بچوں کی شادی ہوئی تو ان کی سب اولاد کالی سُرمہ پیدا ہوئی۔ فی الجملہ، تمام کوتاہیوں سے قطع نظر کرکے، ہم یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو نے اس ضمن میں یعنی علم الحیوٰۃ میں جو کچھ تحقیقات کی وہ لائق صد آفرین ہے۔

(۳) مابعد الطبیعیات

ارسطو کی مابعد الطبیعیات، اُس کے علم الحیوٰۃ پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ کائنات میں ہر شے ترقی پذیر ہے اور بلا سبب یا بغیر علت نہیں پائی جاسکتی اور اس کے لئے چار علتوں کی ضرورت ہے۔ مادی صوری۔ فاعلی اور غائی۔ ہر واقعہ یا مظہر کے لئے یہ چار اسباب ضروری ہیں۔ مثلاً "میز" یا "کرسی" کو بطور مثال لے لیجے۔ لکڑی جس سے وہ بنی ہے، اس کی علت مادی ہے۔ چار ٹانگیں اور اوپر کا تختہ، یہ اس کی علت صوری ہے۔ بڑھئی اور آلات علت فاعلی ہیں۔ میز لکھنے کے لئے اور کرسی بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے یہ اس کی علت غائی ہے۔

دنیا میں جو نشوونما نظر آتی ہے وہ محض امر اتفاقی نہیں ہے۔ بلکہ، ہر شے میں ایک خاص مقصد، پوشیدہ ہے اور ہر شے کی صورت نوعی، اس شے کو منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ مثلاً مرغی کے انڈے سے مرغی ہی کا بچہ برآمد ہوا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مرغی کے انڈے سے بطخ کا بچہ نکل آئے۔

ایک ایسی ہستی کا اثبات کرنا جو متحرک مؤثر قائم بالذات، واجب الوجود اور علۃ العلل ہے، ارسطو کی مابعد الطبیعیات کا سب سے زیادہ روشن پہلو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا طرز استدلال یہ ہے:۔

---

[1] Law of Heredity

[2] اس مسئلہ پر، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں نہایت وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ۱۲

اگر کائنات میں کوئی شے غیر قابلِ فنا ہے تو پھر کوئی جوہر غیر قابلِ فنا (ایسی بھی) ہونا چاہیے جو اس شے کے لئے بمنزلہ بنیاد قرار دیا جاسکے۔ زمان و مکان ہر دو، غیر قابلِ فنا ہیں۔ پس کوئی غیر قابلِ فنا "جوہر" بھی ضرور موجود ہے۔ علاوہ ازیں، اگر کوئی واجب الوجود محرک نہ ہو، جو بالذات فاعل اور متحرک ہے، تو بہت سے مظاہر کائنات کی تشریح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اگر وہ محرک، بالذات محرک نہ ہو اور اگر حرکت دینا، اس کا تقاضائے ذاتی نہ ہو تو ممکن ہے کہ کسی وقت وہ حرکت سے باز رہے اور کائنات ساکن اور جامد ہو جائے یہ علت، متحرک ہے۔ یہ علت، واحد ہے کیونکہ صرف یہی بذاتِ خود، تمام مظاہر کی علت قرار پاسکتی ہے اس لئے کسی دوسری "علت" کے تسلیم کرنے کی ضرورت یا حاجت ہی نہیں ہے۔ علاوہ بریں حرکت مستقل یعنی دوامی اور ازلی ہے اور جو شے دوامی ہے وہ منطقی طور پر "الواحد" ہی سے سرزد ہوسکتی ہے۔

علاوہ ازیں، محرک ازلی چونکہ قوت نہیں بلکہ فعلیت ہے اس لئے "مادہ" سے پاک ہے اور چونکہ مادہ بنائے کثرت ہے اس لئے جو شے ازلی محرک اور مادہ سے پاک ہے وہ اشیائے متعدد میں منقسم نہیں ہوسکتی یعنی اس میں کثرت نہیں پائی جاسکتی لہذا واحد ہی ہوگی۔ یہ علت جمیع عوارض، قیود، اور حدود سے بھی پاک ہے یعنی "ممکن" نہیں، پس "واجب" ہے۔

نوٹ: "ممکن" اس شے کو کہتے ہیں جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوں اور "واجب" اسے کہتے جس کا نہ ہونا ممکن نہ ہو۔ ۱۲

نیز یہ علت چونکہ غیر مادی ہے اس لئے غیر متغیر، غیر قابل تقسیم غیر قابل فنا، غیر متحد، لامحدود، لایتجزی، اور غیر مشہور ہے۔

اگرچہ، یہ ذاتِ واجب، حواس خمسہ ظاہری سے محسوس نہیں ہوسکتی۔ لیکن عقلِ سلیم، اس کے وجود پر استدلال کرسکتی ہے اور نفس ناطقہ، اس کی ہستی کا ادراک کرسکتا ہے۔ یہ علت العلل، زبدۂ کائنات، جامع کمالات حسنہ، اور مقصود موجودات ہے۔ مدبر الامور ہے اور تدبر اس کا خاصۂ ذاتی ہے۔ فاعل بالذات ہے یعنی اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی "تعطل" عارض نہیں ہوسکتا۔ اس کی ذات، عین صفات ہے اور صفات، عین ذات ہیں۔ یہ علت العلل، ذات واجب الوجود، بذات خود علم بھی ہے عالم بھی اور معلوم بھی۔ گویا غالب نے اسی شعر میں، ارسطو ہی کے فلسفہ کو بیان کیا ہے:-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور صوفیائے کرام نے بھی اسی سے ملتا جلتا خیال ظاہر کیا ہے:-

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود بر سر آن کوزہ خریدار بر آمد

شوپنگلر لکھتا ہے کہ ارسطو نے اپنی مابعد الطبیعیات میں جو نقشہ خداتعالیٰ کا بیان کیا ہے وہ ایسا ہے کہ بہترین اور پاکیزہ ترین مذہب بھی بخوشی تمام اس کو اپنی الٰہیات میں شامل کرسکتا ہے۔ پھر ارسطو لکھتا ہے "چونکہ خدا غیر مادی ہے اس لئے نہ اس میں جذبات ہیں نہ احساسات نہ تاثرات نہ خواہشات، خدا ادراکِ محض ہے۔ چونکہ خدا سے کوئی شے ارفع تر نہیں اور چونکہ اس کی قوت متخیلہ، بہترین شے کا تصور کرتی ہے اس لئے خدا خود ہی عالم ہے اور خود ہی معلوم۔ خدا تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ کرب والم یا راحت و سرور سے متاثر و متکیف نہیں ہوسکتا۔ چونکہ خدا، کائنات کی علت غائی ہے اس لئے وہ ہر شے میں موجود بھی ہے۔ اور ہر شے سے وراء الوراء بھی ہے۔ وہ کائنات کے لئے قانون بھی ہے اور مقنن بھی، انتظام بھی ہے اور منتظم بھی، تدبر بھی ہے اور مدبر بھی۔ اور چونکہ وہ واحد بالذات ہے اس لئے کائنات بھی ایک ہی ہوسکتی ہے اور اس کے بالعکس چونکہ کائنات میں "وحدت" نظر آتی ہے۔ اس لئے اس کا بنانے والا بھی "واحد" ہے۔ اور زمین و آسمان کا نظام اسی "وحدت" پر مبنی ہے۔ خدا کی ہستی پر ارسطو نے حرکت سے استدلال کیا ہے یعنی کائنات میں حرکت کا وجود متحقق ہے۔ حرکت، بغیر متحرک کے پائی نہیں جاسکتی پس اگر ہم "حرکت" کی

۱؎ اس دلیل کو ڈاکٹر سیموئیل کلارک نے اپنی مشہور عالم تصنیف اثبات واجب الوجود میں بصراحت تمام بیان کیا ہے۔ ۱۲

۲؎ جس کے اجزا نہ ہوں۔

۳؎ علیحدہ

۴؎ اس دلیل کو علامہ ابن مسکویہ نے اپنی مشہور تصنیف "الفوز الاصغر" میں بوضاحت تمام بیان کیا ہے۔ ۱۲

علت کے سلسلہ کو ابد تک لیجانا صریحی طور پر خلاف عقل سمجھتے ہیں۔ تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کوئی متحرک ایسا ہے جو تمام حرکت کا باعث ہے اور خود اسے حرکت نہیں۔ پس یہ علت العلل ہی خدا ہے۔

ارسطو نے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ وراء العقل نہیں کیونکہ اگر ہم خدا تعالیٰ کو بذریعہ عقل، شناخت نہیں کرسکتے تو پھر خدا کا عدم اور وجود برابر ہو جائیگا یا ہم محض اک "خیالی خدا" پر اعتقاد رکھنے پر مجبور ہونگے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی انسان خدا کو نہ تو اس طرح جان سکتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کو جانتا ہے، اور نہ کوئی شخص اس کی ماہیت کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اسقدر ضرور معلوم کرسکتا ہے کہ کوئی ہستی، اس کائنات کی منتظم اور مدبّر ضرور ہے۔ رٹر لکھتا ہے "ارسطو، افلاطون کی طرح، شر کو ماہیتِ اشیاء سے منسوب نہیں کرتا بلکہ مادہ کو بہر طور (خواہ اُس سے خیر سرزد ہو یا شر) خدا کے ساتھ ازلی مانتا ہے۔ خدا مادہ کا خالق نہیں صرف صانع ہے اور مادہ کی مختلف قوتوں کو "فعلیت" میں مبدل کرتا رہتا ہے"۔ (ارسطو نے مسئلہ خیر و شر پر کچھ نہیں لکھا)

(۴) مبادیاتِ علم النفس

اگرچہ ارسطو کی نفسیات بعض مقامات پر مبہم ہے تاہم اس میں بہت سے دلچسپ مقامات بھی ہیں۔ ارسطو عادت پر بہت زور دیتا ہے۔ اور اسی نے عادت کو سب سے پہلے "طبیعت ثانیہ" سے تعبیر کیا، اور "تلازمۂ تصورات" کا قانون دریافت کیا۔ لیکن نفسیات کے دو اہم مسائل یعنی جبر و اختیار اور بقائے روح پر اس نے کوئی قولِ فیصل پیش نہیں کیا۔ کتاب الاخلاق میں بعض اشارات مثلاً "ہم اپنی حالتِ کذائی کو تبدیل نہیں کرسکتے۔" جبر پر دلالت کرتے ہیں اور بعض تصریحات مثلاً "ہم اپنا ماحول، اپنی مرضی سے منتخب کرکے، اپنی آئندہ حالت کو حسب مرضی جس سانچہ میں چاہیں، ڈھال سکتے ہیں، اختیار پر اشارت کرتی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک روح، نظامِ عضوی کے اصولِ حیات کا نام ہے۔ پودوں اور درختوں کی روح، صرف ان کی "قوت تغذیہ" ہوتی ہے۔ حیوانات کی روح، صرف ان کی قوت احساس و حرکت ہی ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی رُوح علاوہ قوت احساس کے قوت متخیلہ اور متفکرہ سے بھی متصف ہوتی ہے۔ روح، بغیر جسم کے نہیں پائی جاسکتی اور نہ وہ جسم میں اس طرح داخل ہوتی ہے کہ کوئی شے باہر سے آگئی، اور نہ وہ مادّی ہے، اور نہ فنا پذیر۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جب ارسطو روح کو ابدی کہتا ہے تو اس کی مراد "نفس ناطقہ" سے ہوتی ہے نہ کہ اس لطیفۂ حیاتی سے جو تمام حیوانات میں مشترک ہے۔ روح تو جسم کے ساتھ ہی فنا ہوجاتی ہے۔ صرف "قوتِ مُدرکہ ہی غیر فانی ہے۔

(۵) مبادیاتِ اخلاق

ارسطو نے اس امر کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مادی دنیا (طبیعات) کے مسائل سے روحانی عالم (اخلاق) کے مسائل زیادہ وقیع ہیں۔ اگر ایک شخص یہ نہیں جانتا کہ پانی کن اجزا سے مرکب ہے تو شاید اُسے اور اس کے ہمسایوں کو اسقدر تکلیف نہوگی، جسقدر اس صورت میں، اگر اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ چال چلن اور سیرت کس طرح سنواری جا سکتی ہے؟ بہترین زندگی کیا ہوتی ہے؟ حیات انسانی کا اعلیٰ ترین مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ "نیکی" کیا ہے؟ شادمانی کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بقول پروفیسر سنٹیانا* چونکہ ارسطو ایک سائینسدان تھا۔ اس لئے اس نے "علم اخلاق" میں جو اصول بنائے وہ نہایت معقول اور ممکن الحصول ہیں، اور فطرت انسانی کا نہایت سچا تخیل پیش کیا ہے۔

ارسطو نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مقصدِ حیات نیکی نہیں، بلکہ "شادمانی" یا "راحت" ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں محض حصول شادمانی کے لئے، اگر ہم دولت، عزت، حکومت، دانش اور تندرستی کے لئے کوشاں ہوتے ہیں تو محض اسی لئے کہ ان چیزوں سے شادمانی حاصل ہوگی۔"

لہذا "شادمانی" کو مقصدِ حیاتِ انسانی قرار دینا، عین ثواب ہے۔ لیکن ہمیں "شادمانی" کی نوعیت سمجھنا اور اس کے حصول کا طریقہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے، اور یہ بات اس صورت میں معلوم ہوسکتی ہے۔ جب ہم یہ جان لیں کہ انسان دوسرے حیوانات سے کن وجوہ کی بناء پر ممتاز ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انہی "وجوہ" کو مدِ نظر رکھنے اور اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے شادمانی حاصل ہوسکتی ہے۔ اب یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتی ہے کہ جو چیز انسان کو جمیع

* زمانہ حال کے مشاہیر فلاسفہ میں سے ہے۔

حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ قوتِ تخیل اور قوتِ ادراک ہے۔ پس عقل و فہم کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے حقیقی شادمانی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور "نیکی" یا "خوبی" کے حصول کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان صحیح قوت تمیز و فیصلہ، ضبط و خودداری، انضباط خواہشات اور حوصلہ مندی سے کام لے اور اپنی قوتوں کو بہترین طریق پر استعمال کرے۔ انسانی سیرت (کیرکٹر) کے خواص یا صفات سہ گانہ طریق پر مرتب ہو سکتی ہیں جن میں سے اول و آخر طریق مذموم ہے اور درمیانی صورت مستحسن مثلاً بزدلی اور تہور کے مابین شجاعت، بخل اور اسراف کے مابین سخاوت گویا "خیر الامور اوسطہا" یعنی درمیانی طریق بہترین طریق ہے۔

ارسطو کے فلسفہ کا اثر

شاید، ارسطو کے علاوہ اور کوئی شخص ایسا نہیں پیدا ہوا، جس کے خیالات نے تمام، دنیا کے لوگوں پر، تمام زمانوں میں، اس درجہ اثر پیدا کیا ہو۔ اور نہ کسی شخص نے ارسطو سے بڑھکر، توسیع علم و حکمت اور اصلاح نفوس و عقول انسانی میں حصہ لیا، ارسطو کے بعد آجتک کوئی فلاسفر ایسا نہیں گزرا جس نے ارسطو سے استفادہ نہ کیا ہو۔ سکندریہ کی تہذیب و شائستگی کی بنیاد، اسی کے فلسفہ پر مبنی تھی۔ اس کی منطق نے زمانۂ وسطیٰ کی وحشی اور غیر مہذب یورپین اقوام کو آدمی بنانے میں کافی امداد کی۔ اس کی ساری تصانیف پہلے تو نسطوری[1] عیسائیوں نے سریانی زبان میں ترجمہ کیں۔ اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں عربوں نے یونانی اور سریانی دونوں کو سامنے رکھکر عربی میں ترجمہ کیں، ابن رشد اندلسی نے جو ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح گزرا ہے۔ یورپین اقوام کو عقل و حکمت کی شمع سے منور کیا اور علی الخصوص ایبلارڈ اور ایکوئناس نے، جو مشہور مسیحی متکلمین گزرے ہیں، ارسطو کے فلسفہ کو عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اور بیکن اور ڈیکارٹ[2] کے زمانہ تک ارسطو کا فلسفہ مثل بائیبل کے الہام ربانی سمجھا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اب کینٹ اور ہیگل کا دور دورہ ہے لیکن ارسطو کے احسانات سے دنیا نہ سبکدوش ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کینٹ اور ہیگل بھی بالواسطہ اسی کے دسترخوانِ علم کے "زلہ ربا"[3] ہیں ۱۲

---

[1] قدیم عیسائیوں کے ایک فرقے کا نام ہے۔
[2] فلسفہ جدید کا بانی، فرانس کا باشندہ تھا (۱۶۵۰-۱۵۹۶)
[3] خوشہ چیں یا ٹکڑا نوالہ اٹھا کر کھانے والا۔

اس کی بربادی میں بھی اک عافیت کا رنگ ہے
عقل اس ویرانہ سازی پر ہماری دنگ ہے
شورشِ موجِ رواں گویا صدائے چنگ ہے
مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

برسات کے مناظر

گلستاں کے مطربوں کو چہچہانا آگیا
مرغزاروں کو ہوا میں لہلہانا آگیا

مخملیں روئیدگی سے ڈھک گئے ہیں کوہسار
ہر طرف ہے خوشنما دھانی درختوں کی قطار

ننھی ننھی کونپلوں سے لدگئی ہیں ڈالیاں
جھومتی ہیں آہ! کس انداز سے ہریالیاں

پٹ گئی ہے نقرئی پھولوں سے باغوں کی زمیں
بھینی بھینی نکہتوں سے ہے ہوا بھی عنبریں

موتیا کی تیز لپٹیں اور جوہی کی مہک
مست کرنیوالی بیلے اور چنبیلی کی مہک

وہ طرب زا ننھی چڑیوں کے سحر زا چہچہے
یا فضا میں آسمانی دیویوں کے قہقہے

آہ وہ سنسان راتوں میں گھٹاؤں کا ہجوم
ہلکی ہلکی اور، متوالی ہواؤں کا ہجوم

اس خمار آگیں سمے میں گاہ جگنو کی چمک
بادلوں کی چلمنوں میں گاہ تاروں کی دمک

بادلوں کا رات میں کھل کر برسنا دیکھ لو
دیکھنے والو! پڑیگا پھر ترسنا دیکھ لو

(غیر مطبوعہ)

اختر انصاری
(دہلوی)

آرزو

ذرّوں کو آفتاب کے ساغر کی آرزو
اور مجھ کو تیری چشم فسوں گر کی آرزو

دوشِ نسیم صبح پہ اڑتی ہے بوئے گل
ہے عشرتِ نمودِ گلِ تر کی آرزو

اہلِ فنا کو عار ہے ہستی سے اسقدر
خاکِ مزار کو بھی ہے صرصر کی آرزو

اللہ رے تیرہ کاری نورِ چراغِ حسن
ہے داغِ لالہ شعلۂ احمر کی آرزو

کم ہے حرارتِ مَی رنگیں میرے لئے
ہے میرے دل کو سوزشِ اخگر کی آرزو

طورِ کلیم خاکِ مدینہ میرے لئے
ہے مجھ کو خاکِ پائے پیمبر کی آرزو

(غیر مطبوعہ)

عطاءاللہ کلیم

کاچا اور دیویانی

نوجوان اور حسین کاچا خلد بریں سے بقائے دوام کا راز دریافت کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا تھا۔ اور ڈیمن کے استاد کو یہ راز معلوم تھا۔ اس کی لڑکی کاچا پر عاشق ہو گئی۔۔۔۔۔۔ ٹاگور

کاچا۔ دیویانی۔ وقت آگیا ہے کہ میں رخصت ہو جاؤں۔ میں نے تمہارے پتا سے کئی چیزوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور آج اس کی تعلیم ختم ہو گئی۔ مجھے اجازت دو کہ میں واپس بریم لوک چلا جاؤں۔

دیویانی۔ تم نے وہ شے حاصل کر لی ہے جس کی دیوتا خواہش کرتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کیا اس شے کے سوا تمہیں کبھی اور شے کی خواہش نہیں۔

کاچا۔ نہیں۔

دیویانی۔ کچھ نہیں! کسی شے کی خواہش نہیں! اپنے دل کو ٹٹولو۔ کیا تمہارے دل کی گہرائیوں میں کوئی شرمیلی سی آرزو نہیں لرز رہی۔ جیسے مرجھانے کا حل جانے کا خوف ہو۔

کاچا۔ میرے لئے کامیابی کا سورج چڑھ چکا ہے۔ اور اس کی جوت کے سامنے تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی ہے۔ میں نے اس علم پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے۔

دیویانی۔ تو پھر تم دنیا کے تنہا خوش نصیب اور مسرور آدمی ہو۔ آہ! اب میں محسوس کرتی ہوں کہ اس اجنبی دنیا میں رہنا تمہارے لئے کتنا تکلیف دہ ثابت ہوا ہوگا۔ اگرچہ ہم نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دیں لیکن تمہارے دل کو شگفتہ نہ کر سکے۔

کاچا! یہ تلخ کلامی کیسی مسکراؤ اور مجھے جانے کی اجازت دو۔

دیویانی۔ مسکراؤں؟ لیکن میرے دوست! یہ دنیا تمہارا سورگ نہیں ہے میں مسکراہٹیں اس دنیا میں اتنی سستی نہیں ہیں۔ جہاں پیاس پھول کے کیڑے کی طرح دل کو کھا جاتی ہے۔ جہاں ناکام آرزوئیں محبوب کے گرد رقص کرتی ہیں۔ جہاں یاد گمشدہ مسرت کے لئے احمقانہ طور پر ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہے۔

کاچا! دیویانی! مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیوں خفا ہو!

دیویانی۔ کاچا۔ کیا اس ہرے بھرے اور گھنے جنگل سے جاتے ہوئے تمہیں کوئی رنج نہیں ہوتا۔ جس کے سائے تم پر اتنا عرصہ چھائے رہے ہیں۔ کیا تم ہوا کو کانپتے ہوئے سایوں میں سے گزرتے ہوئے۔ کراہتے ہوئے نہیں محسوس کرتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ خشک پتے گمشدہ امیدوں کی روحوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ صرف تمہارے چہرے پر ایک تبسم ہے۔ تم ہم سے جدا ہو کر جا رہے ہو۔

کاچا۔ اس ہرے بھرے جنگل نے مجھ سے ماں کا سا سلوک کیا ہے۔ اسی جگہ گویا میں نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

دیویانی۔ جب تم گلے کو چرانے کے لئے لاتے تھے تو وہ گھنا سایہ دار درخت تم پر اپنی شاخیں پھیلا دیتا تھا تاکہ تمہارے تھکے ہوئے اعضا کو آرام حاصل ہو سکے۔

کاچا! اے جنگل کے آقا! میں تجھے پرنام کرتا ہوں۔ جب دوسرے طالب علم تیرے سایے میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ اپنے سبق دہرائینگے۔ اس وقت مجھے بھی یاد کر لینا۔

دیویانی۔ اور ہماری ندی وینومتی کا بھی خیال رکھنا! جس کا تیز رو پانی مترنم محبت کا آبشار ہے۔

کاچا۔ مجھے یہ ندی ہمیشہ یاد رہیگی۔ بن باس میں اس ندی نے مجھے تھپک تھپک کر کئی بار سلا دیا ہے۔ یہ ندی ایک بے پرواہ دیہاتی لڑکی کی طرح اپنے نہ ختم ہونے والوں کاموں پر مسکراتی ہے اور سادہ سا گیت گاتی ہے۔

دیویانی۔ لیکن میرے دوست! میں تمہیں یاد کراتی ہوں کہ ان کے علاوہ تمہارا ایک اور بھی دوست تھا جو تمہارے جلا وطنی کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

کاچا۔ اس محبوب دوست کی یاد میری زندگی کا ایک جزو بنگئی ہے۔

دیوایانی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب تم پہلے پہل یہاں آئے تھے تم بچے تھے۔ باغ کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر تم مسکرا رہے تھے۔

کاچا! اور میں نے یہ دیکھا کہ تم پھول چن رہی ہو۔ سفید لباس پہنے ہوئے۔ عین اس طرح جس طرح صبح نور کے لباس میں نہا جاتی ہے۔ اور میں نے کہا تھا " مجھے مدد دینے کی اجازت دیکر سربلند کر دو۔"

دیوایانی۔ اور میں نے تعجب سے پوچھا تھا "تم کون ہو۔" اور تم نے عاجزی سے جواب دیا تھا میں دہراسپاتی دیوتا اندر کے ایک رشی کا لڑکا ہوں۔ اور تمہارے باپ سے امرت کا راز سیکھنے آیا ہوں۔ ایسا امرت جو مردوں کو زندہ کر دے۔

کاچا۔ میں ڈرتا تھا کہ شاید تمہارے پتا مجھے یہ راز بتانے سے انکار کر دیں۔

دیوایانی۔ لیکن جب میں نے تمہاری سفارش کی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ ان کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔

کاچا۔ تین بار حسد سے جلنے والے ٹیٹنوں نے مجھے مار دیا۔ اور تم نے اپنے پتا کو کہکر پھر مجھے زندہ کر دیا۔ تمہارا احسان اور میرا شکریہ امٹ ہے۔

دیوایانی۔ شکریہ! سب کچھ بھول جاؤ کاچا! اور مجھے کسی بات کی پرواہ نہ ہوگی۔ مجھے کوئی رنج نہ ہوگا۔ کیا تم صرف فائدوں کو یاد رکھتے ہو۔ احسانوں کا خیال کرتے ہو۔ اگر دن بھر سبق پڑھنے کے بعد شام کی خاموشی میں ایکبار بھی تمہارا دل کسی نامعلوم مسرت سے لرزنے لگا ہو تو اس لرزش کو یاد کرو۔ شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کے گزرتے ہوئے گیت کا کوئی حصہ تمہارے سبقوں میں ٹلکر رہ گیا ہو۔ یا کسی سانس کی سرسراہٹ نے تمہارے مطالعے کو مسرت سے لرزا دیا ہو۔ تو سورگ میں فرصت کے وقت اس لرزش کو یاد کرو۔ آہ! صرف احسان۔ صرف فایدے۔ حسن۔ محبت .... کچھ نہیں۔

کاچا۔ کچھ چیزیں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتیں۔

دیوایانی۔ میں جانتی ہوں۔ میری محبت نے تمہارے دل کے انتہاہ سمندر کی گہرائی کو پا لیا ہے۔ اور اس محبت کی وجہ سے مجھے اتنی جرأت ہوئی ہے کہ میں تمہارے سرد مہری کے باوجود تم سے ایسی باتیں کروں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ شہرت مسرت کا باعث نہیں بن سکتی۔ دوست تم اب نہیں جا سکتے۔ میں نے تمہارا راز پا لیا ہے۔

کاچا! نہیں۔ نہیں۔ دیوایانی!

دیوایانی۔ نہیں! کیا جھوٹ نہ کہو۔ محبت کی نظر گہری ہے اور آسمانی ہے۔ ہر روز تمہارے سر کی جنبش۔ تمہارے ہاتھ کی حرکت۔ تمہاری آنکھوں کی ایک نگاہ اسی طرح محبت کا پیغام دیتی تھی جس طرح سمندر لہروں کی زبانی باتیں کرتا ہے۔ یکایک میری آواز تمہارے دل کو لرزا دیتی تھی۔ کیا میں نے یہ منظر نہیں دیکھا! میں تمہیں جانتی ہوں۔ اور تم میرے دائمی قیدی ہو۔ دیوتاؤں کا بادشاہ بھی اس رشتے کو نہیں توڑ سکتا۔ اس صند کو نہیں مٹا سکتا۔

کاچا! دیوایانی۔ کیا اس بات کے لئے میں نے محنت کی ہے! اپنے گھربار سے جدا ہو کر۔ رشتہ داروں کو چھوڑ کر اتنے سال صرف اس دن کے لئے تکلیفیں اٹھاتا رہا ہوں

دیوایانی۔ کیوں نہیں۔ کیا صرف علم ہی قیمتی ہے۔ کیا محبت سستی ہے۔ اس لمحے کو جانے نہ دو۔ جرأت کر کے اعتراف کر دو کہ ایک عورت کی محبت اس تپسیا سے اچھی ہے جس کے ذریعے علم۔ قوت۔ اور شہرت حاصل ہوتی ہے۔

کاچا! میں نے دیوتاؤں کے سامنے اقرار کیا تھا کہ امرت لیکر واپس آؤنگا۔

دیوایانی۔ لیکن کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری آنکھوں نے مطالعے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ کیا تم نے کبھی مطالعہ چھوڑ چھاڑ کر مجھے پھولوں کے تحفے پیش نہیں کئے۔ کیا تم اس موقع کی تلاش میں نہیں رہے کہ کسی طرح پھولوں کو پانی دینے میں میری مدد کر سکو۔ وہ کیا شے تھی جس نے تمہیں مجبور کیا۔ کہ رات کے وقت جب دریا کے کنارے تاریکی جھکی ہوئی تھی عین اس طرح جس طرح محبت اپنی غمگیں خاموشی پر جھک جاتی ہے۔ میرے ساتھ گھاس پر بیٹھ جاؤ۔ اور وہ گیت گاؤ جو تم تاروں کی انجمن سے سیکھ کر آئے تھے۔ کیا یہ تمام چیزیں ایک ظالمانہ سازش کا نتیجہ تھیں۔ جو تم

نے سورگ میں کی تھی - کیا یہ تمام چیزیں صرف اس لئے تھیں کہ تم میرے پتا کا دل موہ لو - اور کیا اب جاتے وقت تم مایوس اور فریب خوردہ محافظ کو شکریے کے کھوٹے اور بے قیمت سکے پھینک کر خوش کرنا چاہتے ہو -

کاچا! مغرور عورت! سچائی کی دریافت سے کیا فائدہ ہوگا اگر محبت آمیز خلوص سے تمہاری خدمت کرنا غلطی تھی تو میں اس غلطی کی سزا - خوفناک سزا - بھگت رہا ہوں - یہ وقت نہیں کہ میری محبت کی صداقت کا امتحان لیا جائے - میری زندگی کا کام میرے سامنے ہے سورگ میرا انتظار کر رہا ہے - اگرچہ آج کے بعد میرے دل میں ایک سرخ شعلہ بھڑکتا رہیگا جو خلا کو نگل جانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوگا لیکن میں رک نہیں سکتا - میں سورگ جاؤنگا - لیکن آج کے بعد سورگ میرے لئے سورگ نہ ہوگا - میں نے مطالعے سے ایک راز دریافت کیا ہے اور میرا فرض ہے کہ دیوتاؤں تک یہ راز پہنچا دوں - مجھے معاف کر دو -

دیویانی - اور سمجھ لو کہ اس غم کی وجہ سے جو بے ارادہ میں تم کو پہنچا رہا ہوں - میری تکلیف اور بھی بڑھ گئی ہے -

دیویانی - معافی! تم نے میرے دل میں غصے کا ایک طوفان پیدا کر دیا ہے - اور اب میرا دل سخت ہو گیا ہے اور جل رہا ہے

بجلی کی طرح - تم اپنے فرض اور اپنی شہرت کے لئے سب کچھ کر سکتے ہو - واپس جا سکتے ہو - لیکن میرے لئے کیا رہ گیا ہے؟ یاد کانٹوں کا ایک بستر ہے - اور میری پنہاں شرم میری زندگی کی جڑوں کو کاٹ کاٹ کر کھاتی رہیگی - تم ایک مسافر کی طرح آئے - دھوپ کی گھڑیوں میں میرے باغ کے سایے میں بیٹھے رہے - اور اپنا وقت کاٹنے کے لئے تم نے اس باغ کے تمام پھول چن لئے اور ان پھولوں سے ایک ہار بنا لیا - اور اب جاتے ہوئے تم نے اس ہار کو توڑ دیا اور تمام پھول زمین پر گر پڑے - خاک میں مل گئے - ملعون ہے وہ علم جو تم نے حاصل کیا ہے - ایک ایسا بوجھ ہے کہ لوگ اس کو اٹھانے میں تمہارے ساتھ شریک ہونگے - لیکن وہ کم نہ ہوگا - خدا کرے اطمینان تمہاری زندگی سے اتنا ہی دور رہے جتنے سرد مہر ٹھنڈے تارے کنواری رات کی بن بیاہی تاریکی سے -

(ٹاگور)

عابد

غزل

(از سید محمد ابراہیم نجم ندوی، عظیم آبادی)

آئی بہار، کیجئے سامانِ اضطراب — پائے جنوں ہو اور بیابانِ اضطراب

ہنگامۂ نشاط سے فرصت جو پائیے — جوہر دکھائے سرِ میدانِ اضطراب

صبر و سکوں کا اور ہی ہو نا ہے رنگ ڈھنگ — ہے میری خامشی میں بھی اک شانِ اضطراب

دل کیا مٹا کہ مٹ گئی وہ شورشِ تپش — وابستہ اس کے ساتھ تھی کیا جانِ اضطراب

نجم

(غیر مطبوعہ)

غزلیات

(۱)

کرتا ہوں برقِ قہر کا خوگر جگر کو میں ۔۔۔ چھپ چھپ کے دیکھتا ہوں کسی کی نظر کو میں

کر دے اگر گداز اسے گرمیِ سجود ۔۔۔ کرلوں جبیں میں جذب ترے سنگِ در کو میں

اُن کو یہ ڈر، نہ آئے کہیں آستاں پہ حرف ۔۔۔ مجھ کو یہ ضد کہ رکھ کے اٹھاؤں نہ سر کو میں

اللہ! اپنی نعمتِ عظمیٰ کو پھیر لے ۔۔۔ ذوقِ نظر نہیں تو کروں کیا نظر کو میں

پَو پھوٹنے سے پہلے ہی دل جل بجھا مرا ۔۔۔ کیا مُنہ دکھاؤں آج نسیمِ سحر کو میں

کٹتی نہیں ہے راہِ مصیبت کسی طرح ۔۔۔ خنجر ملے تو ختم کروں اس سفر کو میں

آنکھوں میں کھچ کے آگیا سب حسرتوں کا خون ۔۔۔ کہئے تو اب دکھاؤں نظر کے اثر کو میں

لو صحبتِ شبانہ کی لذّت بھی مٹ چکی ۔۔۔ حسرت سے دیکھتا ہوں چراغِ سحر کو میں

چھوڑے تھے جس کی آس پہ دونوں جہاں رسا
پوچھے وہی نہ بات تو جاؤں کدھر کو میں

(غیر مطبوعہ) رسا

(۲)

یہ عجب بہار ہے جلوہ گر، یہ عجیب فیضِ بہار ہے ۔۔۔ کہ کلی کلی کا جگر سنانِ غمِ خزاں سے فگار ہے

ترے دستِ بامِ فروز سے جو مئے نشاط عطا ہوئی ۔۔۔ مرا دل ہنوز اُسی کے کیف سے عرش زار خمار ہے

یہ چمن میں پریوں کے جمگھٹے ہیں کہ رنگ و نور کی محفلیں ۔۔۔ یہ جمال ہوشربا ہے پیشِ نظر کہ تختِ بہار ہے

رگِ اشتیاق میں اضطراب فگن ہے شعلۂ آرزو ۔۔۔ کہ جنونِ عشق نگاہِ حسن کی شوخیوں پہ نثار ہے

یہ بہارِ شام، یہ منظرِ لبِ جوئبار، یہ محویت ۔۔۔ کوئی نغمہ مطربِ خوشنوا ترا نغمہ جانِ بہار ہے

شبِ ماہتاب میں فصلِ گل کا نشاط خیز سماں عدمؔ
یہ نگار خانۂ باغ ہے کہ بہشت زارِ بہار ہے

(غیر مطبوعہ) سید عبدالحمید عدمؔ

مقفّل کمرہ

دفتر کی چار دیواری میں پانچ بجے تک دماغی کام کرنے کے بعد میں شہر سے باہر سیر کے لئے چلا گیا ۔ اور کئی میل پیدل چلنے کے بعد تقریباً ۸ بجے شام واپس لوٹا ۔ واپسی پر راستے میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک عالیشان مگر غیر آباد مکان دیکھا ۔ جس کے آگے ایک چھوٹا سا پارک تھا ۔ کسی زمانے میں یہاں سیٹھ عبداللہ رہا کرتے تھے ۔ اس مکان کو دیکھ کر مجھے سیٹھ عبداللہ کا خیال آگیا ۔ اور میں اس زمانے کو یاد کرنے لگا جبکہ سیٹھ عبداللہ مشہور بینکر یکایک فرار ہو گیا تھا ——— لیکن ایک سانحہ نے میرے خیالات کے سلسلہ کو بالکل بدل دیا ۔ سڑک کی ایک جانب سے ایک چوپہیہ گاڑی آرہی تھی ۔ اور دوسری طرف ایک سائیکل کی زرد روشنی نظر آتی تھی ۔ سائیکل سوار نے گاڑی کے آگے سے سڑک کو عبور کرنا چاہا لیکن بدقسمتی سے گھوڑے کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا ۔ گاڑیبان نے گاڑی ٹھہرا لی ۔ مگر جب اسکو معلوم ہوا کہ ابھی تک اس کا نمبر دیکھا نہیں گیا ۔ تو گاڑی دوڑا لے گیا ۔ سائیکل سوار اپنا سائیکل اٹھا کر کھڑا ہوا لیکن سخت تکلیف کی وجہ سے وہ ایک منٹ بھی کھڑا نہ رہ سکا اور کراہتا ہوا پھر گر پڑا ۔

میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا ۔

"کیا آپ کے چوٹ آئی ہے ۔"

"جی ہاں میرا گھٹنا زخمی ہو گیا ہے ——— کیا آپ میری مدد کریں گے ؟"

وہ سائیکل کی زرد روشنی میں پڑا ہوا تھا اور جب میں اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک خوش پوش جوان لیکن کمزور آدمی تھا ۔ اس کے چہرہ پر کرب و اندوہ کے نقوش ثبت تھے ۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں ۔ جب میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دیا تو وہ کراہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے ایک پاؤں زمین سے اٹھا لیا اور درد بھری آواز سے کہا ۔

"میرے پاؤں میں سخت تکلیف ہے ۔ میں اسے زمین پر بھی نہیں رکھ سکتا ۔"

"آپ کہاں رہتے ہیں ؟"

"سامنے مکان میں رہتا ہوں میں شکر گزار ہونگا اگر آپ مجھے وہاں تک پہنچا آئیں ۔"

اس نے سیٹھ عبداللہ کے مکان کی طرف اشارہ کیا تھا ۔ چنانچہ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سہارا دئیے رکھا اور دوسرے سے اسکی سائیکل اٹھائی پھر میں ان کے ساتھ سیٹھ مذکور کے مکان کی طرف چلدیا ۔

ہم تاریک ہال کے دروازہ تک پہنچ گئے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالے میں چابی ڈال کر مجھ سے کہا ۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں"

"نہیں ابھی آپ اس قابل نہیں ہوئے ۔"

اس نے کچھ بہانا کرنا چاہا لیکن آخر وہ بھی جان گیا کہ ابھی اسے میری مدد کی ضرورت تھی ۔ پھر ہم نے دروازہ کھولا اور سائیکل کا لمپ اتار لیا اور وہ میرے بازو کا سہارا لئے ہوئے ہال کی دائیں جانب ایک کمرے میں داخل ہوا ۔ وہاں وہ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا ۔

اس نے مجھے اپنی جیب سے دیا سلائی نکال کر دی اور کہا کہ مہربانی فرما کر آپ اس کمرے کا لمپ روشن کریں ۔ چنانچہ میں نے میز پر رکھے ہوئے لمپ کو روشن کر کے سائیکل کا لمپ بجھا دیا ۔ اب اس نے ایک اطمینان کا سانس لیکر کہا ۔

"شکریہ ! شکریہ !! اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مہمان نوازی نہ کر سکا ۔ میں معذور ہوں ۔ امید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خدا حافظ ۔" ۔ ۔ ۔ اور یہ کہتا ہوا وہ بیہوش ہو گیا ۔ میں عجیب تذبذب میں پھنسا ہوا تھا ۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور آنکھیں نصف کھلی اور نصف بند تھیں ۔ وہ مجھ کو دوبارہ جانے کے لئے کہہ چکا تھا ۔ لیکن ایسی حالت میں اس کو چھوڑ دینا خلاف مصلحت تھا ۔

آخر میں نے گھنٹی بجانے کی رسی کھینچی اور گھنٹی کو کسی دور کے کمرے میں بجتے ہوئے سنا۔ کئی منٹ گزر گئے اور کوئی بھی میرے پاس نہ پہنچا۔ میں نے خیال کیا کہ اتنی بڑی عمارت میں ایک لکھپتی کا بیٹا اکیلا نہیں رہ سکتا یہاں پر کچھ لوگ اور بھی ہونے چاہئیں اگر وہ گھنٹی کا جواب نہیں دیتے تو میں خود ان کو تلاش کرونگا چنانچہ میں نے لمپ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلا۔

لمپ کی روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا اس نے مجھے متحیر کر دیا۔ ان کمروں میں نہ فرش تھا نہ فرنیچر مدتوں سے دیواروں پر رنگ نہیں کیا گیا تھا، اور ہر طرف گرد جمی ہوئی تھی۔ چھتوں میں مکڑیوں نے جالے تنے ہوئے تھے۔ کمروں میں کبوتروں اور ابابیلوں کے گھونسلے تھے اور ان کی بیٹیں فرش پر جمی ہوئی تھیں میں نے ہر جگہ تلاش کی لیکن وہاں پر مجھے کوئی شخص نہ ملا سب کمرے چھان مارے لیکن سب ہی ویران پائے کمرے میرے بوٹ کی آواز سے گونج رہے تھے۔ آخر میں نے ایک ایسے کمرے کو دیکھا جس میں ایک تالا پڑا ہوا تھا اور تالے پر ایک بڑی سرخ مہر تھی! میں ٹھہر گیا اور سوچنے لگا کہ اس کمرے میں کیا ہو سکتا ہے۔ ابھی وہاں ٹھہرے ہوئے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ میں نے زخمی جوان کی آواز سنی وہ مجھے بلا رہا تھا اور اپنے آپ کو اندھیرے میں پا کر پریشان تھا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔

"آپ یہاں سے لمپ کیوں اٹھا لے گئے۔"

"میں آپ کے کسی رشتہ دار یا خادم کو تلاش کر رہا تھا تاکہ میں آپ کو اس کے سپرد کر جاؤں۔"

"میں اس جگہ اکیلا رہتا ہوں۔ اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں میرا دوست لطیف میرے پاس آ جائیگا۔ میری چوٹ کچھ زیادہ سخت نہیں۔ میں محض ضعف قلب کی وجہ سے بیہوش ہو گیا تھا۔ میری والدہ کی طرح میرا دل بھی بہت کمزور ہے اور میں جانتا ہوں کہ جو دل کی کمزوری میری والدہ کی موت کا باعث ہوئی ہے۔ وہی میری وفات کا سبب بھی ہوگی معمولی سی تکلیف اور معمولی سا رنج بھی میرے لئے بہت اذیت رساں ہے...... کیا آپ ڈاکٹر نہیں؟"

"نہیں میں ایک بیرسٹر ہوں۔"

"میرا دوست آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے"

"جی ہاں بڑی خوشی سے۔"

یہ سنکر زخمی جوان کسی سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے پوچھا "کیا آپ نے اس لمپ کے ساتھ اس عمارت کا ہر ایک کمرہ دیکھا۔"

"میں یہی خیال کرتا ہوں۔"

"ہر ایک کمرہ!" اس نے دوبارہ کہا "میں پوچھتا ہوں کیا آپ ہر ایک کمرہ میں داخل ہوئے۔"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کسی دوسرے شخص کی تلاش میں تھا۔ اور اس لئے میں اس کمرہ کے سوا جس کے تالے پر سرخ رنگ کی مہر لگی ہوئی ہے اور سب کمروں میں داخل ہوا۔

زخمی جوان میرا یہ جواب سنکر کانپ گیا۔

"اور آپ نے یہ معلوم کرنا چاہا ہوگا کہ مہر والے کمرے کے اندر کیا ہے؟"

"قدرتی طور پر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا۔"

"کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو اس کمرے کے راز کو معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو اس بڑی عمارت میں کئی برس تک اس کمرے کو کھولے بغیر رہ سکتا ہے۔"

"تو کیا آپ خود بھی اس کمرے کے اسرار سے واقف نہیں"

"تو آپ اس کمرے کو کھولتے کیوں نہیں۔"

"مجھے اس کمرے کو کھولنا نہیں چاہیئے۔"

میں لاجواب ہو گیا اور یہ دیکھکر کہ زخمی جوان اب نسبتاً اچھی حالت میں ہے۔ میں جانے کے لئے اٹھا۔

"کیا آپ کو کچھ جلدی ہے۔"

"نہیں"

"کیا آپ کچھ دیر اور میرے ساتھ گفتگو کرنا پسند فرمائینگے"

"بڑی خوشی سے۔"

"کیا آپ مجھ مصیبت زدہ کی زندگی کے بعض حالات سننے کے لئے تیار ہیں۔"

"بیشک"

میں اکثر تنہا رہتا ہوں اور مجھے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا بہت کم موقعہ ملتا ہے...... آپ جانتے ہیں کہ میرا والد ایک امیر آدمی تھا۔ میری ایک امیر گھرانے میں پرورش ہوئی۔ لیکن آج میں غربت اور تنگدستی کے جنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔

میں بے روزگار ہوں، بے یار و مددگار اور بدقسمت ہوں۔
اس پر طرّہ یہ کہ مجھے اس بڑے مکان میں تنہا رہنا پڑتا ہے۔
اور یہ ہی میرے کمزور دل کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہے۔
اس مکان کو اچھی حالت میں رکھنا بھی میرے لئے ناممکن ہے
چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی حالت کسقدر خراب ہے۔
میرے لئے یہاں رہنا مصیبت ہے۔

"آپ اسے بیچ کیوں نہیں دیتے"؟

"میں اسے بیچ نہیں سکتا۔ فی الحال یہ ناممکن ہے"۔

"تو اسے کرایہ پر دید یجئے"۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"تعجب ہے۔"

"بیشک یہ بات تعجب انگیز ہے۔" اس نے کہا:

"جناب من یہ راز ہے جو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔
جناب یہی وہ معاملہ ہے جس میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت
ہے۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "آپ مجھ پر اعتماد رکھیں" اور
مجھ سے ہر قسم کی مدد کی توقع کریں"۔

شکریہ! شکریہ!! آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرے والد کا
نام سیٹھ عبداللہ ہے۔ انہوں نے اچانک اپنے وطن کو اپنے
عزیزوں کو اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، اور غیر ملکیوں اور
اجنبیوں کے درمیان وفات پائی"۔

"اچھا تو کیا وہ انتقال فرما گئے!؟"

"جی ہاں قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ میرے والد
کے احباب کو ایک ایسے کام میں جو والد کی معرفت ہوا تھا۔
خسارہ ہوا میرے والد کو اس کا اسقدر صدمہ ہوا کہ انہوں نے
روپوش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور ہم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دو
برس بعد اسی کام میں جملہ حصہ داران کو کثیر نفع ہوا۔ اب اگر
والد زندہ ہوتے تو اس وقت واپس آجاتے چونکہ اب روپوش
ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر وہ اب تک واپس نہیں آئے۔
گمان غالب ہے وہ انتقال فرما گئے۔ دوسرے اگر وہ زندہ
ہوتے تو کم ازکم اپنی روپوشی کے ابتدائی ایام میں کسی طرح ہم سے
خط و کتابت تو کرتے۔ افسوس دو سال سے نہ تو ان کی کوئی خبر
ہی ملی ہے اور نہ ان کی چھٹی ہمیں ملی۔ ہم سے جدا ہونے کے
کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک چھٹی میری والدہ کے پاس بھیجی تھی
اس پر لاہور کی مہر تھی۔"

اس نے اپنے ڈیسک میں سے ایک چھٹی نکال کر مجھ کو
دی اور کہا کہ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں۔

میں نے چھٹی پڑھی۔

"پیاری بیوی جب سے ڈاکٹروں نے یہ کہا ہے کہ
تمہاری بیوی کا دل بہت کمزور ہے۔ اور معمولی سا صدمہ بھی
اس کے لئے بیحد ضرر رساں ثابت ہوگا۔ اسوقت سے ہی میں
نے کاروباری معاملات کا تم سے ذکر نہیں کیا باوجودیکہ کاروبار کی
حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی تھی۔ مگر [illegible] وقت
آگیا ہے جب [illegible] اس کے بغیر چارہ نہیں کہ میں کاروباری معاملا
کی خرابی کے باعث تم سے جدا ہونے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ لیکن
خیال رہے کہ یہ جدائی عارضی ہے اور ہم عنقریب ایکدوسرے
سے ملیں گے۔ تم اس بات پر پورا بھروسہ کر سکتی ہو۔ اور مجھے
بھی اس کا پورا یقین ہے۔ پیاری بیوی میں دوبارہ کہتا ہوں
کہ ہماری یہ جدائی عارضی۔ بالکل عارضی ہے۔ میں تم کو زیادہ
دیر تک مبتلائے غم نہ رکھونگا۔ اور نہ ہی تم کو زیادہ دیر خراب
صحت کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑینگی۔ میں تمہاری خوشی ہمیشہ
مقدم رکھتا ہوں۔ اب تم ایک کام کرو وہ یہ کہ میرے فوٹوگرافی
کے کمرے کے تالے پر مہر لگا دو اور اس کو اس کی حالت پر
چھوڑ دو۔ اس میں نہ تم داخل ہو اور نہ رشید کو وہاں جانے
دو۔ البتہ رشید اپنی اکیسویں سالگرہ کے بعد اس کمرے کو کھول
سکتا ہے۔ اس کمرے میں بعض ایسی چیزیں ہیں جن کو میں
لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔

تمہارے شکوک کو رفع کرنے کے لئے میں لکھے دیتا
ہوں کہ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو میری نیکنامی کے
دامن پر مبنزلہ ایک داغ کے ہو یا جو مجھے ندامت میں غرق
کر دے۔ تم کو اس مکان کو بیچنے کی اجازت نہیں کیونکہ اگر
ایسا کیا گیا تو راز فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

خدا حافظ! پیاری بیوی خدا حافظ!! ہم عنقریب ملیں گے۔
اگر اس عارضی جدائی کے دوران میں کسی مشورے کی ضرورت
ہو تو لطیف سے مدد لے سکتی ہو"

——میں تم سے ایک دفعہ پھر اس عارضی جدائی

کی معافی چاہتا ہوں ۔

تمہارا پیارا شوہر

عبداللہ ۔

میں یہ چٹھی پڑھ چکا تو نوجوان یعنی رشید نے کہا :۔

"جناب من ! اس کے بعد میری والدہ کے پاس تقریباً اسی مضمون کی ایک اور چٹھی پہنچی ۔ اس پر بھی لاہور کے ڈاکخانہ کی مہر تھی اور اس میں بھی انہوں نے اپنا پتہ تحریر نہیں کیا تھا ۔ بعد ازاں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی ۔ اور آخر میری والدہ ان کی روانگی کے دو سال بعد دل شکستہ ہو کر مر گئی ۔ اور اس کی موت کے بعد میرے پاس والد کی ایک اور چٹھی پہنچی یہ اسقدر پرائیویٹ ہے کہ میں آپ کو دکھا نہیں سکتا ۔ البتہ اس کا وہ حصہ جس میں بند کمرے کا ذکر ہے آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں ۔"

نوجوان نے میز کی دراز سے ایک اور چٹھی نکالی اور مجھے پڑھکر سنائی ۔

"اگرچہ تمہاری والدہ کی موت کے بعد اس کمرے کی اہمیت جس پر تمہاری والدہ نے میرے حکم سے مہر لگا دی تھی اب کم ہو گئی ہے ۔ لیکن اب بھی اس کا کھولنا خلاف مصلحت ہے ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ تم اس کمرے کو اپنی اکیسویں سالگرہ سے پہلے نہ کھولو ۔

جب تم اس کمرے کھول چکو تو تم اس مکان کو بیچ سکتے ہو ۔ یا کرایہ پر دے سکتے ہو ۔"

یہاں تک پڑھکر نوجوان نے کہا :۔

"بس یہ ان کی آخری چٹھی تھی ——— اب اسقدر حالات معلوم ہونے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس مکان کو نہ تو کرایہ پر دے سکتا ہوں اور نہ فروخت کر سکتا ہوں ——— جناب من بس اب دو ماہ باقی ہیں ۔ دو ماہ بعد میری عمر اکیس برس کی ہو جائیگی ۔ اس وقت میرا پہلا کام اس کمرہ کو کھولنا ہو گا اور دوسرا اس مکان کو فروخت کرنا ۔"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ کے والد کے فرار ہونے کا باعث کوئی جرم نہیں ۔"

"بلاشک ۔"

"کیا آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے وطن سے جاتے ہوئے اپنی پیاری بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لیا ۔"

"مجھے معلوم نہیں ۔"

"انہوں نے تم لوگوں سے جن سے ان کو کسی قسم کے نقصان کی امید نہیں ہو سکتی اپنا پتہ کیوں چھپایا ۔"

"میں نہیں جانتا ۔ جناب میرے بیان پر بہت سے اعتراض ہو سکتے ہیں جس کا میں جواب نہیں دے سکتا ۔"

"محبی ! میرا خیال ہے کہ کسی قانونی جرم کے مرتکب ہونے کے باعث سے آپ کے والد نے اپنے پیارے وطن کو خیرباد کہا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس صاف گوئی سے ناراض نہ ہونگے ۔"

"جناب من ! کاش آپ میرے والد کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ۔ جس وقت وہ ہم سے جدا ہوئے اسوقت میری عمر چودہ برس کی تھی ۔ اور مجھے دنیا کی باتوں کے متعلق کچھ زیادہ علم نہ تھا ۔ لیکن پھر بھی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سا آدمی ہندوستان بھر میں ملنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے ۔ اگر ان میں نقص تھا تو یہ کہ وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھے ۔ معمولی سا غم اور معمولی سا رنج بھی ان کو سخت تکلیف دیتا تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے دوسروں کو نقصان پہنچے ۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا تو ان کو بیحد صدمہ ہوتا ۔ ان کی سچائی اور دیانتداری ضرب المثل ...."

"محبی" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :۔

"میں نے اپنی رائے صرف صورت حالات کو دیکھ کر قائم کی تھی ۔ ممکن ہے میری رائے غلط ہو ——— اب مجھے کافی دیر ہو چکی ہے اور میں اجازت چاہتا ہوں ۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے اور اس معاملہ میں میں بروقت بلا کسی معاوضہ کے مدد کرنے کے لئے تیار ہونگا ۔"

"شکریہ ! میں اپنے دوست لطیف کو آپ کے پاس بھیجونگا ۔"

"بہت اچھا ——— خدا حافظ" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا ۔ کچھ عرصہ تک مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا ۔

ایک دن دوپہر کے وقت ایک کارڈ ملا ۔ جس پر محمد لطیف کا نام لکھا ہوا تھا ۔ میں نے اسے بلا لیا ۔ وہ آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ۔

"مجھے آپ کے پاس مسٹر رشید نے بھیجا ہے ۔ کسی زمانہ

ہیں میں سیٹھ عبداللہ کا معتمد ملازم تھا۔"

"فرمائیے"

"آج مسٹر رشید کی اکیسویں سالگرہ ہے۔"

"توکیا تم نے وہ کمرہ کھول لیا۔"

"نہیں صاحب ابھی ہم نے اسے نہیں کھولا، ہم چاہتے ہیں کہ اسے ایک معزز اور قانون دان شخص کی موجودگی میں کھولا جائے۔ کیا آپ اس کے کھولنے کے وقت وہاں موجود رہنا پسند فرمائینگے۔"

"میں بڑی خوشی سے اسوقت آپ کا شریک ہونگا۔"

"ہم اسے آج رات کو ۹ بجے کھولیں گے۔"

"میں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤنگا"۔

"شکریہ ہم اس وقت آپ کا انتظار کریں گے۔"

پھر وہ مجھے سلام کرکے چلا گیا۔ وقت مقررہ پر میں رشید کے مکان پر پہنچا۔ رشید نے میرا شکریہ ادا کرکے لطیف سے کہا:۔

مسٹر لطیف اب شاید کمرہ کھولنے میں دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں جلدی کرنی چاہئے"۔ ہم سب چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ لطیف نے لمپ اٹھایا اور ہمارے آگے آگے چلا۔ آخر ہم اس دروازے پر پہنچے۔ رشید کو پریشان اور خوفزدہ دیکھکر مجھے کچھ تعجب نہیں ہوا۔ لیکن متین اور سنجیدہ لطیف کو خوفزدہ اور پریشان دیکھ کر میں ضرور حیران ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی بیحد کوشش کررہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں بمشکل لمپ کو تھامے تھا۔ میں نے اس سے لمپ لے لیا۔

"رشید" اس نے خوفزدہ رشید کو چابیاں دیتے ہوئے کہا۔" لو یہ چابیاں سنبھالو۔ اب تم اس کمرے کو کھول سکتے ہو۔ لیکن تم کو اس کے کھلنے پر کسی فوری صدمے .... کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے"۔

"ہیں تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو"۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں تم کو ڈرانا نہیں چاہتا۔ بلکہ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کمرے کے کھلنے پر تم کو اچانک صدمے یا کسی زبردست رنج کے برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے"۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے ان پر زبان پھیر کر کہا "تم اس کمرے کو کھولو۔ لیکن میری ہدایات کو یاد رکھو۔ ہاں کھولو"۔

لطیف کی زبان سے یہ سنکر مجھے پورا یقین ہوگیا کہ وہ کمرے کے اسرار سے واقف ہے۔

رشید نے پریشان نظروں سے لطیف کو دیکھا پھر ایک چاقو کے ساتھ کمرے کی مہر توڑ ڈالی اور تالا کھولکر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ایک قدم کمرے کے اندر داخل کیا ہی تھا کہ وہ ایک چیخ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ بیہوش ہوکر گر پڑا۔"

لیمپ کی روشنی میں میں نے کمرے میں جھانکا میں بھی لرز گیا اور لطیف کی اطلاع کا دھیان کرکے میں نے اپنے آپ کو کسی خوفناک انکشاف کے لئے تیار نہ کرلیا ہوتا تو ضرور میرے ہاتھ سے لیمپ چھوٹ جاتا۔

وہ تنگ وتاریک کمرہ کبھی فوٹوگرافی کی لیباریٹری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ شیشے کی الماریوں میں شیشیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پیمانے رکھے تھے۔ ایک طرف چند کیمرے پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف پانی کا ایک ٹب رکھا تھا۔ اور کمرے کی ہوا کیمیاوی اور حیوانی اشیاء بدبو سے لبریز تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ جس کے قریب ہی ایک کرسی پر ایک انسان۔ نہیں نہیں ایک انسانی پنجر ہماری طرف رخ کئے رکھا تھا۔ اس نے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا گوشت خشک ہوگیا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑگیا تھا۔ اس کی گردن کی موٹائی بمشکل میری کلائی کے برابر ہوگی۔ اس کے ہاتھ میز پر تھے۔ اس کا چہرہ ایک طرف کو جھک گیا تھا، اس کا منہ کھلا ہوا تھا! —— آہ اس کا چہرہ کسقدر خوفناک تھا!! اس کے ہاتھوں کندھوں اور چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی!

لطیف چلایا "آہ میرا بدقسمت آقا! آہ میرا بدقسمت آقا!" اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ یہ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میں چلایا "ہیں! سیٹھ عبداللہ!"

"ہاں جناب میرا بدقسمت آقا عبداللہ پورے سات برس سے اس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے آہ وزاری کی۔ اس کے آگے رویا، اس کے پاؤں پکڑے، اسے سمجھایا، اسے منایا۔ اس کی منتیں کیں۔ لیکن حیف صد حیف اور افسوس صد افسوس اس نے ایک نہ مانی اور جو کرنا چاہتا تھا سو کیا۔ اس نے مجھے کمرے سے نکال کر اندر سے قفل لگا دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میز پر اس قفل

کی چابی پڑی ہوئی ہے .... آہ اس نے اور بھی کچھ لکھا ہے ۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے" اور یہ کہتا ہوا وہ میز کی طرف بڑھا میں نے چلا کر کہا" ہاں ہاں اسے اٹھالو اور للہ جلدی سے اس جگہ کو چھوڑ دو —— یہاں ہوا زہریلی ہے۔" اس نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھالیا اور پھر ہم رشید کو اٹھا کر اس کو اس کے کمرے میں لائے ۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش آیا ۔ لطیف نے رشید کو برانڈی کا گلاس پلایا ۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی رشید اٹھ بیٹھا ۔ اس میں اب اپنی خاندان کے افسوسناک حالات سننے کی طاقت آگئی ۔

رشید نے کہا" آہ وہ میرا باپ تھا ———— رشید تم اس بات کو پہلے بھی جانتے تھے !! تم نے مجھے اسی صدمہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہونے کو کہا تھا؟"

"ہاں میں اس بات کو سات برس سے جانتا ہوں کہ تمہارا والد اس کمرے میں مردہ پڑا ہوا ہے ۔"

"کمبخت تو جانتا تھا لیکن پھر بھی تو نے ہم کو یہ بات نہیں بتائی ۔"

"تم میری مجبوریوں کو نہیں جانتے اس لئے تم نے ایسا درشت لہجہ اختیار کر لیا ہے ۔"

"میں بالکل دیوانہ ہو رہا ہوں ۔ میں اس معمہ کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا ۔ کیا میرے پاس اور میری والدہ کے پاس جو جو چٹھیاں تھیں وہ محض جعلی تھیں ۔"

"نہیں تمہارے والد نے وہ چٹھیاں مجھکو لکھکر دیں اور ان کے متعلق مجھے ہدایات کیں جن کی میں نے پیروی کی ۔ وہ میرا آقا تھا اور اس کے حکم کی تعمیل میرا فرض ۔"

"تو تم مجھے مفصل حالات بتاؤ ۔"

"تم جانتے ہو کہ ایک دفعہ تمہارے والد پر بہت مصیبت کا زمانہ آیا ۔ کاروبار خراب ہو گیا ، حصہ داروں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا جس نے بہت سے غریبوں کو تباہ کر دیا ۔ تمہارے والد میرے آقا ایک حساس دل و دماغ کے مالک تھے چنانچہ اس بات کا ان کو بہت صدمہ ہوا وہ ہر وقت سخت ذہنی تکلیف محسوس خیال کرتے اور یہ خیال ان کے ہمیشہ سوہان روح ثابت ہوتا ۔ آخر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ آہ میں نے ان کو بہتیرا سمجھایا لیکن انہوں نے ایک نہ مانی اور نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ مجھے خاموش رہنے کے لئے کہا —— وہ خودکشی کرنے کا پکا ارادہ کر چکے تھے آخر انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں آرام سے مروں یا سخت درد و کرب کے ساتھ جان دوں ۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور طوعاً و کرہاً ان کی مرضی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔

ان کو ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی کا دل بہت کمزور ہے اور ایک معمولی صدمہ بھی اس کی موت کا باعث ہوگا ۔ وہ اپنی بیوی کو اپنی موت کے ناقابل برداشت رنج میں مبتلا کر کے ان کی زندگی کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن انہیں اپنی زندگی ختم کئے بغیر بھی چارہ نہیں تھا ۔ وہ اپنی بیوی کو صدمہ پہنچائے بغیر ہی اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ اس کے لئے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ صاف ظاہر ہے انہوں نے مجھکو وہ چٹھیاں لکھکر دیں جو میں نے تمہاری والدہ کے پاس بھیجیں ۔ اور تم لوگوں کو ان کی خودکشی کا گمان بھی نہ ہوا ۔ ان چٹھیوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب سچ تھا ۔

جب وہ بہت جلد ملنے کی امید ظاہر کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عنقریب مر جائیگی اور عالم بالا میں ملاقات ہوگی وہ جانتے تھے کہ اس کی زندگی بہت کم باقی رہ گئی ہے اور وہ یا تو خرابی صحت کی وجہ سے یا ان کی جدائی کے غم سے ضرور مر جائیگی ۔

اس کی موت کے بعد ایک چٹھی تمہارے پاس بھیجنے کے لئے انہوں نے مجھے دی جس کو میں نے لاہور سے ڈاک میں ڈلوایا ۔ اور اس طرح سے تم کو بھی ان کے لاہور میں ہونے کا مزید یقین ہو گیا ۔

مرنے سے قبل انہوں نے مجھے سات برس تک ان کی خودکشی کی بابت خاموش رہنے کا حکم دیا تھا اور میں نے ان کے سب احکام پر عمل کیا ہے ۔

ان کا خیال تھا کہ سات برس بعد ان کے عزیزوں کو اور ان کے دوستوں کو ان کی موت کی خبر اسقدر رنج نہ دیگی جسقدر کے اسوقت دیتی ———— آپ دیکھتے ہیں کہ مرتے وقت بھی انہوں نے دوسروں کا کسقدر خیال رکھا ۔"

لطیف خاموش ہو گیا کمرہ میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی ۔ پھر رشید بولا :-

"لطیف صاحب ! میں اب سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں آپ کو الزام نہیں دے سکتا ۔ آپ نے اپنی دانائی سے میرے والد کے

احکام کی تعمیل کر کے میری والدہ کو ایک سخت صدمے سے بچا لیا۔ اگر آپ راز فاش کرتے تو ایک طرف والد کی رسوائی ہوتی اور دوسری طرف میری والدہ کو اور مجھ کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچتا —— مگر یہ تمہارے ہاتھ میں کاغذ کیسا ہے۔"

"یہ وہ تحریر ہے جو آپ کے والد نے مرتے وقت اس کمرے میں چھوڑی کیا میں اسے آپ کو پڑھ کر سناؤں؟"

"ہاں پڑھیے۔"

"میں نے زہر کھایا ہے۔ یہ میری رگوں میں اثر کر چکا ہے۔ اور میں چند لمحوں کے بعد اس فانی دنیا کو چھوڑ چکا ہونگا۔ اگر میری خواہشوں پر عمل کیا گیا ہوگا تو اس تحریر کے پڑھنے کے وقت مجھے مرے ہوئے برسوں گزر چکے ہونگے۔ اور اس یقیناً کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو کہ میری وجہ سے یا میری معرفت اپنا روپیہ ضائع کرنے کے سبب سے میرے ساتھ دشمنی رکھتا ہو۔

رشید! تم میرے بیٹے ہو اور اسقدر دیر کے بعد بھی میری موت کی خبر تم کو رنج پہنچائیگی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنے مصیبت زدہ والد کو معاف کر دو گے —— زہر میرے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا ہے —— میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی ہیں —— خدا حافظ! خدا حافظ!!

کاش باری تعالیٰ میری پریشان اور تائب روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

ہم سب نے کہا "آمین! آمین!!

(کانن ڈایل)

اختر سبحانی بیتاب پٹیالوی

نغمۂ زندگی

(لانگ فیلو)

اے ہمنشیں! تو اندوہناک سُروں میں، یہ راگ نہ الاپ، کہ زندگی ایک ہستی موہوم ہے، جس کی تعبیر ایک سعی لاحاصل ہے۔ کیونکہ وہ رُوح جو مے غفلت سے سرشار ہو۔ مُردہ ہے۔ اور اشیائے بے حقیقت ہیں۔

زندگی مظہر حقیقت ہے، اور جیسا کہ تو نے سمجھ رکھا ہے۔ گوشۂ لحد اس کی انتہا نہیں، اس میں شک نہیں، کہ انجیل اور دوسرے مقدس آسمانی صحیفے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ انسان خاک کا پُتلا ہے۔ اور وہ پھر ایک روز خاک ہو جا ئیگا۔ مگر اس میں روح کا کوئی ذکر نہیں۔

اس محدود، چار روزہ زندگی کا راز نہ ہر دم مسرور رہنے میں اور نہ ہر وقت غم کھانے میں ہے۔ بلکہ مشغول کار رہنے میں نہاں ہے۔

علم و ہنر جس کی جستجو اور حصول میں ہمیں ہر لحظہ کوشاں رہنا چاہیئے۔ ایک بحر بے پایاں ہے اور اس عمر فانی کی چند گھڑیاں جو ہمیں عطا کی گئی ہیں، بہت سرعت سے گزر رہی ہیں۔ اگرچہ ہمارے قلوب مضبوط اور تواں ہیں، تاہم ان کی مثال ایک ماتمی نقارے کی سی ہے۔ جس پر غلاف چڑھا ہو۔ اور جس کے اندر سے گریہ وزاری کی آواز بدستور آرہی ہو۔

دنیائے عمل کے اس وسیع جولانگاہ میں نوُجانوروں کی طرح قیام نہ کر۔ اس کش مکش حیات میں سکون پذیر نہ ہو، بلکہ اپنے آپکو متحرک رکھ، اور اس دنگل میں تو اپنے تئیں بہادر ثابت کر۔

مستقبل خواہ وہ کتنا ہی خوشگوار کیوں نہ ہو۔ اُسے ایک فریب آفریں سراب سمجھ۔ عہد گزشتہ کے سوانح کو طاق نسیاں کی نذر کر۔ اس عہد حاضرہ میں ایک ہوشیار مرد کار بن اور جہد و توکل سے کام لے۔

مشاہیر کے دستور عمل اور ضوابط اوقات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو نہایت کامیاب بنا سکتے ہیں۔ اور اس دور فانی سے علیحدگی اختیار کرتے وقت سطح زمین پر اپنے نقش قدم چھوڑ سکتے ہیں۔ ہاں! ایسے نقش قدم۔ جو شاید کسی گم گردہ راہ اور دل شکستہ بھائی کے لئے درس عمل ثابت ہوں۔

لہذا اب ہمیں لازم ہے کہ ہم کمر ہمت باندھکر میدان عمل میں ساعی وکوشاں ہوں۔ اپنے پائے استقلال کو غیر متزلزل رکھیں تاکہ ہم ہر م بلائے آسمانی کا بخندہ پیشانی مقابلہ کر سکیں جس حد تک ممکن ہو محنت اور انتظار سیکھیں۔

اللہ یار خاں۔

جمہوریت

مزدور کو ہوا ہے احساس زندگی کا
بیدار ہو رہا ہے انسان اس صدی کا
افسونِ امتیازِ شاہ و غلام ٹوٹا
سرمایہ داریوں کا کہنہ نظام ٹوٹا
آہی گئی سمجھ میں یہ بات اس جہاں کی
زینت ہے ننھے ننھے تاروں سے آسماں کی
صیاد طائروں کی تنظیم کر رہا ہے
ضیغم حقوقِ آہو تسلیم کر رہا ہے
آزاد زندگی کی تدبیر ہو رہی ہے
دنیا کی از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہے
مغرب کی سرزمیں میں قیصر کا ساز چپ ہے
انجام غزنوی پر روحِ ایاز چپ ہے
جمہوریت کا چرچا جو عام ہو رہا ہے
شاید جہاں کا مذہب اسلام ہو رہا ہے

فاخر

امام بخش صہبائی

مولانا امام بخش دہلوی اپنے زمانے کے باکمال شاعر اور جیّد عالم گزرے ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ایسے یکتائے عصر کا ذکر کسی صاحب تذکرہ نے نہیں کیا۔ اگر کیا بھی ہے تو نام اور تخلص سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اُس دور میں اُردو زبان ترقی کر رہی تھی۔ اور اُردو میں شعر کہنا ہی باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ فارسی کہنے والے تھے مگر کم۔ اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس دور کے صرف اُردو شعرا کا حال لکھا ہے۔ اور فارسی شعر کہنے والوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ میں بھی زیادہ تحقیق نہیں کر سکا۔ دہلی سے مولانا مغفور کے حالات ملنے کی اُمید تھی۔ محترمی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی لکھا۔ اور حضرتِ سائل دہلوی کے بزرگوں اور صہبائی مرحوم کے تعلقات کی بنا پر بالواسطہ سائل صاحب سے بھی استفسار کیا۔ لیکن اُنھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اور حضرت خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا کہ صہبائی صاحب کا تذکرہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ میری کتاب (غدر دہلی کے افسانے) میں صرف قتل کا حال ہے۔ اس لئے میں جس قدر تلاش کر سکا ہوں عرض کئے دیتا ہوں۔

مولانا مرحوم غالباً ۱۷۹۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی۔ ان کے بزرگ ایران سے بسبیلِ تجارت ہندوستان میں آئے تھے۔ اور یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

چو دیدم غالب و آنده را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

اُن کے والد کا نام کسی جگہ سے نہیں ملا۔ آپ نے علوم مروّجہ کی ابتدائی تعلیم مولوی عبداللہ خاں علوی سے حاصل کی۔ جو اپنے زمانے کے ایک اچھے فارسی گو شاعر تھے۔ صہبائی کے دوست بھی تھے۔ اور اُستاد بھی۔ شروع شروع میں مولانا صہبائی اصلاح بھی انھیں سے لیتے رہے۔ اور مولانا کے چند خطوط مولوی علوی کے نام بھی ہیں جن میں سے ایک نقل کرتا ہوں۔ اس سے صہبائی کا نثر لکھنے کا رنگ بھی نظر آجائے گا۔

"تسلیم نگاری نیاز صہبائی صفوء ایں قرطاس را بے تحریر نقوشِ عقیدت نگذاشت تا مرتسمِ صفحاتِ خواطر گردد کہ از سجدہ طرازانِ آں آستان جرأتِ عرض بے اختیاری ہمیں غبارِ ناتواں دارد و گستاخیِ پابوسِ خدام از جبیب ہمیں نقشِ پا سر برمی آرد۔ دریں روزہا کہ خاکِ مین پوری برسر آرزوہا می افشاند۔ اگر سایہ خدام آقائے فیض التزام بالِ ہمائے برسر عقیدت سرشت وانمی نمود۔ وحشت افزائی ایں سواد بر جاں تقاضائے گریبان چاکے می افزود۔ اگر مصرعے موزوں میتواں کرد ہم لبھائے خود را لعلۂ آں مامور گردانید نست داگر عبارتے باید نگاشت ہم گوشِ خود را سامعِ آں بہر سانیدن۔ دگرنہ فقدانِ سخن فہم آفتے برسر آوردہ است، و قیامتے برپا کردہ۔ خاک دہلی اگر ہمہ عبارست نفسہا را در پردہ اش با بوئے گل بہم آغوشی پرداختن است و دماغ را با مشک و عنبر دست در گردن انداختن بہر حال حرمانِ صحبتِ گرامی سخت آفت است و فقدانِ مطالعۂ دیدار دشوار قیامت۔ روشن گر آئینۂ ما خورشید شبہائے انتظار را بصفائے صبحِ وصال مبدل گرداند و شدائد ایامِ دوری را براحت افزائی شب ہائے وصال رساند۔"

جیسا کہ اوپر کے خط سے ظاہر ہوتا ہے مولانا مین پوری میں رہا کرتے تھے۔ اور نواب حیدر حسن خاں رئیس شاہجہاں آباد کی وساطت سے دربار شاہی تک بھی رسائی تھی۔ اگرچہ بہادر شاہ اُردو شعراء کی بہت قدر کرتے تھے لیکن ان کی یہ قدر دانی یہیں تک محدود نہ تھی وہ اپنے وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ مولانا صہبائی کو بھی دربار سے وظیفہ ملتا تھا۔ اور بادشاہ کی مدح میں اُنھوں نے چند قصیدے اور ایک دو رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

۱۸۴۲ء میں جب دہلی اورنٹیل کالج قایم ہوا تو مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ جو بعد میں اضلاع شمال و مغرب کے گورنر مقرر ہوئے معلموں کے امتحان کے لئے دہلی آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار پر ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک

فارسی معلم بھی مقرر کر دیا جائے۔ عمائد شہر نے مرزا غالب حکیم مومن خاں اور مولانا صہبائی کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا غالب کو بلایا گیا۔ ان کا قصہ تو مشہور ہے۔ یہ سکریٹری کو ملنے گئے۔ لیکن جب وہ ان کے استقبال کے لئے کوٹھی سے باہر نہ آئے تو یہ بگڑ کر چلے آئے۔ ان کے بعد حکیم مومن خاں اور مولانا کی باری آئی۔ مسٹر ٹامسن نے ان سے چند سوال کئے۔ اور آخر میں مولانا سے کہا کہ آپ اس کام کے لئے موزوں ترین شخص ہیں۔ صہبائی مرحوم ۱۸۵۶ء تک اورنٹیل کالج کے فارسی پروفیسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن جب ہنگامۂ غدر نے سب کام بند کر دیئے تو بوڑھے صہبائی بھی اپنے مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔ اور انہیں دنوں مارے گئے۔

صہبائی مرحوم کا اکلوتا بیٹا عبدالکریم تھا۔ اس کے لئے اور ایک عزیز شاگرد عبدالعزیز کے لئے ہی آپ نے کافی در علم قوافی لکھی۔ عبدالکریم اور عبدالعزیز دونوں یکے بعد دیگرے غدر سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔

صہبائی کے دوست

مولانا صہبائی نہایت خوش خلق اور مرنجان مرنج شخص تھے۔ یوں تو آپ کے اخلاق کے بہت لوگ مداح تھے۔ لیکن آپ کے خاص دوستوں میں سے میرزا غالب حضرتِ آزردہ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سرسید احمد خاں مرحوم اور نواب سید محمد صدیق حسن خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ مولوی لطف اللہ کشمیری کے بیٹے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے زمانے کے علماء و فضلاء میں ممتاز تھے۔ اور دہلی میں عہدہ صدر الصدور پر مامور تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر اور سید غلام علی خاں وحشت بھی مولانا کے خاص دوستوں میں سے تھے۔

صہبائی کے شاگرد

مولانا فارسی کے شاعر تھے۔ اور عمر بھر آپ نے اُردو میں شعر نہیں کہا لیکن اپنے شاگردوں کی اُردو غزلوں کی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے شاگردوں میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔

لالہ دین دیال۔ دہلی کے رہنے والے اور منشی ہردیال سنگھ کے بیٹے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے۔ البتہ نثر کی طرف خاص میلان تھا۔ صہبائی مرحوم سے ابتدائی فارسی تعلیم حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھوپال میں میر منشی مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے مرنے کے بعد اُن کا کلام جمع کیا۔ اگرچہ وہ مکمل نہ تھا۔ تاہم ان کی کوششیں لائق ہزار آفریں ہیں۔

مولوی محمد حسین۔ یہ بھی دہلوی تھے۔ تجر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں عدالت اندور کے ناظم مقرر ہوئے۔

لالہ بلدیو سنگھ۔ تامی تخلص تھا۔ بہت اچھا لکھنے والے تھے۔ میرزا غالب سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔

شاہزادہ میرزا قیصر بخت۔ شاہی خاندان سے تھے۔ اپنے تخلص سے فروغ تھے۔ ابتدا میں اپنے والد میرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد صہبائی کے شاگرد ہوئے۔

سید شبیر حسین نسیم۔ میر التماس حسین کے بیٹے تھے اور قصبہ بھرتپور ریاست بھرتپور کے رہنے والے۔ عربی۔ فارسی کی تعلیم مولوی سید محمد مونی پتی سے حاصل کی۔ پہلے پہل حکیم مومن خاں کے شاگرد ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد مولانا صہبائی سے اصلاح لینے لگے۔ مولانا نے شہادت سے چند ماہ پہلے انھیں مرزا داغ سے اصلاح لینے کی ہدایت کی اور یہ ان کے شاگرد ہو گئے۔ بھرتپور میں سب انسپکٹر پولیس تھے ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ کلام ملاحظہ ہو۔

تمہاری زلف خود دل مانگ لیگی — یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
بُرا ہے عشق، یہ میں جانتا ہوں — مگر ناصح سے ضد سی آ پڑی ہے
بہت دیکھا شب غم کو گھٹا کر — تمہاری زلف سے پھر بھی بڑی ہے
لہو پانی کیا ہے ایک اپنا — غضب کی پھوٹ چھالوں میں پڑی ہے

اُن دنوں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (حسرتی) کے مکان پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اور غالب آزردہ۔ علوی۔ صہبائی۔ مومن۔ نیر۔ اور وحشت وغیرہم وہیں جمع ہوتے تھے۔ مرزا غالب اور مولانا صہبائی کے چند اشعار لکھتا ہوں جو ایک ہی زمین میں کہے گئے ہیں۔ اس سے اُن کا مقابلہ مقصود نہیں صرف اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ پڑھنے والے دیکھ لیں کہ دو اُستاد جب ایک ہی طرح پر آزمائی کرتے ہیں تو اُن کا اشہبِ قلم کیا کیا جولانیاں کھاتا ہے۔

غالب

ہرچہ فلک نخواستہ است ہیچ کس از فلک نخواست
ظرفِ فقیہ مے نجست، بادۂ ما گزک نخواست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوشے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

صہبائی

مرد رہِ فنا منم دل مزہ نوشترک نخواست

گر فلکم نے نواخت، کام طلب گزک نخواست
درخور طبع چرخ نیست از ہمہ اشتیا زمن
خودسرہ درعیار خویش ناسرہ مشترک نخواست

غالب

دود سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش
دیدہ برخواب پریشان زد، جہاں نامیدمش
وہم خاکے ریخت درچشمم، بیاباں دیدمش
قطرۂ بگداخت۔ بحر بے کراں نامیدمش
باد دامن زد برآتش، نوبہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ، از ہستی خزاں نامیدمش
غر تم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش
کردہ تنگی حلقہ دام۔ آشیاں نامیدمش

صہبائی

دود آہم سائباں گشت آسماں نامیدمش
گوشۂ دل دم زوسعت زد جہاں نامیدمش
دود سودا جمع شد چنداں کہ تن نامش نہاد
زاں میاں سرزد شرار وہم، جاں نامیدمش
لخت لخت از سینہ خوں جوشید و گل زد موج رنگ
نالہ موزوں شد وسرورد آں نامیدمش
نارسائی حیلہ میخواست۔ در شغل ہوس
آرزو خوں گشت در دل۔ گلستاں نامیدمش

غالب

ہا پری چہرہ غزالان دز مردم رم شان
دل مردم بخم طرہ خم در خم شان
کافرانند جہاں جوئے کہ ہرگز نبود
طرۂ حور دلاویز تراز پرچم شان
آشکارا کش، بدنام و نکو نامی جوئی!
آہ ازیں طائفہ و آنکس کہ بود محرم شان

صہبائی

یارب آناں کہ تواے جان منی ہمدم شان
گر ہمہ نوش دہد نیش تو گردد سم شان
ناہداں بین کہ بگشتند حریف مے عشق
وہ چہ قوم اند کہ گفتن نتواں آدم شان
جام کوثر زن و خاک رہ بت مال بلب
آہ ازآناں کہ وضو نام برآرد نم شاں

یہ تو شاعروں کی غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں مگر یہاں ان سب کی گنجائش نہیں۔ مولانا صہبائی نے عرفی۔ ظہوری اور نظیری کی غزلوں پر بھی غزلیں لکھی ہیں۔ ان شعراء کے دواوین دیکھ لیجئے۔ اور صہبائی سے مقابلہ کر لیجئے۔ یہاں مولانا حالی کی کتاب یادگار غالب سے ایک دو اقتباس پیش کرتا ہوں۔ تاکہ مزید حالات پر روشنی پڑے

"اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا۔ اور فارسی کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہونچ گئی تھی۔ مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ حکیم مومن خاں نواب مصطفیٰ خاں حسرتی نواب ضیاء الدین خاں نیر۔ سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا (غالب) کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہٖ ایسا تھا۔ جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا اُن کے زمانے میں ہوتا۔"

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں۔

"صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا (غالب) نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے وہ مرزا کو اور مرزا اُن کو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا۔ اور شاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور یہی اُن کی اصل ترقی کی بنیاد تھی۔"

مولانا کی اُوپر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی مرزا غالب کو کم مانتے تھے۔ لیکن مولانا صہبائی نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ

نالۂ غالب و آزردہ زکف برد عناں
سوختم از آتش گرم دم شاں

علاوہ ازیں ان کے دیوان میں اور کئی جگہ یہ اعترافِ شکست موجود ہے۔ اس دور میں مرزا غالب کے بعد فارسی نظم و نثر و لغت میں کوئی ممتاز ترین ہستی ہے تو مولانا صہبائی کی۔ اُن کی علمیت کا اندازہ مولانا حالی کی اوپر کی تحریر سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب نے بیدل کے تتبع کی کوشش

کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور اُنھوں نے راہ کو پرخار دیکھ کر آخر کار اسے بالکل ترک کر دیا۔ یہ بات خصوصاً اُن کے بعض اُردو اشعار میں نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن صہبائی کے کلام میں آپ دیکھیں گے کہ وہ مرزا بیدل کے تتبع میں ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں، بلکہ ایک پہلو سے اُس قدیم روش سے آگے نکل گئے ہیں۔ صہبائی کے مضامین اس قدر "خشک" نہیں ہیں جس قدر مرزا بیدل کے۔ اُن کا تخیل بہت بلند ہے۔ طبیعت میں روانی ہے۔ مضامین تلاش کرنے میں انھیں خاص کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ صہبائی اور غالب کا دور نئی نئی ترکیبیں وضع کرنے میں مشہور ہے۔ چنانچہ صہبائی۔ غالب۔ اور مومن کے کلام میں ایسی نادر اور اچھوتی تراکیب پائی جاتی ہیں جو پہلے کسی اُستاد نے استعمال نہیں کیں۔ صہبائی نے اگرچہ مومن اور غالب کی طرح کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی۔ لیکن اُنھوں نے اس "جدت" میں نمایاں حصہ لیا۔ اُن کے کلام میں ایک دو جگہ ہندی الفاظ ویسے ہی موزوں ہیں جیسے ملا غنی کے کلام میں بعض کاشمیری الفاظ فنِ معما کے ماہر ہونے کی حیثیت سے صہبائی جس قدر مشکل مضامین کی توقع کی جائے کم ہے۔ لیکن نہیں اُن کے مضامین مقابلتاً سادہ اور عام فہم ہیں۔ اگر کہیں کوئی ادق مضمون بھی باندھا ہے تو اسی "معانی تخیل" کے طفیل باوجود فنِ معما اور لغت پر کامل عبور ہونے کے علاوہ حتی الوسع آسان لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ آپ کا کلام کسی اُستاد سے کم نہیں ہے۔

مولانا صہبائی کو جملہ علوم فنونِ مروجہ میں پوری دسترس حاصل تھی۔ خصوصاً درس و تدریس میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حکیم مومن خاں کے مقابلے میں انھیں اورنٹیل کالج دہلی کا فارسی معلم مقرر کیا گیا تھا۔ فنِ معما میں ملا کوکبی کا درجہ سب سے بلند مانا جاتا ہے لیکن صہبائی نے اس فن میں اس قدر مہارت حاصل کی اور خود اس قدر نرالے اور اچھوتے نکتے پیدا کئے کہ ملا کوکبی کے معمے ان کے سامنے بالکل سادہ اشعار نظر آتے ہیں۔ فنِ معما میں ان کے لکھے ہوئے چار رسالے مشہور ہیں۔

۱۔ گنجینۂ رموز۔ اعمالِ معما کے نکات حل کرنے کی بہترین درسی کتاب ہے۔ صہبائی نے اس پر بہت محنت کی ہے اور ایک شعر سے تین سو ساٹھ مختلف نام نکالے ہیں وہ شعر یہ ہے۔

چوں آں مہ روے خود از پردہ بنمود　　　دل از ما بردہ آخر کرد تا بود

۲۔ جواہرِ منظوم۔ رباعیاتِ معما کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک رباعی سے اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں کا ایک نام نکلتا ہے۔ مثلاً

رحیم

اے رہ بدل جہاں ز جورت غم را　　　وے برہمی از تو خاطرِ خرم را

آں کو بنود بندہ[۱] و کش آرد بدست　　　یکسر آشفتہ می کنی عالم را

رسالے کے خاتمہ میں ایک مثنوی لکھی ہے جس میں اپنے تخلص کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

بیا ساقی کہ من در انتظارم
بدہ جام و ببر رنجِ خمارم
بیار آں جام و بنداز شیشہ یکتا
بشو آلودگیہا یم بصہبا
ز بس مشتاق صہبائے تو بودم
تخلص نیز صہبائی نمودم

۳۔ مخزنِ اسرار۔ ملا کوکبی ایک شعر سے صرف سینتیس[۳۷] نام نکال سکا۔ وہ شعر یہ ہے۔

کشتِ امیدِ حاصل ازاں ماہِ پرعتاب　　　نیمے ز آب سرکش و نیمے بیافت آب

مولانا صہبائی نے اس رسالے میں اسی شعر سے ملا کوکبی کے ناموں کے علاوہ ایک سو پچاس جدا جدا نام نکالے ہیں۔

۴۔ رسالۂ نادرہ یہ بھی مذکورہ رسائل کی طرح صہبائی کے کمال کا گواہ ہے۔

مولانا صہبائی کی اور تصانیف بھی ہیں۔ مثلاً دیزۂ جواہر۔ رسالہ نحو فارسی نتائج الافکار، اعلاء الحق، کافی در علمِ قوافی۔ غوامضِ سخن اور بیاضِ شوق پیام وغیرہا۔

سراج الدین علی خاں آرزو نے شیخ علی حزین کے کلام رسالہ احقاق الحق میں چند اعتراض کئے تھے۔ جن کا جواب مولانا صہبائی نے اعلاء الحق کی صورت میں دیا۔ اور ایک رسالہ قولِ فیصل بطور محاکمہ درمیان شیخ علی حزیں اور خانِ آرزو بھی لکھا۔ ان رسائل کے علاوہ مولانا مرحوم نے ظہیرائے تفرشی مقامات نصیرائے ہمدانی حسن دمشق نعمت خان عالی پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری اور مُلا ابراہیم وغیرہ کی شرحیں بھی لکھیں اور آئین اکبری اور آثار الصنادید (مؤلفہ سر سید مرحوم) پر غالب کے پہلو بہ پہلو اُن کی تقریظیں بھی موجود ہیں۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی جالندہری

---

[۱] جو شخص "بندہ" نہ ہو وہ "حر" ہو گا۔ اگر "حر" کو اُلٹ دیں تو "رح" بن جاتا ہے۔ اب چوتھے مصرعے میں "اگر می" کو "آشفتہ" کیا جائے تو "یم" بن جائے گا۔ ان دونوں کو (مصرع ۲) کو یکجا کیا جائے تو رحیم بن جائے گا۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی

تجرّد کا راز

از

"جرمین باماں"

گوین - ووین - منشی بین نے چلا کر کہا "ابھی تک تم ختم نہیں کر چکیں۔"

سیڑھیوں کے اوپر سے، جو پیچ کھاتی ہوئی دوکان سے بالاخانے پر خوابگاہ میں داخل ہوتی تھیں، کسی نے خوش آئند آواز میں جواب دیا "ابا جان! ابھی نہیں۔"

"کیوں نہیں؟ تم کو کچھ وقت کی بھی خبر ہے؟ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری کاہلی کی بدولت ایک اعلیٰ درجہ کا سودا ہاتھ سے کھو دوں! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ موسیو شیانٹائے کا سا گاہک مجھے روز روز ملتا ہے؟"

"ابا! مجھ سے جسقدر جلدی ہوسکتی ہے، کر رہی ہوں۔"

"تو پھر ذرا اور جلدی کرو۔"

یہ غیظ آمیز کلمات اس کے لوٹتے ہوئے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر ایک نمایاں خوف کا اظہار کرتے تھے۔ بڈھا منشی بین استعمالی اشیاء اور قدیم عجائبات کا سوداگر تھا۔ وہ یہ کہکر اپنی دوکان کے ایک تاریک گوشے میں جا بیٹھا۔ یہاں سے وہ ہمیشہ ایک مکڑی کی طرح آنے جانے والے سیاحوں پر نظر رکھا کرتا تھا۔

اس مرتبہ اس کا معاملہ کسی معمولی سیاح سے نہ تھا، بلکہ ایک دولتمند نوجوان سے، جو ایک خاموش زندگی بسر کرنے کی غرض سے اپنی زمینداری پر آیا ہوا تھا، تاآنکہ جو "شہرت" اس کو بعض دلچسپ واردات کی بدولت حاصل ہوگئی تھی زائل ہوجائے۔ اس کی کوٹھی ایک عرصۂ دراز سے بند پڑی ہوئی تھی۔ ایک دنیادار نوجوان شخص کے واسطے بجز شکار اور برائے عجائبات جمع کرنے کے اور کیا شغل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ موسیو شانٹائے، بڈھے منشی بین کا مستقل خریدار بنگیا تھا۔ آج ہی منشی بین ایک پرانی مرمت شدہ الماری کو اس کے ہاتھ فروخت کرنے کی امید کر رہا تھا۔ موسیو شانٹائے کو قدرے پس و پیش تھا، کیونکہ اس کی دانست میں نہ تو الماری قدیم عجائبات ہی سے تعلق رکھتی تھی، اور نہ اسقدر قیمتی ہی تھی جتنا کہ اس کا مالک ظاہر کرتا تھا۔

نیچے باپ فروختگی کے خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ اوپر ووین کے رخسار سرخ تھے، قلب کی حرکت تیز تھی۔ اور وہ اپنے عجیب وغریب کام کی تکمیل میں عجلت کر رہی تھی۔

اس کی سادہ خوابگاہ میں میز پر کئی ایک زردی مائل ٹکڑے پڑے تھے جن پر نہایت خولصورت اور دلکش خط میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک دوات پرانی بد رنگ سیاہی سے بھری ہوئی تھی۔ اور ایک رنگ اڑا ہوا ریشمی فیتہ میز پر رکھا تھا۔ بجز ایک چیز کے یہی وہ کل سامان تھا جس سے وہ کام کر رہی تھی۔ وہ چیز اٹھارھویں صدی کی ایک "کتاب الانشاء" تھی اور میز پر بند رکھی تھی۔ ووین اپنے دل کے جذبات صفحۂ کاغذ پر اتارنے میں اسقدر منہمک تھی کہ اپنے والد کے قدم کی چاپ پشت پر سن کر ایکدم چونک پڑی۔

"اب مجھے خود ہی تم کو تلاش کرنے کے واسطے آنا پڑا۔ کیوں" بڈھے نے ناراضگی کے لہجہ میں کہا۔

"ابا جان!" لڑکی نے گھبرا کر جواب دیا "میں ختم کر چکی۔ بس بالکل ختم ہوگیا۔" اس نے تحریر شدہ کاغذات کو اٹھا کر کسی سنہرے سفوف سے خشک کیا اور موڑ کر اسی پرانے فیتہ میں لپیٹ کر اپنے والد کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خولصورت بالوں والی نازک اندام معصوم پری کسی قد آور دیو کے مقابل کھڑی ہوئی ہے۔

"کیا تم نے وہ تمام محبت آمیز خطوط نقل کر دئے جن کے اوپر میں نے نشان لگا دیا تھا" بڈھے منشی بین نے سوال کیا

"ہاں ابا"

"اور ان پر پانی کے چھینٹے ڈالکر ایسا بنا دیا کہ آنسوؤں کے دھبے معلوم ہوں۔"

"ہاں ابا"

اس نے بے اعتباری کے ساتھ کچھ دیر اسے دیکھا۔ لڑکی اس خوف سے کانپ گئی کہ مبادا وہ کھولکر ان خطوط کو پڑھے۔ مگر وہ بہت عجلت میں تھا۔ اور خطوط کا پلندہ ہاتھ میں لئے ہوئے نیچے اتر گیا تاکہ ان کو پرانی الماری کی ایک پوشیدہ دراز میں چھپادے۔

تنہا ہوتے ہی ودین خود بخود مسکرائی۔ خطوط کی نقل ؟ نقل کی آخر کیا ضرورت تھی۔ کیا خود اس کے دلی جذبات اسقدر کافی نہ تھے۔ کہ ایسے ہزار ہا خطوط کو پُر نہ کردیں۔ دل کے وہ پوشیدہ جذبات، جو موسیو شانتاسے کی آمد سے برانگیختہ ہوگئے تھے۔ اظہار کے واسطے کسی کتاب انشا کے حاجت مند ہو سکتے ہیں۔ اور اب وہ در پردہ خوش تھی " وہ میرے خطوط کو پڑھیگا۔" اس نے خیال کیا۔ " وہ تو یہی سمجھے گا کہ اس کی لکھنے والی اس دنیا سے عرصہ ہوا گزر چکی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ انہیں خطوط کو پڑھیگا جو میں نے اسی کے واسطے تحریر کئے۔ اور جنکو میں اس کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں لکھونگی۔"

ایک گھڑی بعد بڈھے منشی پین نے اس کو آواز دی۔ اور وہ نیچے اتر کر دوکان میں داخل ہوئی۔

" لو مبارک ہو۔" بڈھے آدمی نے کہا" وہ قبل از وقت ہی آ پہنچا تھا اور جونہی میں نے اس پوشیدہ دراز کا ذکر کیا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے باتوں باتوں میں الماری کے کھولنے کے متعلق تمام باتیں کہہ ڈالیں۔ اور وہ الماری کو اپنے ہمراہ موٹر میں لے گیا۔ کیوں۔ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

ودین نے کہا" میں خوش ہوں۔"

(۲)

گاؤں والوں میں مشہور تھا کہ موسیو شانتاسے چھ ماہ سے زاید گرمی میں نہ بسر کریگا۔ مگر اس کا قیام زیادہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ بجز ایک آدھ مرتبہ چند روز کے واسطے پیرس جانے کے، اس نے مستقل طور سے وہاں اقامت اختیار کرلی۔ ہر شخص کو حیرت تھی کہ وہ اب تک تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جس شخص کی دولت اس کے واسطے ہر قسم کا سامانِ تفریح اور آرام و آسائش مہیا کر سکے، اور وہ اسقدر سادہ زندگی بسر کرے، یقیناً تعجب خیز ہے۔

دن گزرتے چلے گئے۔ بڈھا منشی پین زمانے کی نیرنگی کا شکار ہوگیا۔ دوکان ودین کو ورثہ میں ملی۔ اس کے سنہری بالوں میں سفیدی کی جھلک نمودار ہو چلی تھی۔ اور اس کی نیلی آنکھوں کی پہلی چمک زائل ہوتی جاتی تھی۔ وہ بھی تنہا اور خاموش زندگی بسر کر رہی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور باپ کی دولت کے باوجود اس نے شادی نہیں کی۔ کبھی کبھار موسیو شانتاسے ایک آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ کونے کچالوں کو ڈھونڈنے اور پرانی کتابوں اور مختلف عجائبات کو تلاش کرنے میں گزارتا تھا۔ یہ رشتہ مشترک، اور ان کا یہ خیال کہ دونوں کی خلوت گزینی کے اسباب بجنسہ ایک تھے۔ ان کو اکثر ملنے پر مجبور کردیتا تھا۔

موسیو شانتاسے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر چکا تھا کہ ایک روز کتابوں کے ڈھیر کو ٹٹولتے ہوئے اس کو ایک "کتاب انشا" دستیاب ہوئی۔ اس نے کتاب کی ورق گردانی شروع کی۔ ودین اس کو ایک عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحہ بعد اس نے کتاب کو میز پر رکھدیا اور کہنے لگا۔

" اس زمانے میں بھی لوگ ادبیات سے واقف تھے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے بیس برس قبل تمہارے والد سے ایک پرانی الماری خریدی تھی۔ میں نے اس کے اندر ایک پیکٹ چند محبت بھرے خطوط کا پایا۔ ہاں!" اس نے ودین کے چہرہ کے تغیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ " پرانے خطوط محبت کا ایک پیکٹ۔ یہ خطوط ایسے خوبصورت انداز میں لکھے ہوئے ہیں، اور اظہارِ جذبات اس نفیس پیرایہ میں کیا گیا ہے، کہ آج اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ انہیں خطوط نے میرے نظریۂ زندگی کو تبدیل کر دیا۔ ان کو پڑھکر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں کسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فی زمانہ ایسی عورت کا ملنا جو اس خوبصورتی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرسکے۔ حد درجہ دشوار ہے۔ میری گزشتہ محبتیں بجز حماقت کے اور کچھ نہ تھیں۔ اور مستقبل مجھ کو کوئی امید نہیں دلاتا تھا۔ میں یہیں رہ پڑا۔ بیس سال تک میں نے اپنی زندگی گویا ایک ہیولے کی معیت میں بسر کی ہے۔ مجھے اس کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ خطوط پرانے زمانے میں میرے ہی واسطے تحریر کئے گئے تھے۔

ودین کے سپید چہرے پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ بعد اس کے رخسار پھر زرد کے زرد تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا:۔

" میں بہت خوش ہوں۔"

حفیظ الرحمن

مختلف ممالک کے قومی ترانے

شعر جذبات دلی کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اپنے جذبات کا اظہار اکثر شعر ہی سے کرتے ہیں۔ جنگ اور لڑائی کے موقعوں پر اشعار ہی سے فوجوں کے دل بڑھائے جاتے ہیں۔ اسی لئے ہر ملک کا قومی ترانہ یا قومی گیت اشعار ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ ترانہ خاص طور سے تصنیف کیا جاتا ہے اور بعض اوقات کسی جنگ یا لڑائی کے موقعہ پر فوجوں کا دل بڑھانے کے لئے کوئی رزمیہ نظم پڑھی جاتی ہے اور وہ اسقدر مقبول ہوتی ہے کہ وہی نظم قومی ترانہ بنجاتی ہے۔ ذیل میں چند ممالک کے قومی ترانے ہیں۔ میں نے حتی الامکان لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) آسٹریا

اس قومی ترانہ کا مصنف آسٹریا کا مشہور شاعر ہیڈن ہے۔ جب اس نے انگلستان کا سفر کیا تھا تو یہ وہاں کے قومی ترانہ سے اسقدر متاثر ہوا کہ واپس آکر اس نے بھی ایک قومی ترانہ تصنیف کیا:-

خدا ہمارے مہربان، نیک اور شہنشاہِ اعظم کو سلامت رکھے۔ وہ طاقتور اور عقلمند شہنشاہ ہے اور ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ خدا اس کے گلے میں ہمیشہ پھولوں کے ہار پہنائے رکھے جو اس کی شاہانہ عظمت کا مظہر ہیں۔

خدا ہمارے مہربان، نیک اور شہنشاہِ اعظم کو سلامت رکھے۔ اس کا شاہی عصا غیر ممالک کی طرف بڑھے۔

اس کے تخت کے سب سے بہترین ستون رحم اور انصاف ہیں۔ اس کی ڈھال پرستاروں کی طرح کرنیں منور ہیں۔

اس کی خواہش ہمیشہ اپنے آپ کو نیکی میں ملبوس کرنے کی رہی ہے۔ صرف اپنی رعایا کی حفاظت کرنے کے لئے اس کی تلوار اونچی ہوا میں اٹھتی ہے۔ اس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی رعایا کو آزاد کر دیا ہے۔

بہادری۔ دلیری اور سچائی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ جب اس کا آخری وقت آ پہنچے تو خدا کرے ملائک اس کے استقبال کو آگے بڑھیں۔

(۲) ہالینڈ

۱۸۱۵ء میں یہ ترانہ ہینڈرک وان ٹالنس نے لکھا تھا:-

وہ جس کی رگوں میں ولندیزی خون جوش مار رہا ہے جو آزاد اور بہادر ہے۔

جس کا دل اپنے وطن اور شہزادہ کی محبت میں روشن ہو رہا ہے۔ آئے اور ہمارے ساتھ گیت میں شامل ہو جائے۔

اسے ہمارے ساتھ اپنی آواز بلند کرنی چاہئے۔
وہ گیت شہزادہ اور آبائی وطن کے لئے ہے۔
جس سے تمام دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

خدایا ہمارا قدیم ملک محفوظ رکھ جو تو نے ہمارے آبا کو عطا کیا تھا وہ ملک جہاں ہم نے طفولیت کے دن گہوارہ میں گزارے ہیں اور جہاں ہماری آخری قبر بھی بنیگی۔

ہمارے شہزادہ اور آبائی وطن کے لئے ہم تمہاری برکت اور رحم کے بھی ملتجی ہیں۔

ہماری یہی دعا ہے کہ خدایا ہمارے شہزادہ اور اس کے عظیم الشان اور آزاد خاندان کو ہمیشہ سلامت رکھ۔ جو ہالینڈ کو بہت پیارا ہے۔

بچپن سے لیکر بڑھاپے تک بلکہ اس وقت تک جب ہم موت کے آغوش میں ہونگے۔ ہماری یہی دعا ہوگی

خدایا ہمارے شہزادہ اور آبائی وطن کو سلامت رکھ۔

(۳) فن لینڈ

فن لینڈ کے قومی ترانے کا مصنف رون برگ ہے :۔
ہمارا ملک ۔ ہمارا ملک ۔ ہمارا آبائی ملک ۔
دنیا میں کسی جگہ بھی ایسے پہاڑوں کی طرح کوئی پہاڑ
اور ایسی وادیوں کی طرح کوئی وادی ہے ؟
اے شمال کے ملک ۔ اے ہمارے آبائی ملک ۔

(۴) سرویا

اس ترانہ کے مصنف کا نام کسی کو بھی معلوم نہیں ۱۸۴۰ء میں جب سرویا والے ہنگری کے خلاف لڑ رہے تھے تو اس زمانہ میں یہ نظم بیحد مقبول ہوئی تھی :۔
بیدار ہو اے اہل سرویا بیدار ہو۔
رات گزر گئی اور سورج طلوع ہو رہا ہے ۔
ملک اور آزادی تمہیں دعوت دے رہی ہے ۔
تمہارا جھنڈا لہرا رہا ہے ۔
کسی ظالم کی زنجیر تمہیں مقید نہیں کر سکتی ۔
مسلح ہو اے اہل سرویا مسلح ہو اور اٹھو ۔
میدان جنگ کی طرف بڑھو ۔
اپنے دشمنوں کو عاجز کر دو
سرویا اپنے فرزندوں کو پکار رہا ہے کہ آگے بڑھو
کیونکہ فتح اس کا انعام ہے ۔
لڑنے کے لئے نکلو خدا تمہاری مدد کرے
مسلح ہو اے اہل سرویا مسلح ہو اور اٹھو ۔

(۵) سویڈن

سویڈن کے قومی ترانہ کا مصنف سٹرینڈ برگ ہے :۔
ہم اپنے دلی جذبات کا اظہار ایسے کرتے ہیں کہ
خدا ہمارے بادشاہ اور ملک کو سلامت رکھے ۔
ہماری زندگیاں ہنسی خوشی اور لطف سے کٹتی ہیں ۔
اس لئے ہمیں نہایت عمدہ سروں میں یہ گانا چاہئے ۔
کہ خدا ہمارے وطن اور بادشاہ کو سلامت رکھے ۔

(۶) امریکہ

یہ ترانہ ۱۸۳۲ء میں ایک پادری فرینکس سمتھ نے کہا تھا جو آج تک مشہور ہے :۔
اے میرے وطن آزاد وطن ۔
میں تیری تعریفوں کے گیت گاتا ہوں ۔
وہ ملک جہاں میرے آبا و اجداد نے اس ملک کو خیر باد کہا ۔
سیاح جہاں آکر خوش ہوتے ہیں ۔
ہر ایک پہاڑ سے آزادی کی گونج آرہی ہے ۔
تو میرا وطن ہے آزاد وطن ۔
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
تیرے پہاڑوں ، دریاؤں اور جنگلوں سے مجھے عشق ہے
ان چیزوں کو دیکھ کر میرا دل اچھلتا ہے ۔
انسانوں کی زبانوں کو بیدار ہونا چاہئے ۔
تمام ملک کو اس میں حصہ لینا چاہئے ۔
چٹانوں تک کو اپنی خموشی توڑ کر یہ گیت گانا چاہئے ۔
اے خدا جس کے ہاتھوں میں آزادی ہے
ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں ۔
ہمارا ملک آزادی کی مقدس روشنی سے ابد تک روشن رہے
اپنے جلال سے ہمیں بچا ۔
سب سے بڑے شہنشاہ ہمارے خدا ۔

(۷) بلجیم

یہ نظم اسوقت کی ہے جب بلجیم اور ہالینڈ والوں کی جنگ ہو رہی تھی اور بلجیم آزاد ہو رہا تھا ۔
غلامی کے طویل سال ختم ہونے کو ہیں ۔
بلجیم بے غیرتی کی زندگی سے نکل رہا ہے ۔
اپنی جوانمردی سے آخر کار اپنا جھنڈا ، حقوق اور قدیم شہرت واپس لے لی ہے ۔

نصیر احمد

دَولت کی قربانگاہ پر

کشتی آہستہ آہستہ زمین سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ خلیج وسیع و کشادہ تھی۔ ساحل کے متوازی مونگے کی چٹانیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سمندر کی لہریں ان چٹانوں پر آ کر ٹوٹ جاتی تھیں اور ان چٹانوں کے دامن کے برابر برابر سفید سفید جھاگ تا حدِ نظر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس لامتناہی سلسلہ کے درمیان ایک معمولی سا شگاف اس مقام کا پتہ دیتا تھا۔ جہاں ایک چھوٹا سا دریا سمندر میں آ کر گرا تھا۔ سامنے ایک دور کی پہاڑی کے دامن پر ہری ہری دھوپ افراط سے پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس مقام پر جنگل کا کنارہ سمندر کے ساحل سے بالکل واصل ہو گیا تھا۔ بہت دور پر فاصلہ کے باعث ایک سحاب آسا سلسلۂ کوہ مبہم طور سے پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جس کی ناہمواری سے یہ گمان ہوتا تھا کہ اٹھتی ہوئی لہریں دفعتاً منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ آسمان شدت تپش سے آتشدان بنا ہوا تھا۔ سمندر سوائے ایک غیر محسوس سنسناہٹ کے خاموش اور ساکن تھا۔

جس شخص کے ہاتھ میں منقش پتوار تھا "رک گیا"۔ "اسے یہاں کہیں ہونا چاہئے" اس نے کہا اور یہ کہہ کر پتوار کو کشتی میں رکھ لیا۔ اور اپنے بازوؤں کو سیدھا اپنے سامنے خشکی کی طرف دراز کر دیا۔ دوسرا آدمی کشتی کے پہلے حصے میں تھا اور اس کی متجسس نظریں سامنے کی خشکی کا نہایت غور سے جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے گھٹنے پر پیلے کاغذ کا ایک تختہ پھیلا ہوا تھا۔

"حامد یہاں آؤ اور اسے دیکھو" اس نے کہا۔

دونوں آدمیوں نے نہایت نرم اور آہستہ لہجہ میں گفتگو کی۔ ان کے لب خشک اور سخت تھے۔ حامد کشتی کے کناروں کا سہارا لیتے ہوئے ہوشیاری سے ہمراہی مخاطب کے قریب آیا اور اس کے شانوں پر سے دیکھنے لگا۔ کاغذ پر ایک ناہموار سا خاکہ کھنچا ہوا تھا، بار بار تہ ہونے کے باعث وہ اسقدر بوسیدہ اور شکستہ ہو چکا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی اس کے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی ہوتی۔ پنسل کے نشانات نہایت ہلکے پڑ چکے تھے اور نہایت غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ اس پر خلیج کا خاکہ ہے۔

"اس مقام پر" حامد نے کہا "چٹانوں کا سلسلہ ہے اور اس مقام پر شگاف ہے" اس نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو خاکہ پر پھیرا۔ "یہ خمدار اور پیچیدہ سطر دریا کو ظاہر کرتی ہے...... اور یہ ستارہ اس مقام کا پتہ دیتا ہے"۔

"اس نکتہ دار لکیر کو دیکھو" نقشہ والے آدمی نے کہا "یہ خط مستقیم ہے اور چٹانوں کے سلسلہ کے شگاف سے کھجور کے درختوں کے کنج تک جاتا ہے۔ ستارہ اس مقام پر ہے جہاں کہ یہ خط چشمے کے اوپر سے گزرتا ہے۔ ہمیں اس نکتہ کو جھیل میں داخل ہونے سے قبل اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" حامد نے چند توقف کے بعد کہا "کہ یہ چھوٹے چھوٹے نشانات کیا معنی رکھتے ہیں؟" یہ چھوٹی چھوٹی سی لکیریں جو ادھر ادھر اشارہ کر رہی ہیں! اور یہ رسم الخط کس ملک کا ہے؟"

"چین کا" نقشے والے آدمی نے کہا۔

"اچھا! ہاں وہ تو چینی ہی تھا" حامد نے کہا۔

"وہ سب چینی تھے" نقشہ والے آدمی نے کہا۔

وہ دونوں چند منٹ خاموش بیٹھے خشکی کی طرف نظریں جمائے رہے۔ کشتی بتدریج آگے کو بڑھ رہی تھی۔ حامد نے پتوار کی طرف دیکھا۔

"نادر، کشتی کھینے کی اب تمہاری باری ہے" اس نے کہا۔

نادر نے خاموشی سے خاکہ کو تہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ احتیاط کے ساتھ اپنے ہمراہی کے پاس سے گزر کر پتوار چلانے لگا۔ اس کے بازو نہایت کمزوری سے کشتی کو کھے رہے تھے۔ اس کے حرکات ایک ایسے آدمی سے مشابہت رکھتی تھیں جو بہت مضمحل اور ماندہ ہو۔

حامد کی نیم وا آنکھیں سفید سفید جھاگ کے دیکھنے میں مصروف تھیں۔ گرمی کی شدت کرب ناک تھی۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ باوجودیکہ وہ مقام مطلوب کے اتنے قریب آ گئے تھے لیکن حامد اس وقت اس بے انتہا مسرت سے آشنا نہ معلوم ہوتا تھا جس کا اس نے بارہا اندازہ لگایا تھا۔ تمام کی تحصیل کے لئے سرفروشانہ جدوجہد

نے اور بحر اعظم سے ایک قلیل اور ناکامی رسد والی کشتی میں شبانہ روز
مدد درازہ بحری سفر کے صبر آزما مصائب نے اُسے بالکل مضمحل کر دیا
تھا۔ اُس نے خیالات کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنے ذہن کو
اس خزانے کی طرف منتقل کر دیا جس کی بابت چینیوں نے گفتگو کی
تھی۔ لیکن یہ روح افزا خیالی دنیا بہت ہی قلیل عرصہ۔ اس کے تخیل
کا مرکز بنی رہی۔ اور بہت جلد دریا کے صاف شفاف پانی کی روانی
نے اُس کی منظروں کو متوجہ کر لیا۔ اسے اب ایک بےچینی کے ساتھ
اپنے حلق اور ہونٹوں کی ناقابل برداشت خشکی محسوس ہونے لگی۔
لہروں کی شکست کی آواز ایک ترنم پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے کانوں
کو سمندر کا یہ نغمہ بہت بھلا معلوم ہوا۔ امواج بحر کشتی کے کناروں
کے بوسے لیتی تھیں اور تیوار ہر دفعہ انہیں اس گستاخی کی سزا میں
پیچھے ہٹا دیتا تھا۔

حامد ابھی تک جزیرہ کی موجودگی سے باخبر تھا لیکن اب اُس
کے احساسات کے اندر خواب کی سی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ اب
اس کی نظروں کے سامنے وہ رات تھی جس رات اُسے اور نادر
کو اتفاقی طور پر چینیوں کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی
درخت چاند کی روشنی میں کیسے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آگ روشن
تھی۔ تین چینی راز کی باتوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف اُن کے
جسم پر چاند روشنی ڈال رہا تھا۔ اور دوسری طرف دہکتے ہوئے
شعلوں کی دمک اُن کے جسم کو سُرخ بنا رہی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی
انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ نادر نے حامد کو اشارہ
سے سننے کے لئے بلایا تھا۔ گفتگو کا کچھ حصہ سُن نہ سکا اور کچھ حصہ
قابل فہم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اصل راز کھل گیا تھا۔ ایک ہسپانوی
جہاز جزائر فلپائن سے روانہ ہو کر گردش زمانہ سے ریتلے کنارہ
پر چڑھ کر برباد ہوا تھا۔ اکثر جہاز والوں کو موت نے ختم کر دیا۔ بس
ماندہ جہاز والے اقتضائے وقت سے ساتھ کی دولت کو واپسی
پر حاصل کرنے کی امید میں دفن کر کے جان بچا کر چلے گئے۔ لیکن
پھر واپس نہ آئے۔ دو سو برس بعد قسمت کی خوبی سے چانگی کو
اس کا علم ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیا اور اس دولت
بیکراں کو بار دیگر نہایت احتیاط سے مدفون کر دیا۔ اس نے یہ کام
تنہا کیا لیکن اُسے دفینہ کی حفاظت کا کامل یقین تھا۔ اُس نے
تحفظ کے ذرائع پر کچھ روشنی نہ ڈالی تھی کیونکہ وہ اس کا ایک راز
تھا۔ اب اُسے امداد کی ضرورت تھی تاکہ وہ دفینہ کی دولت کو
وطن لے آئے۔ اس کے بعد چانگی نے ایک چھوٹا سا خاکہ پھیلایا
تھا اور چینی نہایت ہی آہستگی سے باتیں کرنے لگے تھے۔ ان سب
باتوں کو دو ہندی دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے!

اب حامد کو وہ منظر دکھائی دیا جبکہ وہ چینی کے خون کا پیاسا
تھا۔ چانگی کی چوٹی اس کی مضبوط گرفت میں تھی۔ چینی کی زندگی
ایک ہندی کی زندگی کی طرح قیمتی نہ تھی۔ اب چانگی کا چہرہ حامد
کے سامنے تھا۔ اول سانپ کی طرح غضبناک۔ پھر خطرناک۔ مرتے
وقت اس کی صورت کیسی خوفناک ہو گئی تھی۔ دغاباز لیکن قابل رحم
چانگی کا چہرہ! اس نے دانت کیوں دکھائے تھے؟ یکایک خواب
کے واقعات نے نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی۔ حامد نے دیکھا
سونے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ چانگی درمیان میں حائل ہے۔
اور اُسے طلائی انبار سے ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ حامد نے پھر چانگی
کی چوٹی پکڑ لی۔ اُس نے پھر ڈراؤنے طریقہ سے دانت دکھائے۔
اب چانگی لحظہ بہ لحظہ جسامت میں بڑھتا جاتا ہے۔ سونے کے انبار
دفعتاً دہکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ ایک مہیب دیو نمودار
ہوا، بالکل چانگی سے مشابہ، اور اس نے حامد کو شعلے کھلانے شروع
کئے جس سے اُس کا منہ بری طرح جل گیا۔ ایک اور دیو اُس کا نام پکار
رہا تھا "حامد! حامد! اے خوابیدہ احمق!" ——— یا یہ نادر کی
آواز تھی۔ وہ جاگ اٹھا۔ اب وہ جھیل کے دہانے میں داخل ہو
چکے تھے۔

"وہ رہے کھجور کے تین درخت۔ مقام مطلوبہ ان جھاڑیوں
سے خط مستقیم میں ہوگا۔" دیکھو اگر ہم ان جھاڑیوں میں گزر کر سیدھے
دوسری جانب روانہ ہوں تو جہاں دریا ملیگا وہ مقام وہاں سے
قریب ہی ہوگا۔"

دریا کا دہانہ اب قریب آ گیا تھا۔ حامد نے اُسے دیکھکر کہا۔
"اسے بھئی جلدی کرو، پیاس کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔
کہیں، خدا کرے، سمندر کا پانی نہ پینا پڑے۔" اس نے اپنے
ہاتھ کو کاٹا اور چٹانوں اور ہری ہری گھاس کے درمیان آب رواں
کی سیمیں چادر کو اشتیاق کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یکایک وہ
تند لہجہ میں نادر سے کہنے لگا "ادھر لاؤ تیوار مجھے دو۔"

وہ دریا کے دہانے میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد نادر
نے چلو میں کچھ پانی لیا، چکھا اور تھوک دیا۔ ذرا دور چلکر اُس نے پانی
پھر چکھا "اب غنیمت ہے"، اس نے کہا اور دونوں نہایت اشتیاق

سے پانی پینے لگے۔

"او نحو" حامد نے یکایک کہا "اس طرح تو بہت دیر ہو گی" اور کشتی کے اگلے حصہ پر مخدوش طریقہ سے جھک کر اس نے اپنے ہونٹ پانی سے لگا دیئے۔ وہ بہت جلد سیراب ہو گئے۔ ندیا کے کنارے میں ایک شگاف کے اندر کشتی کو داخل کر کے گھنے اُگے ہوئے سبزہ پر، جو دریا کے کناروں پر پانی تک پھیلا ہوا تھا۔ اترنے ہی کو تھے کہ حامد نے کہا۔

"نشان دادہ جھاڑیوں تک پہنچنے اور پھر وہاں سے مقام مقصود تک خطِ مستقیم قائم کرنے کے لئے ہمیں بہت چکر لگانا پڑے گا۔"

"بہتر ہو کہ دوسری جانب کشتی میں ہی چلیں" نادر نے کہا۔

انہوں نے کشتی کو پھر دریا میں داخل کیا اور سمندر میں واپس آ گئے۔ ساحل کے برابر ہوتے ہوئے وہ جزیرہ کے اس جانب پہنچ گئے جہاں چند جھاڑیاں موجود تھیں۔ یہاں وہ اتر پڑے کشتی کو ساحل کے اوپر کھینچ لیا۔ اب انہوں نے جنگل کی طرف پیشقدمی کی اور اس وقت تک چلتے رہے کہ انہیں وہ جھاڑیاں اور چٹانوں کے درمیان کا شگاف ایک لائن میں نظر آنے لگا۔ حامد نے کشتی میں سے ایک اوزار لے لیا تھا جو حرف ل سے بہت مشابہت رکھتا تھا اور جسکے ترچھے سرے پر ایک صیقل شدہ پتھر لگا ہوا تھا۔ نادر کے ہاتھ میں پتوار تھا۔

"وہ جگہ اس طرف ہوگی" اس نے کہا "ہمیں ناک کی سیدھ اس وقت تک چلنا چاہیئے جب تک ہم چشمہ تک نہ پہنچ جائیں اس وقت ہمیں کامیابی کی یقینی امید ہے۔"

ان کا راستہ نہایت صبر آزما تھا۔ گھنے نرکلوں، جھاڑیوں اور کھجور کے افتادہ پتوں میں انہیں گزرنا پڑا۔ زمین پر پھیلے ہوئے چھوٹے لیکن گنجان پودوں نے مشکلات میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اول اول چلنا دوبھر ہو گیا لیکن بہت جلد بلند و بالا درخت آ گئے۔ اور زمین صاف نظر آنے لگی۔ آفتاب کی ناقابل برداشت حدت بتدریج ٹھنڈے سایہ میں تبدیل ہونے لگی۔ درخت اور زیادہ طویل القامت ہو گئے جن کے بلند سروں پر گنجان اور ہرے ہرے پتے اور شاخیں ایک خوشنما دائرہ میں دلفریب انداز سے دامن پھیلائے ہوئی تھیں۔ شاخوں پر قسرتی رنگ کے پھول آویزاں تھے اور سُرخ سُرخ حسین بیلیں ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سایہ گہرا ہونے لگا۔ زمین پر سُوکھی کُکُر متا پھیلی ہوئی تھی اور سرخ خاکی مائل تھیں

جا بجا منظر کو متوجہ کرتی تھیں۔

حامد کو ایک پھریری آئی" اتنی شدید گرمی برداشت کرنے کے بعد یہاں تو سردی محسوس ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم بالکل سیدھے جا رہے ہیں نا؟" نادر نے دریافت کیا۔

یکایک انہوں نے بہت دور، ہلکی سی تاریکی میں ایک شگاف دیکھا جہاں آفتاب کی کرنیں درختوں کے سایہ دار پتوں میں سے چھن چھن کر زمین پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ ہری ہری گھاس دلکش طریقہ سے نظروں کو کھینچ رہی تھی، رنگین پھول اس منظر کے حسن پر اضافہ تھے۔

"دریا!" نادر فرطِ مسرت سے چلا اٹھا "وہ جگہ تو اب بالکل ہی قریب ہو گی۔"

ندیا کے کنارے سبزہ کثرت سے اُگ رہا تھا۔ بلند درختوں کی جڑوں کے درمیان بڑے بڑے پودے نشوونما پا رہے تھے جنہیں جن کو انسان نے ابھی کسی نام سے موسوم نہیں کیا۔ اپنی گھنی سایہ دار چھتوں کو لئے ہوئے نہایت فخر و ناز سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہزار خوشنما پھول، صدہا بیلیں جن کی پتیاں چمکدار تھیں۔ درختوں کے تنوں سے آویزاں تھیں۔ اُس نالاب کی وسیع اور ساکن سطح پر، جس کو خزانے کے متوالوں نے نظر انداز کر دیا تھا، بڑے بڑے بیضوی شکل کے پتے تھے اور ایک بڑا سا سرخ و سفید پھول جو کنول سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ ایک مستانہ ادا سے بہہ رہا تھا۔ آگے چلکر دریا نے موڑ پر یکایک تند و تیز رفتار اختیار کر لی، پانی نہایت زور شور سے بہنے لگا۔

"نہیں!" حامد نے کہا۔

"شاید ہم سیدھے راستہ سے کسی قدر ہٹ آئے ہیں" نادر نے کہا" اور اس کا احتمال بھی تھا۔"

اُس نے گھوم کر پیچھے کے جنگل میں خاموش سرو سایوں کو دیکھا۔

"یہاں ہم اگر چشمہ کے اطراف میں تلاش کریں تو ہمیں کوئی مفید نشان مل جائیگا۔" نادر نے کہا "تم نے کہا تھا ——" حامد کہنے لگا۔

"اُس نے، اس نے کہا تھا کہ یہاں کنکروں کا ایک ڈھیر ہے۔" نادر نے بطور اصلاح تردید کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، پہلے چشمے کے بہاؤ کی طرف چلیں" حامد نے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھے۔ اُن کی متجسس نگاہیں ہر طرف نہایت غور سے مصروف تلاش تھیں۔ معاً حامد رُک گیا۔

"ہائیں! وہ کیا؟" نادر نے اُس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ "وہ کوئی چیز نیلی نیلی" نادر نے کہا۔ وہ شے حامد کو اتفاقاً اسوقت نظر آ گئی

جبکہ وہ ایک فراز کے اوپر سے گزر رہا تھا - اب انہوں نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی - وہ فوراً تیز قدم ڈالتے ہوئے آگے بڑھے - یہاں تک کہ اس بوسیدہ دست و بازو کا متعلقہ حصۂ جسم بھی نظروں کے سامنے آگیا - نادر کی گرفت پتوار پر سخت ہوگئی، حامد نے اپنے اوزار کو مضبوطی سے پکڑ لیا - دیکھا کہ ایک چینی کی لاش ہے جو منہ کے بل پڑی ہوئی ہے - اُس کی بے بسی کی موت صورت حال سے ظاہر تھی -

حامد اور نادر ایک دوسرے کے پاس ہوگئے - اور وحشت زدہ آنکھوں سے اس بدشگون مردہ جسم کو خاموشی سے گھورنے لگے - لاش درختوں کے درمیان ایک صاف مقام پر افتادہ تھی، قریب ہی ایک چینی پھاوڑا پڑا ہوا تھا، کسی قدر دور پر ایک تازہ کھودے ہوئے سوراخ کے قریب پتھر پھیلے ہوئے تھے -

"ہم سے بھی پہلے کوئی آن پہنچا" نادر نے اپنی آواز صاف کرتے ہوئے کہا - اس پر حامد سے مجنونانہ حرکات سرزد ہوئیں اور اُس نے اپنے پیروں کو زور زور سے زمین پر مارا - نادر کا چہرہ سفید پڑگیا لیکن اس نے کچھ نہ کہا - وہ بھیں چینی کی طرف بڑھا - لاش کی گردن پھول گئی تھی اور رنگ ارغوانی ہوگیا تھا، اُس کے ہاتھ اور پنڈلیاں سوج گئیں تھیں -

"شا" اس نے کہا اور فوراً پلٹ پڑا - اور کھدے ہوئے سوراخ پر گیا - شدت حیرت اور فرط مسرت سے وہ چیخ اٹھا - اس نے زور سے حامد کو آواز دی جو کہ کسی قدر فاصلہ سے آہستہ آہستہ آرہا تھا -

"ارے میاں خزانہ موجود ہے! کہیں نہیں گیا!" اُس نے گھور کر مردہ چینی کو دیکھا اور پھر خزانے کی طرف - حامد بسرعت سوراخ پر پہنچا - بدبخت مردہ کے قریب ہی چند پیلی پیلی سلاخیں پڑی ہوئی تھیں جن کا رنگ مدھم پڑگیا تھا - وہ سوراخ میں جھکا اور برہنہ ہاتھوں سے مٹی کو جلدی سے ہٹا کر ایک وزنی سلاخ باہر نکالی - ایسا کرنے میں ایک چھوٹا سا کانٹا اُس کے ہاتھ میں چبھ گیا - اُس نے کانٹے کو انگلیوں سے نکال لیا اور وزنی سلاخ کو اوپر اٹھایا -

"سونا یا رانگ ہی اتنا وزنی ہوسکتا ہے" اس نے سرور آمیز لہجہ میں کہا -

نادر کی نظریں ابھی تک لاش پر گڑی ہوئی تھیں، وہ بہت متعجب ہو رہا تھا -

"یہ چینی اپنے ہمراہیوں سے سبقت لیگیا" آخرکار نادر گویا ہوا "اور یہاں تنہا حصول خزینہ کے لئے آیا لیکن زہریلے سانپ نے اس کا خاتمہ کر دیا ..... تعجب ہے کہ اُسے یہ مقام کیسے معلوم ہوا"

حامد جو ہاتھ میں طلائی سلاخ لئے ہوئے کھڑا متفکر تھا کہ مردہ چینی کا یہاں موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے - یکایک چونک کر کہنے لگا - "ہمیں یہ دفینہ تھوڑا تھوڑا کر کے لیجانا پڑیگا اور وطن پہنچکر کچھ عرصہ کے لئے مدفون رکھنا پڑیگا .... اسے کشتی تک کیسے لیجائیں؟"

اس نے اپنا جیکٹ اُتارا اور زمین پر بچھا دیا اور چند طلائی سلاخیں سوراخ میں سے نکالکر اُس پر ڈالدیں - ایک مرتبہ پھر اُسے محسوس ہوا کہ ایک چھوٹے سے کانٹے سے اس کی کھال پر خراش آگیا ہے -

"ایک مرتبہ میں ہم اتنا منتقل کر سکتے ہیں" اس نے کہا، یکایک عجیب تند لہجہ میں اُس نے نادر کو مخاطب کر کے کہا "تم کیا گھور رہے ہو؟"

نادر نے لاش کی طرف اشارہ کیا "میں اس کی موجودگی کا متحمل نہیں ہوسکتا ...... یہ بالکل اُس سے مشابہت ——"

"لاحول ولا قوۃ" حامد نے کہا "ارے میاں سب چینی یکساں ہوتے ہیں -"

نادر نے اُس کے چہرہ کو دیکھا اور کہا "اس دولت میں ہاتھ لگانے سے قبل میں اسے دفن کرنا چاہتا ہوں"

"دیکھو نادر بیوقوف مت بنو" حامد نے سختی سے کہا "اس ملعون کو پڑا رہنے دو"

نادر نے پس و پیش کیا اور اُس کی آنکھیں متفکرانہ طور سے زمین پر جھک گئیں -

"مجھے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے" نادر نے مایوسانہ طرز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا -

"بات اصل یہ ہے" حامد نے کہا "کہ اس دفینہ کا کیا کیا جائے - اسے دوبارہ یہیں کہیں محفوظ طریقہ سے بطور خود دفن کر دیں یا آبنائے کو پار کر کے کشتی تک لیجائیں؟"

نادر سوچ میں پڑ گیا - اُس کی متوحش نظریں بلند درختوں کے گول سبز چھتریوں پر جن پر آفتاب کی شعاعیں ضیاباری کر رہی تھیں - اور طویل القامت درختوں کے تنوں کے درمیان سرگرم سفر تھیں - اس کی نظریں پھر چینی کی لاش پر جم گئیں - وہ کانپنے لگا - اس کی نگاہیں پھر درختوں کے درمیان کی تاریک گہرائیوں میں بھٹکنے لگیں - اُس کی

نگاہیں وحشت آلودہ تھیں اور اُس سے تمام ماحول پر وحشت چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔

"نادر تمہیں ہو کیا گیا ہے ۔" حامد نے کہا "کیا تمہارے حواس منتشر ہو گئے ہیں ؟"

"ہاں تو اس دفینہ کو کسی طرح باہر نکالنا چاہیئے" نادر نے چونک کر کہا ۔

اُس نے کوٹ کے کالر کے سروں کو پکڑ لیا اور مقابل کے گوشے حامد کے ہاتھ میں تھے ۔ انہوں نے بوجھ کو اٹھایا ۔

"کس طرف ؟" حامد نے کہا "کشتی کی طرف نا ؟"

ابھی چند ہی قدم بڑھے ہونگے کہ حامد نے کہا "تعجب ہے کہ پتوار چلانے سے میرے بازو ابھی تک درد کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کمبخت بڑی تکلیف دے رہے ہیں ۔ ٹھہرو ذرا آرام کر لوں ۔"

انہوں نے کوٹ چھوڑ دیا ۔ حامد کا چہرہ سفید پڑ گیا ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کے چھوٹے چھوٹے قطرے نظر آنے لگے ۔

"جنگل کی آب و ہوا کچھ خراب معلوم ہوتی ہے" اس نے کہا اور پھر دفعتاً بلا وجہ غضبناک ہو کر چلایا "اس طرح تضیع اوقات سے کیا فائدہ ہے ؟ اٹھو ، ہاتھ لگاؤ ۔ نادر تم نے جب سے لاش کو دیکھا ہے خاک کام نہیں کیا ۔"

نادر نہایت غور سے اپنے ہمراہی کے چہرہ کا جائزہ لے رہا تھا ۔ اس نے کوٹ کے اٹھانے میں مدد دی ۔ اور دونوں خاموشی سے تقریباً سو گز بڑھے چلے گئے ۔ حامد گہری سانس لینے لگا ۔ "تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے ؟" حامد نے کہا ۔

"آخر حامد تمہاری حالت کیسی ہوتی جاتی ہے ؟" نادر نے سوال کیا ۔

حامد نے ٹھوکر کھائی اور فوراً کوٹ پھینک دیا ، اور چند لمحہ کے لئے نادر کی طرف گھورتا رہا ، یکایک اُس نے ایک نعرہ مارا اور اپنی گردن کو نہایت مضبوط گرفت میں لے لیا ۔

"میرے نزدیک نہ آؤ" اُس نے کہا اور ایک درخت کے تنے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا ۔ پھر ہموار آواز میں کہنے لگا ۔ "میں ابھی ٹھیک ہوا جاتا ہوں ۔"

لیکن اُس کے اعضا بہت جلد ڈھیلے پڑ گئے ۔ اُس کے پیر کانپنے لگے ۔ درخت پر اس کی گرفت کمزور ہونے لگی ۔ اور وہ آہستہ آہستہ درخت کے تنے کے سہارے زمین کی طرف پھسلنے لگا یہاں تک کہ وہ جڑ کے قریب خستہ و کوفتہ گر پڑا ۔ اس کے اعضا پر تشنج کی کیفیت طاری تھی ۔ از دیاد کرب اور کثرت تکالیف نے اس کے چہرہ کو بگاڑ دیا تھا ۔ نادر لپکا کہ اس کو سنبھالے ۔

" مجھے ہاتھ نہ لگاؤ ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ ۔ حامد نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "گری ہوئی سونے کی سلاخوں کو کوٹ پر رکھدو ۔"

"کیا میں تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتا ؟" نادر نے پوچھا ۔

"طلائی سلاخوں کو کوٹ پر رکھدو ۔"

جوں ہی کہ نادر نے طلائی سلاخوں کو اٹھا کر کوٹ پر رکھا ایک چھوٹا سا کانٹا اس کے انگوٹھے کے سرے پر چبھ گیا ۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا ، ایک نازک خار ، جو شاید دو انچ لانبا ہوا سے نظر آیا ۔

حامد نے ایک ناقابل فہم چیخ ماری اور خاموش ہو گیا ۔

نادر حواس باختہ ہو گیا ۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر کانٹے کو دیکھا ۔ پھر اس نے حامد پر نظر ڈالی جو نزع کے منازل کو طے کر رہا تھا ۔ شدت کرب اور تشنج کی سختیوں سے اُس کی پشت دوہری ہو جاتی تھی ۔ اور پھر سیدھی ہو جاتی ۔ نادر کی نظریں بلند بلند درختوں کے بیچ میں سے ہو کر ، درختوں کے تنوں پر چھائی ہوئی بیلوں کے جالدار پھیلاؤ سے گزر کر اب اس مقام تک پہنچیں جہاں کہ چینی کی لاش دھندلے طور پر ابھی تک نظر آ رہی تھی ۔ نادر کی آنکھوں کے سامنے خلیج کا خاکہ پھر گیا ۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے نشانات ، جن کی اہمیت کو وہ نہ معلوم کر سکے تھے ، اُس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے ۔ معاً حقیقت اس پر کھل گئی !

"خدا خیر کرے !" اُس نے کہا ۔ کیونکہ اُس کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کانٹے جو بظاہر اتنے نازک اور معصوم معلوم ہوتے تھے جان لیوا کانٹے تھے اور سم آلود تھے ! اب وہ سمجھا کہ خزانہ کی حفاظت کی بابت چانگھی کا یقین کامل اور بجید اصرار کیا معنی رکھتا تھا ۔ اب وہ چانگھی کی مرتے وقت کی دھمکی کا سبب سمجھ رہا تھا ۔

"حامد !" وہ چلایا ۔

لیکن حامد اب ساکت اور خاموش تھا ۔ اس کے ہاتھ پیر اکڑ رہے تھے اور ایک جانفرسا ، ڈراؤنی ہیئت پیش کر رہے تھے ۔ ایک دل لرزا دینے والا سکون جنگل کے اطراف میں چھایا ہوا تھا ۔

نادر ایک غیر متوقعہ تندی و تیزی کے ساتھ اپنے انگوٹھے کے خار خوردہ حصّہ کو چوسنے لگا ۔ اپنی عزیز زندگی کے لئے ، اپنی پیاری جان کی خاطر ۔ لیکن بہت جلد ایک سخت تکلیف وہ درد اس کے

بازوؤں اور کاندھوں میں محسوس ہونے لگا۔ اُس کی انگلیاں سخت پڑ گئیں۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ زہر چوسنا لاحاصل ہے۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ایک المناک سکوت اُس پر مستولی تھا۔ اُس کی ٹھوڑی اُسکے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھی۔ کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ایک زندگی کا ٹوٹنے والا تار! رنج و غم کی حسرت زدہ تصویر! حامد اُس کے سامنے تھا۔ اور اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ موت کی بھیانک صورت جانکنی کی زندہ دھمکی اُس کی آنکھوں میں منعکس تھی۔ درد اٹھا۔ اور بڑھا، حلق کی طرف رجوع ہوا اور اذیت میں، کرب و بلا میں اضافہ ہونے لگا ...... زمین سے صدہا فیٹ کی بلندی پر سرد ہوا کے جھونکے نے درختوں کی گنجان چھتریوں میں ایک حرکت پیدا کر دی اور ہزار ہا غیر موسوم پھول خلائے بسیط کو طے کرتے ہوئے زمین پر گرنے لگے۔

(ویلز)

سید رضی الحسن چشتی

محوِ خیال

کسی کے غم میں اک نوخیز، نازک، مہ لقا عورت — کسی کی یاد میں اک مہ جبیں اور دل رُبا عورت
الگ بیٹھی ہے دنیا کے بکھیڑوں سے جدا ہو کر — لبوں پر آ رہی ہے جان حرفِ مُدعا ہو کر
تمناؤں کے ویرانے کو یوں آباد کرتی ہے — کسی کا نام لیتی ہے، کسی کو یاد کرتی ہے
تصور ہی تصور میں وہ دل کو شاد کرتی ہے — تصور میں ہی نقشِ آرزو میں رنگ بھرتی ہے
تصور لے اُڑا ہے اس کو تخیلی بہشتوں میں — محبت کے جہاں ذرات چرچے ہیں فرشتوں میں
وہ فردوسِ تخیل جو طرب زارِ مسرت ہے — جہاں کا پتہ پتہ آئینہ دارِ مسرت ہے
وہ رنگ و بو کی دنیا جو مسرت ہی سے بستی ہے — جہاں شبنم کے بدلے بھی مسرت ہی برستی ہے
جہاں کے سرمدی نغمے اثر خیزِ مسرت ہیں — جہاں کے سرمدی جلوے گہر ریزِ مسرت ہیں
جہاں پھولوں میں، غنچوں میں مسرت مسکراتی ہے — جہاں زریں فضاؤں میں مسرت جگمگاتی ہے
جھلکتے ہیں جہاں کلیوں کے منہ پر نور کے موتی — ڈھلکتے ہیں جہاں پتوں سے اکثر نور کے موتی
جہاں جاری ہیں چپے چپے پر نہریں مسرت کی — سفینے آرزوؤں کے ہیں اور لہریں مسرت کی
جہاں نغمے مسرت کے ہیں بھونروں کی زبانوں پر — جہاں کرتی ہیں حوریں رقص الفت کے ترانوں پر
غم و اندوہ سے جس کے مکیں نا آشنا بالکل — جفائے آسماں سے ہے زمیں نا آشنا بالکل

جہاں مفہوم جینے کا مسرت ہی مسرت ہے
جہاں کا حاصلِ رنگیں محبت ہی محبت ہے

(غیر مطبوعہ)

وقار انبالوی